سوريا

١٩ ☆ ٢٠ ☆ ٢١

سوريا



رات

عمل : حنیف رامے

ادب اور آرٹ

۱۹-۲۰-۲۱

سویرا

ترتیب :

حنیف رامے

نذیر چودھری

ترتیب

○ پرنٹرز : سویرا آرٹ پریس، لاہور ○ پبلشر : نذیر احمد چودھری ○ اہتمام : ریاض چودھری

بات چیت

حنیف رامے

تار نگہ کا سوت نہیں بندھتا ضعف سے
پیچاں رہے یہ رشتہ دلا اس کو تاب دے (میر)

صاف شفاف پانی کے بہت سے بندولے اور کٹورے میرے ارد گرد پڑے ہیں۔ صاف شفاف آسمان پر صاف شفاف دھوپ دعدغاتی ہوئی لہریں لیتی ہے۔ اوپر دیکھوں تو آسمان اور دھوپ ، دائیں بائیں دیکھوں تو یہی آسمان اور دھوپ پانی کے کٹوروں میں موجود۔ بھاگنے کا کوئی رستہ نہیں۔ چپکے سے ہاتھ بڑھا کر میں ایک کٹورے کا آسمان حلق میں انڈیل لیتا ہوں۔ آسمان کا یہ ٹکڑا میرے اندر اتر کر پھیلنا شروع ہو جاتا ہے۔ میری ہتھیلی سانس لینے لگتی ہے۔ میرے ہاتھ کی ہر انگلی آنکھ بن جاتی ہے۔ میری آنکھیں نگاہ بن جاتی ہیں۔ دھڑکتا ، دیکھتا ، سنتا ہوا ہاتھ کاغذ کی سطحوں پر سرسراتا ہے۔ اجاڑ ، ویران ، بے جان کاغذ کو زندہ ہاتھ کا لمس غفلت کے خواب سے جگاتا ہے۔ ہوا چلنے لگتی ہے۔ ہوا گھوم گھوم کر کہیں پہاڑ کھڑے کرتی ہے ، کہیں میدان بچھاتی ہے ، کہیں سدا بہار جنگل اگاتی ہے۔ میرا ہاتھ ہوا کا ہم سفر و ہم رکاب ہے ، جہاں ہوا نے جو بنایا ، میرے ہاتھ نے آب رنگ سے بچڑتے ہوئے برش کے ساتھ وہیں اس وجود میں اپنا سانس گھول دیا — لیکن عین اس وقت ایک خیال مجھے ضرور آتا ہے : بھلا دیکھو تو اگر تمھارا پانی خشک ہو جائے تو کون ہے جو تمھارے لیے شیریں پانی کا چشمہ بہا لائے ؟

اصل میں یہ سوال مجھی سے مختص نہیں۔ ہر فنکار کے سینے میں یہی سوال دھوم مچائے رکھتا ہے کہ تخلیق کا سوتا کہاں ہے اور اس کا محافظ کون ہے ؟ یوں سمجھیے کہ جس نے اس سوال کا جواب ڈھونڈ لیا اس کے لیے اس کا رستہ آسمان اور دھوپ کی طرح صاف شفاف ہے ، اور جس نے اسے اہمیت نہ دی ، یا جسے اس سوال کا جواب نہ مل سکا وہ تنے ہوئے رسّے پر کھڑا اندھا ہے جسے یہ علم نہیں کہ نیچے کھائی ہے یا نرم سوکھی گھاس کا ڈھیر ہے ، جسے یہ علم نہیں کہ رسا آگے پیچھے بھی موجود ہے یا یہیں ختم ہو جاتا ہے۔

انسانیت کا پہلا اور سب سے اہم کمال یہ ہے کہ زبان وجود میں آئی۔ لفظوں میں سب سے اہم لفظ « میں » ہے۔ انسان اسی لیے انسان ہے کہ وہ « میں » کا لفظ ادا کر سکتا ہے۔ سوفسطائیوں کو بھی اسی لفظ « میں » نے زندہ رہنے کا جواز مہیا کیا

تھا ۔ تو کیا میں بھی اپنے کان میں آہستہ سے اِس « میں » کا امرت رَس ٹپکا دوں اور اعلان کر دوں کہ پانی خشک ہو گیا تو میں خُود اپنے لیے شیریں پانی کا چشمہ بہا لاؤں گا ۔ میں اپنی روح کو حکم دوں گا کہ آسمانوں اور زمینوں کے ذخائر پر چھا جائے ، محیط ہو جائے ۔ میں بڑ کا درخت بن جاؤں گا ۔ میرا پانی خشک ہو گیا تو میں ہوا میں جھومتی ہوئی اپنی ایک شاخ کا رُخ زمین کی طرف موڑ دوں گا ۔ اندھی اندھیری زمین میں یہ شاخ سانپ کی طرح بہتی ، تیرتی بڑھے گی اور شیریں پانی کے کنارے اپنی جڑیں گاڑ دے گی ۔ پانی کا وہ چشمہ جو میرے تنے میں سے گزرتا تھا اور میرے پتوں میں رنگ بھرتا تھا بے شک خشک ہو گیا لیکن اب میری یہ سراغ رساں شاخ میرا تنا بن جائے گی ، پانی کی روح اب اس شاخ ، اس نئے تنے میں سے ہو کر گزرے گی ۔ میرے پتوں کو کون بے رنگ ، بے رس کر سکتا ہے ۔

کاش معاملہ یہیں طے ہو جاتا ۔ کائنات کا ہر جزو اپنی جگہ ایک جہان ہے ، ایک نظام ہے ۔ یہ لفظ « میں » بھی ایک نظام ہے ۔ جب منہ سے یہ لفظ نکلتا ہے تو ساتھ ھی دل میں لازماً ایک دھڑکن بیدار ہوتی ہے ــــ « یہ » ــــ « میں اور یہ » ۔ « میں » اکیلا کچھ بھی نہیں ۔ « میں » کے ساتھ « یہ » اسی طرح اضافی ہے جس طرح دن کے ساتھ رات یا زمان کے ساتھ مکان ۔ ہر « میں » کے ساتھ کسی « یہ » کا تعلق لازم ہے ۔ تو کیا میں اکیلا اپنے لیے پانی کا چشمہ بہا کر نہ لا سکوں گا ؟ تو پھر میں بادل کا رستہ روک کر کھڑا ہو جاؤں گا اور کہوں گا کہ اے « یہ » ! اے میرے ہمزاد ! مجھے پانی دے ۔ میں بہتے دریاؤں سے کہوں گا ، میں ندّیوں کو پکاروں گا ــــ کوئی تو بولے گا ۔

کاش معاملہ یہیں طے ہو جاتا ۔ میں انسان ہوں اور انسان یک سمتی تعلق میں زندہ نہیں رہ سکتا ۔ وہ لینا ھی نہیں ، دینا بھی چاھتا ہے ۔ ندیاں ، دریا ، بادل دے تو دیں گے ، لے نہ سکیں گے ــــ ذرا ٹھہریے ، میرے دل میں ایک اور لفظ جاگ رہا ہے ــــ « وہ » ــــ « میں اور وہ » ۔ ہر « میں » کے ساتھ ایک « وہ » بھی تو لازم ہے ۔ تو میں « اس » سے کہوں گا کہ اے « وہ » ! اے میرے موھن ! اے میری سُندری ! مجھے اپنے ہونٹوں کا رس دو ، اپنے نین ساگر میں ڈبکیاں لگانے دو ، اپنے گھنیرے بادل ایسے بالوں میں بھیگ لینے دو ۔ تمھیں تو میں دے بھی سکتا ہوں ۔ میں تمھیں پکے ہوئے انگوروں کی مہک دوں گا ، تمھاری جھولی نین تاروں سے بھر دوں گا ، تمھارے لیے خشک پہاڑی نالوں کی تہ میں بیٹھی ہوئی رنگ رنگ کی

ڈکریاں اور خوشبو سے بوجھل ہواؤں میں تیرتی ہوئی کومل تتلباں چُنوں گا ــــ میں " تیرے " لیے کیا کیا نہیں کروں گا ؟

کاش معاملہ یہیں طے ہو جاتا ـ میں انسان ہوں لیکن ساتھ ہی فنکار بھی ہوں ـ فنکار لیے دسے گئے دو سمتی تعلق میں بھی زندہ نہیں رہ سکتا ـ اس تعلق کے آسمان کی طرف میں آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں تو مجھے اس میں کوئی شگاف دکھائی نہیں دیتا ـ ہر بار نظریں وہیں لوٹ آتی ہیں جہاں سے چلی تھیں ـ اس میں کوئی شک نہیں کہ عالمِ اشیاء (میں اور یہ) کے برعکس عالمِ محسوسات (میں اور وہ) میں مکان کی تینوں سمتیں اور زمان رواں کی چوتھی سمت بھی موجود ہوتی ہے اور ایک انسان اس عالم میں نہایت سکون و اطمنان سے زندہ رہ سکتا ہے کیونکہ اس کے لیے اس میں اتنے بہت سے اَن دیکھے ، اچھوتے عجائب وقتاً فوقتاً تجربہ کرنے کو موجود ہوتے ہیں کہ وہ زندگی بھر سدا شیِٔ حیرت انگیز لمحوں میں گھرا رہ سکتا ہے ـ لیکن وہ انسان جو فنکار بھی ہے اس کے لیے یہ عالم ایک قید خانہ ہے ـ اس کے پاس جو اپنی الگ اور بالا روشنی ہوتی ہے اس کے ذریعے سے وہ اس عالم کے ہر اندھیرے گوشے اور لمحے کو چشم زدن میں چیر جاتا ہے ـ وہ اپنے اندر مکانِ درُوں ، اور اپنے باہر مکانِ بروں میں ایک ہی رفتار سے سفر اور مشاہدہ کر سکتا ہے ـ وہ محسوسات کو شکل عطا کرنے پر قادر ہے چنانچہ عالمِ محسوسات اس کے لیے ایک حلقہ ، ایک دائرہ بن جاتا ہے اور فنکار کسی حلقے ، دائرے میں اسیر ہو کر نہیں رہ سکتا ـ پھر اسے اس حقیقت کا بھی علم ہے کہ ستاروں کے چراغوں سے سجے ہوئے اِس آسمان میں بے شک کوئی شگاف نہیں لیکن اس کے پیچھے مزید آسمان بھی ہیں ـ اسے زمانِ رواں کی سر زمین ، عام انسانوں کے مسکن ، کے پردے کے پیچھے زمان دائم کے گہراؤ کی بھی خبر ہے ـ اپنی اس خبر ، اپنے اس علم کا وہ کیا بنائے ، اسے کیونکر کام میں لائے ؟ اس کے وجود کی یہ اَن جانی ، غیر محسوس وادیاں اس سے اپنا حق مانگتی ہیں ـ انسانی تعلقات کی چاروں سمتوں میں وہ چکر کاٹ چکا ہے ، اَن دیکھے کو اس نے دیکھ لیا ہے اور اچھوتے کو اس نے چھو لیا ہے ـ اب وہ کیا کرے ــــ ٹھہریے ، میرے دل میں ایک اور لفظ جاگ رہا ہے ــــ « تُو » ، « میں اور تُو » ـ میں کے ساتھ « تُو » بھی لازم ہے ـ

جب نظر ہر بار ایک ہی رستے پر سفر کرے اور پلٹ آئے تو وہ رستہ منجمد ہو جاتا ہے ـ منجمد رستوں پر فنکار کو اپنے زندہ ہونے کا ، اپنے آزاد ہونے کا احساس نہیں ہو سکتا ـ زمین اپنے محور کے گرد بے شک فی دقیقہ میلوں کے حساب سے سفر

کرے لیکن یہ حرکت اب انسانوں کے لیے منجمد ہو چکی ہے ، ایک لکیر ، ایک دائرہ بن چکی ہے ۔ زمین کے ہر مربع انچ پر ہوا کا ڈھیروں بوجھ موجود ہوتا ہے ، یہ بوجھ انسانی جسم پر بھی ضرور موجود ہوتا ہے لیکن اب یہ بوجھ بھی انسانوں کے لیے منجمد ہوچکا ہے ، ایک لکیر ، ایک دائرہ بن چکا ہے ۔ حرکت کے احساس ، زندگی کے احساس کے لیے لازم ہے کہ اس یکسانیٔ رفتار میں تبدیلی واقع ہو ۔ فن میں جمود کی بات بھی یہی ہے کہ اگرچہ ادیبوں کے بہت سے حلقے اور مصوروں کے بہت سے دائرے موجود ہوتے ہیں ، نظمیں غزلیں لکھی سنائی جاتی ہیں ۔ تصویریں بنائی دکھائی جاتی ہیں لیکن زمین کی حرکت کی طرح ان کی حرکت اور ہوا کے بوجھ کی طرح ان کا بوجھ بھی منجمد ہوتا ہے — ان کے ہونے ، نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔

ہر فنکار کے یہاں زمانِ دائم کی سمت کے وجود کا علم موجود ہوتا ہے اس لیے یہ اس کی ضرورت ہے کہ وہ مکان اور زمانِ رواں کے حصار سے نکلے اور نئے افقوں پر سانس لے ۔ لیکن وہ کون ہے ، وہ کہاں ہے جو اسے عالمِ اشیاء کی لکیر اور عالمِ محسوسات کے دائرے سے اوپر اٹھا دے ، بلند کر دے ؟ وہ کون ہے جو اس کے لیے فضا میں ایک زینۂ پیچاں بلند کر دے جس پر چڑھ کر وہ حرکت بھی جاری رکھ سکے ، سفر کا مشاہدہ بھی کر سکے اور اس کی ہر حرکت ، ہر سفر اسے ایک عالم کی قوسوں سے نکال کر دوسرے عالم کی قوسوں میں داخل کر دے ؟ فنکار کے لیے عالمِ محسوسات میں اس پیچ دار تعلق کی گنجائش نہیں نکلی ۔ ایسا تعلق تو اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی ذات موجود ہو جس سے فنکار سطحِ محسوس کے بجائے سطحِ غیر محسوس پر مل سکے اور وہ ذات ایسی ذات ہو کہ زمانِ دائم پر قادر ہو ، زمانِ دائم میں اسی طرح حرکت کر سکتی ہو جس طرح فنکار زمانِ رواں میں ۔ فنکار کو زمانِ دائم کے وجود کا علم تو ہے اور وہ اسے محسوس بھی کرنا چاہتا ہے لیکن کر نہیں سکتا ۔ یہی وہ اندھیرا ہے جہاں اس کی اپنی روشنی بھی اندھیرا بن جاتی ہے ، یہی وہ مقام ہے جہاں اس کا پانی ختم ہو جاتا ہے اور اس کی ہری بھری کھیتیاں سُوکھ جاتی ہیں ، یہی اس کی روح کی وہ آن جانی ، غیر محسوس وادیاں ہیں جو اس سے اپنا حق مانگتی ہیں ، اسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ اس ذات کی تلاش میں نکلے جو اس کے لیے شیریں پانی کا چشمہ بہا کر لائے ، جو زمانِ دائم کی مالک و مختار ہو ۔ فنکار اپنی اسی غیر محسوس سطح ، اپنی اسی اندھی سطح پر « تُو » کی آواز سنتا ہے ۔ یہ « تُو » کون ہے ؟

یہ « تُو » کوئی بھی ہو سکتا ہے ۔ ہر وہ ذات جو سارے انسانی تجربے کو ایک وحدت میں منسلک کر دے « تُو » کہلا سکتی ہے ۔ « تُو » وہ ڈوری ہے جس میں

جسم و ذہن و تخیل و وجدان کے سارے امکانات ایک ساتھ پروئے جا سکتے ہیں ۔ « تُو » وہ مقامِ نظر ہے جہاں سے ہر چیز زندہ و پُر معنی نظر آتی ہے ، کچھ بھی بے معنی و بے جان نہیں رہتا ، « تُو » ہی « تُو » رہ جاتا ہے ۔

انسان کی فطرت اگر کوئی ہے تو یہ کہ وہ اپنے سلسلے میں ، اپنی زندگی سے اپنی موت تک ، آزاد اور با اختیار ہے لیکن وہ اکیلا نہیں رہ سکتا — « یہ » ، « وہ » ، « تم » ، « تُو » کے بغیر اس کا گزارہ نہیں اور ساتھ ہی وہ ان میں سے کسی کو بھی « تُو » سمجھ لینے پر قادر ہے ۔

« یہ » کو « تُو » سمجھنا تو سیدھی سادی اپنی بے حرمتی ہے ، اپنے آپ کو محدود کرنا ہے ۔ مادّیت کے چکر میں پھنسنے سے زندگی یا تو افیم کا پیالہ بن جاتی ہے یا جہنم کی مثال — یا بالکل بے نیاز ، حال مست یا پھر کمر توڑ ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے ہوئے ۔ مادّیت حواس کے دائرے سے نکلنے کی اجازت نہیں دیتی ، آن جانے کو غیر حقیقی سمجھ لیا جاتا ہے ۔ ذہن اشیاء سے ٹکریں مار مار کر سو جاتا ہے یا ماؤف ہو جاتا ہے ، تخیل اور وجدان کی منزلیں اس پر بند کر دی جاتی ہیں ۔

« وہ » یا « تم » میں تو فنکاروں نے ہمیشہ سے « تُو » کا عکس دیکھا ہے بلکہ اسے « تُو » سمجھا ہے ۔ « میں » اور « وہ » میں جب عشق و ایمان کا رشتہ قائم ہوجائے تو « وہ » میں « تُو » کی سطحیں جنم لے لیتی ہیں اور وہ پھیل کر سارے انسانی امکانات پر محیط ہو جاتا ہے ، جانا ، آن جانا ایک جان کر دیتا ہے ، ہر چیز کے معنی بن جاتا ہے ۔

یُوں « تُو » کا لفظ ہر زبان میں ہمیشہ اللہ کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے اور فنکار ہمیشہ اس ذات سے پانی مانگتے رہے ہیں کہ زمین و آسمان کے درمیان جو کچھ ہے سب اسی کا ہے ۔

فضا میں « میں اور تُو » کا زینۂ پیچاں بلند ہو جاتا ہے تو ہر مقام سے ہر مقام تک چڑھنے اُترنے کا رستہ واضح ہو جاتا ہے ، عالمِ اشیاء اور عالمِ محسوسات بھی کیفیتِ انجماد سے کیفیتِ حیات میں بدل جاتے ہیں ۔ میرے مُنہ سے « میں » کا لفظ نکلا ، میں نے اپنے وجود کا اقرار کیا تو میں نے زینۂ پیچاں پر قدم رکھنے ، زندگی شروع کرنے کا فیصلہ کیا ۔ میں نے زینۂ پیچاں کی پہلی سیڑھی « یہ » پر ابھی قدم نہ رکھا تھا کہ میرے ذہن میں بڑ کے درخت کا خیال جنم لے چکا تھا حالانکہ بڑ کے درخت کا تعلق عالمِ اشیاء سے ہے ۔ میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو میں نے « یہ » کے وجود کا اقرار کیا ۔ اب چونکہ میں زینۂ پیچاں پر کھڑا تھا اس لیے عالمِ اشیاء کی اس سیڑھی پر مجھے اس سے اگلی سیڑھی کا احساس بھی تھا ۔ اسی احساس نے مجھ سے بادل کے لیے « ہمزاد » کا لفظ کہلوایا حالانکہ ہمزاد کا لفظ « وہ » یا عالمِ محسوسات سے تعلق رکھتا ہے ۔ جب میں نے « وہ » کی سیڑھی پر قدم رکھا ، عالمِ محسوسات کے وجود کا اقرار کیا ۔

اپنی سندری سے خطاب کیا تو میرے نفس میں ایک اگلی سیڑھی کی دھڑکن بیدار تھی ، « تم » سے سیدھا رستہ « تُو » کو جاتا ھے ۔ میں « تُو » کی سیڑھی بھی چڑھ گیا اور میں نے دیکھا کہ زینۂ پیچاں کا ہر موڑ ، ہر ارتفاع اس سیڑھی پر مجھ میں زندہ و منوّر ھے ۔ میرا زینۂ پیچاں مکان و لا مکان کی اسی سرحد پر ختم ہو جاتا ھے کیونکہ میں فنکار ہوں پیغمبر نہیں ۔ میں « تُو » کو مخاطب تو کر سکتا ہوں ، « تُو » کو اپنے موہن کے ہردے کی گرمی میں محسوس کر سکتا ہوں ، « تُو » کو اپنی سندری کے نین ساگر میں محسوس کر سکتا ہوں ، دریا کے بہاؤ میں محسوس کر سکتا ہوں ، پہاڑ کی استقامت میں محسوس کر سکتا ہوں کہ یہ سب تُو ہو کا اعجاز ہیں لیکن « تُو » کو « تُو » کی حیثیت سے محسوس نہیں کر سکتا ۔ « تُو » سے صرف غیر محسوس تعلق رکھ سکتا ہوں ۔ اس تعلق کے قیام کے بعد عالمِ اشیاء اور عالمِ محسوسات اور عالمِ غیر محسوس میں وہ پہلی حدودِ فاصل نہیں رہتیں ۔ اب ہر عالم سے ہر عالَم کو روشن رستے پھوٹ رہے ہیں ، سب کچھ مل ملا کر ایک ہو گیا ھے ـــ سب رنگ مل کر روشنی بن گئے ہیں ۔

اس روشنی کو غور سے دیکھیے اور اسے اپنے اندر اتارنے کی کوشش کیجیے ۔ انسانی معاشرے میں آپ کو روشنی کے بہت سے دعویٰ داروں سے سابقہ پڑے گا کیونکہ ہر فنکار بزعمِ خود روشنی کا مینار ہوتا ھے ۔ اگر آپ نے زینۂ پیچاں پر تجربہ کی ہوئی روشنی اپنے اندر اتار لی ھے تو آپ بڑی آسانی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس فنکار کی روشنی سچی ھے یا جھوٹی ، یہ روشنی آپ کی روح کے اندھیروں کو چیر کر انھیں اُجال سکتی ھے یا نہیں ؟ میں آپ سے زمانِ رواں کو نظر انداز کرنے کا مطالبہ نہیں کر رہا ۔ اگر کوئی فنکار آپ کو وقتی یا ہنگامی طور پر بھی پسند آئے تو اس کے کام سے ضرور حظ اٹھائیے ، داد بھی دیجیے ۔ لیکن جب یہ وقت گزر جائے تو اس فنکار کو چپکے سے تشریف لے جانے کو ضرور کہیے ورنہ آپ کے ہاں خانۂ دل میں اس فنکار کی اندھی روشنی سے تاریکی کی تہ اور بھی گہری ہو جائے گی ۔ ایسے فنکار کا کام تو ایک جھولا ھے جس میں کبھی کبھار بیٹھ کر انسان گھومنے میں گُم ہو لیتا ھے اور بس ، ایسے فنکار کی روشنی دائرے میں گھومتی گھماتی ھے اور بس ، ایسا فنکار آپ کا رفیق نہیں بن سکتا ۔ وہ تو خود حلقے میں محصور ھے ، دائرے میں اسیر ھے ، وہ آپ کے پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیریں کیا پگھلائے گا ۔ اس کے لیے تو کسی ایسے فنکار کو ڈھونڈیے جس کی روشنی زینۂ پیچاں میں بہتی ہو ، جو آپ کو اپنے ساتھ اوپر ، افلاک و آفاق پر ، بھی اٹھائے اور زمین کے نیچے کا بھی نظارہ کرائے ۔ جو تحریر ، تقریر ، تصویر ، تعمیر آپ کو وقتی طور پر لبھاتی ھے اس میں مطالب کی صرف ایک سطح ہوتی ھے ۔ یہ یا تو عقلِ محض

کا کرشمہ ہو گی یا جذبات کا مجموعہ ہو گی یا پھر محض تخیل کی بھول بھلیاں ۔ ایسے « فن پارے » میں انسان دائرے کے اندر سفر کرتا ہے ، وہیں لوٹ آتا ہے جہاں سے چلا تھا — اس کی شخصیت ، اس کی روشنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ، نہ اس کے سامنے میں کوئی کمی واقع ہوتی ہے ۔ اس کے برعکس وہ فن پارہ جس میں حرکت زینۂ پیچاں کی سی ہے اس میں مطالب کی کئی سطحیں ہوتی ہیں (تمام سطحیں نہیں ہوتیں ، تمام سطحوں کا احاطہ تو صرف خالقِ کائنات ہی کے بس میں ہے) اور ہر سطح سے دوسری سطحوں کو رستے جاتے ہیں ۔ ایسے فن پارے میں عقل اور جذبات ، تخیل اور وجدان ، جانا اور آن جانا ، منطق ، نفسیات ، مابعدالطبیعات — سب ایک رشتے ، ایک وحدت میں جکڑے ہوئے ملتے ہیں ۔ یہ اس طرح کی وحدت نہیں کہ سب عناصر کو جمع کیا ، آپس میں ملایا اور میز پر ڈال دیا ۔ فنکار کی وحدت جامد نہیں ہوتی ، اس کی وحدت متحرک ہوتی ہے ۔ وہ ایک ایسا توازن قائم کرتا ہے جس میں عناصر ایک دوسرے کے تابع بھی ہوتے ہیں اور حاکم بھی ۔ زینۂ پیچاں کی ہر سیڑھی ایک مقامِ نظر ہوتی ہے جہاں سے دوسرے مقامات بھی نظر آ سکتے ہیں ۔ جس وقت جس سیڑھی پر ہوں وہ سیڑھی حاکم ہو جاتی ہے اور دوسری سیڑھیوں کی روشنی اس میں سے چھن چھن کر ہم تک پہنچتی ہے ۔ آپ نے عام تجربہ گاہوں میں بھی رنگوں کی وہ تھالی ضرور دیکھی ہو گی جسے اگر گھمایا جائے تو وہ سفید نظر آتی ہے ۔ اس تھالی میں ہر رنگ کا رقبہ دوسرے رنگوں کے رقبوں سے چھوٹا بڑا ہوتا ہے ۔ روشنی بنانے کا یا توازن کی تخلیق کرنے کا یہی رستہ ہے ، یہ علم حاصل کیا جائے کہ اس خاص تحریر ، تقریر ، تصویر ، تعمیر میں کون سا عنصر کس وقت حکومت کرے اور کس وقت اطاعت کرے ۔ اسی علم کا استعمال زمانِ دائم کی خبر لانے والے فنکاروں کی پہچان ہے ۔ ایسے ہر فنکار کا کام مختلف عصروں میں دیکھنے ، سننے ، پڑھنے والوں کے سامنے مختلف سطحیں لاتا ہے جو لوگوں کو مقاماتِ نظر مہیا کرتی ہیں ، جہاں سے وہ دوسری سطحوں کا تجربہ حاصل کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں ۔ اس کی ایک مثال مصنف فنکاروں کی ہے کہ ہر دور میں ان کی کتابوں کے نئے ترجمے ہوتے ہیں اور ان ترجموں کو پہلے ترجموں سے زیادہ مناسب سمجھا اور گردانا جاتا ہے ۔

انسانیت کی سب سے ابتدائی اور بنیادی مصروفیت یہ ہے کہ وہ اسموں کی تخلیق کرنا چاہتی ہے اور کرتی ہے ۔ اللہ نے آدم کو تخلیق کیا تو اسے سب سے پہلے اسموں کی تعلیم دی ۔ اسم وہ سمبل ہے جس کا مقام زمانِ دائم میں ہے ۔ اسماء وہ دروازے ہیں جو کائنات کے اسرار ہم پر منکشف کرسکتے ہیں ، ہمیں « تُو » سے قریب کر سکتے ہیں ۔ جس طرح فنکار اپنے معاشرے کا اسم ہوتا ہے اسی طرح ہر عصر کا بھی ایک اسم ہوتا ہے ۔ ہر فنکار

اپنے عصر میں اس اسم کی تلاش میں نکلنا ھے کیونکہ معاشرے میں اُس کے سپرد یہی فرض ھے ــــ وہ کون سا اسم ھے جو میرے عصر پر محیط ھو سکتا ھے، جو مجھے «تُو» سے قریب کر سکتا ھے؟

«تُو» نے خود چاھا ھے کہ «میں» اس سے دعا کرے ــــ «مجھے صراطِ مستقیم پر چلا» ـ یہ صراطِ مستقیم کیا ھے؟ صراطِ مستقیم وہ رستہ ھے جو مابعدالطبعاتی سطح پر ھر مقام سے یکساں فاصلے پر ھو ـ یہ فاصلہ مکان یا زمانِ رواں کے پیمانوں سے کبھی یکساں نہیں دیکھا جا سکتا ـ یہ فاصلہ اسی طرح یکساں ھوتا ھے جیسے چاند کا فاصلہ زمین اور سورج سے (کروڑوں میل کے فرق کے باوجود) یکساں ھے اور یہ فاصلہ عطارد کے فاصلے کی طرح مکان اور زمانِ رواں کے لحاظ سے بدلتا بھی رھتا ھے ـ کوئی لکیر، کوئی دائرہ صراطِ مستقیم نہیں ھو سکتا ـ عطارد کی حرکت کی طرح صراطِ مستقیم زینۂ پیچاں ھی کی شکل اختیار کر سکتا ھے (علمِ نجوم کے مطابق بھی عصرِ حاضر میں فلک پر عطارد ھی کی حکومت ھے)ـ زینۂ پیچاں ھی پر ھر مقام دوسرے مقامات سے یکساں فاصلے پر موجود ھوتا ھے ـ زینۂ پیچاں ھی صراطِ مستقیم ھے ـ نظریۂ اضافیت کو اگر آپ رد نہیں کر سکتے تو یہ ماننا ھی پڑے گا کہ روشنی بھی سیدھی لکیر میں سفر نہیں کرتی، زینۂ پیچاں ھی کی صورت میں سفر کرتی ھے ـ

اس مقام پر یہ سوال پیدا ھوتا ھے کہ آخر ھر فنکار زینۂ پیچاں کیوں نہیں پا پاتا؟ فنکار اپنے انسان اور فنکار ھونے کی حیثیت میں اپنی انا ـ اپنی خودی کے لیے پھیلنے اور ابھر اٹھنے کے رستے اور مواقع ڈھونڈتا ھے یہاں تک کہ وہ عالمِ اشیاء اور عالمِ محسوسات پر اپنی «میں» کو محیط پاتا ھے ـ اس مقام پر وہ «تُو» کی آواز سنتا ھے ـ عام فنکار اپنی انا کی اتنی ھی بلندی پر قناعت کر لیتا ھے ـ «تُو» کی آواز اسے آگے بڑھنے کی دعوت تو دیتی ھے، وہ کچھ دُور آگے چلتا بھی ھے لیکن اربوں، سنکھوں میلوں کے اس خلا میں پریشان ھو کر اپنی منجمد بہشت میں لوٹ آتا ھے ـ اسے ڈر ھے کہ اگر وہ اور آگے گیا تو اس کی خُودی ضرور بے خُودی میں تحلیل ھو جائے گی ـ لیکن وہ فنکار جسے اپنے اسم ھونے پر ایمان ھے، جسے اپنے سائے کے وجود کا احساس ھے، جسے اپنی روح کے اندھیرے نگروں کے وجود کا اقرار ھے اور جو اپنے سائے، ان اندھیرے نگروں کی پکار سنتا ھے اور انھیں اپنے نظامِ حیات میں باقاعدہ مقام دینا چاھتا ھے اس کے لیے بھاگنے کا کوئی رستہ نہیں ـ وہ «تُو» کی سیڑھی پر قدم رکھنے سے پیشتر پلٹ کر اپنی منجمد بہشت یا متحرک دوزخ میں نہ آئے گا، اس کے لیے آگے بڑھنے کے سوا چارہ ھی نہیں ـ اور جب «تُو» کی سیڑھی آجاتی ھے، اس کی خُودی پھیل کر، ابھر اٹھ کر

« بے خودی » کی هم رکاب هو جاتی هے ۔ « نمو » کی رفیق بن جاتی هے تو شیریں پانی کا چشمه سدا کے لیے رواں هو جاتا هے ۔

☆ ☆ ☆

اس مرتبه سویرا میں تین ناولٹ شائع هو رهے هیں ۔ تیسرے ناولٹ کے مصنف ڈی ، ایچ ، لارنس هیں جو ادب میں نئے افق کی حیثیت رکھتے هیں ۔ جهاں لارنس کا یه ناولٹ کهانی کهنے اور کهانی کے پردے میں نئی سرزمینیں آشکارا کرنے کی مثال هے وهاں اس پر اسی کے همراه شائع هونے والا ایف ، آر ، لیوس کا مضمون ایک ذهن رسا تک رسائی کا مکمل اظهار هے ۔ اس مضمون کے ساتھ هی ناول کے موضوع سے متعلق دو اور مضمون بھی شامل هیں ۔ اس طرح یه حصه الگ وحدت کا حامل هے ـــ ناول اور ناول پر ۔

اس مرتبه سویرا میں « سفر » کے نام سے ایک عنوان قائم کیا گیا هے ۔ اس حصے میں « رفتار کا بدن » ، سفر پر ایک مکالمه » بھی شامل هے ۔ غالب احمد کی نظم « سفر » کو بھی اسی حصے میں شمار کرنا چاهیے ـــ سفر اور نئے سفروں کی آرزو ۔

اس مرتبه سویرا میں جان پهچان کے لیے میر تقی میر کو چنا گیا هے ۔ ناصر کاظمی نے جانے پهچانے میر میں سے ایک ان جانے اچھوتے میر کو ابھارا هے ـــ میر ، همارا میر ۔

اس مرتبه بھی سویرا کے سرورق پر آرٹ کا لفظ محض زیبائش و نمائش کے لیے درج نهیں ۔ محمد حسن عسکری نے « رواو » پر مضمون لکھا هے ۔ « رواو » کی تصاویر بھی شامل کی گئی هیں ۔ خالد اقبال حال هی میں لندن سے مصوری کی تربیت مکمل کر کے آئے هیں ۔ همارے ملک میں دعوی' تو بهت کو هے لیکن خالد اقبال واقعی حقیقت پسند هیں ، ساتھ هی مصور بھی ۔ خطاطی کو هم مشرقی باعزت فنون میں شمار کرتے هیں ، ایک نئی مثال پیش هے ـــ بسم الله ۔

دن

ناولٹ

انتظار حسین



منظر　　　　　　　　　　　　　　عمل : خالد اقبال

(۱)

ماضی اس کے تئیں لمبی راتوں اور کھڑی دوپہروں کا ایک سلسلہ تھا ، بیچ بیچ میں کوئی بھیگی صبح ، کوئی بارش سے شرابور دن مانند موتی کے گوندھا ہوا : دوپہریں گلی گلی گھیت کھیت کا سفر ، راتیں کالا سفر بے فرسنگ بے سمت ، سوتے جاگتے ہنکارتے مسافر ، کبھی رتجگا اور کہانیاں ، کبھی خواب کا عالم کہ آنکھیں بند ہیں اور چلے جاتے ہیں ، کچھ خبر نہیں کہ کتنی دور نکل آئے کتنی دور جانا ہے ۔ جب حویلی سب سو جاتی اور گلی باہر سناٹا ہونے لگتی تو میر بوعلی کے ہنکارنے کی آوازیں آتیں ۔ حویلی کی بغل میں کچی پکی ایک کوٹھری تھی اور ایک احاطہ ، جاڑے گرمی برسات وہاں آسمان تلے سوتے ، برائے نام سونا اصل میں ہنکارنا ۔ ساونوں اور مینہ بوندی کی گنتی کی راتیں کوٹھری میں چھت کے نیچے گذرتیں سو ہنکارنے ڈکرانے کا سلسلہ طول پکڑ جاتا اور محلہ جاگ جاگ اٹھتا ۔ ہنکارتے تھے اور اندھیرے میں تیر چلاتے تھے کہ ہمیشہ نشانے پہ بیٹھتے تھے ۔ ایک رات ہنکارتے ہنکارتے چلانے لگے " نکل گیا ، نکل گیا "۔ صبح ہوتے ہی خبر آئی کہ کنکر کھوڑے میں ڈاکہ پڑ گیا ۔ تائی اماں بتایا کرتی تھیں کہ جلالی وظیفہ ان کا بگڑ گیا تھا ، اب ہمزاد قبضے سے باہر ہے ، رات کو سونے نہیں دیتا ۔ جلالی وظیفہ اور ہمزاد کے ذکر پہ اس کے اور تحسینہ کے کان اندیشہ کر کھڑے ہوتے ۔ تائی اماں خود بھی حیران ہونے لگتیں ۔ انہیں تو بس اتنا پتہ تھا کہ جلّے کی جانسوز رات کو میر بوعلی کوٹھری سے چلاتے نکلے " گر پڑی ، گر پڑی "۔ پھر حویلی کا پھاٹک پیٹنا شروع کر دیا ۔ ابھی بڑے ابا زندہ تھے کہ رات رات بھر عبادت کرتے ، آہستہ سے جانماز سے اٹھے ، پھاٹک کھولا ، میر بوعلی پھاٹک پیٹتے تھے اور چلاتے تھے " گر پڑی ، گر پڑی "۔ بڑے ابا نے گھبرا کے پوچھا " کیا گر پڑی ؟ " وحشت میں جواب دیا "چھت"۔ وہ دن اور آج کا دن کہ پھر کبھی چھت کے نیچے انہیں سونا نصیب نہ ہوا ۔ کبھی چھت تلے لیٹتے تو بری طرح ڈکرانے چلاتے اور محلے والوں کی نیندوں میں خلل ڈالتے ۔ دن نکلتا تو مردہ سے ہو جاتے ، نہ ڈکرانا نہ ہنکارنا نہ کسی سے بولنا ، جھلنگے پہ بیٹھے گٹھری بنے اونگھتے رہتے ۔ وہ اور تحسینہ بہت بہت دیر تک احاطے سے باہر کھڑے انہیں تکتے رہتے ، ڈرتے حیران ہوتے ، پھر آپ ہی آپ وہاں سے چل پڑتے ۔ اور ایک تھے گڈھے شاہ کہ بس تائی اماں نے انہیں دیکھا تھا ۔ میر بوعلی آنکھوں دیکھی حقیقت تھے ، گڈھے شاہ تائی اماں سے سنا افسانہ ۔ مجذوب تھے ، حویلی کی دیوار تلے ڈیرا ڈالا تھا ، انگلیوں سے زمین کھودتے رہتے ، کوئی پوچھتا تو جواب دیتے " فقیر رہنے کو گھر بنانا ہے "۔ گڈھا ذرا گہرا ہوا تو اندر اس کے بیٹھ گئے ۔ ایک روز بڑے ابا پاس پہنچے ، گذارش کی " شاہ جی حویلی حاضر ہے ، اس میں ڈیرا کرو "۔ گڈھے شاہ بے اعتنائی سے بولے " حویلی زمین کے نیچے ہے "۔ بڑے ابا کو برا لگا ، تڑخ کر جواب دیا " تو زمین کے نیچے ہی جاؤ اور رہو "۔ دوسرے دن نہ گڈھا تھا نہ گڈھے شاہ تھے ۔

وہ اور تحسینہ سنتے اور حیران ہوتے ۔ تائی اماں حیران ہوتیں ، پھر معنی خیز انداز میں چپ ہو جاتیں ۔ پھر چپ ٹوٹتی اور کہنے لگتیں " ہمارے بڑے ابا بہت بڑے عامل تھے ۔ ہمارا تو بھیا خاندان عاملوں کا خاندان ہے ۔ آگے ہماری ہر پیڑھی میں ایک عامل ہوا کرتے تھے ، پر بڑے ابا کے بعد سلسلہ بند ہو گیا "۔

" کیوں ؟ "

" کوئی گدی ان کی سنبھالنے والا جو نہ تھا ۔ ابا میاں کے شغل اشغال اور تھے ، باپ کے علم پر کبھی توجہ ہی نہ کی ، دوسروں کے پاس چلا گیا ۔ کیا ہوا کہ جب بڑے ابا

چرپائی پہ پڑے تو ایک ننگا فقیر جنیں کہاں سے آیا ، حویلی کے سامنے دھُنی دے دی ۔ بڑے ابا کی حالت بگڑتی چلی گئی اور اب دم اب دم ہونے لگے ۔ تین دن بری حالت رہی ، سانس گلے میں اٹکا ہوا ، وہ کرب کہ اللہ توبہ ۔ بی بی تیسرے دن کیا ہوا کہ وہ ننگ دھڑنگ سنڈ مسنڈ ملنگ گھر میں گھس آیا ۔ عورتیں چلانے لگیں ، پر بڑے ابا نے اشارہ کیا کہ آنے دو ۔ سب دم بخود ۔ اسے بی بی وہ بڑے ابا کے پاس جا سینے سے چپٹ گیا ۔ بڑے ابا تھر تھرائے اور . ختم .. ..واپس ملا گیا ۔ پھر ایسا غائب ہوا کہ لوگوں نے ڈھونڈیا ڈالی اور اس کا پتہ نہ چلا .. .. .. بس اس دن سے حویلی والوں میں کوئی عامل نہیں ہوا......''

خاندان کے بزرگوں کی یادیں اور باتیں ، جن بھوتوں کے قصے ، کبھی کہانی کوئی ، تائی اماں کی داستان هر رات جاری رهتی اور رات بھیگنے لگتی اور آنکھیں اس کی نیند سے پہلے بھاری ہوتیں پھر بند ہونے لگتیں ۔ آنکھ پھر کھلتی تو سب سوئے ہوتے ، خاموشی ، خراٹے ، اندھیرا ، خوابوں کی سرحد سے آتی ہوئی میر بوعلی کی ہنکار ، دل ڈر سے دھڑکتا اور دانت جاڑے سے بجنے لگتے : پھر پتہ چلتا کہ وہ تائی اماں کی چارپائی پہ نہیں بڑی آپا کے بستر میں ہے ، اور آہستہ آہستہ سرک کر وہ بالکل بڑی آپا کے پہلو میں ہو جاتا اور ان کے گداز اور محبت بھرے پہلو سے نکلتی گرمائی دھیرے دھیرے پھر اس پر نیند بن کر چھانے لگتی ۔ دوبارہ آنکھ اس کی کھلتی تو پھر وهی خاموشی اور خراٹے اور اندھیرا ، کالے کوس آگے کالے کوس پیچھے ، سنگھی نہ ساتھی ، خوابوں کی سرحد سے آتی ہوئی میر بوعلی کی بھید بھری ہنکار تک سنگت چھوڑ جاتی ، اور نیند بھی ، وہ جاگتا رهتا اور رات لمبی ہوتی جاتی اور دم اس کا یہ الٹتا کہ بدن سے لحاف الٹ دیتا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھنے لگتا ، اتنے میں اچانک آواز اذان کی کان میں آتی کہ اس سے اندھیرے میں نور کی ایک لکیر کھنچتی دکھائی دیتی ، آسے اطمینان ہوتا کہ رات اب آخر ہوئی ۔ پھر لال مندر جاگتا ، سنکھ اور کھڑتالیں اور گھنٹیاں بجنے لگتیں ، اندھیرے میں روشنی کا ایک بھنور پیدا ہوتا ، دھیرے دھیرے ابھرتا پھیلتا اور ڈوب جاتا ۔ پھر وهی خاموشی ، جانو رات ختم ہوتے ہوتے پھر شروع ہو چلی ہے ۔ اندھیرے میں پھر اس کا دم الٹنے لگتا کہ اتنے میں روئی کا پیچ بول اٹھتا ، روئی کا ایک پیچ بولتا ، پھر تھوڑے وقفے کے بعد دوسرا پیچ ، پھر آوازوں کا ایک تار بندھ جاتا گویا اندھیرے کی تہہ پھٹ گئی ہے۔اور روشنی کی دھار بہہ نکلی ہے ، کوئی جھوجری آواز ، کوئی پتلی آواز جس میں کئی بلٹے آئے ، اور ایک پیچ تھا کہ ریل ریل کے انجن کے تیزی سے سیٹی دیتا اور چپ ہو جاتا ، اور پھر آس سب سے موٹی اور بھاری والی آواز والے پیچ کی آواز ، رات کی رخصتی کا سب سے طویل نوحہ ، بھاری اور یکساں آواز میں بولتا رهتا بولتا رهتا ، اور وہ سمجھتا کہ صبح تک یونہی بولتا رہے گا ، مگر آہستہ آہستہ آواز ڈھنے لگتی ، اور پھر وهی خاموشی ۔ رات کی رخصتی کا سب سے طویل نوحہ سب سے آخری اعلان بھی تھا کہ بعد اس کے کوئی پیچ نہ بولتا اور دن میں دوپہروں کے سفر کی آخری منزل کہ وهاں پہنچ کے ٹھٹکتا اور اس سرخ اینٹوں والے موٹے مٹھس ستون کو کہ بلند ہوتے ہوتے آسمان کو چھوتا نظر آتا دیکھ کے حیران رہ جاتا ۔ فضا میں بلندیوں کی یہ انتہا زمین پر ملک کی آخری سرحد تھی ، جہاں سے آگے قدم رکھتے ہوئے وہ سوچنے لگتا کہ اب اجنبی ملک کی حدیں شروع ہوتی ہیں ۔ اجنبی ملک کے علاقے کو وہ دور سے دیکھتا اور واپس ہو لیتا ۔

جلتی دوپہریوں میں ، ہوا بند ہو یا لُوں چلتی ہو یا آندھی اٹھتی ہو کہ ستر بلائیں ساتھ لاتی ، آوارہ گھومنا ، گھومتے رهنا ، کبھی پیڑوں کی چھاؤں میں کبھی گرم گرم بالو جیسی ریت پہ اور کبھی هرے بھرے کھیت میں ، اتنا چلنا اتنا چلنا کہ ٹانگیں دکھنے لگتیں اور تحسینہ کا گورا منہ سرخ ہوجاتا اور بالوں کی لٹیں پسینے سے تر بتر کنپٹی پہ اور گردن پہ آ کر چپک جاتیں ۔

واپس ہوتے ہوئے مندر والی گلی میں ، مندر والی گلی سے پیاؤ کی گلی میں جہاں پانی پیتے منہ ہاتھ دھوتے ، اور پھر اپنی گلی میں ۔ مندر والی گلی سے گذرتے ہوئے اس پہ ہیبت سی چھا جاتی ۔ سرخ پتھروں والا مندر کہ دھوپ میں دور سے آنچ دیتا اس کے لئے ہمیشہ ایک معمہ رہا ، اس کے اندر کون رہتا ہے ، آدمی کہ جن : سنکھ اور کھڑتالیں اور گھنٹیاں کہ روز تڑکے میں اور شام پڑے یہ بجنے لگتی ہیں ، کون بجاتا ہے : بہت اونچائی پہ چھوٹی سی کھڑکی میں لگی ہوئی لوہے کی چرخی کہ دوپہر بھر ساکت رہتی ہے اور دھوپ ڈھلنے لگتی ہے تو آپ ہی آپ گھومنے لگتی ہے اور سفید ڈوری میں باندھی ہوئی پیتل کی چمکتی دمکتی گڑوی نیچے ہوتے ہوتے کنوئیں کے اندھیرے میں چھن سے گرتی ہے جانو کسی نے مٹھی بھر اشرفیاں پھینکی ہیں اور پھر غائب ، پھر تھوڑی دیر میں پانی سے لبالب چمکتی دمکتی نکلتی ہے ، اوپر ہوتی چلی جاتی ہے اور کھڑکی کے پاس پہنچ کر اچانک گم ہو جاتی ہے ۔ گڑوی کون ڈالتا ہے کون کھینچتا ہے ، اور یہ اتنی لمبی ڈوری کہاں سے آئی ، سوچ کی ڈوری لمبی ہوتی چلی جاتی ، اتنی لمبی کہ ہاتھ سے سرا نکل جاتا ، اتنے میں کوئی بیلی برمن کے آس پاس کی کسی کچی گچی سے اٹھتی اور اپنی طرف متوجہ کر لیتی ۔ سرخ پتھروں والی مندر تو دھوپ میں یہ تپی کہ وہ پاؤں رکھتا تو جلنے لگتے ، مگر آس پاس ننھی منی کچی گچیاں تھیں ، جن میں پانی جمع رہتا اور جہاں کوئی اکیلی بھنبیری پانی پہ بیٹھے بغیر پانی پہ سائے کی طرح منڈلاتی رہتی ، معلق پھرکنی بن کر گردش کرتی رہتی ، یا کوئی سنہری چتیوں کالے ٹیکے والی ابھاری کنارے پہ اترتی ، ڈنک کو گردش دیتی ، اور اڑ جاتی ۔ ہاں پیاؤ کی گلی میں کہ مندر والی گلی سے آگے تھی دوپہر بھر چھاؤں رہتی اور پیاؤ چلتا رہتا ۔ دونوں نالی بہتے ، پھر اس ٹھنڈی نالی میں کھڑے ہو جاتے جو یوں اجلی تھی پر کائی کی ہلکی تہہ جم جانے سے رپٹواں ہو گئی تھی ۔ پیروں کے اوپر سے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پھسل کر بہتا رہتا اور وہ کھڑے رہتے ۔ ایک روز اسی طرح کھڑے کھڑے اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ ایسا پھسلا کہ سارا گٹا چھل گیا ۔ تحسینہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔ وہ رووناں ہو گیا تھا مگر پھر چپ ہو گیا ۔ رستے بھر اسے تحسینہ پہ سخت غصہ آتا رہا اور جب کھنڈال کے پیڑ پہ جا کر اس نے کھنڈال کی ایک ہری لچکی ہوئی سنٹی توڑی تو اسے تحسینہ کو دینے سے اس نے صاف انکار کر دیا ۔

" ضمیر ہمیں دے دے یہ سنٹی " ۔ تحسینہ کے منہ میں پانی بھر آیا تھا ۔

" کیوں دے دوں ؟ " اس نے روکھا جواب دیا ۔ " دے دے ، ہم تجھے گھر چل کر نیلا شیشہ دیں گے " اس نے پھر بڑی خوشامد بھری آواز میں کہا ۔

" بڑی دے گی شیشہ ۔ جاؤ نئیں دیتے ہم " ۔

تحسینہ ایک دم سے چپ ہو گئی ، جیسے روٹھ گئی ہو ۔ وہ خود پیڑ پہ چڑھنے لگی ۔ پیڑ پہ وہ اچھی خاصی چڑھ گئی تھی ، لیکن وہ بار بار ٹوکتا ۔ قدم ذرا ڈگمگایا اور اس نے شور مچایا " وہ گری " ۔ تحسینہ پھر سنبھل جاتی ۔ آخر وہ ایک موٹے سے گدے پہ پہنچ کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور سنٹی توڑنے لگی ۔ ہوا ہولے ہولے چلتی تھی ، بار بار ذرا تیز سا جھونکا آتا اور سوکھے سنہری بال اس کے منہ پر آ پڑتے اور سفید ڈھیلا پائجامہ جو اس نے آج ہی بدلا تھا کھڑ بڑ کھڑ بڑ کرنے لگتا ۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے اس کی آنکھوں میں اور آنکھوں کے ساتھ ذہن میں ایک بجلی سی کوندی ۔ اس نے نیچے کھڑے کھڑے آواز لگائی " تحسینہ ننگی " ۔ سنٹی توڑتے توڑتے تحسینہ کے ہاتھ رک گئے ۔ پاؤں اس کے اک ذرا کانپے ، پھر وہ سنبھلی ، اور آہستہ سے نیچے اتر آئی ۔ زبان سے چپ ، منہ سوجھا ہوا ، تیوری تنی ہوئی ، آنکھوں میں انگارے ، وہ اسے دیکھ کے سہم گیا ۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگی ، اور وہ کھڑا

کا کھڑا رہ گیا ، ہاتھ پاؤں شل ، دل اندر سے بیٹھا جائے ۔ وہ اس کے بالکل پاس آ گئی اور اس کی ڈر کے مارے بری حالت مگر غصہ بھری آنکھوں سے ایک ساتھ آنسو نکل پڑے ۔ تحسینہ ھچکیاں لے کے رونے لگی ۔ پھر وہ مڑی اور ھچکیاں لیتی ہوئی گھر کی طرف چل پڑی ۔

پاؤں من من کے اور جی بیٹھا جائے ۔ کنوئیں پہ بہت دیر بے سدھ کھڑا رہا ۔ پانی سے بھری چرس ادھر آتی ، ھیرا اسے زور لگاتے ہوئے اپنے پیروں کے قریب لاتا اور پوری آواز سے گاتا

ھوجی گنگا جمنا سرسوتی سات سندھور بھرپور

سفید بے رنگ پانی اس کے بھٹے ہوئے سفید پیروں پہ بکھرتا ، پھر کنڈی میں ، کنڈی سے کچی گدلی نالی میں بہتا چلا جاتا ۔ وہ کھڑا رہا کھڑا رہا ، پھر آپ ھی آپ چل پڑا ۔

گھر کے دروازے پہ پہنچ کے وہ ٹھٹکا ۔ وہ سوچ میں پڑ گیا ، اس سوچ میں کہ اندر کیسے جائے ۔ ڈرتے ڈرتے ڈیوڑھی میں قدم رکھا ، پھاٹک سے گذر کے دبے پاؤں دوباری میں پہنچا ۔ اور اندر کے دروازے کی دراڑ سے اندر جھانکنے لگا ، نظر تو کچھ نہ آیا ، ھاں اماں میاں کے حلانے کی آواز کانوں میں آ رھی تھی ، شاید تحسینہ نے ابا میاں سے کہہ دیا ، اور اس کا دل اندر سے دھکڑ پکڑ کرنے لگا ۔ جلدی سے باھر نکلا اور الٹے پاؤں گلی میں ۔ مندر کے پاس پہنچ کر اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا ، کوئی آ رہا تھا ، دل کو ڈھارس ہوئی اور قدم آھستہ پڑنے لگے ۔ پانی کے ایک اتھلے سے تھالے پہ ایک بھنبیری جانے کب سے معلق پھرکنی سی گھومے جا رھی تھی ۔ دھوپ ڈھل رھی تھی مگر پنہارنیں کنوئیں پہ ابھی نہیں آئی تھیں ۔ ھاں کھڑکی کی خاموش چرخی جاگ اٹھی تھی ۔ چمکتی دمکتی گڑوی نیچے اترنے لگی ، ڈوری لمبی ہوتی گئی اور گڑوی نیچے اترتی چلی گئی یہاں تک کہ کنوئیں کے اندر چھناکا ہوا ، اور لمبی ڈوری سمٹنے لگی ، کھڑکی کے اندھیرے میں گم ہونے لگی ، اور پھر وہ سفید چمکتے موتی برساتی سونے سی گڑوی بھی اندھیری کھڑکی میں گم ہو گئی ۔ اس کی حیرت پھر جاگنے لگی تھی ۔ خاموش چرخی کو وہ دیر تک تکتا رہا ، اس بھید بھری کھڑکی کی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ ایک بر نے اس کا دھیان بھٹکایا جو اس کے ھاتھ کے جھٹکے سے پرے ھٹ گئی اور پھر اسی پانی کے ننھے منے تھالے پہ جا بیٹھی جہاں کئی پیلی پیلی برں اور بیٹھی تھیں ۔ انہیں دیکھ کے اسے اپنی کھنڈال کی ممچی یاد آ گئی جسے وہ وھیں کھنڈال کے درخت کے نیچے پھینک آیا تھا اور جو اس وقت ہوتی تو ان ساری بروں کو وہ سنگھوا لیتا ۔ اسے پھر ساری بات یاد آ گئی اور جی ڈھینے لگا ۔ وہ اداس اداس پھر چلنے لگا ۔ پیاؤ کے پاس سے گذرتے ہوئے اسے پیاس لگنے لگی ۔ اوک سے پانی پیا کہ کھاری تو نہیں پھیکا پھیکا ضرور لگا اور شاید ایسا ٹھنڈا بھی نہیں تھا ۔ پیاس بجھ کر بھی بے بجھی رھی ۔ پیاؤ کی گلی سے وہ سڑک پہ چلا آیا جہاں دھوپ ڈھلنے پہ کئی چاٹ والے آ بیٹھے تھے ۔ ایک میلا کھسٹا کتا اس طرف بھوکی نظریں جمائے کھڑا تھا کہ کوئی گاھک دھی بڑے کھا کے پتا پھینکتا تو لپک کے آتا اور چاٹنا شروع کر دیتا ۔

بازار کی جن جانی بوجھی دوکانوں پر وہ گھنٹوں بے معنی بے مقصد دیر دیر تک شوق سے کھڑا رہتا اور کبھی دس سروں والے راون کی تصویر اور کبھی دھڑ دھڑ جلتی ہوئی لنکا کے اوپر سے اڑتے ہوئے ھنومان جی کی تصویر کو تکتا رھتا ، اور کبھی اس سوچ میں پڑ جاتا کہ یہ کالا سانپ کہ گردن میں البیٹ دئے سر پہ پھن پھیلائے کھڑا ھے کرشن جی کے پھنکار کیوں نہیں مارتا ، ان میں سے ھر دکان پہ گیا ، کھڑا ہوا ، کھڑا رہا ، اور بے زار ہو کر آگے بڑھ لیا ۔ آخر دکانوں کے چراغوں میں بتی پڑی ، لیمپ اور لالٹینیں جلنے لگیں ۔ اور وہ پھر گھر کی طرف چلنے لگا ۔

اندھیرا ہو چلا تھا اور دوباری میں تو بالکل کالونس پت گئی تھی - بس آنگن میں جلتی ہوئی لالٹین کی روشنی کی ایک دھندلی ادھ کھلے کنوڑ سے نکل کر دوباری میں پڑ رہی تھی - اندر قدم رکھنے کا اسے حوصلہ نہیں پڑتا تھا - دوباری میں دیر تک کھڑا رہا اور جانے کتنی دیر اور کھڑا رہتا کہ گلی میں آہٹ ہوئی اور ابا میاں ایک دم سے پھاٹک میں داخل ہوئے - اس کی جان ہی تو نکل گئی - نماز پڑھ کے آ رہے تھے وہ -

"کون ؟ ضمیر ؟ اندھیرے میں کھڑا ہے ؟ کیوں ، کہاں تھا اب تک ؟"

سینے میں امنڈتا ہوا غبار گلے اور آنکھوں کی راہ امنڈ پڑا اور ابا میاں سارا غصہ بھول بھال سینے سے لگا اسے اندر لے گئے -

ابا میاں اسے یاد تھے ، ابا میاں کی باتیں یاد تھیں ، اگرچہ بکھری بکھری سی ، اٹکل بے جوڑ انداز میں ، چوڑا چکلا ڈھلتا ہوا جھریوں دار گورا گورا بدن ، سفید ہلکی ہلکی ڈاڑھی ، سر پہ بگلا سے بال ، کمر قدرے جھکی ہوئی ، بر میں اجلا سفید ململ کا کرتا ، گلے میں لٹکی ہوئی چاندی کی ننھی سی تلوار جس سے دونوں وقت کھانے کے بعد خلال کرتے - حقہ پیتے پیتے اونگھنے لگتے ہیں - حقے کی نے ہونٹوں سے الگ کی ، چاندنی بچھے تخت پہ سجے ہوئے گاؤ تکئے پہ کمر نیچے کو کھسکی اور سفید برف سر ٹک گیا ، خراٹے لینے لگے - ابھی خراٹے لے رہے ہیں اور ابھی خراٹے لیتے لیتے چونکے ہیں اور ظہر کی نماز کے لئے سیدھے مسجد کو - محراب پہ قرینے سے اوپر نیچے چنی ہوئی سرخ اور سرمئی چلمیں کہ بعض شوق سے خریدی گئی تھیں اور بعض تحفے میں آئیں ، اور کسی پہ سنہری کسی پہ روپہلی باریک نفیس جالی کھدی تھی ، بھاری جھالر والا پنکھا کہ آدھی ڈاٹ والی چھت کے کنڈوں میں آویزاں دوپہری بھر حرکت میں رہتا اور بیٹھک کے گوشے گوشے میں ہوا پہنچاتا ، پیتل کا چمکتا ہوا اگالدان ، کونے میں رکھی ہوئی لاٹھی کی شکل کی چھڑی ، لمبا چوڑا تخت کہ چاندنی اس پہ بچھی تھی ، چاندنی پہ قالین اور گاؤ تکیہ - ابا میاں سارا دن اسی تخت پہ بیٹھے رہتے ، آنے والے آتے ، مونڈھوں پہ بیٹھتے ، حقے پیتے ، پان کھاتے ، باتیں کرتے ، اور چلے جاتے - بیٹھک پھر خالی رہ جاتی اور ابا میاں اونگھنے لگتے - "ضمیر ، تحسینہ کہاں ہو" - وہ اور تحسینہ دونوں بھاگے بھاگے آتے اور ابا میاں سے لپٹ جاتے ، روز اکنّی جو دیتے تھے وہ - مگر دوپہر کو ان کی پکار گرفتاری کا پیام بن کر آتی "باہر لو چل رہی ہے ، سو جاؤ" - ایک بغل میں تحسینہ دوسری بغل میں وہ ، بیچ میں ابا میاں ، انھوں نے خراٹے لینے شروع کئے اور تحسینہ نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا اس نے تحسینہ کو ، دھیرے سے اٹھے کہ اتنے میں خراٹوں کا تسلسل ٹوٹتا "کہاں جاتے ہو ، لیٹے رہو" - اور وہ دونوں پھر دم سادھ کر آنکھیں میچ کر لیٹ جاتے ، لیٹے رہتے لیٹے رہتے کہ اتنے میں گلی میں ملائی کے برف والا گھنٹی بجاتا 'ملائی کا برف' کی صدا لگاتا آتا اور وہ بے اختیار ابا میاں کے پاس سے اٹھ لپکتے دوڑتے گلی میں پہنچتے - اپنی اپنی اکنّی نیفے سے نکال ، ملائی کا برف خریدنا کہ چاقو سے کٹی ہوئی سفید برف قاشیں ہرے ہرے پتوں پہ جمتی چلی جاتیں اور پھر ان کی انگلیوں کے مس سے پگھلتی چلی جاتیں - برف جب ختم ہو جاتا تو انگلیوں کا واسطہ ختم ہو جاتا اور برف سے سنے ہاتھ اور زبان میں بے واسطہ رشتہ پیدا ہو جاتا - پھر گیلی انگلیوں کو دامن سے پونچھتے اور ابا میاں کے خیال سے ڈرتے سہمتے ہولے ہولے اندر آتے ، اتنے میں دالان کے کسی در سے بڑیا آہستہ سے نکل کر رینگتی ہوئی اوپر اٹھتی نظر آتی "بڑیا" اور دونوں کے دونوں تیر کی طرح زینے میں ہو چھت پہ پہنچتے - تحسینہ بڑیا پکڑ لیتی اور منڈیر پہ کھڑے ہو ، بڑیا کو چٹکی میں پکڑ فضا میں بلند کرتے ہوئے پیغام دیتی "بڑیا بڑیا اللہ میاں سے میرا سلام کہیو" - "اور میرا بھی" وہ بے تابی سے بول اٹھتا -

’’ نہیں! کیوں ، بڑیا میری ہے ۔ بڑیا بڑیا اللہ میاں سے تحسینہ کا سلام کہیو ‘‘ ۔ اور چنکی ڈھیلی ، اور بڑیا ، سفید گالا جھالا ، ہوا کے جھونکے کے ساتھ اوپر اٹھتی اور اونچی ہوتی چلی جاتی ۔ وہ روونا رونا ہو جاتا اور تحسینہ سے اس کا دل بھر جاتا ۔ اداس اداس ساری چھت پہ بھٹکتا پھرتا ، کبھی اس منڈیر کے پاس کبھی اس ممٹی کے قریب ، کبھی سوکھی مرنڈ گھاس والے نوسیدہ چھجے پہ کبھی اس بڑے کھرے پہ جس کے راستے برسات کے دنوں دس چھت کا سارا پانی سمٹ کر دیوار سے نکلے ہوئے ٹین کے ٹوٹے پٹ نالے میں جاتا اور دھاڑ دھاڑ گلی میں گرتا ، اور مایوس ہو کر وہ نیچے اترنے لگتا ، اتنے میں بندروں کے طفیل ٹوٹی ہوئی ممٹی میں ایک ننھی سے بڑیا دبکی نظر آتی ’’ بڑیا مل گئی ‘‘ وہ زور سے چلاتا ۔ پھر وہ بھی اسی منڈیر پہ کھڑا ہو پیغام دیتا ’’ بڑیا بڑیا میرا سلام اللہ میاں سے کہیو ‘‘ ۔ تحسینہ کس حسرت سے بڑیا کو دیکھتی ، بڑیا کہ اس کی چٹکی سے نکل دھوپ سے تپتی فضا میں تیرنے لگتی ، رینگتی رہتی رینگتی رہتی ۔ اور تحسینہ لپک کر کہتی ’’نیری بڑیا تھکی ہوئی ہے ۔ اللہ میاں کے پاس کیسے پہنچے گی ۔ لو جی وہ تو نیچے آ رہی ہے ‘‘ ۔ وہ پھر روونا سا ہو جاتا کہ اتنے میں ہوا کا ایک زور کا جھونکا آتا اور بڑیا نیچے آتے آتے اٹھتی اور تیزی سے بلندیوں پہ بہتی چلی جاتی ۔ اللہ میاں کو سلام لے جانے کے سوال پہ ان میں ہمیشہ لڑائی ہوئی ، بڑیا تو ایک ہی کا سلام لے جا سکتی تھی نا ، اور تحسینہ ایسی مطلبی کہ بس اپنا سلام اللہ میاں کو بھیجتی ۔ ہاں سینگی بائی کی جادو بھری آواز دور سے آتی تو دل ان کے ساتھ ساتھ دھڑکتے اور سہمی آنکھیں آپس میں ایک ہی کہانی کہتیں ۔ مارے ڈر کے ، نیچے منڈیر کے ، دیوار سے زینے کی لگے دبکے دبکائے بیٹھے رہتے اور اتنے پاس پاس ہو جاتے کہ دھڑکن ایک دوسرے کے دل کی صاف سنائی دیتی ۔ بیٹھے رہتے بیٹھے رہتے ، پھر چپکے چپکے سر نکال کر گلی میں جھانکتے کہ سینگی بائی ہے یا چلی گئی ۔ ’’ بڑیا ‘‘ گلی میں بھٹکتی ہوئی بڑیا کو دیکھ کے یک بارگی چونکتا اور سینگی بائی کو بھول بھال سوا سو بھر کے زینے سے زینے سے نکل آنگن میں ، آنگن سے گلی میں ۔ پر بڑیا غائب ۔ کہاں گئی ، چھو ہو گئی ۔ اور وہ بڑیوں کی تلاش میں ایک لمبے اور خطرناک سفر پہ چل کھڑے ہوتے ، بھونڑ کی طرف ، جہاں آکھ کے بودے کھڑے تھے کہ ان کے ہرے کچے کچے پھلوں کو توڑتے تو سفید سفید دودھ نکلتا اور جب پک کر آپ پھٹتے تو اندر ان کے باریک باریک سفید ریشم کے تار سے بنے ہوتے : جٹیل میدان کہ چلتے چلتے کوئی شیشہ تلوے میں چبھ جاتا اور خون نکلنے لگتا یا گوکھرو چبھ جاتے اور نکالے نہ نکلتے ، کہیں کہیں بد رنگ کانٹے دار جھاڑی ، کوئی آڑا ترچھا اکیلا ببول کا پیڑ ، کالی جتی دار سرخ دانوں والی جھاڑیاں ، اور پرے ان کے ایک طرف کھنڈال کا ایک ہرا بھرا پیڑ ایک اونچا پیپل اور کئی ایک گھنے نیم یہ گھیرے ہوئے کہ نیچے ان کے دھوپ کا نشان تک نہ ہوتا ۔ ان درختوں کے قریب پہنچنے پر سفر کی منزل اکثر بدلی ہے اور بڑیوں سے ذہن گرگٹ کی طرف منتقل ہوا ہے ۔ ان درختوں میں جانے کتنے گرگٹ چھپے تھے کہ دوپہری میں روز ایک آدھ گرگٹ کا پھرنا ہوتا اور دوسرے دن آئے تو پھر نیم کے کسی گدے پر کھنڈال کی کسی ٹہنی میں کبھی سرخ سرخ منہ نظر آتا کبھی پیلی پیلی لمبی دم ۔ کھنڈال کی لمبی لچکیلی ہری سنٹیوں سے اور اینٹوں سے گرگٹ مار کے حضرت عباس کی مشک میں چھید کرنے کا بدلہ لینا اور ایک ایک پلی خون بڑھانا

اور پھر اس سے پرے چلتے ہوئے کنوئیں پہ ہاتھ منہ دھونا ، چلّو بھر بھر پانی پینا اور کنڈی کے ٹھنڈے موتیا پانی میں پیر ڈال دینا ۔ پانی سے لبالب بھری ہوئی کالی چرس جب کنارے پہ آ جاتی تو گورا چٹا کڑیل جوان ہیرا رسے کو زور سے کھینچتا اور تان لگاتا

هوجی گنگا جمنا سرسوتی سات سندھور بھرپور

اور اس کے قدموں میں آن گنت ٹھنڈے اجلے سبال پھول بکھر جاتے۔ کالے گھٹنوں سے اونچی میلی دھوتی اور ہونٹوں سے نیچے تک لٹکتی ہوئی گچھا سی کھچڑی مونچھوں والا گندل سلوں کا رسہ کھولتا، "ہیرا" بیل کا منہ ہوتا اور اس کے ساتھ ہنٹر پڑنے کی سڑاک سے آواز، جس کے اثر سے اڑے ہوئے بیل پھر اونچائی کی طرف چل پڑتے اور اس تیزی سے کھر مارے خاک اڑاتے کہ اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا کہ اب وہ اپنے رستے سے ہٹے اور اس کے سر پر آئے، اور وہ وہاں سے ہٹ کر پھر درختوں کے اس جھنڈ کی طرف ہو لیتے۔ پھر وہی معرکہ— گرگٹ۔ گرگٹ سے وہ ڈرتا بھی تھا اور دکھائی دے جاتا تو مارے بغیر چھوڑتا بھی نہیں تھا، بلی بھر حون جو گھٹ جاتا۔ ہاں ایک دفعہ وہ گرگٹ کو نہیں مار سکا تھا۔ اس ایک دفعہ، مارنا کیا ہاتھ ہی نہیں اٹھا۔

"گرگٹ" اس کی آستین پہ تحسینہ کی گرفت سخت ہو گئی اور دونوں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ پیپل کی جڑ سے نکل کے وہ تنے پر چڑھ رہا تھا۔ اس نے اینٹ اٹھائی، اینٹ اٹھائی تھی کہ وہ جڑھتے چڑھتے ایک دم سے رک گیا۔ منہ اس کا تنے سے ہوئی ایک انگل اونچا اٹھ گیا اور سرخ ہوتے ہوتے ہوئے انگارے کی مانند دھکنے لگا، سرخی اس کی گردن میں اس کی پیٹھ میں لہریں لینے لگی، اور پھول کے وہ پہلے سے دگنا موٹا ہو گیا۔ تحسینہ کی مٹھی نے اس کی آستین کے ساتھ ساتھ اس کا بازو بھی انگلیوں میں جکڑ لیا۔ دونوں دل ایک آہنگ ایک رفتار سے دھڑکنے لگے، دونوں ایک بن گئے: آدمی، کوسوں آدمی نہ آدم زاد، نہ آدم زاد کی آواز، پانی کی بھری جرس کنوئیں میں معلق، اور بیل، ڈھلان پہ اترتے اترتے دفعتاً رک گئے تھے، اور ہیرا اور گندل کنواں چھوڑ کر کہیں گم ہو گئے تھے۔ ہر چیز ہر آواز ٹھہر گئی تھی۔ قدم ان کے، دھڑکتے ہوئے دل ان کے، ہاتھ میں اٹھائی ہوئی اینٹ، پیپل کے گدے، کھنڈال کی لمبی لچکیلی شاخیں۔ ایک چیز بس حرکت میں تھی، حرکت میں تھی، لہرا رہی تھی، سرخی کہ اب بل کھا کے ہری ہوتی جا رہی تھی، اسٹی بل کھاتی ہری لہر، گرگٹ جانوں گم ہو گیا تھا کہ گھل گیا تھا اور رنگ کی لہر بن گیا تھا، پیچ کھاتی گرم ہوتی ہری لہر۔ لہر پھر بدلی، رنگ نے تیسری جون لی، ہری لہر نیلی پڑنے لگی: پھر گنتی کا احساس بھی جاتا رہا، کچھ خبر نہ تھی کہ کب کے کھڑے ہیں کب تک کھڑے رہیں، رنگ کون کون سی جون لے چکا ہے اور کون سی جون اور لے گا۔

چونکے تو پیپل کے پتوں میں ایک نیلی دم گھومتی ہوئی گم ہو رہی تھی۔ دم میں دم آیا اور دل پھر حرکت کرنے لگے، دھڑکنے لگے، اور سینے کی نلی چلنے لگی۔ قدم کہ جم گئے تھے ہلے اور آپ ہی آپ کنوئیں کی طرف اٹھنے لگے، جہاں جرس اپنے معمول سے چل رہی تھی اور ٹھنڈا نکھرے ہوئے موتیوں جیسا پانی ہیرا کے سفید پیروں پہ بہتا ہوا پختہ کنڈی میں، پختہ کنڈی سے کچی پہلی نالی میں، اور نالی سے کھیتوں میں جا رہا تھا۔ خاموشی سے پانی پیا اور جلدی سے گھر کی طرف چل پڑے، چپ چاپ، گم سم۔ دہشت آنکھوں میں باقی تھی اور دھڑکنا دلوں نے ابھی بند نہیں کیا تھا۔ ہوا بند، اور مکوہ اور آک کی جھاڑیاں کہ جیسے دھوپ میں تپنے لگی ہیں۔ زمین نے قدم ایک دم سے پھر پکڑ لئے۔ چار قدم آگے ایک چکر تیزی سے گھومنے لگا تھا۔ "چڑیل"— تحسینہ نے آستین اس کی پھر جکڑ لی۔ چکر تیزی سے گھومتا گھومتا پھیلنے لگا اور آس پاس پڑے ہوئے کاغذ، پتنگوں کی ٹوٹی کمانیں، مرغیوں اور کبوتروں کے اکا دکا میلے پر، چھوٹی چھوٹی کنکریاں اپنی لپیٹ میں لیتا آگے بڑھنے لگا، پیچ کھاتا اوپر اٹھنے لگا۔

واپس گھر پہنچے تو بڑی آپا نے آڑے ہاتھوں لیا "کہاں گئے تھے تم؟ ذرا صورت دیکھیو، منہ سرخ ہو رہا ہے۔ ڈوبے لوئوں میں مارے مارے پھرے ہیں"۔

بڑی آپا چلاتی رہیں اور وہ دونوں کے دونوں چپ - بڑی آپا کہنے کو پھوپھی ، اصل میں ماں سے زیادہ ۔ تحسینہ بیٹی تھی ، پر اس سے زیادہ آسے جاتی تھیں - نہلانا دھلانا ، رات کو اپنے پاس سلانا - باوا جب اسے ساتھ لے جانے لگے تھے تو روٹھیں ، خفا ہوئیں ، منتیں کیں ، بی کو برا بھلا کہا ، پھر کچھ نہ چلی تو روئیں - باوا بات کے ایسے پکے نکلے کہ نہ ابا میاں کی بات پہ دھیان دیا نہ بڑی آپا کے تانسنے پہ پسیجے -

"ہاں بھیا ، تمہاری اولاد ہے تمہیں اختیار ہے - بیوی نے کہا ہو گا کہ لونڈا پھوپھی کے پاس رہ کے بگڑ جاوے گا ، لے کے آؤ - ہاں بھیا شوق سے لے جاؤ - ہم کون روکنے والے"-

بڑی آپا تانسے دیتی رہیں ، باوا سنتے رہے ، مگر ارادے میں ذرا فرق نہ آیا - باوا کرتے وہی تھے جو جی میں آتی تھی مگر سنتے تھے خاموشی سے - ابا میاں کے سامنے تو بالکل ہی چپ رہتے - انہیں دنوں کی ایک تصویر اب تک حافظہ میں اس کے محفوظ تھی - صبح ہی صبح بیٹھک میں لوگ جمع تھے اور ابا میاں کی آواز بار بار غصے سے کانپنے لگتی اور منہ سرخ پڑ جاتا - اتنی سویرے لوگوں کا بیٹھک میں جمع ہونا بھی عجیب سا تھا کیونکہ ابا میاں اتنی سویرے نہ تو بیٹھک کھولتے تھے اور نہ ملنے والے آتے تھے - ہوا رات سے بند تھی - رات کو گرمی سے کتنی مرتبہ اس کی آنکھ کھلی اور دیکھا کہ بڑی آپا جاگتی ہیں اور پنکھا جھلتی ہیں - صبح پھر بہت سویرے گرمی سے اس کی آنکھ کھل گئی - سارا آنگن پیلا پیلا ہو رہا تھا ، اک غبار دیواروں پہ ، منڈیروں پہ چھت پہ ، نیم کے اوپر غرض سب جگہ تیر رہا تھا ، تیرتے تیرتے رک گیا تھا - بڑی آپا نماز کی چوکی پہ تھیں اور اپنی میٹھی دکھ بھری آواز میں مناجات پڑھ رہی تھیں

مولا علی ، وکیل علی ، بادشاہ علی

صبح کی نماز کے بعد یہ مناجات بڑی آپا کا ورد تھا - روز یہی ہوتا کہ آنکھیں اس کی ابھی بند ہیں اور آدھے سوتے آدھے جاگتے کی کیفیت ہے اور کانوں میں چاندی کی کٹوریاں سی بج رہی ہیں

مولا علی ، وکیل علی ، بادشاہ علی

بڑی آپا کی آواز میں عجب رقت اور درد کی کیفیت تھی اور مناجات پڑھتے دیکھ کر لگتا کہ بس ابھی نگھلیں گی اور صبح کے پاکیزہ دھندلکے میں گھل جائیں گی - پیلا پیلا آنگن ، ہوا بند ، اور بڑی آپا کی رقت بھری میٹھی آواز ، ایک ٹھنڈی منور لکیر آنگن کی پیلی گرم فضا میں رستہ بناتی ہوئی - اس کی آنکھیں پھر مندنے لگیں - لیکن بند ہوا سونے کہاں دیتی تھی - وہ اٹھ بیٹھا - بڑی آپا مناجات پڑھتی تھیں ، تائی اماں وضو کر رہی تھیں ، تحسینہ بے سدھ پڑی خراٹے لیتی تھی - اور بیٹھک سے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں - بیٹھے بیٹھے اسے اکتاہٹ ہوئی - آنکھیں ملتا چارپائی سے اترا اور سیدھا بیٹھک میں -

"سن رہے ہو ، بنیاد علی ، پیر جی کی باتیں" ابا میاں زور زور سے بول رہے تھے -

"اماں پیر جی تم مجھے جھوٹا ڈال سکتے ہو مگر اخبار کو کیا کرو گے - فائل لکھواؤں اور دکھاؤں آپ کو اخبار کہ جنت البقیع کا مزار اکھڑوایا گیا ہے یا نہیں" -

اخبار کے ذکر پر پیر جی تھوڑے سے سٹپٹائے اور بنیاد علی پہ ابا میاں کی بات کا سکہ جم گیا -

ابا میاں اور تیز ہوئے "یہ انتہا تھوڑا ہی ہے ، اور سنئے" - ابا میاں رکے اور پیر جی سے آواز اونچی کرکے بولے "پیرجی اور سنئے ، حضور رسول مقبول کے روضے کا بھی قبہ گروا دیا" -

"قبہ گروا دیا" بنیاد علی ، مولوی ثناء اللہ ، شیخ ضیاء الحق سب کے بدن میں رعشہ آ گیا " نہیں صاحب ، خیال میں آنے والی بات نہیں " ۔

" نہیں صاحب " ابا میاں گرجے " تو اخبار تو مان لو کہ جھوٹا ہوا نا ؟ "

سب کے سب چپ ہوگئے ۔

پیر جی بولے " گروایا تو نہیں ہے اترواکے الگ رکھ دیا ہے " ۔

" لیجئے سن لیجئے شیخ جی " ابا میاں طنزاً بولے " قبہ اتروا کے الگ رکھ دیا ہے ۔ اب پوچھو کیوں ۔ کہیں گے بدعت ہے ۔ اماں پیرجی تم تو وہابی ہوگئے ہو وہابی ۔ ساری منتوں کو شرک کہو گے " ۔ ابا میاں چپ ہوئے ۔ پھر کہنے لگے " نہ تو انسانوں نے کیا ، ان انسانوں نے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں ، اب قدرت کا انتظام دیکھئے ۔ ابن سعود نے روضۂ مبارک کے غسل کی اجازت نہیں دی " ۔

پھر سب کے جسم میں رعشہ آ گیا ۔ خود اس کے جسم میں نہر تھوری پیدا ہو گئی ۔ ابن سعود پہ ایسے سخت غصہ آیا ۔

" ہاں غسل کی اجازت نہیں دی " ابا میاں بولے " تو ہوا کیا کہ عین دوپہر میں ایک بدلی اٹھی ۔ سارا مدینہ خشک اور روضۂ منورہ پہ جھم جھم پانی برسا کہ گنبد شریف اور صحن اقدس دھل کے گرد سے پاک ہوگئے " ۔

عقیدت سے سب کے سر جھک گئے ۔ پیر جی خاموش ۔ مولوی ثناء اللہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے ۔ باوا الگ مونڈھے پہ چپ چاپ بیٹھے تھے ۔ وہ کل ہی چھٹی پر آئے تھے ۔ بیچ میں موجود لیکن نہ کسی بات کی حمایت نہ مخالفت اور نہ چہرے پہ غصہ نہ عقیدت ۔ اپنی عادت ، باوا ابا میاں کے برعکس تھے ۔

ابا میاں حقہ پیتے رہے ، پھر حقے کو بنیاد علی کی طرف سرکا دیا ۔ " شیخ جی تم منصفی کرو " ۔ وہ پھر بولے " ایسا شخص مسلمان کہلانے کا مستحق ہے ؟ "

شیخ ضیاءالحق فوراً بولے " توبہ کرو ، ایسا شخص اور مسلمان " ۔

" ایسا شخص مسلمان تو نہ ہوا نا ؟ "

" نہیں ، ہرگز نہیں " ۔

" اور جو ایسے شخص کی حمایت کرے وہ مسلمان ہوگا ؟ "

" ہرگز نہیں " ۔

" تو اب سنو " ابا میاں بولے " تمہارے حضرت رئیس الاحرار نے اسی ابن سعود کی حمایت کی تھی " ۔

" ابن سعود کی ؟ "

" واللہ ابن سعود کی ۔ جو جھوٹ بولتا ہو وہ کافر ۔ اخبار موجود ہے ۔ اس میں ان کے قلم کی تحریر دی ہوئی ہے " ۔

پیرجی پھر بولے " رئیس الاحرار کی دلیل یہ تھی .... "

" دلیل ولیل کچھ ہو ۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ انہوں نے ابن سعود کی حمایت کی تھی یا نہیں ؟ "

اب مولوی ثناء اللہ بولے " یہ تو مذہب کی بات ہوئی ۔ سیاست کے بارے میں جو ان کی رائے تھی اس پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے " ۔

" لیجئے صاحب " ابا میاں طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے بنیادعلی کی طرف مخاطب ہوئے " بنیادعلی سنتے ہو کیا کہہ رہے ہیں شیخ جی...... اماں شیخ جی آپ ہیں کانگریسی ۔ میرا تو روئے سخن ان چار مسلمان بھائیوں کی طرف ہے " ۔

بنیاد علی نے حقہ پھر ابا میاں کی طرف بڑھا دیا ۔ ابا میاں نے حقے کی نے ہونٹوں میں لی ، دو تین گھونٹ لئے ، کھانسنا شروع کر دیا ، پھر گھونٹ لئے اور آہستہ آہستہ ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں ۔

" خیر جیسا کیا وہ ان کے ساتھ ۔ اب وہ اس دنیا سے اٹھ گئے اللہ ان کے گناہوں کو معاف کرے"۔ بنیاد علی ٹھنڈا سانس بھر کے بولے ۔

ابا میاں کی آنکھیں اسی طرح بند تھیں اور حقہ بدستور گڑ گڑ کر رہا تھا ۔

"ویسے یہ خبر صحیح بھی ہے ؟ " مولوی ثناء اللہ نے شک بھرے لہجے میں سوال کیا ۔

"صاحب سنا ہے اللہ جانے" بنیاد علی نے جواب دیا ۔

"اخبار میں تو ابھی کچھ آیا نہیں ہے ۔ کیا کہا جا سکتا ہے" پیر جی بولے ۔

ابا میاں کھنکارے ، حقے کی نے کو الگ کیا ، کہنے لگے" آج کی خبر ہے تو اخبار بال کل پہنچے گا "۔ انہوں نے حقے کی نے پھر منہ میں لے لی اور پھر آنکھیں بند کر لیں ۔

" خدا کرے جھوٹ ہو"۔ شیخ ضیاء الحق بولے ۔ باہر سڑک پہ ایک دبا دبا سا ہنگامہ پیدا ہوا اور بہت سے قدموں کی مدھم چاپ ۔

"کیوں بھئی کیسا جلوس ہے یہ ؟ " ایک شخص چلتے چلتے بیچ سڑک پہ ٹھٹک گیا ۔

"جلوس ؟ "بیٹھک میں سب کے سب چونک پڑے ۔ جلوس چلتے چلتے بیٹھک کے سامنے آ گیا ۔ کالا علم آگے آگے ، پیچھے ایک مجمع ، کھدر پوش کانگریسی رضا کار ، ترکی ٹوپی اور شیروانیاں پہنے ہوئے مسلمان شرفا ۔ شیخ ضیاءالحق ، پیر جی ، بنیاد علی ، مولوی ثناءاللہ سب کے سب اندر سے باہر چبوترے پہ آئے ، پھر نیچے اتر کے جلوس میں شامل ہو گئے ۔

ابا میاں آہستہ سے اٹھے اور چبوترے پہ آ کھڑے ہوئے ۔ باوا ان کے پیچھے پیچھے ۔ جلوس جب بیٹھک کے آگے سے گذر گیا تو ابا میاں کے قدم شاید بے ارادہ اٹھے اور آہستہ سے نیچے اتر کر وہ بھی جلوس کے سب سے پیچھے ہو لئے ۔ باوا ان کے ساتھ تھے اور وہ بھی ان کے ساتھ لگ لیا تھا ۔

فقیر چند پرچونیا سودا تولتے تولتے دکان سے اٹھا اور نیچے آ کھڑا ہوا "میاں کیا ہوا"۔

"مولانا محمد علی . . . "

"محمد علی شوکت علی ؟ "

"ہاں محمد علی شوکت علی ۔ لالہ جی دکان بند کر دو"۔

"لالہ جی ، کیا ہوا ، گھٹنا ہو گئی ؟"

"ہمیں ، محمد علی شوکت علی کا دیہانت ہو گیا "۔ فقیر چند نے دکان کو تالا لگایا اور لپک جھپک آگے بڑھ جلوس میں مل گیا ۔

"محمد علی شوکت علی خلافت والے؟ "

"کیا کہا ؟ خلافت والے محمد علی شوکت علی گذر گئے ؟ "

دکانیں بند ہونے لگیں ۔ کسی نے دکان بند کر تھڑے پہ بیٹھ جانا مناسب جانا ، کوئی جلوس میں جا ملا ۔ خاموش جلوس سڑکوں اور گلیوں سے نکلتا ہوا ٹھٹھیروں والی گلی میں پہنچا ، وہاں سے نکل کر بڑے بازار میں ، بازار سے بیٹھ کے میدان میں آیا اور رک گیا ۔

"حضرات بیٹھ جائیے" ایک شخص بلند آواز سے بولا ۔ اور مجمع بڑی خاموشی سے میدان میں بچھے ہوئے فرش پر بیٹھ گیا ۔ پھر صمد آگے بڑھا اور چادر بچھے ہوئے تخت پہ جا پہنچا ۔ کانگریس کے ہر جلوس میں صمد کھدر کا لمبا کرتہ پہنے عینک لگائے بال بڑھائے آگے آگے ہوتا تھا ۔ کبھی کبھار کئی مہینوں کے لئے غایب ہو جاتا اور جلوس میں بالکل

نائی نہ دیتا ، پتہ چلتا کہ جیل چلا گیا ، اور پھر کسی دن یکایک جلوس میں سب سے جھنڈا لئے نظر آتا اور زور زور سے نعرے لگاتا ، گلا پھاڑ کے تقریر کرتا ۔ آج اس نے نعرہ نہیں لگایا تھا ۔ وہ تخت پہ کھڑا ہوا ۔ مجمع خاموش تھا ۔ چند لمحے وہ چپ رہا ۔ پھر بلند آواز سے بولا "بھائیو ، ہم وطنو ، آج رئیس الاحرار .. .. ." اس کی بھرا گئی ۔ چپ ہوا ۔ گلا صاف کیا ، پھر بولا "بھائیو ، آج .. .." اس کی آواز پھر گئی ۔ چپ ہوا اور پھر کھنکار کے آواز کو ذرا بلند کر کے بولا "بھائیو ہم سے آج... ." پھر بھرانے لگی ، پھر خاموش ہو گیا ۔ مجمع بدستور خاموش تھا ۔ بہت سے لوگ اس کی تک رہے تھے ۔ بہت سوں کے سر جھک گئے تھے ۔ بعض لوگوں نے چپکے چپکے رونا شروع دیا تھا ۔ ایک شخص نے پانی کا گلاس صمد کو پکڑا دیا ۔ صمد نے پانی پیا ، رومال سے پونچھا ، پھر استقلال سے کھنکار کر بولا "ہم وطنو رئیس الاحرار نے فرمایا تھا کہ میں ی لیے بغیر اپنے ملک واپس نہیں جاؤں گا"۔ صمد چپ ہوا ، پھر ایک ساتھ رقت بھری میں چلا کر بولا " تو مسلمانو رئیس الاحرار واپس نہیں آئے ۔ وہ ہمیں..... ہمیں وہ چھوڑ "۔ صمد کی آواز بھرا گئی اور وہ سٹیج سے نیچے اتر گیا ۔

مجمع اسی طرح بیٹھا تھا ، خاموش ، سر جھکے ہوئے ، کسی کسی آنکھ سے آنسو ہوئے ۔ اس نے ابا میاں کو دیکھا ، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے ۔ باوا چپ کھڑے

(۲)

ماضی اس کے تئیں خوشبو تھی کہ اڑ رہی تھی ، ہجرت کر رہی تھی ۔ لمبی راتوں کھڑی دوپہروں کا وہ بے انت سلسلہ اب ایک ادھ بسرا خواب تھا ۔ آنگن والا نیم کا ، اونچی نیچی لمبی چوڑی چھتیں ، کائی جمی منڈیریں اور اونچی دیواریں ، سب سے اونچے تھے والی وہ منڈیر جسے بندروں نے آدھا توڑ ڈالا تھا ، پرے نظر آتا ہوا لال مندر ، لال مندر بہت پرے کھڑا ہوا موٹا ٹھس سچ ، بیچ بیچ میں نیم اور پیپل اور شیشم کے درخت ے ہوئے ، سب چیزیں ویسی ہی ہوتے ہوئے ویسی ہی نہیں تھیں ۔ اس سے وہ سب کی اتنی دور ہو گئی تھیں ۔ لگتا تھا کہ دوسرے جنم میں ان سے مل رہا ہے ۔ سالوں بعد وہ ں آیا تھا ۔ کیا خبر ہے کہ ابھی اور کب تک وہ واپس نہ آتا ، مگر ابا میاں کی بیماری کا پہنچا اور باوا نے جلدی جلدی چھٹی لی ، امی نے سفر کا سامان تیار کیا ، اور چل کھڑے نے ۔ مگر سفر گھنٹوں کا تو نہیں تھا ، دنوں کا تھا ۔ صوبے سے صوبے میں یوں تو نہیں پہنچ ۔ گاڑی دن بھر چلتی ، رات بھر چلتی ، چلتے چلتے کھڑی ہو جاتی ، پھر چلنے لگتی ۔ کے اندھیرے میں کبھی کسی سٹیشن کے قریب کبھی بیچ جنگل میں کھڑی ہو جاتی اور دینے لگتی ، کبھی کبھی اتنی کھڑی ہوتی کہ مسافر اکتا کر گاڑی سے نیچے اتر پڑتے ٹولیوں کی ٹولیاں پٹریوں کے بیچ میں بچھے ہوئے کنکروں کو روندتی ہوئی چہل قدمی کرنے ں ۔ باوا پہلو بدلتے ، کھڑکی سے جھانک کے دیکھتے اور بالآخر نیچے اتر کر کسی چکر پوچھ گچھ کرنے لگتے کہ اتنے میں دور پٹری پہ روشنی کا ایک ہنڈا دکھائی دیتا کہ دیکھتے ہی فراغت سے ٹہلتی ہوئی ٹولیوں میں کھلبلی ہوتی اور سب اپنے اپنے ڈبے کی سمت تے ، اور روشنی کے قریب ہونے کے ساتھ ساتھ لوہے کے پہیوں کا شور سنائی دیتا ، جو قریب پر اتنا تیز ہوتا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے ، مگر جب مسافروں سے بھرے ہوئے

روشن ڈبے ساکن ڈبوں کے برابر سے تیزی سے گزرتے ہوئے اندھیرے میں کھو جاتے تو وہ شور بھی دور ہوتا ۔ گم ہوتا چلا جاتا ۔ رکی ہوئی گاڑی میں جھٹکا لگتا ، سارے ڈبے ہل اٹھتے ، گاڑی پھر چل پڑتی ۔

سفر میں امی نے کئی بار اپنی الٹی آنکھ کے پھڑکنے کا ذکر بڑی فکر مندی سے کیا ۔ سفر کے تیسرے دن صبح کو انہوں نے چلتی گاڑی سے سامنے کچے رستے پہ ایک بیل کو مرا پڑا دیکھا ، بے ساختہ منہ سے نکلا "الٰہی خیر" پھر گاڑی رک کے کھڑی ہو گئی ۔ بس اس کے بعد تو ان کا سارا سفر ہی تشویش میں کٹا ۔

باوا نے چلنے میں بہت جلدی کی تھی ۔ مگر ابا میاں نے ان سے زیادہ جلدی کی ۔ پہنچے ہیں تو تیجا تک ہو چکا تھا ۔ بڑی آپا باوا سے مل کے بہت روئیں ۔ روئیں ، بین کئے ، اور بین میں ابا میاں کی طرف سے شکایتیں کیں کہ مرتے وقت باپ کو پانی نہیں پلایا ۔ کبھی شکایت ، کبھی طعنہ ، کبھی ابا میاں کے انتظار کا ذکر ، کبھی اپنی گھبراہٹ کا تذکرہ ۔

" آخری وقت تک دروازے پہ ٹکٹکی بندھی رہی ۔ اب آؤ ، اب آؤ ۔ بار بار پوچھتے ، چھموں گاڑی دیکھنے کسی کو بھیجا ہے ۔ بڑی حسرت تھی کہ بیٹے کی صورت دیکھ لیں " ۔ بڑی آپا کی آواز پھر بھرّا گئی اور باوا کی آنکھیں پھر نم ہو گئیں ۔ رات کو وہ جب آ کر اترے ہیں تو تڑکا ہو رہا تھا ۔ بڑی آپا باوا کے گلے میں باہیں ڈال کے اور امّی کے سر سے سر جوڑ کر جانے کب تک روتی رہیں اس کی تو چارپائی پہ کمر لگاتے ہی پٹ سے آنکھ لگ گئی تھی ۔ اب صبح اٹھنے پہ ایسے لگا کہ رات کا وہ سلسلہ اب تک جاری ہے ، ہاں اب اک ٹھہراؤ کے ساتھ ۔ بڑی آپا روتے روتے چپ ہو جاتیں ، باتیں کرنے لگتیں ، ان کے ہاتھ میں سروطہ چلنے لگتا ، پھر جانے کیا ہوتا کہ انہیں ابا میاں کی کوئی بات یاد آ جاتی ، آنکھیں ڈب ڈبانے لگتیں ، آواز رندھ جاتی اور مدرے اونچی آواز سے رونا شروع کر دیتیں ۔ باوا چپ تھے ، ہاں بار بار آنکھ ضرور نم ہو جاتی تھی ۔ سر جھک جاتا تھا ۔ آخری وقت میں ابا میاں کی صورت نہ دیکھنے اور خدمت نہ کرنے کا غم ، پھر بڑی آپا کے بین بھرے طعنے ، باوا کا سر جھک جاتا اور جیب سے رومال نکل کر آنکھوں پہ پہنچ جاتا ۔ بڑی آپا کی آنکھوں کی طرح ان کی آنکھیں سوجھی ہوئی تو نہیں تھیں مگر سرخ پڑ گئی تھیں ۔

" بس اک تمنا رہ گئی بی بی کہ بیٹا کاندھا دے باقی تو خدا بخشے اللہ نے ساری تمنائیں پوری کیں " ۔ تائی اماں کے لہجے میں تاسّف کی کیفیت کے ساتھ ساتھ دلاسا دینے کا انداز بھی تھا " اللہ ، اولاد کو سب کچھ قابل بنا کے دنیا سے اٹھے ۔ ایسی سکھ کی نیند اللہ ہر کسی کو نصیب کرے " ۔ تائی اماں کو جانے کیا دھیان آیا کہ بولتے بولتے چپ ہو گئیں ۔ ان کی آنکھیں خلا میں گھورنے لگی تھیں ۔ چپ بیٹھے بیٹھے آہستہ سے چونکیں ، بولیں " بی بی بالکل ایسا لگے تھا کہ سو رہے ہیں ۔ جانو ابھی آنکھ لگی ہے اور ذرا کھٹکا ہوا تو چونک کے آنکھ کھول دے ویں گے " ۔

بڑی آپا تائی اماں کا منہ تکنے لگیں ۔ پھر کہیں اور جا پہنچیں " پوچھنے لگے کیا دن ہے ۔ میں بولی جمعرات ۔ پائنتی تحسینہ بیٹھی تھی ، اسے تکنے لگے ۔ بولے ' نادِ علی پڑھو' میں ناد علی پڑھنے لگی ۔ غنودگی سی آ گئی ۔ میں سمجھی کہ آنکھ لگ گئی ہے ، پھر ناد علی پڑھنے لگی ...... ایک ساتھ آنکھیں کھول دیں اور دروازے کو تکنے لگے ...... جیسے کوئی دروازے پہ کھڑا ہو .... کہنے لگے چھموں ...... مولا آئے ہیں ...... پھر آنکھیں مندتی چلی گئیں ... .. "

سب چپ ، اپنی اپنی جگہ بُت بنے ہوئے ، کسی دھیان میں ڈوبے ہوئے ۔ وہ پھر بڑی آپا کو تکنے لگا تھا ، جن کی آواز اب کی بار خلاف معمول بالکل نہیں بھرائی تھی ۔

" آخری وقت میں مولا مشکل کشا آوے ہیں "۔ تائی اماں کی دھیان میں ڈوبی ہوئی آواز سرگوشی جیسی کیفیت کے ساتھ ابھری اور ڈوب گئی ۔ پھر وہی چپ ۔ آنگن کی ہر چیز ساکت تھی ، دھوپ بھی کہ نیم کے نیچے بڑی ہوئی چارپائی کی پائنتی پر آ کر رک گئی تھی ۔ نیم کی کسی خاموش ٹہنی سے کوئی ننھا سا زردی مائل سفید پھول جھڑتا اور آہستہ سے کسی گود میں ، کسی شانے پہ ، کسی سر میں آ پڑتا ۔ ننھے ننھے زردی مائل سفید پھول خاموشی سے جھڑ رہے تھے اور بکھر رہے تھے ، بڑی آپا کے گھٹنے پہ رکھے ہوئے سوکھے سر میں ، تائی اماں کے سفید برف بالوں اور امی کی کھچڑی چوٹیا میں ، پاندان پہ ، چارپائی پہ ، چارپائی کے برابر بنی ہوئی گھڑونچی اور اس پہ رکھے ہوئے کورے سرخ گھڑوں پہ ۔

جانے کیسے مگر پھر وہی ذکر چل نکلا ، مگر اس مرتبہ سرگوشیوں میں ۔ تائی اماں کی آواز اتنی آہستہ ہوتی اتنی آہستہ ہوتی کہ ایسے کچھ سنائی نہ دیتا کہ کیا کہہ رہی ہیں ، بس ہونٹ ہلتے اور ڈلا سی آنکھیں حیرت سے گردش کرتی اور باتیں کرتی دکھائی دیتیں ، اور بڑی آپا کے ہاتھ میں چلتا ہوا سروطہ یک بارگی رک جاتا ۔

" اچھی بڑی آپا میرا تو دل دھک سے رہ گیا "۔ امی کی آواز سرگوشی کی حد سے نکل کر ذرا بلند ہو چلی تھی " میں نے تمہارے بھائی سے کہا ۔ انہوں نے جھڑک دیا کہ تمہارا وسوسہ ہے ، آبادی قریب ہے ، کسی کسان کا بیل ہوگا ، مر گیا ۔ مگر آپا میرا دل اندر سے دھکڑ پکڑ کرے کہ یا اللہ گاڑی بیچ جنگل میں کیوں رکی ۔ اور آس پاس کوئی کھیت نہیں ، کوئی گاؤں نہیں ، بیل کس کا ہے "۔

" اری بہنوں "۔ بڑی آپا کے لہجے میں آواز بلند ہوتے ہوئے بھی سرگوشی کی کیفیت تھی اور آنکھوں میں حیرانی " میں نے تو ، بہنوں ، تین دن پہلے خواب دیکھ لیا تھا ۔ کیا دیکھوں ہوں کہ ابا میاں ہیں ، آواز دے رہے ہیں ' چھموں ، چھموں ' میں دالان سے نکلی ہوں ۔ پشت اُن کی میری طرف ، باہر دروازے کی طرف جا رہے ہیں ۔ میں بولی ہوں کہ ، ابا میاں ' لوں میں آپ کہاں جا رہے ہیں ' کہہ رہے ہیں ' بی بی ' لوں کہاں ، دن ڈھل رہا ہے ۔ اذان ہو رہی ہے ، نماز کو جاتا ہوں ، دروازہ اندر سے بند کرلو "۔

پھر سب کے سب چپ تھے ، اسی طرح اپنی اپنی جگہ بت بنے ہوئے ، کسی دور کے دھیان میں ڈوبے ہوئے : نیم کی ٹہنیاں کہ دم بھر پہلے ہوا سے لہرا رہی تھیں سرنگوں ہو گئی تھیں ، اور ننھے زردی مائل سفید پھولوں کے گرنے کی رفتار پھر اسی سست پڑ گئی کہ جانو فضا میں رینگتے ہوئے نیچے آ رہے ہیں ۔

تائی اماں کو حرکت ہوئی " توبہ توبہ بڑی گرمی ہے ۔ ہوا بالکل رک گئی "۔ اور انہوں نے زور زور سے پنکھا کرنا شروع کر دیا ۔

بڑی آپا چونکیں ۔ انہیں یاد آیا کہ باوا کو نہانا ہے ۔ " تحسینہ ، اری تحسینہ ۔ بی بی ذرا غسل خانے میں تولیہ صابون رکھ دے اور دیکھ کہ کسلے میں پانی ہے ؟ "۔

بڑی آپا کو باتیں کرتے کرتے کسی بھی بات پر ابا میاں یاد آ جاتے ، ان کی بات کا خیال آ جاتا ، آنکھ بھر آتی ۔ شروع میں یہ لمحے جلدی جلدی آتے ، پھر وقفے لمبے ہونے لگے ۔ لمحے دیر سے آتے اور جلدی رخصت ہو جاتے ۔ سوگ کی فضا حویلی سے رخصت ہو چلی تھی اور روز مرہ کے ذکر اذکار شروع تھے ۔ ابا میاں کی یاد کم ہونے لگی اور بڑی آپا کی توجہ کا مرکز باوا بننے لگے ۔ پھر امی تھیں کہ بہت دنوں کے بعد ملی تھیں اور سینکڑوں ذکر ان سے کرنے

کے تھے ، ضروری بھی اور غیر ضروری بھی - پھر وہ اسے دیکھیں اور انہیں خیال آتا کہ شادی اس کی کب ہوگی

" ماشاء اللہ جوان ہوگیا ہے - اور اب تعلیم سے بھی فراغت ہوگئی سمجھو ، بہو تم اس کا بیاہ کر دو اب "۔

امی جواب دیتیں " بڑی آپا تمہارے بھائی کہتے ہیں کہ ہم لونڈے کی منشا کے بغیر شادی نہیں کریں گے ۔ نئی روشنی کے لونڈے ہیں ، ماں باپوں کی پسند سے ان کی پسند نہیں ملتی ۔ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ بھئی خود پسند کرلیں ، ہم شادی کر دیں گے " ۔

" کیوں ضمیر بیٹا ، تمہیں کیسی دلہن پسند ہے ؟ " بڑی آپا کا رخ اس کی طرف پھر جاتا ۔

نانی اماں بول اٹھیں " اجی تمہیں نہ بتاوے گا وہ مجھے بتاوے گا ۔ بیٹا میرے کان میں بتادے ، جیسی دلہن کہے گا ویسی ہی ڈھونڈ کے لا دوں گی " ۔

"ہاں ان دلہنیں دو کھرا ککڑی ہیں نا کہ پینٹھ میں گئے اور خرید لائے" بڑی آپا کی آواز میں گرمی پیدا ہو جاتی " نانی اماں ، اچھی دلہن گری پڑی نہیں ملتی ہے " ۔

موضوع اس آہستگی سے بدلتا کہ اسے احساس تک نہ ہوتا ۔ اس کی شادی سے ہٹ کر لڑکوں لڑکیوں کی عمومی حالت پر باتیں ہونے لگتیں اور بات کہیں سے کہیں پہنچتی ۔ وہ پھر الف لیلہ پڑھنے میں لگ جاتا ۔ اس نے اپنے بیٹھنے کے لئے ایسی جگہ منتخب کی تھی جہاں سب سے کم دھوپ پہنچتی تھی ۔ کیاری سے ہٹ کر ، جہاں پودینے کے علاوہ بیلے کے بھی کئی پودے کھڑے تھے ، نیم کا گھنا پیڑ تھا ، جس کے نیچے دیوار کے سہارے لمبی گھڑونچی بنی تھی کہ خود ہری بھری اک کیاری تھی ، کورے کورے گھڑے ، کچی ٹھلیاں ، کالی اک صراحی جس کی پتلی لمبوتری گردن میں اکثر بیلے کے پھولوں کا گجرا پڑا ہوتا ، چمکتا دمکتا مراد آبادی گلاس ، اور نیم کے زردی مائل سفید پھول کہ گھڑوں کی بھیگی طشتریوں پہ ، گلاس میں ، گھڑونچی پہ ایک طرف رکھی ہوئی دانوں کی تر بتر تھالی میں ، اور گھڑونچی کی کچی زمین میں بکھرے ہوئے ۔ سرکنڈوں کی تیلیوں والا مونڈھا اس نے کیاری اور گھڑونچی کے بیچ میں دیوار کے سہارے ڈالا تھا اور اسے اپنی مستقل بیٹھک قرار دیا تھا ۔ پاس ہی جھمر کھٹ کہ بڑی آپا ، امی ، اور نانی اماں بیٹھی رہتیں ، باتیں ہوتی رہتیں ، پاندان کھنکتا رہتا اور سروطہ چلتا رہتا ۔ کبھی کبھی باوا کا بیٹھک میں بیٹھے ہوئے دم گھٹنے لگتا اور ایک چارپائی نیم کے نیچے پڑ جاتی ۔ چاروں طرف بیلے بیلے اور زردی مائل سفید بوسیدہ کاغذ پھیلے ہوئے ، بیچ میں باوا جو عینک لگائے ہر کاغذ کے ایک ایک لفظ کو احتیاط سے پڑھتے اور پرانے دھرانے اک بستے میں تہہ کر کے رکھتے جاتے ۔ اس عرق ریزی کے باوصف ایسا رقعہ کوئی اب تک ہاتھ نہیں آیا تھا کہ گروی پڑی حویلی کا مقدمہ جیتنے کی صورت پیدا ہوتی ۔ لمبا چھریرا سا قد ، رنگ گندمی ، بال کھچڑی ، خاندان میں پہلے شخص تھے کہ پتلون پہنا اور سرکاری نوکری کی ۔ نانی اماں کو ان کی روش پر ہمیشہ اعتراض رہا ، کہا کرتی تھیں " اجی تحصیل داری سے پہلے بھی طور یہی تھا ۔ برجس ڈالے فل بوٹ چڑھائے کھٹ کھٹ کرتا شکار سے واپس آتا : بندوق کونے میں رکھ ، تھیلا گلے سے اتار ، فل بوٹ ایک طرف پھینک ، چوکی پہ کھڑا ہو نماز پڑھنے لگا ۔ میں ہاہا کرتی کہ شبو میاں برجس اتار دو ، وضو کر لو ، شبو میاں کہاں سنتے ہیں " نانی اماں ولایت میں بھی لوگ نماز پڑھیں ہیں ۔ وہاں پجامہ کوئی نہیں پہنتا " ۔ خاک پھونھل موئے ولایت والوں پہ ۔ برجسوں اور پتلونوں میں لوگ نماز پڑھنے لگیں تو قیامت نہ آجاوے ۔ اور بی بی تحصیل داری کے بعد تو جنٹل مینی میں جو کسر رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی ۔ ابا میاں مجھ ڈوبی کو طعنے دیوے تھے

"تائی اماں تمہارے شبیر حسین تو بالکل انگریز ہوگئے ہیں۔ تم نے پالا تھا تم ہی جانو"۔ "اے میاں میں کیا جانوں، میں نے پالا تھا یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ بیٹا انگریز بن جا" مگر عمر کے ساتھ ساتھ اب انگریزیت بھی بہت کم ہوگئی تھی۔ رہی تحصیل داری سو آنے تو تھے چھٹی لے کر۔ لیکن ابا میاں کے گذرنے کے بعد اتنی ذمہ داریاں آپڑی تھیں کہ یہی سوچا کہ پنشن میں اب کون سی مدت باقی ہے، یہ مدت رخصت پہ کاٹو، آخر رخصت بھی تو برسوں سے نہیں لی تھی، اور نوکری چاکری سے فارغ ہو گھر پہ بیٹھو۔ حویلی کا مقدمہ ایک طرف، پھر زمینوں کی دیکھ بھال، کھیتی باڑی کا انتظام، پھر اس کوٹھی کی منصوبہ بندی، جس کی تعمیر کا خیال پنشن لے کر گھر بیٹھنے کے خیال کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا۔ روز منہ اندھیرے اٹھنا، بھونڈ پہ جا کر کھیتوں کو دیکھنا، کوٹھی کی جگہ کا جائزہ لینا، واپسی پر انہیں پیلے بوسیدہ کاغذوں پہ جھک جانا۔ کاغذ پڑھتے پڑھتے تھک جاتے اور دم لینے کو عینک اتار کے کاغذوں پہ رکھتے، کم گوئی کے باوجود کبھی کبھی کوئی فقرہ منہ سے نکل ہی جاتا۔ بڑی آپا کی توجہ فوراً باتوں سے ہٹتی، بھائی کے فکرمند چہرے کو تکنے لگتیں "یہ تو بڑا غضب ہوگا"۔

باوا ناخوش سے لہجے میں کہتے "ابا میاں بھی تو غضب کر گئے ہیں۔ اتنا سود بٹانے کے لئے رقم کہاں سے آئے"۔

بڑی آپا کی آنکھیں بھیگنے لگتیں، آواز میں رقت پیدا ہو جاتی "باغ تو پہلے ہی نیلام چڑھ گیا تھا، بزرگوں کی یہی کھچی یادگار تھی ...." بڑی آپا چپ ہو جاتیں، پھر کہنے لگتیں "اماں جی یہیں سے سدھاریں، ابا میاں نے اسی گھر میں آنکھ کھولی اسی گھر میں آنکھ بند کی۔ بڑے ابا نے بھی آخری سانس یہیں لیا"۔ بڑی آپا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور باوا پھر کاغذوں کو پہلے بے دلی سے اور پھر اہتمام سے الٹنے پلٹنے لگتے۔

اس کی آنکھوں میں پوری حویلی کہ مانند ایک براعظم کے تھی گھومنے لگتی۔ ڈاٹ کی چھتوں والے اونچے کشادہ کمرے، کٹوان دروں والے لمبے لمبے دالان، مٹی میں اٹی اندھیری بخاری جس کے اندر جھانکتے ہوئے اسے ہمیشہ ڈر لگا کہ کہیں بخاری کی باسی ہوا اسے اندر نہ کھینچ لے، تہہ خانہ جس کے اور چھور کا اسے کبھی اندازہ نہ ہوسکا کہ اس کے بیچ جنگلے دالان کے نیچے آنگن میں نکلے ہوئے تھے مگر ایک جنگلا دالان کے اندر کے بغلی کمرے میں بھی کھلتا تھا، اور ایک جنگلا بڑے کمرے کے اندر والے چھوٹے اندھیرے کمرے میں کھلتا تھا، اور لمبی چوڑی رات جہاں جھنجھر کہ زینے میں داخل ہوتے ہی احساس ہوتا کہ کسی اجنبی سرنگ میں داخل ہوئے ہیں، اور کسی کسی کچی چھت پہ اگی ہوئی گھاس کہ برسات نکل جانے پر سوکھی مرنڈ ہو جاتی اور کسی قدیمی زمانے کی یادگار نظر آتی، بہتی جمنے سوکھے پن نالے کہ سوکھ جانے والے دریا سے لگتے، اور پھر وہ پر اسرار سرحد، سفید بیٹوں سے اٹی ہوئی کالی پڑتی منڈیر، جس کے پرے اونچی نیچی کچی پکی ان گنت چھتیں پھیلی نظر آتیں، اور آگے ان سے وہ سرخ پتھروں والا اونچا مندر، براعظموں سے پرے ایک اور براعظم، جہاں اونچا ہمالیہ سر اٹھائے دکھائی دیتا، لال مندر چھوڑ کر کہ حویلی تو کیا ہمالیہ سے بھی اونچا دکھائی پڑتا حویلی کی چھت بستی میں سب سے اونچی تھی۔ حویلی کی وسعت اور اونچائی کا پورا احساس اس وقت ہوتا تھا جب تائی اماں غدر کے دنوں کا ذکر سناتی تھیں "بی بی میں تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ بڑی اماں سنایا کریں تھیں۔ ایسی لٹس پڑی اور آپا دھاپی پڑی کہ ایک کو ایک کی خبر نئیں۔ بھری بستئیں ایسی اجڑیں کہ نہ کوئی نام لینے والا رہا نہ پانی دینے والا۔ کوسوں چراغ جلے تھا نہ دھواں اٹھے تھا۔ جاٹ گوجر رانگڑ پوربئے دھوائیے بھالے بلم نچاتے دندناتے پھرتے، آج یہ گاؤں لوٹا، کل اس بستی پہ ہلہ بولا، پرسوں فلاں شہر پہ جا

پڑے - کوئی شہر کوئی گاؤں نہ بچا کہ جہاں غدر نہ مچا ہو - بس ہماری بستی بچی تھی - سب نے مِلا کے کیا کیا کہ اپنی اپنی عورتوں کو حویلی میں بھیج دیا اور خود لٹھ تان تان کے بستی کے گردا گرد پہرہ دینے لگے - حویلی کی چھت یہ سمجھ لو کہ سب سے اونچی تھی دور تک کا آدمی واں سے نظر آوے تھا - تین آدمی نقارے لے کے چھت پہ بیٹھ گئے - دن رات جاگیں تھے - مٹے گوجروں نے تین دفعے ھلہ بولنے کی ٹھانی - تینوں مرتبہ نقارہ بج بج گیا اور وہ تینوں دفعے باھر سے ھی لوٹ گئے "۔

حویلی کی بلندی بھی قائم تھی اور وسعت بھی ، مگر وہ پرانی کتنی ہو گئی تھی - مٹیاں اور رحیاں کچھ تو ایسی ٹوٹی تھیں کہ بس آثار باقی تھے ، جو باقی تھیں ٹوٹ پھوٹ رھی تھیں - منڈیریں کالی پڑ چکی تھیں اور دیواروں سے بوسیدہ پلستر کے پرت کے پرت گرتے تھے اور اتنے گر چکے تھے کہ ککئیا اینٹوں سے بنی دیواریں ننگی ہوتی جا رھی تھیں اور ککئیا اینٹوں کی درزوں سے پیلی سیلی مٹی ہر وقت گرتی رھی تھی ، دالان میں کمروں میں فرش پہ دیواروں کے سہارے جا بجا پیلی سیلی مٹی کی ننھی ننھی ڈھیریاں بن جاتیں اور پھر ان میں سے کبھی اللہ میاں کی بھینس نمودار ہوتی کبھی بیلیا راجہ اسے خوب کریدتا اور اپنے لئے سوراخ پیدا کر لیتا - پرانی جو چیز نظر نہیں آتی تھی وہ آنگن تھا ، لیا حوڑا کچا آنگن کہ تیسرے پہر کو سقہ جب پہلی مشک بہاتا تو بس تھوڑی دیر کے لئے زمین کھلی نظر آتی اور بھاپ اٹھتی دکھائی دیتی اور اس کے بعد پھر زمین پیاسی کی پیاسی ، کئی مشکیں چھڑکاؤ ہونے کے بعد زمین بھیگتی اور خوشبو دیتی اور پھر باوا کا تازہ حقہ مونڈھے کے آگے رکھا مہار دیتا - اور وہ نیم جیسے وہ صحن سے دیکھتا آ رھا تھا اور جانے کب سے کھڑا تھا مگر اسی طرح ھرا بھرا اور گھنا تھا کہ اس تلے سدا چھاؤں رہتی - پھر وہ گھڑونچی کہ مانند ھری بھری کیاری کے تھی اور وہ کیاری کہ مثل گھڑونچی کے پانی میں تر بتر رھی اور خوشبو سے مہکتی رھتی - گوری لمبی انگلیوں میں جھمکتے مراد آبادی گلاس اور اس میں کچی ٹھلیا سے کبھی کوری صراحی سے گرتے ہوئے مہکتے میٹھے پانی کا رسیلا شور: تحسینہ اس کی طرف توجہ کئے بغیر پانی پی گلاس گھڑے کے سیجھے رکھ پھر باورچی خانے کی طرف چلی جاتی اور وہ پھر الف لیلہ یہ ، جو اس نے ابا میاں کی کتابوں سے نکال کر وقت گذاری کی نیت سے پڑھنی شروع کر رکھی تھی ، جھک پڑتا - الف لیلہ پڑھتے پڑھتے کھو جاتا اور بھٹکتے ہوئے شہزادوں کے ساتھ خوب صورت سنگ دل ساحراؤں کی محل سراؤں میں داخل ہوجاتا...... "ھوا بند ہوگئی" بڑی آپا کی آواز کے ساتھ وہ ایک ساتھ الف لیلہ کی محل سرا سے باھر آجاتا ، اور اس وقت اسے پتہ چلتا کہ بدن اس کا پسینے میں بھیگتا جا رھا ھے - سبز و سرخ لہریوں والا پنکھا بڑی آپا کے ھاتھ میں گردش کرنے لگتا " کمبخت ابھی سے اتنی مکھی ھے ، برسات میں تو جنیں کیا حال ہو گا "۔

تائی اماں ٹوکتیں " بی بی برسات کہیں ھو تو سہی - اساڑ گذر چلا اور پانی کی بوند نہیں پڑتی - توبہ اب کے تو بڑی گرمی ھے - میرا تو مروڑیوں سے پنڈا لیس گیا "۔

پھر نیم کی ٹہنیوں میں ایک ھلکی سی لرزش تیرتی چلی جاتی اور امی کہتیں " اللہ تیرا شکر"۔

نیم کی گھنی ٹہنیوں کے کسی گوشے سے اچانک فاختہ بولنا شروع کر دیتی اور ساتھ اس کے بنی آواز میں آواز ملانے لگتی " کوٹھوں گی ...... پیسوں گی...... آیا تھا...... گیا تھا ...... کوٹھوں گی ، پیسوں گی ، آیا تھا ، گیا تھا... .."۔ فاختہ بولتے بولتے چپ ھو جاتی اور پروں کی رسیلی سرمئی پھڑ پھڑاھٹ کے ساتھ ٹہنی سے بلند ہوتی ، ایک چرخ کھاتی اور پھر کوٹھے سے پرے نکل جاتی۔

تحسینہ باورچی خانے سے نکل کیاری پہ آ بیٹھتی اور پودینے کی ننھی مہکتی پتیوں کو

چلتے پھرتے مونڈھے کے بالکل قریب آجاتی کہ وہ گوری گردن پہ پسینے کے شفاف قطرے دیکھ سکتا ۔ چندا کے نیچے سے لٹکے ہوئے سہرے بال بھیگی گوری گردن پہ چپکنے لگتے اور سفید وائل کی باریک قمیص کہیں کہیں سے بھیگ کر سڈول بھری ہوئی کمر سے پیوست ہوتی نظر آتی ۔ گردن اور پشت سے نظر ہٹا کر وہ پھر الف لیلہ پہ نظریں گاڑ دیتا ، لیکن چند ہی لمحوں میں عزم اس کا ٹوٹنے لگتا اور نظریں اس کی پھر چوری چھپے چمکتی ادھ بندھی چٹیا پہ ، گوری گردن پہ ، بھری بھری کمر پہ ، پودینے کی مہکتی ہری ہری گیلی پتیوں میں ، رنگی ہوئی اور بھیگتی ہوئی گوری پتلی انگلیوں پہ بھٹکنے لگتیں ۔

امی کی ہمدردی کی رگ ایک روز پھڑکی تو یوں بولیں ”بڑی آپا تحسینہ غریب تو کام کرتے کرتے تھکی جاوے ہے ۔ اتنے بڑے ٹبر کا سارا کام ایک جان پہ پڑ گیا ہے یہ بھی کوئی بات ہوئی “۔

بڑی آپا بولیں ” بجنے کی کیا بات ہے اس میں ۔ گھر کا کام ہے باہر والے تھوڑا ہی آ کے کریں گے “۔

”بڑی آپا “ امی بولیں ”تم نے تو یہ ستم کیا ہے کہ سارا کام اسی پہ ڈال دیا ہے“۔

”اجی کنواری لونڈیوں کو کام کی عادت ہونی چاہیے ۔ آخر پرائے گھر جانا ہے ، واں انہیں چھپر کھٹ پہ بٹھا کے کون کھلاوے گا “۔

” اے لو بڑی آپا تم تو الٹی بات کہو ہو ۔ کنوار پنے کے دن ہی تو ہووے ہیں کہ ہنس بول لو ، اس کے بعد کہاں یہ مہلت ۔ بی بی یہ بھی کوئی بات ہوئی ، میں بیٹھی بیٹھی اب تک بان توڑوں......“۔

” بہو میں تجھے چولھے پہ نہ بیٹھنے دوں گی “۔ بڑی آپا نے فوراً احتجاج کیا ۔

امی نے عزم باندھا اور توڑ دیا ۔ کام پھر تحسینہ ہی کو کرنا پڑتا ۔ گھر کا نظام اسی پرانے ڈھرے پہ جاری رہا ۔ تحسینہ کی کفایت شعاری کے احساس نے یہ فرق ڈالا کہ امی کا پیسہ کوڑی بھی اس کے پاس جمع رہنے لگا ۔ ایسے روز اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا ” کتنے؟“ یہ سوال کرتی ۔ جتنے مانگتا اتنے دے دیتی ، مگر ایک تکلف کے ساتھ گویا پیسے ضائع کرنے کے لیے دئے جا رہے ہیں ۔ اچھے اور بنی فوراً آن نازل ہوتے اور اس سے ایک ایک آنہ لے لیتے اور پھر گھر بھر میں اس کا اعلان کرتے ۔ بنی کو بڑی آپا جھڑکتیں ، پھر اس پہ بگڑتیں ”بھلا ایسے کیوں پیسے دئے ہیں ۔ چٹوری ابھی بزار جاوے گی اور بھانساوے گی “۔ اچھے کو پیسے ملنے پہ تائی اماں ایسے بھر بھر گود دعائیں دیتیں ”باپ کی طریوں افسر بنے ، حکومت کرے ، سہرا جلدی بندھے ، چاند سی دلہن گھر میں آوے ، ماں باپ بہاریں دیکھیں “۔ تائی اماں کے بال سفید ہو گئے تھے ، لیکن کاٹھی ابھی تک بنی ہوئی تھی کہ پائجامہ پھنس کے ٹانگوں میں آتا تھا اور چہرے کی جھریوں کے باوجود پتہ چلتا تھا کہ کسی زمانے میں حسین ہوں گی ۔ ایک بڑی آپا تھیں کہ جسم کی عمارت ہل گئی تھی اور وہ دوہرا بدن دوہرا ہوتے ہوتے بھی اکہرا ہو گیا تھا کہ جو کپڑا پہنتیں ڈھلتے سے لٹکتے ۔ تائی اماں کس رشتے سے تائی اماں تھیں اسے اب تک پتہ نہیں تھا : ایک دو کی نہیں گھر بھر میں سب ہی کی تائی اماں تھیں ، یہاں تک کہ ابا میاں بھی انہیں تائی اماں ہی کہا کرتے تھے ۔ ان کی بیٹی کے متعلق اسے بس دھندلا دھندلا خیال تھا کہ ایک گوری چٹی بڑی بڑی آنکھوں والی لمبے قد کی عورت تھی ، اس کی رخصت کے بعد بڑی آپا نے کہا تھا ” تائی اماں کی لونڈیا تو ڈوب گئی ۔ یہ تو بالکل گنوار لوگ ہیں “۔ اور امی نے جواب دیا تھا ”اجی اب عرش کا تارا تھوڑا ہی اترتا ۔ اچھا ہے غریب لوگ ہیں لونڈیا کو اچھی طرح رکھیں گے “۔ پھر کب اور کیسے ، یہ اسے یاد نہیں تھا ،

بس اتنا یاد تھا کہ سرے کی اس کی خبر آئی تھی اور جب تائی اماں وہاں سے چالیسویں کے بعد واپس آئیں تو ایک گورا چٹا بچہ ہر وقت ان کی گود میں ہوتا اور اچھے کے نام سے اسے کھلاتیں اور سلاتیں -

اچھے اور بنی پیسے ملتے ہی تیر کی صورت باہر جاتے اور تھوڑی دیر میں وہ دیکھتا کہ وہ سینکوں میں لگے ہوئے برف کے گولے، جن میں زرد ، سرخ سبز رنگ تیرتے ہیں ، لئے چلے آرہے ہیں ، اور زبان لگا لگا کے انہیں چاٹتے ہیں -

مونڈھے پہ بیٹھے بیٹھے وہ تھک جاتا - الف لیلہ بند کر جمائیاں لیتا ، پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں ، نیچے میں بڑے کمرے سے بڑی آپا کی آواز آتی "ارے بھئی ضمیر کہاں ہیں - ابھی تک باہر بیٹھے ہیں - تحسینہ بھئے کو بلا کہ کھانا کھا لو "- تحسینہ باہر آتی ، روکھے پھیکے انداز میں کہتی " کھانا کھا لو چل کے "- اور وہ اٹھ کھڑا ہوتا - کبھی کبھی وہ اتنا بیزار ہو جاتا کہ کھانے کو اس کا مطلق جی نہ چاہتا - اسے اپنے آپ پہ غصہ آتا ، تحسینہ پہ غصہ آتا ، بند ہو جانے والی ہوا پہ ، بھنبھناتی ہوئی مکھیوں پہ ، جھلنگوں کے طویل ہوتے دنوں پہ - تحسینہ پھر آ کر اسی روکھے پھیکے انداز میں کہتی " کھانا کھا لو چل کے "- اور وہ الف لیلہ بند کر پھر چپکے سے اس کے پیچھے ہو لیتا -

(۳)

" بجلی بجلی میرا بیاہ کدھر ؟ " سفید چمکتی بجلی بنی کی ننھی نرم انگلیوں سے پھسل کر چارپائی سے نیچے جا پڑی -

چارپائی پہ ایک طرف ہرے چھلکوں اور کٹی ہوئی سفید بجلیوں کی ایک ڈھیری لگی تھی اور پاس ہی تسلے میں سفید چھلی ہوئی امیاں بھری رکھی تھیں - تحسینہ چھلی ہوئی ثابت امیا اٹھاتی ، چاقو سے دو کرتی اور پھر چاقو کی نوک سے بجلی کے ٹکڑوں کو نکال امیا کی قاشوں کو تسلے میں ڈال دیتی -

بنی نے اپنی چمکتی ہوئی ثابت بجلی اٹھائی اور ضمیر کے مونڈھے کے پاس آ کھڑی ہوئی -

" ضمیر بھائی بتاؤ میرا بیاہ کدھر ہو گا ؟ "

" خود پوچھ لو " وہ اس وقت الف لیلہ پڑھنے میں ایسا مصروف تھا کہ نظریں اٹھانا بھی ناگوار ہو رہا تھا -

بنی نے بجلی سے اپنا بیاہ پوچھا ، پھر اچھے کا بیاہ پوچھا ، پھر ضمیر بھائی کا - " ضمیر بھائی تمہارا بیاہ جہنم میں ہو گا "-

" اچھا " اس نے بے اعتنائی سے جواب دیا اور پھر کتاب پڑھنے لگا -

" بجلی بجلی باجی کا بیاہ کدھر ؟ "

بجلی ٹپ سے اس کی کھلی کتاب میں آ کے گری -

بنی نے تالی بجا کے شور مچایا " آ ہا ہا باجی کا بیاہ ضمیر بھائی سے ہو گا "-

دل اس کا دھک سے رہ گیا : خون خشک ، اور ہاتھ پیر جانو جمے کے جمے رہ گئے- بس یہ خواہش کہ کسی طرح آنکھوں سے اوجھل ہو جائے ، باہر چلاجائے- پر جسم ساکت تھا اور نظریں کتاب پہ اسی طرح جمی ہوئیں ، اور دل دھڑ دھڑ کرتا تھا - ہوا پھر بند ہوگئی تھی اور ٹہنیاں نیم کی پھر سرنیوڑھائے خاموش تھیں - پسینے کے قطرے اس کی گردن پہ اور اس کے ماتھے پہ ابھر آئے تھے - گردن پہ سرسراتے قطرے کالر کے اندر رسنے لگے - پھر ایک

پتلی گیلی لکیر قمیص کے اندر پیٹھ پہ سرکتی ہوئی رینگنے لگی، نیچے اترنے لگی۔ دل میں آئی کہ کتاب بند کرو اور آنکھ بچا کر آہستہ سے باہر نکل جاؤ مگر جسم تھا کہ اسی طرح اپنی جگہ پہ جما تھا۔ تحسینہ کی طرف دیکھنے کی تو اسے ہمت نہیں ہوئی تھی، لیکن چاقو کے امیوں میں در دراتے اور چھلیوں کے سینوں میں اترنے کی مدھم آواز اسی رفتار سے بغیر کسی فرق کے آئے جا رہی تھی۔ ہوا بند تھی اور ٹہنیاں نیم کی سر نیوڑھائے خاموش۔ پھر فاختہ نے نیم کی اسی خاموش ٹہنی پہ بیٹھے بیٹھے بولنا شروع کر دیا۔ بجلی سے ننی کی توجہ بھٹکی اور وہ دل میں آواز ملانے لگی "کوٹوں کی .... پیسوں کی ....آیا تھا . .. . گیا تھا .. . کوٹوں کی........"

"صبح کا سبق یاد کر لیا ہے؟" تحسینہ بولی اور ننی کو جانو بریک لگ گیا۔

"س . ب... و"۔

"ہاں سبق"۔ تحسینہ نے اسی اطمینان سے درشت لہجے میں کہا اور چاقو الگ رکھ تسلا سنبھال چارپائی سے اٹھنے لگی۔

ننی خاموش۔

"نکالو سپارہ اور پڑھنے بیٹھو"۔ اس نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا۔

ننی کا دم خشک، تیزی طراری ساری ختم، سمجھو کوئی قیدی ہو، اس نے بڑی بے چارگی سے آہستہ آہستہ جزدان کھولا۔ وہ انگلیاں وہ ہاتھ جن میں ابھی بجلی سے بیاہ پوچھتے ہوئے بجلی دوڑتی تھی، اب مجبور تھے اور حکم کے پابند۔ اس نے مرے ہوئے دل سے سپارہ نکالا اور ورق الٹ پلٹ کر کے سبق ڈھونڈنے لگی۔

تحسینہ نے امیوں کا تسلا اٹھایا، نیم کے نیچے سے اٹھ کر دھوپ میں پڑی ہوئی چارپائی کے پاس گئی۔ تسلا الٹا اور امیوں کی قاشوں کو کھری چارپائی پہ پھیلانے لگی۔

ضمیر کتاب آہستہ سے بند کر، مونڈھے پہ رکھ، دبے پاؤں باہر ہو لیا۔

گلی خاموش تھی، خاموشی میں گھلی ملی اک بھنبھناہٹ۔ اک گونج کہ کہیں دور شہد کا چھتا ٹوٹنے پر بہت سی مکھیاں بھنبھناتی ہوں۔ گلی میں چھاؤں پھیلی تھی، سوا ان دیواروں اور نالیوں کے جن کے مقابل کے مکان اونچے نہیں تھے۔ ایک کتا کہ جانے کب سے نالی کے گندے میلے پانی میں بیٹھا زبان نکالے ہانپ رہا تھا قدموں کی آہٹ سے باہر نکلا، پورے جسم کو ایک جھٹکا دیا اور گیلے جسم سے بوندیں برساتا ایک طرف کو ہو لیا۔ اپنی گلی سے مڑتے ہوئے کوڑے کے ایک ڈھیر پہ اونگھتی ہوئی مرغیوں نے چونک کر چونچیں اٹھائیں اور 'کڑ' کی ایک دھیمی سی بے ساختہ آواز ہوئی۔ دم بھر کے لئے اسے گمان گذرا کہ بھول کر کسی اجنبی گھر میں کسی زنان خانے میں داخل ہو گیا ہے اور اک دم سے بہت سی نظریں اس پہ اٹھ گئی ہیں۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھ گیا۔ چند قدم چلا تھا کہ پیچھے کسی مرغے نے زور سے بازو پھٹ پھٹائے اور ککڑوں کوں کی آواز بلند کی۔ سامنے دیوار کی سایہ دار منڈیر پہ ایک اونگھتا ہوا سفید براق مرغ چونکا، پھریری لی، زور سے بازو پھٹپھٹائے اور اس سے بھی زیادہ تیز آواز میں بانگ بلند کی۔

گلی سے نکل کر وہ لال مندر کے چوک میں آ گیا۔ لال پتھر جل رہے تھے، پگھل رہے تھے، کنوئیں کی سرخ سنگین من تپ رہی تھی۔ لوہے کی چھوٹی بڑی چرخیاں کہ کنوئیں کے دہانے کے گرد نصب تھیں خشک تھیں، خاموش تھیں۔

پیاؤ کی گلی سے نکلتے ہوئے اسے ٹھنڈک لگی، پر گھڑی بھر میں ٹھٹیروں والی گلی آ گئی جہاں دھوپ اور دھواں تھا اور بے شکل دھاتوں اور پیتل اور تانبے کی بڑی بڑی تھالوں اور دیگچوں اور تنیڑوں پہ پڑتی ہوئی چوٹوں سے یہ شور کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

شور کم ہوتا گیا ، پیچھے گم ہوتے ہوئے رستے میں لپٹتا گیا ۔ کنجڑوں والی گلی میں کالا بچار ایک بیچ میں اڑا کھڑا تھا ۔ کوشش پر بھی جب وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو وہ دیوار سے لگ کر آہستہ آہستہ چلتا ، لاتوں اور سینگوں کی مار سے بچتا ، گلی سے باہر نکل گیا ۔ گلی سے قصائیوں کے محلے میں ، قصائیوں کے محلے سے پکی سڑک کو پھلانگتا ہوا دگڑے میں ، دگڑے سے بھونڑ والے رستے پہ ۔

اسے دیکھ کے گندل کھڑا ہو گیا " ابے ہیرا " ۔ اس نے ہیرا کو پکار کے بلایا " چھوٹے میاں جی آئے ہیں ، کھاٹ ڈال دے "۔

ہیرا چارپائی لئے دوڑا دوڑا آیا ، چارپائی بچھاتے ہوئے بولا "میاں جی چلم پانی لاؤں "۔

" نہیں بھئی "۔

گندل چلم لے کے چارپائی کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گیا ۔ کنواں اس وقت نہیں چل رہا تھا اور گندل اور ہیرا دونوں فارغ نظر آتے تھے۔ گندل نے چلم منہ سے لگائی اور آنکھیں اس کی مندنے لگیں ۔ ہیرا اس کے آگے پہ کچھ زیادہ پرجوش نظر آتا تھا ۔ آنکھوں میں اس کی چمک پیدا ہو گئی تھی اور ایک بے تابی کہ کچھ کہنا چاہتا ہو اور کہہ نہ سکے ۔

" چھوٹے میاں " ۔ آخر اس کی زبان کھل ہی گئی " چھوٹے میاں " یو کہوے ہیں نہ یاں پہ کوٹھی بنو گی ۔ وا کے بعد تو سگرا تبر حویلی سے یہیں پہ آ جایو گا ۔ جدوں بڑے میاں تھے تو یاں پہ گھنی رونک رہوے تھی ۔ کٹائی کے دنوں میں تو سگرے سمیں بس یہ بیٹھے رہو تھے ، لوگن کی بھیڑ جمی تھی ۔ پر وا کے بعد تو .... " ہیرا کی آواز دھیمی پڑ گئی " نام رام کا "۔

وہ چپ بیٹھا رہا ۔ گندل بھی چپ تھا ، آنکھیں بند تھیں اور چلم کے کش جاری تھے۔ ہیرا پھر بولا " تو چھوٹے میاں ، تحصیل دار صاحب اب تو ٹکیں گے ؟ "۔

" ہمیں " اس کی طرف سے گندل نے جواب دیا " پلشن لے رہو ہیں ۔ وا کے بعد یئیں ٹکیں گے " ۔

"تو چھوٹے میاں ، تم بھی پلٹ کے نئیں جایو ؟"

" اللہ کی تو پڑھائی پوری نئیں بھئی ابھی "۔ گندل نے پھر اس کی طرف سے جواب دے دیا ۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں ، کھانسا اور چلم کو ہیرا کے ہاتھ پکڑاتا ہوا بولا "چھوٹے میاں اب تو گھنے برس بیت گیو ، تو تمری پڑھائی کا کب انت ہوئے گا ؟"

"بس تھوڑے ہی دن باقی رہ گئے ہیں "۔ اس نے جواب دیا ۔

مگر گندل اب اس کی بات نہیں سن رہا تھا ۔ اس کی آنکھیں آس پاس کی چیزوں سے ہٹ کر سامنے کے کھیتوں میں پہنچ گئی تھیں ، جہاں ہریالی پہ دھوپ چھاؤں کا کھیل ہوتا تھا ، جلدی جلدی چلتی ہوئی دھوپ ، اس کے پیچھے دوڑتا ہوا سایا : ابر کی ہلکی چادر کھیتوں میں پھیلتی چلی گئی اور دھوپ کھیتوں سے بڑے پیڑوں کی قطار کو چھوتی ہوئی آگے پھلانگ گئی ۔ گندل اور ہیرا دونوں کی آنکھیں اوپر اٹھ گئیں ، اور خود اس کی بھی ۔ اکا دکا تیرتے ہوئے سفید بادل آپس میں گھل مل کر سورج پہ چھا گئے تھے ۔

"گندل" ہیرا آہستہ سے بولا "تو ورت کیا کہوے ہے ۔ میری تو ، گندل ، کنواں چلاتے چلاتے کانچ نکل گئی ۔ اور بوند نہ پڑی تو بیلوں کی بدھیا بیٹھ جاوے گی "۔ اس نے چلم کو آہستہ سے گندل کی طرف بڑھا دیا ۔

گندل نے خاموشی سے چلم کا گھونٹ بھرا ، کھانسا ، پھر سوچ بھرے لہجے میں بولا "ورت اب کے دیر سے ہوگی ۔ جوتشی جی کہئیو تھے کہ یو سال سخت ہے "۔ اس نے پھر چلم کا

گھونٹ لیا اور ھیرا کی طرف چلم طرف بڑھا دی"لالہ یو میں آنچ مندی ھوگئی ۔ آپلا رکھ دے"۔

ھیرا چلم لے کر بھوبھل میں دبے اپلے کے پاس جا بیٹھا ۔ گندل کی آنکھیں پھر مندنے لگیں ۔ آنکھیں مندنے لگیں اور ھونٹ ھولے ھولے ھلنے لگے۔

رات گنوائی سوئے کے دوس گنوایو کھائے
ھیرا جنم امول تھو کوڑی بدلو جائے

گندل کی آنکھیں بند تھیں ، جسم ساکت ، سارے بدن کا جی اواز میں کھنچ آیا تھا کہ دھیرے دھیرے ابھر رہی تھی ، پھیل رہی تھی ۔

چارپائی سے اٹھ وہ آھستہ سے واپس گھر کی طرف ہولیا ۔ کھیتوں سے برسنے کے درختوں پر دھوپ پھر آترآئی تھی ۔ دھوپ پلٹ رھی تھی ، درختوں سے کھیتوں میں اتر رھی تھی اور چھاؤں کی چھاونی اٹھ رھی تھی ۔

گھر میں اس نے قدم رکھا تو دن ڈھلنے لگا تھا اور دالان کے سامنے صحن میں دور تک چھاؤں کی چوڑی پٹی پھیل گئی تھی ، لیکن بڑے کمرے کے دروازے ابھی نہیں کھلے تھے اور خس کی ٹٹی پانی سے اسی طرح سرابور تھی ۔ صحن سے وہ دالان میں آیا اور بڑے کمرے کی طرف بڑھنے لگا کہ جاتے جاتے وہ جھجکا اور اس کا رخ بڑے کمرے سے ھٹ کر بغلی کمرے کی طرف ھو گیا ۔ اندر قدم رکھا تھا کہ امی اور تائی اماں باتیں کرتے کرتے چونکیں ۔

"اے ھئے اس دوپہری میں تو کہاں تھا ؟" امی نے فوراً سوال کیا ۔

"بھونڑ پہ چلا گیا تھا ذرا "۔

"بھونڑ پہ ؟لونڈے ھوش کی دوا لے ۔ قیامت کی لو چل رئی ھے اور شہزادے جنگلوں میں پھر رئے ھیں "۔

"اے ذرا ڈوبا منہ تو دیکھو لال ھو را ھے"۔ تائی اماں نے ٹکڑا لگایا "آبیٹا لیٹ جا ، میں پنکھا کروں "۔

اس نے اس پیش کش کو غنیمت جانا اور جوتے اور قمیص اتار آھستہ سے لیٹ گیا ۔ تائی اماں نے زور زور سے اسے پنکھا کرنا شروع کر دیا ۔ اس کی آنکھیں بند ھونے لگیں ۔

دوپہر کو سب بڑے کمرے ھی میں آرام کرتے تھے کہ وھاں بڑا فرشی پنکھا لگا ھوا تھا ۔ جسے نوری دوپہری بھر کھینچتی تھی ، اور خس کی ٹٹیاں دروازوں پہ کھڑی تھیں ۔ جن پہ تیسرے پہر تک برابر پانی چھڑکا جاتا تھا ۔ لیکن امی اب اکثر بچوں کے سونے کے سہارے بڑے کمرے سے چھوڑ کر بغلی کمرے میں آ جاتیں اور کبھی کبھی تائی اماں بھی وھیں آ بیٹھتیں اور سونے کی بجائے دوپہری بھر باتیں ھوتیں ، کبھی سرگوشیوں میں کبھی بلند آواز سے ۔

" اجی ایک بات ھے " ۔ تائی اماں کہہ رھی تھیں " لونڈا ڈوبی آتی تھی بہت خوش ھے ۔ سارے دن وائی توائی پھرے ھے ۔ بڑھنا یوں ھووے ھے ، بیٹھا مار کے بیٹھے تو بڑھے ۔ آخر آدمی ھے غصہ آ ھی جاوے ھے ایسے بچے پہ " ۔

"تائی اماں یہ تم نے کیا بات کہی"۔ امی جواباً بولیں " شریر آخر کون سا بچہ نہیں ھوتا؟ تمہارا اچھے کم شریر ھے کیا ؟ "

" اے وہ سب سے زیادہ شریر ھے ۔ اتنا جھخواوے ھے مجھے کہ ڈوبا میرا تو سر ھل جاوے ھے " ۔

" تو بس تائی اماں بچے تو شریر ھی ھوا کریں ھیں ۔ پر انہیں جان سے نہیں مارا جاتا ۔ اجی اس نے تو بہن کو دھنک ڈالا ۔ دھے پنکھے پہ پنکھا ۔ میرا تو کلیجہ ھل گیا " ۔

" ہاں ڈوبا ایسا نہرا بھی تھا کہ جان کو جان نہ سمجھے"۔ نانی اماں چپ ہو گئیں۔
امی کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ ہولے سے بولیں " نانی اماں ، اس لونڈیا میں کچھ سنک ہے۔ کام کرے گی تو کام ہی کرے جائے گی۔ جہیز کو پڑھانے بیٹھے گی تو پڑھائے ہی چلی جائے گی جیسے ساتوں علم آج ہی پڑھا کے اٹھے گی"۔

" جس پہ سو سیلی ٹر ہے"۔ نانی اماں بولیں " ساں کچھ کم ہے بس جو سنک سوار ہو گئی سو سوار ہو گئی۔ اور میرا سماں ؟ ۔ اب تو ماشاء اللہ بال بچے ہیں ، ذمہ دار نہیں ہیں۔ جب یہ تھا تب دیکھیں۔ ایسا رنگ تھا کہ جو دن سوار ہے سو سوار ہے۔ ابا سماں سمجھاتے سمجھا کے ہارے پر کیا مجال کہ وہ اپنی ہٹ سے ٹل جاوے"۔

" ہاں جی یہ سب اثر تو ہے مگر نانی اماں یہ بات تو اور ہے"۔ امی کی آواز اور دھیمی پڑی اور سرگوشی میں کہنے لگیں " اجی یہ چھموں آپا اسے کب تک پڑھائے رکھیں گی۔ ماشاء اللہ پوری عمر ہے۔ بیاہ شادی کی فکر کرنی چاہئے اب تو اس کی"۔

" ہاں بی بی عمر تو پوری ہے۔ تمہارے شمیم کی اور اس کی بس تھوڑی چھوٹائی بڑائی ہے"۔

" اجی نانی اماں شمیم سے تو بہت بڑی ہے چھمدہ"۔

" نا بی بی"۔ نانی اماں نے قطعی انداز میں تردید کی " جب وہ پیدا ہوئی ہے تو شمیم پیٹ میں تھا۔ مجھے تو آج کی سی بات یاد ہے کہ جب وہ جھلا نہائی تھی تو تبسم نے کہا تھا نہ تو بی بی ناند تو بٹ گئی ، اب بھاوج کو ساتھ خیر سے کے خدا فارغ کرے۔ اس وقت تجھے ساتواں مہینہ تھا"۔

"جس لونڈیا کے ساتھ تو ڈھائی تین مہینے کی چھوٹائی بڑائی برابر بھی بہت ہووے ہے۔ لونڈیاں جلدی بڑھیں ہیں۔ اب دیکھی نہیں ہو شمیم سے دگنی عمر کی لگے ہے"۔

" ہاں ماشاء اللہ اٹھان اچھا ہے"۔

" آخر کیا سوچ رہی ہیں بڑی آپا ؟ "

" کیا خبر ہے کیا سوچ رہی ہے۔ یہ بھی نہیں ہے کہ معلوم نہ ہوں۔ چچا کا لونڈا موجود ہے۔ ایمان داری کی بات ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد چچا نانا کہاں پوچھیں ہیں۔ مگر وہ ڈوبا تو چھمی کے لئے تڑپے ہے"۔

" لونڈا کرے کیا ہے؟ " امی نے سوال کیا

" کیا بتہ ہے کیا کرے ہے۔ پڑھنا لکھنا جو گا تو وہ ہے نہیں۔ مدار کے مہینے میں بنیاد علی آئے تھے تو میں نے پوچھا کہ ، اجی بنیاد علی تمہارا امداد انٹریس کب کرے گا ؟ ، کہنے لگے کہ ' نانی اماں ' انٹریس بی اے تو آج کل جوتیاں چٹخاتے پھریں ہیں۔ ڈگری کو کوئی نہیں پوچھتا۔ میں نے تو سوچا ہے کہ تمہارے امداد کو پولیس میں بھرتی کرا دوں۔ دو سال میں تھانے داری کا نمبر آجاوے گا۔ بڑی آمدنی کی جگہ ہے۔ ہاں بی بی تھانے دار ہو جاوے تو پھر کیا چاہئے۔ حاکمی ہے وہ تو۔ مٹی خالی ڈگری کو لے کے کیا کوئی چاٹے؟"

" اجی نانی اماں کیا باتیں کرو ہو ، تھانے داریئیں بٹتی تھوڑا ہی پھر رہی ہیں۔ ایف اے بی اے کو تو تھانے داری ملتی نہیں ہے۔ اجڑوں کو کون تھانے داری دے دے گا"۔

" بی بی مجھے کیا پتہ ہے تمہاری ڈوبی تھانے داریوں تحصیل داریوں کا۔ بنیاد علی ہی کہوے تھے"۔

"بنیاد علی چاچا کے کہنے کا کیا ہے۔ وہ تو ایسے ہی شیخئیں بگھارا کریں ہیں۔ مگر خیر ہمیں کیا ، امداد تھانے دار ہو جاوے تو ہمیں کیا برا لگے ہے۔ ہمارے تو گھر کی

بیٹی جا رہی ہے ۔ میں تو جانوں کہ بڑی آپا کو اب سوچنا نہیں چاہئیے ۔ لونڈا ایسا برا تو ہے نہیں ۔ اب تحسینہ کے لئے عرش کا تارا تو آترے گا نہیں "۔

" کیا خبر ہے اس کے دل کی کیا سوچ رہی ہے "۔ تائی اماں بولیں اور ایک ذرا معنی خیز انداز میں " ابا میاں زندہ تھے تو ان کے سامنے بھی کئی دفعہ ذکر آیا ، تو چپ ہو ہو گئے ۔ وہ جیسے کہ سوچتے تھے "۔

کمرے کا دروازہ ہوا کے ایک تند جھونکے کے ساتھ دھاڑ سے کھلا اور تڑاخ سے بند ہو گیا ۔

" آندھی آ رہی ہے "۔ تائی اماں بے ساختہ بولیں ۔

اس نے بھی چونک کر آنکھیں کھول دیں ۔ دالان میں اور آنگن میں زردی کھنڈی تھی ۔

" کپڑے اٹھاؤ اپنے اپنے ، زور کی اندھیاری ہے "۔ بڑی آپا صحن سے چلا رہی تھیں ۔

تائی اماں ، امی ، سب کے سب باہر نکل گئے اور الگنی پہ پڑے کپڑے اور چارپائیوں پہ بکھرے بستر لپک جھپک اٹھنے لگے ۔

" اچھے ، او اچھے اندر آجا " تائی اماں اچھے کا ہاتھ پکڑے ہوئے اندر دالان میں آ گئیں ۔ پھر پکارنے لگیں " بی بی اندر آجاؤ ، کالی آندھی ہے یہ تو "۔

آندھیوں کا ایک تانتا بندھ گیا تھا ۔ ہوا چلتے چلتے بند ہو جاتی ، بڑی آپا کے ہاتھ میں سبز اور سرخ لہریوں والا پنکھا تیزی سے گردش کرنے لگتا ۔ فاختہ بولتے بولتے نیم کی ٹہنیوں سے بازوؤں کی ایک میٹھی پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ اٹھتی ، چرخ کھاتی ، اور فضا میں تیرتی تیرتی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ۔ ' کواؤ کواؤ ' کی نشیلی شیریں آواز کہ جانے کون سے نیم کے پیڑ کی کونسی گھنی ٹہنی سے ہوا کا جھونکا بن کر اٹھتی اور گرم تپتی فضا میں ٹھنڈک کی ایک لکیر کھینچتی چلی جاتی ۔ ٹھنڈک کی لکیر کھنچتی چلی جاتی گہری ہوتی چلی جاتی ، پھر ایک دم سے کواؤ کی آواز بند ، ٹھنڈک کی لکیر غائب ۔ تائی اماں پنکھا بڑی آپا کے ہاتھ سے لے لیتیں " بی بی بڑی گرمی ہے ۔ ہوا بند ہو گئی "۔ اور بڑی آپا دفعتاً اس سے مخاطب ہوتیں " ضمیر تم یہاں کیوں بیٹھے ہو ۔ اندر دالان میں جا کے لیٹ جاؤ ۔ ہر وقت پڑھنا ہر وقت پڑھنا ۔ ڈوبا پڑھنا نہ ہوا وبال جان ہو گیا ۔ اور ایسے میں تائی اماں کا پنکھا جھلتا ہوا ہاتھ ڈھیلا پڑ جاتا اور آنکھیں آسمان کو تکنے لگتیں ، کھوئی کھوئی آواز میں ، جس میں آمد کے ساتھ ساتھ اندیشے کی بھی ایک خفیف سی کیفیت ہوتی ، کہتیں " آندھی آ رہی ہے " ساری کی ساری نظریں ایک دم سے اوپر اٹھ جاتیں ، جہاں آسمان پیلا پیلا نظر آتا ، اور اس کے سائے میں بہت سی چیلیں آہستہ آہستہ دائرے بناتی ہوئیں ، نشے میں نڈھال ناچتیں غش کھاتیں ۔ پھر اچانک سے نیم کی ٹہنیوں میں ایک ہیجانی لرزش ہوتی اور کسی گھنی ٹہنی میں کوئی چھپا کوا چونک کر ' فس ' کرتا اور پتوں کے ہرے پردوں سے نکل کر باہر آتا اور چیختا چیختا کووں کے شور مچاتے بھاگتے دوڑتے سراسیمہ غول میں جا شامل ہوتا ۔ چڑیوں اور کووں کی سراسیمگی بیچ آترتی اور مرغیوں کو چونکاتی کہ ان کی گردنیں ایک دم سے ' قاں ' کی دھیمی سی آواز کے ساتھ کھڑی ہو جاتیں اور کان فضا میں کچھ سننے کی کوشش کرتے ۔ پھر یہ گھبراہٹ انسانوں پر اپنا اثر دکھاتی ۔ دوسری دوسری منزل پر کسی کھلے دریچے کے کنواڑ ایک اچانک شور کے ساتھ بند ہو کر کھلتے اور پھر بند ہو جاتے " میاں آندھی آ رہی ہے "۔ اور یہ آواز کوٹھوں کوٹھوں بلند ہوتی چلی جاتی ۔ قریب و دور پھیلی ہوئی کچی پکی چھتوں سے چارپائیوں کے بستر اور تاروں پہ پڑی ہوئی سفید سفید چادریں اور نیلی پیلی ساڑھیاں اور دھوپ میں سوکھتے ادھ گیلے نیلے گلابی فیروزی دوپٹے گرد میں اٹنے لگتے اڑنے لگتے ، اور بوڑھیاں اور لڑکیاں بالیاں لپک جھپک دوپٹے اور ساڑھیاں تاروں

سے اُتار بستر سروں پہ رکھ منڈیریں پھلانگتیں سیڑھیاں اُترتیں نیچے آنے لگتیں ، اور کمروں کے دروازے اندر سے بند ہونے لگتے کہ اتنے میں دیکھتے دیکھتے ساری فضا میں زردی گھنڈ جاتی اور سنّاٹے جھکاٹے چلنے لگتے۔

آندھی کا کوئی وقت مقرر نہ تھا ، کبھی عین دوپہر میں آسمان پیلا پڑنے لگتا ، کبھی سہ پہر کو تو کبھی شام کو ، اور پھر سہ پہر کا وقت مقرر سا ہو جاتا کہ بند ش ہوتے وقت نہ آسمان میں زردی کا ایک ہالہ نمودار ہوتا اور اس کے سائے میں نسے سے نڈھال ناچتی اونگھتی چیلوں کے حلقے ۔ مگر کسی دن ساری ٹوٹتی اور رات کو سوتے سوتے فضا میں کہیں دور ایک سنسناتا شور اُٹھتا اور آگے بڑھتا سنائی دیتا اور آنکھیں ابھی اچھی طرح کھلنے نہ پاتیں کہ اندھیری البتی اور آنگنوں اور چھتوں اور کوٹھوں پہ نیند کا باندھا ہوا طلسم تیزی سے ٹوٹتا جاتا ۔ نہ کوئی رنگ مقرر تھا کہ عام طور پر تو پیلی ہی ہوگی ، لیکن کسی کسی دن ایکا ایکی بلائی میں کالونس لیے چلی جاتی ، اور تیسرا پہر ہوتے ہوتے اتنا اندھیرا ہو جاتا کہ دکانوں اور مکانوں میں لالٹینیں جل جاتیں ۔

آندھی سہ پہر کو آتی ، شاموں کو آتی ، آدھی آدھی راتوں کو اُٹھتی ، مگر اس کا ثمر ہمیشہ صبح کو ظاہر ہوتا کہ گلیوں میں کنجڑے جھڑی ہوئی امیوں کے ٹوکرے کے ٹوکرے لے کر آتے اور آموں کا مال ٹکوں میں بیچ کر جاتے ۔ کل کی کالی آندھی نے امیاں ہی نہیں امیوں کے لدے پھندے تناور درخت گرائے تھے ۔ حویلی میں چارپائی پہ امیوں کا ڈھیر لگا تھا اور تائی اماں اور بڑی آپا کے ہاتھوں میں چاقو در در چل رہے تھے ۔

" سنیں ہیں کہ ایک پتھر تین من کا شیخوں کی ٹال میں پڑا تھا وہ اُڑ گیا ، اور اُڑ کے ایک دھنبور کے گھر پہ جا پڑا ۔ ڈوبے کا چھپر گر پڑا " ۔

بڑی آپا حیران ہونے لگیں " تائی اماں مجھے تو یقین نہیں آتا " ۔ پھر ضمیر سے مخاطب ہوئیں کہ اس کی سائنس دانی پر ان کو پورا اعتبار تھا اور جب کوئی بات انہیں خلاف عقل معلوم ہوتی تو اس سے رجوع کرتی تھیں " ضمیر میاں ، تم نے تو سائنس پڑھی ہے ۔ تم بتاؤ تین من کا پتھر کہیں اُڑ سکے ہے " ۔

تائی اماں نے ضمیر کو بولنے کی مہلت نہیں دی " ہم تمہاری ڈوبی اینس سینس ، کو تو جانتے نئیں ہیں ، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے ، بڑھیا کنجڑی امیں لے کے کل تو آوے گی ہی ، پوچھ لیجو ۔ اے ماں ڈوبی کی نند کا لونڈا آندھی میں اُڑ گیا ، اب اسے بھی جھوٹ بتا دو ۔ ڈوبا کھیت کے پاس کھیل رہا تھا ۔ کمبخت باپ کو دیکھو کہ آندھی آئی تو ترکاری کے جھمبے تو اُٹھانے لگا ، لونڈے ڈوبے کی سدھ نہ لی ۔ آندھی میں اُڑ گیا ۔ اب تک تو ملا نئیں ہے " ۔

بڑی آپا نے پھر تامل کیا " عمل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ اتنا بڑا لونڈا اور آندھی میں اُڑ جاوے " ۔

" بی بی عقل میں کونسی بات آوے ہے " ۔ تائی اماں کہنے لگیں " یہ تو حیرت کا کارخانہ ہے ۔ میری تو کالی آندھی کو سوچ سوچ کے ہی عقل حیران ہووے ہے ۔ بس اس کے بھید ہیں وہی جانے " ۔

" تائی اماں " نبی بولی " آپ کہہ رہی تھیں کہ کالی آندھی میں پریئیں ہو ویں ہیں " ۔

" بیٹی میں تو یہ کہہ رہی تھی ، ہم نے تو ایسا ہی سنا ہے ، کمبختی ماری سینس جھوٹ بتاوے ہے تو بتاتی رہے ، کہ راجہ اندر کا تخت نکلے ہے ، آگے جن پیچھے جن ، ساتھ ستر بلائیں ، تخت پہ راجہ اندر اور ارد گرد پریوں کا حلقہ " ۔

" تائی اماں " نبی سوچتے ہوئے بولی " میں بتاؤں لونڈے کو کون لے گیا ۔ اسے پریئیں اُڑا کے لے گئیں " ۔

بڑی آپا گرم ہوگئیں " اسے دیکھو کیسی باتوں کے مٹکے ڈھاتے ہے - سبق تو نے لیا آج ؟ اری تحسینہ تو نے سبق دیا ہے اسے ؟ "

بنی کو جالو سانپ سونگھ گیا -

" بنی ادھر آؤ ، سناؤ سبق " - تحسینہ کی تحکمانہ آواز باورچی خانے سے آئی -

تائی اماں کی باتوں کا تار ٹوٹ گیا تھا اور چاقو ہاتھ میں پھر تیزی سے چلنے لگا تھا " اب تو اسیا میں گٹھلی پڑ گئی ہے - آم اب آیا ہی ہوتا " -

" آم تو آ گئے ہیں ، چپچپے ہیں " - بڑی آپا بولیں " بوند پانی کی پڑے تو آم میں رس پڑے " -

کبریاں اماں ٹھیں ، اسیوں میں بجلی پڑی ، بجلی جالی تھی ، اور جالی نے گٹھلی کی وضع لی - آسمان بدستور دانتیا بنا ہوا تھا ، اور آم اسی طرح چپچپے تھے - اوپر سے بوند نہیں پڑی اور اندر سے رس نہیں پھوٹا - روز اسی انداز سے سورج چڑھتا اور حویلی کے وسیع آنگن میں دھوپ اور چھاؤں کی آویزش شروع رہتی ، چھاؤں پیچھے ہٹتے ہٹتے ہم کے نیچے سمٹ آتی اور سورج سر پر آ جاتا : ڈیڑا اٹھتا اور سب کے سب بڑے کمرے میں ، نیم اندھیری فضا ، گردش کرتا ہوا فرشی پنکھا ، دروازوں پہ لگی ہوئی خس کی بھیگی بھیگی ٹٹیاں ، آنکھوں میں اور بدن میں ٹھنڈک اترنے لگتی - فرش پہ پہلے دستر خوان بچھتا ، پھر اسی فرش پہ لیٹے لیٹے بڑی آپا اور تائی اماں اور امی اونگھنے لگتیں - " بی بی ، یہ مجھے تو ذرا آنکھ نہیں لگنے دیتے " - تائی اماں اونگھتے اونگھتے چونک پڑتیں - بڑی آپا بنی کو ڈانٹتیں " اب تو سو رہنے گی نہیں ؟ " اور تائی اماں زبردستی اچھے کو اپنی بغل میں لٹا لیتیں - ان کی آنکھیں پھر بند ہونے لگتیں - رفتہ رفتہ فرش پر لیٹے ہوئے سب لوگوں کو نیند آ لیتی - بہت دیر بعد خراٹے لیتے لیتے بڑی آپا چونکتیں " کیا بج گیا ضمیر ؟ " " ڈھائی " اور بڑی آپا کی آنکھیں پھر بند ہونے لگتیں - پھر آپ ہی آپ تائی اماں ، آنکھ کھل جاتی ، اسی طرح لیٹے ہوئے کواڑ ذرا کھول کے باہر دیکھتیں " دھوپ ہے ابھی تو " - اور غنودگی انہیں پھر آ لیتی - فرشی پنکھا اسی ایک رفتار سے گردش کرتا رہتا ، گردش کرتا رہتا ، مگر پھر نوری کے ہاتھ ڈھیلے پڑنے لگتے اور آنکھوں میں نیند اترنے لگتی ، ایک جھپکی آئی ، پنکھا بند ، پھر آپ ہی آپ چونک پڑتی ، اور پھر پنکھا چلنے لگتا بڑی آپا سوتے سے ایک ساتھ اٹھ کے بیٹھ جاتیں ، کواڑ کا ایک پٹ کھول کے دیکھتیں اور گھبرا اٹھتیں " ائے ہئے دھوپ چبوتری پہ پہنچ گئی - ظہر کا وقت گذرا جا رہا ہے " اور آہستہ سے کواڑ کھول باہر نکل جاتیں -

آنکھ اس کی لگتی اور کھل جاتی - تائی اماں اور بڑی آپا کی مانند نیند اسے کب آتی تھی - پہاڑ سا دن کٹنے میں نہ آتا اور لمبی دوپہر لمبی ہوتی چلی جاتی - باوا ایک تکیہ لمبے اور گاؤ تکئے کے سہارے آدھے لیٹے آدھے بیٹھے عینک آنکھوں پہ لگا پھر کاغذ پڑھنے شروع کر دیتے - تحسینہ کروٹ لیتی ، چوڑیوں کا ایک میٹھا مدھم چھناکا ہوتا ، وہ اٹھ کھڑی ہوتی - امی آنکھیں کھول دیتیں " بیٹی تجھے دوپہری میں بھی قرار نہیں ہے - گھڑی بھر کو تو آرام کر لیا کر " - " ممانی جی کلپ کل سے مؤا خراب ہو رہا ہے - دوپٹہ دھو کے رنگ ڈالوں آج - آپ کا دوپٹہ بھی دھو دوں ، بہت میلا ہو رہا ہے " - " ہاں کلپ بچے تو اسے بھی دھو دیجو " - امی لیٹے لیٹے دوپٹہ اتارتیں اور تحسینہ کو پکڑا دیتیں -

بند اندھیرے کمرے میں لیٹے لیٹے اس کا دم الٹنے لگتا - آہستہ سے اٹھتا اور باہر نکل آتا - طپش سے تپتا دالان آباد دکھائی دیتا - کمرے کے دروازوں پہ ٹنگی ہوئی پانی میں شرابور خس کی ٹٹیاں کہ پانی ان سے رس رس کر دالان میں بہتا ہوتا ، پانی سے لبا لب بھری ہوئی ناند ، جس کے پانی میں اچھے اور بنی چھپا کے لگاتے ہوتے اور پھر ایک ساتھ جھوڑ جھاڑ دالان

سے جھو ہو جاتے ، دالان کے بغلی در میں بیٹھی ہوئی تحسینہ ، پاس خشکے کی بیچ سے بنا ہوا کلف بھگونے میں رکھا ہوا ، اُجلے میلے دوپٹے ، صابون ، پڑیاں ، اور کاغذ کی پڑیوں میں بندھے ہوئے رنگوں کے منحملہ ململ کی دھجی میں لپٹی ہوئی فیروزی رنگ کی ڈلی کہ اُس سے نکلتی سنہری لہر دور سے چمک مارتی ۔ تسلے میں کلف انڈیلنا اور دوپٹے کو خوب مل مل کر دھونا پھر کھنگال کر تسلے میں اُجلا پانی انڈیلنا اور رنگ رنگ کی پڑیا گھول کر دوپٹہ رنگنا ، نچوڑنا ، تہیں کھول کر جھٹکنا اور آنگن میں تنی ہوئی الگنی پر دھوپ میں پھیلا دینا ۔ خربوزوں کے گودے سے بھری ہوئی مڑی ہنڈیا اُٹھا لانا اور گودے کو اتنا ملنا اتنا ملنا کہ بیج گودے سے الگ ہو جاتے کہ تب انہیں پتیل کی چھانی میں ڈال کر پانی کا لوٹا اُٹھا تڑ یڑے دیتی کہ وہ چاندی سے چمکنے لگتے ، کچھ بیجوں کو ہرا رنگنا کچھ کو سرخ اور اُن کے ہار گوندھ لینا ۔

کبھی دالان کے کسی کونے میں پٹ سے آواز ہوتی ، دونوں چونک کر ادھر دیکھتے ، اور اُسی دم اچھے اور بنی جانے کہاں سے ایک دم سے داخل ہوتے اور شور مچانا شروع کر دیتے " تیلیا راجہ ، اجی تیلیا راجہ......ضمیر بھائی دیکھو تیلیا راجہ "۔ واقعی جیسے تیل میں ڈوبا ہو ، کالی چمکتی ڈلی سی ، تیلیا راجہ بھن بھن کرتا دیوار سے ٹکراتا ، ٹکرا کے زمین پہ ٹپ سے گرتا اور اپنے سوراخ سے سڑم تیز مٹی کریدنا سروع کر دیتا ۔ تیلیا راجہ کا ہنگامہ پرور ڈرامائی عمل ابھی جاری ہوتا کہ اچھے کی نظر بھٹکتی اور دالان کے بغلی در میں ایک بڑیا آہستہ آہستہ رینگتی بھٹکتی دکھائی پڑتی ، جو دالان سے نکل آنگن میں پہنچتی اور تیرتی تیرتی اوپر اُٹھنے لگتی ، یہاں تک کہ سامنے والی دیوار کی منڈیر کو چھوتی معلوم ہوتی ۔ " بڑیا ، بنی بڑیا "۔ اور اچھے اور بنی دونوں دالان سے نکل آنگن میں ہوتے ہوئے تیر کی طرح زینے میں داخل ہوتے اور گم ہو جاتے ۔ پھر وہی بھائیں بھائیں کرتا دالان اور پھر وہ اور تحسینہ اکیلے ۔ اکیلے لمحے جن کی وہ تمنا کرتا رہتا لیکن آئے تو وہ کتنے سخت گزرتے ، ایک گو مگو کی کیفیت ، دھڑ دھڑ کرتا دل : اور تحسینہ اُسی انداز سے گویا اُسے کسی بات کی خبر نہیں گودے میں سنے خربوزے کے پیلے گدلے بیجوں کو ملتی رہتی ، ملتی رہتی مگر پھر آپ ہی آپ اُس کی گردن پہ پسینے کے اُجلے قطرے اُبھرنے لگتے اور بیج صاف کرنے کا شغل ایک مشینی عمل بن جاتا ، لگتا کہ اس کے ہاتھ اُسی انداز اُسی رفتار سے بیجوں بھرے گودے کو کھجوتے رہیں گے کہ اچانک وہ ہاتھوں کو تڑ یڑے دیتی اور اُٹھ کھڑی ہوتی ۔ اُٹھتے اُٹھتے کہ رخ اُس کا آنگن کی طرف ہوتا اُسے اُڑتی نظر سے دیکھتی ، چلتے چلتے بظاہر سادگی سے کہتی " بہت طش ہے ، کیوں بیٹھے ہو گرمی میں یہاں ؟ " تپتے دالان میں بیٹھے رہنے کا کوئی عذر اُس کے پاس نہ ہوتا ۔ وہ چپ چاپ اُٹھ کھڑا ہوتا اور کبھی اندر بڑے کمرے میں چلا جاتا اور کبھی باہر ہو لیتا ۔

باہر جاتے جاتے اس نے عذر پیدا کیا ۔ " تحسینہ "۔

تحسینہ ٹھٹک گئی ۔

" پیسے دے دو کچھ "۔

دالان سے نکلتے نکلتے وہ مڑی اور بغلی کمرے کی طرف ہو لی ۔ پیچھے پیچھے وہ ۔ پھر وہ آہستہ سے اندر آ گیا ، بغلی کمرے میں صندوق کے پاس جہاں وہ پیسے نکال رہی تھی ۔ اُجلے موتی سے قطرے گردن پہ پھر اُبھرے لگے اور گردن پر پڑے ہوئے اکا دکا بال بھیگنے لگے اور ہاتھ جلدی جلدی کپڑوں کو اُلٹنے پلٹنے لگے ۔ کپڑوں کے نیچے سے اس نے روپیوں کی صندوقچی نکالی ، ایک روپیہ نکال کے اُسے دیا کہ وہ لمبی گوری اُنگلیاں اس کے ہاتھ کے برابر آ گئیں ، اور پھیلے ہوئے ہاتھ میں نادانستہ ایک ارادہ پیدا ہوا ، ایک جنبش ، مگر پھر وہی رکاوٹ کی کیفیت ۔ وہ صندوق بند کر آہستہ سے باہر نکل گئی ۔

دھلیز میں وہ چند لمحے چپ چاپ کھڑا رہا ۔ دل اُس کا آھستہ آھستہ دھڑکنے لگا تھا ۔ کھڑا رہا ، پھر جی ڈھیلے لگا ۔ کمرے سے نکل دالان میں آیا کہ اب خالی تھا اور دالان سے سونا ہوا باھر نکل گیا ۔

سرخ پتھروں والا مندر دور سے آنچ دے رھا تھا ۔ بہت اونچائی پہ اندھیری کھڑکی میں اگی ہوئی وہ لوھے کی چرخی کہ صبح و شام مسلسل گھومتی اور شور کرتی تھی اب شانت تھی ۔ مندر والی گلی سے نکل بیاؤ کی گلی میں ، بیاؤ کی گلی سے نکل رہا تھا کہ لڑکوں کی ایک بےھنگم ٹولی نے رستہ اس کا روک لیا ۔ کالے کلوٹے لڑکوں کے اس غول میں گورے چٹے لونڈے بھی تھے لیکن منہ پہ توے کی سیاھی مل کر سب ایک سے ہو گئے تھے ۔ بعض نے بس قمیص اتارنا کافی جانا تھا ، بعض نے کہ بہت چھوٹے تھے سب کپڑے اتار اپنے تئیں ننگا کر لیا تھا ۔ کچھ نے کپڑے اتار لنگوٹ کہ اُن کے جسم سے ھمرنگ تھے باندھے ہوئے تھے ۔ بیچ سڑک پہ کھڑے ، ھاتھوں میں چھڑیاں اور چھوٹے چھوٹے ڈنڈے ، ڈنڈے بجاتے شور مچاتے

کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے

کوڑی کھیت لگائے گا　　　برسے گا برسائے گا

کوڑی گئی ریت میں　　　پانی گیا کھیت میں

بیچ سڑک پہ رکھی ہوئی تھالی ، تھالی میں ایک دو دھیلیاں بہت سے پیسے کچھ دھیلے ، ھر آنے جانے سے مطالبہ کہ تھالی میں پیسے ڈالو ، دلیا پکائیں گے ، مینہ کی دعا کریں گے ۔

تھالی میں اکنی ڈالی تو لڑکوں نے رستہ چھوڑا اور وہ آگے بڑھا ۔ مگر اب اس کے قدم نہیں اُٹھ رھے تھے ۔ قدم کہ رک گئے تھے مڑے اور آگے جاتے جاتے وہ پلٹ پڑا ۔

شام کو دسترخوان پہ بڑی آپا کو پھر ضمیر کی فکر ہوئی ۔ ” اری تحسینہ ضمیر کو بلا کے لانا کہ کھانا کھاؤ بھیا “ ۔

تحسینہ رکی ، پھر رک کر قریب گئی ” کھانا “ ۔ اس نے آھستہ سے کہا ۔

ایک اونگھ سی اس پہ طاری تھی اور سر مونڈھے کی پشت پہ ڈھلکا ہوا تھا ۔ آنکھیں اسی طرح بند رہیں ، آھستہ سے جواب دیا ” بھوک نہیں ھے “ ۔ چپ ۔ پھر آنکھیں کھولیں ، بولا ” طبیعت خراب ھے مری ، کھانا نہیں کھاؤں گا ۔

تحسینہ خاموشی سے مڑی اور واپس بڑے کمرے میں ۔

اُس کی طبیعت واقعی خراب ہو گئی تھی ۔ امی نے اس کی پیشانی کو چھؤا ، اس کی کلائی کو دیکھا ، بولیں ” بدن ذرا گرم ھے “ ۔

تائی اماں کو امی کے اس بیان سے تشفی نہیں ہوئی ۔ خود ماتھے اور گالوں کو چھو کے دیکھا ، بولیں ” بہو کیسی باتیں کرے ھے ۔ لونڈا تو بخار میں بھن را ھے “ ۔

بڑی آپا نے اپنے طور ماتھے اور رخساروں کو چھوا ، انگلیاں ماتھے پہ رکھیں ، پھر پورا ھاتھ گال پہ رکھا ، بولیں ” بی بی ، بدن جھنک را ھے “ ۔

” میں تو جانوں لوں لگی ھے “ ۔ تائی اماں بولیں ۔

” اجی لوں تو لگنی ھی تھی “ ۔ بڑی آپا کہنے لگیں ” دوپہریوں میں مارا مارا پھرے ھے ۔ برسوں میں بھتیجا آیا تھا ، پھوپی کے پاس بیٹھتا ، باتیں کرتا ۔ مگر مجنوں وہ ایک دن میرے پاس آ کے نہ بیٹھا ۔ جنیں کیا ہو گیا ھے پردیس جا کے ۔ بہو تم کیوں لے آئیں اسے ۔ اس کا جی نہیں لگتا یاں “ ۔

” بی بی پہلے تو ایسا نہ تھا “ ۔ تائی اماں بولیں ” جب یاں تھا تو ھر وخت بڑی آپا بڑی آپا کرے تھا “ ۔

۳۶۹۳۸

"بہنوں ، وہ تو پردیس میں جا کے بدلا ہے" ۔ پھر بڑی آپا نے تحسینہ کو پکارا "تحسینہ ، اری ایسا ہے کہ نی ۔ جلدی بنا بنّا ہونے کے لئے"۔

بخار گرا کے آیا ۔ شروع میں بے ہوشی ہوئی کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا ۔ ٹک ہوش آتا تو دھندلا دھندلا احساس ہوتا کہ ہاتھوں پیروں پہ مالش ہو رہی ہے ۔ آہستہ آہستہ پھر غنودگی آ لیتی اور پھر وہی بے خبری ۔

دو دن غفلت رہی ۔ تیسرے دن ہوش آیا تو ساتھ اس کے بخار بھی ٹوٹنے لگا ۔ پسینہ ایسا آیا کہ کرتا تر بتر ہو گیا اور بڑی آپا ماتھے اور گردن اور گلے کو آنچل سے پونچھتے پونچھتے تھک گئیں ۔ وہ حسِ التذاذ اسی طرح باقی تھی ۔ سر خالی خالی لگتا تھا اور زبان پہ اسی طرح دانے سے جمے تھے ۔

نانی اماں اور بڑی آپا اور اسی دوپہر کی چند گھڑیاں جانیں کس مشکل سے بڑے کمرے میں گزاری تھیں۔ چھت میں لٹکے ہوئے جھالر والے لمبے پنکھے سے زیادہ انہیں نم کی ٹٹیوں سے چھن کر آنے والی ہوا زیادہ بھاتی تھی ۔ لو چلنے لگتی اور دھوپ کی طپش تیز ہو جاتی تو نیم کے نیچے سے اٹھ کر اندر جا بیٹھتیں ، لیکن تک دھوپ ڈھلی اور وہ پھر اپنی ٹھیک پر ۔ سو دن ڈھلا تو وہ بہ باہر نکل آتیں مگر اس پر پابندی تھی کہ شام سے پہلے باہر نہ آئے ۔ دروازہ اسی انداز سے بند تھا اور خس کی ٹٹی اسی طرح پانی میں شرابور تھی ۔ البتہ روشندان سے شعاع ایک جھک کے اندر چلی آئی تھی اور کمرے کے اندھیرے میں ایک سنہری تارہ بھری لکیر تن گئی تھی ، جو پتہ دیتی تھی کہ سورج کا رخ بدل چکا ہے ۔ نوری اندھی سوتی آدھی جاگتی ایک ہی رفتار ایک ہی انداز سے پنکھے کی ڈوری کھینچے جاتی تھی کہ اس میں کبھی کبھی اس کے اونگھ جانے سے جھٹکا آتا اور ہوا کے بہاؤ اور کندوں کی گردش سے پیدا ہونے والے یکساں ترنم میں ایک پھندا پڑتا ، پر وہ فوراً چونک اٹھتی اور ڈوری کی گردش اور ہوا کا بہاؤ اور کندوں سے نکلنے والی آواز پھر اسی مقررہ ڈگر پہ آجاتی ۔ تحسینہ نے اس کے سر میں کاہو کے تیل کی مالش زور زور سے شروع کی تھی ، مگر اب اس کی رفتار بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی اور گھنے گرم بالوں میں گردش کرتی ہوئی انگلیاں پنکھے کی نیند بھری رفتار سے رفتار ملا کر آہستہ آہستہ سرسرا رہی تھیں ، رینگ رہی تھیں ۔ اس پہ نیم غنودگی کا عالم تھا ۔ پچھلے دو دن ، غشی اور نقاہت کے گرم دھند میں ڈوبے ہوئے دن اب سپنے سمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے یاد ، آتے جا رہے تھے : گورے پوروں میں تھرمامیٹر کی شیشے کی شفاف نلکی کہ اس کے ہونٹوں میں آجاتی اور پھر وہ لمبی انگلیاں اسے جھٹک کر بلند کرتیں اور آہستہ سے ایک چاندی سے چمکتے خول میں بند کر دیتیں ۔ ہاتھوں اور پیروں پہ ہوتی ہوئی مالش کہ ایک ہی رفتار سے دیر تک جاری رہتی یہاں تک کہ تلوؤں کو ملتی ہوئی نرم پوٹلی تھم جاتی اور نانی اماں کی کلائیوں میں پڑی ہوئی چاندی کی چوڑیاں بجتیں اور خاموش ہو جاتیں ، یا کبھی کبھی اس کی ہتھیلی پہ گردش کرتی ہوئی نرم رسیلی پوٹلی ٹھٹکتی اور ریشمیں سہری چوڑیاں چھن سے بول اٹھتیں ۔ ہتھیلی پہ گردش کرتی ہوئی نرم رسیلی پوٹلی ، ہاتھ کو چھوکے سے نہاتے ہوئے مخملیں میٹھی انگلیاں ، ریشمیں سہری چوڑیوں کے ہلکوروں سے رستا ہوا نرم ترنم ، اور ایک خواب حواس پہ اس کے چھایا ہوا ، ایک شیریں غشی ، ایک شہد آمیز نشہ ۔ وہ شیریں خوابی کی کیفیت پھر جاگ رہی تھی ۔ لذت سے لبریز ہلکی پتلی بدلیاں حواس پہ پھر امنڈ رہی تھیں ۔ جی چاہتا تھا کہ انگلیاں وہ یونہی بالوں میں سرسراتی رہیں ، اور وہ یونہی آنکھیں موندے آدھ نیندی کیفیت میں پڑ رہے ۔ نیند بھری کیفیت کچھ گہری ہوئی ۔ شعور میں اس کے شہد سا گھل رہا تھا اور حواس پہ خواب کی ایک پہلی تہہ چڑھتی جا رہی تھی ۔ بغیر کسی ارادہ کسی نیت کے سیدھے ہاتھ کو

اس کے حرکت ہوئی اور آہستہ سے سرہانے کی طرف بڑھ گیا ۔ کاہو کے نیل میں ڈوبے ہوئے گھنے گرم بالوں میں رینگ کر انگلیاں اس کی گردش کرتی ہوئی گوری انگلیوں میں پیوست ہو گئیں ۔ گردش کرتی ، انگلیاں ٹھٹکیں ، جہاں کی تہاں جمی رہ گئیں ۔ جہاں کی تہاں جمی انگلیاں پگھلنے لگیں ، بہنے لگیں ۔ آگ نے آگ سے طپش پکڑی ، گرم سیال رو ایک انگلیوں سے انگلیوں میں منتقل ہوتی ہوئی ، نشیب سے ابھر کر نشیب میں بہتی ہوئی : الگ الگ بہتی ندیاں امنڈ کر کناروں پہ سے بہہ نکلی تھیں ، ایک دوسرے میں بہنے لگی تھیں ، گھل مل کر ایک رخ بہہ رہی تھیں ۔ کالے لمبے بالوں کی گرم گھنیری سے نکل کر جکڑے ہوئے ہاتھ ہونٹوں کے قریب آ گئے ۔ حنائی نگھانی گوری انگلیاں تپتے ٹوٹتے بخار والے تپتے کانپتے ہونٹوں پاس آ کانپیں ، ہونٹوں سے نکلتے گرم سانس میں بہہ نکلیں ، مگر ایک ایکی وہ بے قابو ہو اس گرم گرفت کو چھڑا کر نکلیں ۔ وہ سرہانے سے ایک ساتھ بڑ بڑا کر اٹھی اور چل کھڑی ہوئی ۔

دور ہوتے ہوئے قدموں کی چاپ کے ساتھ دروازہ عجلت میں کھلا اور بند ہو گیا ۔ آنکھیں اس کی اسی طرح بند ہوئی تھیں ، مگر حواس پر چھائی ہوئی خواب کی گہری ہوتی ہوئی گھٹا ٹوٹ گئی تھی ۔

(۴)

صبح ایکھ اس کی سویرے منہ اندھیرے کھلی کہ بڑی آپا اپنی نماز کی چوکی پہ تھیں اور ان کی پر سوز رقت بھری آواز مولا علی ، و لی علی ، ادساہ علی ، صحن میں پھیل رہی تھی ، رقت کی یہ کیفیت کہ بڑی آپا کا جسم پگھل رہا ہے اور کوئی دم جاتا ہے کہ وہ بہے گا اور صبح کے پاکیزہ دھندلکے میں حل ہو جائے گا ۔

گھر سے نکلنے یہ کہ آج بیماری سے اٹھنے کے بعد کئی دن میں قدم باہر نکالا تھا اور دور کے نڑکے میں ٹہلنے چلا تھا اسے ساری فضا نئی نئی نظر آتی اور اجلی ، لال منڈیر کہ جس کی مانند درختے والی چرخی مسلسل گردش میں تھی ، لمبی ڈوریوں میں بندھی ہوئی چھوٹی بڑی بیل کی گڑویاں اور لوہے کی ڈولچیاں کہ تیزی سے نیچے جاتیں ، کنوئیں کے اندھیرے میں گم ہو کر کھنکھناتیں اور پانی سے لبالب بوندیں ٹپکاتیں پھر اسی درختے میں جھپٹ جاتیں ، ٹھٹھیروں والی گلی کہ ابھی دکانیں بند اور فضا شور سے پاک تھی ، بس ایک بھنگن جھاڑو دیتی تھی ، جس کی جھاڑو سے اڑتی ہوئی گرد نے گلی سے ایک نرم زوصبح دھند کا غلاف چڑھا دیا تھا ، گلیوں سے پرے بستی سے باہر جاتی ہوئی وہ سمند کنکروں والی گاڑ گڈھوں والی پہلی سڑک بھی جس پہ چلتے ہوئے پیر اس کے گٹوں تک خاک میں اٹ چلے تھے ، اور بستی کی انتہا پر کھڑا ہوا سرخ ارنڈوں والا موٹا مٹھس سیون ، رات کی رحصتی کا نقیب کہ اب گرمیوں میں یوں چپ تھا کہ نوحہ خوانی اور منادی کا فرض گویا اسے پھر کبھی ادا ہی نہیں کرنا پڑے گا ۔ بستی کی انتہا کو اس نے چھوا اور پلٹ پڑا ۔ قدموں کے نیچے سے نکلی ہوئی سڑک پھر قدموں کی زد میں تھی ، کبھی کنکروں کی کھردری زمین قدموں میں بجتی ہوئی ، کبھی ادھڑی سڑک جہاں کنکر غائب تھے اور قدم رکھنے سے خاک اڑتی تھی ۔ اسکول والا باغیچہ نظر آنے پہ سڑک سے اتر دگڑے میں آیا جہاں منوں مٹی تھی کہ پیر اس کے دھنس دھنس گئے ۔ اور دگڑا پار کر اسکول کی صاف شفاف پگڈنڈی پر ۔

وہ ایک خاموش شہر میں داخل ہو گیا تھا ۔ سرخ اینٹوں کے دروں کی وہ لمبی قطار ، وہ برآمدہ کہ کھنچا چلا گیا تھا ، دور سے دیکھنے پہ لگتا کہ یہ عمارت ان گنت دروں اور ایک

نیچے برآمدے اور کھپریل کی جھکی ہوئی نیچی چھت کے سوا کچھ نہیں ، مگر قریب آنے پہ عمارت بلند ہونے لگتی اور پھیلتی چلی جاتی ۔ اونچے اونچے در ، اندر چمکتے شیشوں والے اَن گنت دروازے اور دریچے ، گردا گرد پھیلی ہوئی فیلڈ ، جہاں کہیں کہیں سفید کھمبے کھڑے تھے اور ہاکی اور فٹ بال کی فیلڈوں کی سرحدوں کا پتہ دیتے تھے ۔ کلاسوں کے دروازے مقفل تھے ، برآمدے خالی ، اور فیلڈ خاموش ۔ اسکول بند تھا ۔ شہر، جس کے دھوئیں چھاتے آسمان پر نہ اُٹھاتے تھے شہری سال کے سال ہجرت کر جاتے اور شہر خالی اور سنسان ہو جاتا ۔ ان دھوؤں اور اس سناٹے دونوں سے اس کی آشنائی تھی ۔ گرمیوں کی صبحوں کو ابا میاں کے ساتھ بھوبڑ کے کھیتوں میں گھومتے اکثر اس نے آنکھ بچا کر رستہ کاٹا ہے اور پھول توڑنے کی آس سے اسکول میں پہنچا ہے ۔ جب وہ اسکول کی پست چہار دیواری کو پھاند کر اندر داخل ہوتا تو یہاں کی ہر چیز دیکھی بھالی اور برتی ہوئی ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو ایک اجنبی بستی میں محسوس کرتا ، جہاں کے باسی کسی جادو کے اثر سے یا کسی دیوتا کے ڈر سے بستی خالی کر گئے ہیں ۔ وہ فیلڈ کا چکر لگاتا ، فیلڈ میں کھڑے ہوئے سفید ستونوں کو چھو کے اور ہلا کے دیکھتا ، خالی برآمدوں میں گھومتا — خالی برآمدے ، بند دروازے ، اکا دکا دروازے کا شیشہ ٹوٹا ہوتا اور وہ جھانک کر نیم اندھیرے میں چمکتے ڈسکوں اور کرسیوں کو دیکھتا ، دیکھتا رہتا اور پیچھے ہٹ جاتا ، کسی دروازے کا قفل غائب ہوتا اور دروازہ ذرا کھلا ہوتا ، حیرانی اور ڈر کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اس کے پاٹوں کو آہستہ سے کھولتے ، چپکے چپکے اندر جاتا ، تعجب سے خالی فرش کو بند دریچوں کو ادھ کھلے روشن دانوں کو دیکھتا ، پھر دل اس کا دھڑکنے لگتا ، باہر نکلتا ، اور بغیر پھول توڑے اسکول کی حدود سے باہر چلا آتا ۔

ماضی کی مہک اُسے پھر آنے لگی تھی ، اور بیتے دنوں کا جادو دل و دماغ میں جاگ رہا تھا ۔ وہ باغیچے میں ہو لیا ۔ دھلے دھلے پودے اور جھاڑیاں ، اُجلے سفید پھول گویا سبزے میں چاندنی چٹکی ہے ، تتلیاں کہ پودوں کو ہاتھ لگانے سے بے قرار ہوتیں اور ٹھکانے سے بے ٹھکانے ہو فضا میں بھٹکنے لگتیں ۔ شبنم سے سرابور پتوں اور مہکتے پھولوں میں سفر کرتی انگلیاں ایک اور سفر پہ نکل گئیں ، انگلیوں کی گرفت میں ، وہ شہد آمیز لمس پھر جاگ رہا تھا اور پوروں اور انگلیوں اور ہتھیلی میں میٹھی کن من ہو رہی تھی ۔ پھولوں سے اس کا رومال بھر گیا تھا ۔ اس نے رومال کو گانٹھ دی اور باہر نکل آیا ۔

خاک سے اٹی سڑک ، قدموں تلے بجتے ہوئے کنکر ، بولی زمین ، دگڑا ، پگڈنڈیاں ، کھیتوں کی مینڈھیں ، پیر اُس کے کبھی شبنمی گھاس کو روندتے روندتے نم ہوتے کبھی دگڑے میں چلتے چلتے گرد آلود ہوتے ۔ دور سے ہرا کے الاپ لگانے کی آواز آ رہی تھی ۔ تو بھوبڑ کی حدیں شروع ہو چکی تھیں ۔ کبھی پتلی پگڈنڈی پر ، کبھی کھیتوں کی مینڈھوں سے گذرتا ہوا وہ نیم اور کھنڈال کے درختوں کے پاس جا پہنچا ۔ اس نے نیم کی ٹہنی مسواک کی غرض سے توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا کہ ٹہنیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور گرگٹ ایک ہرے پتوں سے نکل کر موٹے گدے پہ آ گیا ۔ ادھ ٹوٹی شاخ کو چھوڑ کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا ۔ گرگٹ پھولتا گیا ، پھیلتا گیا ۔ کانٹے سر کے اور پشت کے کھڑے ہو گئے اور منہ کی دہکتی ہوئی سرخی گردن میں ، گردن سے پشت میں تیرنے لگی ۔ دل اُس کا دھڑکنے لگا ، ایک مبہم سا ڈر کہ کوئی یورش ہونے والی ہے ۔ رنگ زرد سے سرخ ، سرخ سے ہرا ہؤا ۔ پھر اس کا رخ گھنی ٹہنیوں کی طرف ہو گیا ۔ پیلی پتلی دم کچھ دیر تک اسے ایک جگہ ٹھہری ہوئی نظر آئی ، پھر وہ بھی سٹک کر پتوں میں گم ہو گئی ۔

ایک موہوم ڈر ، اکیلے پن کا مبہم احساس ، ذہن کے کسی گوشے میں اُبھرتا دبتا وہم

کہ جسم کا ایک پلی خون گھٹ گیا ہے ۔ رخ اس کا پہلے کنوئیں کی طرف ہوا ، پھر چلتے چلتے اس نے رستہ بدلا اور سیدھا گھر کی طرف ہو لیا ۔ جہاں کبھی کالے پیلے داتوں والی جھاڑیاں ، آک کے پودے ، سفید کانٹوں اور میلی پتیوں اور پیلے پھولوں والے ٹیڑھے میڑھے ببول کے درخت تھے ۔ اب اس میدان کی شکل بدل رہی تھی ۔ جا بجا سمنٹ کے ڈھیر تھے اور سرخ گہاں اینٹوں کی دیواریں ۔ کوٹھی کی تعمیر شروع نہیں ہوئی تھی ، مگر اثر آثار اس کے ظاہر ہونے لگے تھے ۔

جب اس نے گھر میں قدم رکھا ہے تو دیواریں اجلی ہو چلی تھیں اور سب سے اوپر والے کوٹھے کی ممٹی پہ سنہری دھوپ دمکنے لگی تھی ، مگر بڑی آپا ابھی نماز کی چوکی پہ تھیں اور ان کی پرسوز رقت بھری آواز مولا علی وکیل علی بادشاہ علی صحن میں پھیل رہی تھی ۔ نانی اماں دعا مانگتے مانگتے ابھی ابھی سجدے میں جھکی تھیں ۔ امی اسی طرح سوا رہی تھیں ، مگر اس فرق کے ساتھ کہ اب پریشان کرنی مکھیوں سے مدافعت کی غرض سے دوپٹے کا آنچل ان کے چہرے پہ آ گیا تھا ۔ محسینہ اٹھ بیٹھی تھی پر آدھی سوئی آدھی جاگی تھی ۔ نیند کی ننھی بدلیاں کہ چھنٹ کر پھر کھل مل رہی تھیں اور آنکھوں پہ منڈلانے لگی تھیں کہ اس نے بڑھ کر پھولوں کا رومال اس کی گود میں رکھ دیا ۔ نیند کی ننھی بدلیاں آن کی آن میں غائب ، اور آنکھیں حیرانی اور استفسار کی غیر واضح کیفیت کے ساتھ اس کی طرف اٹھ گئیں ۔

” پھول ہیں “ جواب میں وہ بولا ، اور دل اس کا دھڑکنے لگا ۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ کر دالان کی طرف ہو لیا ۔

دالان میں اور خالی کمروں میں مصروف بن کر وہ دیر تک گھومتا رہا ؛ بڑے کمرے میں ، بڑے کمرے سے بغلی کمرے میں ، بغلی کمرے سے پھر بڑے کمرے میں ۔

جب باہر آیا تو صحن اسے پھولوں سے اجلا اجلا مہکتا معلوم ہوا ۔ پھول نانی اماں کی چاندی کی بالیوں میں تھے ، پھول بڑی آپا کے کانوں میں تھے کہ ابھی باورچی خانے کی طرف گئی تھیں ، پھولوں سے محسینہ لدی پھندی تھی نہ کانوں کے مہکتے گچھوں کے اثر سے رخساروں کے پھولوں میں رنگ دوڑا تھا اور چہرہ کھلا پڑتا تھا ، پھولوں کے لئے نبی ٹھنک رہی تھی کہ کانوں میں پہنے پہ قانع نہ تھی بلکہ ہار بھی چاہتی تھی ۔

” بس اب اور پھول نہیں ہیں ۔ تجھے تو ہاؤ کا ہو گیا ہے “ ۔

” باجی گجرا “ ۔

” ذرا سے تو رہ گئے ہیں ۔ اس میں گجرا کیا بنے گا ۔ کل پھر ضمیر بھائی لائیں گے تو پھر گجرا بنائیں گے ۔ ہیں نا “۔ محسینہ کی آواز میں پیار کے ساتھ ساتھ ایک لہک بھی تھی ۔

بنی کو کل کے وعدے سے تسکین نہیں ہوئی ” تمہارے پاس اتنے تو ہیں “ ۔

” کہاں اتنے ہیں ؟ چار کلیاں رہ گئی ہیں “ اور اس نے پھیلے آنچل کو سمیٹ لیا ۔

نبی پہلے ٹھنکی ، پھر روٹھ کے منہ پھلایا ، پھر بسورنے لگی ، اور جب محسینہ پہ کوئی وار کارگر نہ ہوا تو اس پہ ٹوٹ پڑی ۔ محسینہ نے کہ اس نے آنچل پھر پھیلا لیا تھا اور اطمینان سے پھول گوہ رہی تھی جلدی سے آنچل کو سمیٹا ، نبی کے ہاتھ پکڑ کے پھول چھینے اور اسے پیچھے دھکیل کے ہنس پڑی ” باولی ہوئی ہے “ ۔ سر سے آنچل کاندھے پر کھسک آیا ، جوڑے میں لگے ہوئے کئی پھول افشاں کی طرح جھٹ کے گرے اور ایک لٹ سرخ ہوتے گالوں پہ آ پڑی ۔ ” ایک دفعہ کہہ تو دیا کہ اب کل ہار بنائیں گے ۔ مانتی نہیں ہے “۔ وہ پھر ہنس پڑی ” بالکل حوش ہے “ ۔

” محسینہ سر ڈھکو “ ۔ امی نے تہدید آمیز لہجے میں کہا ۔

محسنہ سامنے ہی آگئی ۔ سر ڈھکا ، سینے سے سرکتے آنچل کو درست کیا ، بالوں کی لٹ اوپر کی ، پھر گم ۔ امی نے پاندان اپنے پاس سرکایا ، کھول کے پان لگانے لگیں ۔

"تائی اماں پان کھاؤ گی ؟"

"بس ایک کتر لگا دے ہو"۔ تائی اماں بولیں ، امی پھر خاموشی سے پان لگانے لگیں ۔ محسنہ گم سم ، پوری کی تصویر کہ بات کرتی ہوئی ۔ اور خود وہ ، بےبسی پہ سمٹ سکنے کی کیفیت ، گویا امی نے محسنہ کو پھر اسے ڈانٹا ہے ۔

"ابھی ہم تو یہ جانیں ہیں" امی آخر بولیں "کہ جب تک ماں کے گھر رہے بھیتوں کی صورت ماں نے نہ دیکھنے دی ۔ چوری چھپے کبھی بھول مل بھی گئے تو کانوں کو چھپائی پھرتی تھی کہ کہیں اماں نہ دیکھ لیں ، خون پی لیں گی ۔ مگر اب تو بتول نئیں ہیں"۔

"ہاں" تائی اماں یاس بھرے لہجے میں بولیں "اب تو گویا ہر عیب فیشن ہے"۔

"ہاں بے پردگی فیشن ، سر کھلا رہے تو فیشن ، اونچا گریبان فیشن ۔ دوپٹے پھٹ گئے ہیں لونڈیوں کے ۔ ہمارے زمانے میں ایسا کاہے کو تھا"۔

"ہم نے تو کل ہوش سنبھالا ہے بی بی"۔ تائی اماں کہنے لگیں "ہمارے زمانے میں تو گویا ایسا پردہ ہووے تھا کہ کیا مجال کہ غیر مرد آواز بھی سن لے ۔ بڑی اماں ، اللہ بخشے بڑی جری تھیں ، سر کے بال سفید ہو گئے تھے مگر سقے نے کبھی ان کی پرچھائیں نئیں دیکھی ۔ بی بی ۔ ان دنوں تو ماں باپ سے بھی پردہ ہووے تھا ۔ سجاد علی جو ہیں ان کی ایک بہن تھی ۔ بڑی اچھی تھی کمبخت ۔ نہ تو پھول کھلے نہ باپ بھائی کی صورت دیکھی صحت ہوئی ۔ باپ باہر بیٹھا بیٹھا حکیم ڈاکٹروں کا انتظام کرتا رہا ، بیٹی اندر دم توڑتی رہی ۔ وہ جیسی صورت خاک کے پردے میں چھپ گئی ۔ کیا اپنے کیا غیر کسی مرد نے جھلک اس کی نہ دیکھی"۔

محسنہ خاموشی سے اٹھی اور باورچی خانے کی طرف چلی گئی ۔ بی بی بھی کچھ حیران کچھ سہمی ہوئی اس کے پیچھے ہو لی ۔

امی محسنہ کو اٹھتے اور جاتے غور سے دیکھتی رہیں ، جب وہ باورچی خانے میں داخل ہوگئی تو ان کی نظریں پھر اپنے مقام پر واپس آ گئیں ۔

"بی بی کوئی برا مانے یا بھلا مانے"۔ اور امی کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا "ہمیں ایسی بے حجابی پسند نہیں"۔

"برا ماننے کی اس میں کیا بات ہے"۔ تائی اماں بولیں "کوئی غیر تو ہو نئیں ، اور پھر ڈوبی بات کوئی ایسی نئیں کہی ۔ بری بات دیکھی ، ٹوک دیا ۔ بڑوں کا کام ہی یہ ہوتا ہے"۔

امی کہنے لگیں "تائی اماں میں تو ڈروں ہوں کہ کوئی بات الٹی نہ لے لی جاوے ۔ آخر سیانی لڑکی ہے ، ایسا بھی کیا کہ نگوڑی نہ آنکھ میں حیا نہ چال میں حجاب ، سر اور سینے کی سدھ نہیں ۔ ایک آدھ دفعہ میرے جی میں آئی کہ کہوں بیٹی سیانی لڑکیاں کمر جھکا کے چلا کرتی ہیں ۔ پھر میں نے سوچا کہ بھینا مجھے کیا ، مفت میں بری بنوں"۔

"خیر یہ تو بی بی تیری خواہ مخواہ کی بات ہے اپنوں میں ایسی غیریت تو ہوتی نئیں ہے"۔

"تائی اماں اس میں غیریت کی بات نہیں ہے ۔ کنواری لڑکی کا معاملہ نازک ہوتا ہے ۔ ماں کی آنکھ اسے ٹھیک رکھتی ہے ۔ بڑی آپا کے ہوتے ہم کون کہ ٹوکیں ۔ ان پہ لازم ہے

کہ وہ روک ٹوک کریں"۔

"اری وہ تو ابا میاں جب سے گذرے ہیں ایسی بے سدھ ہے کہ کسی بات کو دیکھے ہے نہ ٹوکے ہے"۔

امی چپ ہو گئیں۔ تھالی چھالیوں کی آگے کی اور چھالیا کترنے لگیں۔ پھر سوچتے سوچتے بولیں "اجی میں تو جانوں بڑی آپا کو اب بیاہ اس کا کر دینا چاہئیے"۔

تائی اماں چپ رہیں۔ پھر آہستہ سے بولیں "سید علی کا خط پھر آیا ہے"۔

امی چونکیں "اچھا؟ ذکر نہیں کیا بڑی آپا نے"۔

"ذکر کرے گی۔ اب کے تو ذکر کرے ہی گی"۔

"کیوں؟" امی کے کان کھڑے ہوئے۔

"اب کے انہوں نے ہاں اور ناں میں جواب مانگا ہے۔ اب ڈوبی کو کچھ نہ کچھ طے کرنا پڑے ہی گا"۔

چند لمحے امی اور تائی اماں دونوں چپ رہیں۔

تائی اماں پھر آپ ہی بولیں "ڈوبی وہ بھی سچے ہیں، آخر کب تک بیچ میں لٹکے رہیں۔ کرنی ہے تو کرو نہیں تو منع کرو"۔

"آخر سوچ کیا رہی ہیں بڑی آپا، کچھ پتہ تو چلے؟" امی بولیں۔

"بی بی ہمیں تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ابا میاں زندہ تھے سو ان کی موجودگی میں سید علی کے بار بار خط آئے پر وہ چپ ہو جاویں تھے۔ چھوٹے ہے منہ وہ سب تھے۔ اسی چپ چپ میں دن گزرے جا رہے ہیں اور لونڈیا کی عمر دن دن بڑھ رہی ہے"۔ تائی اماں چپ ہوئیں۔ پھر بولیں "اب بھیا آ گیا ہے میں جانوں اس سے مشورہ لے گی"۔

"بھیئے سے اور کون کون سی بات میں مشورے لئے تھے"۔ امی کے لہجے میں ایک ذرا گرمی آ گئی۔

"اس معاملہ میں تو ضرور لے گی"۔ تائی اماں چپ ہوئیں، پھر بولیں "ویسے ایمان کی بات ہے کہ ڈوبی کو بھیئے سے محبت تو بہت ہے۔ اندر سے یہ [illegible] بھیئے سے ملوں"۔

امی چپ۔ انہوں نے سروطہ تھالی میں رکھ دیا، کتری ہوئی چھالیاں ملیں، چار دانے ہتھیلی پہ رکھ کے منہ میں ڈال لئے۔ پھر آپ ہی آپ بولیں "بہنی بہن بھائی کا معاملہ ہے، بیچ میں بولنے والی کون، مگر سمجھ میں آئی بات تو کہنی چاہوے ہے؟ میں یہ پوچھوں ہوں کہ جب خدیجہ کا امداد سے نام دھرا گیا تھا اس وقت کوئی تو نہیں بولا تھا"۔

"ہاں یہ بھی تو تم سچ کہو ہو"۔ تائی اماں بولیں "مگر ایک بات یہ بھی تو تھی کہ اس وقت لونڈیا کا باپ زندہ تھا، چھوٹوں کی چاری کیا چلی"۔

امی پھر چپ ہو گئیں۔ چھالیاں کترتی رہیں، کترتی رہیں، پھر کہنے لگیں "تائی اماں بات یہ ہے کہ انہوں نے تو لونڈے کو چھوڑ دیا ہے اور میں بھی سچ کہوں ہوں۔ ہاں بھئی کل کلاں کو پسند نہ آئے تو ہمیں تانے کہ تم نے مجھے جہنم میں جھونک دیا"۔ امی خاموش ہو گئیں، مگر بات ان کی شاید ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ چند لمحے رک کر پھر بولیں، لیکن اس مرتبہ ان کی آواز بہت بجھی تھی "تائی اماں، یہ لونڈیا اتنی ہوا ہوا کیوں رہوے ہے"۔

"اے اس کی ماں بھی ڈوبی ایسی ہی ہے"۔ تائی اماں نے لاپرواہی سے کہا۔

"تائی اماں، یہ تو ہر وقت خفقانی سی رہوے ہے۔ جانے غریب کو کیا دکھ لگ گیا

ہے ۔ بڑی آپا ہماری ایسی باولی ہیں کہ کسی بات کی سدھ ہی نہیں"۔

دائی اماں نے ایک ساتھ پہلو بدلا " ائے ہٹے دھوپ آ گئی"۔

دھوپ ڈھلتے ڈھلتے چارپائی پہ آ گئی تھی ۔

" اندر جاؤ " ۔ امی آپ کھڑی ہوئیں " صمد چلو جا کے اندر بیٹھو"۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بغلی کمرے کی طرف ہو لیا ۔

دوپہر کو وہ کئی بار کمرے سے نکلا ، کبھی پانی پینے ، کبھی پیشاب کے بہانے ۔ دالان میں آیا ، دالان سے صحن میں ، صحن سے پھر دالان میں ۔ اس دوپہر کو دالان سنسان رہا ، نہ موتیے رنگے گئے نہ خربوزوں کے بیج دھلے ۔

پھر اس کی آنکھ لگ گئی جب وہ اٹھا اور باہر آیا تو دھوپ ڈھل گئی تھی ۔ امی اور دائی اماں اور بڑی آپا سب کے سب باہر نکل آئے تھے ۔

" صمد ادھر آ جاؤ ، یہاں ہوا ہے"۔ بڑی آپا نے اسے آواز دی ۔ وہ دالان سے نکل کر نیچے مونڈھے پہ جا بیٹھا ۔

" ائے جھونوں ہوتے ٹوک دیا ۔ ہوا پھر بند ہو گئی "۔ دائی اماں کے ہاتھ میں پنکھا زور زور سے گردش کرنے لگا ۔

ہوا واقعی بند ہو گئی تھی ۔ اس کی قمیص پسینہ سے تر بتر ہونے لگی ۔

" بہت ہی بڑی گرمی ہے ، میرا تو بدن ڈبڑوڑیوں سے پھل گیا "۔ امی بولیں ۔

دائی اماں بڑبڑانے لگیں " توبہ توبہ آسمان تو بانبا ہو گیا ۔ ڈوبی بھوبل برس رئی ہے"۔ پھر اُن کا لہجہ بدلا اور گڑگڑا کے دعا مانگنے لگیں " الہی اپنے حبیب کا صدقہ پانی بھیج ..... پانی ، کربلا کے پیاسوں کا واسطہ ، پانی "۔

بڑی آپا کہنے لگیں " بھیوں ، سنتی ہیں کہ نجومیوں نے بتایا ہے کہ اب کی برس پانی نہیں پڑے گا "۔

دائی اماں نے فوراً ٹوکا " نا بی بی ، ایسی آواز مت نکال ۔ اللہ رحم کرے"۔

امی بڑبڑانے لگیں "اجی ہم تو یہاں آ کے آفت میں پھنس گئے ۔ ایسی گرمی کاہے کو دیکھی تھی ہم نے ۔ ساون گذر چلا اور بادل کا آسمان پہ نام نشان نہیں"۔

"اری بی بی" دائی اماں کا تخیل بھٹکنے لگا " یہ کیا سوکھا ہے ، سوکھا تو ایسی بڑی تھی . .. ..مگر ہمارا تمہارا تو بہ بھی نہیں تھا ، بڑی اماں سنایا کریں تھیں کہ ایسی سوکھا پڑی کہ برسات ساری گذری گئی اور بوند پانی کی نہیں پڑی ۔ اساڑ اجاڑ ، ساون سوکھا ، بھادوں خالی ۔ آسمان تانبا ، زمین تڑخی جاوے ، چڑیئیں گھونٹ کو ترسیں اور ڈنگر راتوں کو پیاس سے ڈکرائیں .....تو بی بی یہ سمجھو کہ اس برس دانہ نئیں آگا ۔ کال پڑ گیا .. .. ..سارے میں ترہ ترہ پڑ گئی ۔ ماؤں کمبختوں نے مٹھی بھر چنوں کے لئے گودیں خالی کر دیں اور ایک ایک نوالے کے لئے بیٹیں بہا دیں .....وہ جانور کٹا وہ کٹا کہ .... بس توبہ ہی ہے ۔ چرند پرند جو ملا کاٹا اور کھایا.. .... اری بی بی ، کیا پوچھو ہو کوا تک عنقا ہو گیا "۔

"کوے بھی ؟ ائے نائی اماں کیا کہہ رہی ہو"۔ بڑی آپا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔

"ہاں بی بی کوے .. " دائی اماں کی آواز میں دہشت کی ایک کیفیت پیدا تھی "کوے ......بی بی کال تھوڑائی تھا عذاب الہی تھا ۔ کال ٹلا تو غدر ٹوٹ پڑا ۔ چوریئیں ہوئیں ، پھر ڈاکے پڑے ۔ روز خبریں آویں کہ آج فلاں محلے میں کومل لگ گیا ، آج فلاں گانوں میں

ڈاکہ پڑگیا ۔ ایسے میاں اسی میں ہوتے ہوتے غدر مچ گیا ۔ خلقت ہل گئی ۔ وہ گولہ بارود چلا کہ کھڑی حویلیاں زمین کا پیوند ہو گئیں ، اور حویلیوں والوں کو سر چھپانے کو جگہ نہ ملے ۔ اور میاں دلی میں تو وہ رن پڑا کہ بڑی اماں کہتی تھیں کہ دلی کے کنوئیں خاک سے اٹ گئے اور جمنا سرخ ہو گئی "۔

نانی اماں چپ ہو گئیں — بھٹکتے بھٹکتے جانے کونسی دنیا میں جا نکلی تھیں کہ آواز بھی ساتھ ان کا چھوڑ گئی تھی ۔ بڑی آپا گم سم ۔ آنکھوں میں دہشت کی دمک ۔ امی بھی چپ ۔ مگر پھر امی نے پہلو بدلا اور نانی اماں کے بوڑھے سوتے جادو کے جالے سے نکلنے کی کوشش کی "ابھی خبر دلی کا کیا ذکر ہے ۔ اس شہر کو تو فقیر کی دعا ہے ۔ بار بار اجڑے گا بار بار بسے گا"۔

نانی اماں امی کو تکتی رہیں ۔ وہ خود بھی تو اپنے بوڑھے ہوتے جادو میں بکھری ہوتی تھیں ۔ پھر انہوں نے پنکھا اٹھایا ، جھلنے لگیں ۔ پھر بڑبڑائیں "فقیر کی دعا کہو لو یا اعمالوں کی سزا ، ہم تو یہ جانیں ہیں کہ بائیس خواجہ کی چوکھٹ میں کوئی راجہ سو برس سے زیادہ تخت پہ نہیں بیٹھا ۔ سو برس بعد راج بدلے ہے ۔ رعایا ہلے ہے"۔

"اللہ تیرا شکر" بڑی آپا کی باچھیں کھل گئیں ۔ نیم کے پتوں میں سرسراہٹ پیدا ہوئی تھی اور جلتے پتے بدنوں کو ہوا کے ایک ہلکے جھونکے نے چھوا تھا ۔ ڈھلتی دھوپ سے تپتے آنگن میں اچانک چھاؤں سی اتر آئی ۔ دھوپ سمٹنے لگی ، جلدی جلدی سامنے کی دیوار پر چڑھی ، منڈیر پہ پہنچی ، اوپر کوٹھے والی مٹی پہ سونا سی نظر آئی اور اوجھل ہو گئی ۔

"اللہ بادل بھیج" بڑی آپا کی حسرت بھری نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں ۔

ننھی گدلی بدلیاں جلتی نیلی فضا میں بھٹکتے بھٹکتے قریب قریب ہو گئیں تھیں اور گھل مل گئی تھیں ۔ گھلی ملی بدلیاں بلندی پہ رینگتی رہیں ، بھری رہیں اور سوکھے آنگن میں شادابی کی رو دوڑنے لگی ۔ گھلی ملی بدلیاں پھر پھٹنے لگیں اور دھوپ ناٹی ، مٹی پہ نمودار ہوئی ، منڈیر پہ آئی ، دیوار دیوار اتری ، اور آنگن میں پھیل گئی ۔

دروازے کے باہر تانگہ کھڑ کھڑ کرتا آکا رکا ۔

"تانگہ کس کا آیا؟" بڑی آپا چونکیں ۔

"شمیم" امی اس سے مخاطب ہوئیں "دیکھو کس کا تانگہ آیا" پھر بڑی آپا سے بولیں "میں تو جانوں تمہارے بھائی آ گئے ۔ مقدمہ تو آج ختم ہو گیا"۔

وہ اٹھ کر دروازے کی طرف چلا ۔

بڑی آپا دھڑکتے دل سے دعائیں مانگ رہی تھیں "الٰہی خیر ، اچھی خبر آئی ہو"۔

دروازے پہ پہنچا تو باوا تانگے سے اتر رہے تھے ۔ کھچڑی بالوں میں اور لباس پہ گرد کی ہلکی تہہ ، چہرے سے سفر کی تھکن ظاہر ، تانگے والے کا حساب چکایا ، بستہ اتروا کر نوکر کے سر پہ دھرا ، اور تھکے تھکے قدم اٹھاتے اندر چلے ۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے ۔ آنگن میں قدم رکھا تو گھر بھر کی نگاہیں ، آس و یاس میں ڈوبی ہوئی سوال کرتی نگاہیں ، ان کی طرف اٹھ گئیں ۔ باوا نے جیب سے رومال نکال کر کپڑے جھاڑے ، چہرہ صاف کیا ، گردن پہ بہتے پسینے کو پونچھا اور مونڈھے پہ بیٹھ گئے ، بڑی آپا مونڈھے کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھیں اور زور زور سے پنکھا جھل رہی تھیں ۔

"بھیا کیا ہوا ؟" نانی اماں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ۔ آہستہ سے بولے "ڈگری ہو گئی"۔

"ڈگری ...."

تیزی سے پنکھا جھلتا ہوا ہاتھ ایک ساتھ رک گیا ۔ رک کر پھر چلنے لگا ، مگر

بہت آہستہ ۔

کئی منٹ تک خاموشی رہی ، سوائے پنکھے کے کہ بڑی آپا کے ہاتھ میں باوا کے سر آہستہ آہستہ گردش کر رہا تھا ۔ پھر باوا اٹھے اور غسل خانے کی طرف چلے گئے ۔

وہ نہا دھو کر وہی روزمرہ والا حار جانے دار تہمد باندھے سفید بنیان پہنے غسل خانے سے نکل سویرے پہ دتھوے اور حقے کی نے کو کہ ابھی تازہ بھر کے مونڈھے کے سامنے رکھا گیا تھا ، ہونٹوں میں دبایا ۔ بڑی آپا اور تائی اماں اور امی اسی طرح گم سم ان کی بیٹھی رہیں ۔ دھوپ ڈھل چکی تھی ۔ بھاؤں اور ہلکا ہلکا چھڑکاؤ ، جس نے زمین میں دبی ہوئی گرمی کو ابھارا تھا اور گملے آنگن سے ابخرات نکل رہے تھے ۔ باوا نے حقے کی نے کو ہونٹوں سے الگ کر کے اسے جڑ سے مونڈھا اور واصلے سے رکھ پھر ہونٹوں میں دبا لی ۔ وہ تھکن اور بے بسی لڑکے سے گرے وسے سرے سے عیاں تھی ڈھل سی گئی تھی ۔ شاداب حقے کی سوندھی خوشبو اور خواب آور گڑ گڑاہٹ کے ساتھ ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں ۔ حقے کی گڑ گڑاہٹ ، ان کی بند آنکھیں ، بڑی آپا اور امی اور تائی اماں کہ گم سم بیٹھی تھیں ۔ خاموشی اتنی کہ دم بند ہونے لگا بار بار اس نے ارادہ کیا کہ وہ آہستہ سے اٹھے اور دبے پاؤں باہر چلا جائے ۔ مگر اس کا حوصلہ نہ ہوا ۔ ایک دفعہ اس نے مصمم ارادہ کیا کہ وہ دبے پاؤں اس بند فضا سے نکل جائے کہ اسے میں ہچکیوں کی آواز آنے لگی ۔ بڑی آپا بہت دیر سے دم سادھے بیٹھی تھیں ، بند ٹوٹ گیا اور وہ گھٹنوں میں سر دے کے آہستہ آہستہ رونے لگیں ۔ باوا نے آنکھیں کھولیں ، بڑی آپا کو دیکھا ، اور پھر آنکھیں بند کر لیں ، اور حقے کی گڑگڑاہٹ اسی رفتار کے ساتھ بلند ہونے لگی ، ہوتی رہی ۔

اس رات حویلی والے سویرے سوئے ۔ بڑا والا لمپ کہ پہلے آنگن میں کبھی چھت پہ بھی کمرے میں رات گئے تک دھنڑ دھنڑ جلتا رہتا تھا اور باوا اس کی روشنی میں بڑے اہتمام سے ... باقاعدہ آئے بیٹھے رہتے تھے ، شام ہی سے بند کر دیا گیا تھا ۔

گلی سے گذرنے والے لوگوں کو گمان ہوا کہ حویلی والے آج کسی تقریب پہ گئے ہیں ۔

(۵)

اساڑ آیا ، ساون سوکھا ، اور اب بھادوں گذر رہا تھا ۔ آسمان پہ کبھی کبھی بادلوں کے دل کے دل چلتے نظر آتے ، مگر سفید دھوپ سے چمکتے بادلا سے بادل ، روپہلی بادلوں کے لیے ایک سمت سے دوسری سمت میں ہجرت کرتے ہوئے ، بے مقصد بے منزل ۔ بادلوں کے قبیلے رینگتے رینگتے رہتے ، رک کر کھڑے ہو جاتے ، پھر رینگنے لگتے ۔ بادل جانے کدھر کدھر سے بھٹک کر آتے ، ٹوٹے پھوٹے بادل ، بادلوں کی ٹکڑیاں ، پھٹی ٹوٹی روپہلی بدلیاں ، اکا دکا ملگجے کالے اور آہستہ آہستہ آپس میں پیوند ہونے لگتے ، اور سورج پہ ایک بار تک ... پڑ جاتا ، اور دھوپ ... اور میدانوں میں جلدی جلدی جلتی ہوئی درختوں کو پھلانگ کر اوٹ میں جا چھپتی ۔

" آج تو بادل آ رہے ہیں "۔ کوئی راہ گیر چلتے چلتے کہتا ۔

کمہار آسمان کو دیکھتا ، پھر روکھے لہجے میں کہتا " برسنے والے نہیں ہیں "۔

ملگجے کالے بادلوں کے قبیلے کے گرجے بے برسے گذر جاتے ، اور آسمان پھر خالی خالی نظر آتا ۔

" ٹیٹری بول رہی ہے ، مینہ آئے گا "۔ چیختی ہوئی ٹیٹری کی آواز پر تائی اماں امید

ہرے لہجے میں کہتیں ۔

" تائی اماں " ننی پوچھنے لگتی " ٹٹیہری چیخی کیوں ہے ؟ "

" پانی ، پانی مانگے ہے ، بادلوں کو پکارت ہے "۔

" تو بادل اسے پانی نہیں لا دیتے ہیں ؟" اچھے کا تجسّس بھڑکنے لگتا ۔

" ہاں بیٹا ، بڑی بدنصیب ہے ، اسے کو پانی نہیں ملا تا ۔ اسی بددعا لگی کہ ٹٹیہری ے گی ، چونچ میں پانی کا قطرہ نہیں جاتا ۔ دماغ میں جمے ہے ، بوند پڑت ہے تو دماغ کے ے حلق تر ہو جائے ہے ، مگر پھر پیاسی کی پیاسی "۔

ٹٹیہری پانی مانگتی رہتی ، بادلوں کو پکارتی رہتی ۔ ٹٹیہری کبھی کبھی دوپہری میں پکارتی ، کبھی رات کے سناٹے میں پکارتی ، بوند پانی کی پر صورت میں نہ پڑتی ۔ جلتی پھنکتی دوپہریاں گرد سے اٹ گئیں اور تارے کہ راتوں کو جگمگاتے تھے اب میلے میلے دکھائی دینے۔ ساون کہ برسات کے تھے ، ساون کی جھڑی نہ بھادوں کی جھڑ لگتی ۔ ساون کے مہینے سیندوری مدیسے کہ جھلے برس لگے دھوئیں لگے رہے یہ بھادوں کی امیدیں جاتی رہیں ۔ جلی زمین سے اٹھتی ہوئی سوندھی باس کہ بیچ بیچ کرتے کرتے گھوڑوں سے آتی ہوئی سساند ۔

روز صبح کو کہ کبھی بالکل بتمامی ہوتی اور کبھی ہلکی سی آٹھنا اور بھونڑ کی طرف نکل جانا ۔ آگے آگے باوا پیچھے پیچھے وہ ۔ کہیں ایک قدم رکھا کہ گندل اچانک سے کبھی کسی درخت کے پیچھے سے ، کبھی میندہ چلتا ہوا آتا ، قریب آ کر آہستہ سے سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا " سرکار کریلا جل گیا " ۔ گندل اور ہیرا نتھواں سارے سارے دن چلاتے ، نوں کو چلاتے ، گجردم اٹھ کر چلاتے ، ٹٹیہری کی پکار اور ہیرا کی بات بھٹکتی دوپہروں ر سناٹی راتوں میں سنائی دیتی ۔ صبح کا گجر بجتا تب سنائی دیتی ، اور جب دھوپ ڈھل کر میندہ میندہ سر کٹنے لگتی تب سنائی دیتی ۔ مگر زمین پیاسی رہی اور لوؤں اور آندھیوں کا ر قائم رہا ۔ گندل روز کسی فصل کے جلنے کی خبر سنا دیتا ۔

" سرکار .... مکی اجڑ گئی .... کل سرخ آندھی آئی تھی " ۔

باوا نے خاموشی سے عینک درست کی ، کھنکارے ، آہستہ سے بولے " اچھا " ۔ اور ڈیوڑھی کے پاس سے نکل کر کھیت کی منڈیر پہ ہو لئے ۔

" بی بی میں نے دالان سے جھانک کے دیکھا ، آسمان سرخ ، خون کی بوٹی ، منڈیریں اور والیں لال لٹو "۔

بڑی آپا کہ دہشت کی کیفیت ان کی صورت اور لہجے دونوں سے ظاہر تھی بولیں " تائی اماں ہماری عمروں میں تو ایسی آندھی کبھی نہیں آئی "۔

" ہاں بی بی ہم نے نہیں دیکھی " ۔ تائی اماں بولیں " بڑی اماں ہمارے سنایا کریں تھیں کہ غدر سے پہلے ایک دفعے آئی تھی ، ایسی سرخ کہ آسمان مانو خونم خون ہو گیا ، اور دیواریں اور منڈیریں اور ممٹیاں جیسے کسی نے سرخ پڑیا مل دی ہو " ۔

" بہنوں ہم تو یہ جانیں ہیں " ۔ بڑی آپا کے لہجے سے دہشت کی کیفیت مٹ گئی تھی ور دکھ کا رنگ پیدا ہو چلا تھا " جب سے اس بخت ماری اوٹھی کی نم کھودی ہے روز ایک آفت ٹوٹتی ہے " ۔ تائی اماں نے فوراً تائید کی " یہ تو سچ کہو ہے دلہن ۔ ابا میاں کے سامنے جب شبیر حسین نے ایک دفعہ ذکر کیا تھا تو انہوں نے صاف منع کر دیا تھا کہ ہم اس زمین کو ہاتھ نہیں لگائیں گے ، اس میں اثر ہے ، آباد نہیں ہو سکتی "۔

" تائی اماں آپ ہیں بڑی شکیائی " ۔ امی بولیں " بھئی یہ تو وقت کی بات ہے ۔ کام بنتے بھی ہیں بگڑتے بھی ہیں ۔ سنور جائے تو کہہ دو نصیب ور ہے ، بگڑ جائے تو اثر بتا دو "۔

نانی اماں نے فوراً جواب دیا " پھو تو تو ہماری کسی بات کو مانتی ہی نئیں ، نہ تیرا خصم مانے ۔ اچھی بی بی ہم ہی بے وقوف ہیں "۔ نانی اماں چپ ہو گئیں ۔

بڑی آپا کا ذہن بھٹک کر کسی اور طرف جا نکلا ۔ سوچ بھرے لہجے میں بولیں : " نانی اماں ، بیشی کی رات کو میں نے خواب دیکھا کہ جنہیں ابا میاں ہیں ، اور بڑے ابا بھی ۔ اور ان کے ساتھ کوئی اور ....ایک خیال کہ پیر بو علی ہیں ۔ ابا میاں اور بڑے ابا پریشان سے ہیں......پھر جیسے پیر بو علی چلائے ہوں......حویلی کی ڈاٹ پھٹ گئی......بس میری آنکھ کھل گئی......"

نانی اماں ہل سی گئیں ، کچھ دیر تک گم سم خلا میں تکتی رہیں ، پھر پہلو بدلتے ہوئے ٹھنڈا سانس لیا ، بولیں " بعضا خواب تو سچ مچ عین مین سچ ہو جاوے ہے "۔

نانی اماں خاموش ہو گئی نہیں ، لیکن جب کوئی اور نہ بولا اور امی اور بڑی آپا گم سم بیٹھی رہیں تو پھر بول پڑیں ، مگر اب کے ان کے لہجے میں تلخی بھی تھی " اب اوڑھنی کو پھٹیں لگائے رہو ، حویلی تو نکل لے گئی "۔

بڑی آپا نے جواب میں ٹھنڈا سانس بھرا ، بولیں " ہاں پھپھو " اور چپ ہو گئیں ۔

کوٹھی کی تعمیر شروع ہو چکی تھی ۔ تیاگنے کچہری کا قصہ ختم تھا ، ابا میاں کے رقعے پرچے احتیاط سے باندھ کر پھر کتابوں کے بھرے لکڑی کے صندوق میں ڈال دیئے گئے ۔ اب باؤ کا سارا سارا دن ڈھونڈے نہ گذرتا ۔ امی نے ایسے بھی اس الجھیڑے میں پھنسا دیا " امجی تم اکیلے کہاں تک سارے کام کی دیکھ بھال کرو گے ۔ اپنی عمر کو دیکھو ۔ ذرا گرے تو کھٹنا سے ایسے لگو گے کہ اٹھا نہ جائے گا ۔ ضمیر گھر میں بیٹھا کیا کرتا ہے ۔ کیوں اس سے نہیں کہتے کہ کام کی دیکھ بھال کرے ۔ گھر میں وہ بیٹھا بھی تو کیا فرق پڑتا ۔ دوپہری بھر دالان میں جمائیاں لیتا اور آنگن تکتا رہتا ، اور نیم کی ٹہنیاں کبھی تھکے تھکے ہلکورے لیتیں ، اور کبھی سر نوڑھا کر چپ ہو جاتیں ۔ تحسینہ تھی تو گھر ہی میں ، کبھی دالان میں کبھی آنگن میں کبھی کیاری پہ ۔ دور سے جھلک نظر آئی اور ان کی آن میں اوجھل ۔ امی تھیں کہ ہر وقت اسے نظروں میں رکھتیں ۔ اٹھتے بیٹھتے اسے احساس رہتا کہ امی کی نظریں ساتھ ہیں اور محاصرہ کر رہی ہیں ۔ گھر سے خفقان ہونے لگا ، مگر باہر بھی سکون تو نہیں ملا ۔ سیمنٹ کی جا بجا ڈھیریاں ، روڑیوں کے سرخ سرخ ڈھیر ، بھیگا گارا جہاں سے راج بھر بھر تراسیں سر پر رکھ ادھر نئی دیواروں کی طرف جاتے ، سیڑھی چڑھ مچانوں پہ پہنچتے اور پراتیں خالی کر نیچے پلٹ آتے ، اور وہ سرخ گہاں اینٹوں سے لدے گدھے کہ ان کے لد پھند کر جانے کا تانتا دن بھر بندھا رہتا ۔ لگتا کہ کوٹھی نہیں شہر تعمیر ہو رہا ہے ۔ گدھوں کے آنے جانے قافلے ، روڑیاں کٹتے اور آریوں اور آروں کے چلنے کا ترنم ، راج مزدور ، اٹھتی اونچی ہوتی دیواریں ، یہ جھل پہل اس کے تئیں ایک بھنگم شور تھا ، ایک بے سمت سرگرمی ۔

" ضمیر میاں ، سردلیں کیسے بنیں ؟ "

" کیوں ؟ "

بوڑھے بڑھئی نے عینک درست کی ، بولا : " کل جو لکڑی آئی تھی ، غایب ہے "۔

" لکڑی غایب ؟ "

لکڑی کس نے غایب کی ، ایک ایک سے پوچھا گیا ، ڈانٹا گیا ۔ راج مزدور کام چھوڑ چھوڑ گرد اس کے جمع ہوئے اور لگے ایک دوسرے کو تہمت دینے ۔ پھر باوا آئے ۔ شور کرتے مزدور ایک دم سے چپ ہو گئے ۔ انہوں نے سیدھے سبدھے سوال کئے ، ایک راج نے آ کھڑے

آ گھیرے جواب دئے ۔ نمک بڑا ، نکال دیا ۔

سریوں اور چوکھٹوں کی لکڑی غایب ہوئی ۔ پھر اینٹوں پہ گمان گذرا کہ کم ہیں ۔ پھر سیمنٹ کی چند بوریاں کم ہوئیں ۔ جس کسی پہ شک پڑا ، نکال باہر کیا ۔ چوری کا سلسلہ جاری رہا اور راجوں کو نکالنے کا سلسلہ لمبا ہوتا گیا لیکن راج مزدور وہی تھے ، ایک تھیلی کے چٹے بٹے ۔ نکالے ہوئے راج پھر کام پر آنے لگے ۔ پھر نکالے گئے پھر کام پر لگے ۔ اور برائی کا ایک چکر قایم ہو گیا ۔

" کام اب تک شروع نہیں ہوا ؟ کہاں ہیں راج ؟ "

" نیو میں ، خزانہ ؟ " ایک راج نے پر اسرار سے لہجے میں دبی زبان سے کہا ۔

" کیسا خزانہ ؟ "

" ابھی برآمدے کی نیو کھودتے کھودتے چھناکا ہوا ۔ سب کھود رہے ہیں اپنے ...... خزانہ نکلے گا " ۔

راج سارے کے سارے دن بھر آدھی ہوئی نیو کو کھودتے رہے ، گہرا کرتے رہے ۔ جنہوں نے کھدائی میں حصہ نہیں لیا وہ آمدہ نیو میں بیٹھے وہاں دبکے رہے اور ہر ضرب پہ حیرانی کا مظاہرہ ہوتا رہا ۔ شام کو کھلا کہ کانسی کا دیگچا ہے ، کوڑے اس میں بھرے ہیں ۔

" اشرفیاں کوئلے بن گئیں " نانی اماں افسوس بھرے لہجے میں بولیں " اپنی قسمت کی بات ہے ۔ اور نیت کا بھی معاملہ ہووے ہے ۔ سنا دو جانوں کسی راج کمبخت کی نیت میں فرق تھا "۔

راجوں کی نیت کا فرق قایم رہا اور تعمیر کے ساتھ خرابی کی صورت چلتی رہی ۔

راجوں کے ہنگام شور سے دل اکتانے لگتا اور وہاں سے ہٹ کر کنوئیں کے پاس بڑ کے پیڑ کے نیچے آ جاتا ۔ گندل کی پکار " ہیرا ، اوئے ہیرا...... ہیرا ہوت "۔

" ہمیں "۔

" اوئے چھوٹے میاں آیوں ہیں ، کھاٹ ڈال دے "۔

" آیا "۔

ہیرا سدھ سدھ ہوتا بھک چھپک آیا ۔ چارپائی بچھ جاتی ۔ بڑ کے گھنے سایے میں لیٹ کر اسے کتنا سکون ملتا ۔ گندل راکھ میں دبا ہوا اپلا کریدتا ، چمٹے سے توڑ کر چلم بھرتا ۔ اور پائنتی کے سہارے بیٹھ چلم پینے لگتا ۔

" ممیر میاں " ہیرا بولا ۔

" ہوں "۔

" یہ کوٹھی کب تک بنو گی ؟ "

" بن رہی ہے ۔ بن ہی جائے گی " ۔

" تو وا کے بعد سگرے حویلی والے یاں پہ آ جاوس گے ؟ "

" اور کیا ؟ "

" اور حویلی خالی ہو جاوے گی ؟ " ۔

" خالی ؟ ہاں "

گندل نے چلم پیتے پیتے آنکھیں کہ بند ہو چلی تھیں کھولیں ، کھنکارا ، چلم ہیرا کی طرف بڑھا دی ۔ آنکھیں پھر مندنے لگیں ۔ گنگنانے لگا :

رات گنوائی سوئے کے دوس گنوایو کھائے
ہیرا جنم امول تھو کوڑی بدلو جائے

اس کی آنکھیں بھی بند ہونے لگیں تھیں اور میٹھی میٹھی غنودگی آنکھوں میں آنکھوں کے راستے سویرے بدن میں اترنے لگی تھی کہ منشی جی کی آواز نے چونکا دیا ۔

" چھوٹے میاں " منشی جی کی آواز گھبرائی ہوئی تھی ۔

اس نے آنکھیں کھول دیں " کیوں ؟ "

" پپیتا سوکھ گئی "۔

" کونسا سوکھ گئی ؟ " وہ حیران رہ گیا ۔

" جی " منشی جی بولے " کوئلہ سوکھ گئی ۔ اب باقی کہاں سے آوے ۔ کام رکا پڑا ہے "۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا ۔ بھٹے کوئلہ کے پاس گیا کہ جہاں محنتی سارے کام چھوڑ چھوڑ کر جمع تھے ۔ کچھ کوئلہ کو جھانک جھانک کر دیکھتے تھے ، کچھ نے ٹولیاں بنائی تھیں اور درخت کے سائے میں بیٹھے حقے پیتے تھے ، ابلتے تھے ، پھر گھر کی طرف ہو لیا ۔

بیٹھک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر ہوا تو باوا کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں اور بڑی آپا نے بے ساختہ بولیں " اے ہئے ایسی دھوپ میں مارا مارا پھرے ہے ۔ دیکھو تو سہی منہ سرخ ہو رہا ہے "۔

باوا بڑی آپا کی بات کو نظر انداز کر کے اسے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھتے رہے " کیوں ؟ "

" کام رک گیا " اس نے آہستہ سے کہا ۔

" کیوں ؟ " باوا نے پھر اسی تیز استعجابیہ لہجے میں سوال کیا ۔

" کوئلہ سوکھ گئی "۔

" کیسے ؟ " بڑی آپا چونک پڑیں ۔

بڑی آپا کا سوال بے جواب رہا ۔ وہ بولنا چاہتا تھا لیکن باوا کے تیور دیکھ کر چپ ہو گیا ۔ باوا خاموشی سے اٹھے ، کپڑے درست کئے ، جوتا پہنا ، باہر ہو لئے ۔

باوا کے باہر جانے پہ سکتہ ٹوٹا ۔ تائی اماں نے جھرجھری لی " اے ضمیر کوئلہ سچ مچ سوکھ گئی تھا ؟ "

" جی تائی اماں "۔

" کیسے سوکھ گئی ؟ " بڑی آپا نے سوال کیا ۔

" گرمی سے "۔

" گرمی سے ؟ " تائی اماں کے لہجے میں طنز کا رنگ تھا " گرمی سے کبھی کنوئیں سوکھا کرتے ہیں ۔ آخر ہرٹ کا کنواں بھی تو ہے ، دن رات چلے ہے ڈوبا ، وہ کیوں نہ سوکھا ؟ "

" تائی اماں " وہ کہنے لگا " یہ کوئلہ تو تھوڑے دنوں کے لئے کھدوا لی تھی ۔ کچی تھی اتھلی تھی ، دھوپ سخت پڑی ، سوکھ گئی "۔

وہ بڑبڑائیں " ہاں اب جو جی چاہے کہہ لو "۔ اور چپ ہو گئیں ۔

بڑی آپا چپ تھیں ۔ امی بھی ۔

پھر امی نے جماہی لی ، بولیں " ڈوبی کوٹھی تو ایسی کھٹائی میں پڑی ہے کہ بن ہی نہیں چکتی ۔ روز نہ ہفتن پڑے ہے "۔

بڑی آپا اسی طرح چپ تھیں ۔ تائی اماں چپ تھیں ۔ تائی اماں چپ رہیں ، پھر بڑی آپا سے مخاطب ہوئیں " جمعون تجھے یاد ہے جب پیر جی والوں کا گھر بن رہا تھا ؟ "

"ہاں" بڑی آپا نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا اور پھر خیال میں ڈوب گئیں ۔

"بڑی دھوم دھام سے جلدی جلدی بنی تھیں" ۔ نانی اماں شروع ہوگئیں "وہ سمجھتیں کہ اللہ کی پناہ ، جیسے نرالا انہیں کا گھر بن رہا ہے ۔ نیم کھدی ۔ اسی دن کوٹھیا کھدی ۔ پیر جی کے ہاں پھر دونے مٹھائی بانٹیں ۔ برادری کا ایک ایک بچہ گیا ، تکمیلیں اٹھائیں ، پھر سہرے گائیں اور کوٹھا کھلوایا ۔ پانی ڈوبا ایسا ٹھنڈا اور میٹھا کہ کیا بتاؤں" ۔ جب ہوئیں پھر شروع "پھر پہ ...... دوسرے دن صبح کو جو سقہ ڈول ڈالے ہے تو ڈول اٹھے سے زمین میں جا کے اٹکا ۔ ہوئی سو نہیں" ۔

بڑی آپا نانی اماں کا منہ تکنے لگیں ۔

امی ٹھہر کر بولیں "جی نانی اماں بہت کا اتنی دو پہل ملے ہے ۔ یہ دونے پر ہی ویسے ہیں ، ابھی تو اوچھے" ۔

"یہ تو سچ ہے بہو" ۔ نانی اماں بولیں "مگر بعضی بعضی زمین بھی ایسی ہووے ہے کہ آباد نہیں ہوتی ۔ اب یہ دیکھ لو کہ پیر جی نے ہاتھ کوشش کی ، دوسرا کنواں بھی کھدوایا ، مگر ایسی کھدائی پڑی کہ ڈوبا مکان بھی نہ بنا ۔ انہیں دنوں بڑا بیٹا جوان ہوا ، وہ چوڑی چھاتی ، یہ ڈیل ، کھڑے کھڑے میں چٹ پٹ ہوگیا ...... اسی برس ان کی آنکھ بند ہوگئی" ۔

بڑی آپا چپ ۔

امی سوچ میں پڑ گئیں ، پھر دھیمی دھیمی آواز میں بولیں "خیر نانی اماں یہ تو رہنے دو ۔ مکان تو وہ بنا ہی ۔ اور بھئی ایسا اچھا مکان بنا ہے کہ شہر میں تو اس کا ثانی ہے نہیں" ۔

"اے کیا بنا" ۔ نانی اماں نے بیزاری سے کہا "یہ کوئی دیکھنے میں بنا ہوا ۔ پھر آخر گیا تو ڈوبا گھر بنا ۔ بڑا بیٹا گیا ، باپ گیا ۔ چھوٹے نے لے جا کے بکوا لیا ۔ اب تم کہو کہ شہر میں اس کا ثانی نہیں ۔ بھلا کیا اس میں سرخاب کے پر لگے ہیں ۔ پیر جی نے جو نقشہ بنوایا تھا اس کا تو یہ ادھیائی بھی نہیں" ۔

امی لاجواب ہوگئیں ۔ بڑی آپا چپ بیٹھی رہیں ، پھر انہیں خیال آیا کہ نماز کا وقت جاتا ہے ۔

گارا کہ دن بھر دھوپ میں تپتا تھا گاڑھا ہوا ، پھر اس پہ پپڑیاں جمنے لگیں پھر سوکھ کر تڑخنے لگا ۔ اینٹیں کہ دن بھر منڈلاتی تھیں اور سنہرا سونا سمیٹتی تھیں ہجرت کر گئیں ۔ باؤ نے کنوئیں کا خیال چھوڑا اور نل کا بندوبست شروع کیا ۔ تعمیر کا کام بند ، نل ڈالنے کا کام شروع تھا ۔ پہلے گارے کے سوکھے ڈھیر بن گئے ، ادھ بنی دیواروں کہ دور سے گیلی اور بھیگی دکھائی دیتی تھیں ان کی تری غائب ہونے لگی ۔ راج کہ دن بھر اینٹیں تھامے پھرتے اور دیواریں چنتے تھے دیواروں کو ادھ بنا چھوڑ کر چلے گئے تھے : اور ادھ بنی دیواروں پہ سکوت طاری تھا ۔ سوکھی کوئیا کے پاس مزدور دن بھر کام کرتے ، جہاں پہلے لمبی لمبی چھڑیں نصب نظر آئیں اور ان میں بندھی ہوئی لمبی رسی ۔ پھر وہ چھڑیں غائب ہوئیں اور ایک سینہ قد نل نصب ہوا ۔ نل چلا ، نل کے ساتھ گارا گیلا ہوا اور خشک ادھ بنی دیواروں میں نمی کی رو پھر سے دوڑی ، اور اینٹیں کہ گارے کو سوکھا دیکھ کر تل گئی تھیں ، لوٹیں اور کبھی نل کے پاس کی پیلی پاکیزہ کیچڑ پر منڈلائیں اور کبھی گارے سے رس کھینچتی دکھائی دیں ۔

نل دن بھر شور کرتا ، اور دن بھر دیواروں پہ کھٹ کھٹ ہوتی رہتی ، اور دن بھر وہ کبھی تازہ تازہ بنی ہوئی دیواروں اور سوندھی سوندھی خوشبو والے کمروں میں جہاں سبزہ اسی طرح پڑا تھا گھومتا ، کبھی اس کھڑاگ سے بیزار ہو تھک تھکا کر بڑ کے درخت کے نیچے آجاتا ۔

اور پھر اینٹوں اور روڑوں اور نل کے شور سے دور چھاؤں اور سکون اور گنڈل کی چلم سے نکلتی ہوئی غنود آمیز گڑ گڑ اور بند ہوتی ہوئی آنکھیں

راب گنوائی سونے کے دوس گنوایو کھائے
ہیرا جنم اسول تھو کوڑی بدلو جائے

ہیرا اپنے بیٹھے ہوئے دیروں کو دیکھتا ، انگلیوں اور ہتیلوں کو دیکھتا کہ چرس کی رسی کی رگڑ سے سرخ ہو گئی تھیں ، چھل گئی نہیں اور کہنے لگتا " گنڈل ، کہا اچھا ہے اسور کی ، اب کے ورسا ہوگی ؟ "

گنڈل کہاںسا اور چلم پینے لگتا ۔

ہیرا چپ بیٹھا رہتا اور پھر آپ ہی آپ بڑ بڑانے لگتا " اچھا ساون تھیو ، ایکو بار بھی آلھا نئی بڑی " ۔

بنی اور اچھے حویلی سے آنکھ بچا کر نکلنے اور دوپہری بھر بھونڈ میں منڈلاتے رہنے ۔ اچانک کسی سمت سے نمودار ہوتے اور دور سے آواز لگاتے " ضمیر بھائی ، دیکھو ، ہمارے پاس بڑیا " ۔

" بڑیا بڑیا اللہ میاں سے میرا سلام کہیو " ۔

" اور میرا بھی " اچھے لکڑا لگاتا ۔

" بڑیا بڑیا اللہ میاں سے میرا سلام کہیو اور اچھے کا بھی " ۔ اور بڑیا بنی کی ننھی منی چٹکی سے نکل کر فضا میں تیرنے لگتی ۔

وہ انہیں ڈانٹنے لگتا " تمہاں بھر رہے ہو دھوپ میں....... ادھر آؤ " ۔

دونوں کے دونوں ، کبھی ، ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھنے اور پھر الٹے بھاگ پڑتے " ضمیر بھائی ہم گھر جا رہے ہیں " ۔

بنی اور اچھے نظروں سے اوجھل ہو جاتے اور وہ اپنے کام سے لگ جاتا ۔ پھر وہ بڑ کے نیچے چارپائی پہ آ لیٹتا اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں کہ وہ پھر آن وارد ہوتے ، مگر اس مرتبہ ڈرے ہوئے ، آنکھوں میں دہشت ۔

" ضمیر بھائی کر کمنٹا " ۔

" واں " اچھے اشارے سے بتاتا " کھنڈال کے بڑ پہ ۔ سرخ ہوگیا ہمیں دیکھ کے " ۔

" تو گھر نہیں گئے تم ؟ " وہ انہیں گھور کے دیکھتا اور دونوں کے دونوں اپنی جگہ پہ جمے رہ جاتے ۔

پھر وہ انہیں گھیر گھپ کے گھر لے کے چلتا ۔ کبھی میںڈھ پہ ، کبھی لیکھ میں ، دگڑا ، پھر پکی سڑک ، سڑک سے گلیوں میں ، ٹھٹیروں کی گلی ، پھر بزریا ، پھر باؤ کی گلی ، پھر لال مندر ۔ پھر گھر آجاتا ، نیما آنگن ، سنسان دالان کہ کسی کسی گوشے میں کڑیوں کے قریب اکا دکا بر بھنبھنا رہی ہوتی ۔ دل کہ اندر قدم رکھتے ہوئے ذرا ذرا دھڑکتا پھر ڈوبنے لگتا اور وہ پھر الٹے پاؤں بھونڈ کو ہو لیتا ۔

(۶)

کوٹھی کی تعمیر جاری تھی : رکی ، رک کر شروع ہوئی ، شروع ہو کر رکی ، رک رک کر جاری رہی ۔ باوا کا اندازہ اب ذرا غلط ہو گیا تھا ، مدت اور لاگت دونوں کے بارے میں ۔ اگنے سے دگنا خرچا جاچکا تھا اور تعمیر تھی کہ ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آئی تھی ۔

تعطیلات اس کی ختم ہو رہی تھیں ۔ تعلیم کا اس کا سلسلہ جاری رہے گا کہ ختم ہوا چاہتا ہے ، اس پہ اب اس میں شک پیدا ہو چلا تھا ۔ امی کی باتیں بھی معنی خیز تھیں اور باوا کی خاموشی بھی ۔ امی نے مختلف موقعوں پر مختلف لہجوں میں بات کی لیکن مرکزی نکتہ ایک ہی تھا ۔ تائی اماں سے کہہ رہی تھیں " اجی تائی اماں ، پڑھائی تو بی اے پہ ختم ہو جاوے ہے ۔ موئے ایم اے کی تو بس تم تمام ہے ۔ میں تو آن سے یہ کہہ رہی ہوں کہ بس کرو ۔ بی اے کر ہی لیا ہے ، نوکری جیسی قسمت میں ہے مل جاوے گی ۔ بعد سارے ایم اے سے کیا سرخاب کا پر لگ جاوے گا "۔ اسے سمجھانے لگیں " بھیا اس پڑھائی لکھائی کو طاق میں رکھو اور کچھ کرو ۔ باپ کی پنشن ہو گئی ۔ ضعفی کا وقت ہے ۔ اسی وقت کے لئے تو اولاد مانگیں ہیں کہ پیری کا سہارا بنے ۔ وہ لائے ہم کھائیں ۔ مگر تمہاری پڑھائی ہی ختم نہیں ہوتی ۔ مجھے تو ہو نہیں کہ تمہیں ہر بات سمجھائی جاوے ۔ خود بھی غور کرو ، حالات کو دیکھو ۔ مقدمے میں اتنی رقم پہلا کھپانی ہوئی اور حویلی ہار کے بیٹھ رہے ۔ نگوڑی، کوٹھی بیسہ لئے جا رہی ہے اور پوری نہیں ہوچکتی ۔ آمدنی ہر طرف کی بند ہے ۔ خالی پنشن ہے ۔ پڑھائی کا بوجھ کیسے اٹھاویں گے "۔ امی کہتی رہیں ، وہ سنتا رہا ، باوا خاموش رہے ۔ باوا خاموش رہے ، پھر بولے ، مگر نہ مشورہ نہ دلیل نہ نصیحت ، دوٹوک بات ، پڑھائی بند کرو ، نوکری کا بندوبست کرو ۔

باوا کی رائے تھی کہ وہ فوراً یہاں سے روانہ ہو جائے ، کالج سے سرٹیفکٹ لے ، ان کی چٹھیاں لے کر مختلف افسروں کے پاس کہ کچھ کے وہ ممنون احسان تھے اور کچھ پر ان کے احسانات تھے جائے اور نوکری کا معاملہ کرے ۔ مگر امی کو دکھ یہ تھا کہ حال آیا کہ حویلی سے کوٹھی میں منتقل ہونا ہے ، یہ کام اکیلے آدمی کے بس کا کب ہے ۔ بات باوا کی سمجھ میں آ گئی ۔ روانگی اس کی دو دن کے لئے ملتوی ہوئی اور مکان کی منتقلی وقت سے پہلے شروع ہو گئی ۔

رات دیر تک وہ جاگتا رہا ۔ تائی اماں عشاء کی نماز سے فارغ ہو بیچ آنگن میں پڑے ہوئے کھرے چھپر کھٹ پہ آ بیٹھیں اور اچھے اور نبی کے پے در پے مطالبوں پر خانہ خراب سر گوارہ وطن شہزادوں اور نامراد شہزادیوں کے قصے سنانے لگیں ۔ کہانی کسی منزل پہ نہ پہنچی تھی کہ نبی سو گئی ، پھر اچھے کی آنکھیں بھی بند ہونے لگیں ۔ تائی اماں کہانی کہتی رہیں ، اور جب سننے والوں نے خراٹے لینے شروع کر دیئے تو پھر ان پہ بھی غنودگی طاری ہونے لگی ۔ باوا کہ رات کو فراغت اور اطمینان سے تہمد اور ململ کے کرتے میں مونڈھے پہ بیٹھے گھنٹوں خاموش حقہ پیتے رہتے تھے اور اسے پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کس وقت چارپائی پہ لیٹے ہیں آج اس کے سامنے اٹھے ، حقہ الگ رکھا ، اور چارپائی پہ لیٹ گئے ۔ تحسینہ نے آہستہ سے اٹھ کر لالٹین مندی کی اور اسی آہستگی سے پھر اپنی چارپائی پہ جا لیٹی ۔ رات بھیگ چلی تھی ۔ تارے ، گرد میں اٹی میلی کوڑیاں ، ٹک اجل گئے تھے ۔ آخر بڑی آپا بھی کہ عشاء کے وقت سے لے کر اب تک نماز کی چوکی پہ ایک پہلو بیٹھی تسبیح کو گردش دیئے جاتی تھیں چوکی سے اٹھیں ۔ لالٹین کی لو مندی ہوتے ہوتے بجھنے لگی تھی کہ انہوں نے بڑھ کر بتی تیز کی ، مگر فوراً ہی وہ پھر مندی ہونے لگی ۔ لالٹین اسٹول سے اٹھا کر کان کے قریب لا اسے ہلایا ، تحسینہ کو آواز دینے لگیں " تحسینہ "۔

" جی "۔

" بی بی تیل نہیں ڈالا تھا لالٹین میں ؟ "

" ڈالا تو تھا " وہ رک کر آہستہ سے بولی " مگر بوتل میں تیل ہی نہیں تھا ، ذرا سا تھا "۔

بڑی آپا نے لالٹین کو سٹول پہ رکھا ، بڑبڑانے لگیں " لالٹین تو جا رہی ہے ، اب رات بھر اندھیرے میں پڑے رہو "۔

رات بہت سی تر چمک ہوئی ، رات کہ بتی کی روشنی کے داغ دھبوں سے پاک تھی ، بے میل بے داغ اندھیری رات ۔ نانی اماں کے خراٹے ۔ اب شاید بڑی آپا بھی سو گئی تھیں ، اس کی آنکھیں بھی نیند سے بوجھل ہو ہو کر بند ہونے لگیں ۔

آنکھ کھلی تو پھر وہی روز مرہ کی فضا ، بڑی آپا نماز کی چوکی پہ بیٹھی ہوئیں ، وہی پرسرور رقت بھری آواز

مولا علی ، وکیل علی ، بادشاہ علی

اس کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں ، ایسے لگا کہ سمندر کی اقلیم سے نکا کی آواز آ رہی ہے

شیوہ اگرچہ اپنا نہ پند وعظ و بند ہے
پر اس کو سن رکھا ہے کہ تو کچھ درد مند ہے
کیا ہے جو عرصہ تنگ ہوا کام بند ہے
دل جمع کر کہ صاحب مولا بلند ہے
یعنی کرم شعار ہے مشکل کشا علی

مولا علی ، وکیل علی ، بادشاہ علی

اسی نے آکے جھنجھوڑا " صبح اٹھو ، کام کے دن ہو سویرے اٹھ جایا کرو ، روز وہی سارے بجے تک سانا ، ڈوبی نیند نہ ہوئی افیم ہوئی "۔ وہ ٹھٹکے سے ایک دم اٹھ کھڑا ہوا ۔ آنکھ کھول کے دیکھا تو صحن کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی ۔ نیا پرانا دنیا بھر کا کاٹھ کباڑ کہ کمروں کوٹھریوں میں بند تھا اب صحن میں اس کا اڑنگ لگا تھا ۔

بڑے ابا کی بیٹھک بھی کھلی ۔ سرخ اور سرمئی جاجم کہ بعض پہ سنہری بعض پہ روپہلی باریک جالی کڑھی تھی اسی پرانے قرینے سے تہ کی رکھی تھیں ، بس ان پہ گرد کی تہ کچھ زیادہ دبیز ہو گئی تھی ۔ پیتل کا چمکتا اگالدان ، کونے میں رکھی ہوئی لام کی شکل کی چھڑی ، اونچا جوڑا تخت ، تخت پہ اجلی چاندنی اور قالین اور گاؤ تکیہ ، تخت کے برابر کونے میں رکھا ہوا نیچہ دار حقہ ، اور ڈاٹ والی چھت کے کنڈوں میں لٹکا ہوا بھاری فرشی پنکھا کہ ساکت اور ساکن تھا ، پر لگتا تھا کہ ابا میاں ابھی آئیں گے ، گاؤ تکئے سے کمر لگا کے بیٹھیں گے اور فرشی پنکھا حرکت میں آئے گا اور اس کی بھاری جھالر سے نکلتی ہوئی ہوا بیٹھک کے کونے کونے میں پہنچے گی ۔

" نانی اماں " بڑی آپا اداس لہجے میں نانی اماں سے مخاطب ہوئیں " ایسا لگے ہے کہ ابا میاں ابھی ابھی اٹھ کے ذرا مسجد تک گئے ہیں "۔ بڑی آپا چپ ہو گئیں ۔ ان کی آواز بھرا گئی تھی ۔ پھر ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں ۔ پھر وہ آہستہ سے باہر نکل گئیں ۔

زنگ لگے برتن اور دیمک چاٹے کاغذ کہ جانے کن برسوں سے انہیں ہوا اور دھوپ نہیں لگی تھی ، پرانی کپڑا لگی پوشاکیں کہ جھٹکی مارے سے تار تار ہونے لگتیں ، بزرگوں کی نشانیاں اور یادگاریں کہ پشتوں سے صندوقوں میں بند تھیں ، اور خود رکھوالی اور وارث دیدار سے ان کے محروم تھے ، اب یہ سب کی سب دولت اندھیرے کمروں اور تہہ خانوں اور مقفل صندوقوں سے نکل کر صحن میں آ گئی تھی ۔

" اے بڑی آپا تمہیں کیا ہو گیا ہے " ۔ اسی کمروں اور کوٹھریوں کا جائزہ لیتے لیتے باہر آئیں ، بال اور چہرہ اور لباس گرد سب پہ اٹی تھی اور پسینے سے بھیگ چلی تھیں ،

بڑی آپا کو فراغت سے بیٹھا دیکھ کے چونکیں " اے بڑی آپا تمہیں کیا ہو گیا ہے ۔ ایسے بیٹھی ہو جیسے کوئی کام ہی نہیں ہے ۔ اپنے سامان کی خبر لو نا ، کب نکلے گا کب جائے گا " ۔

" بی بی میرا کیا ہے ، تم اپنا سامان نکالو "۔ بڑی آپا خشک سے لہجے میں بولیں ۔

" اے ہے یہ کیا بات ہوئی ؟ " امی ٹھٹکیں ۔

" بات کیا ہوئی " بڑی آپا نے اپنی دانست میں لہجے میں بڑی معروضیت پیدا کی تھی ، مگر اس سے مایوسانہ احتجاج کا رنگ صاف عیاں تھا " تم اپنا سامان نکالو ، بھجواؤ " ۔

" اور تمہارا سامان ؟ " امی نے ٹھٹک کر پوچھا ۔

" میرا سامان نہ جائے گا " ۔

" کیوں ؟ " امی کے جیسے پتنگے لگ گئے ہوں

باوا سامان کے انبار کے پاس کھڑے چیزیں درست کر رہے تھے ۔ انہوں نے مڑ کے دیکھا ، پھر سامان کو چھوڑ آہستہ سے قریب آئے ۔ امی فوراً ان کی طرف مخاطب ہوئیں " سن رہے ہو جی ، بڑی آپا کہتی ہیں میرا سامان نہیں جائے گا " ۔

" کیوں ؟ .... کیا بات ہے بڑی آپا ؟ "

" میں نہ جاؤں گی " ۔ بڑی آپا نے قطعی انداز میں جواب دیا ۔

امی چپ ۔ باوا چپ رہے ، پھر بولے " آخر کیوں ؟ "

" کوئی زبردستی ہے ۔ تم جاؤ ۔ اللہ تمہیں نیا گھر مبارک کرے ۔ میں تو نہ جاؤں گی " ۔

" نائی اماں دیکھ رہی ہو " ۔ امی نے اب نائی اماں سے انصاف چاہا ۔

نائی اماں جھڑکی کے انداز میں بولیں " اے چھموں ، تجھے کیا ہو گیا ہے ۔ یہ بھی خوب رہی کہ نہیں جاؤں گی ۔ تو بی بی نہیں جاؤگی تو یہاں اکیلی دیواروں سے سر پھوڑوگی ؟ "

امی نے فوراً ٹکڑا لگایا " اور نائی اماں اکیلا بھی یہاں کون رہنے دے گا ؟ "

" اجی میرا رہنا نہ رہنا کاہے کا ہے ۔ تجسیمہ پرائے گھر کی ہے ۔ دنوں کی بات ہے ، بھائی امداد علی آ جاویں تو چار بول پڑھواؤں اور گھر سے دھکا دوں ۔ بچی ہے سو نائی اماں سے ہلی ہوئی ہے ساتھ چلی جاوے گی ۔ رہ گئی میں ، سو آنے والوں سے کہوں گی کہ بھیا ایک کوٹھری دے دو " ۔

" بڑی آپا کیسی باولوں کی باتیں کر رہی ہو " ۔ امی غصہ کرتے کرتے سمجھانے پہ آ گئیں " ایسی بات کرو کہ سمجھ میں آوے ۔ اپنا گھر ہوتے سانے بھلا دوسروں کے سر پڑنا ۔ یہ یوں بیٹھے لو لوسنا ہوا " ۔

بڑی آپا ٹس سے مس نہ ہوئیں ۔ امی ، نائی اماں ، باوا سب چپ ۔ امی نے پہلو بدلا اور اس سے مخاطب ہوئیں " ضمیر بڑی آپا کا سامان نکال " ۔

" نا میرا سامان نہ نکلے گا " ۔ بڑی آپا نے قطعی انداز میں کہا ۔

" مگر کیوں ؟ " باوا نے اسی قطعی انداز میں سوال کیا ۔

" بس میں یہاں سے نہ جاؤں گی " بڑی آپا بھی آج باوا کے مقابلے میں جم گئی تھیں ۔

" آخر کیوں نہیں جاؤگی ؟ وجہ ؟ " باوا کا لہجہ درشت ہو گیا ۔

" نہیں جاؤں گی " ۔ بڑی آپا نے تڑخ کر کہا ، مگر فوراً ہی آواز میں دکھ پیدا ہو گیا " اب تو میرا جنازہ ہی یہاں سے جائے گا ...... ابا میاں کی آنکھ یہیں بند ہوئی تھی ، میری بھی ......" بڑی آپا رو پڑیں ، پھر ہچکیاں لینے لگیں ۔

باوا آہستہ سے سرکے اور پھر سامان کے انبار پہ آ کر چیزیں درست کرنے میں مشغول ہو گئے ۔

" ضمیر " ۔

" جی " ۔

" ایک ٹھیلا پہنچانا ہے ، اسے لے کر جاؤ ؟ "

وہ باہر نکلا تو بیچ میں دروازے پہ ٹھیلا لدا کھڑا تھا ، اور بنی اور اچھے بے صبری سے ٹھیلے والے کے پاس آئے ، دہائی لگانے کہ چلو ، پھر پیچھے جاتے اور اپنی پوری طاقت سے ٹھیلے کو دھکیلنے کی کوشش کرتے ۔ منہ ان کے سرخ ہوتے جا رہے تھے ، مگر ٹھیلا ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا ۔ اس کے کہنے پہ ٹھیلے والے نے پھریری لی اور ٹانڈے باندھے پہ لدا پھندا ٹھیلا حویلی سے کوٹھی کو روانہ ہوا ۔

ٹانڈے باندھے پہ لدے ٹھیلوں کا دن بھر تانتا بندھا رہا ۔ پھر پھر سامان حویلی سے لانا اور کوٹھی کے برآمدوں اور کوٹھے کمروں میں کہ کمروں کی دیواروں کا سمٹ بھی نہیں ہو سکا تھا انڈیلنا ۔ ہر ٹھیلے کے آگے آگے ننھے نقیب بنی اور اچھے کہ ڈیوڑھی قریب آتی تو آگے جا کر ٹھیلے کی آمد کا پورے جوش سے اعلان کرتے اور ضمیر بیزاری سے پیشوائی کو باہر نکلتا اور سامان اترواتا ۔ بنی اور اچھے ٹھیلوں کے آگے آگے نقیب بن کر چلتے ، کبھی ان کا جی چھوڑنے اور ٹھیلے کے پہیے پہ ہو آؤ یہی جوش وہ کھڑے ہو کر منادی کرتے اور ٹھیلوں سے پہلے سڑک پہ رینگتے ہوئے ٹھیلے کو دیکھ کے غل مچانے لگتے " ٹھیلا آ رہا ہے ۔ ضمیر بھائی ٹھیلا آ رہا ہے " ۔ اور جب ٹھیلا کوٹھی کی حدود میں آ جاتا تو چھت سے اتر کر باہر نکل اس کی پیشوائی کرتے ۔ کبھی نقیب ، کبھی منادی ، کبھی پیشوا ، پھر اس پورے دھندے سے جی اچاٹ اور ایک پڑوا کے دیکھتے کہ باڑی پہ پہنچی جلی جاتی نہیں ہو لیے اور دور نکل گئے ۔

میزیں ، کرسیاں ، پلنگ ، چھپر کھٹ ، بڑے بڑے ٹرنک ، مقفل صندوق ، کوئی ادھ ٹوٹی ٹھنڈی کوئی ٹوٹا پھوٹا کٹولا ، دیگ دیگچے ، کوئی لمبا بانس اٹمل بے جوڑ بانٹے بٹیاں اور نواڑ کی چکٹی ، پاؤں کی پھاندی ، ساتھ میں ایک جھنگا ، ٹین کے خالی کنستر ، چھوٹے بڑے پرانے پچکے ہوئے اور نئے چمکتے ہوئے ڈبے ، طوطے کی تصویر والی پالش کی خالی ڈبیاں ، بظاہر بے فائدہ مگر سامان کا باقاعدہ حصہ ۔ ایک اڑنگ تھا کہ برآمدے کی چھت سے جا لگا تھا ۔ اسے خفقان ہونے لگا ۔ سامان اس کے سر پہ چڑھا آ رہا تھا ۔ برآمدے سے باہر آیا ، پھر کنوئیں کی طرف نکل آیا ۔ کنواں رکا ہوا تھا ، بن حشک ، بیل ایک طرف کھڑے اونگھتے تھے ، اور گندل ڈھاک کے پیڑ کے نیچے اکیلا حقہ پیتا تھا ۔

" گندل آج کنواں نہیں چلا ؟ "

" نہیں میاں " گندل بولا " جرس کو کٹو کتر گئی ۔ جو ہوئے تھی ، ہمرا گٹھائی کرائے گو ہے " ۔

گندل نے اٹھ کر چارپائی ڈالی ۔ " چھوٹے میاں ، بیٹھ جاوو " ۔

ضمیر بیٹھ گیا ۔ گندل نے راکھ سے آپلا کریدا ، چمٹے سے توڑ کے چلم میں بھرا ، وہاں سے اٹھا تو ضمیر قدموں میں آ بیٹھا ۔

" ضمیر میاں کب جاوو گے ؟ "

" کل " ۔

گندل سوچ میں پڑ گیا ، پھر اس نے چلم کا گھونٹ لیا ، پھر بولا " ضمیر میاں .... وا کے بعد جدوں ڈپٹی بن جاوو تو گندل کو اپنے دھورے بلائے لیجو " ۔

ضمیر چپ بیٹھا رہا ۔ گندل بھی جواب کا منتظر نہیں تھا ۔ آنکھیں بند نہیں ہوئی تھیں ہاں ایک خواب کی کیفیت اُن میں پیدا تھی ۔ اُس کا لہجہ اُداس ہو گیا " چھوٹے میاں ، اپنی

دیپٹی میں سکت نائے رئی ، ھڈی نے ماس چھوڑ دیو ۔ ابا میاں کی آنکھ بند ھوگئی ، نئیں تو میں انو بلشن پے ھوتا.........یو شریر کام ھوگا نئیں ریو ، کچی مٹی کا ڈربا ھے ، اوھک توجھ پڑو تو ڈھے جاوے گا "۔ وہ چپ ھوگیا ۔ اس کی نظریں آس پاس کی چیزوں سے ھٹ کر سامنے کے کھیتوں میں پہنچ گئی تھیں ، جہاں پژمردہ ھریالی پہ دھوپ چھاؤں کا کھیل ھوتا تھا ، جلدی جلدی چلتی ھوئی دھوپ ، اس کے پیچھے دوڑتا ھوا سایہ ، ابر کی ایک ھلکی چادر کھیتوں میں پھیلتی چلی گئی اور دھوپ کھیتوں سے پرے بیڑوں کی قطار کو چھوتی ھوئی آگے نکل گئی ۔ اس کی آنکھیں اوپر اٹھ گئیں اور ضمیر کی بھی ۔ اکا دکا تیرتے ھوئے سفید بادل اس میں گھل مل کر سورج پہ چھا گئے تھے ۔ کھیتوں سے پرے سڑک پہ ننگ دھڑنگ لونڈوں کی ایک ٹولی کہ منہ پہ کالونس مل رکھی تھی اور ھاتھوں میں چھوٹے چھوٹے ڈنڈے تھے ۔ ڈنڈے بجاتے ھوئے ، زور زور سے گاتے ھوئے

کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے
رستے گا برسائے گا   کوڑی کھیت لگائے گا
کوڑی گئی رات میں   پانی گیا کھیت میں

" بادل آرہے ھیں ۔ لگے تو ھیں برسنے والے سے "۔ اس کے لہجے میں آس اور سک کی ملی جلی کیفیت تھی ۔

کندل دیر تک آسمان کو تکتا رھا ، پھر سک بھرے لہجے میں بولا " پورب سے اٹھے ھیں ۔ کیا خبر ھے برس ھی پڑیں "۔ پھر فوراً ھی اس کی نظریں بادلوں سے ھٹیں اور کوٹھی کی چھت سے اوپر کی اس منڈیر پہ جا ٹکیں جہاں بنی اور اچھے کھڑے تھے ۔ بنی نے چٹکی فضا میں بلند کی " بڑیا بڑیا اللہ میاں سے میرا سلام کہیو" ـــــ " اور میرا بھی" اچھے نے ٹکڑا لگایا ـــــ" بڑیا بڑیا دونوں کا سلام اللہ میاں سے کہیو "۔ اور بنی کی چٹکی کھولی ، گولا بڑیا چٹکی سے نکل فضا میں بہنے لگی ، اونچی اٹھنے لگی ۔

کندل بڑبڑانے لگا " یو بالک نے کہنی راڑھ مچاوے ھے "۔ پھر چلایا " لالہ جی منڈیر سے پلنگ کو ھو جاوو "۔

بنی اور اچھے منڈیر سے جھٹ سے چھت پہ کود گئے ۔ اوجھل ھوئے ، پر فوراً ھی پھر اچکے ، ننھے دوسری کہ منڈیر کے پیچھے سے دم کے دم میں ابھرے اور پھر اوجھل ھوگئے ۔

کندل نے پھر چلم منہ سے لگالی ۔ پرے کھیتوں میں وہ تکتا رھا ، پھر گڑگڑ گڑگڑ کی مدھ بھری آواز اس کی آنکھوں پر اس کے پورے جسم پر عمل کرنے لگی ۔ آنکھیں مندنے لگیں اور سبز اور نیند میں ڈوبی وہ آواز ھولے ھولے پھر ابھرنے لگی

رات ڈرائی سونے کے دوس کنوانو کھائے
ھیرا جنم امول تھو کوڑی بدلو جائے

بڑی آپا جنہیں روتے ھچکیاں لیتے چھوڑ آیا تھا ، محسنہ کہ کمروں سے سامان نکلتے وقت دور سے نظر آئی تھی ، چپ چپ کھوئی کھوئی سی ، وہ خیالات میں گم دیر تک بیٹھا رھا ۔ پھر ھڑ بڑا کر اٹھا ، اٹھ کے کوٹھی کی طرف ھولیا ، جہاں سامان کے آنے کا سلسلہ قائم تھا ۔ دن جا رھا تھا اور سامان ابھی بہت آنا باقی تھا ۔ ٹھیلوں کا ایک تار بندھا ھوا تھا کہ لدے پھندے رکتے رینگتے آتے اور خالی ھو جلدی جلدی تیور کرتے واپس ھو جاتے ۔ حویلی خالی ھو رھی تھی کہ شہر خالی ھو رھا تھا ۔ وہ فکر میں پڑگیا کہ شام تک سارا سامان نہ آیا تو کیا ھوگا ، کل تو اسے ھر حال چلے جانا ھے ۔ اسے اپنے جانے کا خیال آنے لگا ۔ حویلی کہ اس کے نئیں ماضی کی اڑتی خوشبو تھی مانند اک خواب کے ذھن سے بسرنے لگی ۔ اب سفر اس پہ سوار تھا ۔

میگھ ملہار

ناولٹ

ممتاز شیریں



عمل : دُوفي

أرفيوس

نیـــل کمـــل

یہ نیل کمل ہیں ، یہ نیل کمل ہیں ۔
کتنے سندر ہیں یہ ، یہ پاؤں ، یہ بالکل وہی ہیں ، یہ بالکل وہی ہیں ۔
جیسے اس مکمل ، حسین چاندنی میں دیوی کے سندر کنول جیسے پاؤں ۔
یہ وہی ہیں ، یہ وہی ہیں ، یہ نیل کمل ۔
آہ ، کیسا سکون ہے ، کیسا سکون ہے ان میں !
ان چرنوں کی مٹی اپنی آنکھوں پر مل لوں تو ان میں ٹھنڈک آ جائے ۔
ان چرنوں میں میں اپنا سارا جیون بتا دوں !
یہ نیل کمل ہیں اور آپ دیوی ہیں ، وہی سندر دیوی !
ہاں آپ وہی ہیں ۔
وہی دیوی جو اس مکمل ، حسین چاندنی میں میری ستار کی لے پر ناچ اٹھی تھی !

کتنی گمبھیر ، پر سکون ، سحر زدہ رات تھی وہ !
اور وہ چاندنی کتنی مکمل ، کتنی حسین ، کتنی مسحور کن !
ساری کائنات اس چاندنی کے سحر میں لٹی ہوئی تھی ، اور ستار کی مدھر تانیں اس پرسکون فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیتی تھیں ، اور ایک عجیب محویت کے عالم میں میری انگلیاں ستار کے تاروں کو چھیڑ رہی تھیں ۔
ان تاروں سے ایک نغمہ پھوٹا ، مچلا ، تڑپا ۔
کہیں دور سے پائل کی جھنک سنائی دی ، یہ پائل کی جھنک قریب آنے لگی ، اور قریب ۔

چھن چھن چھن چھن پائل باجے ،
چھن چھن چھن چھن ....

ایک پرچھائیں نظر آئی ۔
اور پھر دو پاؤں ۔ صرف پاؤں ۔ اتنے پیارے ، اتنے سندر ، اتنے پاکیزہ اور شفاف ، جیسے تازہ کھلے ہوئے ، جھیل میں نہائے ہوئے کنول ! نیل کنول !
پائل بج اٹھی ، وہ پاؤں آہستہ آہستہ تال دینے لگے ۔

وہ پرچھائیں اپنے پورے روپ میں نمودار ہو گئی ۔ بہت ہی سندر ، لانبے بال کھولے جو گھٹنوں تک لہرا رہے تھے ، منور چہرہ ، کول اور مضبوطی کا امتزاج ، گول ٹھوڑی میں ننھا سا گڑھا ، بھرے بھرے رخسار ، گہری نشیلی آنکھیں ، چاند سی پیشانی پر دمکتا ہوا ٹیکہ اور سر کے گرد ایک عجیب سی ، پر اسرار روشنی کا ہالہ ۔
نیلی ساری میں لپٹا ہوا متناسب جسم ۔
نازک کلائیوں پر موتیا کے گجرے ، موتیا کی لڑیوں میں لپٹی ہوئی باہیں ۔
موتیا کی لڑیوں میں لپٹی ہوئی باہوں کا لہراؤ ، بدن کے ہر ہر عضو میں بلا کی لچک ......

وہ بینگ ہے روپ میں کہ بجلی لہرائے
وہ رس آواز میں کہ امرت للچائے
رفتار میں وہ لچک پون ، رس بل کھائے
گیسو میں وہ لٹک کہ بادل منڈلائے

آآ کے راگنی کھڑی ہوتی ہے
دیکھیے کوئی سجل بدن کا یہ رچاؤ
ہر حظ بدن کی لو میں مدھم جھنکار
یہ شعلۂ حسن جیسے بجتا ہو ستار*

اف وہ روپ !

میں ایک عالم دیوانگی میں اپنی ستار بجائے جا رہا تھا ، بالکل کھویا ہوا ۔ وہ مست ناچے جا رہی تھی ۔

نہیں معلوم وہ کب تک ناچتی رہی اور میں کب تک بے خبر ، خواب کے سے عالم میں ستار بجاتا رہا ۔ مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی ، جیسے میں کسی سحر کے زیر اثر تھا ۔

اچانک وہ سحر ٹوٹ گیا ۔

وہ روپ ایک پرچھائیں ، ایک سلہوت میں تبدیل ہوگیا لیکن پرچھائیں بنتے بنتے روشنی کے ایک چھوٹے سے دائرے میں وہ دو حسین پاؤں پھر نظر آئے ۔

بالکل یہی پاؤں ، ایسے ہی سندر ، نیل کنول ۔

وہ نیل کمل تھم گئے ، پائل کی چھم چھم تھم گئی ۔

وہ پرچھائیں آہستہ آہستہ غائب ہو گئی ۔

آنکھیں بند کر کے میں نے اپنے سر کو ایک زور کا جھٹکا دیا ۔ اور اپنے آپ کو اس سحر سے آزاد پا کر اپنے آس پاس دیکھا ۔

صبح صادق کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی ۔

ستار میرے ہاتھوں سے گر چکی تھی ۔ اس کے تار ٹوٹ گئے تھے ۔ میری انگلیاں زخمی ہوگئی تھیں ، ان سے خون رس رہا تھا ۔

اور پھر وہ روپ کبھی نظر نہ آیا ۔

چاندنی راتوں میں اپنی ستار لئے میں دیوانہ وار باہر نکل جاتا اور اسی محویت سے ، اسی جنون کے عالم میں اپنی ستار بجائے جاتا ....

دھرج ، ایمن کلیان ، تلک کامود ، نیلا میری ۔

للت ، جے جے ونتی ۔

بسنت بہار ، میگھ ملہار ۔

راگ بجتے رہے ، گیت پھوٹتے رہے ۔

میری انگلیوں سے خون رستا رہا ۔

میرے جذبات و احساسات کی گہرائی ان نغموں میں حلول ہوتی رہی ۔ میری روح میری ستار کی تاروں میں تحلیل ہوگئی ۔

لیکن وہ ایک دفعہ نمودار ہو کر ، پھر کبھی نظر نہیں آئی ۔

پھر کبھی نہیں ۔

چاندنی راتیں اماوس کی راتوں میں تبدیل ہوتی رہیں ، ان کاجرکاری رینوں سے اندھیرا چھوٹتا رہا ، آکاش میں چاندنی اپنا جادو پھیلاتی رہی ۔

اور میں اس روپ کو دیوانہ وار ڈھونڈتا رہا ....

یہ پاگل ہو جائے گا ، یہ پاگل ہو جائے گا ۔

---

* ''روپ'' : فراق گورکھپوری ۔

اس سے ستار چھین لو ، اس سے ستار چھین لو -
اسے بجانے نہ دو ---- کئی آوازیں گونجیں -
اس نے دیوی کا سب سے کامل روپ دیکھا ہے ، بھاگیا وان ہے ، بھاگیہ وان -
یہ سنگیت کی آتما کو چھو لے گا - دوسری اور سے کسی نے کہا (یہ ہندو پنڈت تھے ، سنگیت کے استاد) -
اس پر کسی کا سایہ ہوگیا ہے ، یہ پاگل ہو جائے گا -
اس پر کچھ عمل کرو ، اس سے ستار چھین لو --- یہ آوازیں حاوی ہوگئیں -
اور مجھ سے میری ستار چھین لی گئی -
میری روح چھین لی گئی !

مجھ پر عمل کیا جانے لگا - اور اس عمل کے دوران میں ، میں نے محسوس کیا ، کوئی بڑی مضطرب ، بڑی سہی چیز میرے من سے نکلی جا رہی ہے ، اسے سخت اذیت پہنچ رہی ہے -
یہ عمل بند کردو ، میں چلا اٹھا ، بند کردو - میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی ستار نہیں بجاؤں گا - اور اسی رات میں نے اپنی ستار ڈھونڈ نکالی - اور اسے لئے چپکے سے باہر نکل گیا -

وہ رات بھی اتنی ہی گہری ، اتنی ہی سحر زدہ تھی -
پونم کے چاند کی شیتل ستلی کرنوں میں سا ری کائنات نہائی ہوئی تھی - وہی سپنوں کا سا جادو تھا ، وہی آنند ، وہی شانتی !
اور میں ستار لئے اپنے تنہا گوشے میں بیٹھ گیا - ستار کو آخری مرتبہ چھیڑنے کے لئے میری انگلیاں بے قرار ہو اٹھیں - میں نے آخری گت چھیڑا ، اس میں اپنے من کی ساری تراسا ، سارا دکھ درد سمو دیا -
پھر میں نے اپنی ستار کو ایک چھوٹے سے ٹیلے پر رکھا - اسے موتیا کے گجرے پہنائے ، اس پر چنبیلی کی لڑیاں لپیٹیں - اس کے نیچے عنبر اور لوبان جلایا اور اس موتیا اور چنبیلی کی لڑیوں میں لپٹی ہوئی ، عود اور لوبان کی خوشبو میں بسی ہوئی ستار کو ٹیلے پر چھوڑ کر نیچے اتر آیا -
میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ، ہاتھ جوڑے اور اپنے من کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک پرارتھنا کی :
دیوی ، میری ایک پرارتھنا سن لو -
میں تمہیں وچن دیتا ہوں دیوی ، اب تمہاری ستار کبھی نہیں چھیڑوں گا -
سوگند ہے دیوی ، تمہاری سوگند !
شما کرو دیوی ، میں نے تمہیں بہت تکلیف دی ہے - کیول تم جانتی ہو ، یہ کشٹ تمہیں میں نے نہیں دیا -
میرے من کی پوترتا ، میرے من کی موہ سے تم انجان نہیں ہو دیوی !
تمہیں مجھ پر وشواس ہے تو میری یہ بھینٹ قبول کر لو -
میں تمہیں وہ بھینٹ دے رہا ہوں دیوی ، جس سے سارے سنسار میں میرے لئے اور کوئی چیز پیاری نہ تھی -
میں اپنی ستار* تمہاری نذر کرتا ہوں -

---

* ستار یوں تو مذکر ہے لیکن جب کسی کو کسی شے سے جنون کی حد تک پیار ہو تو وہ مؤنث بولی جا سکتی ہے -

اور ستار تو تمہاری ہی ہے نا ؟ ستار اور وچتر وین ۔ تم اس سے راگنیاں چھیڑتی ہو ، تمہاری وینا سو جاتی ہے تو ساری دنیا سو جاتی ہے ۔ یہ ستار تمہاری ہی ہے ۔

تم میری یہ بھینٹ لے لو ، گر میرے من کی موہ میں سجائی ہے ۔

پائل کی مدھم سی جھن جھن.........جھن جھن........جھن جھن

وہ چاند کی کرنوں پر ہولے ہولے ، تھم تھم کر آ رہی تھی* ' کومل' پد گامنی کے گانے قدموں کی لڑکھڑاہٹ........

میرے ہردے میں ایک بے چین لہر اٹھی ۔ میرے من کی موہ جاگ اٹھی ۔

میری پلکیں پھر تھرا کر کھلنے لگیں ۔ میں ایک بار اور وہ روپ دیکھ لوں ، صرف ایک بار اور ۔ لیکن میری نظریں نہ اٹھ سکیں ۔

نظریں نیچی ہی رہیں ۔ " ہر رقص کف پا سے لو سی لہرا کے اٹھتی تھی " ۔ اور ہر قدم پہ کنول کھل رہے تھے ۔

آہ وہ نیل کنول ، وہ نیل کنول !

میں نے بے قرار ہو کر اپنی آنکھیں کھول دیں ۔ وہ سحر ٹوٹ گیا ۔

وہ غائب ہو گئی تھی ۔ اور میری ستار بھی غائب ہو گئی تھی ۔

میری بھینٹ قبول کر لی گئی ، میری ستار امر ہو گئی ، میری ستار امر ہو گئی ۔

اور پھر نہ پوچھئے ، نہ پوچھئے مجھ پر کیا گزری ،

کیا من کا دھیرج ، بڑھی بے کلی سی ......

اس کے بعد پھر کبھی چاندنی مجھے سکون نہیں پہنچاتی تھی ۔ چاندنی ظلم ڈھاتی تھی ۔ یوں محسوس ہوتا تھا ، چاندنی مجھے ڈس رہی ہے ۔ موسم کی چاندنی اور برکھا کی بھیگی راتیں مجھے پاگل بنا دیتی تھیں ۔ چاندنی راتوں میں اور برکھا کی بھیگی رینوں میں ستار بجانے کے لئے ، ستار کی تاروں کو صرف چھیڑنے کے لئے میں بے قرار ہو اٹھتا ۔ اور یہ تڑپ اتنی شدت اختیار کر لیتی کہ میں رات رات بھر سو نہ سکتا ۔

اب بھی کسی کو ستار بجاتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھ پر ایک جنون ، ایک وحشت طاری ہو جاتی ہے ۔ جی مچل جاتا ہے کہ ستار اس سے چھین لوں اور خود چھیڑنے لگوں ۔ لیکن اس رات کی وہ سوگند مجھے روکے رکھتی ہے ، اور مجھ پر ایک قیامت گزر جاتی ہے ۔

میرے بدن کا رواں رواں ستار کی جھنڑ سے متاثر ہوتا ہے ۔ ستار چھیڑی جاتی ہے تو میرے من کی وین کے تار بج اٹھتے ہیں ، میں کھو جاتا ہوں ، مد ہوش ہو جاتا ہوں ، اور کبھی کبھی مجھے اچانک اس روپ کی ایک جھلک سی نظر آ جاتی ہے ، صرف ایک جھلک ، اور صرف ایک لمحے کے لئے مختصر سی جھلک !

لیکن آج کی رات !

آج کی رات بھی اتنی ہی گہری ، اتنی ہی سحر زدہ ہے ! آج اس رات پر ایک جادو چھایا ہوا ہے ۔ فضا کنجن بیر سی نکھری ہوئی ہے ۔ اور اس مکمل ، حسین ، مسحور کن چاندنی میں کتنا سکون ہے ، کتنا آنند ، کتنی شانتی !

اور وہ سنگیت کی ، کلا کی ، روپ کی دیوی ، جو اس رات میری ستار کی لے پر ناچ

---

* "روپ" : فراق گورکھپوری ۔

ی تھی ، چاند کی شبنمی شیتل کرنوں پر ہولے ہولے ، چھم چھم کرتی آئی تھی ، زندہ ، حرکت ، انسانی روپ میں آ گئی ہے -

میری بھینٹ کے صلے میں دیوی خود میرے پاس چلی آئی ہے -

ہاں وہی ہیں ، آپ وہی ہیں ، روپ کی ، کلا کی ، سنگت کی دیوی*!

معصوم ، پاکیزہ ، مقدس -

موسیقی کی روح !

اب وہ روپ ایک بولتی ہوئی تصویر حیات ہے -

یہ وہی روپ ہے -

یہ گھنیرے گیسو ،

یہ مدھ ماتے ، رس بھرے نین کنول ،

اور یہ نیل کنول ،

نئے سندر ہیں یہ

کتنا سکون ہے ، کتنا آنند ہے ان میں !

یہ پاؤں ، یہ وہی ہیں ، یہ پاکل وہی ہیں -

ان چرنوں کی مٹی اپنی آنکھوں پر مل لوں تو ان میں ٹھنڈک آ جائے ! ان چرنوں میں میں اپنا سارا جیون بتا دوں !

یہ وہی ہیں ،

یہ وہی ہیں ، یہ نیل کمل ،

یہ نیل کمل .... یہ نیل کمل -

---

* یونانی دیو مالاؤں میں وینس حسن کی دیوی ہے اور اپالو موسیقی کا دیوتا - لیکن ہندو دیو مالاؤں میں حسن اور فن میں جو یگانگت اور ازلی رشتہ ہے اس کے اعتبار سے موسیقی اور فن کی دیوی ہی حسن کی دیوی بھی ہے - چنانچہ روپ ، کلا اور سنگیت کی ایک ہی دیوی ہے ---- سرسوتی !

سرسوتی

نیل کمل مسکائے ، رسیے بھونرا ،
رس پی اور اُڑ جائے ،
نیل کمل مسکائے .. ..
دیوی ، نیل کمل ،
اور بھونرا ؟

سبز پاتوں پہ نیل کنول کھل رہے تھے ۔

اور دو نیل کنول جیسے پاؤں تالاب کے کنارے بنی ہوئی مرمریں سیڑھیوں پر دھیرے دھیرے اُتر رہے تھے ۔

کمر پر نازک سی ایک گاگر اٹھائے وہ نیر بھرنے آئی تھی ۔

اس نے نیر بھرا اور گاگر ایک طرف رکھ دی ۔ اپنے دونوں کومل ہاتھ بڑھائے ۔ کنول کے پھولوں سے کھیلنے لگی ، بچوں کی سی معصومانہ مسرت اس کے سندر مکھڑے پر کھیل رہی تھی ۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اپنی نیلی ساری کو پنڈلیوں پر سے اٹھائے پانی کی سطح پر اپنے پاؤں سے لہریں بنانے لگی ۔ اور دھن نیر میں نہائے ہوئے یہ نیل کنول سے پاؤں دیکھ کر تالاب کے نیل کنول ماند پڑ گئے ۔

پھر گاگر اپنی کمر پر رکھے وہ دھیرے دھیرے اوپر آئی ،
ایک مدھر سا گیت گنگناتی ہوئی ۔

اچانک اُس کی نظریں اجنبی کی نظروں سے ٹکرائیں ، جو تالاب کے کنارے کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا ، عجیب عقیدت اور پرستش بھری نگاہوں سے ۔

" تم کون ہو پردیسی ، یہاں کیوں آئے ہو ؟ "

بڑی میٹھی ، نرم آواز اجنبی کے کانوں میں آئی ۔ اس آواز میں امرت کی سی مٹھاس تھی ۔

" تم کون ہو پردیسی ، یہاں کیوں آئے ہو ؟ "

" میں ، میں "۔

وہ چونک پڑا ، " ایک بھولا بھٹکا راہی ہوں ، گاؤں سے چلتے چلتے شام ہو گئی ، یہ گھنا جنگل بیچ میں پڑا ہے ، راہ سجھائی نہیں دیتی " ۔

"چنتا نہ کرو پردیسی ، میری کٹیا میں چلے چلو ، رات وہیں بسر کر لینا ، پھر سویرے اُٹھ کے چلے جانا ۔ میری کٹیا اس چھوٹی سی پہاڑی کے اُوپر ہے ، چلو میرے ساتھ "۔

وہ جیسے ایک سحر کے زیر اثر اُس کے ساتھ ہو لیا ۔ اس نے دیکھا ، کٹیا میں وہ اکیلی رہتی ہے ، اور کوئی ساتھ نہیں ہے ۔

" آپ یہاں بالکل اکیلی رہتی ہیں ؟ "

"ہاں اکیلی ہی سمجھئے ۔ ویسے بالکل اکیلی بھی نہیں ۔ یہاں ایک سنیاسی رہتا ہے ۔ لیکن وہ نگر نگر گھومتا رہتا ہے ۔ ایک خوبصورت پیالے میں وہ شربت انڈیلتے ہوئے بولی ۔ کبھی کبھار ہی یہاں آتا ہے " ۔

" پہلے یہ پی لو پردیسی ، تمہیں پیاس لگی ہو گی " ۔ اُس نے پیالہ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا ۔ کیسا شربت تھا یہ ؟ اس کے ہونٹوں نے تو کبھی ایسا شربت نہ چکھا تھا ۔ اس میں ایک ہلکا سا سرور اور خمار تھا لیکن شراب کا سا بہکانے والا نشہ نہیں ۔ اور امرت کی سی مٹھاس تھی ، وہ امرت جو سورگ کی نہروں میں بہتا ہے ۔

"تمہیں بھوک بھی لگی ہو گی پردیسی ، ابھی کھانا گرم کئے دیتی ہوں"۔ گیلی لکڑیوں پر پھونکیں مارتے مارتے دھوئیں سے اس کی کنول جیسی انکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

اس کے سامنے دال بھات رکھتے ہوئے یہ بولی "تمہیں دینے کے لئے میرے پاس کچھ بھی تو نہیں ہے پردیسی - بس یہی دال بھات ہے - اور کچھ بھی نہیں"۔ بے بسی سے اس کی انکھوں میں آنسو آ گئے -

اسے اس حال میں دیکھ کر اجنبی کا دل رو پڑا -

اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے "ہائے میں بھی کیسی سوز کی ہوں - ذرا ذرا سی بات پر میرے آنسو نکل آتے ہیں - جانے کیوں ؟ نہیں مجھے تو کوئی دکھ نہیں ، میں تو سکھی ہوں"-

"ٹھہرو پردیسی ، میں تمہارے لئے ایک چیز ابھی بنائے دیتی ہوں - دیکھو اب لکڑیاں بھی خوب جل اٹھی ہیں - کبھی کنول کے بیجوں کی کھیر کھائی ہے ؟"

"کنول کے بیجوں کی کھیر ؟"

"ہاں ، ہاں - یہ نیچے تالاب میں کنول کھلے ہیں نا - میں ان کے بیج جمع کر کے دھوپ میں خوب سکھا لیتی ہوں اور ان کا چھلکا اتار کر دودھ میں ابال لیتی ہوں - بڑی مزے دار کھیر بنتی ہے"-

ہاں ، دیوی ، جس چیز کو بھی یہ مقدس ، آسمانی ہاتھ چھو جائیں اس کے ذائقہ کے کیا کہنے - اس نے دل ہی دل میں سوچا - اور وہ حیران رہ گیا - کنول کے بیجوں کی اس کھیر میں بھی وہی مزا تھا جیسے وہ سورگ میں بہنے والی نہروں کے امرت سے بنی ہو -

اب اسے کوئی شک نہ تھا - یہ وہی تھی ، یہ وہی تھی -

"آپ کہاں کی رہنے والی ہیں ؟ یہاں کیسے آئیں ؟ اس سنیاسی کے ساتھ کیوں رہتی ہیں ؟"

"تم باور نہیں کرو گے پردیسی - میں اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی - اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں - مجھے صرف یہ بتایا گیا ہے کہ میں بدقسمتی سے سرسوتی کے مندر کے کھنڈروں کے پاس بے ہوش پائی گئی - اور یہ سنیاسی مجھے اٹھا کر یہاں لے آیا - تب سے میں یہیں رہتی ہوں"-

"اس کے سوا آپ کو کچھ بھی یاد نہیں پڑتا ؟"

"نہیں بالکل نہیں - شاید میں گر کر بے ہوش ہو گئی تھی - ممکن ہے میرے سر میں چوٹ آئی ہو یا گرنے میں دماغ کو ایسا دھکا پہنچا ہو کہ میں اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں سب کچھ بھول گئی ہوں - میں تو یہ بھی نہیں جانتی میں کون ہوں ، میرا نام کیا ہے ؟ بڑے اچنبھے کی بات ہے نا ؟"

وہ کچھ دیر کھوئی کھوئی نظروں سے افق کے اس پار دیکھتی رہی جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو ، جیسے افق کے اس پار اس کے جیون کا راز چھپا ہو - کٹیا کے قریب پاس کے درختوں کے جھنڈ پر پونم کا چاند آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا - وہ کھوئی کھوئی سی ، چاند کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی -

پھر اس نے اپنی نظریں ہٹا لیں - اور اس احساس کے تحت کہ مہمان کے سامنے یوں اداس نہیں رہنا چاہئے ، اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی :

"اچھا پردیسی ، اب اپنے بارے میں تو کچھ بتاؤ نا - تم نے مجھ سے تو اتنے سارے سوال کر ڈالے اور اپنے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا - تم کون ہو ، کہاں کے رہنے والے ہو اور تمہیں کہاں جانا ہے ؟"

وہ ہنس پڑا "میرا وجود آپ کی طرح کوئی راز تو نہیں ۔ معمولی آدمی ہوں ۔ میرا گاؤں یہاں سے قریب ہی ہے اور مجھے شیام کہتے ہیں ۔ میرا اصل نام تو شیام نہیں ہے ۔ گاؤں والے مجھے شیام اس لئے کہتے ہیں کہ بنسی بجاتا ہوں ۔ اور ...... اور .... جس لڑکی سے میں پریم کرتا ہوں ، جس سے میری سنگنی ہو چکی ہے اس کا نام رادھا ہے"۔

اس کی ساری اداسی دور ہو گئی اور وہ کھکھلا کر ہنس پڑی ۔ کتنی مدھر تھی وہ ہنسی جیسے چاندی کے پھول جھڑ رہے ہوں ۔

"بہت اچھے ، بہت اچھے ! مرلیا والے شیام؟ اچھا کنہیا جی یہ تو بتاؤ ، بنسی اپنے ساتھ لے آئے ہو؟"

"میری بنسی تو میری جیون ساتھی ہے ۔ میں اسے ہمیشہ پاس رکھتا ہوں"۔

"تو پھر کچھ سناؤ نا ۔ بانسری کی تانوں میں یہ رات کتنی اچھی کٹے گی ۔ تم کیا جانو پردیسی ، میں ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتی ہوں ۔ مجھے یہاں اکیلے میں اتنا ڈر لگتا ہے ۔ یوں معلوم ہوتا ہے اس جنگل میں کوئی گھوم رہا ہے ۔ اور میں ڈر کے مارے سوتی بھی نہیں ہوں ۔ دروازہ بھیڑے چپ چاپ دم سادھے ساری رات یہیں بیٹھی رہتی ہوں ۔ آج تم آ گئے ہو تو بالکل ڈر نہیں لگ رہا ۔ اور رات بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہے"۔

اف کتنی معصوم اور بھولی بھالی تھی وہ ! اجنبی کے ساتھ رات گذارتے ہوئے اسے بالکل کسی خوف یا جھجھک کا احساس تک نہ تھا ۔ اس کی بوتر ہستی پاپ اور گناہ سے بالکل انجان تھی ۔ یا پھر شاید اسے اجنبی کے من کی سوترتا پر وشواس تھا ۔

شیام نے اپنی بانسری نکال کر ہونٹوں سے لگائی ۔ لیکن کوئی دھن چھیڑنے سے پہلے وہ بول اٹھی ، یہاں نہیں پردیسی ، چلو باہر چلیں ۔ باہر کیسی اچھی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے ۔ چاندنی راتیں مجھے بے حد پسند ہیں لیکن میں ڈر کے مارے باہر نہیں نکل سکتی"۔

وہ دونوں باہر نکل آئے ۔ جیسے سارے سنسار پر سندرتا چھائی ہوئی تھی ۔ فضا کیسی کنچن نکھری نکھری ہوئی تھی ۔ نیلے گگن پر پونم کا چاند اپنا جادو بکھیر رہا تھا اور چاند کی سیتل سنہری کرنیں تالاب کے پانیوں اور کنول کے پھولوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں ۔ اور کنول کے پھولوں کے درمیان چاند کا حسین عکس تیر رہا تھا ۔

یہ سندر رین ، یہ سپنوں کا سا جادو ، یہ چاندنی اور سنگیت ۔ بجائے جاؤ پردیسی اپنی بنسی بجائے جاؤ ، بانسری کی تانوں سے تو تم امرت رس گھول رہے ہو ۔

وہ آنکھیں بند کئے گویا سنگیت میں کھو سی گئی ۔

وہ اپنی بنسی پر راگنیاں چھیڑتا رہا اور رات گہری ہوتی گئی ۔

اور اس گہری رات میں اچانک اس نے میگھ ملہار چھیڑنا شروع کیا ۔ اور اس نے دیکھا ، وہ بالکل مدھوش ہوئی جا رہی ہے ۔ میگھ ملہار کی چھیڑ سے اس کے سارے بدن میں ایک لہر سی دوڑ گئی اور اس کے انگ انگ سے اضطراب اور بے چینی چھلکنے لگی اور پھر اچانک اس کی انگلیاں اضطراری طور پر خلا میں یوں حرکت کرنے لگیں جیسے وہ کسی ان دیکھی وین کو چھیڑ رہی ہوں ۔

آس کی وین کہاں تھی ؟ آس کی وین کہاں تھی ؟
بسنت رت مدماتی آئی تھی ، پر آس کی وین کہاں تھی ؟
وین نہیں تھی لیکن......
من کی بین سنواری باجے
من کی بین سنواری باجے........
من کی بین سنواری......ی......ی..... ی

گاؤں میں ایک میلہ لگا ہوا تھا ۔ میلے میں آئے ہوئے سپیرے بین بجا بجا کر سانپوں کو کھلا رہے تھے اور مندر سے پوجا کر کے واپس آنے والی عورتوں اور لڑکیوں کے جھرمٹ کے جھرمٹ اُن سپیروں کو گھیرے ہوئے تھے ۔

اس نے دور ہی دور سے دیکھا ۔ اس جھرمٹ میں اس کی رادھا بھی تھی ، لیکن آج اس کی بے چین نظریں رادھا کو نہیں کسی اور کو تلاش کر رہی تھیں ۔

اچانک اس کی نظریں ایک اجنبی سے ٹکرائیں جو اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا ۔ اجنبی نے اسے اپنے پاس بلایا "جسے تم ڈھونڈ رہے ہو ، وہ میں ہی ہوں ۔ میں بہت دیر سے تمہیں دیکھ رہا ہوں ۔ مجھے معلوم ہے تم کسے ڈھونڈ رہے ہو وہ میں ہی ہوں سور داس ، اوتی سے آیا ہوں " ۔

سور داس ؟ وہ حیران رہ گیا ۔ سور داس ، سنگیت میں اتنا بڑا نام ؟ کیا یہی سور داس ہے ؟ یہ میلے پھٹے ہوئے کپڑے ، یہ بھونڈی سی شکل ، یہ دھندلا دھندلا سا چہرہ ۔ بھلا وہ روپ پر کیوں دھیان دے رہا ہے ۔ اس کے پاس تو کلا ہے اور سنگیت ۔ کلا اور سنگیت میں یہ کمال ہو تو روپ کی کیا پروا ؟

اس نے جھک کر سور داس کے چرن چھوئے " میں بھاگیہ وان ہوں مہاراج ، جو آپ کے درشن ہوئے ۔ مجھے سنگیت سے لگاؤ ہے ۔ کچھ کچھ جانتا ہوں ۔ مہاراج مجھے آپ اپنا سیوک بنا لیجئے ، اپنے چرنوں میں رہنے دیجئے " ۔

سور داس نے اسے آشیرواد دی ۔ " میں جانتا تھا تمہیں سنگیت سے ضرور پیار ہو گا ۔ تمہارے پتا ہمیشہ متر تھے ، انہیں میگھ ملہار چھیڑتے سنا ہے ؟ تمہارے پتا کو بھی سنگیت سے پیار تھا ۔ تم نے بھی کچھ سیکھا ہے اپنے پتا سے ؟ کچھ بجا لیتے ہو ؟ "

" ہاں بنسی بجا لیتا ہوں مہاراج ۔ پر میرے من میں بہت دنوں سے ایک اچھا ہے ۔ میں وین سیکھنا چاہتا ہوں ۔ میں نے سنا تھا آج میلے میں ایک نامی وین بجانے والا آئے گا ۔ میں اسی کو ڈھونڈ رہا تھا ۔ مجھے کیا پتہ تھا آج سور داس جی کے درشن ہو جائیں گے ۔ میں بھاگیہ وان ہوں مہاراج ۔ بتائیے میں کہاں آپ کے پاس آیا کروں ، آپ کہاں رہتے ہیں ؟ "

" پدیسہ میں دیوی سرسوتی کا ٹوٹا ہوا مندر تم نے دیکھا ہوگا ۔ میں آج کل وہیں رہتا ہوں ۔ لیکن سنو ، کل تم مجھ سے وہیں ملنا اور اپنی بنسی بھی ساتھ لیتے آنا ۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم میں وہ گہری سوجھ ہے کہ نہیں جو سنگیت کے لئے چاہئے ۔ اگر ہے تو میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا ۔ تم مجھ سے جو چاہو سیکھ سکتے ہو " ۔

" آپ کی بڑی کرپا ہے مہاراج ! " اس نے پھر جھک کر سور داس کے چرن چھوئے ۔

وہ بڑا ہی خوش گھر لوٹ رہا تھا ۔ آج وہ سور داس سے ملا تھا ۔ سور داس اسے سنگیت سکھائیں گے ! وہ اپنے آپ میں یوں مگن چلا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی کے آنے کی اسے خبر تک نہ ہوئی اور کسی نے پیچھے سے اس کی آنکھیں بند کر لیں ۔

اس نے اُن ہاتھوں کو چھو کر دیکھا ۔ بڑے نرم ، کومل ، نازک سے ہاتھ تھے ۔

" رادھے " وہ پکار اٹھا ۔ بھلا یہ چنچل رادھے کے سوا اور کون ہو سکتی تھی ؟

رادھا نے اپنے ہاتھ اس کی آنکھوں پر سے ہٹائے اور گھونگٹ کاڑھ لیا ۔

اور گھونگٹ کے پٹ کھول کر اس نے دیکھا آج اس کی رادھے بڑی پیاری ، بڑی سندر لگ رہی تھی ۔ ہلکی سبز ساری کے آنچل میں اس کا چمپئی مکھڑا خوب کھل رہا تھا ۔ ماتھے پر وہ ایک نازک سا نارنجی تلک لگائے ہوئی تھی اور اس کے سیاہ گھیرے بالوں میں چمپا کی ادھ کھلی کلیوں کی وینی سجی تھی ۔

" جاؤ میں تم سے کبھی نہیں بولوں گی " ۔ وہ روٹھ گئی ۔ " تم نے میلے میں مجھے دیکھا

تک نہیں ۔ ایک بار دیکھا ، لیکن دیکھ کر بھی میرے پاس نہیں آئے ۔ جانے کیسے ڈھونڈتے رہے ۔ اور پھر اب تک اُس بڑے بسے آدمی سے کھڑے باتیں کرتے رہے"۔

" ایسا نہ کہو رادھا ! تم نہیں جانتیں وہ کون ہیں ۔ وہ ایک بہت بڑے سنگیت گرو ہیں ۔ اور پھر میں تم سے ملنا ضرور چاہتا تھا ، لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ تم اتنی دیر رکی رہو گی ۔ اپنی سکھیوں کے ساتھ گاؤں واپس نہیں لوٹ جاؤ گی ۔ آج کیسے تم اکیلی اتنی دیر تک رک گئیں ؟ "

" پتا جی کچھ دنوں کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں ، ماتا جی سے کہہ دوں گی مندر میں پوجا کے بعد واپس لوٹتے شام ہو گئی " ۔

" اچھا یہ بات ہے ! وہ ہنسا "۔

" بنسی لے آئے ہو نا ؟ "

وہ دونوں چلتے چلتے اُس جگہ پر آ گئے جو اُن دونوں پریمیوں کی خاص جگہ تھی ۔

" اپنی روٹھی ہوئی رادھا کو منا لیں ؟"

رادھا کے چرنوں میں ڈاری مرلیا .....

شیام نے اپنی بنسی رادھا کے قدموں میں ڈال دی ۔ رادھا نے بھی سر اٹھایا اور ہنس کر بنسی اپنے پاؤں پر سے اُٹھائی اور شیام کے ہونٹوں سے لگا دی ۔

رادھا کے چرنوں میں ڈاری مرلیا ......

جانے کتنی دفعہ یونہی اپنی رادھا کو پاس بٹھائے اُس نے بنسی بجائی تھی ۔ اور وہ دونوں پریمی بنسی کی تانوں میں کھو جایا کرتے تھے ۔ پریت اور سنگیت میں کتنا گہرا سمبندھ ہے ، لیکن آج جانے کیوں وہ بے چین تھا ، اُسے رہ رہ کر ایک ہی خیال آ رہا تھا ، کیا میں واقعی اچھا بجا سکتا ہوں ؟ کیا میں سور داس جی کے امتحان میں پورا اتروں گا ، وہ مجھے سنگیت سکھائیں گے ؟

" بہت اچھا بجا لیتے ہو ، تم میں وہ سارے گن ہیں ۔ مجھے تم سے یہی اُمید تھی کہ تمہارے پتا جی کی وہ سنگیت کی موہ تم میں ضرور ہو گی ۔ اچھا اب میگھ ملہار چھیڑنا "۔

سور داس جی کی تعریف سے اُس کا من کھل اٹھا ۔ اُس نے اپنی روح کو سنگیت میں سموتے ہوئے میگھ ملہار چھیڑا ......

"جیو شیام جیو ۔ بالکل اپنے پتا جی کی طرح چھیڑتے ہو ۔ میں بس تم سے یہی سننا چاہتا تھا ۔ میگھ ملہار ۔ آج رات تم میرے پاس آؤ، وہیں سرسوتی کے مندر میں ۔ بدیسہ یہاں سے دور نہیں ہے لیکن میں وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا ۔ مجھے اونتی واپس جانا ہے "۔

" آپ اونتی جائیں گے تو میں بھی ساتھ چلوں گا مہاراج ۔ سنگیت کے لئے تو میں سنسار کے کونے کونے تک بھی جا سکتا ہوں "۔

درختوں کے جھنڈ کے اُس پار اُس نے دیکھا ، رادھا کی سکھیاں پانی بھرنے پنگھٹ پر آئی ہوئی ہیں ، لیکن اُن میں رادھا نہیں تھی ۔ جانے کیوں وہ آج پانی بھرنے نہیں آئی ورنہ وہ اُس سے یہیں کہہ دیتا کہ وہ آج بدیسہ جا رہا ہے اور نہیں معلوم کب لوٹے گا ۔ اُس نے دیکھا رادھا کی سب سے پیاری سکھی کرشنا وینی ایک درخت کی اوٹ میں کھڑی اُسے دیکھ رہی ہے ۔ شاید وہ اُس کی اور سور داس کی باتیں سننے کے لئے آ کھڑی ہوئی تھی ۔

جب کرشنا وینی نے دیکھا شیام نے اُسے دیکھ لیا ہے تو وہ تیر کی طرح نکل بھاگی ۔

"سنو وینی جی ، ادھر آنا ذرا "۔ اُس نے پکارا ۔

" کیوں شیام جی اپنی رادھے کو دیکھ رہے ہو ؟ وہ نہیں آئی آج ، آپ کی رادھے " ۔

" کیوں ؟" " یہ تو آپ جانیں ، بھلا میں کیا جانوں ؟ " وہ بلا کی شوخی اور چنچلتا سے اُسے

جھڑتی رہی ۔
لیکن وہ کرشن کنہیا کی طرح شریر ، چنچل ، چھیل چھبیلا تو تھا نہیں کہ گوپیوں سے ہنسی مذاق اور شرارت کرے ۔ نہ اس نے کرشنا ونی کی گاگر سے نیر چھلکایا نہ اسے اس سیدھی سیٹھی شکایت کا موقع ہی دیا ۔

بھر پچکاری
مکھ پر ماری
بھیگ گئی ساری
ساری .... بھیگ گئی سا .. .. ری
ہولی کھیلت کرشن کنہیا ...... ہولی کھیلت کرشن کنہیا

ونی کی حیرانی کا جواب اس نے گھمبیرتا سے دیا " ونی جی ، آج میں گاؤں سے باہر جا رہا ہوں ، مجھے رادھے سے یہ بات کہنی ہے ۔ وہ پانی بھرنے ادھر آتی ہو گی ، تم اس سے کہہ دینا ۔ میں یہاں اس کا انتظار کر رہا ہوں "۔
ونی اپنی گاگر اٹھائے جلدی جلدی رادھا کے گھر کی طرف چل دی ۔ دوسری سکھیاں بھی اس کے ساتھ ہو لیں ۔
" کیوں ری رادھے ، آج نیر بھرن کیوں نہیں آئی ری ؟"
" ماتا جی کا ہاتھ بٹا رہی تھی "۔
" میں تیرے لئے ایک سندیسہ لائی ہوں ، لیکن چل میں تجھ سے نہیں بولوں گی "۔
" دیکھو ونی یوں روٹھا نہیں کرتے "۔
" موری اچھی یمنا تم ہی کچھ بولو نا "۔ رادھے بے چین ہو گئی ۔
" میں تو کچھ نہیں جانتی "۔ یمنا بولی : "ونی ہم سے الگ ہو کر کہیں چلی گئی تھی ۔ ونی ہی سے پوچھ لو "۔
چنچل ونی گاگر کمر پر رکھے ناچ کے انداز میں گھوم گئی ---

میں جل جمنا بھرن جاتی تھی ،
بیچ میں مل گئیو شیام سندرنا ،
چلو رادھے ، تو ہے شیام بلاوت
چلو رادھے تو ہے ..... شیام .....

" سچ ونی ؟ تجھے مورے سر کی قسم "۔
" اور کیا جھوٹ کہہ رہی ہوں ؟ تمہارے کنہیا اسی میلے والے آدمی سے کھڑے باتیں کر رہے تھے ۔ مجھے دیکھا تو کہنے لگے : رادھے سے کہہ دینا میں یہاں اس کی راہ دیکھ رہا ہوں ۔ مجھے اس سے کچھ کہنا ہے "۔
شرمائی لجائی رادھے کو ساری سکھیوں نے گھیرے میں لے لیا* ۔

میں جل جمنا بھرن جاتی تھی ،
بیچ میں مل گئیو ، بیچ میں مل گئیو شیام سندرنا ،
چلو رادھے ، تو ہے شیام بلاوت
چلو رادھے ، تو ہے شیام بلاوت
چلو رادھے......

" رادھے ، مجھے جانا ہو گا رادھے "۔

---

* گوپیوں کا ناچ

" سنگیت ، سنگیت ، سنگیت ! تم تو باولے ہو گئے ہو شیام ۔ جیسے تم سنگیت جانتے ہی نہیں ۔ اتنی اچھی بنسی بجا لیتے ہو ، گا بھی لیتے ہو ۔ تمہیں اور کیا سیکھنا ہے ؟"

" تم سمجھ نہیں سکو گی رادھے ! سنگیت کے لئے میری موہ ، میری تڑپ کو تم سمجھ نہیں سکتی ۔ تو میں جانتا ہی کیا ہوں ؟ ذرا سی بنسی بجا لی اور بس ؟ سنگیت کی بلندیوں کو چھونا کوئی آسان بات نہیں ؟ سنگیت کے لئے تو ایک جیون کا تیاگ چاہئیے اور سوچو تو رادھے ، میرے بھاگ کیسے جاگ اٹھے ہیں ۔ سورداس جی میرے سنگیت گرو ہوں گے ۔ رادھے ، شیام جب تمہاری مانگ میں سیندور بھر کے ، تمہیں اپنی دنیا کے گھر لے آئے گا اس وقت وہ کوئی معمولی آدمی نہ ہوگا ۔ سنگیت میں ایک نام ہو گا ۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ ایسا ہو ؟ بتاؤ رادھے "

" میں کچھ نہیں جانتی شیام ۔ مجھے تو تم جیسے ہو ، ویسے ہی اچھے لگتے ہو ۔ لیکن تمہاری سادھنا کی راہ میں میں رکاوٹ نہیں ہوں ۔ میں تمہیں روکوں گی نہیں ۔ جہاں جانا چاہتے ہو ، جاؤ ۔ میں تمہارا انتظار کر لوں گی ۔ تمہاری رادھے تمہاری راہ میں نین بچھائے رہے گی ۔ تمہاری رادھے تمہارا انتظار کرے گی ۔ ہمیشہ ہمیشہ تمہارا انتظار کرتی رہے گی "۔

جہاں کبھی دیوی سرسوتی کا شاندار مندر کھڑا تھا ، وہاں اب ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا ۔ سامنے ایک گھنا جنگل تھا اور پاس ہی ندی بہتی تھی ۔ اس ٹوٹے ہوئے مندر کے سامنے سورداس اس کا انتظار کر رہے تھے ۔

" اچھا ہوا تم ٹھیک سمے پر آ گئے ۔ میں پوجا پاٹ کی تیاریاں کر رہا تھا "۔ سورداس نے اس کے گلے میں [illegible] پھولوں کے ہار پہنائے ، خود بھی اپنے ہی ہار پہنے ۔ دونوں نے پوجا کی اور مندر کے باہر آ بیٹھے ۔

پورنما کی رات تھی ، پورا چاند نکل آیا تھا ، لیکن ان کے سامنے اتنا گھنا جنگل تھا ، چاند کی روشنی چھپ گئی تھی ۔ گھنے درختوں کی ٹہنیوں میں سے چاند کی کرنیں صرف ایک جال سا بن کر رہ گئی تھیں ۔

" جانتے ہو آج کون سی رات ہے ؟ "

" پونم کی رات "۔

" اور یہ بھی جانتے ہو یہ کون سا مہینہ ہے ؟ "

" ہاں اساڑھ "۔

" اساڑھ کا مہینہ اور پورنما کی رات ۔ آج رات میں تمہیں وہ نظارہ دکھاؤں گا جسے تم جیون بھر بھول نہیں سکو گے ۔ آج کی رات تمہارے جیون کی سب سے بڑی رات ہو گی ! "

شیام نے حیران ہو کر سورداس کی طرف دیکھا " آج رات کیا ہو گا مہاراج ؟ "

" آج رات سرسوتی آکاش سے دھرتی پر اتر آئے گی "۔

" سچ مہاراج ؟ "

" ہاں ۔ تم جانتے ہو اس جگہ کسی زمانے میں سرسوتی کا شاندار مندر تھا ، دیس کے سارے سنگیت جاننے والے ، کوی ، لیکھک ، چترکار ، سارے کلاکار یہاں پوجا کے لئے آیا کرتے تھے ۔ یہ گویا کلاکاروں کا کاشی تھا ۔ وہ بہت دور دور سے آیا کرتے تھے ۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ یہاں آ کر سرسوتی کی پوجا کر لیں اور سرسوتی کی آشیرواد حاصل کر لیں تو وہ کلا میں نام پیدا کریں گے ۔ آج بھی گو یہ مندر اب کھنڈر رہ گیا ہے ، اساڑھ ، ساون اور بھادوں ان تین مہینوں میں ، پونم کی رات کو اس ٹیلے پر بیٹھ کر ، کوئی میگھ ملہار چھیڑے تو دیوی سرسوتی خود اس کے سامنے چلی آتی ہے ۔ اور جو کوئی اپنے آپ کو سنگیت میں کھو کر اس طرح یہ راگ چھیڑ سکتا ہو کہ دیوی خود مسحور ہو کر دھرتی

نظر آئے ، جو کوئی سرسوتی کا روپ دیکھ لیتا ہے وہ سنگیت میں بڑا نام پیدا کرتا ہے ۔ وہ سنگیت کی آتما کو چھو لیتا ہے "۔

" یہ راگ آپ چھیڑئیے مہاراج ۔ بھلا مجھ میں اتنی شکتی کہاں ہے ؟ سنگیت میں وہ ودیا کہاں ہے کہ میں اس طرح یہ راگ چھیڑ سکوں ؟ "

" نہیں ، میں تو اب بوڑھا ہو چکا ہوں ۔ شاید یہ ہے کہ یہ راگ چھیڑنے والا نوجوان ہو ، آواز ہو ، اس کے جذبات بہت گہرے ہوں ، اس کا من سونا اور پاک ہو ۔ تم میں وہ ساری باتیں ہیں ۔ اپنی جوانی میں ، میں نے بھی دیوی کا یہ روپ دیکھا ہے ۔ آج تمہیں دکھانا چاہتا ہوں "۔

شیام حیرت سے سور داس جی کی یہ باتیں سن رہا تھا ۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا ۔

دیوی سرسوتی ! سرسوتی ، سنگیت کی ، کلا کی ، روپ کی دیوی ! سرسوتی ! جس کی پوجا کلا کاروں کے من میں آگ لگا دیتی ہے ، سنگیت کے دیوانوں کی آتما کو چھو لیتی ہے ۔ راگ ، کلا کی ، راگنیاں ، کویتائیں ، مصوریاں ، مورتیں ، کلا اور فن کے ہر کام کے لئے جو وجدان کا سرچشمہ تھی ۔ جس میں حسن و فن دونوں مجسم تھے ۔ سرسوتی ، جو کہ خود ہی حسن اور فن کے ازلی رشتہ کا اظہار تھی ۔ کیا وہ ایک تصور ہی تھی یا کیا وہ ایک حقیقت تھی جسے آنکھوں سے دیکھا جا سکے ؟

دیوی سرسوتی آج اس کے سامنے آئے گی ؟ سرسوتی ، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا چہرہ کنول کا سا حسین ہے ، جس کے بال گھنگھور گھٹاؤں کی طرح ۔ ۔ ۔

" شیام اب میگھ ملہار چھیڑنا شروع کر دو ، وہ سمے آ گیا ہے ۔ دیکھو چاند ہمارے سروں پر آ گیا ہے اور آدھی رات بیت چکی ہے "۔ سور داس کی آواز اس کے کانوں میں آئی ۔

اس نے اپنی بنسی نکالی اور جیسے ایک سحر کے زیر اثر میگھ ملہار چھیڑنا شروع کیا ۔ آج سے پہلے کبھی اس نے اس طرح میگھ ملہار نہ چھیڑا تھا ۔ اس کے من میں ایک آگ سی بھڑک رہی تھی ۔ اس کی روح بنسی کی تانوں میں تحلیل ہوئی جا رہی تھی ۔

اچانک جنگل میں دور ایک روشنی نمودار ہوئی ۔ یہ چاند کی روشنی نہیں تھی ۔ چاند کی کرنیں تو گھنے درختوں کی ٹہنیوں میں سے اندھیرے اور روشنی کا ایک جال سا بن رہی تھیں ۔ نہیں ۔ نہیں یہ چاند کی روشنی نہیں تھی ، یہ کوئی اور ہی روشنی تھی ، اتنی خیرہ کن جیسے ہزاروں چاند ایک ساتھ گگن میں آ گئے ہوں ۔

شیام کی آنکھیں اس خیرہ کن روشنی سے چندھیا گئیں ۔ وہ روشنی آگے بڑھتی گئی اور شیام کی حیران نظروں نے دیکھا ایک غیر معمولی ، انتہائی حسین عورت سامنے کھڑی ہے ۔ اس کے سر کے گرد روشنی کا ایک ہالہ ہے ۔ اس کے سارے بدن سے روشنی کی خیرہ کن شعاعیں پھوٹ رہی ہیں ۔ اس کا چہرہ چاند سے زیادہ منور ہے ، اور کنول کی طرح حسین ۔ اس کے گھنگھور گھٹاؤں جیسے کھلے بال ایک طرف شانے پر پڑے ہوئے گھٹنوں تک لہرا رہے تھے ۔ سر پر ہیروں اور زمرد کا تاج تھا اور متناسب جسم پر لپٹی ہوئی نیلی ساری یاقوت اور موتیوں سے جڑی ہوئی کمر پٹی سے کسی ہوئی تھی ۔ اور نازک کلائیوں میں چنبیلی کے گجرے اور بانہوں میں موتیا کی لڑیاں لپٹی ہوئی تھیں ۔ اور کنول جیسے پاؤں کو اپنے دامن میں لینے کے لئے دھرتی سے آپ ہی آپ پھول اُگ آئے تھے ۔ ایک نادر حسن تھا ۔ ایک عجیب شان اور گمبھیرتا !

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی آ رہی تھی ۔ شیام پر ایک عجیب کیفیت طاری ہونے لگی ۔ وہ بنسی بجاتے بجاتے رک سا گیا ۔ دیوی نے ہاتھ سے اشارہ کیا ، بجاتے جاؤ ۔ شیام بجاتا رہا اور راگ ختم کرنے پر اسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کرے ۔ اس نے سور داس کی طرف دیکھا اور سور داس

کی آنکھوں میں اسے ایک ایسی چمک نظر آئی جو اسے بالکل پسند نہ آئی ۔ وہ کچھ عجیب ہی نظروں سے دیوی کو گھورے جا رہا تھا ۔

شیام کا دل اس وقت جذبۂ عقیدت اور پرستش سے معمور تھا ۔ اپنی نگاہوں میں یہی جذبۂ پرستش لئے وہ دیوی کو دیکھتا رہا ۔ دیوی آگے بڑھی، اسے یوں لگا جیسے دیوی اس سے کچھ پوچھنا چاہتی ہو ۔ اس غنچہ دہن کے یاقوتی لب کھلے ، لیکن اسی سمے اچانک دیوی کا وہ روپ فضا میں شامل ہو گیا ، ہوتے ہوتے غائب ہو گیا ۔

شیام بہت دیر تک اس سحر کا شکار رہا ۔ سور داس کی آواز نے اسے اس بے خودی سے چونکا دیا " دیکھ لیا نہ تم نے دیوی کا روپ ! اب تم جا سکتے ہو ۔ میں جب لوٹتی جاؤں گا تمہیں بلوا لے جاؤں گا " ۔

شیام کی سمجھ میں نہ آیا کہ سور داس جی اتنی رات گئے اسے گاؤں لوٹنے کو کیوں کہہ رہے ہیں ۔

اسی رات اسے جنگل پار کر کے گاؤں لوٹنا تھا ۔ اسے کچھ ڈر سا لگنے لگا ، لیکن آج رات اسے ایسا لگ رہا تھا اب وہ دیوی سرسوتی کی پناہ میں ہے ۔ وہ اس کی حفاظت کرے گی ۔ وہ بغیر کسی خوف کے اس گھنے جنگل میں داخل ہو گیا ۔ بیچ جنگل میں اس نے دیکھا ایک طرف درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں روشنی سی ہو رہی ہے ۔ اسے کچھ شک سا گذرا اور وہ جھنڈ کے پاس اور قریب گیا ۔ اور اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ دیوی ابھی تک وہیں تھی ۔ اس کے بدن سے روشنی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں ، لیکن اب یہ روشنی حیرہ کن نہ تھی ۔ چاند کی روشنی کی طرح ہلکی نیلی سی اور ٹھنڈی تھی ، وہی نادر حسن تھا ، لیکن اب اس حسین چہرے پر ایک عجیب درد اور بے چینی سی نمایاں تھی ۔ کنول جیسی آنکھیں نم دار تھیں ، جیسے وہ کسی ان جانے غم سے بوجھل ہوئی جا رہی ہوں اور وہ اسی جھنڈ میں بار بار اس طرح چکر کاٹ رہی تھی جیسے راہ بھول گئی ہو ۔

شیام سہم گیا ۔ اسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کرے ۔ اور وہ کر بھی کیا سکتا ؟ دیوی کو اس حالت میں دیکھ کر شیام کے دل میں ایک درد پھوٹ پڑا ۔ کاش وہ کچھ کر سکتا ، وہ کچھ کر سکتا !

سویرے ہی شیام اچاریہ پورنا بردھن کی سیوا میں جا پہنچا ۔ اچاریہ پورنا بردھن سے اسے بڑی عقیدت تھی ۔ اس نے سوچا شاید وہ کچھ کر سکیں ۔ اس نے انہیں رات کا سارا ماجرا کہہ سنایا ۔ اچاریہ تڑپ اٹھے ۔

" تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ بتایا شیام ۔ میں تمہیں اس آدمی کے ساتھ جانے نہ دیتا ۔ وہ آدمی جس کا تم ذکر کر رہے ہو ہرگز ہرگز سور داس نہیں تھا ۔ میں نے سور داس کو دیکھا ہے اور اس آدمی کو بھی ۔ وہ گندپا تھا ۔ اس نے سور داس کے ساتھ بھی یہی کیا تھا ۔ جس وقت سور داس نے اس مندر کے پاس اسی ٹیلے پر بیٹھے میگھ ملہار چھیڑا تھا ، یہ بہروپیا بھی ساتھ تھا ۔ روایت ہے سور داس کی سوز بھری آواز سے مسحور ہو کر دیوی سرسوتی خود اس کے سامنے چلی آئی تھی ۔ دیوی نے خوش ہو کر سور داس سے پوچھا تھا ، اس سمے وہ جو مانگنا چاہتا ہے مانگ لے ۔ اور سورداس نے دیوی سے یہ مانگا کہ اس کا نام سنگیت میں بڑا نام ہو ۔ اور وہ سنگیت کی گہرائیوں کو پا سکیں ۔ دیوی نے سور داس کے سارے ارمان پورے کرنے کا وچن دیا ۔ گندپا کو پاس بیٹھا دیکھ کر اس سے بھی یونہی پوچھا کہ وہ بھی کچھ مانگنا چاہتا ہے تو مانگ لے ۔ دیوی کا حسن دیکھ کر گندپا کے سینے میں کچھ اور ہی ارمان سلگ رہے تھے ۔ اس نے ڈھیٹ بن کر کہا : " میں تمہیں مانگتا ہوں "۔ دیوی کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ نکلے، دیوی کے غصہ سے دھرتی کانپ اٹھی ۔ " مجھے اپنانا

چاہتے ہو؟ سرسوتی کو تو اپنا نہیں سکتا ۔ اور پھر تم جیسا کمینہ، جاہل آدمی، جس کے پاس کوئی علم نہیں، کوئی ہنر نہیں، جسے فن اور کلا اور سنگیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں، تم جیسا آدمی مجھے کہاں پا سکتا ہے؟ تمہاری یہ مجال کہ مجھی کو مانگو؟ سرسوتی کو اپنانا چاہو؟"
دیوی بپھری ہوئی واپس چلی گئی ۔ اور اس دن سے وہ کمینہ اسی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح دیوی کو انسانی روپ میں لے آئے اور قید کر کے اپنے پاس رکھ لے ۔ اس نے جادو، سحر، ٹونے ٹوٹکے سیکھنے شروع کئے ۔ یہاں ایک ایسا گروہ بھی ہے جو ہمارے دھرم کو نسٹ کرنے پر تلا ہوا ہے ۔ ان کے گرو کے پاس اس نے وہ سب سیکھے اور پھر وہ ایسے آدمی کی جستجو میں تھا جو میگھ ملہار اس طرح چھیڑ سکے کہ دیوی مسحور ہو کر پھر دھرتی پر اتر آئے اور اس سمے وہ منتروں سے اسے رام کر لے ۔ جو کچھ تم نے سنا ہے، کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کل رات اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب ہو گیا ہے ۔ ۔

شیام تم نے بہت بڑا پاپ کیا ہے ۔ سوچ بھی سکتے ہو تم نے کیا کیا ہے؟ تم نے دیوی سرسوتی کو قید کرنے میں ایک مہاپاپی کی مدد کی ہے!"

شیام پاگل ہو گیا ۔ انجانے میں اس سے کتنا بڑا پاپ ہو گیا تھا! اس نے اپنے نوجوان، ولولہ بھرے دل میں ایک عزم کیا ۔ وہ دیوی کو کسی نہ کسی طرح آزاد کرائے گا ۔ اس معصوم، پوتر، مقدس دیوی کو اس ناپاک، ہوس پرست سے بچائے گا ۔ وہ یہ جانتا نہیں تھا کہ وہ یہ کیسے کر سکے گا، لیکن وہ اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے، اپنا جیون بلیدان دینے کے لئے، اپنی جان کی بازی لگا دینے پر تیار تھا!

اپنے نوجوان دل میں ایک جوش، ایک عزم، قربانی کا ایک جذبہ لئے ہوئے وہ گاؤں سے چل پڑا ۔ اس نے رادھے سے بھی نہیں کہا وہ کہاں جا رہا ہے ۔ ماں سے رخصت مانگی، ماں کے چرن چھوئے اور ماں کی آشیرواد لے کر چلا ۔ مگدھ کی اس وسیع سلطنت میں وہ شہر شہر، نگر نگر مارا مارا پھرتا رہا ۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اسے ایک مدت گزر گئی ۔ وہ پھر رہا تھا کہاں تھا؟ دیوی کہاں تھی؟

جہاں کہیں بھی وہ جاتا تھا ۔ عجیب و غریب خبریں سننے میں آتی تھیں ۔ راج دربار میں ایک ماہر بت تراش ایک بت بنا رہا تھا ۔ اسے پوری امید تھی کہ یہ بت اس کا شاہکار ہو گا ۔ لیکن اچانک جانے اسے ہو کیا گیا تھا، وہ بت بہت بدصورت سا بننے لگا تھا ۔ اس کے ہاتھوں میں تراش کا وہ ہنر ہی نہیں رہا تھا ۔ ایک نامی چتر کار، ایک تصویر پر کام کر رہا تھا ۔ جو اس کے فن کا بہترین نمونہ ہو سکتی تھی ۔ اچانک مصور کے نقوش بگڑ گئے اور اب وہ جو کوئی بھی تصویریں بناتا بھدی اور معمولی ہوتیں ۔ ایک مشہور مصنف ایک ادبی کارنامہ 'ایپک' تخلیق کر رہا تھا ۔ لیکن اچانک اس کی یہ حالت ہوئی کہ اپنے اظہار کے لئے الفاظ ہی نہیں ملتے تھے ۔

شاہکار نا مکمل رہ گئے تھے، تصویروں میں حسن نہ رہا تھا، موسیقی سے روح چلی گئی تھی، ساز بے سر ہو گئے تھے ۔

دیوی سرسوتی کی وین خاموش تھی اور سنسار میں فن مر گیا تھا ۔

من کی وین منواری باجے،
من کی وین منواری ...... ی

کسی ان دیکھی وین کو چھیڑتی ہوئی انگلیاں رک گئیں ۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں، جیسے وہ کسی بڑے ہی میٹھے سپنے سے بیدار ہوئی ہو ۔

" ارے میں تو باوری ہو گئی ہوں ۔ تم نے یہ کیا راگ چھیڑا تھا پردیسی؟ مجھے یوں

لگ رہا تھا جیسے پونم کی اس چاندنی میں، سنگیت میں اور میرے پچھلے جیون میں کوئی بہت گہرا سمبندھ ہے۔ میں بھی کیسی باؤلی باتیں کر رہی ہوں۔ چلو جانے دو۔ اب کٹیا میں چلیں۔ بہت رات بیت چکی"۔

آج رات پہلی دفعہ وہ گہری نیند سوئی اور شیام رات بھر کٹیا کے باہر بیٹھا اس کی حفاظت کرتا رہا۔

صبح وہ سنیاسی کی تلاش میں چل دیا۔ پاس کے گاؤں میں اسے ڈھونڈ کر وہ واپس آ رہا تھا کہ سنیاسی بھی دوسری اور سے ادھر آتے اسے دکھائی دیا۔ وہ شاید اس کے جانے کے بعد کٹیا میں آ گیا تھا۔

سنیاسی کی نظر شیام پر پڑی۔ " ارے تم یہاں کہاں ؟"

" سنیاسی جی، کیا آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں یہاں کس لئے آیا ہوں ؟"

شیام کے لہجے کا بھرپور طنز محسوس کر کے سنیاسی جکڑا سا گیا۔ " تمہارے برا بھلا کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں خود اپنے کئے پر انتہائی نادم ہوں۔ اس دن سے آج تک میں بھی اسی کوشش میں لگا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا تھا، اس کا توڑ کر سکوں"۔

" آپ کی باتوں پر مجھے تھوڑا وسواس ہے" شیام کی طنز گہری ہوتی گئی۔

" باور کرو، میں کٹیا میں رہتا تک نہیں ہوں۔ گاؤں گاؤں، نگر نگر گھومتا رہتا ہوں۔ کبھی یہاں آیا بھی ہوں تو مجھ پر ایک عجیب ہیبت سی طاری ہو جاتی ہے۔ کٹیا میں جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ یہیں جنگل میں راتیں گذار لیتا ہوں۔ تم باور کر لو، میں نے اسے چھوا تک نہیں ہے۔" یہ پاپی ہاتھ اس مقدس بدن کو کبھی نہیں لگے۔ وہ ابھی تک ایسی ہی پوتر اور پاکیزہ ہے!

اور یہ دیکھو شیام، میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ میں آج اپنے ساتھ کیا لے آیا ہوں۔ اس لٹیا میں مقدس پانی ہے۔ میں بہت دنوں سے اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح توڑ ہو سکے، لیکن کسی گرو، کسی مہاتما کو یہ توڑ معلوم نہ تھا۔ آخر مجھے ایک ایسے مہاتما مل ہی گئے جو یہ توڑ جانتے تھے۔ انہوں نے اس پانی پر کچھ پڑھ کر دیا کہ یہ مقدس پانی اس پر چھڑکا جائے تو وہ اپنی اصلی حالت پر آ جائے گی۔

لیکن شیام بڑی مجبوری ہے میں یہ پانی لے تو آیا ہوں، پر چھڑکنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ میں جانتا ہوں میں نے بہت بڑا پاپ کیا ہے۔ ایک ایسا پاپ جس کے لئے میری جگہ ہمیشہ کے لئے نرک کی آگ ہو گی۔ لیکن یہ تو مرنے کے بعد کی بات ہے۔ اس پانی میں تو اسی وقت کی موت ہے"۔

" موت سے ڈرتے ہو؟ ادھر لاؤ وہ پانی مجھے دے دو"۔

" پہلے سوچ تو لو، شیام۔ اس پانی میں یقینی موت ہے۔ اس پانی کے چھڑکتے ہی تم پتھر ہو جاؤ گے!"

"میں امر ہو جاؤں گا"۔

میں امر ہو جاؤں گا۔ شیام مقدس پانی کی لٹیا کو مضبوطی سے تھامے واپس ہوا۔ وہ اپنی گاگر میں نیر بھرے، آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ رہی تھی، وہ ہاتھوں میں کنول کے پھولوں کے ڈنٹھل تھامے تھی۔ شام کی شفق کی سرخ روشنی میں اس کا کنول سا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ وہ مکھڑا اس کے ہاتھوں میں تھامے ہوئے کنول سے کہیں زیادہ حسین تھا۔

" ارے پردیسی تم آ گئے؟ بہت اچھا کیا۔ چلو گھر چلیں۔ آج سنیاسی بھی آیا ہوا ہے"۔

" سنیاسی تو چلا بھی گیا۔ اب وہ بہروپیا کبھی نہیں آئے گا۔ اب ان نیل کنولوں پر کوئی نرموہی بھونرا نہیں منڈلائے گا"۔

وہ حیران نظروں سے اُس کی طرف دیکھتی رہی ۔ وہ کیا کہہ رہا تھا ؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ۔ " اچھا سنیاسی کو جانے دو ۔ اب تم گھر چلے جاؤ ۔ آج بھی میں نے کنول کے دھوں کی کھیر پکائی ہے ، تمہیں پسند آئی تھی نا "۔

وہ چپ چاپ اُس کے ساتھ ہو لیا ۔ وہ اپنے برتاؤ سے کسی طرح اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کے من میں کیسی ہلچل مچی ہوئی ہے ۔ اس نے کل ہی کی طرح کھانا کھایا اور میٹھا باتیں کرتا رہا ۔

" اب پھر چلیں پردیسی ۔ تم اپنی بنسی بجانے جاؤ ، تم تو اپنی بنسی کی تانوں سے امرت رس گھولتے ہو "۔

وہ باہر نکل آئے ۔ آج رات چاندنی اور بھی نکھری ہوئی تھی اور مکمل ، حسن ، مسحور کن چاندنی میں ، کتنا آنند تھا ، کتنی شانتی !

آہ کتنی حسین رات ہے ! کتنی گہری ، کتنی جادو بھری ، یہ رات جو اس کے جیون کی آخری رات تھی !

وہ بنسی کو اپنے ہونٹوں سے لگائے راگنیاں چھیڑ رہا ، اور آج سچ مچ اس کی روح ہی کی تانوں میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی ۔

" راگ چھیڑو نا پردیسی ، جو کل رات تم نے سب سے آخر میں چھیڑا تھا "۔

اس نے سر اُٹھا کر دیکھا ، چاند سر پر آ گیا تھا ۔ آدھی رات بیت چکی تھی ۔

" آپ کو معلوم ہے یہ کونسی رات ہے "۔

" ہاں پونم کی رات ، کل تیرھویں تھی ۔ چودھویں تو آج ہے "۔

" اور یہ بھی جانتی ہیں یہ کون سا مہینہ ہے ؟"

" نہیں تو ۔ میں تو مہینوں کے نام بھی بھول گئی ہوں ، اور آبادی سے اتنی دور رہ کر پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون سا مہینہ ہے ، کون سا سال ہے ، بس سمے یونہی بیتا جا رہا ہے "۔

" یہ اساڑھ کا مہینہ ہے اور پورنما کی رات اور اب آدھی رات بیت چکی ہے "۔

اُس نے میگھ ملہار چھیڑنا شروع کیا ۔ میگھ ملہار کی چھیڑ سے اس کے بدن میں لہر دوڑ گئی ۔ انگ انگ سے بے چینی جھلکنے لگی ۔ وہ مدہوش سی ہو گئی اور اس کی انگلیاں خلا میں یوں حرکت کرنے لگیں جیسے وہ کسی ان دیکھی وین کو چھیڑ رہی ہوں ۔

پھر میگھ ملہار کا سحر آہستہ آہستہ چھٹنے لگا ۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اور اپنی خلا میں حرکت کرتی ہوئی انگلیوں کی طرف دیکھا ۔ " ارے میں تو سچ مچ باوری ہوئی ہوں ۔ نہ جانے کیوں پردیسی جب کبھی تم یہ راگ چھیڑتے ہو تو مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے پورنما کی چاندنی میں ، سنگیت میں اور میرے جیون میں کوئی بہت گہرا سمبندھ تھا "۔

" اپنے ذہن پر ذرا زور دیجئے ، سوچئے آپ کون تھیں ؟ "

" نہیں مجھے کچھ یاد نہیں آتا ، کچھ بھی نہیں "۔

" ہائے ، اپنے آپ کو بھلا دینے والی دیوی ، اپنے آپ کو بھول جانے والی دیوی ! شیام کا دل رو پڑا ۔

" ذرا سوچئے تو ، یاد کیجئے ، یاد کرنے کی کوشش کیجئے ، آپ کہاں سے آئی ہیں اور کون تھیں ! "

وہ پھر کھوئی ہوئی نظروں سے اُفق کی طرف دیکھنے لگی ۔

" نہیں تو مجھے کچھ بھی یاد نہیں پڑتا ۔ مجھے صرف اتنا پتہ ہے کہ میں بدیسہ میں دیوی سرسوتی کے مندر کے پاس بے ہوش ......"

" آپ دیوی سرسوتی ہیں ! "

شیام نے اٹھ کر دیوی کے چرن چھوئے اور اُن کنول جیسے پاؤں پر مقدس پانی کے کچھ چھینٹے دئے - اور دیوی کے کنول جیسے پاؤں کو اپنے دامن میں لینے کے لئے دھرتی سے کنول اُگ آئے -

" اب دیوی سرسوتی ہیں - سنگیت کی ، کلا کی ، روپ کی دیوی ! دیوی ، آپ کے بنا تو سنسار کا فن مر گیا تھا ! حسن فنا ہو گیا تھا "-

اور اس کے قلب و روح ایک وجدانی کیفیت سے سر شار ہو گئے - اس احساس سے کہ وہ نہ صرف دیوی کو قید سے آزاد کرا رہا ہے بلکہ وہ فن کو موت سے اور حسن کو ابدی فنا سے بچا رہا ہے -

پھر اُس نے اس مقدس حسین بدن کے ہر حصہ پر پانی چھڑکنا شروع کیا -

اور آخر میں اُس نے اُس سندر مکھڑے پر پانی کے چھینٹے مارے - اُس حسین چہرے پر ، اور انسانی روپ میں وہ نور کھو کر بھی کنول کی طرح حسین تھا ، اب ایک اور ہی طرح کا حسن پھوٹ پڑا - ابھری ، آسانی حسن !

دیوی اپنے حسین ترین روپ میں اس کے کتنے پاس کھڑی تھی - دیوی کی نگاہیں اُس پر جمی ہوئی تھیں - ان نگاہوں میں بے پناہ تشکر کا جذبہ تھا - اوروہ نگاہیں اُس پر لطف و عنایت برسا رہی تھیں - اُس نے آنکھیں بند کر لیں - اب وہ بڑی خوشی سے اپنی جان دینے کے لئے تیار تھا -

چند لمحوں کے لئے اُس کی پچھلی ساری زندگی اُس کے ذہن میں گھوم گئی - آخر اُس کی عمر ہی کیا تھی - چوبیس سال - کتنی بھلی ، کتنی بے فکری زندگی تھی ! باپ کی موت اُس کی زندگی کا دکھ تھا - لیکن ماں نے باپ کی جگہ لے لی تھی - اُسے ماں سے کیا کچھ نہ ملا تھا - کتنا پیار ، کتنا آنند اور کیسی ممتا ! اُسے اپنی ماں کا چہرہ اب بھی دکھائی دیا - وہ ماں جس نے اُسے آشیر واد دے کر بھیجا تھا ، ڈیوڑھی سے لگی اس کا اب بھی انتظار کر رہی تھی - اس کا لعل کبھی نہ کبھی واپس آئے گا - انتظار کرتے کرتے اُس کی بوڑھی آنکھیں نیم اندھی ہوچکی تھیں - اور ماں کے بعد ایک اور ہی کومل ، سندر چہرا ، اُس کے سامنے اُبھرا ......

" تمہاری رادھے تمہاری راہ میں نین بچھائے رہے گی - تمہاری رادھے تمہارا انتظار کرتی رہے گی ، انتظار کرتی رہے گی "- اور یہ انتظار واقعی اب سدا کا انتظار تھا - اُس کی رادھے مضطرب اور بے چین اُس کی تلاش میں بھٹک رہی تھی !

اچانک اس کے کانوں میں ایک ایسی موسیقی گونجی جیسے وہ اس سنسار کی نہیں ، اینھری ، آسانی موسیقی ہو ، ستاروں کی موسیقی* ! اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں -

دیوی چاند کی کرنوں پر اُڑی جا رہی تھی - اب اُس کے ہاتھوں میں اپنی وچتر وین تھی - اور وہ اپنی وین پر کوئی ان جانا آکاش وانی راگ چھیڑ رہی تھی - اب بھی دیوی کی مہربان نگاہیں اس پر جمی تھیں - دیوی کا حسین ترین روپ اس کے سامنے تھا - اور دیوی اپنی وین چھیڑتی ہوئی چاند کی کرنوں پر آکاش کی طرف اُڑی جا رہی تھی -

اور پھر اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں -

کتنی حسین موت تھی ، کتنی حسین موت تھی !

ہم سے نہ بیتی جائے عمریا ....

آشرم میں ایک نئی لڑکی داخل ہوئی تھی - اس نے اتنی کم سنی میں جیون بھر کنوارا

* Music of the Spheres -

رہنے کی سوگند کھائی تھی ۔ وہ آشرم کی سب سے اچھی سیوک تھی ۔ اس نئی لڑکی کا نام رادھے تھا !

چاندنی راتوں میں جانے اسے کیا ہو جاتا تھا ۔ وہ آشرم سے باہر گھنٹوں بیٹھی کسی کا انتظار کرتی رہتی تھی ۔ جیسے اب بھی کوئی واپس آئے گا ۔ پونم کی راتوں کو وہ بے چین ، باوری سی ہو جایا کرتی تھی ۔ کیونکہ ان راتوں کو وہ ایک عجیب سا سپنا دیکھتی ، ہمیشہ ایک ہی سا سپنا ——

مگدھ اور بدسہ کے درمیان کی سڑک کے آس پار چھوٹی سی پہاڑی پر ایک کٹیا تھی ۔ کٹیا کے سامنے بانس کے درختوں کا ایک جھنڈ اور اس جھنڈ میں پورنما کی چاندنی میں ایک پتھر کا مجسمہ نظر آتا تھا ، جس کی شکل ہو بہو اس کے شیام سے ملتی تھی ۔ اور پون چلتی تو اس مجسمہ کے پاس کی بانسوں سے ایسی آواز نکلتی جیسے بانسری پر کوئی میگھ ملہار چھیڑ رہا ہو ۔

تنہائی میں تیری یاد   جیسے ایک سریلی دھن
جیسے چاند کی ٹھنڈی لو   جیسے کرنوں کی گُن گُن
جیسے جل پریوں کا ناچ* !

---

* ناصر کاظمی ۔

آرفیوس ، یوریڈیس

بربط کے تاروں سے ایک نہایت میٹھی ، مدھر لے نکلی اور جھیل کے پانیوں سے ٹکرائی ، موسیقی کی لہریں جھیل کی لہروں کو کاٹتی ہوئی نیچے تہہ تک اترتی چلی گئیں ۔

جھیل کی ساری جل پریاں ابر نیساں کے قطروں کو سیپیوں میں گرتے ہوئے دیکھنے میں محو تھیں ۔ ابر نیساں سے ایک گول ، موٹا سا قطرہ کسی سیپ میں گرتا اور اپنی کوکھ کی گہرائیوں میں اس قطرے کو چھپائے سیپ آپ ہی آپ بند ہوجاتی ۔

جانے یہ کیا راز تھا کہ یہ پانی کا قطرہ سیپ کی کوکھ سے موتی بن کر نکلتا تھا !

جل پریاں سوچ رہی تھیں کہ ابر نیساں کے یہ قطرے سیپیوں میں ایک عرصے تک چھپے رہیں گے اور پھر ان سیپیوں سے سچے موتی نکلیں گے ، مکمل ، گول ، نہایت حسین اور آبدار موتی ! اور ان موتیوں کو وہ نقرئی تاروں میں پروئیں گی اور ان کی لڑیاں بنا کر اپنے گلوں میں اور نازک نازک کلائیوں میں پہنیں گی ، اپنی سڈول مرمریں باہوں پر موتیوں کی لڑیاں لپیٹیں گی .... جل پریاں جو خود موتی سونگھے کی بنی معلوم ہوتی تھیں ، اس مدھر رت سے سرشار ، جھیل کے پانیوں میں رقص کرنے لگیں ۔

اور اچانک غیر معمولی ، سحر انگیز موسیقی کی لہریں ان کے کانوں سے ٹکرائیں اور ساری جل پریاں بے چین ہو کر سطح آب پر تیر آئیں ۔

اور پھر انہوں نے بربط بجانے والے کو دیکھا اور یہ دیکھ کر کہ وہ کون ہے ، اُن کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں ۔

" اری دیکھ تو یہ کون ہے "۔ وہ مضطرب اور مشتعل ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگیں ۔ " یہ آرفیوس ہے ، ری ، آرفیوس ۔ اپالو کا سلونا بیٹا ! "

" ہائے ری سچ ؟ دیوتا اپالو کا بیٹا ؟ "

" ہاں ہاں ۔ موسیقی کے دیوتا اپالو کو بھی شاعری کی میوز سے محبت ہو گئی تھی ۔ اور آرفیوس اسی میوز کا بیٹا ہے "۔

" یوں معلوم ہو رہا ہے ساری کائنات اس کی موسیقی کے سحر میں ڈوبی ہوئی ہے ۔ بھلا جس کی پیدائش موسیقی اور فن کے دیوتا اور شاعری کی دیوی کے ملاپ سے ہوئی ہو اُس کی موسیقی میں یہ سحر کیوں نہ ہو ! "

ایک جل پری بڑی گھمبیرتا اور شان سے بولی ۔ یہ جل پری یوریڈیس تھی ، جو اُن ساری جل پریوں میں سب سے زیادہ حسین تھی ، اور اُن جل پریوں کی شہزادی معلوم ہوتی تھی ۔

آرفیوس کو ادھر آتا دیکھ کر ساری جل پریاں جھیل میں غوطہ لگا گئیں ۔ صرف یوریڈیس بغیر کسی جھجھک کے اوپر ہی ، سطح آب پر کھڑی رہی ۔

" چلی آ ، یوریڈیس ، واپس چلی آ "۔ گہرے پانیوں میں اترتی ہوئی اُس کی سہیلی کی جیسے کہیں دور سے آواز آئی ۔

" نیچے چلی آ یوریڈیس ، ورنہ دیکھ تو پچھتائے گی ۔ بھلا ہم جل پریوں کا دیوتاؤں کے بیٹوں سے کیا ملاپ ؟ "

" تم نیچے اپنے سیپیوں اور موتیوں کے جل محل میں چلی جاؤ ، میں یہیں اوپر ، سورج کی دنیا میں رہوں گی ! "

" سورج کی دنیا ہمارے لئے نہیں ہے یوریڈیس ! "

" لیکن میں اسے اپنالوں گی ۔ میرا مقدر میرے ساتھ ہے ۔ میں اپنی تقدیر کی آپ مالک ہوں ! "

یوریڈیس کا اٹل فیصلہ سن کر اس کی سہیلی نیچے اتر گئی ۔ دوسری سب جل پریاں یوریڈیس کے انتظار میں جھیل کی نصف گہرائیوں میں ادھر ادھر تیرتی پھر رہی تھیں ۔ یوریڈس کی سہیلی نے اس کا جواب انہیں سنایا تو جل پریوں کی ٹولی نیچے اپنے سیپیوں کے جل محل میں چلی گئی ۔

صرف یوریڈیس اوپر رہ گئی ، جھیل کی سطح پر ۔

اور اس وقت ، نیلے پانیوں پر کھڑی ہوئی یوریڈیس اتنی حسین لگ رہی تھی ، اتنی حسین کہ جب آرفیوس نے اسے دیکھا تو اسے یوں گمان ہوا جیسے نیلے پانیوں پر کنول کے پھولوں کے درمیان ، سفید جھاگ میں سے اچانک وینس ابھر آئی ہو* !

دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں ۔ اور اسی سمے درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے چھپے ہوئے سربر ، ننھے کیوپڈ نے اپنی کمان کھینچی ۔ کیوپڈ کی تنی ہوئی کمان سے یکے بعد دیگرے دو سنہرے تیر نکلے اور یہ سنہرے تیر آرفیوس اور یوریڈیس کے سینوں میں ایک ساتھ پیوست ہو گئے ۔

اپنی موسیقی کے سحر سے ساری کائنات کو مسحور کرنے والا آرفیوس خود مسحور ہو کر آگے بڑھا ۔ اور یوریڈیس بھی جھیل کے پانیوں پر چلتی ہوئی دھرتی پر آ گئی ۔ اس کے ننگے پیروں کے تلوؤں میں ٹھنڈی ٹھنڈی ، سبز مخملیں گھاس کی خنکی بڑی راحت بخش اور بھلی معلوم ہو رہی تھی کیونکہ زندگی میں پہلی بار وہ زمین پر آئی تھی !

" آپ کون ہیں ؟ دیوی ؟ جل پری ؟ "

" دیوی کہاں ؟ میں تو ایک معمولی جل پری ہوں ۔ اور ... اور میں جانتی ہوں آپ کون ہیں " ۔

" بھلا بتائیے میں کون ہوں ؟ "

" آپ آرفیوس ہیں ، دیوتا اپالو کے بیٹے " ۔ اور آرفیوس کی نظریں اپنے چہرے پر جمی دیکھ کر یوریڈیس نے شرم سے اپنی نظریں جھکا لیں ۔ آپ کے باپ موسیقی کے دیوتا ہیں اور ماں شاعری کی دیوی ۔ بھلا دیوتاؤں کے بیٹوں کا ہم جل پریوں سے کیا ملاپ ؟ "

" آپ بھی تو کیلاپسو کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ۔ وہی کیلاپسو جس نے آٹھ سال تک یولیس کو اپنے دام محبت میں گرفتار کر رکھا تھا ۔ کیلاپسو جسے خداؤں نے لاثانی حسن اور سدا بہار جوانی عطا کر رکھی ہے ؟ "

" نہیں آرفیوس ، نہیں ۔ میں تو ایک معمولی جل پری ہوں ۔ کیلاپسو جل پری ہوتے ہوئے بھی ایک دیوی ہے "۔

" پھر بھی آپ حسین ساحراؤں کی اسی قبیل سے ہیں ۔ ابھی دیکھئیے میں نے آپ کو پہلی بار دیکھا ہے اور جانے ابھی سے میرے سینے میں یہ کیا جذبہ بیدار ہو گیا ہے ۔ آپ نے تو مجھے پہلی ہی نظر میں مسحور کر دیا ۔ آپ نیلگوں کی ساحرہ ! کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں ؟ "

یوریڈیس نے اپنی حسین آنکھیں اوپر اٹھائیں ۔ وہ جو جھیل کے پانیوں کی طرح نیلی تھیں ۔ اور اپنی خوبصورت زلفیں ، جن میں ایسی ہی لطیف لہریں تھیں جیسے جھیل کے پرسکون سطح آب پر پیدا ہوتی ہیں ، اور جو سورج کی کرنوں کی طرح چمکیلی اور سنہری تھیں ۔ اپنی منور پیشانی اور نازک صراحی دار گردن پر سے پیچھے ہٹا کر نرمی سے کہا :

" یوریڈیس ، مجھے یوریڈیس کہتے ہیں "۔

" یوریڈیس ، یوریڈیس " آرفیوس نے یہ نام زیر لب دھرایا ۔ یوریڈیس ، تم آبی دنیا کی

---

* مصور ، بوتی چلی کا وینس کی پیدائش کا مشہور Representation

پری هو اور میں سورج کی دنیا میں دیوتاؤں کا بیٹا ہوں ۔ کیا ہمارا ملاپ ممکن نہیں ؟ ضرور ممکن ہے ۔ تم بھول جاؤ کہ ہم میں کوئی امتیاز ہے ۔ میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں "۔

یوریڈس شرما گئی اور کوئی جواب نہ دیا ۔ لیکن اس کی اس شرم میں ، جس نے اس کے حسین گالوں پر گلال بکھیر دی تھی ، اثباتی جواب موجود تھا ۔

" یوریڈس ، میں ایک بھولا بھٹکا راہی ہوں ۔ بہت دور سے تمہاری اس حسین ، شاداب وادی میں چلا آیا ہوں ۔ پیاسا ہوں ۔ تمہارے جل محل میں ایک پیاسے مسافر کے لئے کچھ راحت کا سامان ہے ؟"

یوریڈس یہ سن کر تیر کی طرح بھاگ نکلی اور جھیل میں ایک چھلانگ لگا کر اندر چلی گئی ۔ آرفیوس کو یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بجلی کوند گئی ہو ۔

آن کی آن میں یوریڈیس پھر نیلے پانیوں کی سطح پر ابھر آئی ۔ اس کے ہاتھوں میں ایک جام تھا اور بلوریں صراحی ۔ بلوریں صراحی میں ایک آتشیں سیال تھا جس کا رنگ شعلوں کا سا سرخ تھا ۔ وہ اپنے آرفیوس کے لئے نکتار لے آئی تھی ۔ نکتار اور امبروزیا ، دیوتاؤں کی غذا تھی ۔ بڑی نایاب اور لذیذ ، لیکن اس کا آرفیوس تو دیوتاؤں کا بیٹا تھا ، اور وہ چاہتی تھی اسے ایسا مشروب پلائے جو دیوتاؤں کے شایان شان ہو ۔

وہ دونوں ایک ٹیلے پر بیٹھ گئے اور یوریڈس اپنے نازک ہاتھوں سے یہ رنگین مشروب بلوریں صراحی سے جام میں انڈیلتی رہی، اور آرفیوس کو پلاتی رہی ۔ قرمزی رنگ کے اس مشروب میں ہلکا سا نشہ تھا اور شہد کی شیرینی !

نکتار کے گھونٹوں نے آرفیوس کو تازہ دم کر دیا ، اور اس نے پھر اپنی بربط اٹھا لی اور اس کے تاروں کو چھیڑنا شروع کیا اور اس کی بربط سے ایسے شیریں نغمے پھوٹنے لگے جیسے اس سے پہلے کبھی نہ پھوٹے تھے ۔ کیونکہ اب ان میں محبت کی چاشنی شامل ہوگئی تھی !

اور وہ دونوں یونہی ملتے رہے ۔ یلیزین وادی کے حسن اور موسیقی کے سحر نے انہیں قریب سے قریب تر کر دیا ۔

اور دیوی جونو کو ان محبت کے دیوانوں پر ترس آگیا اور اس نے آرفیوس اور یوریڈیس کو ایک ایسے بندھن میں باندھ دیا جو جیون بھر ٹوٹ نہ سکے !

اور وہ دونوں اب ایک دوسرے کے جیون ساتھی تھے ۔

شادی کے نئے نئے دن تھے اور ان دونوں متوالوں کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی کی ساری خوشیاں انہیں پر ختم ہوگئی ہوں ۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں یوں مگن ، کھوئے ہوئے ، دنیا و مافیہا سے بے خبر یلیزین کی اس حسین وادی میں یوں رہنے لگے جیسے آدم و حوا اپنی پہلی معصومیت میں ، ایڈن کے بہشتی چمن میں رہا کرتے تھے ۔

یلیزین وادی نہایت سر سبز و شاداب اور بلا کی زرخیز تھی ، پھلوں پھولوں سے ہمیشہ لدی رہتی تھی ، ہر طرف مخملیں دوب کے زمردیں قطعے تھے ، شفاف جھرنے تھے ، چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اس وادی کو اپنے دامن میں لئے ہوئی تھیں ۔

یوریڈس زمین پر چلتی تو مخملیں ، سبز ، ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس اس کے قدموں میں بچھی جاتی ، کہ ہمیشہ پانی میں رہنے کے عادی یہ نازک پاؤں زمین کی سختی محسوس نہ کریں ۔ درختوں کی ڈالیوں سے لذیذ ، پکے ، میٹھے پھل اس کے ہاتھوں میں آپ ہی آپ آ جاتے تھے ۔ اور خود رو پھول اپنی نازک ٹہنیوں سے جھک کر اس کے کومل پیروں کو چوم‌چوم لیتے تھے ۔

اور یوریڈس اپنی آبی دنیا ، اپنے سیپیوں کے جل محل اور اپنی سہیلی جل پریوں کو تقریباً بھلا چکی تھی ۔ یہ سورج کی دنیا تھی ، یہ حسین اور سر سبز وادی ، آرفیوس کی بے پناہ محبت اور آرفیوس کی سحر انگیز موسیقی !

آرفیوس موسیقار بھی تھا اور شاعر بھی ۔ باپ سے اُس نے موسیقی وراثت میں پائی تھی ، اور ماں سے شاعری ! وہ اپنی بربط کے تاروں کو چھیڑتا ہوا اپنے گیت گنگناتا ۔ اس کی آواز میں بھی وہی جادو تھا جو اس کی بربط کی لے میں تھا ۔ ساری وادی پر اُس کی موسیقی کا سحر چھایا ہوا تھا ۔ درختوں کی شاخیں اس کے سہرس نغموں سے مسحور نیچے جھک آتیں ۔ اور آرفیوس اور یوریڈیس پر اپنا سایہ پھیلا دیتیں ۔ جنگل سے درندے کے جانور اس کی موسیقی کے سحر سے کھنچے چلے آتے ۔ شیر ، چیتے ، بڑے اطمینان اور امن سے بھیڑ بکریوں کے پاس ہی بیٹھے رہتے ۔ اور ایک ناگ کہیں سے نکل آتا اور آرفیوس کی بربط کی لے پر مست جھومنے لگتا ۔

رات ہوتی تو سب جانور جنگل کو لوٹ جاتے اور آرفیوس اور یوریڈیس وادی میں گھومتے ہوئے ، ٹھنڈی پر سکون چاندنی سے لطف اندوز ہوتے اور چاندنی میں آرفیوس کی موسیقی کا سحر دوبالا ہو جاتا ۔ یوریڈیس آرفیوس کے اس کمال پر تحسین کے پھول نچھاور کرتی ۔ لیکن آرفیوس کہتا ۔

” یقین کرو یوریڈیس اس سے پہلے میرے نغمے کبھی اتنے سیریں نہ ہوتے تھے ، اور نہ میرے شعروں میں یہ حسن ہوتا تھا ۔ مانا کہ میرے یہ جوہر فطری ہیں اور اپنے والدین سے ورثہ میں ملے ہیں ، لیکن اس فطری جوہر کو جلا دینے والی تم ہو یوریڈیس ! تم میرے وجدان کا سر چشمہ ہو ، میری موسیقی کی روح ہو ! “

موسیقی کی روح ؟

میں موسیقی کی روح ہوں !

یوریڈیس چاندنی میں ٹھنڈی گھاس پر لیٹے لیٹے مدھوش سی ہو جاتی اور آرفیوس اُسے اپنے پہلو میں لٹائے ، سوئے ہوئے بھی بربط کے تاروں کو چھیڑتا رہتا ۔ بڑے ہلکے سروں میں ، تاکہ اس کی یوریڈیس کو میٹھی نیند آ جائے ۔ اور یوریڈیس کے کانوں میں ایک مدھر راگنی گونجتی رہتی اور وہ گہری ، میٹھی نیند کی دنیا میں کھو جاتی ۔ آرفیوس چاند کی روشنی میں اس خوابیدہ حسن کو دیر تک دیکھتا رہتا ۔ اور پھر اُس کی آنکھیں بھی نیند کے نشہ سے بوجھل ہو کر بند ہو جاتیں ۔ لیکن گہری نیند میں بھی اُس کی انگلیاں اضطراری طور پر بربط کے تاروں کو چھیڑتی رہتیں ۔

ان دونوں کی زندگی کتنی حسین تھی !
لیکن حسین زندگی ایک خواب ہوتی ہے ۔
اور جیون سپنے ٹوٹ جاتے ہیں !

یوریڈیس ! یوریڈیس ! یوریڈس !

ایک درد میں ڈوبی ہوئی ، چوٹ کھائی ہوئی ، زخمی آواز پھڑ پھڑا کر ساری وادی میں گونجتی ہوئی ، جھیل کی لہروں سے ٹکرائی ۔

جھیل کی ساری جل پریاں ایک بار پھر بے چین ہو کر سطح آب پر تیر آئیں ۔

” اری یہ تو آرفیوس کی آواز ہے ۔ کیسی چوٹ کھائی ہوئی ہے ۔ ہماری یوریڈس کو کچھ ہو نہ گیا ہو ! “

جل پریاں جو آبی دنیا میں یوریڈس کی غیر موجودگی کو بری طرح محسوس کرتی تھیں اور اس کی جدائی کو سہہ نہ سکتی تھیں ۔ یوریڈیس سے پھر ملنے کی آرزو لئے جھیل سے نکل کر زمین پر اُتر آئیں ۔ اُن کی ٹولیاں یوریڈیس کو ساری وادی میں ڈھونڈتی پھریں ۔ درختوں کے جھنڈوں میں تلاش کیا ۔ کچھ پہاڑیوں کے اُوپر چڑھ گئیں ۔ ٹیلوں کے پیچھے دیکھا ، اور اچانک اس کی سہیلی کی نظر یوریڈیس پر پڑی جو ایک ٹیلے کے نیچے گھاس پر پڑی ہوئی تھی ، بے

جان سی - اس کا سر آرفیوس کے زانوؤں پر تھا اور آرفیوس اسے اس طرح پکارے جا رہا تھا ، جیسے اس کا دل پھٹا جا رہا ہو !

یوریڈیس ! یوریڈیس ! یوریڈیس !

" کیا ہوگیا ہماری یوریڈیس کو ؟ " مضطرب ہو کر سب نے بیک وقت اس سے سوال کیا -

" میں کچھ نہیں جانتا - میں کچھ نہیں جانتا "-

وہ پاگل سا ہو رہا تھا -

کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یوریڈیس امر اور لافانی نہیں ہے - جل پریاں تو عموماً لافانی ہوا کرتی ہیں - کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یوریڈیس فانی ہے - میں اپنے باپ ، دیوتا اپالو کے پاس سے امبروزیا مانگ لاتا ، اور ہر روز رات کو جب وہ سوئی ہوئی ہوتی ، اس کے حسین جسم کے ہر حصہ پر امبروزیا مل کر اسے آگ کے پاس رکھ دیتا - اور اس آگ میں اس کا فانی وجود پگھل جاتا ، اور وہ رفتہ رفتہ لافانی اور امر ہو جاتی -

اور کوئی زبردست طاقت ، حتیٰ کہ موت بھی میری یوریڈیس کو مجھ سے چھین نہ سکتی!

اب بے رحم موت نے میری یوریڈیس کو ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا کر دیا ہے -

میری روح مجھ سے چھین لی ہے!

کیا واقعی یوریڈیس مر چکی تھی ؟ جل پریوں کو یقین نہیں آرہا تھا - انہوں نے یوریڈیس کا پنڈا چھو کر دیکھا - برف کی مانند سرد تھا ، اور وہ دل جو کبھی تیزی سے دھڑکا کرتا تھا ، خاموش تھا -

لیکن موت میں بھی وہ کتنی حسین اور شگفتہ معلوم ہو رہی تھی !

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گہری نیند سوئی ہوئی ہو ، میٹھے سپنوں میں کھوئی ہوئی ، اس کی سنہری زلفیں اس کے مرمریں شانوں پر پریشان تھیں ، گلابی ہونٹ ادھ کھلے غنچے کی طرح نیم وا تھے - شاید مرتے وقت آرفیوس کا نام اس کے لبوں پر تھا - اور ان ہونٹوں پر ایک لطیف سی معصوم مسکراہٹ منجمد ہوگئی تھی - اس کے چہرے پر آکاش کی اپسراؤں کا حسن تھا -

موت میں بھی وہ کتنی حسین لگ رہی تھی !

لیکن وہ مری کیسے ؟

یوریڈیس کی سہیلی کی نظر اس کے کومل پاؤں کے تلوے پر پڑی - " یہ دیکھو " وہ چیخ اٹھی - تلوے پر ایک ہلکا سا زخم تھا - خون کی ایک لکیر نیچے بہہ گئی تھی اور زخم کے آس پاس جلد نیلی ہو چکی تھی -

" زہر ، سانپ "-

" سانپ ، سانپ ، سانپ ! " وہ سب چلا اٹھیں - " یوریڈیس کو سانپ نے ڈس لیا ہے - زہر چوس ڈالو ، جلدی سے زہر چوس ڈالو ! "

نہیں اب کوئی فائدہ نہیں ، وہ مر چکی ہے -

وہ مر چکی ہے !

سانپ ، سانپ ، سانپ ؟

سانپ نے یوریڈیس کو ڈس لیا ہے ؟ آرفیوس اپنی دیوانگی سے چونکا - سانپ ، یعنی وہی ناگ جو اس کی بربط کی لے پر مست جھومتا رہتا تھا ، جو یوریڈیس کے قدموں میں لوٹا کرتا تھا ، وہ ناگ یوریڈیس کو کیسے ڈس سکتا تھا ؟ اس طرح کہ وہ ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو جائے ؟

سانپ ؟ جو یوریڈیس کے حسن سے بھی اتنا ہی مسحور تھا جتنا آرفیوس کی موسیقی سے - سانپ ، جو یوریڈیس کو دیکھ کر ....

جب میں نے اسے دیکھا ، وہ مجسم معصومیت تھی !
وہ مکمل تھی !
اس کی روح گویا جسم کی سرحد پر حیران کھڑی تھی !

Eve, as once I came upon her,
Among her first thoughts stood forlorn.
To Spirits her lips parted were
Before me stood this perfect one,
Her flank, vast and with gold over-run,
Of sun or man without a fear;
Offered to any air that scanned,
The soul still stupified. as it were.
At a loss on flesh's borderland.

Yea! from my leafy post above
Reptile* tasting bird like bliss,
Even the while my chittering wove
The net work of its williness,
Unlistening beauty, I drank you in.
Heavy with charms, limpid, serene,
I dominated furtively,
Eying your burning golden wool
Your nape. inscrutable and full
Of all your motions secrecy.

وہ مکمل تھی ، وہ معصوم تھی !

اور اس تکمیل کو توڑنے ، اس معصومیت کو ملوث کرنے کے لذت آگیں تصور سے میں آگے بڑھا کہ اسے ترغیب دوں اور اچانک میں نے محسوس کیا وہ خود سراپا ترغیب تھی!

تو پھر ترغیب آسان تھی - اور میں نے اسے اس درخت کا ثمر کھانے کی ترغیب دی جو ان کے لئے ممنوعہ تھا - کہا کہ اس کے کھانے پر ان پر سارے علوم روشن ہو جائیں گے - اور وہ ابدی ، لافانی ہو جائیں گے !

انہوں نے وہ پھل کھا لیا اور پھر انسان کو نیکی اور بدی کے علم سے آگاہی ہوئی -
اور اس پہلے گناہ کے بعد انسان کی افتاد واقع ہوئی -
اور موت† ، انسان پر عیاں ہوئی !
اور پھر خداوند نے سانپ سے کہا :
" تیری سزا یہ ہوگی کہ تو زندگی بھر پیٹ کے بل گھسٹتا چلے گا - تیری نسل میں

Valery—Le Serpent *

† یونانی Mythology میں گناہ سے پہلے کی معصومیت ، بنیادی گناہ ، اور گناہ سے موت کے عیاں ہونے کا تصور نہیں ہے - یہ تصور یہودیت ، عیسائیت ، اسلام اور دوسرے بڑے مذہبوں میں پایا جاتا ہے - اس سانپ کی مطابقت سے جو آرفیوس کی موسیقی پر جھومتا تھا . اور جس نے یوریڈیس کو ڈس لیا تھا ، میں نے بنیادی گناہ کی اس انجیلی Symbolism سے مناسبت پیدا کی ہے - م - ش -

اور انسان کی نسل میں ہمیشہ دشمنی ہو گی ۔ وہ تیرا سر کچلے گا تو اُسے ڈس لے گا ......

سانپ نے یوریڈیس کو کیسے ڈس لیا تھا ؟ وہی سانپ جو اُن دونوں کے سامنے مسحور، مست جھومتا رہا تھا ۔ جب وہ دونوں ساتھ ہوتے تھے ، اس نے دونوں کو کیوں نہ ڈس لیا ۔ کاش اس نے دونوں کو ایک ساتھ ڈس لیا ہوتا ، وہ دونوں ایک ساتھ مرتے ، اور اُن کی روحیں ایک ساتھ رہتیں ! آرفیوس ، یوریڈیس کا سر اپنے زانوؤں پر لئیے ، اُس کا زخمی پاؤں اپنے ہاتھ میں لئے تڑپتا رہا !

(ساوتری اپنے پتی کا سر زانوؤں پر لئے بیٹھی تھی ۔ غم سے اس کا کلیجہ پھٹا جارہا تھا ۔ اس کے پتی کو ایک ناگ نے ڈس لیا تھا ۔ اُس کا نیا نیا سہاگ لٹ گیا تھا ۔ اُس کا سارا جیون سونا ہوگیا تھا ...... پیا بن اُس کی عمریا کیسے بیتے گی ۔ یہ جیون بھر کا دکھ اُس سے کیسے سہا جائے گا ؟

آج اُس کی سہاگ رات تھی ، اور آج اُس کے پیتم کا یہ انگ چتا کی اگنی میں جلا دیا جائے گا ۔

ناگ کو ڈسنا ہی تھا تو اُس نے دونوں کو کیوں نہ ڈس لیا ۔ کاش وہ ناگ پھر آئے ، ساوتری کو بھی ڈس لے، تا کہ ان دونوں کی آتمائیں ......

ایک خوفناک چھبی ساوتری کے پاس آ کھڑی ہوئی ۔

یہ موت کا دیوتا ياما تھا ۔ جو اپنا حق لینے آ گیا تھا ۔

" آج میری سہاگ رات ہے دیوتا ! میرے پتی کو تم کیسے چھین سکتے ہو ۔ اُسے لے جانا ہو تو مجھے بھی ساتھ لے جاؤ "۔ ساوتری نے رو رو کر موت کے دیوتا سے پرارتھنا کی ۔

" دیوتا ! آج میری سہاگ رات ہے ۔ میں تم سے اپنے سہاگ کی بھیک مانگتی ہوں ! میرا پتی مجھے واپس دے دو "۔

دیوتا ہنسا ۔ ایک خوفناک تحقیر بھری ہنسی !

" یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی مرنے کے بعد پھر جیون پا سکے ؟ کوئی میرے پاس آئے اور اُسے واپس لوٹا دوں ؟ میں موت کا دیوتا ہوں ۔ اور موت ایک ایسی طاقت ہے ، جس سے کسی کو گریز نہیں ، جس پر کوئی فتح نہیں پا سکتا ۔ ہے کوئی ایسی طاقت جو موت پر فتح پا سکے ؟ "

" ہاں ہے ۔ اور وہ پریم ہے "۔ ساوتری نے ایک گھمبیرتا سے سر اونچا کر کے کہا ۔

" اور میری پریت اتنی سچی ، اتنی گہری ہے کہ موت پر بھی اُس کی جے ہو گی "۔

" اچھا جا ، تجھے اپنی بھیک مل گئی ۔ تیرا سہاگ تجھے واپس دیتا ہوں "۔

موت کا دیوتا یاما یہ کہہ کر غائب ہو گیا ۔ اور ساوتری کو اس کا سہاگ واپس مل گیا ۔

ساوتری کی پریت کی شکتی نے موت پر جے پائی !

اور موت کے دیوتا یاما نے ساوتری کے پتی کا جیون ....)

میں موت کے دیوتا پلوٹو سے اپنی یوریڈیس کی زندگی کی بھیک مانگوں گا ۔ اپنی اتھاہ ، بے کراں محبت کا واسطہ دے کر ۔ لیکن موت کے دیوتا کو محبت سے کیا واسطہ ؟

کاش مجھ میں ہرکولیس کی قوت ہوتی، کہ میں یوریڈیس کو موت کی زیر زمیں اندھیاری دنیا سے واپس لا سکتا ۔ جیسے ہر کولیس موت کے دیوتا سے لڑ کر آل سس ٹس کی روح کو روحوں کی اندھیاری دنیا سے واپس لے آیا تھا ۔

مجھ میں وہ قوت بازو کہاں ؟ لیکن میں بھی دیوتا اپالو کا بیٹا ہوں ۔

میں سورج کی روشن دنیا کے سارے دیوی ، دیوتاؤں سے مدد مانگوں گا !

آرفیوس نے یوریڈیس کے مردہ جسم کو اُس کی سہیلیوں کے حوالے کیا ، کہ اُسے موت کے آخری سفر کے لئے تیار کریں ، اور آپ دیوتاؤں کی تلاش میں نکل کھڑا ہؤا ۔

جل پریاں رو رو کر بین کرنے لگیں ۔

" ہائے یوریڈیس ، تو ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی ! "

" میں نہ کہتی تھی یوریڈس ، سورج کی دنیا ہمارے لئے نہیں ہے ۔ تو پچھتائے گی ۔ تو ہماری اپنی دنیا میں ہوتی تو یوں نہ مرتی ۔ اور مرتی بھی تو جھاگ بن کر جھیل کے پانیوں میں تحلیل ہو جاتی ۔ اب تجھے ہم اس آخری سفر کے لئے کیسے تیار کریں ؟ تیرے اس حسین جسم کو کیسے منوں مٹی کے سپرد کریں ؟ "

اپالو اپنے سنہرے رتھ میں سوار گھوڑے دوڑائے جارہا تھا ۔ آرفیوس نے آگے بڑھ کر سر پٹ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی باگ تھام لی ۔

" اپنی رتھ روک لو ، مقدس باپ ! آپ کا بیٹا ایک زخمی دل لئے آپ سے ایک بھیک مانگنے آیا ہے "۔

" کیا بات ہے ، آرفیوس؟ آج کچھ رنگ دگر ہے ۔ بڑے پریشان معلوم ہو رہے ہو"۔

" میری بیوی یوریڈیس مر چکی ہے ، مقدس باپ ، مجھے کسی طرح اس کی زندگی واپس دلوا دو "۔

" تم نے بہت دیر کی ، بیٹے ۔ پہلے کیوں نہ مجھ سے امبروزیا مانگ لے گئے ۔ تم نہ جانتے تھے کس طرح امبروزیا سے فانی کو لافانی بنایا جاسکتا ہے "۔

" میں کیا جانتا تھا ، مقدس باپ ، کہ وہ لافانی نہیں ہے "۔

" اب کچھ نہیں ہوسکتا ، اب کچھ نہیں ہوسکتا "۔

" کیوں نہیں ہوسکتا ؟ آپ دیوتا ذیوس کے بیٹے ہیں ، جو خداؤں کا خدا ہے ۔ بھلا ذیوس کے حکم کے سامنے پلوٹو کی کیا چلے گی "۔

" ذیوس کی گرجدار برق پلوٹو کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ۔ پلوٹو اپنی روحوں کی دنیا کا خود مختار بادشاہ ہے ۔ وہاں صرف اُس کی بادشاہت چلتی ہے ۔ خداؤں کے خدا ذیوس بھی اُسے مجبور نہیں کرسکتے "۔

اور اپالو آرفیوس کو یونہی مغموم چھوڑ کر ، اپنی رتھ بڑھائے آگے چلا گیا ۔

دیوی آرٹیمس سارے ہتیار تھامے ، آنکھوں سے آگ برساتی ، سامنے سے گذری ۔

" دیوی آرٹیمس ، آپ جنگ کی دیوی ہیں ۔ مجھے اپنا کوئی ہتیار دے دیجئے تاکہ میں موت کے دیوتا سے جنگ کرسکوں ! "

" موت کے دیوتا کے ساتھ جنگ میں میرا کوئی ہتیار کام نہیں آئے گا "۔

دیوی آرٹیمس نے بھی وہی مایوس کن جواب دیا ۔

" دیوی آرٹیمس ، آپ نے افی جی نیا کو دوبارہ زندہ کرکے اُسے دوسری زندگی بخشی تھی ۔ یوریڈیس کو بھی دوسری زندگی بخشئے "۔

" لیکن افی جی نیا تو مری نہیں تھی ۔ میں نے اُسی وقت اُسے زندہ اٹھا لیا تھا ، جب وہ میرے آلٹر پر قربان کی جانے والی تھی "۔

دیوی آرٹیمس ہتیار تھامے چلی گئی ۔

افرو ڈائٹ ، حسن مجسم ایک عجیب شان سے کھڑی تھی !

آرفیوس دیوانہ وار اُس کی طرف بھاگا اور دیوی کے پیروں پر گر گیا ۔

"دیوی افروڈائٹ ، آپ کے سوا اور کوئی میری مشکل کشائی نہیں کرسکتا"۔

"محبت کیا ہوتی ہے، یہ صرف آپ جان سکتی ہیں - میرے دل کا زخم صرف آپ دیکھ سکتی ہیں"۔

دیوی افروڈائٹ ، آپ محبت کی دیوی ہیں ! آپ یہ کیسے گوارا کرسکتی ہیں کہ محبت مر جائے ؟ "

ایک فاتحانہ مسکراہٹ دیوی افروڈائٹ کے لبوں پر نمودار ہوئی ۔ اور دیوی نے اپنی بلندیوں سے اپنے پاؤں پر پڑے ہوئے آرفیوس کو دیکھا اور کہا :

"محبت تو امر ہے - محبت کیسے مرسکتی ہے؟ محبت نہیں مری ، یوریڈیس مر گئی ہے - موت نے تمہاری محبت کو اور گہرا کر دیا ہے ، تمہاری تڑپ اور بڑھا دی ہے ، اور یہ میری فتح ہے !"

" اب ایک زخمی دل کی کراہ ، نالہ و فغاں کو محبت کی فتح سمجھتی ہیں ؟ کیا آپ یہ نہیں چاہتیں کہ محبت زندہ و جاندار ہو ؟ "

" چاہتی ضرور ہوں ، لیکن میں اس معاملے میں تمہاری کچھ مدد نہیں کرسکتی - مجھے تو تمہیں جو کچھ دینا تھا وہ تحفہ تمہیں بخش دیا تھا ......

جانتے ہو نا میرا تحفہ کیا ہوتا ہے ؟ اور پیرس کو میں نے تحفہ میں کیا دیا تھا ؟

انوھی حسن کو اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ عریاں دیکھ کر پیرس مبہوت ہوگیا تھا - اس کے سامنے تین دیویاں کھڑی ہوئی تھیں - ایک سے بڑھ کر ایک حسین ! انہوں نے اپنے دیویوں کے لبادے اتار ڈالے تھے - اور بالکل برہنہ ہوگئی تھیں تاکہ وہ انہیں اچھی طرح جانچ سکے کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ حسین ہے -

پیرس ایک سے دوسری کو پھر دوسری سے تیسری کو دیکھتا رہا - وہ بوکھلا گیا تھا اور اسے سوجھ نہیں رہا تھا کہ کس کا انتخاب کرے اور کسے سب سے زیادہ حسین ہونے کا اعزاز عطا کرے - کیوں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے انداز میں حسن کا مکمل نمونہ تھی !

پھر ہیرا آگے بڑھی - اس نے پیرس سے کہا : " تم مجھے انتخاب کروگے تو میں تمہیں بے پناہ اقتدار دوں گی - انسان اقتدار کا بھوکا ہے - اور اس کے لئے کیا کچھ نہیں کر بیٹھتا ! بولو تمہیں اقتدار چاہئیے ؟ "

ہیرا ذیوس کی بیوی تھی اور وہ جتنا چاہے اسے اقتدار بخش سکتی تھی ! پھر انہینے (Athene) آگے بڑھی اور پیرس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی :

" میں تمہیں علم و دانش سے مالا مال کردوں گی ، میں علم و دانش کی دیوی ہوں"۔

میں چپ چاپ کھڑی یہ تماشہ دیکھتی رہی - میں جانتی تھی فتح میری ہوگی - آخر میں حسن و محبت کی دیوی ہوں - مجھ سے بڑھ کر حسین کون ہوگا ؟

اور مجھے یہ بھی پورا یقین تھا پیرس کو میرا تحفہ سب سے زیادہ پسند آئے گا - میں جو کچھ اسے دے سکتی تھی پیرس کو اس کی سب سے زیادہ ہوس تھی - اقتدار و حکومت اور علم و دانش کی نہیں -

میں اپنی جگہ کھڑی رہی اور اشارے سے پیرس کو اپنے پاس بلایا - اور اپنی ساری اداؤں اور رعنائیوں کی اس کے سامنے نمایش کرتے ہوئے کہا : " اور جانتے ہو میں تمہیں کیا دے سکتی ہوں ؟ "

اور پھر اس کی بوکھلاہٹ اور تجسس کے اضطراب سے پورا فائدہ اٹھا کر، آہستہ آہستہ،

ایک ایک لفظ تول کر کہا :

" میں تمہیں یونان کی حسین ترین عورت تحفہ میں دوں گی !"

پھر تو یہ قیاس کرنا آسان ہے کہ پیرس کو میں نے جیت لیا ۔ اُس نے مجھے سب سے زیادہ حسین ہونے کا اعزاز بخشا ، اور میں نے اپنے وعدے کے مطابق یونان کی حسین ترین عورت اُسے تحفے میں دی ۔

وہ ہیلن تھی ، حسن کی سمبل !

اور اُس حسن کی پیدائش رات اور دن کے ملاپ سے ہوئی تھی ۔

اس کی ماں لیڈا ایک جل پری تھی ۔ اور جانتے ہو لیڈا کیسی تھی ؟

She walks in beauty like the night* !

وہ رات کی طرح حسین تھی ۔ اور دن کا اُس سے ملاپ ہؤا ۔

ایک رات وہ جل پری لیڈا چاندنی میں اپنے عریاں نیلے جسم کا حسن دیکھ کر آپ ہی آپ مسحور ہوئی جارہی تھی ، اور ایسے میں ایک نہایت خوبصورت ، سفید براق راج ہنس اس کے پاس آیا اور نہایت پیار سے اپنی لانبی حسین گردن اور چونچ اور پنکھ اُس پر پھیرتا رہا ۔ لیڈا کے دل میں اس راج ہنس کے لئے بے پناہ محبت اُمڈ آئی ، اور وہ راج ہنس کے سر اور گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرتی رہی ۔ راج ہنس نے اُس کے عریاں نیلے جسم کو اپنے اُجلے پنکھوں میں لپیٹ لیا اور وہ مدھوش ہو کر سو گئی ۔

صبح اُٹھ کر اس نے دیکھا ، اُس کا راج ہنس کہیں غائب ہو گیا تھا ۔

اور اُس کے پاس ایک انڈا پڑا ہوا تھا ۔

یہ انڈا حسن تھا ۔ جو رات اور دن کے ملاپ سے پیدا ہؤا تھا ۔

اور ہیلن اُسی حسن سے نکلی ۔ وہ حسن کی سمبل تھی !

میں نے پیرس کو وہ حسن تحفہ میں دیا تھا ، جس کا وژن دیکھ کر اپنی روح شیطان کے حوالے کرنے والا ڈاکٹر فاسٹس پکار اُٹھا :

Was this the face that launched a thousand ships,
And burnt the topless towers of illium ?
Sweet Helen, make me immortal with a kiss ---
Her lips suck forth my soul : ......

Here will I dwell, for heaven is in these lips,
And all is dross that is not Helena†

اور یہی ہلینا جو حسن کی سمبل تھی ، جو وجدان کا سر چشمہ تھی ، ایک تباہ کرنے والی آگ بن گئی‡ ۔ ہیلن کے لئے یونان اور ٹرائے کے درمیان دس سال تک خونیں جنگ ہوتی رہی ۔

الیم کے برج جل اُٹھے ، ٹرائے تباہ ہو گیا !

اور جب ٹرائے کے میدان جنگ میں پیرس زخمی پڑا تھا ، جاں بلب ، اُس وقت اُس نے اپنے پاس بلایا ، لیکن بے وفا ہیلن نے مرتے ہوئے پیرس کو پوچھ کر بھی نہ دیکھا اور اُسے یونہی جان بلب چھوڑ کر چلی گئی ۔

---

* Byron.

† Marlowe : " Dr. Faustus "

‡ ایک نوجوان ، جدید ڈچ شاعر کی نظم میں ہیلینا کا تصور ۔

پھر انونی زخمی پیرس کے پاس آئی - وہی انونی جسے ہیلن کی محبت میں پیرس چھوڑ چکا تھا - لیکن جو اب بھی اُس کی وفا کا دم بھرتی تھی !

با وفا انونی پیرس کو اس حال میں دیکھ کر تڑپ اُٹھی ، اور اُس کے زخموں پر لگانے کے لئے جڑی بوٹیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر چن لائی - لیکن انونی کی یہ کوشش بے سود تھی ، کیونکہ اُس کے لوٹنے تک پیرس اپنی جان دے چکا تھا -

اُس وقت میں، پیرس کی کوئی مدد نہ کر سکی تھی ، اور نہ ہیلن کی بے وفائی پر کوئی سرزنش کی تھی - پیرس کو یہ معلوم ہونا چاہئے تھا کہ جب ہیلن نے اپنے شوہر مینلاس سے بے وفائی کی تھی تو اس سے بھی ایک نہ ایک دن بے وفائی کرے گی -

جب پیرس مر رہا تھا ، میں اس کی کوئی مدد نہ کر سکی تھی - اور نہ اُسے ہیلن کی وفا دی تھی - میرا کام تو بس اُسے ایک تحفہ دینا تھا -

اور میں نے پیرس کو یونان کی حسین ترین عورت تحفہ میں دی تھی -

اور تمہیں آرفیوس ، تمہیں میں نے یلیزین وادی کی سب سے حسین جل پری دی تھی - اور اب کہ وہ مر چکی ہے - میں تمہیں اُسے واپس نہیں دے سکتی"-

محبت کی دیوی افروڈائٹ نے بھی اُسے مایوس لوٹا دیا تو اب اُسے کسی دیوی دیوتا سے کوئی امید نہ رہی -

کاش مجھ میں ہرکولیس کی قوت ہوتی کہ میں خود اپنی قوت بازو سے یوریڈیس کو موت کے دیوتا سے چھین لا سکتا !

" تمہارے پاس ایک ایسی قوت ہے ، آرفیوس ، جو ہرکولیس کی قوت سے کہیں بڑھ کر ہے - تم اس کے ذریعہ گہرائیوں میں پہنچ سکتے ہو - جہاں تک ہرکولیس اپنی قوت بازو کے ذریعہ بھی رسائی حاصل نہیں کر سکتا ! تمہاری پہنچ اُن گہرائیوں تک ہے - تم روح کی دنیا میں اُترتے چلے جاؤ "-

یہ غیبی آواز سن کر آرفیوس چونکا اور اپنے سامنے اپالو کا ایک وژن دیکھا - اپالو ایک لارل کی شاخ تھامے اور اپنی سنہری بربط لئے کھڑا تھا - اپالو کی بربط کے تاروں کی ایک ہلکی سی چھیڑ نے آرفیوس کو سمجھا دیا کہ اس کے پاس وہ کیا قوت تھی جسے دیوتا اپالو نے ہرکولیس کی قوت بازو سے کہیں زیادہ کہا تھا - اور جس کے ذریعہ وہ روحوں کی گہرائیوں میں اُتر سکتا تھا -

لیکن موت کے دیوتا کو موسیقی اور فن سے کیا واسطہ ؟ آرفیوس نے سوچا -

موت کے دیوتا کو محبت سے کیا واسطہ ؟

نہیں ، یہ بات نہیں - آخر دیوتا پلوٹو نے بھی محبت کی چوٹ کھائی تھی ——

ٹینا کی اُگلتی ہوئی آگ ، گرم گرم لاوے اور آئے دن پھٹتی ہوئی زمین سے تنگ آ کر ، جہاں یہ پھٹتی ہوئی زمین اُس کی روحوں کو پناہ نہ دے سکتی تھی ، وہ جزیرۂ سسلی میں ایک ایسی سر زمین کی تلاش میں آ نکلا تھا جو مضبوط ہو اور زرخیز ، تاکہ وہ اپنی روحوں کی سلطنت کو وہاں منتقل کر سکے -

وہ زیر زمین اپنی رتھ پر گھوڑے دوڑائے جا رہا تھا - ہر جگہ کی زمین کو ٹھونک بجا کے دیکھتا ہوا - ایسے میں وینس نے اپنے بیٹے کیوپڈ سے کہا : " دیکھو بیٹے - اس وادی میں تو اب میری کوئی قدر نہ رہی - میرا اقتدار باقی نہ رہا - شکاری ڈائنا تو محبت وحبت سے کوئی سروکار نہیں رکھتی - اور سیرس کی بیٹی پراسرپائن کا بس چلے تو عمر بھر کنواری رہے - اب میں کوئی ایسا حیرت انگیز کارنامہ چاہتی ہوں جس سے میرا اقتدار اچانک پھر بلندیوں

پر پہنچ جائے اور بھلا اس سے زیادہ بڑا کارنامہ کیا ہو گا کہ خود موت کے دیوتا کو محبت میں مبتلا کر دیا جائے ؟ دیکھو ابھی ادھر سے موت کے دیوتا پلوٹو کا گذر ہوگا ، تم اپنے سنہری تیر کمان سنبھالے رکھنا اور موقع دیکھ کر ، اس طرح اُس کے دل پر سیدھے تیر مارنا کہ خطا نہ ہو ، اور اس زخم سے وہ تڑپ اُٹھے !"

اور کیوپڈ اپنی تیر کمان سنبھالے کھڑا ہو گیا ۔

سسلی میں یہ وادی انتہائی زرخیز اور خوبصورت تھی ۔ کیونکہ دھرتی ماتا سیرس خود یہاں رہتی تھی اور اُس کی دیکھ بھال سے کھیتوں میں خوب اناج اُگتا تھا ۔ وادی پھلوں پھولوں سے لدی رہتی تھی ۔ ہر طرف حتیٰ کہ پہاڑیوں پر بھی ہریالی ہی ہریالی نظر آتی تھی ۔

اسی حسین سر سبز وادی میں جو ایڈن کے بہشتی چمن سے مشابہ تھی ، ایک حوا اپنی مکمل معصومیت میں ، معصوم ، شگفتہ پھولوں کے درمیان ، مخملیں سبز گھاس پر گھوما پھرا کرتی تھی ۔

اور ، ایک بار اور* ، حوا کی معصومیت ملوث کی جانے والی تھی !

دھرتی ماتا سیرس کی ننھی ، نوخیز لڑکی پراسرپائن ، جس سے ، ماں سیرس کو بے اندازہ محبت تھی ، اس سر سبز وادی میں ہرنی کی طرح جوکڑیاں بھرتی پھرتی تھی ۔ پراسرپائن ابھی بچی ہی تھی اور جوانی اور بچپن کی سرحد پر کھڑی تھی ۔ جوانی کے نئے نئے شعور سے وہ بے چین اور مضطرب سی رہا کرتی تھی ۔ وہ اب بھی سہیلیوں کے ساتھ بچوں کے کھیل کھیلتی تھی ۔ اور وادی کے پھول چننے میں بچوں کی سی مسرت محسوس کرتی تھی ۔

اُس صبح بھی وہ اپنی سنہری چپلیاں اُتار پھینک کر ، اوس میں بھیگی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر ننگے پیروں سے چلتی ہوئی ، اپنی سہیلیوں کے ساتھ پھول چنتی جا رہی تھی ۔ حد نظر تک پھول ہی پھول بچھے نظر آتے تھے ۔ رنگا رنگ ، ہر نوع کے شبنم میں نہائے ہوئے شگفتہ گلاب ، بنفشہ ، یاسمین ، لالہ و نرگس ، سورج مکھی ، میری گولڈ ، ڈیلیا ، ڈیزی ، پینزی ۔ پراسرپائن اور اس کی سہیلیوں نے پھول چن چن کر ٹوکریوں میں بھر لئے اور ٹوکریوں میں جگہ نہ رہی تو ان کے گلدستے بنا کر اپنے سینوں پر سجا لئے ، اور جنگلی گلاب کے ہار بنا بنا کر اپنے گلوں اور اپنی باھوں پر لپیٹ لئے ۔

اور پھر پراسرپائن کو کچھ دور پر ایک نرگس کا پھول نظر آیا ۔ غیر معمولی حسین اور بہت بڑا ۔ ایسا پھول اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا ۔ اور اتنی دور سے اُس گل کی مہک اُسے مدھوش کئے دے رہی تھی ۔ اس گل کی کشش سے بے اختیار کھنچ کر وہ آگے بڑھی ۔ وہ جیسے جیسے آگے بڑھتی جاتی تھی ، پھول اور بھی دور ہوتا جاتا تھا ۔ یہاں تک کہ وہ اپنی سہیلیوں کو چھوڑ کر بہت آگے نکل گئی ۔

دوڑتے دوڑتے وہ ھانپ رہی تھی ، پسینہ کے قطرے موتیوں کی طرح اُس کے حسین گلابی چہرے پر اُبھر آئے تھے ۔ اور گلوں میں بسی ہوئی پراسرپائن خود ایک شبنم میں نہایا ہوا شگفتہ گل آپ معلوم ہو رہی تھی !

آخر کار وہ پھول کے پاس پہنچ گئی ۔ لیکن اس کا ڈنٹھل اتنا سخت تھا کہ اُس سے ٹوٹ نہ سکا ۔ اُس نے پورے پودے کو زمین سے زور دے کر نکال لیا ۔ اور جیسے ہی وہ پودا جڑ

---

* ملٹن نے Paradise Lost میں ، حوا کی ایڈن کے بہشتی چمن میں یہی تصویر کھینچی ہے ۔ اور اسے اس زرخیز وادی میں دھرتی ماتا سیرس کی بیٹی پراسرپائن سے تشبیہہ دی ہے ۔ اور حوا کی ترغیب اور Rape of Proser pine میں مماثلت پیدا کی ہے ۔

سے آکھڑ آیا ۔ ارد گرد کی مٹی ڈھیلی ہوگئی ، اور زمین کھلنے لگی ۔ اور اسی وقت پلوٹو کا رتھ بالکل اسی جگہ پہنچا تھا ۔ کھلتی ہوئی زمین سے روشنی اندر آئی تو اس نے اوپر دیکھا ۔ نکھتوں میں بسی ہوئی ایک معصوم ، نو خیز کلی حیران و پریشان کھڑی تھی ! مشتعل اور شعلہ رو ۔ وہ اپنی پریشانی اور اضطراب میں اور بھی حسین معلوم ہورہی تھی ۔ موت کا دیوتا پلوٹو اسے دیکھ کر اتنا بے چین ہوگیا کہ آن کی آن میں اس نے پراسرپائن کو گود میں اٹھا لیا اور رتھ میں اسے اپنے پہلو میں بٹھائے سر پٹ گھوڑے دوڑا دئے ۔ گھبرائی ہوئی پراسرپائن کی ایک آخری چیخ وادی میں گونجتی رہ گئی !

اور دھرتی ماتا سیرس نے پراسرپائن کی چیخ سنی اور ساری وادی میں دیوانہ وار اسے ڈھونڈتی پھری ، اور اسے نہ پاکر گوشہ نشین ہو گئی ۔

پھول مرجھا گئے ، درخت سوکھ گئے ، غلہ برباد ہو گیا ۔ وادی میں قحط پھیل گیا ۔

سورج کی دنیا کے دیوتاؤں نے یہ حالت دیکھی تو اپنے قاصد مرکیوری کو ، جس کے پیروں پر ننھے ننھے سنہری پر لگے تھے ، موت کے دیوتا پلوٹو کے پاس بھیج کر یہ طے کروایا کہ پراسرپائن کچھ عرصہ اس کے پاس رہے گی اور سال کا بیشتر حصہ اپنی ماں کے پاس گذارے گی ۔

اور جب نو بہار چمن پراسرپائن دھرتی ماتا سیرس کے پاس رہتی ، روئے زمین پر بہار چھائے رہتی ، اور جب پراسرپائن روحوں کی دنیا میں پلوٹو کے پاس واپس چلی جاتی اور سیرس پھر گوشہ نشین ہو جاتی ، دنیا پر خزاں چھا جاتی ۔

اور یوں بہار اور خزاں کے موسم پیدا ہوئے ۔

اب پراسرپائن بھی خوش تھی کہ وہ ایک عرصہ تک ماں کے پاس رہتی تھی اور بقیہ وقت روحوں کی دنیا کی ملکہ بنی وہاں حکومت کرتی تھی ۔

تو محبت کی بے پناہ قوت ، محبت کے سحر نے موت کے دیوتا کو بھی رام کر لیا تھا ! آرفیوس کو اب امید پیدا ہو چلی تھی کہ وہ محبت کا واسطہ دے کر موت کے دیوتا سے اپنی یوربڈس کی روح واپس مانگ لائے گا ۔

وہ اب ہیڈس کی ندی کے کنارے کھڑا تھا ۔ یہاں کشتیوں میں روحیں اس پار ، زیر زمین روحوں کی دنیا میں پہنچائی جا رہی تھیں ۔ کشتی رانوں نے اسے اپنے ناوؤں میں بٹھا کر اس پار لے جانے سے انکار کر دیا ، کیونکہ وہ صرف روحوں کو اس پار لے جاتے تھے ، اور آرفیوس ابھی مرا نہیں تھا ۔ اس کا وجود مادی تھا ۔

وہ دوسری طرف زمینی راستہ سے پہنچا ۔ یہاں زمین میں ایک سوراخ سا تھا ، جس سے ایک تنگ سا راستہ نیچے جاتا تھا ۔ جیسے ہی وہ اندر اترا ، موت کی سلطنت کے دروازے پر ایک خوفناک تین سروں والا کتا سربیرس آگے بڑھا ۔ آرفیوس نے اسے نان کے ٹکڑے نہیں کھلائے بلکہ صرف اپنی بربط کی تاروں کو ہلکے سے چھیڑا ۔ اور یہی ہیبت ناک کتا جو ہرکولیس پر اپنے خونیں دانت اور پنجے بڑھائے جھپٹ پڑا تھا ، یوں چپ چاپ مسحور کھڑا رہا جیسے یلیزین وادی کے قریب جنگل کے وہ سارے جانور جو آرفیوس کی موسیقی سے مسحور اس کے آس پاس کھڑے رہتے تھے ۔

آگے بڑھ کر ایک اور بڑا آہنی دروازہ تھا ۔ اور یہاں سے تنگ راستہ وسیع ہو گیا تھا ۔ لیکن یہاں سے گذرنا اتنے ہی خطرات کا حامل تھا ، جیسے سائیکلا اور چاربڈس کے درمیان سے گذر جانا ۔

اُس آھنی دروازے پر دو نہایت ڈراؤنی شبیہیں پہرہ دے رہی تھیں ۔ اُن میں سے ایک موت تھی ، دوسری گناہ * ۔

موت آگے بڑھ کر آرفیوس کا راستہ روکے کھڑی ہو گئی ۔ وہ کیسے اندر جا سکتا تھا ، جب نہ وہ موت سے ہم کنار نہ ہؤا تھا ، اور ابھی زندہ تھا ۔ آرفیوس دوسری طرف بڑھا تو گناہ نے اُس کا راستہ روک لیا ۔ آرفیوس نے کوئی گناہ نہ کیا تھا ، اور گناہ کی دنیا میں اس کا بار نہیں تھا !

آرفیوس نے پھر اپنی بربط اُٹھائی اور اُسے چپکے سے چھیڑا ، اور موت اور گناہ کی ہیبت ناک شبیہیں بھی بربط کی لے سے اُسی طرح مسحور ہو کر ساکت و جامد کھڑی رہیں اور اُسے اندر جانے کے لئے راستہ دے دیا ۔

اب آرفیوس اپنی بربط بجاتا ھی چلا گیا ۔ اب اُس کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ رھی تھی ۔ سارے پہرے دار موسیقی کے نشے میں ڈوب جاتے تھے ۔ وہ ایک ایک کر کے ساتوں مہلک گناھوں کی شبیہوں کے درمیان سے گذر گیا † ۔

موت کے دیوتا کے کانوں سے ایک سحر انگیز موسیقی کی لہر ٹکرائی اور وہ حیران رہ گیا کہ یہ کون تھا جو اُس کی روحوں کی دنیا میں اس طرح نڈر چلا آتا تھا ۔ اور یہ کیسی موسیقی تھی جس کا نشہ روحوں کی دنیا کے سارے باسیوں کو مدھوش کئے دے رہا تھا ؟

اب آرفیوس اپنی بربط بجاتا ہؤا اُس تخت کے سامنے کھڑا تھا ، جہاں موت کا دیوتا پلوٹو اور ملکہ پراسرپائن ساتھ ساتھ بیٹھے تھے ۔

ساری روحیں آرفیوس کی موسیقی سے مسحور اُس کے قریب کھنچ آئی تھیں ۔ دوزخ کی آگ میں جلنے اور دوزخ کی اذیتوں سے تڑپنے والی روحوں کو بھی آرفیوس کی موسیقی سے قرار آ گیا تھا ۔

وہ خوفناک فیوریس ، جن کے بالوں میں سانپ کنڈلیاں مارے لپٹے ہوئے تھے ، وھی فیوریس جو کسی سے گناہ سر زد ہو جانے پر اُس کا اس طرح پیچھا کرتی تھیں کہ وہ اذیت دہ زندگی سے تنگ آ کر اُن سے پیچھا چھڑانے کے لئے موت کی پناہ مانگتا تھا ، چپ چاپ کھڑی تھیں ، اور فیوریس کی آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے ۔

لیکن نیوبی کے ھمیشہ بہنے والے آنسو تھم گئے !

ملیڈس نے اپنے گاگر نیچے رکھ دئے ۔

ٹنٹالس اپنے پیاسے لب اُس پانی کی طرف بڑھانا بھول گیا ، جو ھمیشہ اُس کے لبوں سے دور چلا جاتا تھا ۔

اور نارسائسس نے پہلی بار پانی میں اپنے عکس سے نظریں ہٹا کر آرفیوس اور اُس کی بربط پر جما دیں ۔

یہ کیا غیر معمولی قوت تھی ؟ یہ کیسا سحر تھا جو نارسائسس کی توجہ کو اپنے عکس سے ہٹا سکتا تھا ؟

پرسیوس نے گورگن میڈوسا کا خوفناک سر جلدی سے اپنے پیچھے چھپا لیا کہ اُسے دیکھ کر کہیں یہ ساحر موسیقار پتھر نہ بن جائے !

وہ چکر جس سے باندھ کر یکزیان کو اذیت دی جاتی تھی ، آپ ھی آپ تھم گیا ۔

---

* ملٹن کے Paradise Lost میں دوزخ کا ذکر جب سیطان وھاں جاتا ھے ۔

† سات مہلک گناھوں Seven Deadly Sins کا تصور خاص طور سے عیسائیت میں پایا جاتا ھے ۔ ملٹن کی دوزخ میں ان شبیہوں کا بھی ذکر ھے ۔

ہرکولیس کا انسانی وجود ابھی تک بے پناہ تکلیف اور ناقابل برداشت آگ کی سی جلن سے پاگل ہو کر اپنے جسم سے اژدھے کے زہر میں ڈوبے ہوئے لبادے کو الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا ، اور وہ جہاں جہاں سے لبادے کو نوچ پھاڑ کر اپنے جسم سے الگ کرتا تھا ، اُس کی جلد اور گوشت تک اُس کے ساتھ نکل آتا تھا ۔ ہرکولیس چند لمحوں کے لئے اپنی تکلیف بھول گیا ، اور لبادے کو پھاڑتے پھاڑتے رک گیا ۔

اور انسانیت کا پہلا مسیحا ، جسے پتھر کی سولی پر آہنی زنجیروں سے باندھا گیا تھا ، اور جو انسانوں کی نجات کے لئے اپنے زخم جگر سے خون بہا رہا تھا ، کراہتے کراہتے رک گیا ۔

یہ پرومیتھیوس تھا ، جو انسانوں کے لئے آسمانی آگ چرا لایا تھا ، اور انسان کو علم کی روشنی دی تھی ۔۔ جس کی سزا کے طور پر ذیوس نے پرومیتھوس کو کوہ قاف کی چوٹی سے موٹی موٹی آہنی زنجیروں سے باندھ دیا تھا ۔ اور ایک گدھ مسلسل اُس کا جگر چبایا کرتا تھا ۔

گدھ بھی پرومیتھیوس کے جگر پر ٹھونگیں مارتے مارتے اچانک رک گیا ۔

موت کا دیوتا حیران تھا کہ آخر یہ کیا سحر تھا جس نے اُس کی روحوں کی سلطنت میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا ؟

" تم کون ہو ؟" موت کے دیوتا نے آرفیوس کو مخاطب کیا : " یہاں میری سلطنت میں کیوں آئے ہو ؟ جہاں کسی کو بار نہیں ۔ لیکن ہم تمہیں معاف کئے دیتے ہیں ، کیونکہ تم نے اپنی موسیقی کے سحر سے ہمیں ، موت کو بھی ، مسحور کر لیا ہے ۔ ہم سے جو مانگنا چاہتے ہو ، مانگ لو ! ہمیں منظور ہے "۔

" میں اپنی موسیقی کی روح مانگتا ہوں دیوتا ۔ آپ نے میری موسیقی کی روح چھین لی ہے "۔

" تمہاری موسیقی کی روح چھین لی ہے ؟"

" ہاں یوریڈس ، جو میری موسیقی کی روح تھی ! "

" لیکن تمہاری یوریڈس تو مر چکی ہے ۔ اور تم یہاں سے اُسے کیسے واپس لے جا سکتے ہو ۔ مرنے کے بعد کسی کی زندگی واپس لوٹائی جا سکتی ہے ؟ نا ممکن ! "

" آپ چاہیں تو مجھے اُس کی زندگی کی بھیک دے سکتے ہیں ، دیوتا ! آپ کی بے پناہ طاقت سے میں ناواقف نہیں ہوں ۔ کسی کو موت سے مفر نہیں ۔ ہم سب کو ایک نہ ایک دن آپ کے پاس واپس لوٹنا ہے ۔ لیکن موت کا بھی ایک وقت ہوتا ہے دیوتا ! یوریڈیس کی زندگی کی معیاد ابھی پوری نہیں ہوئی تھی ۔ وہ ابھی ابھی جوان ہوئی تھی ، ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ابھی ابھی پایا تھا ، ہمارے وجود کی تکمیل تو اب ہوئی تھی !

محبت کیا ہوتی ہے ۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں دیوتا !! یاد کیجئے آپ نے ملکہ پراسرپائن کو کیسے اپنایا تھا ۔ اور جب قاصد مرکوری انہیں اپنی ماں سیرس کے پاس واپس لے جانے آیا تھا تو آپ نے پراسرپائن کو چپکے سے چند انار کے دانے کھلا دئے ، تا کہ وہ پھر آپ کے پاس آ سکے ۔ اب بھی جب ملکہ پراسرپائن اپنی ماں دھرتی ماتا سیرس کے پاس رہتی ہیں تو کیا آپ بے چین نہیں رہا کرتے ؟ ذرا سوچئے ، اگر پراسرپائن آپ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھین لی جائیں تو آپ پر کیا گذرتی ؟ اور آپ تصور کر سکتے ہیں دیوتا ، مجھ پر کیا گذر رہی ہو گی ، جب کہ میری بیوی یوریڈیس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھین لی گئی ہے ۔

ملکۂ پراسرپائن ، میری یوریڈیس بھی بالکل آپ کی طرح تھی ، ایک معصوم ، شگفتہ پھول ! وہ ہری ہری ، ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر یونہی گھوما کرتی تھی ، اور پھول چنا کرتی تھی ، اور پھول اپنی نازک ٹہنیوں سے جھک کر اُس کے کومل پیروں کو چوم چوم لیتے تھے ! "

پراسرپائن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے ۔ اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں

اپنے شوہر سے التجا کی کہ یوریڈیس واپس دے دی جائے - پلوٹو کے دل پر بھی آرفیوس کی باتیں اثر کر گئی تھیں - اُس نے آرفیوس سے کہا :

" اچھا ڈھونڈ نکالو اپنی یوریڈیس کو !"

آرفیوس نے اپنے ارد گرد روحوں کے اُس بے کراں سمندر پر نظر دوڑائی ، لیکن یوریڈیس اُسے کہیں نظر نہ آئی -

کہاں چلی گئی میری یوریڈیس ؟ کیا اُسے میری بربط کی لے سنائی نہیں دی ؟ جب کہ ساری روحیں میرے پاس کھنچ آئی ہیں ، یوریڈیس کی روح میرے پاس کیوں نہیں آئی ؟

کہیں وہ مجھ سے گریزاں تو نہیں ہے ، جیسے ڈڈو کی روح اینئیس سے گریزاں تھی ؟

*جب اینئیس زیر زمین روحوں کی دنیا میں آیا تھا ، اور اپنے بوڑھے باپ کی روح سے ملا تھا ، اُسے ڈڈو بھی نظر آئی ، لیکن اینئیس کو دیکھنے کے باوجود وہ اُس سے کترا کر چلی گئی ، اپنے شوہر کی روح کے پاس !

لیکن ڈڈو اینئیس سے اس لئے کترا کر چلی گئی تھی کہ اینئیس خود اُسے اپنی محبت میں گرفتار کرنے کے بعد ، اُسے چھوڑ کر چلا گیا تھا ، اور ڈڈو نے خود کشی کرلی تھی - اور اپنے آپ کو چتا کی مقدس آگ میں جلا دیا تھا -

اینئیس کو بھی ڈڈو سے شدید محبت ہو گئی تھی ، لیکن یہ محبت اُس کے اعلیٰ مقصد کے آگے ایک رکاوٹ تھی - اینئیس جو شکست خوردہ ٹرائے چھوڑ کر روما ، ایک نیا ملک بسانے اور وہاں اپنی سلطنت قایم کرنے نکلا تھا ، اُس کے لئے عورت پاؤں کی زنجیر تھی جو اُسے آگے بڑھنے سے روکتی تھی ، اور جب جاتے ڈڈو کو بتائے بغیر کارتھیج سے چلا گیا تھا - اور مرتی ہوئی ڈڈو نے یہ بد دعا کی تھی کہ اُس کے کارتھیج میں ، جہاں کی وہ ملکہ تھی ، اور اینئیس کے روم میں نسل در نسل دشمنی چلی آئے ، اور دونوں سلطنتوں کے درمیان خونی جنگیں ہوتی رہیں -

روحوں کی دنیا میں بھی ڈڈو کا اینئیس سے منہ موڑ کر چلا جانا قرین قیاس تھا ، لیکن اُس کی یوریڈیس اُس سے کیوں گریزاں ہوگی ؟

وہ تو سیاست داں نہیں تھا ، وہ فن کار تھا - اُسے اقتدار اور ملک گیری کی ہوس نہیں تھی ، موسیقی اور فن سے پیار تھا - موسیقی اور فن کی جن بلندیوں کو وہ چھونا چاہتا تھا ، محبت اُن کے آگے رکاوٹ نہیں تھی - سیاسی مقصد کے لئے محبت رکاوٹ ہو سکتی ہے ، لیکن فن کے لئے محبت وجدان کا سر چشمہ ہے !

یوریڈیس اُس کے لئے پاؤں کی زنجیر نہیں تھی - یوریڈیس اُس کی موسیقی کی روح تھی !

" میری یوریڈیس تو یہاں دکھائی نہیں دیتی ، وہ کہاں ہے دیوتا ؟ "

" وہ ابھی آتی ہی ہوگی - تم اپنی بربط پر ایک اور نغمہ چھیڑو ، ہم سننا چاہتے ہیں !"

" ایک ٹوٹے ہوئے دل کا راگ کیا سنئے گا دیوتا ! "

آرفیوس کی زخمی روح اور شکستہ دل کی آواز اُس کی بربط کی لے میں گھل گئی ، اور اُس کے ٹوٹے ہوئے دل سے ایک ایسا نغمہ پھوٹا کہ ساری فضا میں اُس کا درد گھل گیا -

پراسرپائن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہے جارہے تھے - اُس کا نرم دل تڑپ اٹھا - موت کے دیوتا کا دل بھی اُس نغمہ کی آگ میں موم کی طرح پگھلنے لگا -

" آرفیوس ، تمہارے درد کو ہم جان گئے "- موت کے دیوتا کی آواز بھرا گئی - " آج محبت کے درد اور موسیقی کے سحر نے موت پر فتح پائی ہے !"

---

* Virgil : Aenied.

"تم اپنی یوریڈیس کو واپس لے جا سکتے ہو ۔ لیکن ایک شرط ہے ، ایک شرط !"

"وہ کیا ہے دیوتا ؟"

"تمہیں اعتماد ہونا چاہئیے ، کامل اعتماد ۔ تم آگے بڑھتے چلے جاؤ ، یوریڈیس تمہارے پیچھے پیچھے آتی رہے گی ۔ لیکن اوپر کی روشن دنیا میں پہنچنے سے پہلے تمہارے دل میں کوئی شک و شبہ گذرے کہ کہیں تمہیں دھوکا تو نہیں دیا گیا ، اور تم یہ دیکھنے کے لئے کہ واقعی یوریڈیس تمہارے پیچھے آرہی ہے کہ نہیں ، تم نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھا تو تم دوبارہ یوریڈیس کو کھو لو گے ، اس طرح کہ وہ کبھی تمہارے پاس واپس نہیں آئے گی ۔ وہ تم سے چھوٹ کر پھر روحوں کی دنیا میں واپس چلی آئے گی ۔

"مجھے یہ بھی منظور ہے دیوتا"۔

"اب تم آگے آگے چلے جاؤ ، وہ تمہارے پیچھے پیچھے چلی آئے گی"۔

آرفیوس یوریڈیس کو دوبارہ پا لینے کے خیال سے نہایت مسرور آگے بڑھا چلا گیا ۔ راستے میں اس کے دل میں کئی بار یہ شک گذرا کہ آیا یوریڈیس اس کے پیچھے واقعی آرہی ہے کہ نہیں ۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا ، اور پوری قوت ارادی سے کام لے کر اپنے آپ کو پیچھے مڑ کر دیکھنے سے روکے رکھا ۔ یہاں تک کہ وہ سارا اندھیارا راستہ پار کر گیا ۔ اس نے روشنی کی ایک کرن اندر آتے دیکھی ، اور چڑیوں کو چہچہاتے سنا ۔ اس کا دل خوشی سے معمور ہو گیا کہ اب وہ کوئی دم میں سورج کی روشن دنیا میں واپس پہنچ جائے گا ، اور اب یوریڈیس پھر اس کے ساتھ ہو گی ! پھر اچانک اس لمحہ اس کے دل میں اس شبہ نے زور پکڑا کہ یوریڈیس واقعی اس کے ساتھ چلی آئی ہے کہ نہیں ۔

اب تو منزل آ ہی گئی ۔ پیچھے مڑ کر دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے ؟

اور اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ۔ ایک لمحہ کے لئے اسے اپنی بیوی کا وہ حسین چہرہ نظر آیا ، جو اس کے ساتھ واپس روشن دنیا میں چلے آنے کے خیال سے پھول کی طرح کھل اٹھا تھا ، لیکن آن کی آن میں وہ پھول سا چہرہ مرجھا گیا ، اور اس چہرہ پر بے پناہ مایوسی چھا گئی ۔ یوریڈیس اپنی بے بسی میں اس کی طرف بے اختیار ہاتھ بڑھائے ہوئے تھی ، کہ وہ اسے اوپر کھینچ لے ، لیکن کوئی نا معلوم ، ان دیکھی ، زبردست طاقت اسے پیچھے لئے جا رہی تھی ۔ وہ یونہی بے بسی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے ہوئے اور آرفیوس پر اپنی اداس الوداعی نظریں جمائے دھیرے دھیرے پیچھے چلی گئی اور نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ۔

آرفیوس کا دل اس لمحہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ۔ اس نے اب اپنی یوریڈیس کو دوبارہ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو دیا تھا ۔

اب اس کے درد کا درماں اور اس کی تنہا ساتھی صرف اپنی بربط تھی ۔ یوں ساری فطرت ، ساری کائنات اس کے غم میں شریک تھی ۔ بادل آنسو بہاتے تھے ، درخت آہیں بھرتے تھے ، جانور چپ چاپ ، معموم اس کے پاس کھڑے اس کے نغمے سنتے رہتے تھے ۔

اور جب وہ دیوانہ وار ساری وادی میں اپنی یوریڈیس کو پکارتے ہوئے گھوما کرتا ، ساری پہاڑیاں اس کے ساتھ اسی دکھ سے یوریڈیس کا نام دہراتی تھیں ۔

یوریڈیس ، یوریڈیس ، یوریڈیس !

اب آرفیوس کے ٹوٹے ہوئے دل سے جو نغمے نکلتے تھے ، وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ حسین ہوتے تھے ۔ سوز و گداز نے اس کی موسیقی میں بے پناہ اثر پیدا کر دیا تھا ، اور جب وہ بربط بجاتا تھا اس کی زخمی روح ان تاروں میں تحلیل ہوئی جاتی تھی !

اس کی موسیقی کے سحر اور مردانہ حسن کی کشش سے عورتیں اس کے پاس کھنچی چلی

آتیں کہ وہ انہیں اپنا لے گا ۔ لیکن آرفیوس اپنی یوریڈیس کی یاد میں اس طرح محو رہتا کہ اُن کا اُس کے پاس آنا بھی اُسے گراں گذرتا ۔ اُسے اپنی یوریڈیس کے سوا کوئی اور عورت نہیں چاہئے تھی ، کوئی اور نہیں ! اور عورتیں حیران رہ جاتیں کہ آخر وہ ایک مرد عورت کے لئے کب تک اپنی زندگی برباد رکھے گا ۔ آخر آرفیوس کو چند امیزان قسم کی عورتوں سے پالا پڑا ، جنہوں نے اُس کے توجہ نہ دینے کو اپنی توہین سمجھی ، اور یوں بگڑیں کہ اُن کی آن میں آرفیوس کی تکا بوٹی کر دی ۔ اس کے جسم کے سارے حصے الگ الگ کر کے پھینک دئے ، اور آرفیوس کے سر اور اس کی بربط کو ایک ندی میں بہا دیا ۔

آرفیوس کی موت ھیبت ناک اور المیہ موت تھی ، لیکن اب وہ اپنی یوریڈیس سے مل گیا تھا ۔ اور اب اُن دونوں کے روحانی وجود ھاتھ میں ھاتھ ڈالے یلیزین کی حسین وادی میں آزادی سے گھوما کرتے ۔

آرفیوس اور یوریڈیس گو جسمانی طور پر فانی تھے ، موسیقی نے انہیں امر کر دیا تھا ۔

جہاں آرفیوس کے جسم کے حصے دفن ھیں ، وھاں کی بلبلیں اب بھی سحر انگیز نغمے گاتی ھیں ۔

پہاڑوں سے اب بھی آرفیوس کی آواز کی بازگشت آتی ھے :

یوریڈیس ، یوریڈیس ، یوریڈیس !

اور وہ ندی جس میں آرفیوس کا سر اور اس کی بربط بہائی گئی تھی ۔ جس کا نام آرفیوس کے نام پر آلفیوس رکھا گیا تھا ، اس ندی سے اب بھی وھی لے اٹھتی ھے ۔

آرفیوس کی بربط کی لے !

آرفیوس؟ نارسائسَس؟

کیسی ٹھہری کتنی سحر زدہ شب تھی !
اور چاندنی کتنی مکمل ، کتنی حسین ، کتنی مسحور کن !
لیکن وہ چاندنی ظلم ڈھا رہی تھی !
وہ خاموش رات کسی ان جانے راز سے بوجھل معلوم ہو رہی تھی !
وہ سحر زدہ فضا کسی آنے والے حادثے کا پتہ دے رہی تھی !
میرا دل کانپ اٹھا ۔

میں نے اپنی کانپتی ہوئی آنگلیوں سے ستار کے تاروں کو چھیڑا ، اور میرے دل کا گداز ان تاروں میں پگھل بہنے لگا ......

اور نغمے کی ان درد بھری لہروں پر ، اس نقرئی ، نورفشاں چاندنی میں ، وہ چپکے سے ، اپنے پاؤں کی انگلیوں کے بل دوں چلی آئی ، جیسے کوئی بہشتی حور فلک سے اتر کر چاند کی نورانی کرنوں پر تیرتی چلی آئے ۔

یا کوئی حسین آبی پریزاد اپنی جھیل سے نکل کر رقص کرتی چلی آئے ۔

میرے پہلو میں بیٹھ کر اس نے اپنا ننھا سا سر میرے شانے پر ڈال دیا ۔" آقائے شیرازی ، بجائے جاؤ ، ستار ۔ تمہاری ستار کی پر سوز ، درد بھری لے سے میں کھنچی چلی آتی ہوں ۔ بجائے جاؤ ، آج تو میں اپنے وجود کو موسیقی کی لہروں میں کھو دینا چاہتی ہوں !"

اس رات وہ حد درجہ بے چین اور مضطرب تھی ۔ اتنی مضطرب کہ بید مجنوں کی طرح کانپ رہی تھی ۔ اس کے ہونٹوں کے گوشے پھڑک رہے تھے ۔ رخسار انگارے بن کر دھک رہے تھے ۔ اس کی انگلیوں کی تپش میں اپنے شانے پر محسوس کر رہا تھا ۔

" آج تمہیں کیا ہو گیا ہے ، خانم ، کیا ہو گیا ہے تمہیں ؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا ، اور یونہی آنکھیں بند کئے ، وہ میرے شانے پر پڑی رہی ۔ اس کے سارے بدن پر کپکپی طاری تھی ، اور بدن آگ کی طرح جل رہا تھا ۔

اس وقت جہاں ہم بیٹھے تھے ، وہ ہمارے پائیں باغ کا وہ محبوب گوشہ تھا ، جہاں میں اکثر چاندنی راتوں میں ستار بجایا کرتا تھا ۔ مجھے خوف ہوا ، کہیں اسے بخار نہ ہو ، اور یہاں باہر ہوا کی خنکی اسے نقصان نہ پہنچائے ۔ آہستہ سے تھام کر میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا ، اور گرم کشمیری شال اسے اڑھا دی ۔ شال خوب لپیٹے وہ پھر یونہی میرے شانے سے لگی بیٹھی رہی ۔ بالکل چپ چاپ ۔

میرا دل ایک نا معلوم خوف سے بیٹھا جا رہا تھا ۔
یہ فضا اتنی سحر زدہ کیوں تھی ؟

یہ چاندنی ، جو میرے کمرے کے فرانسیسی دریچوں (یہ میں اپنی طہران والی کوٹھی کی بات کر رہا ہوں) سے یوں امڈی چلی آ رہی تھی ، ڈس کیوں رہی تھی ؟

اور یہ رات ، یہ حسین رات ، کسی گہرے راز ، کسی المیے سے بوجھل کیوں معلوم ہو رہی تھی ؟

خداوند ! میں تیری رحمت یزدانی کی پناہ مانگتا ہوں !

وہ اچانک پھر سے بے چین ہوگئی : " ستار ، اپنی ستار اٹھاؤ ، چھیڑے جاؤ ۔ میں آج اپنے آپ کو ، اپنے وجود کو ، موسیقی کی لہروں میں کھو دینا چاہتی ہوں " ۔

میں ستار آہستہ آہستہ چھیڑنے لگا۔ اور اسے کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا، لیکن رہ رہ کر ایک بے چین لہر اس کے بدن میں دوڑ جاتی تھی۔ اس کی دراز، ریشمیں مژہ پر ستارے کانپنے لگے۔ اور اس نے بڑی دھیمی آواز میں، جیسے کہیں گہرائیوں کے اندر سے بول رہی ہو، زیر لب کہا:

”یاد ہے نا، آقائے شیرازی، میں تم سے کیا کہا کرتی تھی۔ جب میں تمہارے پاس نہیں ہوں گی، یہ ستار تم ہمیشہ اپنے پاس رکھنا، اور سمجھنا کہ میں تمہارے پاس ہوں۔ یہ ستار میرا جسم ہے، اس میں میری روح ہے“۔

”ہاں، جانم، یہ ستار تمہارا جسم ہے۔ میں اسے ہمیشہ ہمیشہ اپنے قریب رکھوں گا۔ لیکن اب تو تم خود ہی میرے پاس ہو۔ آج یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو، جانم؟“

اس نے اداس لہجے میں، نہایت دکھ سے کہا: ”شما نمی دانید، من می دانم“۔ یہی جملہ جو وہ اکثر اتنی شوخی سے ادا کیا کرتی تھی، آج اپنے درد بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی: ”شما نمی دانید، من می دانم!“ وہ کیا جان گئی تھی؟

میں بے پناہ اداسی کے عالم میں ستار بجانے لگا۔ جانے میری ان انگلیوں کو، میرے اس محبوب ساز کے تاروں کو کیا ہو گیا تھا، یکے بعد دیگرے وہ سارے نغمے جاگ اٹھے، جن سے ہماری محبت کی داستان مرتب ہوئی تھی۔ آخری نغمہ ختم کر کے میں نے چپ چاپ ستار نیچے رکھ دی۔

اس کی آنکھیں نیم باز تھیں اور اس پر نیم بیہوشی سی طاری تھی۔ لیکن جیسے ہی میں نے ستار رکھ دی، وہ چونک کر بیدار ہو گئی اور اسی طرح مضطرب اور بے چین، اصرار کرنے لگی: ”تم نے ستار کیوں رکھ دی؟ تھک گئے، آقائے شیرازی؟ میں پھر تو کبھی تم سے نہیں کہوں گی، لیکن آج، آج کی رات، بجائے جاؤ۔ راگ چھیڑ دو، ایک ایسا راگ جس سے میرے سارے وجود میں، میری روح میں آگ لگ جائے!“

”راگ تو دیپک راگ ہی ہو سکتا ہے، اور یہ راگ گاتے ہوئے خود تان سین کے وجود میں آگ لگ گئی تھی۔ یہ راگ ہر کوئی گا نہیں سکتا، اور نہ ستار پر چھیڑ سکتا ہے۔ اور میں کوئی تان سین نہیں ہوں“۔

”پھر بھی، کوئی ایسا راگ چھیڑ دو، جس کی گرمی سے میری روح پگھل جائے۔ کوئی ایسا آتشیں نغمہ، جس کی لہروں پر میری روح پاکیزہ شعلہ بنی اڑی چلی جائے!“

مجھے خود نہیں معلوم میں نے کیا راگ چھیڑا تھا، بے اختیار میری انگلیوں نے ستار پر ایک ایسا راگ چھیڑنا شروع کیا، جس کی گرمی سے روح پگھل جائے، جس سے سارے وجود میں ایک آگ لگ جائے۔

میں خود اس آگ میں جلنے لگا، اور اس کی حالت تو کچھ نہ پوچھئے کیا تھی۔ اتنی دگرگوں تھی، اف!......... اس کی جبین منور عرق آلود ہو گئی تھی اور پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح گر رہے تھے۔ رخسار سرخ شعلے بنے دہک رہے تھے۔ سارے بدن میں ایک آگ سی لگی تھی۔ اور سانس اتنی تیز کہ سینے میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اور میں تھا کہ بالکل بے خبری کے عالم میں ستار بجائے جا رہا تھا۔ اور جیسے جیسے سانس بلند ہوتی گئیں، یہ آگ تیز ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ اس جلن کی تاب نہ لا کر، تاروں پر ایک تیز ضرب دے کر میں نے اپنی انگلیاں روک لیں۔

ہوش میں آیا تو میں نے دیکھا ستار کے تار ٹوٹ گئے ہیں، میری انگلیاں زخمی ہو گئی ہیں، ان سے خون رس رہا ہے۔ اور وہ محبوب وجود جو ابھی میرے پہلو میں آگ کی

طرح جل رہا تھا ، ٹھنڈا ہو چکا ہے ۔
اُس کی روح ایک پاکیزہ شعلہ بن کر موسیقی کی لہروں کے دوش پر پرواز کرگئی تھی !

وہ مر چکی تھی !

اف ، کتنی حسین موت تھی !

میں نے آہستہ سے اُس محبوب جسم کو جو اب برف کی طرح ٹھنڈا تھا اور وزنی ہو چکا تھا ، اپنے کندھے سے الگ کیا اور نیچے لٹا دیا ۔

میں اُس بے جان حسن کو دیکھتا رہا ، دیکھتا رہا ....

وہ موت میں بھی کتنی حسین لگ رہی تھی ۔ گویا ایک پاکیزہ ، سچا ، آبدار موتی ۔ اُس کے چہرے پر آسمانی حوروں کا سا حسن تھا ، اور اُس کے ہونٹوں پر جو ابھی تک شگفتہ تھے ، وہ مخصوص مسکراہٹ منجمد ہو گئی تھی ، وہ ابدی مسکراہٹ جو لیونارڈو ڈونچی نے مونالزا کے ہونٹوں پر ثبت کر دی تھی !

میں دیکھتا رہا ، دیکھتا رہا ۔ ایک سکتے کے عالم میں ۔ موت کا گہرا راز میرے ادراک سے باہر تھا !

میں خود نہیں جانتا ، اُس وقت مجھ پر کیا گذر رہی تھی ! میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا ۔ لیکن میری آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ تھا !

اچانک باہر دروازے پر کسی نے دستک دی ۔

میں نے دروازہ کھولا ۔ اُس کا شوہر تھا ۔ (ہاں وہ شادی شدہ تھی ، شادی شدہ تھی)

" آغا ، .... شیریں ؟ "

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ بتائے بغیر اُسے اندر اپنے کمرے میں لے آیا ۔ وہ تڑپ اُٹھا : " آغا ، چہ گذشت ؟ "

" بڑی حسین موت تھی ! " میں نے زیر لب گویا اپنے آپ سے کہا : " اُس کی روح ایک پاکیزہ شعلہ بن کر موسیقی کی لہروں کے دوش پر پرواز کر گئی ! "

وہ میری بات کو بالکل سمجھ نہ سکا ۔ اُسے موسیقی سے کوئی گہرا ربط نہ تھا ۔ اور نہ یہ احساس کہ موسیقی اُس کے لئے کیا معنی رکھتی تھی ! اُسے صرف یہ احساس تھا کہ اُس کی محبوب بیوی مر چکی ہے ۔ وہ چپ چاپ کھڑا اپنے ہاتھ ملتا رہا ۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے ۔

میں نے اُس محبوب ، بے جان جسم کو اپنی باہوں میں اُٹھا لیا ، اور چپ چاپ اُس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں دے دیا ۔

" آغا اسے لے جائیے ، یہ جسم آپ کا تھا ۔ اُس کی روح میری ہے " ۔

اور پھر وقت ٹھہر گیا ۔

کائنات بدل گئی ۔

نہیں ، نہیں ۔ سب کچھ وہی تھا ، دنیا وہی تھی ، کائنات وہی تھی !

But Gh the difference to me !

میرے لئے وقت ٹھہر گیا ، یعنی وہ وقت جس کی ایک اندرونی حقیقت ہے ۔ لیکن وہ وقت جس کی حقیقت بیرونی ہے ، آگے بڑھتا گیا ۔ ماہ و سال گذرتے گئے ، زمان و مکان بدلتے گئے ......

وہ ایران تھا ، یہ پاکستان ہے ۔

وہ طہران تھا ، یہ کراچی ہے ۔

کراچی ، کلفٹن کے قریب باتھ آئی لینڈز میں شیرازی کی شاندار ، خوبصورت کوٹھی - شیرازی کا یہ مخصوص کمرہ جسے خالصتاً مشرق ، ایرانی طرز پر سجایا گیا تھا - اس کمرے کی ہر ہر چیز ایک فن کارانہ مزاج کا پتہ دیتی تھی - یہ کمرہ گویا موسیقی کے لئے وقف معلوم ہوتا تھا - بیش بہا ، دبیز ، ایرانی قالینوں سے مزین - کمرے میں ایک طرف چاندنی بچھی ہوئی تھی اور گاؤتکئے لگے تھے - شیرازی خاندان کے قدیم ایرانی ساز یہاں رکھے ہوئے تھے ، طاؤس رباب اور دوسرے ساز -

لیکن ستار ، وہ ستار جسے وہ ہمیشہ ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا ، حتیٰ کہ کار میں بھی - کی شاندار بیوک دھیمی رفتار سے کلفٹن جانے والی سڑک پر دھیرے دھیرے بہے جاتی اور کھویا ہؤا ستار چھیڑتا رہتا - اور پھر کلفٹن کے کسی تنہا گوشے میں ، جہاں کوئی نہ ہو ، مست و بے خود ، دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ستار چھیڑے جاتا ، جس کی تانوں سے کوئی کوئی وہاں کھنچا چلا آتا - اور اُس کی نیم باز ، کھوئی ہوئی آنکھیں کبھی یہ بھی دیکھ لیتیں کہ اُس کی ستار کی لے پر ابھی کے پاؤں تال دینے لگے ہیں اور شہناز گنگنا اُٹھی ہے - جھنجھلا کر ستار اُٹھائے واپس کار میں آ بیٹھتا "میرے لیے وہ گاتی تھی ، وہ صرف میرے لئے رقص کرتی تھی ، فن کار اور موسیقار تو وہ تھی جو فن کی وقعت اور بلندی کو سمجھتی تھی - لوگوں نے فن کو prostitute کر رکھا ہے - چلی چلو میری جیون ساتھی ، واپس گھر چلو - میں کسی کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا - میں سکون چاہتا ہوں ، تنہائی چاہتا ہوں - تو میری جیون ساتھی ! "

یہ ستار جو اب اُس کے لئے جیون ساتھی تھی ، یہ ستار آوبر کیبلٹ پر رکھی ہوئی تھی - کچھ اس طرح کہ اُس کا ایک سرا آتش دان کے اوپر لگی ہوئی ایک قد آدم رنگین اور نہایت حسین پورٹریٹ کے قدموں میں تھا - دوسری طرف مینٹل پیس پر ایک خوبصورت طاؤس سا بنا رکھا تھا جس میں مختلف خوشبوئیں تھیں - آتش دان میں ایک ' ارن ' سی بنی ہوئی تھی ، جس میں عود اور لوبان اور دوسری خوشبوئیں ڈالی جاتی تھیں - یہ سارا کمرہ مقدس خوشبوؤں میں بسا ہؤا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا یہ کوئی قربان گاہ ہے یا کسی دیوی کا آلٹر -

[یہ ایک دیوی کا آلٹر ہے ، میں یہاں عود اور لوبان اور خوشبوئیں جلاتا ہوں - آتش دان میں شعلے دھک رہے ہیں - (ویسے یہاں تو آتش دان کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی) لیکن میں آگ میں ، ان شعلوں میں اتنی کشش کیوں پاتا ہوں ؟

مجھے محسوس ہوتا ہے آگ میں ایک بلندی اور عظمت ہے - آگ کے پاکیزہ شعلے آسمان کی بلندیوں کو چھولینے کی کوشش کرتے ہیں -

وہ جو کبھی سب سے بلند مرتبت فرشتہ تھا ، جسے عرش معلیٰ کی قربت حاصل تھی ، آگ سے بنا تھا - اُس کا وجود ناری تھا - اب بھی وہ شعلہ بن کر آسمان کے قریب پہنچتا ہے اور عرش بریں کے راز معلوم کرنے میں کوشاں رہتا ہے -

کیا آگ صرف اہرمن کا اسم ہے ؟ یا یزداں کی پاکیزگی اور بلندی کا مظہر ؟

میں ، یوسف شیرازی ، عجمی ہوں - مجھ میں اپنے آبا و اجداد کا پارسی خون ہے ، وہ جو زرتشت کی پیمبری کے قائل تھے - وہ جو آگ کی پرستش کرتے تھے - شاید اسی لئے میں آگ میں یہ کشش پاتا ہوں ، اور ایک جذبۂ عقیدت -

لیکن اب میں خالصتاً عجمی نہیں ہوں - عرب نے عجم پر فتح پالی ، جب وہ نور مشرق سے ہویدا ہؤا ، اور ایک سادہ پاکیزہ مذہب نے ، جس نے خدا کے وجود مطلق سے ایک سیدھا ،

براہ راست رشتہ قائم کیا ، ایران کی اس آتش پرستی کی جگہ لے لی ۔

میں مسلمان ہوں ، اور اپنے مسلمان ہونے پر فخر محسوس کرتا ہوں ۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ہماری ملت کی یہ حالت ہے کہ ہمارے حافظ شیراز نے نہایت افسوس کے ساتھ کہا تھا :

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان ۔

شاید ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھے اس آگ سے ، ان خوشبوؤں سے ، اس ritual سے دور رہنا چاہئے ۔ کہتے ہیں اسلام میں ritual کی گنجایش نہیں ہے ۔ تو پھر حج کعبہ ، طواف ، حجر اسود کا چومنا ، قربانی دینا ، کیا یہ سب ritual میں شامل نہیں ہیں ؟ بقرعید کی قربانی ritual نہیں تو کیا ہے ؟ یہ قربانی جو حضرت ابراہیم کی اپنے عزیز بیٹے کی قربانی کی یادگار ہے ۔ اور جو ایک اور آنے والی بہت بڑی قربانی کا اسم تھی! یہ بہت بڑی اور بہت اہم قربانی جو میدان کربلا میں دی گئی ۔

میں شیعہ ہوں ، لیکن محض رسمی نوحہ خوانی اور سینہ کوبی کا قائل نہیں ہوں ۔ اس قربانی کی وقعت کو سمجھتا ہوں جو ایک بہت بڑے اصول کے لئے دی گئی ۔ حضرت امام حسین نے اپنے خون سے اسلام کو سینچا ، اپنی قربانی سے اسلام کو دوبارہ زندگی بخشی اور اسلام ہر کربلا کے بعد پھر سے زندہ ہوتا ہے ....

امام حسین ایک اور مسیحا تھے، یہ اور بات ہے کہ اس نیزے کو جس پر ان کا مقدس سر چڑھایا گیا ہم ایک اور صلیب نہ بنالیں !

لیکن اس قربانی میں ہمارے لئے اتنی ہی روحانی اور جذباتی اپیل ہے جتنی کہ عیسائیوں کے لئے مسیح کے مصلوب ہونے میں ۔ مسیح کی قربانی فن مصوری، اور ادب کا ایک بہت بڑا موضوع ہے ۔ حسین کی قربانی ہمارے فن و ادب کا بہت بڑا موضوع کیوں نہیں بنتی ؟ دنیا کے اس فن میں انتہائی بلندی ہے ، جس کا مذہب سے بہت گہرا تعلق ہے ۔ خواہ وہ ادب ہو ، یا موسیقی یا رقص یا فن مصوری ! پھر اسلام کو فن سے اتنا دور کیوں رکھا جاتا ہے ؟

میں اپنے موسیقی کے اس جنون کو مذہب کے منافی نہیں سمجھتا ۔ مجھے مذہب سے گہرا لگاؤ ہے ۔ مانا کہ موسیقی ایک کافر طبیعت کا تقاضا کرتی ہے ۔ لیکن روحانی جذبات بھی بیدار کرتی ہے ۔ موسیقی میں ایک روحانی عرفان ہے ....

اور میں اپنی موسیقی کی دیوی کے حضور ہدیۂ عقیدت پیش کر رہا ہوں ....]

شیرازی نے ایک خاص ایرانی خوشبو ارن میں ڈالی اور سارا کمرہ اس کی مہک میں ڈوب گیا ۔ اس خوشبودار دھوئیں نے ستار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ اور پھر ستار کے اوپر اس تصویر کو ۔

یہ تصویر کس کی تھی ؟ یہ لڑکی کون تھی جو تصویر میں ایرانی حسن کا مکمل نمونہ اور موسیقی کی دیوی کا ایرانی مظہر معلوم ہوتی تھی ؟

یہ ستار ، اور یہ طاؤس ، یہ دھوئیں کی مہک ، یہ آلٹر اور موسیقی کی دیوی کا یہ ایرانی روپ ! .... شیرازی کی نظریں تصویر پر جمی رہیں ۔ تصویر کے کونے میں درج تھا ——
" شیریں افراسیاب شیرازی " ۔

شیریں افراسیاب شیرازی میری بنت عم تھی ۔ ہم دونوں اس سر زمین خاک سے پیدا ہوئے تھے جس سے وہ شاعر رنگین بیاں ، گوہر افشاں ، حافظ شیراز اٹھا تھا ۔ شاعری اور موسیقی کا جنون ہم نے گویا ورثے میں پایا تھا ۔

وہ میری بنت عم تھی ، میری بچپن کی رفیق ، میری عزیز ترین دوست ، میری محبوب !

انہی دنوں سے ہماری رفاقت تھی جب کہ میں ابھی "طفلک سیاب پا" تھا ۔ اور پھر رفتہ رفتہ شباب کی منزلوں میں یہ طفلانہ انس اور رفاقت بڑی عجیب و غریب ، آتشیں محبت میں تبدیل ہو گئی ۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا ، تم اندازہ نہیں کر سکتے یہ کس نوع کا عشق تھا ۔ ہماری محبت بہت غیر معمولی تھی ، بہت ہی غیر معمولی ! وہ خود بھی ہر لحاظ سے بڑی غیر معمولی لڑکی تھی ۔ نادر اور یکتا ! اس کی ہستی کچھ ایسی بلندیوں کی حامل تھی ، کچھ ایسی بلند و بالا تھی کہ عام لڑکیوں سے اس کا مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا ۔

میں تمہیں کیسے بتاؤں وہ کیا تھی ، کیسی تھی ؟

ایران کا حسن تم نے دیکھا ہے ۔ حسن ہمارے ہاں نایاب شے نہیں ہے ۔ حسن و جمال سے ایران کی عام عورت مزین ہوتی ہے ۔ لیکن وہ تو ایرانی حسن کا ایک نادر نمونہ تھی ۔ ہر اعتبار سے مکمل ۔

شب دیجور سے سیاہ گیسو ، وہ عنبرین کاکل برہم جو اس کے مرمریں شانوں پر ہمیشہ بکھرے رہتے تھے ۔ جبین منور ، ستوریں ، صراحی دار گردن ، وہ ابروؤں کی کمان جو ایرانی حسن کا خاصہ ہے ۔ گہری ، نشیلی آنکھیں ، سرمگیں نرگسی آنکھیں !

وہ غنچہ دہن جس پر ہمیشہ یاقوت کی سی چھوٹ ہوتی تھی ۔ اور وہ لب ، جن کے گوشوں پر وہ ہلکی سی نرم ، لطیف مسکراہٹ ہوتی تھی جو دکھائی نہیں صرف محسوس کی جا سکے ۔ وہ مونالزا کا مخصوص ابدی تبسم !

وہ چاہ ذقن جس کے بارے میں ہمارے شاعران ایران کہتے ہیں یہ ایک ایسا گڈھا ہے حسن میں عشاق بری طرح گرتے ہیں اور جب گرتے ہیں تو اوپر آنے کے لئے انہیں زلفوں کے پیچ کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ لیکن ، کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک !

شاید قدرت کو یہ منظور نہیں کہ کسی کا حسن اتنا مکمل ہو ۔ ایک مرتبہ کار کے حادثے میں اس کا رخسار زخمی ہو گیا ۔ وہ مجھ سے چھپی پھرتی تھی کہ کہیں زخم کا نشان دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ اس کے حسن میں اب داغ لگ گیا ہے ، کہیں میری محبت میں کمی نہ آ جائے ۔ حالانکہ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ اس حال میں بھی میری محبت وہی رہے گی اگر وہ ہمیشہ کے لئے disfigured ہو جائے ۔ پھر اچانک وہ ایک دن ، بہت دنوں بعد ، میرے پاس آئی ۔ میں نے دیکھا ، زخم کا نشان مٹ چکا ہے ، صرف ایک گہرا نقطہ جو رہ گیا تھا ، جس پر اس نے بڑی نفاست سے ایک مصنوعی سیاہ تل بنا رکھا تھا ، اس نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دئے تھے ۔

وہ تل دیکھ کر مجھے ' بخال ہندوش بخشم سمر قند و بخارا را ' کا خیال نہیں گذرا ، اور ' اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا ' کی شرط کا تو یہاں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا ۔ لیکن سمر قند و بخارا کی بخشش تو ' مادی ' تھی ، اور میں نے اسے اپنی ' روح ' کی بخشش کی تھی ۔ وہ تو کچھ ایسی تھی جسے اپنا وجود ، اپنی روح سپرد کی جائے !

میں حسن کے عضو بہ عضو تجزیے کا قائل نہیں ۔ حسن ایک محدب شیشے سے دیکھا نہیں جا سکتا ۔ حسن ایک مکمل تناسب ہے ، ایک مکمل یکائی ۔ اور وہ حسن کی تکمیل تھی !

(لوگ کہتے ہیں میں بھی حسن کا مالک ہوں ۔ اور میرے فن کار اور مصور دوست جانے مجھے کس کس سے تشبیہیں دیتے ہیں ۔ گویا میں بر نی نی کا اپالو ہوں ، مائیکل اینجلو کا ایک شاہکار نوجوان ڈیوڈ ہوں ! کہتے ہیں پرسیوس کے مکمل ڈھلے ہوئے سر اور چہرے کی تراش سے میری تراش اور خد و خال ملتے ہیں ۔

کہتے ہیں مجھ میں اپنے ہمنام مہ کنعانی کا حسن ہے ۔

میں سوچتا ہوں ، میں ہوں ہی کیا ؟ مجھ میں جو کچھ ہے وہ اس جان ہم نشیں کا عکس ہے - حسن تو وہ تھی ، نغمہ تو وہ تھی ....)

وہ حسن بھی ، نغمہ تھی ، شعر تھی ----

جب وہ میرے پاس بیٹھی نازک بلوریں جام میں اپنی محبوب مئے شیری پلا رہی ہوتی تو وہ عمر خیام کی ساقی معلوم ہوتی ، نہیں محض ساقی نہیں ، وہ تو عمر خیام کی رباعی تھی - مجسم شراب ، شعر اور تم پہلو میں کے تینوں عناصر ایک ' تم ' میں مل گئے تھے - ویسے بھی ہمارے ساتھ ہوتی تھی اور شعر بھی - اور پھر وہ خود بہ نفس نفیس ، مینا بدوش آنکھیں ، ساغر بکف نگاہیں لئے !

شراب ، انگور کی بیٹی ، دخت رز ، بادہ از خون رزانست ....

(شراب اس وقت بھی میرے سامنے ہے ، یہ کچے انگور میرے سامنے رکھے ہوئے ہیں - یہ شیری ہے - میں شیری اس لئے پیتا ہوں کہ وہ اس کی محبوب مئے تھی - وہ مجھے شوق سے پلایا کرتی تھی - شیری کی اس سے ایک اور گہری مناسبت ہے - اسی لئے میں شیری پیا کرتا ہوں -

میرے دوست میرا مذاق اڑاتے ہیں کہ میں یہ ہلکی ' لیڈیز ڈرنک' پیتا ہوں - حالانکہ میں تو سیر بھر انگور کے ساتھ سکاچ بھی پی سکتا ہوں - ہالینڈ کی ڈرائی جن کے کتنے ہی پیگ پی لوں مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا - بس ایک ہلکے سے سرور میں مست رہتا ہوں - بلکہ میں کوگ نیک بھی پیوں تو وہ نہیں بولے گی ، جیسے ' مولاں روژ ' میں Toulouse Lautrec نے پئے ہوئے کہا تھا : " ماں ، یہ میں نہیں بول رہا ہوں ، میری کوگ نیک بول رہی ہے " - میرا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ مجھ پر کبھی تیز نشہ نہیں چڑھتا - پھر بھی میں اکثر شیری ہی پیتا ہوں - میرے دوست نے سمجھ کیا جانیں کہ شیری میرے لئے کیا کچھ ہے ؟

جب میں شیری پیتا ہوں ، تو وہ میرے پاس ہوتی ہے !) -

مئے دخت رز ، بادہ از خون رزانست

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند
گل آدم بسر شتند و بہ پیمانہ زدند
شکر یزد کہ میان من و آں صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

شراب اور شعر - حافظ شیراز کے شعر جو مئے سے کچھ کم مدھوش کن نہیں -

حافظ شیرازی ، سعدی ، فردوسی ، رومی کے شعری ورثے کے زیر سایہ پلی ہوئی اس دختر ایران کو میں نے غالب و میر سے بھی روشناس کرایا تھا ، اور غالب کے فارسی اشعار تو وہ بڑے شوق سے پڑھا کرتی تھی -

اور پھر ان کے علاوہ ہماری وہ خاص چیز بھی تھی جس کے بغیر شراب اور شعر کے ساتھ اس تثلیث کی تکمیل نا ممکن ہے .... یعنی موسیقی !

یہ موسیقی ہی تھی جس کے ذریعے ہم دونوں میں اتنا گہرا روحانی ربط پیدا ہو گیا تھا ! موسیقی بھی کیا شے ہے !

(موسیقی کائنات کی روح کو چھو لیتی ہے -
بیتھووِن کی موسیقی میں ایک کائناتی عرفان تھا -
موسیقی فطرت کے عناصر پر اثر انداز ہوتی ہے .....

آرفیوس کی موسیقی کے سحر سے درخت جھوم اٹھتے تھے ، جانور کھنچے چلے آتے تھے ، چٹانیں اپنی جگہ سے ہٹ کر اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتی تھیں ، کائنات کے ہر ذرے پر اس کا سحر چھایا رہتا تھا ۔

اور تان سین کے بارے میں روایات ہیں کہ اُن کے بسنت سے بہار پھوٹ پڑتی تھی ۔ اُن کی موسیقی کی آتشیں لہروں کے اثر سے پتھر پگھل جاتے تھے ، دیپک راگ سے روح میں آگ لگ جاتی تھی ....

کیا یہ سب محض Legends ہیں ؟ اور اگر ہیں تو ان میں گہرے رمزی معنی پوشیدہ ہیں ۔

میں آرفیوس نہیں ہوں ، بیتھوون نہیں ہوں ، تان سین نہیں ہوں ۔ میں ایک معمولی موسیقار ہوں ۔ لیکن میں نے موسیقی کے حسن و سحر کو اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے) ۔

میں اپنے اس موسیقی کے جنون کے لئے آسی کا مرہون منت ہوں ۔ میری روح میں آگ لگانے ، موسیقی کا جادو جگانے والی وہی تھی ۔

میرے وجدان کا سر چشمہ ، موسیقی کی روح ، موسیقی کی دیوی !

موسیقی میں نے زیادہ تر آسی سے سیکھی تھی ۔ گو میرے استاد بھی تھے ۔ وہ ماہر موسیقار تھی ، لیکن صرف ایرانی موسیقی سے واقف تھی ۔ مجھے جب ہندوستان اور پاکستان میں کافی عرصہ گذارنے کا موقع ملا تو میں نے آسی شوق سے یہاں کی کلاسیکی موسیقی سیکھی ۔ دوبارہ ایران جانے پر اس نے مجھ سے یہاں کی کلاسیکی چیزیں سنیں تو بالکل وارفتہ ہو گئی ۔ وہ یہاں کی کلاسیکی موسیقی کو برتر سمجھتی تھی ۔ اور ستار سے تو اسے والہانہ انس پیدا ہو گیا تھا ۔

وہ ستار کی چھیڑ میں اپنے ہر جذبے کا اتار چڑھاؤ محسوس کرتی ، ستار گویا اس کے ہر گہرے جذبہ و احساس کی ترجمان تھی ۔ اور میں خود بھی ستار بجاتے ہوئے محسوس کرتا تھا ، اور اب بھی کرتا ہوں کہ اس ستار سے پھوٹتے ہوئے ہر راگ میں اس کا کوئی نہ کوئی روپ ہے ۔

” یہ ستار میرا اسم ہے ، اس میں میری روح ہے ۔ جب میں نہیں ہوں گی ، تم اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا اور سمجھ لینا کہ میں تمہارے پاس ہوں ۔

یہ ستار جو تم تھامے ہوئے ہو ، یہ ستار جسے تم اتنے پیار ، اتنے انہماک سے چھیڑتے ہو ، یہ ستار جس کی لے میں تم ڈوب جاتے ہو ، کھو جاتے ہو ، وہ میں ہی ہوں ، یہ میں ہی ہوں ۔

فرہاد نے شیریں کے لئے جوئے شیر نکالی تھی ، لیکن مجھے اپنانے کے لئے تمہیں کچھ اور ہی کرنا ہوگا ۔ فرہاد کی جوئے شیر کی میرے یہاں کوئی زیادہ وقعت نہیں ہے ۔ مانا کہ فرہاد نے پہاڑ کاٹنے میں جان جوکھم میں ڈال دی تھی ، اور آخر میں اپنی جان کی قربانی دے دی تھی ۔ لیکن فرہاد کی ' کوہکنی ' پھر بھی محض ایک جسمانی مشقت تھی ۔ میں تم سے جسمانی مشقت کی طلبگار نہیں ہوں ۔ میں تم میں وہ روحانی کرب دیکھنا چاہتی ہوں جو ایک سچے فن کار کا تخلیقی کرب ہے ۔ جب تک تم اس کرب سے نہیں گذروگے ، روح کی گہرائیوں میں نہیں اترو گے ، مجھے کبھی نہیں پاؤ گے ، کبھی نہیں ......“

اور میں جانتا تھا جب تک میں اس کرب سے نہیں گذروں گا ، روح کی گہرائیوں میں نہیں اتروں گا ، میں اپنی یوریڈیس کو کبھی نہیں پا سکوں گا ، کبھی نہیں ۔ وہ میرے پاس

ہوتے ہوئے بلکہ میری اپنی ہوتے ہوئے بھی ، میری رسائی سے دور تھی ، بہت دور !

اور آہستہ آہستہ میری موسیقی میں وہ روحانی کیف پیدا ہوتا گیا ، جس سے ہم دونوں سرشار ہو جایا کرتے تھے؛ اور ہمیں یہ محسوس ہوتا تھا ، ہم دونوں کی روحیں موسیقی کے دھارے پر بہتی ہوئی ایک دوسرے سے مل گئی ہیں ، ایک دوسرے میں تحلیل ہوگئی ہیں ۔

" میں اب تمہاری ہوں ، تمہاری ہوں ، آقائے شیرازی ۔ اب تم نے مجھے صحیح معنوں میں اپنا لیا ہے ۔ من تو شدم ، تو من شدی ، والی وحدت اب ہم میں پیدا ہو گئی ہے ۔ ہم دونوں ایک ہیں ، ہماری روحیں ایک ہیں ، تم میرا ہی ایک الگ وجود ہو ، اور میں تمہاری ہی ایک جدا ہستی ہوں ۔ اگر زمانے یا قسمت نے مجھے تم سے چھین لیا ، پھر بھی ، یقین رکھو ، میں تمہاری رہوں گی "۔

اگر قسمت نے چھین لیا ؟ اور اس پر میرے اندر ایک اہرمن جاگ اٹھتا ، جو طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کرتا ۔ اور اس وقت ہمارے اس سکون میں ایک ہلچل سی مچ جاتی ۔

میں بات ٹالنے سے کہتا : " تم شیریں ہو ، اور اس نام کے ساتھ دنیائے ادب کا ایک شہرۂ آفاق رومان وابستہ ہے ، اور شیریں کے ساتھ ایک تثلیث ہے "۔

" تثلیث یعنی چہ ؟ " وہ بچوں کی سی معصومیت سے سوال کرتی ۔ "تثلیث ، یعنی شیریں ، فرہاد اور خسرو کی تثلیث ۔ فرہاد نے اپنے تیشے سے پہاڑ کاٹ ڈالے ، اپنی جان جوکھم میں ڈال کر جوئے شیر نکالی ، اپنی جان کی قربانی دے دی ، اور شیریں تو خسرو کی تھی ، اور فرہاد . . .

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب
بے ستون آئینۂ خواب گران شیریں

" آقائے شیرازی "، وہ بلبل زار ایک زخمی ہرنی کی آنکھوں سے مجھے دیکھتی (آف! وہ چشم غزالیں !) ۔ " آقائے شیرازی ، شما دائم بہمیں طور گفتگو می کنید ، ایں شکوک و اندیشہ ہا چہ معنی دارند ؟ " جب وہ بپھری ہوئی ، بات کرتی تو فارسی اس کے منہ سے کتنی شیریں معلوم ہوتی تھی ۔ فارسی یوں بھی شیریں زبان ہے ۔ لیکن جب وہ فارسی بولتی تھی تو اس کی شیرینی کے کیا کہنے !

" شیریں ، جانم ، دیوانہ ام کہ ایں اندیشہ ہا دارم "۔ ایک بے پناہ جذبہ میرے سینے میں اُمڈتا اور میں اس کے ننھے سے سر کو سینے سے بھینچ کر اس کے ملائم بالوں کو چوم لیتا ۔

" ہاں ، میں دیوانہ ہوں ، میں دیوانہ ہوں جو شک کرتا ہوں ۔ تم میری ہو ، تم میری ہو ، تم میری ہو ! "

" تم نے مجھے کتنا غلط سمجھا ہے "۔ وہ بے پناہ دکھ سے کہتی : " پھر کیا شیریں نے بھی اپنی جان نہیں دے دی تھی ؟ کون جانے تم نہیں ، میں ہی اپنی جان دے دوں ...... "

میں اپنے کہے پر پشیمان ہو کر اسے ہر طرح سے بہلانے کی کوشش کرتا ۔ اور جب وہ سنبھل جاتی تو اس کی شوخی عود کر آتی : " چہ می گوئی ؟ فرہاد گرسنہ مزدور بود یا فن کار با کمال ؟ بشنو ، از شاعران ایران می گوید —

سکہ کار تیشۂ فرہاد رنگیں آمدہ
ہر کہ بیند نقش او ، گوید کہ شیریں آمدہ "

اور اس بر جستہ جواب کی میں داد دئے بغیر نہ رہ سکتا ۔ شاید اس بڑے ادبی رومان

کے لئے فرہاد کے فن کار ہونے کا تصور زیادہ صحیح تھا !

لیکن ، آخر وہی ہؤا ، جس کا مجھے جانے کیوں بار بار شک گذرتا تھا ۔ ایک خسرو ہمارے درمیان آ گیا ۔ اُس کی شادی تو مجھی سے ہونے والی تھی ۔ بچپن ہی میں ہم دونوں کا رشتہ طے کر دیا گیا تھا ۔ جیسا کہ تمہارے ہاں بھی رواج ہے ، میری ماں اُسے گہوارے ہی سے مانگ لائی تھی ۔ اور چونکہ ہم ایک دوسرے کے منگیتر تھے، ہمارے ملنے جلنے پر کوئی پابندی نہ تھی ۔ ویسے بھی ہم دونوں ایک بلند اخلاق ماحول اور روایات کے زیر اثر پلے ہوئے تھے ۔

اور عین اُس وقت جب کہ ہماری شادی جلدی ہو جانے والی تھی، ایک خاندانی کشیدگی جو مدتوں چلی آئی تھی ، اور جسے ہم دونوں کے روشن خیال اور فراخ دل والدین ہمارے رشتے کے ذریعہ مٹا دینا چاہتے تھے ، اچانک ایک شدید تفاوت میں منتج ہوئی ۔ اور میرے چچا نے نہ صرف اپنی دختر کی مجھ سے نسبت توڑ ڈالی ، بلکہ فوراً ہی اُس کا کسی اور سے رشتہ کر دیا ۔

وہ خسرو بھی ایک عجیب خسرو تھا ۔ اُسے ہماری بچپن کی نسبت ، ہماری گہری رفاقت کا علم تھا ، اور وہ ایک طرح سے اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتا تھا ۔ بلکہ وہ اُس سے کہا کرتا تھا کہ " تم صرف شیرازی کی ہو ، تمہیں زبردستی میری بنا دیا گیا ۔ یہ ہم پر ظلم ہؤا ہے "۔ تم باور نہیں کرو گے وہ کیسا آدمی تھا ۔ وہ اس حد تک روا دار تھا کہ اُس نے اُسے کھلی اجازت دے رکھی تھی کہ مجھ سے جب چاہے ملا کرے ۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی میں چاندنی راتوں میں بیٹھا ستار بجایا کرتا تھا ، اور جب میرے نغموں میں میری بے بسی ، محرومی ، میرا درد حلول ہو جاتا تھا تو وہ میری ستار کی درد بھری لے سے بے اختیار کھنچی چلی آتی تھی ۔ اور وہ اُسے کبھی منع نہ کرتا تھا ، نہ برا مانتا تھا ۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خود مغربی تعلیم ، تہذیب و تمدن سے پوری طرح آشنا ہونے کے باوجود مشرقی اخلاقی اقدار کی پابند تھی اور ایک مشرقی بیوی تھی ۔ اور اپنا تو یہ عالم تھا : ترے خیال کو چھوتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں '

اُسے اپنی بیوی پر اور مجھ پر بھی پورا بھروسہ تھا ۔ پھر بھی تعجب ہوتا ہے ، کیا اُس شخص میں جلن اور Geaponsy کا جذبہ بالکل نہیں تھا ؟ وہ تو اُس کا شوہر تھا ۔ ممکن ہے اُسے جلن اور اذیت ہوتی ہو ۔ بعض لوگوں کو جلنے میں ، اپنے آپ کو اذیت پہنچانے میں مزہ آتا ہے ۔ نہیں معلوم وہ اس اذیت اور جلن میں لذت محسوس کرتا تھا یا اُس کا یہ اقدام اپنی طرف سے ایک بہت بڑی قربانی تھا ۔ بہر حال شوہر ہوتے ہوئے ہمارے دکھ اور محرومی کا احساس بہت بڑی بات تھی ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بھی اُس سے محبت کرتا تھا ، گو میری اور اُس کی محبت بہت مختلف تھی ۔ ہیت کلف کی طرح میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں چند لمحوں میں اُسے وہ محبت دے سکتا تھا ، جو اسّی سال میں وہ نہ دے سکتا تھا ۔ اتنا بڑا دعویٰ تو میرے لئے مناسب نہ تھا ، خصوصیت سے جب مجھے بھی اس کا احساس تھا کہ وہ بھی اُس سے محبت کرتا ہے ، اپنے انداز میں — ہمارے مزاجوں میں بڑا فرق تھا ۔ وہ نرم ، بردبار ، صالح طبیعت کا مالک تھا ، اور میں بلا کی تیزی اور شدید طوفانی طبیعت کا ! اُس کی محبت نرم، شفقت بھری تھی ، اور میری ...... جانے میری محبت کیسی تھی ، گہری اور آتشیں! شاید میری اس محبت کا انجام ایک المیہ ہی ہو سکتا تھا ۔ ہم دونوں المیے کے لئے ہی بنے تھے '

ہماری کوٹھیاں ایک دوسرے سے متصل تھیں ، اور صحن کی ایک نیچی دیوار دونوں کوٹھیوں کے لئے مشترک تھی ۔ اور وہ کبھی کبھی میرے پاس چلی آتی تھی ۔ میری ستار کی درد بھری لے سے بے اختیار ہو کر کھنچی چلی آتی تھی !

اور اُس رات ، اُس رات ، اُسے شاید اپنی موت کا شدید احساس ہو گیا تھا ۔ اور شاید اُس نے اپنے لئے پہلے سے یہ موت تجویز کر رکھی تھی ۔

"تم نہیں ۔ شاید میں ہی جان دے دوں ......" اُس نے کہا تھا ۔ اور اُس رات وہ میرے پاس چلی آئی اور میرے ہاتھوں میں اُس نے جان دے دی ......

اُس کی موت کتنی حسین تھی! اُس کی پاکیزہ روح موسیقی کی لہروں کے دوش پر پرواز کر گئی !

یوسف شیرازی بہت دیر تک کھویا ہوا ، چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا ۔ اُس نے پھر 'ارن' میں خوشبو ڈالی ۔ کمرہ مہک اُٹھا اور خوشبودار دھوئیں نے ستار کو اور تصویر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ اُس نے ایک نظر تصویر پر ڈالی اور اُس کے قدموں میں سے ستار اُٹھا کر، بیٹھے بیٹھے ، آہستہ آہستہ چھیڑنے لگا ......

اچانک کمرے میں کسی کے قدموں کی آواز آئی ۔ شیرازی بھنا اُٹھا : "تم کیوں چلی آئیں میرے کمرے میں ؟ کتنی دفعہ کہا ہے تمہیں ، اس کمرے میں نہ آیا کرو ۔ لے جاؤ واپس ، جو کچھ لے آئی ہو، خیر اس میز پر رکھ دو ۔ دودھ لے آئی ہو ؟"

"ہاں ، میں تو ...... دودھ ...... لے ...... آئی "۔ سہمی ہوئی ایکو (Echo) نے وہی الفاظ دہرائے اور دودھ کا گلاس میز پر رکھ کر ٹرے لئے چپ چاپ ، دبے پاؤں لوٹ گئی ۔

"کہنے کو تو یہ بھی میری بنت عم ہے ، لیکن بس تفاوت کجا تا کجا !"

"جانے کیوں بھائی جان مجھ سے اتنی نفرت کرتے ہیں ۔ وہ کمرے میں میرا آنا تک گوارا نہیں کرتے ۔ میں نے کیا قصور کیا تھا آخر ۔ میں تو انہیں — اتنا چاہتی ہوں ، اُن کا اتنا خیال رکھتی ہوں ، اُن کی پرستش کرتی ہوں ....." آنچل منہ پر ڈالے ایکو چپ چاپ روتی رہی اور سسکیاں لیتی رہی ......

(ایکو کا دل ٹوٹ گیا ہے ، اُس کا وجود تمہاری محبت کی آگ میں جل رہا ہے ۔ تم کتنے بے رحم ہو نارسائسس ! تم اپنے آپ میں مگن ہو ۔ دوسروں کے دکھ کی تمہیں کوئی پروا نہیں ۔ تمہارے لئے کوئی جلے تو جلے ۔ سن رہے ہو ، نارسائسس ؟ ایکو کی یہ سسکیاں سن رہے ہو ؟ نارسائسس ، نارسائسس ، نارسائسس !

میں نارسائسس نہیں ہوں ، میں نارسائسس نہیں ہوں ، میں آرفیوس ہوں ، جس کی یوریڈیس ہمیشہ کے لئے اُس سے جدا ہو چکی ہے ۔ مجھے کسی سے کوئی بیر نہیں ، کوئی نفرت نہیں ۔ لیکن اب کسی اور عورت کے لئے میرے دل میں جگہ نہیں رہی ۔ یہ اتنی ساری عورتیں مجھے چاہنے کیوں لگتی ہیں ؟ جان کے پیچھے کیوں پڑ جاتی ہیں ؟ میں کسی سے کوئی سروکار رکھنا نہیں چاہتا ۔ میں تنہائی چاہتا ہوں ! اُف ! میں تنہائی چاہتا ہوں ! تنہائی سے میرا ایک حسین راز وابستہ ہے ۔ تنہائی میں میری روح کو سکون ملتا ہے ۔ تنہائی میں میری اپنی ایک دنیا ہوتی ہے ، جس میں ، میں کھو جاتا ہوں ۔

لیکن میں نارسائسس نہیں ہوں ۔ میں اپنے ہی عکس ، اپنے ہی وجود میں کھو نہیں گیا ہوں ۔ اگر نارسائسس خود پسندی اور انانیت کا اسم ہے تو میں ہرگز ہرگز نارسائسس نہیں ہوں ۔

لیکن نارسائسس خود پسندی کا اسم نہیں ہے ۔ اگر نارسائسس اپنے عکس میں آپ کھو گیا تھا تو یہ اُس کی خود پسندی نہیں تھی ۔ اُس کے بارے میں تو ایک سبل (Sybil) نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ وہ جب تک اپنے آپ کو نہیں جانے گا ، اچھی طرح جئے گا ۔ لیکن جب وہ اپنے آپ کو جان لے گا ، یا اپنے آپ کو پانے کی کوشش کرے گا ، تو فنا ہو جائے

۳ ۔ نارسائسس کی Myth کے بھی حقیقی گہرے معنی ہیں ۔ اُس نے اپنے آپ کو پانے کی کوشش کی تھی ، ان گہرائیوں میں زندگی کے معانی ڈھونڈتے تھے ۔ وہ ان گہرائیوں میں دیکھتا رہا ، دیکھتا رہا ، لیکن اُسے وہاں زندگی کی ، وجود کی ، ایک غیر مرئی ، ناقابل گرفت شبیہہ نظر آئی ۔

The Tormenting, mild image, the image of the Ungraspable phantom of life* .... .

اور جب اُس نے اُسے پانے کی ، اُسے گرفت میں لینے کی کوشش کی تو اُنھی گہرائیوں میں ڈوب کر فنا ہوگیا ! ......

تم بھی ان گہرائیوں میں ڈوب کر فنا کیوں نہیں ہو جاتے ، نارسائسس ، نارسائسس ، نارسائسس !)

ایکو کی سسکیاں اب بھی سنائی دے رہی ہیں ۔ لیکن ایکو تو محض ایک صدائے بازگشت تھی نارسائسس اُس میں کیا پاسکتا تھا ؟ نارسائسس اُس پر توجہ کیسے دے سکتا تھا ؟

'' یہ لڑکی بھی میری بنت عم ہے ۔ یتیم لڑکی ہے ، اُسی نے اسے پال رکھا ہے ۔ وہ چاہتی ہیں ، میں اس سے شادی کر لوں ۔ یہ لڑکی بھی مجھے چاہتی ہے ، میرا ہر طرح خیال رکھتی ہے ۔ میں بھی اس کا خیال ضرور رکھتا ہوں ، لیکن میں اسے بہن سمجھتا ہوں ۔ شادی؟ نہیں ، کبھی نہیں ۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے ، کوئی اور عورت اس پہلو میں نہیں ہوگی ۔ کسی اور کے لئے میرے دل میں بالکل جگہ نہیں رہی ۔ میری بقیہ ساری زندگی صرف اُسی کے لئے وقف ہے ۔ اُس کی پاکیزہ روح کے لئے !

میں اس لڑکی کو اپنے کمرے میں آنے نہیں دیتا ، کیونکہ مجھے اس کا شدید احساس ہوتا ہے کہ اگر یہ آئے گی ، تو پھر اُس کی پاکیزہ روح میرے پاس نہیں آئے گی !

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

میں چاہتا ہوں ، یہاں دوسرا کوئی نہ ہو ، دوسرا کوئی نہ ہو ......''

ارے نہیں ، تم ان دوسروں میں شامل نہیں ہو ۔ وہ تم سے نہیں کترائے گی ، کیونکہ تمہیں بھی موسیقی سے محبت ہے اور اُس کے محبوب ساز ستار سے والہانہ اُنس ۔ ہماری دوستی کا بھی تو یہی راز ہے ، میرے دوست ۔

اُس کی روح تمہاری موجودگی سے نہیں جھجھکے گی ، بلکہ کون جانے شاید تم ایک مجاز کو حقیقی روپ میں بھی دیکھ سکو ، کیونکہ تمہارا تو یہ دعویٰ ہے کہ تم نے ایک حقیقت منتظر کو لباس مجاز میں دیکھا ہے اور تمہاری جبین نیاز میں ہزاروں سجدے تڑپ گئے ہیں .....

ہم مسلمان ہیں ، ہمارا دیوی دیوتاؤں پر ایمان نہیں ، پھر تعجب ہوتا ہے تم نے یہ وژن کیسے دیکھ لیا ، ہندو اور یونانی دیومالاؤں میں موسیقی کے دیوی ، دیوتا کا وجود ہے ۔ اگر ہندو Legends یہ ثابت کرتے ہیں کہ موسیقی کی دیوی کبھی کبھی مسحور ہو کر موسیقار کے سامنے چلی آتی ہے اور تم نے بھی یہ وژن دیکھا ہے تو شاید اس لئے کہ تمہارے سامنے بار بار یہ Legends دہرائے گئے ہیں ۔ چونکہ تم نے موسیقی بھی ہندو پنڈتوں سے سیکھی ہے ، جنوبی ہند کے ہندو موسیقاروں سے ۔ اور تم کہتے ہو ، جنوبی ہند کی موسیقی ، اور ویسے بھی ہندو موسیقی یہاں کی سب سے قدیم ، روایاتی اور بنیادی موسیقی ہے ، یہ الگ بات ہے کہ بعد میں مسلمانوں نے بھی اس میں اضافے کئے ہیں ۔

* Herman Melville "Moby dick"

بہر حال ہندو موسیقی سے نہ ہندو Legend وابستہ ہے ۔ اور شدید ذہنی کیفیت کے زیر اثر شاید تم نے یہ وژن دیکھا ہو ۔ شاید وہ موسیقی کی دیوی نہ تھی بلکہ موسیقی خود ایک واضح ، خوبصورت ، نسوانی شبیہ اختیار کر گئی تھی ۔ ہو سکتا ہے ۔

میں اس طرح کے نفسی تجربے اور وژن کا قائل ہوں ۔ وجود دو طرح کے ہوتے ہیں ۔ ایک جسمانی ، دوسرا Astral ۔ یہ Astral وجود ہر کسی کو نظر نہیں آتا ۔ ایک Astral روحانی وجود صرف وہی دیکھ سکتا ہے ، جس کا مزاج نفسی ہو ۔ بہت ممکن ہے ، ہم دونوں کے مزاج نفسی ہوں ......

بہر حال ان دو وجودوں کا راز آسانی سے سمجھ میں آنے والا نہیں ۔

جسم محدود ، روح لا محدود
پھر یہ ایک ربط باہمی کیا ہے ؟

اس کی موت کے بعد بھی ، میں اُس کے وجود کو اتنی شدت سے محسوس کرتا ہوں ۔ مجھے اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ اُس کی روح میرے پاس ہوتی ہے ۔

اور یہی میری اپنی ایک الگ ذہنی دنیا ہے ۔ میرے دوست ، جو میرے لئے حقیقی مادی دنیا سے کہیں زیادہ حقیقی ہے ۔

اور یہی میری تنہائی کا حسین راز ہے ۔

یہ گہری رات ، یہ ستار ، یہ موسیقی ، میری محبت کا المیہ اور اُس کی روح کا ساتھ !

یہ عام دنیوی زندگی میرے لئے بہت کٹھن معلوم ہوتی ہے ۔ ایک بے انتہا حساس فطرت کے لئے ، جو انسانوں سے الگ دیکھنے ، سوچنے اور محسوس کرنے کی عادی ہو ، یہ عام ، معمولی ، ٹھوس ، مادی زندگی بڑی کٹھن معلوم ہوتی ہے !

میں سوچتا ہوں میرے بھی دو وجود ہیں ۔ ایک وہ ظاہری وجود جسے تم نے کاروبار کرتے ، ہزاروں روپے کماتے ، عیش میں جیتے دیکھا ہے ۔ جانے ابا نے کیوں مجھے یہاں کاروبار کے لئے اپنا نمائندہ بنا رکھا ہے ۔ وہ خود تو طہران میں رہتے ہیں ۔ ایران کے شاہی دربار میں ان کا بار ہے ۔ شاہی محل اور ملکۂ ثریا کے ملبوسات کی تزئین و آرائش کی حسین ذمہ داریاں اُن پر عائد ہوتی ہیں ۔ اور مجھے یہاں چھوڑ رکھا ہے ۔ اس خشک کراچی میں ، جہاں کاروبار کرنا پڑتا ہے ۔ بھلا کہاں کاروبار اور کہاں موسیقی ؟

شاید میں نے ہی اپنے آپ کو جلا وطن کر رکھا ہے ۔ ایران میں ، میں اُس کے بغیر جی نہیں سکتا ۔ ایران ، میرا محبوب وطن ، جس کے چپے چپے سے اُس کا تصور ، اُس کی یادیں وابستہ ہیں ۔ یہاں آ کر میں نے اپنے آپ کو سزا دی ہے ۔ اور اپنی بے گنہی کا کفارہ ادا کر رہا ہوں !

تم نے شیرازی کے اس وجود کو کبھی کبھی بیچ لکژری ، مٹروپول ، یا لے گورمے میں کسی میز پر بیٹھے شیری یا کبھی سکاچ پیتے دیکھا ہوگا ۔ وہاں بھی میں کھویا ہوا رہتا ہوں ۔ کیبرے اور رقص سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ۔ رقص کرتے ہوئے جوڑے میرے پاس سے گذر جاتے ہیں ۔ اور میں ہوں کہ بے خبر ، اپنے آپ میں کھویا بیٹھا رہتا ہوں ۔ کبھی کبھی والز کی کوئی اچھی دھن چھڑ جائے تو کوئی یاد پھر تیر نیم کش کی خلش بن جاتی ہے ، کیونکہ وہ میرے ساتھ والز کیا کرتی تھی ۔ بہت سے مغربی ناچوں کو وہ چھچھورا سمجھتی تھی ۔ والز ہی اُس کا پسندیدہ رقص تھا ۔ چند لمحوں کے لئے میں یہ محسوس کرنے لگتا ہوں گویا میں ڈانس فلور پر ہوں ، وہ میری ہم رقص ہے ، میں اس کے ساتھ والز کر رہا ہوں...... اور پھر میں اس بیداری کے خواب سے چونک اٹھتا ہوں ۔ اور ایک جھوٹی ، مصنوعی ، کھوکھلی ،

لیکن جگمگاتی دنیا سے اٹھ کر ، اپنی پر سکون دنیا میں واپس آجاتا ہوں ......

اور پھر وہی رات ، وہی تنہائی ، وہی ستار کی چھیڑ اور اس کی روح کا ساتھ !

یہ ستار اس کا اسم ہے ۔ یہ میرے درد کی تنہا درماں ہے ، یہ اب میری جیون ساتھی ہے ۔ اسے میں ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہوں ۔ یہ ستار اس کی تصویر کے قدموں میں رہتی ہے ۔ میں اس کے نیچے عود اور لوبان اور خوشبوئیں جلاتا ہوں ۔ اور اس عنبر و لوبان کی مہک میں بسی ہوئی ستار کو پہلو میں رکھے ، جانے کب تک ، دیوانگی کے عالم میں چھیڑتا رہتا ہوں ۔ رات گہری ہوتی جاتی ہے ، میں سو جاتا ہوں ، لیکن سوتے میں بھی میری انگلیاں ان تاروں کو چھیڑتی رہتی ہیں ۔ اور اس وقت مجھے یوں محسوس ہوتا ہے ، وہ میرے پاس ہے ۔ میں اپنے شانے پر اس کے ننھے سے سر کا بوجھ محسوس کرتا ہوں ، اس کی ملائم ریشمی زلفیں میرے شانے پر بکھری معلوم ہوتی ہیں ۔ ان کی مہک سے مجھ پر مدھوشی سی چھانے لگتی ہے ....

کون کہتا ہے وہ مر چکی ہے ۔ وہ امر ہے ۔ موسیقی نے اسے لافانی بنا دیا ہے ۔ اس ستار میں اس کی روح ہے ۔ اور جب کبھی میں اس ستار کو اس طرح چھیڑتا ہوں کہ میری روح ان تاروں میں تحلیل ہو جاتی ہے تو اس کی روح میرے پاس چلی آتی ہے ۔

The all of thine that cannot die
Through dark and dread Eternity
Returns again, to me* !

میری ستار امر ہوگئی ، میری بھینٹ قبول کر لی گئی ۔ اور اس کے صلے میں آج دیوی خود میرے پاس چلی آئی ہے ۔ سنگیت کی ، کلا کی ، روپ کی دیوی !

یہ وہی روپ ہے ، یہ وہی روپ ہے ۔

اور یہ وہی ہیں ، یہ نیل کمل ، یہ نیل کمل ،

یہ نیل کمل ۔

کون کہتا ہے وہ مر چکی ہے ۔ وہ امر ہے ، لافانی ہے ۔

اس ستار میں اس کی روح ہے ! یہ ستار اس کی اسم ہے ۔ اور جب کبھی میں اس ستار کو اس طرح چھیڑتا ہوں کہ میری روح ان تاروں میں تحلیل ہو جاتی ہے تو اس کی روح میرے پاس چلی آتی ہے ۔ اور ہماری روحیں موسیقی کی لہروں پر مل کر ایک ہو جاتی ہیں !

آرفیوس اور یوریڈیس کی روحیں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بلرین وادی میں آزاد گھوما کرتی ہیں ۔ آزاد اور مسرور !

پہاڑوں سے اب بھی آرفیوس کی آواز کی بازگشت آتی ہے ۔

یوریڈیس ، یوریڈیس ، یوریڈیس !

اور جس ندی میں آرفیوس کا سر بہایا گیا ، اس ندی سے اب بھی وہی لے نکلتی ہے ، آرفیوس کی بربط کی لے !

مگدھ اور بدیسہ کی بڑی سڑک کے اس پار ایک چھوٹی سی کٹیا کے سامنے بانس کے درختوں کے جھنڈ میں ، پورنیا کی چاندنی میں ، ایک پتھر کا مجسمہ نظر آتا ہے ۔ اور جب ہوا چلتی ہے ، تو اس مجسمے کے گرد کے بانسوں سے ایسی آواز نکلتی ہے ، جیسے بانسری پر کوئی میگھ ملہار بجا رہا ہے !—

---

* بائرن Byron

کپتان کا گڈا

ناولٹ

ڈی ۔ ایچ ۔ لارنس

ترجمہ : سیدہ سیم ہمدانی

نظرِ ثانی : محمد حسن عسکری



گڑیا

عمل : حنیف رامے

(۱)

" ہنیل ! "
" ہا ...... آں " ۔
" تم کہاں ہو ؟ "
" ادھر " ۔
" کیا کر رہی ہو ؟ "

ہنیل اپنا کام کرتی رہی اور سر تک نہ اٹھایا ۔ وہ لیمپ کے پاس ایک نیچی سی کرسی پر ایک گڈا یا پتلا سا لئے بیٹھی تھی اور اسے کپڑے پہنا رہی تھی ۔ پاس ہی ایک ٹوکری میں رنگ برنگے ریشمی ٹکڑے پڑے ہوئے تھے ۔ اس وقت وہ پتلے کے گھٹنے کو کچھ ٹھیک کر رہی تھی اور اس وجہ سے وہ بے چارہ منہ کے بل بازو پھیلائے معلق سا تھا ۔ اس حالت میں گڈا کچھ بے ڈھنگا سا لگ رہا تھا ، کیونکہ اس کی شکل سکاٹ لینڈ کے سپاہی کی سی تھی ۔ جس نے گرم کپڑے کی چست پتلون پہن رکھی تھی ۔

دروازے پر دستک ہوئی اور اسی نسوانی آواز نے پھر پکارا :
" ہنیل ؟ "
" ہا ...... آں ! "
" کیا تم یہاں ہو ؟ اکیلی ہو نا ؟ " اسی آواز نے جرمن میں پوچھا ۔
" ہاں .. ... اندر آجاؤ " ۔

ہنیل کا لہجہ کچھ زیادہ ہمت افزا نہ تھا ۔ دروازہ کھلنے پر اس نے اپنے گڈے کو کھڑا کر کے اس کا کوٹ سیدھا کر دیا ۔ دروازے سے ایک سیہ چشم نوجوان عورت نے بڑی شرارت آمیز جھجک کے ساتھ اندر جھانکا ۔ اس نے باہر جانے کے عمدہ کپڑے پہن رکھے تھے ۔ کندھوں پر ایک دبیز شال اور سر پر کالی چھوٹی ٹوپی جسے اس نے کانوں تک کھینچ رکھا تھا ۔

" ارے واقعی بالکل ہی اکیلی بیٹھی ہو ! " آنے والی عورت نے بڑی حیرت سے کہا ۔ " تو پھر ــ وہ کہاں ہے ؟ "

ہنیل نے جواب دیا " مجھے معلوم نہیں "۔

" اور تم یہاں اکیلی بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو ؟ سچ مچ ! یہ تو میرے خیال میں واقعی بڑی ہمت کا کام ہے ! کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا ؟ " مچکا ٹہلتی ہوئی اپنی سہیلی کے پاس آ کھڑی ہوئی ۔

" بھلا میں کیوں ڈروں ؟ " ہنیل نے قدرے تیزی اور رکھائی سے کہا ۔

" اچھا خیر ! یہ تم کیا کر رہی ہو ؟ ایک اور پتلا بنا ڈالا ؟ ارے ، یہ تو بڑا اچھا ہے ! ہا ۔ ہا ۔ ہا ! وہ ! یہ تو وہی ہے ! نہیں ۔ نہیں ۔ وہ تو بہت خوبصورت ہے ! ہاں وہ بے حد خوبصورت ہے ، ہنیل ۔ عین مین وہی ہے ــ بالکل اسی طرح کا ۔ صرف پتلون کا فرق ہے " ۔

" وہ ایسی پتلون بھی پہنا کرتا ہے "۔ ہنیل نے گڈے کو اپنے گھٹنوں پر کھڑا کرتے ہوئے کہا ۔ یہ نازک اور نفیس گڈا جس کے شانوں میں ہلکا سا خم تھا اور جس نے چست پتلون پہن رکھی تھی ، ہو بہو کسی سکاٹ رجمنٹ کا افسر معلوم ہوتا تھا ۔ اس کا چہرہ بڑی خوبصورتی سے بنایا گیا تھا اور یہ ایک نہایت حسین شبیہہ تھی ــ سانولی رنگت ، چھوٹی چھوٹی ترشی ہوئی سیاہ مونچھیں ، بڑی بڑی کھلی ہوئی کالی آنکھیں اور وہی کم آمیزی اور ہچکچاہٹ

کا سا انداز جو ایک افسر اور شریف النسب آدمی کی خصوصیت ہوتا ہے ۔

مچکا ذرا آگے جھک کے گڈے کا جائزہ لینے لگی ۔ وہ بڑی حسین عورت تھی ، گرم گرم سنہری جلد ، سماھی مائل کھٹی آنکھیں ، صاف اور سیاہ بھنویں ۔

" نہیں " وہ اپنے آپ ہی بڑبڑائی ، جیسے مرعوب ہو کر رہ گئی ہو ۔ یہ وہی ہے ۔ یہ وہی ہے ۔ بس پتلون اس جیسی نہیں ۔ مگر پتلون ہے بڑی خوبصورت ۔ کیا اس کی ٹانگیں واقعی اتنی سیدھی اور خوبصورت ہیں ؟ "

هنیل نے کوئی جواب نہ دیا ۔

" ہو بہو وہی ۔ اسی کی طرح مکمل ۔ ویسا ہی حسین ۔ وہ ایسا ہی ہے ۔ ہو بہو ایسا ہی ۔ کیا اس نے یہ گڈا دیکھا ہے ؟ "

هنیل بولی " نہیں " ۔

" نہ جانے وہ کیا کہے ؟ " وہ چونک اٹھی ۔ اس کے حساس کانوں نے پتھریلی سیڑھیوں پر کسی کی آواز سنی تھی ۔ اس کے چہرے پر خوف طاری ہو گیا ۔ وہ دروازے کی سمت دوڑی اور باہر نکل کے پیچھے سے کواڑ بھی بند کرتی گئی ۔

" کون ہے ؟ " سیڑھیوں میں اس کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی ۔

کسی نے جرمن زبان میں اس کا جواب دیا ۔ مچکا نے جلدی سے پھر دروازہ کھولا اور هنیل کے پاس آ گئی ۔ " یہ تو مارٹن ہے " اس نے بتایا ۔ وہ انتظار میں کھڑی رہی ۔ دهلیز میں ایک چاق چوبند فوجی نمودار ہوا ۔

" ارے ! ہاؤنٹس هیل " اس نے دور دهلیز میں کھڑے اپنے مخصوص سے مختصر اور تیز انداز میں کہا : " کیا میں اندر آ سکتا ہوں ؟ "

" ہاں ، ہاں آئیے ۔" هنیل بولی ۔

وہ آدمی بڑی تیزی سے فوجیوں کی طرح چلتا اندر داخل ہوا اور جھک کے گڈا سینے والی عورت کا ہاتھ چوم لیا ۔ پھر زیادہ بے تکلفی کے ساتھ اس نے مچکا کے ہاتھ پر بوسہ دیا ۔

اس دوران میں مچکا کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑا رہی تھی ۔ یہ ایک بہت بڑا بالا خانہ تھا ، جس کی ڈھلوان دو خوبصورت زاویوں کی شکل میں دیواروں سے جا ملتی تھی ۔ لیمپ کے اوپر والا فانوس ہرے رنگ کا تھا ، جس کی مدھم روشنی بڑی سی سفید گنبد نما چھت اور دیواروں کے اطراف رکھی ہوئی مختلف چیزوں پر پڑ رہی تھی اور جہاں هنیل اپنے ریشمی ٹکڑوں کی ٹوکری لئے ریشمی سرخ لباس پہنے بیٹھی تھی وہاں بھی اس روشنی سے ایک رنگیں دائرہ بن گیا تھا ۔

هنیل گوری چٹی حسین عورت تھی ۔ اس کے بال گھرے بھورے رنگ کے تھے ، چہرہ بڑا روشن معلوم ہوتا تھا ، اور جونہی اس نے فوجی کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر زندگی کی ایک چمک سی پھیل گئی ۔ یہ شخص بھی بڑا حسین تھا ، ڈاڑھی مونچھ صاف ، گہری نیلی آنکھیں مگر ذرا پھٹی پھٹی ۔ اس کے جنگجو مزاج کے آثار چہرے سے ہویدا تھے ۔

مچکا کمرے کے ارد گرد گھومتی ہر چیز کا جائزہ لیتی ہوئی کہے جا رہی تھی : " بہت خوب ! کس قدر خوبصورت ! ذوق کا جواب نہیں ! مرد ہو کر اتنا اچھا ذوق ! نہیں ، ایسے آدمیوں کو تو عورت کی ضرورت ہی نہیں ۔ قطعاً نہیں ۔ دیکھو تو ، مارٹن ، کپتان هیپ برن نے یہ کمرہ خود ہی سجایا ہے ۔ یہ دیکھو اس کی تصویر ۔ دیکھ رہے ہو نا ؟ کتنا سیدھا سادا لیکن کس قدر شاندار ۔ اسے کسی عورت کی ضرورت نہیں " ۔

یہ کمرہ واقعی بڑا خوبصورت تھا ــ وسیع و عریض ، زرد زرد اور دھیمی سی روشنی

والا ۔ اس کو گرم رکھنے کے لئے گہرے نیلے رنگ کے چمک دار پتھر سے بنا ہؤا بڑا آتشدان تھا ۔ فرنیچر اس میں بہت کم تھا ، بس چند ایک بڑی بڑی دیہاتی وضع کی الماریاں اور پالش کی ہوئی لکڑی کی میزیں رکھی تھیں ۔ ایک زبردست لکھنے کی میز تھی ، جس پر لکھائی کے سامان کے علاوہ سائنس کے آلات پڑے تھے اور اس پر ایک پودا بھی دھرا تھا ، جس میں بڑے عمدہ سرخ پھول لگے ہوئے تھے ۔ لیکن بہر طور یہ ایک مرد کا کمرہ تھا ۔ چنانچہ ایک چھوٹے سے ڈبے میں تمباکو اور پائپ رکھے تھے ۔ دور ایک جانب کھونٹیوں پر بڑے بڑے فوجی اوور کوٹ اور ٹوپیاں لٹک رہی تھیں اور ایک چھجے پر دو بندوقیں رکھی تھیں ۔ اس کے علاوہ دو دور بینیں بھی تھیں ، جن میں سے ایک کھڑکی کے نزدیک تپائی کے اوپر دھری تھی ۔ بہت میز کے اوپر مختلف قسم کے فلکیات کے آلے رکھے ہوئے تھے ۔

" اور وہ ستاروں کا مطالعہ بھی کرتا ہے ۔ ذرا سوچو تو ـــ وہ علم فلکیات کا ماہر ہے اور ستاروں کا مطالعہ کرتا ہے ۔ کتنے عجیب ہیں یہ انگریز لوگ ! "

ھنیل بولی : " وہ تو سکاٹ لینڈ کا ہے " ۔

مچکا نے کہا : " ہاں ، سکاٹ لینڈ کا ـــ مگر جب میں اس کے پاس ہوتی ہوں تو مجھے ڈر لگنے لگتا ہے ۔ وہ بڑا ہی پر اسرار آدمی ہے ۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ میں اس کے ساتھ کیا باتیں کروں ۔ ھنیل ، کیا تمہیں بھی اس سے ڈر معلوم ہوتا ہے ؟ اُف ، وہ تو بالکل ایک بند گلی کی طرح ہے ! "

" مجھے ڈر کیوں معلوم ہو ؟ "

" ارے تم بھی عجیب آدمی ہو! شاید تم جانتی ہی نہیں کہ ڈر کس وقت لگنا چاہیے ۔ بھئی فرض کرو اگر وہ اس وقت یہاں آ کر ہمیں اپنے کمرے میں دیکھ لے ؟ نہیں ، نہیں ، آؤ ، چلیں ۔ مارٹن ، آؤ ہم چل دیں ۔ آ جاؤ ۔ میں نہیں چاہتی کہ کپتان ھیپ برن آ کر دیکھ لے کہ میں اس کے کمرے میں آئی ہوں ۔ بھئی ، نہیں ! " مچکا بڑے زور سے مارٹن کو دروازے کی طرف دھکیل رہی تھی اور مارٹن کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں ایک عجیب اور مجنونانہ سا قہقہہ جھلک رہا تھا ۔ " نہیں ، نہیں ، میں نہیں چاہتی ، مجھے یہ پسند نہیں " ۔ اب مچکا اپنی انگریزی آزمانے لگی تھی ۔ چند جملے اس نے اچھی طرح کہہ ڈالے : " نہیں ، نہیں ، کپتان صاحب میں نہیں چاہتی کہ آپ آ جائیں ۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ آ جائیں اور میں یہاں ہوں ۔ نہیں ۔ بالکل نہیں ۔ میں جاتی ہوں ، ھنیل ، میں جا رہی ہوں ۔ اچھی ھنیل میں جا رہی ہوں اور تم تو یقیناً یہاں ٹھہر کے اس کا انتظار کرو گی ؟ لیکن وہ کب آئے گا ؟ تم نہیں جانتیں ؟ نہیں بھئی ، مجھے یہ پسند نہیں ۔ بالکل پسند نہیں ۔ میں مرد کے کمرے میں اس کا انتظار نہیں کرتی ۔ نہیں ، نہیں ، کبھی نہیں ـــ (پھر فرانسیسی میں بولی) کبھی نہیں ، کبھی نہیں ، سمجھیں ۔ اُف ، بے چاری ھنیل ! اس کے تو انگلستان میں بیوی بچے بھی موجود ہیں ؟ نہیں ، نہیں ، میں اس کا انتظار نہیں کروں گی " ۔

اس نے بڑے زور سے مارٹن کو دروازے میں سے باہر دھکیلا اور اپنی شال کو کندھوں پر سنوارتے ہوئے بڑے ٹھسے سے باہر نکلنے کو تیار ہوئی ۔ باہر جانے سے پہلے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے حیرت کے ساتھ ھنیل کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلاتی ہوئی نکل گئی ۔ کاؤنٹس ھنیل نے پھر سے گڈا اٹھا لیا اور اس کا جوتا سینا شروع کر دیا ۔ اب اس کی روزی کا واحد ذریعہ بس یہ پتلیاں بنانا ہی تو رہ گیا تھا ۔

لیکن وہ بے چین سی تھی ۔ اس نے اپنی بانہیں گود میں سمیٹ لیں جیسے ان کو جھکاتے جھکاتے تھک گئی ہو ۔ پھر اس نے لکھنے کی میز پر رکھی ہوئی گھڑی کو دیکھا ۔ اب تو رات

کے کھانے کا وقت گزرے بھی دیر ہو چکی تھی —— نہ جانے وہ اب تک آیا کیوں نہیں ؟ اُس نے بڑی بیزاری کے سے انداز میں ایک آہ بھری - وہ اپنا گُڈا بناتے بناتے اُکتا چکی تھی -

کپڑوں کی ٹوکری کو ایک طرف رکھ کر وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی ، باہر ستارے سفید اور بہت ہی نزدیک معلوم ہو رہے تھے- نیچے کی طرف مکانوں کی اندھیری سی چھتوں کی قطاریں تھیں اور ان چھتوں کی تاریکی کے نیچے سے روشنی کے بخارات سے اُمنڈتے لگ رہے تھے اور اُس سے بھی نیچے شہر کا ہلکا ہلکا شور و غل سنائی دے جاتا تھا - یہ کمرہ بہت ہی اُونچا ، اور دور کہیں آسمان کے قریب معلوم ہوتا تھا -

وہ میز کے قریب جا کے خطوں کے پلندے کو دیکھنے لگی ، پھر اُس کی نظر مہر لگانے والی بتی اور ٹکٹوں والے ڈبے پر پڑی - اُس نے باری باری ان چیزوں کو چھوا اور تھوڑا تھوڑا سرکا دیا - یہ کام محض تبدیلی کی غرض سے کیا گیا تھا ورنہ در اصل وہ یہ بھی ڈھنگ سے نہ دیکھ رہی تھی کہ میرا ہاتھ کس چیز پر پڑا ہے - پھر اُس نے ایک پنسل اُٹھا لی اور بڑا بنا سنوار کے اپنا نام لکھنے لگی —— جوھنازو راسینڈلو —— تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ اپنا ہی نام لکھتی چلی گئی —— اور پھر ایک بار جلے کٹے اور کسی قدر استعجاب کے سے انداز میں بڑی عجیب طرح اپنی ناک سکیڑتے ہوئے لکھنے لگی : الگزینڈر ہیپ برن -

لیکن آخر اس سے بھی وہ تنگ آ گئی اور پنسل پھینک دی - وہ یونہی چلتی چلاتی دور والی کھڑکی کے نزدیک رکھی ہوئی دوربین کے پاس جا پہنچی اور چند لمحے نال پر ہاتھ رکھے کھڑی رہی جو کپتان کے بار بار چھوتے رہنے کی وجہ سے مقابلتاً زیادہ چمکیلا ہو گیا تھا - پھر وہ بڑی گھبرائی ہوئی سی اپنی کرسی کی طرف چل دی - جب کپتان کے قدموں کی چاپ سیڑھیوں پر سنائی دی تو اُس نے اپنا گُڈا اُٹھا لیا اور منہ اُوپر کر کے اُسے کمرے میں آتے ہوئے دیکھنے لگی -

" آھا ، تم یہاں ہو ! " اُس نے دروازہ بند کرتے ہوئے آہستہ سے کہا - ھنیل نے جلدی سے کپتان کی طرف نظر ڈالی لیکن ذرا بھی نہ ھلی اور نہ کوئی جواب ہی دیا -

اُس نے بڑے سکون کے ساتھ جلدی جلدی سے اپنا اوور کوٹ اُتارا اور اُسے کھونٹی پر لٹکانے کے لئے چل دیا - قدموں کی آواز سن کر وہ پھر اُس کی طرف دیکھنے لگی - وہ بالکل گُڈے کی طرح تھا —— لمبا تڑنگا ، دبلا پتلا - شائستہ اور وردی میں ملبوس - وہ مڑا تو اُس کی سیاہ آنکھیں خوب کھلی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں ، اُس کے کالے بال کنپٹیوں پر سے سفید ہوتے جا رہے تھے —— یہ سفید بالوں کا پہلا حملہ تھا -

وہ اپنا گُڈا سینے میں مصروف تھی - کپتان نے کچھ کہے بغیر لکھنے والی میز کے پاس کی کرسی گھما کے اتنی نزدیک کر لی کہ اُس کے گھٹنے تقریباً ھنیل کو چھونے لگے - پھر وہ اپنی ایک ٹانگ دوسری پر رکھ کے بیٹھ گیا - اُس نے بڑی عمدہ گرم جرابیں پہن رکھی تھیں - اُس کے ٹخنے بڑے نازک اور شاندار معلوم ہو رہے تھے - بادامی جوتے اتنے فٹ تھے گویا یہ اُسی کے جسم کا ایک حصہ ہوں - وہ تھوڑی دیر تک بیٹھا اُسے سلائی کرتے ہوئے دیکھتا رہا - روشنی اُس کے نرم و نفیس بالوں پر پڑ رہی تھی - جن میں سنہرے تار اور سیاہ سائے جھلملا رہے تھے - ھنیل نے نظر اُٹھا کے بھی نہ دیکھا -

کپتان نے خاموشی سے اپنا چھوٹا سا گندمی اور ننگا ننگا ہاتھ گُڈا پکڑنے کے لئے بڑھا دیا ، اُس کی بانہہ پر سیاہ بال تھے -

اب اُس نے کپتان کی طرف دیکھا - اُس کا چہرہ کپتان کے مقابلے میں تعجب خیز حد تک تروتازہ اور روشن معلوم ہو رہا تھا -

" کیا تم اسے دیکھنا چاہتے ہو ؟ " ہنیل نے بڑی صاف انگریزی میں پوچھا ۔
" ہاں "۔

اُس نے تاگہ نوڑ کے گڈا کپتان کے ہاتھ میں دے دیا ۔ وہ ایک ٹانگ دوسری پر رکھے گڈا ہاتھ میں لئے بیٹھا رہا ۔ اُس کی سیاہ آنکھوں میں ایک ناقابل فہم سی مسکراہٹ تیر رہی تھی ۔ اُس کے بال بڑی نفاست سے ایک طرف جمے ہوئے تھے اور اُن کی رنگت بڑی کالی اور چمکیلی تھی ۔

بالآخر وہ اپنی سریلی اور مسرور آواز میں بولا : " آخر تم نے مجھے اپنا ہی لیا "۔
ہنیل نے پوچھا : " کیا ؟ "
" تم نے میری صورت بنا ہی لی " مجھے اپنا ہی لیا ۔
" مجھے اس کی کوئی پروا نہیں " وہ بولی ۔

" کیا —— تمہیں کوئی پروا نہیں ؟ " اُس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی ۔ اُس کے جواب دینے کا طریقہ بھی عجیب تھا ۔ جیسے بات کی طرف اُس کا پورا دھیان نہیں بلکہ وہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچ رہا ہے ۔

" آج تم بہت دیر سے آئے ہو نا ؟ " آخر اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی ڈالا ۔
" ہاں ، مجھے بڑی دیر ہو گئی "۔
" آخر کیوں ؟ "
" در اصل میں کرنل سے باتیں کر رہا تھا " ۔
" میرے بارے میں ؟ "
" ہاں ، تمہارے ہی بارے میں "۔

وہ بیٹھی اُس کے چہرے کی طرف تک رہی تھی، یہ سن کر اُس کی رنگت پیلی پڑ گئی ۔ لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ کپتان کے چہرے پر کسی بے چینی کی جھلک ہے یا نہیں ۔

" کیا کوئی بہت بری بات ہوئی ؟ " ہنیل نے پوچھا ۔

" ہاں ، بات کافی بری ہی تھی ، لیکن تمہارے متعلق نہیں ۔ البتہ میری حالت واقعی عجیب سی ہو رہی تھی " ۔

وہ اُسے دیکھتی رہی لیکن وہ آگے کچھ بھی نہ بولا ۔
" کیا بات تھی ؟ " اُس نے پوچھا ۔

" بھئی ، کوئی خاص تو نہیں —— ایسی بات کی مجھے توقع بھی تھی ۔ معلوم ہوتا ہے وہ لوگ تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں —— میرا مطلب ہے تمہارے اور میرے بارے میں ۔ خیر ویسے تم جانتی ہو غیر سرکاری طور پر کسی کو اس بات کی ذرا بھی پروا نہیں ۔ مشکل یہ ہے کہ اب وہ باضابطہ اس بات کی جانچ پڑتال شروع کرنے والے ہیں " ۔

" کیوں ؟ "

" بھئی ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری بیوی میجر جنرل کو خط لکھتی رہی ہے ۔ اس میجر جنرل کے اُن کے خاندان سے پرانے مراسم ہیں اور میری بیوی اُس کے سامنے ہی پلی بڑھی ہیں ۔ میرے خیال میں کچھ ایسی ویسی افواہیں میری بیوی تک بھی جا پہنچی ہیں ۔ در اصل مجھے معلوم ہے کہ اُنہوں نے یہ بات ضرور سن پائی ہے، کیونکہ میرے نام ایک خط میں بھی اُنہوں نے اس کا ذکر کیا تھا ۔

" پھر تم نے اُسے کیا جواب دیا ؟ "
" اُنہیں میں نے لکھ دیا کہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں —— تم بے فکر رہو " ۔

" لیکن کیا تمہارے خیال میں اس بات سے اُن کی تسلی ہو جائے گی ؟ " ہنیل نے دریافت کیا ۔

" میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔ اُنہیں فکر مند ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ " وہ بولا ۔

" خیر اُن کی پریشانی کی تو ضرور کوئی معقول وجہ ہوگی ۔ تم اُن سے ایک سال سے ملے بھی نہیں ہو اور اگر وہ تم سے دیوانہ وار محبت کرتی ہیں تو ——"۔

" نہیں میرا خیال نہیں کہ وہ مجھے دیوانہ وار چاہتی ہیں ۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ مجھے پسند کرتی ہیں " ۔

" تمہارا خیال ہے وہ تمہیں اتنی کم اہمیت دیتی ہیں ؟ "

" اگر مجھے کم اہمیت دیں ۔ البتہ میری طرف سے ذرا مطمئن رہنا چاہتی ہیں "۔

" لیکن کیا اب وہ مطمئن نہیں ہیں ؟ "

" نہیں —— واقعی ۔ یہی بات ہے ۔ خرابی تو بس اتنی ہی ہے ۔ کرنل کی رائے ہے کہ میں چھٹی لے کر گھر چلا جاؤں "۔

وہ اپنی عجیب چمکیلی ، سیاہ اور لاپروا سی نظروں کے ساتھ بیٹھا گدے کو گھورتا رہا ، جسے اُس نے ایک بازو سے سنبھال رکھا تھا ۔ اس گدے اور کپتان میں غیر معمولی مشابہت تھی ، یہاں تک کہ بالوں میں مانگ کا انداز اور سیاہ آنکھوں سے ٹکٹکی باندھ کے دیکھنے کا طریقہ بھی ہوبہو وہی تھا ۔

" کتنے عرصے کے لئے ؟ " ہنیل نے پوچھا ۔

" میں خود نہیں جانتا ۔ شاید ایک مہینے کے لئے "۔ پہلے اُس نے ذرا شک آمیز لہجے میں کہا پھر یقین کے ساتھ بولا :

" ایک مہینے کے لئے ہی جانا ہوگا ! " وہ اُس کی طرف دیکھتی رہی اور اُسے ایسا معلوم ہوُا جیسے وہ اُس کی نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہو ۔

" اور کیا تم جاؤ گے ؟ " ہنیل نے پوچھا ۔

" پتہ نہیں ۔ پتہ نہیں "۔ اُس کا سر یونہی جھکا رہا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے ۔ " پتہ نہیں ۔ کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا کروں " ۔

" کیا تم جانا چاہتے ہو ؟ " ہنیل نے پوچھا ۔

کپتان نے نگاہیں اُٹھائیں اور ہنیل کی طرف دیکھا ۔ جب کبھی وہ ہنیل کی طرف یوں اپنی سیاہ آنکھوں سے دیکھ لیتا تو ہنیل کا دل ہمیشہ پگھل کے رہ جاتا اور کپتان کی وہ عجیب و غریب چمکیلی اور لاابالی سی نظر انسانی نظر نہیں کوئی دوسری چیز معلوم ہوتی تھی ۔ وہ کبھی نہیں سمجھ سکی تھی کہ جب وہ اُس کی طرف دیکھتا ہے تو کیا دیکھ رہا ہوتا ہے ؟

" نہیں " اُس نے بڑی سادگی سے کہا : " میں جانا نہیں چاہتا ۔ مجھے انگلینڈ جانے کی ذرا بھی خواہش نہیں "۔

" کیوں خواہش نہیں ؟ " ہنیل نے پوچھا ۔

" کچھ معلوم نہیں "۔ پھر اُس نے ہنیل کی طرف دیکھا ، اُس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور ساتھ ہی اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سفید روشنی جھلملا اُٹھی ۔ وہ بولا : " اگر کسی کو اس کی وجہ معلوم ہو سکتی ہے تو میرے خیال میں وہ صرف تم ہی ہو "۔

ہنیل کے چہرے پر ایک مسرت آمیز خوف کی لہر دوڑ گئی ۔

" تمہارا مطلب ہے تم مجھے چھوڑنا نہیں چاہتے ؟ " ہنیل نے سانس روکتے ہوئے پوچھا ۔

" ہاں ، میرا مطلب کچھ یہی ہے "۔

" لیکن تمہیں پورا یقین نہیں ہے ؟ "

" ہاں ، ہاں ، مجھے پورا یقین ہے " ۔ وہ بولا اور وہی مخصوص مسکراہٹ اُس کے چہرے پر پھیل گئی اور اُس کی آنکھوں میں عجب سی روشنی جھلملا اٹھی ۔

" یہ یقین ہے کہ تم مجھے چھوڑنا نہیں چاہتے ؟ " اُس نے دوسری جانب دیکھتے اور ہکلاتے ہوئے کہا ۔

" ہاں ، مجھے پورا یقین ہے کہ میں تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتا "۔ کپتان نے دہرایا ۔ اُس کی سکاٹ لینڈ والوں کی سی آواز بڑی سریلی اور انوکھی تھی ، لیکن دراصل اُس کے چہرے کی ناقابل فہم مسکراہٹ دیکھ کر اُسے یقین بھی آتا تھا اور ڈر بھی لگتا تھا ۔ یہ مسکراہٹ بھی ایک پوری پہیلی تھی ــــ عجیب و غریب ، خنبہ اور کبھی نہ بدلنے والی ۔

وہ ڈر گئی اور اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا ۔ جب ہنیل نے اُس کی طرف دوبارہ دیکھا تو کپتان کا چہرہ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بت ہو ــــ چہرے گہری شکنیں ، سیاہ چمکتی ہوئی کھال ، ایک سمت میں گڑی ہوئی نظریں ــــ گویا وہ انسانی چہرہ نہ تھا بلکہ کسی چمکیلے پتھر کا وحشتناک مجسمہ ۔ اُس کے چکنے اور خوش وضع سر پہ سیاہ بال ذرا بھی بدلے ہوئے نہ لگ رہے تھے ۔

وہ پوچھنے لگی : " کیا تم بہت تھک گئے ہو ؟ "

" ہاں ، کچھ تھک سا گیا ہوں " ۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے ہنیل کی طرف اپنے بت جیسے چہرے اور سیاہ لاابالی آنکھوں سے دیکھا ۔ پھر اُس نے نظریں دوسری طرف کر لیں جیسے اُسے کوئی آواز سنائی دی ہو ۔ اس کے بعد وہ پیٹی پر ہاتھ رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا : " معاف کرنا میں ذرا اپنی پیٹی اتار کے کوٹ بدل ڈالوں " ۔

وہ اپنی چوڑی کنھٹی سی پیٹی کو کھولتا ہوا کمرے کی دوسری طرف چل دیا ۔ اُس وقت اُس نے بڑے چست اور اچھے سلے ہوئے خاکی کپڑے پہن رکھے تھے ۔ اُس نے پیٹی ٹانگ دی اور ہنیل کے پاس ایک پرانا ہلکا اور بند گلے کا کوٹ پہنے آ گیا ، جس کے بٹن اُس نے بند نہ کئے تھے ۔ ایک ہاتھ میں سلیپر تھے ۔ جب وہ بیٹھ کر اپنے بوٹ کے تسمے کھول رہا تھا تو ہنیل کو پھر محسوس ہوا کہ کپتان کی بانہہ کسی سیاہ اور بالوں سے بھری ہے، اور اُس کا گندمی ہاتھ کیسا ننگا ننگا لگتا ہے ۔ وہ نیچے جھکا تو اُس کے سر کے سیاہ ، چمکیلے اور نفیس بال بڑی خوبی سے اس طرح جمے ہوئے دکھائی دئے جیسے کوئی سخت سی لوہے کی ٹوپی پہن رکھی ہو ۔

اُس نے سلیپر پہن لئے اور اپنے جوتے دوسری طرف رکھ دئے ۔ پھر اطمینان سے ٹانگیں پھیلا کے اپنی کرسی پر آ بیٹھا ۔

" لو ، اب ذرا سکون ہوا ہے "۔ وہ ہنیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا : " اچھا ، اب یہ کہو کہ تم کیسی ہو ؟ "

"میں ؟" وہ کہنے لگی: " میرا کیا ہے! " اس وقت وہ بڑی تلخی محسوس کر رہی تھی ۔

" تمہارا کیا ہے ؟ " اُس نے لہجے کی تلخی کو محسوس نہ کرتے ہوئے ہنیل کا فقرہ دہرایا ۔ " ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ؟ بے شک ، تم تو میرے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہو ۔ کیوں ؟ کیا تم اہم نہیں ہو ؟ " وہ پھر اُسی عجیب و غریب انداز میں مسکرا دیا ــــ یہ دیکھ کر ہنیل کو لمحے بھر کے لئے بندروں کے وہ چینی مجسمے یاد آ گئے جو ہر وقت رنجیدہ سے لگتے ہیں ۔ کپتان نے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کے ایک انگلی بڑی نرمی سے اُس کے رخسار پر پھیری ۔ ہنیل سرخ پڑ گئی ۔

" پھر حال میں اتنی اہم نہیں جتنے کہ تم ۔ کیا خیال ہے تمہارا ؟ " اُس نے بڑی جرأت کر کے پوچھا ۔

" کیا تمہارا ؟ اتنی اہم جتنا میں ۔ ارے ، توبہ کرو ، میں تو ذرا بھی اہم نہیں ہوں ۔ قطعی اہم نہیں ہوں ! " ---- اُس کے الفاظ کچھ انوکھے اور کھوئے کھوئے سے تھے ۔ ھنیل چکرا گئی ، آخر اُس کا مطلب کیا تھا ؟ وہ چکرا گئی ۔

" تو پھر میں اس سے بھی کم اہم ہوں " ھنیل نے پھر ترش لہجے میں کہا ۔

" ارے ، نہیں ، ایسا نہیں ہے ۔ ایسا قطعی نہیں ہے ۔ تم تو بہت اہم ہو ۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری اہمیت بہت زیادہ ہے "۔

" اور تمہاری بیوی کی ؟" ۔ --- اُس کے سوال میں باغیانہ انداز تھا ۔ " تمہاری بیوی اہم نہیں کیا ؟"

" میری بیوی ؟ میری بیوی ؟ " اُس نے اپنی زبان سے یہ لفظ ایسی بے دلی سے ادا کیا جیسے وہ اُس کا مطلب ہی سمجھ نہ سکتا ہو ۔ " ہاں ، ہاں ، میرے خیال میں اپنی جگہ وہ کافی اہم ہیں "۔

" کون سی حد تک ؟" ھنیل قہقہہ لگاتے ہوئے بے اختیار بول اُٹھی ۔

" بھئی ، اپنی حد تک ۔ یعنی اپنے گھر ، اپنے مقام اور اپنے دونوں بچوں کی حد تک ۔ اُن کی زندگی کا دائرہ تو وہیں تک محدود ہے "۔

" اور تم ؟ ----تم اُس دائرے میں کہاں آتے ہو ؟"

" فی الحال تو میں اُس دائرے میں نہیں ہوں " وہ بولا ۔

ھنیل نے کہا : " لیکن یہ تو سارا جھگڑا ہے ۔ اگر تمہاری بیوی اور تمہارا گھر موجود ہے تو تمہارا یہ فرض ہے نا کہ تم اُسی کے ہو کے رہو ؟"

اُس نے جواب دیا : " ہاں، ہونا تو یہی چاہئے بشرطیکہ میں چاہوں"۔

" تو کیا تم ایسا کرنا چاہتے ہو ؟" ھنیل نے للکارا ۔

" نہیں ، میں نہیں چاہتا "۔

" تو پھر ؟" وہ بولی ۔

کپتان نے جواب دیا : " بس یہی تو اُلجھن ہے "----

" لیکن آخر تم کرو گے کیا ؟" اُس نے اصرار کرتے ہوئے کہا ۔

" بھئی ، میں نہیں جانتا ۔ ابھی میں کچھ نہیں جانتا ۔ میں نے ابھی کوئی رائے قائم نہیں کی کہ مجھے کیا کرنا ہے "۔

" تو بہتر یہی ہے کہ اب رائے قائم کرنا شروع کر دو " وہ بولی ۔

" ہاں ، میں خود سمجھتا ہوں ۔ مجھے معلوم ہے "۔

وہ اُٹھ کھڑا ہؤا اور بڑی بے چینی سے کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا ، لیکن اُس کی پیشانی پر اب بھی وہی پہلے کا سا خالی خالی اندھیرا چھایا ہؤا تھا ۔ اُس نے ہاتھ اپنی جیبوں میں ڈال رکھے تھے ۔ ھنیل بڑی بے بسی کے عالم میں بیٹھی تھی ۔ وہ اس آدمی سے محبت کرنے پر مجبور تھی ---- اُس کے ہاتھوں سے ، اُس کے عجیب و غریب اور سحر انگیز جسم سے اور اُس کی موجودگی کے پر اسرار احساس سے ۔ ھنیل کو اُس کے زمین پر پیر رکھنے کے انداز سے پیار تھا ، چلتے ہوئے جس انداز سے وہ اپنی ٹانگیں ہلاتا اُس سے محبت تھی ۔ اُس کی سانچے میں ڈھلی ہوئی کمر سے اُلفت تھی اور اُس کے سر کو ایک طرف ذرا سا جھکا دینے کے انداز سے لگاؤ تھا اور اس کے علاوہ وہ اُس کی پیشانی کے عجیب اور پر اسرار خلا اور

لاپروائی پر فریفتہ تھی ، لیکن اب اُس کی بے چینی سے وہ صرف ناخوش تھی ۔ اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکتا تھا ، لیکن اُس نے کپتان کو مجبور کر ہی دیا تھا ۔

اُس نے جیبوں سے اپنے ہاتھ نکال لئے اور اس طرح ھنیل کی طرف لوٹ آیا جیسے لوہے کا ٹکڑا مقناطیس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے ۔ وہ پھر ھنیل کے سامنے آ بیٹھا اور اُس کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے اپنے ہاتھ اُس کی جانب بڑھا دئے ۔

" مجھے اپنے ہاتھ دو " وہ بڑی نرمی سے بولا ۔ اُس کے لہجے میں ایسی لجاجت ، بے دماغی ، انوکھا پن اور ترغیب تھی کہ ھنیل کو انکار کی ہمت نہ ہوئی ۔ " مجھے اپنے ہاتھ دو تا کہ مجھے یہ محسوس ہوتا رہے کہ ہم اکٹھے ہیں ۔ الفاظ سے تو بہت کم مطلب نکلتا ہے بلکہ اُن کا تو کچھ مطلب ہی نہیں ہوتا اور پھر انسان کی ساری سوچ بچار تو رائگاں ہی جاتی ہے ۔ بس مجھے یہ احساس ہونے دو کہ ہم اکٹھے ہیں پھر مجھے اور کسی چیز کی کچھ پروا نہیں"۔

وہ اپنے دھیمے اور سریلے انداز میں بولتا چلا گیا ، اور ھنیل کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لئے ۔ وہ اب بھی بولنے کی کوشش کر رہی تھی ۔

" لیکن تمہیں پروا کرنی ہی پڑے گی ۔ تمہیں کوئی فیصلہ کرنا ہو گا ۔ یہ تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا "۔ وہ بضد تھی ۔

" ہاں ، یہ تو مجھے کرنا ہی ہو گا ۔ لیکن اس وقت جب کہ ہم اکٹھے ہیں میں اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا ۔ اُس وقت ہم اکٹھے ہیں ۔ آؤ ، ہم سب کچھ بھول جائیں "۔

لیکن جب ہم اسے بھلا نہ سکیں گے تو کیا ہو گا ؟"

" خیر ، مجھے کچھ معلوم نہیں ، لیکن ---- آج رات ---- مجھے یوں محسوس ہوتا ہے --- ایسا لگتا ہے کہ اسے بھول ہی جائیں تو بہتر ہو گا "۔

اُس کی آواز کی نرمی ، سریلے پن اور کھوئے کھوئے انداز سے وہ بے بس ہو گئی ۔ ھنیل کو یوں محسوس ہؤا جیسے اُس نے کبھی اُس کی باتوں کا جواب دیا ہی نہیں بلکہ الفاظ تو بس یونہی اُس کی زبان سے نکل پڑتے تھے ، کیونکہ بات کے جواب میں اُسے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا ۔ لیکن جیسے وہ خود کبھی نہیں بولتا تھا اس وقت بھی وہ ھنیل کے سامنے اپنی خالی خالی سی خاموشی لئے بیٹھا تھا ۔

ھنیل کو اپنے آپ سے بڑی کشمکش کرنی پڑ رہی تھی ۔ کپتان نے پھر انتہائی نرمی سے اپنا ہاتھ اُس کے رخسار پر رکھ دیا تھا ۔ اُس کا ھلکا سا لمس غیر معمولی حد تک ملائم تھا ، جیسے کبھی کبھی بلی کے بچے کا پنجہ معلوم ہؤا کرتا ہے ۔ جاندار ھوا کے گالے کی طرح ۔ اگر اس نا قابل محسوس قسم کے لمس میں انتہائی سحر انگیزی نہ ہوتی تو وہ دل کڑا کر کے ، بے رخی برتتے ہوئے یہ کہہ کر وہاں سے چلی جاتی کہ جب تم اتنے پست ہمت اور بے اعتبار قسم کے شخص ہو تو میں تم سے کوئی واسطہ رکھنا نہیں چاہتی ۔ وہ یہ سب باتیں کپتان سے کہہ دینا چاہتی تھی ، لیکن جب اُس نے بات شروع کی تو کپتان نے اپنے مخصوص لہجے میں جواب دینا شروع کیا ، جس سے ھنیل کو یوں محسوس ہؤا جیسے اُس کے ارد گرد کسی نے لطیف تاروں کا تانا بانا بن دیا ہو اور ایسے میں نہ تو وہ کچھ سوچ سکتی تھی نہ کوئی عمل کر سکتی تھی اور نہ کچھ واضح طور سے محسوس کر سکتی تھی ۔ اُس کی روح احتجاجاً کراہ اُٹھی ، لیکن اس کے باوجود جب کپتان نے نہایت نرمی سے اپنا ہاتھ اُس کی تھوڑی کے نیچے رکھ کے اُس کے چہرے کو بلند کر لیا اور اُسی کی طرف دیکھ کے اپنے دل فریب انداز میں مسکرا اُٹھا تو ھنیل نے اُس کے منہ چوم لینے میں ذرا بھی مزاحمت نہ کی ۔

وہ بولا : " آج رات تم کس سوچ میں ہو ؟ کس چیز کے بارے میں سوچ رہی ہو ؟"
ھنیل نے اپنی آنکھوں میں ذرا سختی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا :
"مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ آج تمہارے کرنل نے تم سے کیا کہا تھا ؟"
" ارے ، وہ ! تم اس کی پروا نہ کرو ۔ ان باتوں کی تو کچھ بھی اہمیت نہیں "۔
" لیکن آخر اہمیت ھے کس چیز کی ؟" ھنیل نے پھر اصرار کیا ۔ اُسے کپتان سے تقریباً نفرت سی ہو گئی تھی ۔

" اہمیت ھے کس چیز کی ؟ بھئی ، اس وقت اس کمرے کے علاوہ اور مجھے باہر کی کسی چیز کی اہمیت کا احساس نہیں ۔ مجھے دنیا کی کسی چیز سے اس وقت کوئی سروکار نہیں "۔
"ہاں ، صرف اس وقت نا !" ھنیل نے تلخی سے دھرایا ۔ " لیکن مستقبل بھی تو کوئی چیز ھے ۔ مجھے مستقبل کی بھی فکر ھے "۔

مستقبل ! مستقبل ! مستقبل تو ہر روز ختم ہوتا رہتا ھے ۔ میری نظر میں تو مستقبل سیاہ اُلجھے ہوئے دھاگے سے زیادہ نہیں ۔ ہر صبح تم اُس کا سرا ڈھونڈ کر دھاگا کھولنا شروع کر دیتی ہو ، یہی تمہارا دن ہوتا ھے ۔ اور شام کو تم اپنے کھولے ہوئے دھاگے کو توڑ کے پھینک دیتی ہو اور وہ اُلجھا ہوا ڈھیر اس طرح کم ہوتا رہتا ھے ۔ ایک تاگا کم ہوا تو سمجھو ایک دن گذر گیا ۔ بس میرے نزدیک تو یہی مستقبل کی وقعت ھے "۔

" پھر تو ، تمہارے نزدیک کسی چیز کی بھی کوئی وقعت نہیں ۔ میری بھی تمہارے نزدیک کوئی وقعت نہیں ۔ جیسا تم نے خود کہا بس ایک بے کار تاگے سے زیادہ نہیں "۔ وہ مدافعت پر اُتر آئی ۔
" نہیں ، یہ تم بالکل غلط سمجھی ہو ۔ تم میرے لئے مستقبل نہیں ہو "۔
" پھر میں کیا ہوں ؟ ---- ماضی ؟"
" نہیں ، ان میں سے کچھ بھی نہیں ۔ تم کچھ بھی نہیں ہو ۔ جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ھے ، تم کچھ بھی نہیں ہو "۔

" اگر میں کچھ نہیں ہوں تو اس کے لئے میں تمہاری شکر گزار ہوں "۔ ھنیل طنز سے بولی ، لیکن کپتان کے مہمل سے انداز نے اُس پر غلبہ پا لیا ۔ وہ اُس کی گردن پر ہاتھ رکھے اُس کے ہلکے ہلکے غیر محسوس بوسے لیتا رہا ۔ اُس کے بے معنی پن نے ھنیل کو مسحور کر دیا اور بے بس بنا دیا ۔ وہ اُس کے انداز کا کوئی مفہوم نہ سمجھ سکتی تھی --- کسی قسم کے بھی معنی نہ دے سکتی تھی ۔ تاہم اُس کے ہونٹ جو چومتے وقت عجیب سے ہو جاتے تھے ، اُس کی بالوں سے بھری ہوئی بانہیں ، اُس کا نفیس ، خوبصورت سینہ جس پر سیاہ بال تھے --- یہ سب اُسے ایک راز اور ناقابل فہم سی چیزیں معلوم ہو رہی تھیں ، جیسے کسی دوسری دنیا کا باشندہ اُس سے محبت کر رہا ہو ۔ وہ اپنے آپ کو بوجھل بوجھل اور سحر زدہ سی محسوس کر رہی تھی، اور یہ سحر جو اُسے اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا اُسے بہت ھی محبوب تھا، لیکن ساتھ ھی وہ اس سحر سے نفرت بھی کرتی تھی ۔

(۲)

کاؤنٹس زو راسپنٹلو کا سٹوڈیو ایک بڑے بازار میں واقع تھا ۔ در اصل وہ ایک پناہ گزین تھی اور آج کل کے زمانے میں اگر انسان پناہ گزین ہو تو یا وہ کوئی نواب بنا ہوتا ھے یا پھر کوڑی کوڑی کو محتاج پھرتا ھے ۔ لیکن ھنیل نادار نہ تھی کیونکہ اُس کی سہیلی مچکا اور

اُس نے مل کر ایک سٹوڈیو کھول رکھا تھا ۔ جہاں وہ یہ گڑیاں ، رنگ برنگے اُون سے کڑھی ہوئی گدیاں اور اسی قسم کی نسوانی ہنرمندی کی اشیاء بنا کر بیچا کرتی تھیں ۔ اُن کی گڑیاں بہت مشہور تھیں ۔ اس لئے یہ دونوں عورتیں بھوکوں نہ مرتی تھیں ۔

ھنیل سٹوڈیو میں زیادہ کام نہ کرتی تھی ۔ اُسے اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھ کر کام کرنا زیادہ پسند تھا ۔ اُس کا کمرہ بھی اسی عمارت میں تھا اور خاصا خوبصورت تھا ، لیکن کپتان کے کمرے جتنا بڑا نہ تھا ۔ بہر حال وہ اکثر دوپہر بعد سٹوڈیو چلی جاتی اور اگر کوئی خریدار آتے تو انہیں چائے کی پیالی بھی پیش کر دی جاتی تھی ۔

الگزینڈر کا گڈا بیچنے کے لئے نہیں بنایا گیا تھا ، لیکن ھمیں یہ نہ پتہ چل سکا کہ ھنیل ایک دن سہ پہر کو اسے سٹوڈیو کیوں لے گئی ۔ خیر تو اُس نے سٹوڈیو لے جا کر اسے ایک الماری پر کھڑا کر دیا ۔ یہ ایک بوسر اور رئیس آدمی کا بہادت ھی خوبصورت ننھا سا مجسمہ تھا اور اُس کا جسم اتنی خوبی سے بنایا گیا تھا کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی تھی ۔

” اوہ ، یہ تو بڑی عمدہ چیز ھے ! “ مچکا اسے دیکھ کر چلائی : ” یہ تو پورا شاھکار ھے ! یہ تو میرا شاھکار ھے ، ھنیل ۔ واقعی غضب کا گڈا ھے ۔ انتہائی خوبصورت ! بہت ھی حسین آدمی ھے نا ! لیکن نہیں ، یہ ضرورت سے زیادہ حقیقی معلوم ھوتا ھے ۔ میں نہیں سمجھ سکتی کہ تم نے ایسی ھمت کیوں کر کی ۔ ھنیل ، میں ھمیشہ تمہیں نیک سمجھتی تھی ، اپنے سے کہیں زیادہ نیک دل ، لیکن اب تو تم نے مجھے ڈرا دیا ھے ، مجھے تو یہ ڈر ھے کہ تم اب بڑی شریر ھوگئی ھو ۔ اور یہ جان کر مجھے تو بڑی پریشانی ھونے لگی ھے ۔ مگر نہیں ، نہیں ! خیر تم اسے وھاں تو نہیں رکھو گی نا ؟ “

” کیوں نہیں ؟ “ ھنیل نے ذرا طنز سے کہا ۔

مچکا نے بڑے حیرت ، تعجب اور شکایت آمیز انداز میں اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پھاڑ دیں اور بولی :

” لیکن تمہیں ایسا نہیں کرنا چاھئے “۔

” کیوں نہیں ؟ “

” نہیں ، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاھئے ۔ تمہیں اُس آدمی سے محبت ھے “۔

” تو پھر کیا ھوا ؟ “

” تم اُس کا پتلا وھاں نہیں رکھ سکتیں “۔

” کیوں نہیں رکھ سکتی ؟ “

” تم تو واقعی بڑی شریر ھو ۔ بہت ھی بری لڑکی ھو ۔ ذرا سوچو تو ! — اور وہ ایک انگریز افسر ھے “۔

” اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ کوئی قابل تعظیم شخصیت ھوگئی ھے “۔

” وہ لوگ تمہیں شہر سے نکال باھر کریں گے اور جلا وطن کر دیں گے “۔

” بلا سے کر دیں “۔

” نہیں نہیں ! پھر تم کیا کرو گی ؟ یہ تو بہت ھی بری بات ھوگی کہ ھمیں پھر برلن یا میونک جا کے نئے سرے سے کام شروع کرنا پڑے ۔ یہاں تو کام بڑی آسانی سے چل نکلا ھے “۔

ھنیل نے کہا : ” مجھے کوئی پروا نہیں ھے “۔

مچکا نے اپنی سہیلی کی طرف دیکھا اور کچھ نہ بولی ، لیکن وہ بہت غصے میں تھی ۔ ذرا دیر کے بعد وہ پلٹی اور جنگ کا اعلان کر دیا ۔

” جب تم یہاں نہیں ھوگی تو میں یہ گڈا اُٹھا کے دراز میں رکھ دوں گی ۔ اور کسی کو

نہیں دکھاؤں گی ، کسی کو بھی نہیں ۔ اور میں سچ کہتی ہوں اسے وہاں پڑا دیکھ کے مجھے ڈر محسوس ہوتا ہے ۔ مجھے ڈر سا لگنے لگتا ہے ۔ اور پھر تمہیں کوئی حق نہیں کہ مجھے یوں مصیبت میں پھنساؤ ۔ میں تو انگریز افسروں کی طرف دیکھتی تک نہیں ۔ مجھے تو وہ ذرا پسند نہیں ، بڑے روکھے پھیکے اور کھچے کھچے سے معلوم ہوتے ہیں اور ان انگریز افسروں کی وجہ سے میں تو کبھی اپنے سر کوئی مصیبت مول نہ لوں گی "۔

هنیل بولی : " گھبراؤ نہیں ، وہ تمہیں نہیں ستائیں گے ۔ انہیں ہماری ہر حرکت کا اچھی طرح علم ہے ۔ اُن کے جاسوس ہر جگہ موجود ہیں ۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا "۔

" لیکن فرض کرو اگر وہ تمہیں باہر بھیج دیں اور میں یہاں سٹوڈیو میں پھنس کے رہ جاؤں تو" ۔

لیکن ان باتوں کا کوئی فائدہ نہ تھا ۔ هنیل اپنی ضد پہ اڑی رہی ۔

جبر نو ایک روشن سہ پہر کو کسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی : سفید کپڑوں میں ملبوس ، ایک چھوٹی سی عورت اندر داخل ہوئی ۔ اُس کے چہرے پر جھریاں تھیں ، لیکن اب تک خوبصورتی باقی تھی ۔

" آداب عرض !" وہ متوسط طبقے کے لوگوں کی سی میٹھی میٹھی ، چپچپی انگریزی میں بولی : " کیا میں آپ کے سٹوڈیو کی چیزیں دیکھ سکتی ہوں ؟"

" جی ہاں ، ضرور ! اندر تشریف لائیے "۔ یہ مچکا نے کہا ۔

وہ چھوٹی سی عورت اپنے قیمتی لباس اور بجھے بجھے حسن سمیت اندر آگئی ۔ وہ زیادہ بوڑھی نہیں تھی ۔ یہی کوئی پچاس کے لگ بھگ ہو گی ۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ اس عمر میں اُس کا چہرہ اتنا مرجھا گیا ، کیونکہ ویسے اُس کا جسم بڑا سبک اور آنکھیں خوب چمکیلی تھیں ۔ اور جب وہ ہنسنی تو اُس کے خوبصورت دانت دکھائی دینے لگتے تھے ۔ اُس نے کپڑے بہت عمدہ پہن رکھے تھے ، خوب اچھی بنی ہوئی سفید سلک کا فراک ۔ سمور کی ایک لمبی سی شال جس کے صرف کناروں پر رواں تھا اور کالی ٹوپی پر بڑے فینسی قسم کے سبز پروں کا گچھا ۔ اُس نے بہت سا زیور پہن رکھا تھا ۔ وہ بڑی تحسین آمیز نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے جب کبھی انگلیوں سے اپنے بال سنوارتی تو سفید دستانوں پر دو کڑے جھن جھنا اٹھتے ۔

" آپ کا سٹوڈیو بہت عمدہ ہے —— بہت عمدہ —— انتہائی شان دار ! میں تو اتنی شان دار چیز کی امید ہی نہ کر سکتی تھی "۔

مچکا نے قدرے طنز آمیز انداز سے جھک کر اس تعریف کا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولی :

" جی ہاں ، ہمیں بھی یہ جگہ بہت پسند ہے "۔

هنیل جو ایک پردے کے پیچھے جا چھپی تھی ۔ اب جلدی سے آگے بڑھی ۔

اسے دیکھ کر معمر خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا : " اوهو ، مزاج شریف ، آپ بھی ہیں ۔ میں نے سنا تھا کہ آپ دو لڑکیاں یہاں کام کرتی ہیں ۔ اچھا ، اگر آپ برا نہ مانیں تو ذرا اپنا تعارف کرا دیجئے ۔ آپ کا کیا نام ہے ؟ " اُس نے بڑی حسین مسکراہٹ کے ساتھ اپنی چھوٹی سفید انگلی مچکا کی طرف اٹھاتے ہوئے پوچھا ۔

مچکا نے جھکتے ہوئے کہا " اینامیریافان پری لاؤ کیرولت "۔

" اچھا ۔ اچھا "—— اور پھر وہی سفید انگلی هنیل کی سمت اٹھی " اور آپ —— "

" جی ، میرا نام ہے جوهانا زو راسینٹلو " هنیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ۔

" اچھا تو آپ ہیں کاؤنٹس فان ریسینٹلو ! اور یہ ہیں بیرنیس فان ۔ فان —— لیکن

خیر ، اگر آپ نے مجھے دوسری مرتبہ بھی بتا دیا تو بھی مجھے نام یاد نہیں رہیں گے ۔ ناموں کے معاملے میں میری یاد داشت بہت بری ہے ۔ خیر آپ میں سے ایک کو میں کاؤنٹس کہہ لوں گی اور دوسری کو بیرینس ۔ مجھ غریب کے لئے اتنا یاد رکھنا ہی کافی ہوگا : اچھا ، مہربانی فرما کر اب آپ مجھے ذرا اپنی چیزیں دکھا دیجیے ۔ میں یہاں سے کوئی چھوٹا سا تحفہ اپنے ساتھ انگلینڈ لے جانا چاہتی ہوں ۔ میرے خیال میں مجھے ان چیزوں پر زیادہ محصول نہ دینا پڑے گا ۔ کیا خیال ہے آپ دونوں کا ؟"

مچکا بولی " نہیں ، نہیں ، کوئی محصول نہ دینا پڑے گا ۔ آپ جانتی ہیں کھلونے --- یہ --- ان پر ---" یہاں وہ انگریزی میں اپنا مطلب ادا نہ کر سکی ۔ اور ہنیل سے مدد چاہی ۔

ہنیل نے کہا " کھلونوں پر وہ لوگ محصول نہیں لیتے اور پھر کڑھی ہوئی چیزوں کو تو وہ پوچھتے تک نہیں "۔

" اچھا ، خیر ، تب تو ٹھیک ہی رہے گا ۔ میرے خیال میں مجھے یہاں سے ضرور کوئی اچھی چیز مل جائے گی ! وہ سامنے بہت ہی خوبصورت جمپر پڑا ہے بہت ہی نفیس ۔ لیکن میرے لئے ذرا وہ بھڑکیلا رہے گا ۔ افسوس ہے کہ میں پہلے کی طرح جوان نہیں رہی"۔ وہ پھر دل فریب سے انداز میں مسکرائی ۔ اُس کے خوبصورت دانت جھلک اُٹھے اور اُس کے کانوں میں پڑے ہوئے آویزے ہلنے لگے ۔

" میں نے آپ کی گڑیوں کی بہت تعریف سنی ہے ۔ کہتے ہیں وہ صنعت کاری کے بڑے عمدہ نمونے ہیں ۔ کیا میں وہ گڑیاں دیکھ سکتی ہوں ؟"

" جی ہاں " مچکا نے اپنے مخصوص الفاظ دہرائے ۔ دراصل اُسے انگریزی کے یہی دو لفظ ازبر تھے ۔

اُن کے پاس ہمیشہ تین چار گڑیاں ہی بنی ہوتی تھیں اور اس دفعہ تو صرف دو ہی تھیں ۔ اُس نامی کپتان کا ہم شکل گڈا تو دراز میں رکھ دیا گیا تھا ۔

" بہت اچھے ! بھئی خوب !" چھوٹی سی خاتون بڑے فن کارانہ لہجے میں بولی " یہ تو واقعی بڑی عمدہ ہیں ۔ اتنی اچھی گڑیاں بنانا تو بڑا کمال ہے ، کاؤنٹس ۔ کیا آپ گڑیاں بناتی ہیں ؟ یا آپ دونوں مل کے انہیں تیار کرتی ہیں ؟"

ہنیل بتاتی گئی ۔ معائنہ اور تعریف و تحسین برابر جاری رہی ۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ چھوٹی عورت خریداری میں محتاط ہے ۔ اُس نے ساری چیزوں کو بڑے غور سے دیکھا اور خوب سوچ بچار کرتی رہی ۔ گڑیاں اُسے بڑی دلکش معلوم ہوئیں لیکن وہ اُسے بڑی مہنگی لگیں ۔ اس لئے وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی ۔

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "میرا جی چاہتا تھا کہ بہت سی گڑیاں ہوتیں اور اُن میں سے میں کوئی پسند کرتی ۔ پھر ممکن ہے کوئی ایسی نظر آ جاتی کہ جسے میں خریدے بغیر نہ رہ سکتی ۔ اس میں شک نہیں یہ ہیں تو بہت خوبصورت ، بڑی پیاری سی اور پھر قیمت بھی محنت کے لحاظ سے بڑی مناسب معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن معلوم نہیں آپ میرا مطلب ٹھیک سے سمجھ سکیں گی یا نہیں ۔ میرا یہی دل چاہتا ہے کہ اگر ایک دو ہی گڑیاں اور ہوتیں تو شاید مجھے ایک ایسی نظر آتی کہ جسے خریدے بغیر میں نہ رہ سکتی ۔ شاید آپ سمجھیں نہیں ؟ انسان بھی بڑا بےوقوف ہوتا ہے ۔ گوئٹے نے کہا ہے نا کہ .... ؟ معاف کیجئے مجھے جرمن کی الف بے تک نہیں آتی ۔ لیکن اس کا مطلب کچھ یوں ہے کہ انسان ہمیشہ یہ محسوس کرتا ہے موجودہ جگہ کی بجائے اگر وہ کہیں اور ہوتا تو یقیناً زیادہ خوش رہتا ۔ یہی مطلب ہے نا اُس کا ؟ خیر، تو یہ بات واقعی ٹھیک ہے --- اکثر یہی ہوتا ہے لیکن شکر ہے کہ ہمیشہ ایسا نہیں

ہونا "۔ وہ پھر عجیب سے انداز میں خود ہی مسکرا دی اور اپنے ہونٹوں کو سکیڑ کے پھر کہنے لگی " ہاں ، تو ان گڑیوں کے بارے میں بھی میرا کچھ یہی خیال ہے ۔ اگر ایک دو بھی اور ہوتیں ۔ کیا اور ایک بھی نہیں ؟ "

اُس نے بڑے دل فریب انداز میں ھنیل کی طرف دیکھا ۔

ھنیل بولی " جی ، ایک اور بھی ہے لیکن یہ کسی نے کہہ کے تیار کرائی ہے اور وہ بکنے کے لئے نہیں ہے "۔

" ارے ، کیا میں اُسے دیکھ سکتی ہوں ؟ مجھے یقین ہے وہ ضرور خوبصورت ہو گی ۔ میں تو اُسے دیکھنے کے لئے بے تاب ہوتی جا رہی ہوں ۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ عورت کا تجسس بھی بری بلا ہے ؟ " یہ کہہ کر وہ پھر کھلکھلا کے ہنس دی " بدقسمتی سے مجھ میں سائنٹ کوٹ کوٹ کے بھری ہے ۔ اگر ذرا سا مردانہ پن بھی ہو تو بہت سی باتیں برداشت کرنے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے ۔ لیکن مجھ میں تو یہ صفت ذرا بھی نہیں آئی ؟ " اُس نے ایک سرد آہ بھری اور خاموش ہوگئی ۔

ھنیل نے جلدی سے دراز کھول کے کپتان کا پتلا نکالا اور چھوٹی سی عورت کے ہاتھ میں دے دیا ۔ عورت کچھ خوف زدہ سی معلوم ہونے لگی تھی ۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے گول گول اور بحوں کی سی لگنے لگیں ۔ اور چہرہ زرد پڑ گیا ۔ گھبراہٹ کے مارے اُس کے زیور بھی بج اُٹھے ۔ وہ ذرا ہکلاتے ہوئی بولی :—

" ارے یہ ——— کیا یہ ———" وہ ذرا سا ہنسی جیسے کوئی ہسٹیریا میں ہنستا ہو ۔

اُس نے چاروں طرف یوں دیکھا جیسے بچ نکلنا چاہتی ہو ۔ اور کہنے لگی :—

" معاف کیجئے ، میں ذرا بیٹھ جاؤں ۔ معلوم ہوتا ہے کھڑے کھڑے ———" وہ دھپ سے کرسی پر گر پڑی ۔ اُس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا لیکن پتلا مضبوطی سے تھامے رکھا ۔ اُس کی سفید سفید انگلیاں جن میں وہ بڑی بھاری انگوٹھیاں پہنے تھی ۔ گڈے کی کمر کو لپیٹے ہوئی تھیں ۔

بکا جو بہت ڈر گئی تھی وہ دوڑ کے پاس آتے ہوئے بولی " دیکھئے ، یہ تو ایک جیتے جاگتے انگریز کی ، ایک نہایت شریف آدمی کی تصویر ہے ۔ ہو بہو اُسی کی تصویر "۔

" صرف تصویر ہے " ھنیل نے ذرا بشاشت سے کہا ۔

" ہاں " خریدار عورت آہستہ سے بڑبڑائی ۔ " ہاں ، واقعی یہ تصویر ہے ۔ یقیناً یہ بہت عمدہ تصویر ہے "۔

وہ گھبراہٹ کے انداز میں اپنی زنجیر سے کھیلنے لگی اور ایک چھوٹے سنہری چشمے کو آنکھوں پر رکھ لیا جیسے اپنے آپ کو چھپانا چاہتی ہو اور اپنے چشمے کی آڑ میں سے وہ اپنے ہاتھ والے گڈے کی طرف دیکھنے لگی اور بولی :—

" لیکن آج کل تو کوئی بھی انگریز افسر یا سکاٹ لینڈ کا رہنے والا اتنی چست پتلون نہیں پہنتا ——— یہ تو بس فینسی ڈریس میں استعمال ہوتا ہے "۔

اُس کی آواز بڑی مدھم اور دور سے آتی معلوم ہو رہی تھی ۔

ھنیل بولی " جی ہاں ، آج کل یہ نہیں پہنی جاتی ، لیکن اصل لباس تو یہی ہے ۔ میرے خیال میں یہ پتلون بڑی اچھی ہے ۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟ "

" ہوں ۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی ۔ یہ تو انسان پر منحصر ہے " ——— اور وہ چھوٹی عورت زور سے ہنس پڑی ۔

ھنیل نے کہا " جی ہاں ، اس کے لئے ٹانگیں خوبصورت ہونی چاہئیں "۔

"بالکل ویسی جیسی کہ تمہارے گدّے کے اصلی مالک کی ہیں" عورت بولی -

"جی ہاں ، میرے خیال میں اُن کی ٹانگیں بہت ہی خوبصورت ہیں"۔

عورت نے کہا "واقعی ، اس تصویر کو بھی دیکھ کر یہی معلوم ہوتا ہے - اگر آپ ایسے نامناسب نہ سمجھیں تو کیا میں اُن صاحب کا نام پوچھ سکتی ہوں ؟"

"کپتان ہیپ برن" ہنیل نے بتادیا -

"ہاں ، واقعی وہی ہیں - میں بھی فوراً پہچان گئی تھی - میں انہیں کئی سال سے جانتی ہوں"۔

مچکا بیچ میں بول اٹھی "دیکھئے ، مہربانی فرما کر آپ انہیں نہ بتائیے گا کہ آپ نے ایسے دیکھا ہے ! خدا کے لئے کسی کو بھی نہ بتائیے گا"

عورت نے قدرے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا :-

"کیوں نہ بتاؤں ؟ خیر ، میں فوراً انہیں نہیں بتا سکتی کیونکہ میں نے سنا ہے وہ اس وقت کہیں باہر گئے ہوئے ہیں - آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ کب واپس آئیں گے ؟"

ہنیل نے کہا "میرے خیال میں وہ کل آئیں گے"۔

"کل !"

"اور دیکھئے !" مچکا نے پھر لجاجت سے کہا ، وہ اس طرح منت کرتی ہوئی بڑی پیاری لگ رہی تھی "مہربانی فرما کر کسی کو نہ بتائیے گا کہ آپ نے یہ گدّا دیکھا ہے"۔

"کیا مجھے وعدہ کرنا پڑے گا ؟" عورت نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اچھا تو میں انہیں نہیں بتاؤں گی کہ میں نے ایسے دیکھا ہے - خیر ، اب مجھے چلنا چاہئیے - ہاں ، بس میں وہ گدّی کا غلاف لئے لیتی ہوں - شکریہ - مہربانی سے مجھے ذرا پھر اس کی قیمت بتا دیجئے"۔

اُس شام ہنیل بہت بے چین رہی وہ تین دن ہوئے اپنے کسی سرکاری کام سے باہر گیا تھا - وہ اُسی رات واپس آنے والا تھا ----- شاید کھانے در ہی واپس آ گیا ہو - لیکن وہ آیا نہیں تھا - اُس کے کمرے میں تالا پڑا تھا اور اندر اندھیرا چھایا تھا - ہنیل کو چند گھنٹے پہلے نوکر کے انگیٹھی جلانے کی آواز سنائی دی تھی اور اب کمرہ بند اور اتنا خالی خالی سا تھا جیسا تین دن پیشتر سے پڑا تھا -

ہنیل زیادہ بے چین اس لئے تھی کہ اُس کے باہر رہنے سے نہ اسے بالکل بھول گئی معلوم ہوتی تھی - ایسا لگتا تھا جیسے وہ اُس کے لئے کہیں غائب ہی ہو گیا ہو - اب تو وہ اُس کے ذہن تک میں بھی نہ آ رہا تھا - اسے حیرت تھی کہ وہ اتنا غیر اہم کیوں کر ہو گیا -

اب یہ یقین کرنے کے لئے کہ وہ واقعی وہاں ہے ہنیل اُسے پھر سے دیکھنا چاہتی تھی - اسے یوں لگا جیسے وہ آ رہا ہو - ایسا محسوس ہوا گویا وہ اُس پر اپنا کچھ اثر ڈال رہا ہو - لیکن کیا ؟ کیا وہ حقیقی انسان تھا ؟ میں نے اُس کا گدّا کیوں بنایا ! اگر اُس کی کوئی حقیقت نہیں تو پھر گدّا اتنا اہم کیوں ہو کر رہ گیا ! آج سہ پہر کو میں نے وہ اُس عجیب و غریب چھوٹی عورت کو کیوں دکھا دیا ؟ نہ جانے میں اتنی بے وقوف کیوں بنی کہ ایسی جگہ آ کر پھنس گئی جہاں اتنی مصیبت پڑتی ہے ؟ پھر آخر میں اس حال میں پھنسی ہی کیوں ؟ یہ سب کا سب کتنا غیر حقیقی معلوم ہوتا تھا - اور خصوصاً وہ تو بالکل غیر حقیقی تھا - اتنا غیر حقیقی جیسے کوئی خواب میں دیکھا ہوا انسان ، اور جس کا اصل زندگی میں کبھی نام تک نہ سنا ہو - اصل زندگی میں تو اُس کے اپنے جرمنی کے دوست زیادہ حقیقی تھے - مارٹن حقیقی تھا - تمام جرمن آدمی اُس کے لئے حقیقی تھے - لیکن یہ دوسرا آدمی ، وہ تو قطعی

حقیقی نہ تھا - اُس کا بالکل وجود نہ تھا - اصلیت میں اُس کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی - وہ تو ایک موہوم چیز تھا ـــــ اور کسی طور وہ اس موہوم چیز کے ساتھ اُلجھ کے رہ گئی تھی -

کیا یہ ممکن تھا ؟ کیا یہ حقیقت تھی کہ وہ ایک غیر حقیقی چیز سے اتنا قریب آ گئی تھی ؟ اس وقت جبکہ وہ غیر حاضر تھا تو ھنیل کے لئے اُس کا تصور بھی مشکل ہو گیا تھا - وہ اُس کے ذہن سے ہی نکل گیا تھا ، یہاں تک کہ اُس کے گدّے کی طرف دیکھ کر بھی سوائے ایک ویران پتلے کے اُسے اور کچھ نظر نہ آتا تھا - تاہم ، ان سب باتوں کے باوجود وہ اس بے جان پتلے کی خاطر اپنے آپ کو رسوا کر رہی تھی اور ایسی حالت میں کہ جب ایسا کرنا بہت خطرناک تھا -

اُس کے اپنے جرمن دوست ـــــ اپنے جرمنی کے آدمی ـــــ وہ حقیقی آدمی تھے ، جیتے جاگتے انسان - لیکن یہ انگریز افسر اُس محاورے کے مصداق نہ مچھلی تھا ، نہ چڑیا ، اور نہ مرغا - بس یونہی ایک فرضی سا وجود تھا - ھنیل کو یوں محسوس ہوا کہ اگر وہ اب کبھی واپس نہ آئے تو مجھے یوں لگے گا جیسے میں نے کوئی عجیب سا فرضی قصہ پڑھا ہو - ایک ایسی داستان جو یونہی جھوٹ موٹ تخیل کو بھڑکا دیتی ہے -

بہر حال وہ تھی بہت بے چین - اُسے یہ کچھ وہم تھا کہ ممکن ہے اس سب کے پیچھے کوئی اور بات ہو - چنانچہ وہ بڑی تشویش کے عالم میں باہر ٹہلتی رہی اور آواز سننے کی کوشش میں رہی کہ شاید وہ آ رہا ہو -

ہاں ـــــ اب آواز تو آئی - سیڑھیوں پر اُس کے ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دی اور ساتھ ہی اُس کی لرزتی سی دھیمی آواز بھی ـــ اور جونہی ھنیل نے اُس کی آواز سنی وہ پھر ڈر گئی - وہ سمجھ گئی کہ وہاں کوئی موجود تھا - اچانک اُسے کپتان کی حقیقت کا احساس ہونے لگا اور اپنے سب جرمن دوست غیر حقیقی بن گئے - اُس کی غیر ملکی آواز کا سریلا پن سنتے ہی اسے اپنے اندر سب کچھ بدلتا معلوم ہوا ـــــ مارٹن ، روٹو ، ایلبٹریغٹ ، اُس کے جرمن دوست اتنے دھندلے اور ہلکے ہوتے گئے جیسے وہ کوئی غیر مرئی چیزیں ہوں اور اُن میں سے جھانک کر دیکھا جا سکتا ہو -

اب اُس کا سابقہ اس مسئلے سے تھا کہ اُس کا دل ایک طرف سے ہٹ کے دوسری طرف آ جاتا تھا - جب وہ موجود ہوتا تو اُسے ہر طرح حقیقی معلوم ہونے لگتا - جب کبھی وہ غیر حاضر ہو جاتا تو بالکل مبہم سا رہ جاتا اور اُس کے اپنے لوگ ، اپنی قوم کے لوگ زیادہ حقیقی اور اصلی معلوم ہوتے -

لیکن وہ تو باتیں کر رہا تھا ـــ وہ کس سے باتیں کر رہا تھا ؟ اسے پتھریلی سیڑھیوں پر دھیمے اور تھکے تھکے سے قدموں کی گونج سنائی دے رہی تھی اور ساتھ ہی ہولے ہولے باتوں کی آواز بھی آ رہی تھی - اُس کی دھیمی ، نرم آواز اور پھر ایک عجیب و غریب تیز سا لہجہ - ہاں کسی عورت کی آواز تھی - یہ کسی خادمہ کی آواز تو نہیں ہو سکتی تھی کیوں کہ وہ تو انگریزی بول رہے تھے ـــ وہ بڑے غور سے سننے لگی ـــ وہ کسی زیادہ باتیں کرنے والی عورت کی دھیمی ، ہلکی اور دبی دبی سی آواز تھی جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو - ھنیل کے تیز کانوں نے اُسے یہ کہتے ہوئے سنا " ہاں ، میرے خیال میں بھی بیرینس بڑی خوبصورت ، انتہائی حسین لڑکی ہے - لیکن بڑی حد تک اسپین کی رہنے والی معلوم ہوتی ہے - ایلک ، تمہیں یاد ہے جب ہم میلاگا میں تھے ! مجھے ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ تمہیں وہ سر اور شانوں پر شال لپیٹنے والی عورتیں بڑی دل فریب معلوم ہوتی ہیں - وہ بھی اس قسم کی شال میں بڑی خوبصورت دکھائی دے - لیکن یہ بے چاری شاید بڑی فراخ دل ، جذباتی سی لڑکی ہے -

اس میں اسپین والوں کی سی کم آمیزی نہیں ہے ۔ بے چاری لڑکی ، مجھے اس پر ترس آتا ہے ۔ ان دونوں پر ہی ۔ جب انسان کو نوابی خطابات کے باعث فراغت اور عزت کی زندگی بسر کرنے کی عادت ہو تو اس طرح چیزیں بنا بنا کر روزی کمانا بہت مشکل معلوم ہوتا ہوگا ۔ اف ، بے چاریاں واقعی بڑی مصیبت زدہ ہیں ۔ جب انسان ان سے کھڑا اونی کشیدے کی چیزیں خرید رہا ہو تو بیرونس ، کاؤنٹس جیسے خطاب کتنے عجیب معلوم ہوتے ہیں ۔ لیکن میرے خیال میں وہ بے چاری اور کر بھی کیا سکتی ہوں گی ۔ میرا خیال ہے انہیں یہ خطاب چھوڑ ہی دینے چاہئیں ——— "۔

" ہاں ، وہ تو چھوڑ دیں بشرطیکہ لوگ انہیں چھوڑ دیں ۔ بات یہ ہے کہ انگریز اور امریکی لوگوں کو بیرونس یا کاؤنٹس کہنا فراؤلین فان پری لاؤکیرولیت وغیرہ کہنے سے زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے "۔

پھر عورت کی آواز سنائی دی " وہ لوگ صرف فراؤلین کہہ سکتے ہیں جیسے کہ ہم اپنی گورنیسوں کو کہتے ہیں یا جیسا کہ ہم اپنی جرمن گورنیسوں کو پکارا کرتے تھے"۔

کپتان بولا " ہاں ، کہہ تو سکتے ہیں "۔

" آخر فائدہ کیا ۔ ان خطابوں کا فائدہ ہی کیا جب انسان کو گڑیاں اور کشیدہ کاری کی چیزیں بیچنا پڑتی ہوں اور وہ بھی کوئی اتنی خوب صورت نہ ہوتی ہوں "۔

" ہاں ، واقعی ۔ یہ خطاب تو یقیناً غلط سی چیز ہیں لیکن ان کے ہاں تو یہ خطاب ایسے چلا آ رہا ہے"۔ کپتان کی سریلی اور دھیمی سی آواز نے کہا جس میں لاپروائی اور نا امیدی سی پائی جاتی تھی --- وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی نیند میں باتیں کر رہا ہو۔

ہنیل کو مارس کے سبز پروں کا گچھا سا نیچے سیڑھیوں کے موڑ پر جھومتا نظر آیا اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتی وہاں سے ہٹ آئی ۔

(۳)

اوپر والی چھت پر ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوا تھا ۔ بعض دفعہ وہ اس جگہ اپنی دوربین رکھ کے ستاروں اور چاند کو دیکھا کرتا تھا ۔ چاند کسی کسی روز ہی نظر آتا تھا ۔ یہ کوئی ایسی محفوظ جگہ نہ تھی ۔ بلکہ اوپر والی غلام گردش کے کنارے پر کھڑکی سے ذرا باہر چھت کا چھجہ سا تھا بڑھا ہوا کنارہ جو کمروں کے درمیان واقع تھا ۔ ہنیل کے پاس پچھلا کمرہ تھا اور کپتان کا کمرہ تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا سونے کا کمرہ تھا جو در اصل کاٹھ کباڑ کی جگہ تھی ۔ کپتان کے آنے سے پہلے ہنیل اس جگہ اکیلی تھی اور کپتان کے کمرے کاٹھ کباڑ اور دھلائی کے کام کے لئے استعمال ہوتے تھے جہاں کپڑے سکھائے بھی جاتے تھے لیکن وہ ستارے دیکھنے کے لئے اور بھی اوپر جانا چاہتا تھا اور یہی جگہ اسے زیادہ پسند تھی ۔

کافی رات گذر جانے پر ہنیل نے اس کے ادھر ادھر ٹہلنے کی آواز سنی ۔ اس نے باہر کی طرف ابھرتے ہوئے کٹہرے پر بھی اسے چلتے سنا ۔ ہنیل کو بالکل نیند نہ آئی ۔ کپتان اس کے آرام میں مخل ہو رہا تھا ۔ آسمان پر بڑا سا چمک دار چاند طلوع ہوچکا تھا ۔ اسے گرجے کے گھنٹے سے دو بجنے کی آواز آئی ——— بے جان رات میں زندگی کے یہ دو قطرے ٹپکے ——— اور پھر چھت کے اوپر سے اسے کپتان کے کھنکھارنے اور گلا صاف کرنے کی آواز سنائی دی ۔ اس کے بعد ایک بلی زور سے رونے لگی ۔

وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی ۔ اپنے گرد سیاہ شال لپیٹی اور نیچے دھلیز پر پہنچ کے

کنارے کی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ باہر آسمان پر بھرپور چاندنی پھیلی ہوئی تھی، کپتان بڑے سے بلے کی طرح ایک سٹول پر بیٹھا گھٹنے کھولے اپنی دوربین میں سے اوپر دیکھ رہا تھا۔ وہ اس انداز میں ایسا بے حس و حرکت بیٹھا تھا کہ چھت پر بالکل ایک بت سا معلوم ہو رہا تھا۔ سیاہ ٹائیلوں کی بڑی سی ڈھلان پر چاندنی سیسے کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ خاموشی سے کھڑکی میں سے اسے دیکھتی رہی اور کپتان چپ چاپ دوربین کے کنارے جا کھڑا رہا۔

ہنیل نے آہستہ سے کھڑکی کے شیشے پر کھٹ کھٹ کی۔ وہ بالکل جنگلی بلے کی طرح چونک کے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ لمبے کر کے کھڑکی کھول دی۔

"ہیلو" وہ آہستہ سے بولا "تم سوئیں نہیں؟"

وہ قدرے جھجک سے بولی "تم تھکے نہیں؟"

"نہیں" مجھے تو ذرا بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔ چاند آج رات کتنا خوب صورت معلوم ہو رہا ہے! آؤ، کس قدر حیرت انگیز ہے یہ۔ کیا تم اوپر آ کے اسے نہ دیکھو گی؟"

"نہیں، شکریہ"۔ ہنیل جلدی سے بول اٹھی وہ اس خیال سے ہی لرز اٹھی تھی۔

وہ پھر اسی انداز سے بیٹھ کر دوربین میں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ پھر بڑبڑایا "بہت ہی عمدہ چاند ہے"۔ ہنیل بھی کچھ دیر تک ٹھہری رہی۔ آج پوری اس لڑکے سے اکتوبر کے چاند نے مبہوت سا کر دیا تھا۔ آسمان پر پھیلی ہوئی سفید اور گہری، ہری دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے دن نکل آیا ہو لیکن اندھا اور وسیع سا۔ اور وہ چھت پر کسی بلے کی طرح بیٹھا تھا! بالکل یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ دوسرے کسی سیارے کا دن ہو۔

آخر کار وہ ہنیل کی طرف مڑا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی چمک تھی اور اس کی آنکھیں رات میں بالکل ایک بلی کی طرح پھیل گئی تھیں۔

"تمہیں معلوم ہے آج میرے ہاں ایک مہمان آیا تھا؟" وہ بولا۔

"ہاں"۔

"میری بیوی"۔

"تمہاری بیوی!" —— وہ واقعی بھونچکی رہ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ صرف کوئی اس کی واقف کار ہو گی۔ شاید اس کی خالہ، یا شاید بڑی بہن۔ "لیکن وہ تو تم سے کئی سال بڑی ہیں" ہنیل نے اس سے کہا۔

"ہاں، آٹھ سال۔ میں اس وقت اکتالیس سال کا ہوں"۔

کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔

وہ پھر سوچتے ہوئے بولا "ہاں، وہ کل بلا کسی اطلاع کے اچانک آ پہنچیں اور دیکھا کہ میں یہاں سے غائب ہوں۔ وہ وسرنارس زائملس کے ایک ہوٹل میں ٹھہری ہیں"۔

کچھ دیر تک پھر خاموشی رہی۔

ہنیل نے پوچھا "تم ان کے ساتھ نہیں رہو گے؟"

"ہاں، میں شاید کل وہاں چلا جاؤں گا"۔

اس بار خاموشی کچھ زیادہ دیر قائم رہی

"تم آج رات کیوں نہیں گئے؟" ہنیل نے دریافت کیا۔

"بھئی —— آج رات تو میں نے ارادہ چھوڑ ہی دیا —— میری بیوی کو ہوٹل میں کمرہ بدلنا پڑتا اور کافی دقت ہوتی —— اور پھر دیر بھی ہو گئی تھی —— اس کے علاوہ میں سفر کی وجہ سے تھک بھی بہت گیا تھا"۔

" لیکن تم کل تو چلے جاؤ گے نا ؟ "

" ہاں ، کل میں چلا جاؤں گا ۔ ایک آدھ ہفتے کے لئے ۔ اس کے بعد پتہ نہیں پھر کیا ہوگا "۔

خاموشی پھر طویل ہوگئی ۔ وہ چپ چاپ سٹول کے اوپر بیٹھا اپنی بڑی بڑی ویران ، سیاہ اور پھیلی پھیلی آنکھوں سے خلا میں گھورتا رہا ۔ ھنیل کچھ کہنے کی بجائے تھوڑی سوچتی رہی ۔

ھنیل نے پوچھا " کیا تم اُن کے پاس ہوٹل میں جانا چاہتے ہو ؟ "

" نہیں ، میری کوئی زیادہ خواہش بھی تو نہیں ہے لیکن در اصل ، میں اس میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتا ۔ ہم بڑے اچھے دوست ہیں ۔ ہماری دوستی کوئی اتنی سال پرانی ہے ۔ ہماری شادی ہوئے سترہ سال گذر چکے ہیں —— وہ بڑی اچھی آدمی ہیں اور میں اُن کے جذبات کو ٹھیس لگانا نہیں چاہتا ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئیے کہ مجھے اُن کو کسی قسم کی تکلیف دینا پسند نہیں ۔ اس کے برخلاف ، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ انہیں دنیا کی سب خوشیاں میسر آئیں "۔

اُسے ذرا بھی احساس نہ تھا کہ ھنیل میرے ان چھوٹے چھوٹے جملوں کو کتنی حیرت سے سن رہی ہے ۔

" لیکن —— " ھنیل نے ہکلاتے ہوئے کہا " لیکن کیا وہ یہ نہیں چاہتیں کہ تم اُن سے محبت کرو ؟ "

" ہاں ، ہاں ، اس کی تو اُنہیں ضرور توقع ہو گی ۔ یقیناً ہو گی جیسے ہر عورت کو ہوتی ہے "۔

" اور تم ؟ " —— اس سوال کا لہجہ بڑا خطرناک تھا ۔

" بھئی ، سچ پوچھو تو اس کی کوئی خاص پروا نہیں خصوصاً جب —— سب بہت تھوڑے عرصے کے لئے ہے ۔ مجھے اُن کے ساتھ گزارہ کرنے کی عادت پڑ چکی ہے اور پھر ، تم جانو ، مجھے ہمیشہ اُن سے کافی لگاؤ رہا ہے —— اور پھر اگر اُنہیں ایسا کرنے سے خوشی حاصل ہوتی ہے سو پھر مجھے بھی یہ اچھا لگتا ہے کہ وہ زندگی سے جتنی بھی خوشی حاصل کر سکتی ہوں کر لیں "۔

" لیکن تم —— خود تمہارا کیا حال رہتا ہے ! کیا تمہیں کچھ محسوس نہیں ہوتا ؟ "

ھنیل کی حیرت اس درجے تک پہنچ چکی تھی کہ اُسے یقین ہی نہ آرہا تھا ۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ صرف بننے کی کوشش کر رہا ہو ۔ کیونکہ خود ھنیل کے نقطۂ نظر سے سب کچھ بالکل مختلف تھا ۔ اتنے سکون سے وہاں بیٹھے بیٹھے اس قدر نیک نیتی سے ایسی باتیں کرنا —— نہیں ۔ ایسا ہونا نا ممکن تھا ۔

" میں اپنے آپ کو کوئی اہمیت نہیں دیتا "۔ کپتان نے بڑی سادہ دلی سے کہا ۔

ھنیل دوسری طرف دیکھنے لگی ۔ اگر یہ جھوٹ نہیں تو بے وقوفی تھی نا پھر شاید اس سے بھی بری بات ۔ فی الحال کہنے کے لئے اُسے کوئی بات نہ سوجھی ۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ذہنی اعتبار سے کوئی عجیب و غریب شے ہے جیسے ٹڈا ، مینڈک کا بچہ یا کنکھجوا —— انسانی نقطۂ نظر سے تو اُسے دیکھنا ہی نہیں چاہئیے ۔ نہیں ، وہ عام قسم کا آدمی نہیں تھا اور وہ اُس پر اتنی فریفتہ ہوگئی تھی ! اور یہ محض اُس کا تعجب اور حیرت ہی تھی جس نے اُسے دوسرا سوال پوچھنے پر مجبور کیا ۔

" لیکن ، کیا کبھی بھی تمہاری کوئی اہمیت نہیں رہی ؟ " اُس کے لہجے میں قہقہے اور تحقیر کا سا انداز تھا ۔ کپتان نے ذرا بھی برا نہ مانا ۔

" بس ، یونہی کبھی کبھی ۔ میری اہمیت بہت ہی کم ہوتی ہے ۔ مجھے زندگی بھی کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے ۔ انسان کس قدر حقیر ہوتا ہے "۔

ھنیل کا حیرت کے مارے سر گھومنے لگا تھا اور پھر کپتان اپنے آپ کو مرد کہتا تھا ۔
" لیکن اگر تم اپنے آپ کو اتنا کم اھم سمجھتے ھو تو پھر تم کچھ کرتے ھی کیوں ھو ؟" ھنیل نے پوچھا ۔
" ارے ، وہ تو کرنا ھی پڑتا ھے اور پھر کیوں نہ ھو ؟ اگر اپنی حقیقت کچھ بھی نہ ھو تب بھی کچھ نہ کچھ کیا کیوں نہ جائے ۔ ذرا چاند کو ھی دیکھو ۔ اسے ذرا برابر بھی پروا نہیں خواہ میں زندہ رھوں یا نہ رھوں ۔ چنانچہ مجھے اس کی فکر کیوں ھو ؟"
تھوڑی دیر تو ھنیل کو یقین ھی نہ آیا پھر بولی :۔
" میرا ھنسی کے مارے دم نکلا جا رھا ھے ۔ مجھے تو یہ سب بہت ھی مذاق سا معلوم ھوتا ھے —— نہیں ، میں اس پر یقین نہیں کر سکتی "۔
" شاید یہ بھی ایک نقطۂ نظر ھے "۔
ایک بہت طویل اور معنی خیز خاموشی چھا گئی ، ھم یہ نہیں کہنا چاھتے کہ اس میں معنی کیا تھے ۔
" اچھا تو پھر میری تمہاری نظر میں کوئی وقعت ھی نہیں ؟" ھنیل نے پوچھا ۔
وہ بولا " میں نے یہ تو نہیں کہا تھا " ۔
" تمہارے لئے تو کسی چیز کی بھی کوئی وقعت نہیں "۔ وہ ذرا جرأت کر کے چلائی ۔
" میں یہ تو نہیں کہتا "۔
" خواہ تمہاری بیوی ھوں —— میں ھوں یا یہ چاند —— سب ایک جیسا ھے "۔
" نہیں ، نہیں ، اس کا مطلب یوں نہیں نکالنا چاھئے "۔
ھنیل نے اپنے تعجب سے اُس کی طرف گھورا کہ وہ ایسا محسوس کرنے لگی جیسے اُس نے ایک لفظ بھی مزید سنا تو اُس کے اندر کوئی چیز پھٹ کے رہ جائے گی ۔ کیا وہ مرد ھے ؟ —— آخر کیا ھے وہ ! وہ تو بس اتنا جانتی تھی کہ یہ سب کچھ اُس کی برداشت سے باھر ھے ۔
اُس نے کہا " اچھا ، خدا حافظ —— امید ھے ویریاریس زائیٹس میں تمہارا وقت بہت اچھا کٹے گا "۔
اور اس طرح وہ اُسے چھت پر بیٹھا چھوڑ کر چلی گئی ۔
ھنیل نے اپنے دل میں کہا " شاید ۔ یہی ایک انگریز آدمی کی محبت ھے ۔ لیکن میں اسے برداشت نہیں کر سکتی " ۔

(٤)

" آئیے میرے ساتھ چل کے جائے پیجئے —— آئیے نا ! ابھی چلئے ۔ آج تو بڑی سخت سردی پڑ رھی ھے نا ؟ ھاں —— اچھا تو —— میرے ساتھ ھی چلئے اور ھم اپنی چھوٹی سی نشست گاہ میں خوب گرم گرم اور مزیدار چائے پئیں گے ۔ موسم کیا اچانک بدل جاتا ھے اور ایسے میں تو واقعی انسان کو کچھ نہ کچھ تقویت پہنچتی ھی رھنی چاھئے ۔ لیکن شاید آپ چائے نہیں پیتی ھیں ؟ "
"جی نہیں ، چائے تو میں پیتی ھوں ۔ انگلینڈ میں رھنے سے مجھے اس کی عادت ھوگئی ھے"۔ ھنیل نے جواب میں کہا ۔
" اچھا عادی ھوگئی ھیں ! کیا آپ انگلینڈ میں کافی دن رھی ھیں ؟"
" جی ، ھاں —— "
ان دونوں عورتوں کی ملاقات ڈومپلاتس میں ھوئی ۔ مسز ھیپ برن اُس وقت بالکل ھنیل

کی بنی ہوئی گڑیا ہی معلوم ہو رہی تھی ، اُس نے ایک اُڑی سی لکیروں والی عجیب و غریب شال لے رکھی تھی ، ایک چھوٹی گہرے سبز رنگ کی سکرٹ اور گول مٹول سی ٹوپی پہنی ہوئی تھی ۔ ہنیل تو اُس کے قریب کھڑی بہت ہی بڑی معلوم ہو رہی تھی ۔

"خیر، اب تو آپ آ کر ضرور میرے ساتھ چائے پیجئے ۔ دیکھئے، مہربانی کرکے ضرور آئیے۔ اس کی فکر نہ کیجئے کہ یہ بات مناسب ہے یا نہیں کیونکہ میں ہمیشہ وہی کرتی ہوں جس سے مجھے خوشی حاصل ہوتی ہو ۔ میرے خیال میں بعض دفعہ تو میرے خاوند کو بہت تعجب بھی ہوتا ہے ۔ لیکن کیا کریں یہ ہمارے بس کی بات نہیں ۔ مجھے ذرا بھی پسند نہیں کہ کوئی مجھ پر کسی قسم کی بھی پابندی عائد کرے " وہ پھر دل نشیں انداز میں ہنسی ۔ " اچھا ، تو اب آئیے ۔ دیکھیے ہیں شاید ہمیں کچھ گرم گرم کیک مل جائیں ۔ مجھے سردیوں میں، چائے کے ساتھ گرم کیک بہت پسند ہیں ۔ اُمید ہے آپ بھی پسند کریں گی ۔ خدا کرے اس وقت ہمیں کیک مل جائیں ۔ ابھی تو ہمیں یہ بھی پتہ نہیں کہ میں گھر بھی یا نہیں "۔ یہاں وہ پھر ہنس دی ۔" ممکن ہے میرے خاوند گھر پر ہوں یا نہ بھی ہوں ۔ لیکن اس سے آپ کو یا مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا ۔ ہے نا ؟ وہ لیجئے ساڑھے چار بج گئے ۔ انگلینڈ میں ہم ہمیشہ ساڑھے چار بجے چائے پیتے ہیں ۔ میرے خاوند کو چائے کا بہت شوق ہے ۔ شاید سال بھر میں ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوتا کہ ہمارا ملازم چائے کی گھنٹی ساڑھے چار کے پانچ منٹ بعد بجائے ۔ اگر کھانے میں دیر ہو جائے تو میرے خاوند کو ایسی پروا نہیں ہوتی ، لیکن اگر کہیں چائے میں دیر ہو تو پھر وہ گرم ہوجاتے ہیں"۔ اُس نے پھر قہقہہ لگایا ۔ "خیر ، مجھے اپنے خاوند کے متعلق ایسا نہیں کہنا چاہئیے۔ وہ تو بہت صابر اور رحم دل ہیں ۔ مجھے یاد ہی نہیں پڑتا کہ اُنہوں نے کبھی کوئی بے رحمی کا کام کیا ہو یا کبھی کوئی بے جا لفظ استعمال کیا ہو ۔ لیکن آج میں نہیں سمجھ سکی کہ وہ گھر پہ ہوں گے یا نہیں "۔

خیر کپتان ہوٹل میں موجود تھا ۔ وہ پاؤں پھیلائے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اوپر والی چھوٹی سی نشست گاہ میں کھڑا تھا ۔ جب اُس نے ہنیل کو اندر آتے ہوئے دیکھا تو بس بھنویں ذرا سی اُونچی کر لیں ۔

" اوہو ، کاؤنٹس ہنیل —— میری بیوی آپ کو ساتھ لے آئی ہیں ! بہت خوب بہت خوب ! لائیے میں بھی آپ کی شال پکڑ لوں ۔ لائیے ، لائیے ......"

" پیارے ، تم نے چائے کے لئے کہہ دیا ہے ؟" مسز ہیپ برن نے پوچھا ۔

" ایں —— ہاں ۔ میں نے اُن سے کہا تھا جیسے ہی آپ آئیں وہ چائے بھجوا دیں "۔

" اچھا ، اچھا ۔ پیارے ، اب پھر ذرا گھنٹی بجا کے اُن سے کہہ دو کہ چائے تین آدمیوں کے لئے بھیجیں"۔

" بہت اچھا —— ابھی کہے دیتا ہوں "۔

اُس نے گھنٹی بجائی اور اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر چائے کے انتظار میں کھڑا ہوگیا ۔

مسز ہیپ برن نے چائے دانی اُٹھائی تو اُس کے کڑے بج اُٹھے ، بڑی بڑی ہیرے کی انگوٹھیاں جھلملانے لگیں اور موتیوں کے لمبے لمبے بندے اُس کے مرجھائے ہوئے رخسار پر جھولنے لگے ۔ وہ کہنے لگی " کتنی اچھی بات ہے کہ کاؤنٹس زو —— کاؤنٹس رو ——"

وہ بول اُٹھا " راسیمٹلو ۔ میں سمجھتا ہوں بہت سے لوگ انہیں کاؤنٹس ہنیل کہہ دیتے ہیں ۔ کم از کم ہم تو ہمیشہ آپس میں بات کرتے ہوئے یہی کہا کرتے ہیں ۔ دکان کا ذکر کرتے وقت ہم کہتے ہیں کاؤنٹس ہنیل کی دکان "۔

" کاؤنٹس ہنیل کی دوکان ! دیکھئے کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے ۔ نام ہی سے رومانیت ٹپکتی ہے ۔ آپ بالائی لیں گی ؟"

" جی ، شکریہ "۔

چائے پر خوب گپ سپ رہی ۔ اس دوران میں مسز ھیپ برن چائے دانی کو آلٹتی پلٹتی رہی ۔ پہلے تو سپرٹ کا چولہا جلایا ۔ پھر پھونک مار کے بجھایا اور چائے دانی میں سے آٹھتی ہوئی بھاپ کے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن یہ پتہ نہ چل سکا کہ آس میں اور چائے ھے یا نہیں ـــ اور کہنے لگی ! " گھر پر تو مجھے یہ تک معلوم رہتا ھے کہ چائے دانی میں کتنے چمچے چائے ھے ۔ لیکن یہ چائے دانی ـــ میری تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس چیز کی بنی ہوئی ھے ـــ اتنا تو میں جانتی ہوں کہ یہ چاندی نہیں ھے ۔ یہ خود ھی اتنی بھاری ھے کہ مجھے اب تک کئی دفعہ دھوکا ہو چکا ھے ۔ اور میرے میاں کو تو چائے کی اسی حرص ھے ۔ اتنی حرص ھے کہ انہیں تو کم از کم تین پیالیاں چاھئیں ـــ یا اگر مل سکیں تو چار پانچ بھی چڑھا جاتے ہیں! ہاں ، پیارے ، آج چائے بہت ھے ۔ تمہیں پانچ پیالیاں مل سکتی ہیں بشرطیکہ آخری دو پیالیاں تم ذرا ہلکی چائے پی سکو ۔ لائیے ، کاؤنٹس ھنیل میں آپ کو پیالی پھر بھر دوں ۔ یقین جانئے آپ کا نام بہت ھی نفیس ھے "۔

کپتان بولا " ھیمل ایک ڈرامے کا بھی نام ھے ۔ کیوں ھے نا ؟"

جب وہ چائے کی پانچ پیالیاں ختم کر چکا اور آس کی بیوی نے ایک لمبے اور پتلے سے سفید ھولڈر میں سگرٹ پھنسا کے سلگا لیا اور اس طرح کش لگانے لگی کہ دور سے بالکل چھوٹی سی چینی کی عورت معلوم ہوتی تھی ۔ اس وقت ذرا دیر کے لئے خاموشی چھا گئی ۔

مسز ھیپ برن نے کہا " پیارے ایلک ، دیکھو ، تم کہیں میرا پیغام مسز ریکھم کو پہنچانا نہ بھولنا ۔ مجھے تو یہی ڈر ھے تم ضرور بھول جاؤ گے "۔

" نہیں پیاری ، میں بھولوں گا نہیں ۔ ارے ـــ تم کہو تو میں ابھی چلا جاؤں ؟"

ھمیل نے دیکھا کہ جب کبھی وہ اپنی بیوی سے بات کرتا ھے " ایں " کا لفظ بہت استعمال کرتا ھے ۔ لیکن یہ دونوں تو بڑے اچھے دوست تھے ۔

" دیکھو پیارے ، اگر تم وہ پیغام دے دو گے تو مجھے بڑا اطمینان سا ہوجائے گا لیکن تمہیں ذرا بھی جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ھے "۔

" خیر ، مجھے اب چلنا ھی چاھئے "۔

اور وہ چلا گیا ۔ مسز ھیپ برن نے اپنی مہمان کو روک لیا اور بولی :ـــ

" ان کا سلوک میرے ساتھ بہت ھی اچھا ھے ، بڑے ھی نفیس آدمی ہیں اور یہ ھمیشہ سے میرے ساتھ ایسے ھی ہیں ۔ اس لئے اگر ان سے کبھی کوئی غلطی ہو بھی جاتی ھے تو میں آس کا زیادہ برا نہیں مانتی ۔

" اچھا " ھمیل کو یوں لگا جیسے حیرت کے مارے آس کے کان پھیلے جا رہے ہوں ۔

" بس ساری مصیبت اس جنگ کی ھے ۔ اس نے مردوں کو بہت بگاڑا ھے "۔

" کس طرح ؟" ھنیل نے پوچھا ۔

" بھئی ، اخلاقی طور پہ ۔ حقیقت یہ ھے کہ مشکل سے کوئی ایک آدھ آدمی ھی ایسا ہوگا جو ویسا ھی شریف رہا ہو جیسا کہ جنگ سے پہلے تھا ۔ مردوں کی اخلاقی حالت بہت ھی پست ہوگئی ھے "۔

" اچھا ، یہ بات ھے "۔

" ہاں ، بالکل ۔ کیوں ، کیا جرمن آدمیوں اور سپاہیوں کا بھی یہی حشر نہیں ہوا ھے؟"

" جی ہاں ، شاید یہی کچھ ہوا ھے "۔ ھنیل نے جواب دیا ۔

" میں نے جو کچھ سنا ھے ۔ آس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ھے ۔ لیکن در اصل واقعہ تو یہ ھے کہ اس میں سراسر عورتوں کا قصور ھے ۔ ھم بے چاری عورتیں ! میں تو سمجھتی ہوں

ہماری پوری نسل ہی اس کی ذمہ دار ہے ۔ مگر مجھے طعنہ زنی کی عادت نہیں ۔ میں خود جانتی ہوں کہ ترغیب کا مقابلہ کرنا کتنا مشکل ہے ۔ میں بھی کبھی کبھار لگاوٹ بازی کر لیتی ہوں اور یقین مانئیے جب میں جوان تھی تو کوئی آدمی میرے جال سے بچ نہ سکتا تھا ۔ میرے جھکا تو بہت لگا لیکن جھلسی کبھی نہیں گئی ۔ میرے خاوند نے کبھی برا نہیں مانا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ میں اپنی حفاظت بخوبی کر سکتی ہوں ۔ اور بات یہ ہے کہ میں ہمیشہ اُن کی بڑی وفادار بیوی رہی ہوں لیکن اس کے باوجود میں سعلوں سے بہت قریب رہی "۔ یہ کہہ کر وہ پھر اپنے دل کش انداز میں ہنس دی ۔

ہم نے انگلیوں سے اپنے کان چھو کے دیکھے کہ کہیں گر تو نہیں گئے ۔

" در اصل لڑائی کے دوران میں تو بری حالت تھی ۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک ہسپتال کا تو یہ عالم تھا کہ اگر کوئی لڑکی شریف اور سیدھی سادی ہوتی تو وہاں اُس کا رہنا محال ہو جاتا تھا ۔ وہاں کی نرسیں اُسے وہاں سے نکال کے ہی دم لیتیں ۔ جب تک وہ لڑکی اُن ہی جیسے رنگ ڈھنگ اختیار نہ کر لیتی تب تک وہ اُسے رہنے نہ دیتیں اور آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میرا کیا مطلب ہے ۔ بالکل ویسی ہی حالت تھی جیسے بالزاک کی کہانی میں خانقاہ کی ---- مجھے یقین ہے آپ کو وہ کہانی یاد آگئی ہوگی "۔ اور اُس کا قہقہہ پھر گونج اُٹھا ۔

" لیکن جب اتنے مرد ہی نہ رہیں کہ ہر ایک کے حصے میں آ سکیں تو پھر اس کا لازمی نتیجہ ظاہر ہی ہے ! ہاں ، میری ایک دوست آئرلینڈ میں رہتی تھی ۔ وہ اور اُس کا خاوند ایک مثالی جوڑا تھے ۔ حقیقی دوست ۔ اور اس سے زیادہ اُن کی محبت کے لئے اور کیا بھی کیا جاسکتا ہے ؟ خیر تو جنگ کے دوران میں وہ میجر بن گیا اور وہ بے چاری اُس دن کی منتظر تھی جب وہ گھر واپس آئے گا اور پھر اکٹھے وہ کیسی خوشی کی زندگی گزاریں گے ۔ وہ بالکل میری طرح ہے ، اور خوش قسمتی کی بات ہے کہ اُس کے پاس تھوڑا سا روپیہ ہے ---- زیادہ دولت نہ سہی ---- لیکن ---- خیر ---- ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی ۔ ارے ہاں ، وہ بے چاری اُس دن کی منتظر تھی کہ جب وہ گھر واپس آئے گا اور پھر اکٹھے وہ کیسی خوشی کی زندگی گزاریں گے ۔ عجیب سپنوں کے تانے بانے بننے میں دن گزارتی رہی جیسا کہ ہم بد قسمت عورتوں کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے ۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ مرض کبھی دور نہ ہو گا "۔ وہ پھر کھلکھلا پڑی ۔ " لیکن ایسا نہ ہؤا ۔ قطعی نہ ہؤا "۔ یہ کہتے ہوئے مسز ہمبرن نے احتجاج کے طور پہ اپنے انگوٹھیوں سے لدے ہوئے ہاتھ کو جنبش دی ۔ یہ عجیب بات تھی کہ اُس کے ہاتھ بڑے خوب صورت اور سفید تھے اور چھوٹے سے گاؤن میں اُس کی گردن اور سینہ بھی بہت نرم ، سفید اور خوب صورت دکھائی دے رہا تھا اور گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی زنجیروں کی جھلملاہٹ خوب بہار دے رہی تھی ۔ پھر نہ جانے چہرے کی جھریوں نے اُس کی خوب صورتی کا کیوں اس طرح ستیاناس کر کے رکھ دیا تھا ؟ بہر حال یہ ایک حقیقت تھی ۔

" ہاں ، تو ایسا قطعی نہ ہوا " ۔ اس چھوٹی سی عورت نے پھر وہی جملہ کہا ۔ " وہ جب گھر آیا تو بالکل بدلا ہوا تھا ۔ اُس نے مجھے بتایا کہ میں سمجھ ہی نہ سکی کہ یہ وہی شخص ہے ۔ میں ایک چھوٹا سا واقعہ تمہیں سناتی ہوں جو معمولی سہی لیکن بڑا معنی خیز ہے ۔ وہ گھر واپس آ رہا تھا ۔ یہ فوج سے چھٹی مل جانے کے کچھ ہی عرصے بعد کا ذکر ہے ۔ وہ لندن سے گھر آنے والا تھا اور اُس نے اپنی بیوی سے جہاز پر آ کے ملنے کو کہا تھا اور اُسے جہاز کے بندرگاہ پر پہنچنے کا وقت وغیرہ بھی لکھا تھا ۔ خیر تو وہ بے چاری جہاز پر اُسے لینے گئی لیکن وہ نہ پہنچا ۔ وہ اس انتظار میں رہی کہ شاید وہ اپنے وقت پر نہ آنے کی کوئی اطلاع بھیجے گا ۔ اس لئے وہ دوسرے دن یہ بھی نہ کر سکی کہ پھر جہاز پر اُسے لینے

جاتی ۔ چنانچہ ہوا یہ کہ وہ اسی جہاز سے آ گیا ۔ جب وہ گھر پہنچا تو بیوی سے کہنے لگا " تم مجھے جہاز پر لینے کیوں نہیں آئیں ؟ " وہ بولی " کل جب میں گئی تو تم نہیں آئے " ۔ " تو پھر تم آج کیوں نہیں گئیں ؟ " ذرا سوچئے تو کتنی فضول سی بات تھی ! حالانکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو خوب سمجھتے تھے ۔ ایسی باتوں سے دل کتنا دکھتا ہے ؟ اس کی بیوی نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا " بھلا تم کل کیوں نہیں آئے ؟ " اور وہ بولا " مجھے شہر میں ایک عورت ملی جو مجھے پسند تھی ۔ اس نے مجھے ایک رات اپنے ساتھ رہنے کو کہا تو میں وہیں ٹھہر گیا " ۔ اب ذرا غور تو کیجئے ! کیا یہ چیز آپ کے تصور میں بھی آسکتی ہے ؟ "

" اف ، توبہ " ھنبل نے کہا " میں تو اسے بہت بے رحمی کی بات سمجھتی ہوں " ۔

" ہاں ، بالکل ! ایسی بات بیوی سے کہہ دینا کتنا ظلم ہے ! ذرا ہمت تو دیکھئے ! مگر، تو یہ حال ہے آج کل دنیا کا ۔ شکر ہے میرے خاوند ویسے نہیں ہیں ۔ میں یہ تو نہیں کہتی کہ ان میں کوئی برائی ہے ہی نہیں ۔ لیکن اور خواہ وہ کچھ بھی کریں لیکن ایسے بے رحم اور ظالم کبھی نہیں ہوسکتے۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولتے اور پھر ایسا ظلم --- توبہ توبہ ۔ شکر ہے یہ بات ان میں بالکل نہیں ہے ۔ اگر ہم میں سے کوئی برا ہے تو وہ میں ہی ہوں "۔ یہاں وہ پھر ہنس دی " آہ ! مگر وہ تو ہمیشہ میرے ساتھ بہت ہی اچھے رہے ہیں --- انہوں نے مجھ سے کبھی کوئی سخت بات نہیں کہی اور شادی کی رات تو انہوں نے میرے سامنے دو زانو ہو کر قسم کھائی تھی کہ مجھے زندگی بھر خوش رکھیں گے ۔ اور میری زندگی کو خوش گوار بنائے رکھنا ان کا واحد مقصد رہا ہے " ۔

چھوٹی سی عورت نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا چمک دار چہرہ کھڑکی کی طرف پھیر لیا ۔ وہ اس وقت بالکل کسی داستان کی ہیروئن بن رہی تھی ۔ ھنبل اسے ہیروئن کے روپ میں دیکھ رہی تھی جو خود اپنی زندگی کی داستان میں بڑا اہم کردار ادا کر رہی تھی ۔ تماشہ دیکھنے کا شوق تو عورتوں کی فطرت میں داخل ہے ، یہ چیز کسی عورت کو بری نہیں لگتی ۔

چھوٹی سی ہیروئن نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا " دراصل میں عورت زیادہ ہوں اور ماں کم ۔ مجھے اپنے دونوں بچوں سے بے حد محبت ہے ۔ میرا لڑکا ونچسٹر میں ہے اور میری چھوٹی لڑکی بریٹنی کے ایک کانونٹ میں پڑھتی ہے ۔ وہ دونوں بہت ہی پیارے بچے ہیں ۔ لیکن اپنے میاں کا خیال مجھے سب سے زیادہ ہے ۔ شاید میں بہت پرانی وضع کی عورت ہوں ۔ لیکن خیر ۔ یوں تو میں دوسرے مردوں کی خوبیاں بھی دیکھ سکتی ہوں ۔ ایک دفعہ میری ایک بہت ہی بانکے حوصلے آدمی سے ملاقات ہوئی ----- وہ ایک بہت ہوشیار انجینئر تھا ---- لیکن وہ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی صلاحیتوں کا مالک تھا — لیکن خیر چھوڑیئے اس قصے کو " ۔ یہاں اس چھوٹی ہیروئن نے کچھ اس انداز سے سانس لیا جیسے ہوا میں کوئی معطر چیز موجود ہو ۔ اپنے انگوٹھیوں بھرے ہاتھوں کو ملتے ہوئے بولی " خیر ۔ میں جانتی ہوں کہ یوں شعلے کے گرد منڈلانا کیا معنی رکھتا ہے ۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ میں خود آئرلینڈ کی رہنے والی ہوں اور ہم آئرلینڈ کے رہنے والے اس بات سے باز نہیں آسکتے — اور میں انگریز بننے کے لئے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں ہوں ۔ اور دیکھئے نا ۔ یہی ذرا سا تخیل جو میرے حصے میں آیا ہے .... " یہاں وہ پھر ذرا سا ہنس دی " یہی چیز ہے جس کی بدولت میں اپنے شوہر سے ہمدردی کر سکتی ہوں حالانکہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ ہمدردی کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتی ۔ اصل میں بات یہ ہے کہ جب وہ گھر میں میرے پاس رہتے تھے تو انہوں نے کبھی کسی دوسری عورت کی طرف دھیان ہی نہ

دیا تھا ۔ اور مجھے اعتراف ہے کہ بعض اوقات میں خود اُن کی وجہ سے اپنے آپ کو ذرا مجرم سا محسوس کرنے لگتی تھی ۔ لیکن خیر ! اتنا مجھے علم ہے کہ اُنھوں نے مجھ سے ملنے کے بعد کبھی کسی عورت کی طرف گرم جوشی کے ساتھ نظر نہیں ڈالی ۔ یہ تو میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں ۔ وہ خلیق بھی ہیں ، دل کش بھی اور ملنسار بھی ——— لیکن دوسری عورتیں اُنہیں گوشت پوست کی معلوم ہی نہ ہوتی تھیں وہ تو دوسرے لوگوں کی طرح محض ملاقاتیوں کی حیثیت رکھتی تھیں ۔ اور بس ۔ مجھے تو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ بعض دفعہ کوئی بہت ہی خوب صورت سی عورت اگر مل جاتی کہ جسے دیکھتے ہی میں ایک لمحے میں اُس پر فریفتہ ہو جاتی ——— اور حالانکہ وہ بڑے دل کش اور دلچسپ انداز میں اُس سے باتیں کرتے ، اُس کی سب خوبیوں کو پوری طرح سمجھتے ، لیکن وہ اُسے کسی خوب صورت پھول دان یا مصور کے شاہکار سے زیادہ وقعت نہ دیتے گویا وہ گوشت پوست کی نہ ہوں ۔ ایسے میں ظاہر ہے انسان اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ محفوظ سمجھتا ہے ۔ شاید تھوڑی بہت رقابت ضروری ہے ، اس مسالے کی ایک چٹکی مزہ دے جاتی ہے ۔ اور اپنی سترہ سالہ شادی شدہ زندگی میں مجھے ایک دن بھی اس جذبے سے سابقہ نہیں پڑا ۔ چنانچہ جب میں نے یہاں اُڑتی اُڑاتی ایک خبر سنی تو مجھے بہت خوشی ہوئی کیوں کہ مجھے یوں معلوم ہوا کہ اس طرح میں اپنی چھوٹی چھوٹی لغزشوں سے بری الذمہ ہو گئی ۔ اور مجھے ایسا لگا کہ اب وہ زیادہ انسانی سطح پر آ گئے ہیں کیوں کہ آخر محبت کرنا تو انسانی فطرت کا تقاضا ہے خصوصاً اگر کوئی خود بھی خوب صورت ہو اور پھر مدت سے اکیلا کسی خوب صورت عورت کی صحبت میں وقت گذار رہا ہو تو ایسا ہو جانا لازمی ہے "۔

ہنسل تعجب سے اپنی آنکھیں پھاڑے اور کان کھولے اگلے انکشاف کی منتظر بیٹھی تھی اور یہ سوچ کر کہ اسے بھی کوئی بات ضرور کہنی چاہئے وہ بولی :۔

" جی ہاں ، درست "۔

" ہاں ، ہاں " مسز ہیپ برن نے کڑی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا " چنانچہ میں نے سوچا کہ خود ہی چل کر کیوں نہ دیکھوں کہ معاملہ کہاں تک پہنچ چکا ہے میرے کان میں تو بس اس بات کی ذرا سی بھنک پڑی تھی ۔ مجھے نام وغیرہ کا تو کچھ پتہ ہی نہ تھا ۔ بس اتنا اشارہ ملا تھا کہ وہ ملک جرمنی کی ایک پناہ گزین عورت ہے اور نوابی خاندان سے تعلق رکھتی ہے ——— اور یہ بھی سنا تھا کہ میرے خاوند اکثر سٹوڈیو آیا جایا کرتے تھے " ۔ چھوٹی سی عورت نے پھر ہنسل کو گھورا اور بے اختیار ہنس دی ۔ وہ گھبراہٹ اور بے چینی کے انداز میں اپنے ہاتھ ملنے لگی ۔ ہیپل کا ذہن بالکل خالی تھا ۔ وہ مبہوت بیٹھی تھی ۔

مسز ہیپ برن نے اپنی بات جاری رکھی " بس ، تو اتنا ہی کافی تھا ۔ مجھے ایک معقول اشارہ مل چکا تھا ۔ لہذا جب میں سٹوڈیو میں پہنچی تو میری نیت ایسی صاف نہ تھی جیسی کہ میں نے ظاہر کی تھی اور گڑیوں سے زیادہ مجھے کچھ اور ہی دیکھنے اور معلوم کرنے کی خواہش تھی ۔ لیکن جب آپ نے اُن کا گڈا دکھایا تب میں سمجھ گئی ۔ اس کے بعد مجھے کوئی شبہ نہ رہا اور مجھے فوراً پتہ چل گیا کہ وہ اُن سے محبت کرتی ہے ۔ وہ بوکھلا گئی تھی اور اُسے پتہ بھی نہ تھا کہ میں کون ہوں ۔ آپ نے مجھے وہ گڈا دکھا کے بہت ہی ظلم کیا ۔ ظاہر ہے کہ آپ بھی تو نہ جانتی تھیں کہ یہ آپ کسے دکھا رہی ہیں ۔ لیکن اُس کے لئے ، اُس بے چاری کے لئے تو یہ بڑا سخت امتحان تھا ۔ میں سمجھ گئی کہ اُسے سخت تکلیف پہنچ رہی ہے ۔ خیر ، اس میں شک نہیں کہ وہ بڑی خوب صورت ہے ——— بہت ہی خوب صورت ہے ۔

سنہری سنہری جلد ، لال انگارہ جیسی آنکھیں اور وہ حسین چال ۔ پھر اُس کی طبیعت میں کتنی بے ساختگی اور سادہ دلی ہے ۔ ذرا سی دیر میں سب کچھ اُگل کے رکھ دیتی ہے ۔ اس کے علاوہ اُس کی سنہری آواز —— جی ہاں —— جی ، مہربانی فرما کر —— کیا بچپن ہے ان باتوں میں اُس کے سر کی خوب صورت وضع ، اُس کی سادگی اور شاندار لباس سے امارت ٹپکتی ہے ۔ اور مجھے معلوم تھا کہ اگر میں اپنے شوہر کے پاس نہ ہوتی تو وہ اسی قسم کی لڑکی کی طرف مائل ہوں گے ۔ میں نے اس بارے میں کئی مرتبہ سوچا تھا ۔ مجھے بہت دفعہ یہی خیال آتا تھا ۔ اگر عورت مرد سے عمر میں بڑی ہو تو اُسے یہ سوچ بخار لگی ہی رہتی ہے خصوصاً جب اُس کے مرد میں بہت سی خوبیاں بھی موجود ہوں —— جب کبھی مجھے یہ خیال آتا تھا کہ وہ میری غیر موجودگی میں کس قسم کی عورت سے محبت کریں گے تو میرا تخیل ہمیشہ سپین کی صورت میرے سامنے پیش کر دیتا تھا اور اس پیریس کی صورت شکل بالکل اسپین والوں کی سی لگتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے اُس کے بزرگ ضرور کسی شریف اسپین خاندان سے تعلق رکھتے ہوں گے ۔ آپ کا کیا خیال ہے ؟ ''

ھنیل نے جواب دیا '' جی ہاں ۔ آسٹریا میں بھی تو بہت سے اسپین کے لوگ موجود تھے اور اُن کے شہنشاہوں کے ساتھ رہ چکے ہیں '' ۔

'' چارلس پنجم کے ساتھ بھی تو وہی تھے ۔ ہاں ، بالکل ٹھیک ہے ۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا ۔ یہی وجہ ہے کہ پیریس میں اسپین والوں کی سی خوب صورتی اور جرمن والوں کے سے جذبات سمٹ آئے ہیں ۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھ میں وسیا تکبر اور کم آمیزی نہیں ہے ۔ لیکن وہ تو بے حد حسین ہے اور ایسی ہستی سے میں کبھی نفرت نہیں کر سکتی ۔ کوشش بھی کروں تو ایسا نہیں کر سکتی ۔ اور میں ایسی کوشش بھی نہ کروں گی ۔ لیکن میرے خاوند کا اُس سے زیادہ ملنا جلنا خطرے سے خالی نہیں ۔ کیوں ، اس بات پر تو آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گی نا ؟ ''

'' اوہ ، مگر '' ھنیل لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بولی '' در اصل ، اس واقعے میں ذرا بھی صداقت نہیں '' ۔

'' اچھا '' چھوٹی عورت نے اپنا سر ٹیڑھا کرتے ہوئے کہا '' خیر ، میں نہیں چاہتی کہ اب یہ معاملہ اور بڑھے '' ۔

اس کے بعد ایک لمحے کے لئے مکمل خاموشی چھا گئی — دونوں عورتیں سوچ میں غرق تھیں ۔ ھنیل دل میں سوچ رہی تھی کہ کہیں یہ عورت مجھے بیوقوف تو نہیں بنا رہی ہے ۔

مسز ھسٹرن نے پھر بات شروع کی ''خیر ، چنگاری تو موجود ہے اور میں نہیں چاہتی کہ یہ آگ پھیلے — میں خود بہت احتیاط سے کام لوں گی نا کہ کہیں یہ شعلے بھڑک نہ اُٹھیں ۔ میری تمام تر کوشش یہی ہو گی کہ میرے خاوند کا تماشہ بن کے نہ رہ جائے کیونکہ یہ چیز تو یقیناً بہت ہولناک ہوگی ''۔

'' جی ہاں '' ھنیل نے بھی ہاں میں ہاں ملائی ۔

'' میں بڑا سوچ سمجھ کے قدم اُٹھا رہی ہوں ۔ کیا آپ کے خیال میں اس واقعے کی کوئی حقیقت نہیں — اُن میں اور پیرینس میں کوئی خاص تعلق نہیں ؟ ''

'' نہیں ، نہیں — مجھے یقین ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے '' ۔ ھنیل نے بڑے پُروثوق لہجے میں کہا اُسے غصہ آ رہا تھا کہ اس عورت نے اپنے شبہات میں بھی مجھے نظر انداز کر دیا ۔

'' ہوں ! —— ہاں ! '' چھوٹی عورت بڑے عقلمندانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش

دیتے ہوئے بولی" مجھے اس بات کا پورا یقین نہیں ہے! مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ یہ معاملہ ابھی زیادہ دور تک نہیں پہنچا ہے "۔

" اجی، نہیں! " اس بار ھنیل نے چڑ کے احتجاج کے طور پہ کہا۔

" خیر، بہر حال، میں اسے اور زیادہ بڑھنے نہیں دینا چاہتی "۔

کچھ دیر تک بالکل موت کی سی خاموشی طاری رہی۔

" خیر اس کی حقیقت آپ جو کہتی ہیں اس سے یقیناً زیادہ ہے۔ جیسا آپ بتا رہی ہیں اس سے کہیں زیادہ ہے "۔ چھوٹی عورت نے سوچتے ہوئے کہا " ایک بات تو یہ ہے کہ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ ان کی پیشانی سے کچھ پریشانی سی جھلکتی ہے۔ اور یہ پریشانی ایک لمحے کو بھی دور نہیں ہوئی۔ اور جب میں نے بتایا کہ میں سٹوڈیو گئی تھی اور انہیں وہ گدی کا غلاف دکھایا تو مجھے پتہ چل گیا تھا کہ ان کا ضمیر انہیں ملامت کر رہا ہے۔ مجھے ایسی آسانی سے دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔ میرے خیال میں ہم آئرلینڈ والوں کی ایک تاروی بصارت ہوتی ہے۔ خیر، ویسے میں نے ابھی ان سے سلانہ تو کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ یہاں تک کہ میں نے اس گدے کا بھی ذکر نہیں کیا۔ اچھا یہ بتائیے کہ اس گدے کو بنانے کا آرڈر کس نے دیا تھا؟ آپ کو مجھے یہ بتانے میں کوئی تامل تو نہ ہوگا "۔

" نہیں، اس گدے کا آرڈر نہیں دیا گیا تھا "۔ ھنیل نے اعتراف کیا۔

مسز ھمپ ہرن اپنی انگلی اٹھاتے ہوئے بولی " آ ہا —— میرا بھی یہی خیال تھا —— یہی خیال تھا میرا بھی! کم از کم اتنا تو مجھے معلوم ہے کہ کسی غیر شخص نے اس کا آرڈر نہیں دیا ہوگا۔ واقعی مجھے یہ معلوم تھا "۔ اور وہ خود ہی مسکرا دی۔ پھر وہ بولی " اسی لئے میں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ مجھے زخم کریدنے کا ذرا بھی شوق نہیں۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ بڑی نرمی سے زخم پر پھاھا رکھ کے اسے اچھا ہونے دیا جائے۔ لیکن خیر میں نے ان سے یہ کہا تھا کہ وہ ہے بڑی حسین عورت "۔ چھوٹی سی عورت نے بڑی شناسائی سے ھنیل کی طرف دیکھا۔

" اچھا " ھنیل نے کہا۔

" ہاں، اور میرے خاوند کا انداز کچھ مبہم سا ہی رہا۔ وہ کہنے لگے ' ہاں ' بری نہیں، میں نے دل میں سوچا کہ حضرت، آپ " بری نہیں " کہہ کر مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ وہ عورت بری، تو کیا بہت ہی اچھی ہے اور یہی میں نے پھر ان سے بھی کہا۔ دراصل میرا یہ جی چاہتا تھا کہ کسی طرح انہیں پتہ چل جائے کہ مجھے ان پر شبہ ہے "۔

" اور آپ کا خیال ہے وہ سمجھ گئے ہوں گے؟ "

" ہاں، بے شک۔ ضرور سمجھ گئے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایسی عورت کا ایسے شہر میں رہنا جہاں بہت سے شادی شدہ اور کنوارے اجنبی لوگ موجود ہوں بہت خطرناک بات ہے۔ یہ سننا تھا کہ ان کا بھانڈا پھوٹ گیا اور سب کچھ مجھ پر واضح ہو گیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا " کیوں؟ " ان کی آواز میں مجھے بڑی تلخی اور اجنبیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ جناب وہ وقت آ پہنچا ہے کہ آپ کو اس خطرے سے دور ہٹا لیا جائے لیکن ان سے میں نے صرف اتنا کہا کہ کسی نہ کسی مرد کو ضرور اس سے محبت ہو جائے گی۔ لیکن انہوں نے جواب دیا ' نہیں ' ایسا نہیں ہو گا کیونکہ وہ تو صرف اپنے ہم وطن لوگوں کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ میں نے کہا " اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی کے باوجود یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان دونوں کو شہر میں رہنے کی اجازت دے دی گئی ہے "۔ یہ سن کر وہ بڑے غصے سے بولے " غضب خدا کا! کیا تم محض اس لئے انہیں شہر سے

نکال دینا چاہتی ہو کہ وہ خوب صورت ہیں ۔ حالانکہ اُن کے پاس کوئی اور جگہ نہیں جہاں وہ جا سکیں اور جہاں وہ اس شہر کی طرح اپنی گذر اوقات کے لئے پیسے کما سکیں ؟ " یقین کیجئے ہماری شادی کو اتنا عرصہ گذرا ہے انہوں نے آج تک مجھ سے اپنے غصے اور سخت لہجے میں بات نہیں کی تھی ۔ میں نے آہستہ سے صرف اتنا کہا " میں تو صرف اپنے آدمیوں کے بچاؤ کی خاطر کہہ رہی تھی "۔ اس کا اُنہوں نے پھر کوئی جواب نہ دیا لیکن میری طرف ذرا کڑوی نظروں سے دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے "۔

خاموشی پھر مسلط ہوگئی ۔ ہنیل گود میں ہاتھ رکھے اور باتیں سننے کے انتظار میں بیٹھی رہی اور مسز ھیپ برن بھی اپنے دونوں ہاتھ گود میں رکھے کچھ سوچ رہی تھی ۔ اُس کا چہرہ بہت ہی پیلا اور مرجھایا سا دکھائی دے رہا تھا ۔

وہ پھر ذرا ہوشیار ہوتے ہوئے بولی " خیر ، تو اب ہمیں کرنا کیا چاہئے ؟ میرا مطلب ہے ، اب کیا قدم اٹھایا جائے ؟ آپ بیرینس کی عزیز ترین سہیلی ہیں اور میں اُنہیں کسی قسم کا نقصان پہنچانا نہیں چاہتی " ۔

" ہم کر کیا سکتے ہیں ؟ " ہنیل نے اُس کے ذرا رکنے پر پوچھا ۔

چھوٹی عورت نے کہا " میں کافی عرصے سے اپنے خاوند پر زور دے رہی ہوں کہ وہ فوج سے مستعفی ہو جائیں ۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ تین مہینے کے عرصے میں فارغ ہو سکتے ہیں ۔ لیکن بہت سے دوسرے مردوں کی طرح اُن کی بھی اپنی کوئی آمدنی نہیں ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ دوسرے کے دست نگر ہو کر رہیں ۔ کتنی فضول سی بات ہے ! اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ میں فوج میں رہنا چاہتا ہوں ۔ اب سے پہلے کبھی اُنہوں نے کوئی کام میری مرضی کے خلاف نہیں کیا " ۔

ہنیل بولی " لیکن ایک مرد کا خود مختار ہو کے رہنا تو بڑی اچھی بات ہے " ۔

" ہاں ، یہ تو مجھے معلوم ہے ۔ لیکن اپنے وطن چل کے رہنا بھی تو اُن کے لئے بہتر ہوگا وہاں کسی نہ کسی محکمے میں ، میں اُنہیں ملازمت دلوا سکتی ہوں ۔ یوں تو اُن کو وہاں محکمہ موسمیات میں بھی نوکری مل سکتی ہے " ۔

ہنیل نے اب کوئی جواب نہ دیا ۔

مسز ھیپ برن کہنے لگی " ہاں ، البتہ یہ ہے کہ اگر اُن کو یہیں رہنا ہو تو یہ بہتر بھی ہوگا کہ بیرینس اس شہر سے چلی جائے " ۔

ہنیل نے کہا " مجھے یقین ہے کہ اپنی مرضی سے تو وہ کبھی اس شہر سے نہ جائے گی "

" ہاں ، میرا اپنا بھی یہی خیال ہے ، لیکن آپسے یہ بھی سمجھایا جا سکتا ہے کہ اگر وہ اپنی مرضی سے یہ شہر چھوڑ دے تو زیادہ مناسب ہوگا " ۔

" کیوں ؟ " ہنیل نے دریافت کیا ۔

" وہ اس لئے کہ ممکن ہے کسی دن برطانوی افسر آسے یہاں سے باہر نکال دیں " ۔

" آخر وہ کیوں نکال دیں گے ؟ " ہنیل نے پھر پوچھا ۔

" میرے خیال میں جو عورتیں ہمارے مردوں کو خراب کریں اُنہیں ضرور یہاں سے نکال دینا چاہئے " ۔

" لیکن وہ تو آپ کے مردوں کو خراب نہیں کر رہی ہے " ۔

" خیر ، اس معاملے میں میری ذاتی رائے زیادہ اہم ہے " ۔

چنانچہ گفتگو یہاں پہنچ کے قطعی رک گئی ۔

"معاف کیجئے ، میں نے آپ کو بہت دیر تک اپنی باتوں میں لگائے رکھا ہے ۔ دراصل

سی سب باتیں آپ پر اچھی طرح واضح کر دینا چاہتی تھی - جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں مجھے بیرینس سے کوئی پرخاش نہیں - لیکن اس کے باوجود میں اس معاملے کو آگے بڑھنے نہیں دینا چاہتی - خدا جانے اس کا تصفیہ کب تک ہو سکے گا خیر اگر میں نے اپنے خاوند کو استعفیٰ دینے اور انگلینڈ واپس چلنے پر راضی کر لیا تو پھر سب آسان ہو گا ----- بہرحال دیکھیں ، کیا بنتا ہے - یقین مانئے میں ایسی عورت نہیں کہ دل میں کینہ رکھوں " -

جس لہجے میں اس نے یہ بات کہی اس میں خوفناک دھمکی کا انداز موجود تھا -

ھنیل کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی -

اس کی مہربان نے ایک چھوٹا سا جالی کا رومال نکال کے بڑی نفاست سے اپنی ناک کو چھوا اور چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے بولی " کیا یہ ممکن ہے کہ وہ گدا مجھے مل جائے -- آپ جانتی ہیں وہ --- ؟ "

" وہ --- ؟ "

" جی ہاں ، وہ میرے خاوند کا " --- چھوٹی عورت نے رومال سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے کہا -

ھنیل بولی " اس کی قیمت تین گنی ہے " -

" ارے ، سچ مچ ! " - لہجے میں بڑی سرد مہری تھی - " میرے خیال میں تو وہ بیچنے کے لئے نہیں بنایا گیا تھا " -

ھنیل نے اپنی شال اٹھا لی -

" آپ گدا مجھے گھر بھجوا دیں گی نا ؟ --- آپ کی بڑی عنایت ہوگی " -

" پہلے مجھے اپنی سہیلی سے پوچھنا ہوگا " -

" ہاں ، بے شک - لیکن مجھے یقین ہے وہ ضرور اتنی فراخ دل ہوں گی کہ گدا مجھے بھجوا دیں - ورنہ آپ جانیں یہ تو بڑی نا مناسب سی بات ہوگی ! "

" جی نہیں ، کوئی ایسی نامناسب بات تو نہیں ہے - آخر وہ محض ایک تصویر ہی تو ہے " -

" اچھا - کیا آپ کا یہ خیال ہے ؟ " اس کی میزبان رکھائی سے بولی " بہر حال ، خواہ تصویر ہی ہو ، اسے بھی میں اپنی ملکیت میں رکھنا زیادہ پسند کروں گی - یہ گدا تو -- "

ھنیل منتظر رہی لیکن بات ختم ہی نہیں ہو رہی تھی آخر اس نے خود ہی کہا :-

" خیر ، تو اس کی قیمت تین گنی ہے یا اتنے پیسے جرمن سکے میں ادا کر دیجئے " -

" بہت اچھا " چھوٹی عورت بولی " گدا مل جانے پر میں تین گنی آپ کو بھیج دوں گی " -

(۵)

ھنیل سوچ میں ڈوبی گھر کی طرف چل دی - مرد کبھی اتنا حقیر اور ذلیل نہیں ہوتا جتنا کہ اس کی بیوی ' میرا خاوند ' کہہ کہہ کر بنا دیتی ہے - چنانچہ اگر کوئی عورت اپنے خاوند کو کسی دوسری عورت کے پنجے سے چھڑانا چاہتی ہے تو اس کا آسان طریقہ یہی ہے کہ وہ اس عورت کو چائے پر بلا کے اپنے خاوند کا تذکرہ بڑے خلوص سے کچھ یوں شروع کرے " آپ جانتی ہیں میرے خاوند " ہر مرد کسی نہ کسی زمانے میں کوئی احمقانہ حرکت کر چکا ہوتا ہے - جسے کوئی عورت فراموش نہیں کرتی اور زیادہ تر عورتیں بڑے دلگداز پیرائے میں اس حرکت کا ذکر دوسری عورتوں سے کرتی ہیں - مثال کے طور پر ایلک کا وہ نقشہ کہ اس نے شادی کی رات اپنی بیوی کے قدموں میں بیٹھ کے یہ قسم کھائی کہ میں اپنی ساری زندگی

تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا — ہنیل کو جب کبھی اپنے پیارے کپتان کا خیال آتا یہ منظر بار بار اس کے ذہن پر چھا جاتی ۔ کپتان کے حق میں اس کے نتائج بڑے افسوس ناک نکلے۔ ہاں ، البتہ اگر کپتان نے یہی قسم خود اس کے قدموں میں بیٹھ کے کھائی ہوتی تو یہ حرکت ہنیل کو بالکل فطری معلوم ہوتی ۔ وہ اسے محبت کے اظہار کا ایک نہایت لازمی حصہ گردانتی ۔ لیکن ایک دوسری اور چھوٹی سی عورت کے قدموں میں ! اور اس شادی کی رات کو ! نہ جانے اس چھوٹی عورت نے اس وقت کیسا لباس پہن رکھا ہو گا ؟ ہنیل سوچتی ، خدا نہ کرے اس نے ریشمی نرم و نازک پھول دار کپڑے کا کوئی چھوٹا سا فراک پہنا ہو ۔ اس لباس میں وہ چھوٹی عورت کیسی عجیب لگتی ہوگی ! ممکن ہے اس چھوٹے فراک کے ساتھ اس نے ... ٹوپی پہن رکھی ہو اور اس کا میاں تو شاید صرف قمیص اور پتلون میں ہی ہو! اف خدایا ، لوگ بھی کیسے احمق ہوتے ہیں ۔ نہیں نہیں ، خدا کرے اس نے شام کا پورا لباس پہن رکھا ہو ... بیس سال پہلے والا — بہت ہی کھلے گلے کا فراک ، چوڑے دامن ، پیچھے کی طرف خوب چنٹیں ، تھوڑا سا نیچے لٹکتا ہوا ، اونچے اونچے بالوں میں ایک پر اڑسا ہوا ، پھر قیمتی جواہرات اور موتی ۔ اور کپتان نے کھانے کا کوٹ اور سفید واسکٹ پہن رکھی ہو گی اور وہ شاید لوکانو یا بیارٹز کے کسی ہوٹل کے کمرے میں ہوں گے ۔ اور وہ عورت ؟ کیا وہ اپنا چھوٹا سا ہاتھ کپتان کے کندھے پر رکھے کھڑی تھی ؟ یا وہ خواب گاہ میں صوفے پر بیٹھی تھی ؟ اف ، کیسا بھیانک خیال تھا ، تاہم یہ منظر تھا انتہائی ناگزیر ۔ ہنیل کو ابھی شادی کا تجربہ نہ تھا لیکن وہ خود بھی اس واقعے کے امکان سے اتنی قریب آ چکی تھی کہ وہ خوب سمجھتی تھی ایسا منظر یقیناً ناگزیر تھا ۔ سہاگ رات کا ایک لازمی حصہ ۔ اور مرد گھٹنوں کے بل ایڑیاں اوپر اٹھائے جھکا ہوا ہے !

اس کے بال کیسے سیاہ اور صاف ستھرے ہوں گے ! اور کنپٹیوں پر کوئی سفید بال نہ ہو گا ۔ بڑا خوب صورت دولہا بنا ہوگا وہ ۔ شاید کوٹ کے کاج میں سفید گلاب کا پھول بھی ہو ۔ ہنیل اسے گھٹنوں کے بل بیٹھے سفید مڑا ہوا کالر لگائے اور نئی کالی پتلون پہنے اچھی طرح تصور کر سکتی تھی ۔ اسے سر جھکائے دیکھ سکتی تھی اور وہ کپتان کو اپنی سریلی اور لرزتی آواز میں یہ کہتے ہوئے سن رہی تھی ”خدا نے چاہا تو میں تمہیں زندگی بھر خوش رکھوں گا ۔ اب میری زندگی کا واحد مقصد صرف تمہیں خوش رکھنا ہی ہو گا“۔ اور پھر اس چھوٹی عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہوں گے اور اس نے بڑی شان سے کہا ہوگا ”پیارے تمہارا شکریہ ۔ مجھے تمہاری بات کا پورا یقین ہے“۔

اف ! اف ! شوہروں کی یہ باتیں تو ان کی بیویوں تک ہی رہنی چاہئیں اور بیویوں کی باتیں ان کے شوہروں تک محدود ہونی چاہئیں ۔ اور کسی اجنبی کو ایسے احمقانہ اور عجیب و غریب سے ازدواجی تماشوں میں مخل نہیں ہونا چاہئے۔ ہنیل نے سوچا نہیں ، یہ منظر تو ضرور پیش آیا ہو گا ۔ یہ بالکل حقیقی چیز تھی اور اس منظر میں جو مرد تھا اس کے ساتھ مجھے محبت رہ چکی ہے ! اس چھوٹی عورت کے گرویدہ شوہر کے ساتھ ۔ آہ خدایا ، یہ کس طرح ممکن ہوا ! وہ گھٹنوں کے بل ، اپنے گھٹنوں کے بل ، ایڑیاں اٹھائے کبھی اس کے سامنے جھکا ہوا ہوگا !

اس نے اپنے دل میں سوچا کیا میں بالکل بے وقوف ہوں ؟ نری احمق جسے اس کی محبت نے اندھا کر دیا ہے ؟ یہ مجھ سے کیوں کر ہوا ؟ کس طرح ہوا ؟ وہ کس انداز سے اپنی بیوی کے ساتھ باتیں کرتا ہے ! ”اچھا ، پیاری !“ کس طرح وہ اپنی بیوی کا کہنا مانتا ہے ! وہ اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے کس طریقے سے کمرے میں پھرتا ہے ! اور پھر اپنی بیوی کے کہنے پر چل دیتا ہے کیونکہ وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتی ہے ۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اسے مجھ سے باتیں کرنی ہیں اور یہ بھی اسے معلوم ہے کہ وہ مجھ سے کیا کہنا

چاہتی ہے ۔ اس کے باوجود وہ بغیر حیل و حجت کے چل دیا ، بالکل ایک نوکر کی طرح ۔ ''پیاری ، جو کچھ تم چاہتی ہو میں وہی کروں گا ''۔ اُس نے یہ الفاظ بار بار اس چھوٹی عورت سے کہے ہوں گے اور اُن پر عمل بھی کیا ہو گا ۔ اپنے تمام وعدے اور قسمیں پوری کی ہوں گی ۔

اُف خدایا ! ھنیل کف افسوس ملنے لگی ۔ وہ ایسے شخص کے ساتھ کیسے الجھ گئی ۔ وہ اُسے مردانگی کا مجسمہ معلوم ہؤا تھا ۔ اُس میں مردانہ گرم جوشی کا خاموش طوفان سمٹا ہؤا نظر آتا تھا ۔ مگر ...... وہ ..... وہ چھوٹی عورت کیا کہتی تھی بھلا ؟ '' میرے خاوند کا ھدسنہ میرے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک رہا ہے ''۔ بھلا سوچو تو ! پھر وہ گھٹنوں کے بل بھی اُس کے سامنے جھکا تھا اور اُس کا یہ کہنا '' اچھا پیاری ! بہت اچھا ''۔ وہ تو یہی کہ وہ اس چھوٹی عورت سے ڈرتا تھا ۔ یہ بات تو نہ تھی ۔ اُس نے تو بس اپنے آپ کو اس عورت کے سپرد کر دیا تھا ۔

کیا اب تک اُس نے یہ حساب ہی دیکھا تھا کہ مجھے اس آدمی سے محبت ہے ؟ آہ ، کاش اُسے محبت نہ ہوئی ہوتی ۔ کاش اُس نے یوں اپنے آپ کو کپتان کے حوالے نہ کر دیا ہوتا ۔ اُس کے حوالے ! — اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دیا ! — اور کتنے دلدل طریقے سے اُس کے الفاظ اور جذبات پر لٹو ہو گئی اور اُسے بالکل دیوتا سمجھنے لگی اور وہ واقعی ھنیل کو ایسا ہی لگا تھا ۔ ایک خاموش دیوتا ۔ اور نہ جانے وہ اُسے کیا کیا سمجھتی تھی ۔

یہ آخر سب ہوا کیسے ؟ اُسے کیا ہوگیا تھا ؟ کیا وہ اُس کی خوب صورتی پر مرمٹی تھی ؟ نہیں ، یہ بات نہیں تھی ۔ کپتان کا حسن ایسا تھا کہ جس کی ھنیل کو خاص پروا نہیں تھی ۔ اُس میں ضرور کوئی کشش ہوگی ۔ ضرور کوئی کشش ہو گی ۔ ہاں ، اُس کی کشش ہی تھی جس نے ھنیل کا دل موہ لیا تھا ۔

لیکن اب جس روز سے اُس کی بیوی وہاں آپہنچی تھی اُس دن سے کپتان کی کشش کا ھنیل پر کوئی اثر نہ ہؤا تھا ۔ اُس روز سے تو کپتان اُسے بہت برا لگنے لگا تھا — بہت برا ، احمق — گدھا ، بہت ہی معمولی صلاحیتوں کا مبتذل سا آدمی ۔ جب کپتان کا جادو ھنیل پر نہ چلا تو اُس کی نظر میں کپتان کی یہی وقعت رہ جاتی تھی ۔ بہت ہی معمولی صلاحیتوں کا مبتذل آدمی ۔ اور اس منافع خوروں اور اکثر باز مبتذل لوگوں کی دنیا میں اس سے بری بات اور کیا ہو سکتی تھی ۔ ایک معمولی حقیر اور بننے والا آدمی ! اُس چھوٹی عورت کا خاوند ! او خدایا ، وہ ایسے شخص کے ساتھ اتنی بری طرح الجھ کے رہ گئی تھی ! بہر حال ، وہ اپنی بیوی کے پہنچنے کے دن سے لے کر اب تک اُس سے تنہائی میں بات نہ کر سکا تھا ۔ بہت ممکن ہے کہ اب وہ پھر کبھی اکیلے میں اُس سے بات نہ کرے ۔ ھنیل کی اپنی دعا بھی تھی کہ خدا کرے اب وہ کبھی مجھ سے بات نہ کرے ۔ وہ گھناؤنی بات اب ماضی کا واقعہ ہو کر رہ گئی تھی وہ ماضی جو کپتان اور اُس کے درمیان مشترک تھا ۔ وہ اُس کے خیال سے ہی کانپ اُٹھی ۔ چھوٹی عورت کا خاوند !

لیکن یقیناً اُس کی کوئی نہ کوئی وجہ تھی ضرور ۔ کشش ، محض ایک سحر ۔ اُس میں کوئی کشش ضرور تھی ۔ اُف خدایا جب اُس طاقت کا اثر زائل ہو گیا ! اور اب جہاں تک ھنیل کا تعلق تھا اس وقت یہ جادو بلکلخت ختم ہو گیا تھا ۔ اور ھنیل کو اپنے منہ میں زہر گھلا ہؤا محسوس ہو رہا تھا ۔ آخر اس سب کے معنی کیا تھے ؟

آخر اُس کی کشش تھی کیا ؟ اور خود ھنیل پر یہ اثر انداز کیوں کر ہوئی ؟ اب اُس نے کپتان کو اُس کے بہترین روپ میں دیکھنے کی پھر سے کوشش شروع کر دی ھنیل نے

اُس وقت کا تصور باندھا جب وہ چھت پر ستاروں کے قریب دونوں اکیلے ہوتے تھے - کپتان کا کمرہ ! بڑی بڑی سفیدی سے پتی ہوئی دیواریں ، تمباکو کی خوشبو کا پہلی بار آنا ، خاموشی ، ستاروں کے قریب تر ہونے کا احساس ، دور بین ، پودے میں لگے ہوئے لال لال خوبصورت پھول ، اور ان سب کے علاوہ اُس کی موجودگی کی اجنبیت ، دوری اور پراسرار خاموشی ، انہیں چیزوں نے اُس کا دل موہ لیا تھا - وہ کچھ سننے کے لئے عجب انداز سے اپنے سر کو جنبش دیتا - وہ کیا سنتا تھا ؟ — یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُسے ستاروں میں سے کوئی آواز آ رہی ہو --- اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں سے ایک عجیب تاثر چھلکتا تھا گویا اُن میں تقدیر جھانک رہی ہو - اُس کے ابروؤں کی حسین لکیروں پر ہمیشہ غم کے سے آثار نظر آتے - جب وہ چلتا تو اُس کی خوبصورت سیدھی ٹانگوں کا بانکپن بہت بھلا معلوم ہوتا - اُس کی کشادہ اور بالوں سے بھری ہوئی چھاتی بہت شان دار لگتی ! آہ ، اب اُسے پھر ایسا محسوس ہوُا جیسے وہ کشش پھر اُسے اپنی لپیٹ میں لے رہی ہو - اُس کے دل کو ایک سانپ سا ڈس رہا تھا - اُس کے سینے میں خواہشیں مچلنے لگی تھیں -

لیکن اس کے بعد --- اپنے سہانے خیالات کی حد سے نکل کر وہ پھر دیر پیاریس زائٹن والی پارٹی کے متعلق سوچنے لگی - اُس کے کانوں میں کپتان کے وہ الفاظ گونجنے لگے " ہاں پیاری — اچھا — میں ضرور کہہ دوں گا "- اور اُسے خیال آیا کہ یہ کہتے ہوئے کپتان کے چہرے سے کیسی حماقت کیسا عامیانہ پن ٹپکنے لگا تھا - اور وہ بالکل خادموں کی طرح اپنی بیوی کا حکم بجالانے کے لئے چل کھڑا ہوا تھا -

اور اب وہ کشش پھر اس طرح روپوش ہوگئی تھی جیسے کسی روشن شہر سے دھوپ غائب ہو جائے اور اسے دھندلا اور تاریک چھوڑ جائے - بس یہ حقیقت تھی اس کشش کی -

بس یہ حقیقت تھی اس کشش کی - کاش وہ اپنے ہی وطن کے لوگوں سے میل ملاقات رکھتی مثلاً مارٹن سے جو ایک نہایت شریف آدمی ، بہادر سپاہی اور عجیب و غریب آدمی تھا - جس سے باتیں کرنے میں بڑا لطف آتا تھا - بس اُس میں کوئی جادو یا کشش نہ تھی - جادو ؟ اس لفظ کے خیال سے ہی وہ کانپ اُٹھی - جادو ؟ فریب - فریب ، ہاں بس یہی تو چیز تھی - جادو !

لیکن پھر بھی — ہمیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے کیا اُس بڑی سی چھت پر گذری ہوئی شاموں میں واقعی جادو تھا ؟ کیا اُس کی کوئی حقیقت تھی ؟ ہاں ، ہاں ، ہنیل کو اس کا اعتراف تھا - اُن میں کوئی جادو کا سا اثر ضرور موجود تھا - اگر اُس کی موجودگی اور لمس میں کوئی جادو تھا تو اس چھوٹی عورت کا خاوند — ہنیل کا منہ پھر بدمزہ ہوگیا -

اب پھر وہ نئے سرے سے کپتان کی گریز پا کشش کو اپنے تصور میں برقرار رکھنے کی کوشش شروع کرنے لگی تھی - افوہ ، یہ کتنی جلدی ایک فریب ہونے لگا - بہر حال - اگر کبھی اس کشش کا وجود تھا تو اس سے اب کون منکر ہو سکتا ہے - اور اگر کبھی یہ چیز موجود تھی تو اب بھی اسے قائم رکھنا چاہئے - آپ چاہیں تو اسے دھوکہ کہہ لیں - لیکن ایسا دھوکہ جس کا حقیقت میں تجربہ کیا جا چکا ہے وہ اس قابل ہے کہ اُسے برقرار رکھا جائے - شاید یہ بیزاری خود اس دھوکے سے بھی زیادہ بڑا دھوکہ تھی - شاید اُس چھوٹی سی عورت اور اُس کے شوہر سے متعلق یہ بیزاری اُن چند شاموں کے جادو اور دھوکے سے بھی چھوٹی تھی - شاید زندگی بھر کی طویل بیزاری چند لمحوں کے حقیقی دھوکے سے زیادہ باطل تھی - کیونکہ آخرکار — اُس کے سینے کی وہ ملائم سیاہی میں ، وہ اسرار جو اپنا کوٹ بدلنے کے بعد کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلتے وقت کپتان کے ساتھ آتا معلوم ہوتا تھا — نہیں ،

نہیں ، وہ اُس کی کشش کا فریب برقرار رکھنے کے لئے ساری بے زاری کو تج سکتی ہے ۔ نہیں ، بس وہ تو کپتان کی کشش کے جادو تلے ہی زندہ رہنا چاہتی تھی ۔ وہ اسی جادو کو برقرار رکھنا چاہتی تھی ۔ یہی تو اُس کی واحد تمنا تھی ۔ اُسے اگر کسی چیز کے خلاف جد و جہد کرنی تھی تو وہ بس اس بیزاری کا عامیانہ پن تھا ۔ چھوٹی عورت کا سستا پن ۔ اُس چھوٹی عورت کے خاوند اور اُس کی ریا کاری کا ابتذال ۔ اُس کا یہ کہنا " اچھا پیاری ، ضرور ! ضرور ! " — یہ سب باتیں تھیں جن کے خلاف اُسے لڑنا تھا ۔ اُس وقت وہ بہت ذلیل اور قابل نفرت معلوم ہوا تھا ۔ لیکن وہی عجیب و غریب ہستی تنہا چھت پر بیٹھی حسب ستاروں کو دیکھ رہی ہوتی ! پودے کے وہ لال لال سے حسین پھول ۔ وہ اسرار جو سوٹ بدلنے کے بعد ٹہلتے وقت اُس کے ساتھ سمٹ آتا تھا ۔ اُس کی وہ کشش ، وہ اداسی ۔ وہ بوٹ اتارتے ہوئے جھکتے وقت اُس کی وہ خاموشی ۔ پھر جب وہ پیار سے اپنا ہاتھ اُس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھتا تو اُس کے لبوں پر مخصوص اور عجیب و غریب سی مسکراہٹ کی لرزش ! زندگی تو انتخاب کا ہی نام ہے پھر اگر وہ اس کشش ، جادو ، حسن اور فریب کو چن لے ! اُس چھوٹی عورت کے خاوند کے روپ میں اُسے دیکھنے سے تو موت بہتر ہے ۔ اتنا سب کچھ سوچ اور کچھ کہنے کے بعد کیا وہ اُس چھوٹی عورت کا خاوند تھا یا پھر وہ عجیب و غریب ، اور خود اپنے سپنوں کا ملائم سپنے والا دیوتا ؟ آخر کون تھا وہ ؟

نہیں ، وہ ہرگز اُسے گڈا نہیں بھیجے گی ۔ اُس چھوٹی عورت کو وہ گڈا نہیں ملے گا ۔ اور اسی طرح وہ خود کیسی اچھی گڑیا بن سکتی تھی ---- خدایا --- کیسی عجیب و غریب اور نادر .... ؟ !

(٦)

کپتان ہیپ برن اب بھی کبھی کبھار اپنی ڈاک لینے گھر پہ آتا تھا ۔ خادمہ ہمیشہ اس کے خط ہال میں ایک مخصوص جگہ پہ رکھ دیتی تھی تاکہ کپتان کو سیڑھیاں نہ چڑھنی پڑیں ۔

ایک دن اُس کے خطوں کے ساتھ —— یوں کہنا چاہئے کہ ایک دوسرے خط کے ساتھ ، کیونکہ اُس کی ڈاک بہت مختصر ہوتی تھی ، اُسے ایک لفافہ ملا جس پر جانا پہچانا نشان بنا تھا ۔ اس لفافے میں دو خط تھے ۔

پیارے کپتان ہیپ برن

مجھے یہ ملفوف خط مسز ہیپ برن کی جانب سے موصول ہوا ہے ۔ بس وہ گڈا جو تمہاری صورت سے مشابہ ہے ۔ انہیں نہیں بھیجنا چاہتی ۔ اس لئے میں اس خط کا انہیں جواب بھی نہیں دوں گی ۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ کیوں ہمیں اس شہر سے نکال دینے کی کوشش کریں ۔ اُس دن جانے کے بعد اُن کی مجھ سے باتیں ہوئی تھیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھ کو تمہاری محبوبہ سمجھتی ہیں ۔ میں نے تو بالکل کچھ نہیں کہا ، البتہ اتنا ضرور بتایا کہ یہ بات بالکل جھوٹی ہے ۔ لیکن انہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ۔ میں تمہیں تکلیف دینا نہیں چاہتی ۔ لیکن بہر حال تمہیں تو یہ پتہ ہونا چاہئے کہ حالات کیا ہیں ۔

جوہانا ۔ ز ۔ ر

دوسرا خط اُس کی بیوی کے مخصوص موٹے کاغذ اور اُس کے اپنے ہاتھ کا بڑے بڑے نوابی حروف میں لکھا ہوا تھا ۔

میری پیاری کاؤنٹس ،

نہ جانے اس دن کوئی غلطی ہوئی یا کوئی غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی کیونکہ آپ نے مجھے وہ گڈا بھیجنے کے لئے کہا تھا جس کا ہم ذکر کر رہے تھے لیکن آج چار روز ہوگئے ہیں اور وہ اب تک مجھے نہیں ملا ۔ مجھے سٹوڈیو آنے کا خیال ہؤا تھا لیکن پھر میں نہیں چاہتی تھی کہ مسز ڈنس کو تکلیف دوں ۔ میں آپ کی بڑی مشکور ہوں گی اگر آپ مجھے فوراً گڈا بھجوا دیں کیونکہ جب تک وہ میرے قبضے میں نہ آ جائے مجھے چین نہیں پڑے گا ۔ یقین رکھئے کہ گڈا ملتے ہی میں اس کی قیمت کا چیک روانہ کر دوں گی ۔

کل ہمارے پرانے خاندانی دوست میجر جنرل بارلو مجھ سے ملنے آئے تھے اور ہم نے اپنے قوانین کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں کیں اور یہاں اُن کی اخلاقی حالت درست رکھنے کے لئے بھی بہت سی تدبیریں سوچیں ۔ اور مجھے پتہ چلا ہے کہ ہم جس شخص یا جن لوگوں کو بھی ناقابل قبول سمجھیں ۔ انہیں چوبیس گھنٹے کے نوٹس پر شہر سے نکال سکتے ہیں لیکن یقیناً یہ سب بڑی خاموشی اور احتیاط سے کیا جاتا ہے تاکہ کسی بدنامی کی گنجائش نہ رہے ۔

مہربانی کر کے کل تک مجھے وہ گڈا پہنچا دیجئے اور ساتھ ہی ممکن ہو تو اپنے آئندہ پروگرام سے بھی مطلع کریں ۔

یقین کیجئے میں ہمیشہ آپ کی دوست رہنا پسند کروں گی ۔ بہت بہت دعاؤں کے ساتھ ۔

آپ کی مخلص ،

اونیجلین ہمپ، برن

(۷)

اور پھر ایک بڑی بھیانک بات پیش آئی ۔ واقعی نہایت بھیانک سی بات ۔ ہنیل نے شہر کے ایک شام کو نکلنے والے اخبار میں یہ خبر پڑھی ۔ تقریباً کوئی رات کے دس بجے جب ہنیل سونے والی تھی یہ اخبار ہاتھ میں لئے بھاگی بھاگی آئی ۔

مسز ہمپ برن اپنی خواب گاہ کی کھڑکی سے جو ہوٹل کی تیسری منزل پر تھا نیچے کھڑنجے پر آ گری اور مر گئی ۔ وہ رات کے کھانے کے لئے کپڑے تبدیل کر رہی تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صبح کے وقت اس نے اپنی چھوٹی سی انگیا دھو کر کھڑکی کی دھلیز پر سوکھنے کے لئے ڈال دی تھی اسے اتارنے کے لئے کرسی پر چڑھ کے جو اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو کھڑکی سے باہر جا گری ۔ اس کا خاوند اس وقت ساتھ والے کمرے میں تھا اک گھٹی سی چیخ کی آواز اور عجیب سا شور سن کر وہ کمرے میں آیا تا کہ معلوم کرے کہ شور کیسا ہے ۔ اس کی بیوی کمرے میں نہ تھی اور کرسی کھڑکی کے پاس پڑی تھی ۔ اس نے چاروں طرف دیکھ کے سوچا کہ شاید وہ تھوڑی دیر کے لئے کہیں باہر گئی ہے اور پھر کمرے میں جا کے حجامت بنانے لگا ۔ ابھی اس نے پوری طرح حجامت بھی نہ کی تھی کہ ایک خادمہ دوڑتی ہوئی اندر آئی ۔ جب کپتان نے کھڑکی سے باہر جھانک کے گلی میں دیکھا تو وہ بے ہوش ہوگیا اور اگر خادمہ وقت پر اسے سنبھال نہ لیتی تو وہ بھی کھڑکی کے باہر جا گرتا ۔

دوسرے ہی دن کپتان واپس اپنے کمرے میں آگیا ۔ ہنیل کو اس وقت تک پتہ نہ چلا جب تک کہ کافی رات گئے خود اس نے آ کے ہنیل کے دروازے پر دستک نہ دی ۔ ہنیل فوراً سمجھ گئی کہ کپتان آیا ہے ۔ وہ کہنے لگا :۔

”کیا تھوڑی دیر کے لئے باتیں کرنے کے لئے آ سکو گی ؟“

جواب دینے سے پہلے وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر شاید حیرانی اور تجسس کی وجہ سے وہ جانے پر راضی ہو گئی ۔

" اچھا ، میں ابھی آئی " ۔ وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی ۔

جب وہ اُس کے پرسکون کمرے میں پہنچی تو وہ چپ چاپ بے حس و حرکت بیٹھا تھا اور اُس وقت سگرٹ تک بھی نہ پی رہا تھا ۔ وہ اُٹھ کے کھڑا نہیں ہؤا ۔ بس دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا اور هنیل کو ایسا معلوم ہؤا جیسے اُس کا چہرہ کچھ بدل گیا ہو ۔ کچھ زیادہ لچک دار ہو گیا ہو ۔ لیکن روشنی اتنی مدھم تھی کہ وہ ٹھیک سے کچھ نہ سمجھ سکی ۔ وہ کپتان سے ذرا فاصلے پر ہو کے بیٹھ گئی ۔

" اُمید ہے تم سب سن چکی ہو گی " ۔ وہ بولا ۔

" ہاں " ۔

کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ کہنے لگا :

" ہاں ، ایسا ہو جانا ذرا بڑا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسا ہو چکا ہے " ۔

هنیل کے کان کافی تیز تھے ۔ لیکن انتہائی کوشش کے باوجود وہ کپتان کی آواز اور لہجے کا مطلب نہ سمجھ سکی ۔

" بہت عجیب واقعہ ہؤا ہے ۔ انتہائی الم ناک واقعہ " ۔ وہ بولی ۔

" ہاں " ۔

" تمہارا خیال ہے وہ محض اتفاقاً نیچے جا گریں ؟ " هنیل نے پوچھا ۔

" ایسا ہی ہوا ہو گا ۔ کیوں کہ خادمہ ذرا دیر پہلے ہی اس کے کمرے میں گئی تھی اور میری بیوی اُس وقت بالکل خوش و خرم معلوم ہو رہی تھی ۔ میرے خیال میں کھڑکی کی دھلیز تک ہاتھ بڑھاتے وقت اچانک اُس کا سر چکرا گیا ۔ میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس نے مجھے آواز کیوں نہ دی ۔ اُس نے تو کبھی اتنی ہمت بھی نہ کی تھی کہ کسی اونچی کھڑکی سے باہر جھانکے ۔ کیوں کہ اگر وہ نیچے دیکھ لیتی تو فوراً اُس کا جی مالش کرنے لگتا تھا ۔ وہ تو یہ کہا کرتی تھی کہ میں چاند کی طرف بھی آنکھ بھر کے نہیں دیکھ سکتی کیوں کہ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں کسی بہت اونچی جگہ سے گر پڑوں گی ۔ سوائے ایک سرسری نظر ڈال لینے کے وہ کبھی چاند کی طرف نہ دیکھتی تھی ۔ اُسے ہمیشہ یہ احساس رہتا کہ اگر وہ چاند پر پہنچ گئی تو نیچے پوری خلا ہو گی " ۔

هنیل اُس کے الفاظ نہیں محض آواز سن رہی تھی ۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ نہیں بلکہ ایک مشین بول رہی ہے ۔ لیکن خیر ایسا تو اکثر اُن لوگوں کے ساتھ ہوا ہی کرتا ہے جنہیں کسی اچانک حادثے سے سابقہ پڑے ۔

وہ بولی " تمہیں تو بہت صدمہ ہؤا ہو گا " ۔

" ہاں ، اُس وقت تو بہت ہی خوفناک معلوم ہوا ، انتہائی المناک ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے میرا دل مسل کے رکھ دیا ہو " ۔

" انتہائی المناک ! " هنیل نے دھرایا ۔

" لیکن اب " اُس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا " مجھے ایک عجیب سی خوشی محسوس ہو رہی ہے مجھے اُس کے بارے میں سوچ کے خوشی ہو رہی ہے ۔ اگر تم اس بات کو سمجھ سکو تو مجھے اپنی بیوی کی خاطر اس واقعے سے خوشی ہوئی ہے ۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک بڑی کشمکش سے چھٹکارا مل گیا ہو ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ زندگی میں پہلی بار اُسے آزادی نصیب ہوئی ہے ۔ وہ بڑی لطیف اور انوکھی سی روح تھی ۔ میری بیوی ایک پری

تھی جیسے انسانی گھر میں رہنے اور انسانی ساز و سامان استعمال کرنے کی سزا دے دی گئی ہو"۔

" کیا واقعی ؟" ھنیل نے بڑے تعجب سے کہا ۔

" مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ غلط زمانے میں پیدا ہو گئی ہے یا پھر کسی غلط ستارے پر ۔ بالکل اس طرح جیسے گرم ملکوں کے جنگلوں سے کوئی نازک مخلوق پیدا ہوتے ہی نکال لی جائے اور اسے انسانوں کے سے کرتب سکھا دئے جائیں ۔ امید ہے تم میرا مطلب سمجھ رہی ہوگی ۔ شاید تمام عمر اس نے یہی کرتب کئے ہیں ۔ اس کی حالت بالکل ایک چالاک سے چھوٹے سے بندر کی تھی یہ دیکھ کر خود مجھے چکر سا آنے لگتا تھا ۔ لیکن اس بے چاری کی اپنی روح بالکل ایک ننھی سی پری کی روح معلوم ہوتی تھی ، آئرلینڈ کے رہنے والوں کی سی عجیب و غریب روح جو ساری عمر اس کے جسم میں یوں قید رہی جیسے وہ کسی مقبرے میں بند کر دی گئی ہو ۔ بس یہ حالت تھی اس کی روح کی حالانکہ وہ ان تمام مراحل کو طے کرتی رہی اور وہ تمام کام انجام دیتی رہی جو انسان کو پیدائش سے لے کر موت تک ادا کرنے پڑتے ہیں "۔

ھنیل جھجکتے ہوئے بولی " لیکن اگر وہ آزاد ہوتی تو کیا کرتی ؟"

" ظاہر ہے کہ آج کل کی دنیا میں اس جیسی ہستی کا کوئی کام ہی نہیں ۔ مثال کے طور پر اس کی زبان ہی لے لو ۔ اسے کبھی انگریزی بولنی ہی نہ چاہئے تھی ۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ اور کون سی زبان اسے زیادہ زیب دیتی ۔ کیونکہ اگر آئرلینڈ کی زبان کے بارے میں سوچا جائے تو وہ تو انگریزی ہی کے ذریعے سیکھی جاتی ہے ۔ وہ لوگ انگریزی میں سوچتے ہیں اور پھر آئرش زبان کے الفاظ اس خیال پر چسپاں کر دیتے ہیں ۔ لیکن بہر حال انگریزی اس کی زبان قطعی نہ تھی ۔ بس یونہی انگریزی کے الفاظ اس کے منہ سے نکل پڑتے تھے ۔ اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی زبان نہ تھی ۔ بالکل اس طرح جیسے تم شروع سے کسی مینا کو بولنا سکھا دو اور وہ صرف وہی بولے ہوئے الفاظ چیخ چیخ کر دہرا دے ۔ اور یہ مینا اپنی طرف سے لاکھ کوشش کرے تو بھی کوئی نئی آواز پیدا نہیں کر سکتی ۔ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں ہوتی ۔ اپنی آواز تو وہ کھو ہی بیٹھتی ہے ۔ اپنی تمام فطری صلاحیتیں اس سے رخصت ہو جاتی ہیں اور اب جو کچھ وہ کہتی ہے وہ صرف ایک بناوٹ ہوتی ہے "۔

ایک طویل خاموشی چھائی رہی ۔

ھنیل نے جل کر کہا " اگر اس کی کوئی ناقابل فہم زبان ہوتی تو پھر وہ زیادہ اچھی لگتی ؟"

" یہ تو میں نہیں کہتا کہ وہ زیادہ اچھی لگتی ۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک معمولی مینا کی نسبت ہم بولتی ہوئی مینا کو اچھا سمجھتے ہیں ۔ میں خود تو ایسا نہیں سمجھتا لیکن زیادہ تر لوگوں کا یہی خیال ہے ۔ اور وہ بھی ایک قسم کی مینا ہی ہوتی ۔ اسی طرح اس کے اپنے طور طریقے اور اپنی بولی ہوتی ۔ لیکن وہ بے چاری تو پنجرے میں بند پھڑ پھڑاتی اپنے آپ کو ماحول کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتی اور چوں چوں بولتی رہی اور اسے کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ وہ پنجرے میں قید ہے جیسے کہ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ہم اپنی ہی جلد میں محبوس ہیں "۔

" لیکن " ھنیل ذرا مذاق اڑاتے ہوئے بولی " تمہیں کیا معلوم کہ تم نے یہ سب کچھ اپنے آپ گھڑ لیا ہے ـــ صرف ذرا اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے ؟"

" ارے نہیں ۔ یہ تو میں بہت پہلے ہی سوچا کرتا تھا "۔

" پھر بھی " وہ بے سوچے سمجھے بول اٹھی " یہ سب کچھ تم نے فرض کر لیا ہوگا تا کہ تمہیں اپنی زندگی ـــ عمر کاٹنے کے لئے کوئی تسلی میسر آ جائے "۔

"ہاں ، ممکن ہے ایسا ہی ہؤا ہو"۔ کپتان کہنے لگا " لیکن میرا ایسا خیال ہے کہ یہ بات نہیں اُس کی آنکھوں سے مجھے حسد گزرتا تھا ۔ کیا تم نے کبھی اُس کی آنکھوں پر غور کیا تھا ؟ مجھے اکثر اُس کی آنکھیں دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا ۔ وہ سارا وقت باتیں کرتی رہتی ، الفاظ اُس کے ہونٹوں سے اُمنڈتے رہتے حالانکہ اُس کی آنکھیں بالکل صاف ستھری ، چمکیلی اور بے نیاز سی معلوم ہوا کرتی تھیں ۔ بالکل ایک بچے کی طرح جو کچھ سنتا رہے اور پھر ڈر جائے ۔ وہ بھی ہمیشہ ہنستی رہتی --- منتظر رہتی کسی اور بات کا انتظار کیا کرتی ۔ میرے خیال میں تو وہ اس سکاٹ لینڈ والوں کے گیت کی بری سے مشابہ تھی جو ایک فانی انسان سے محبت کرنے لگی تھی اور ڈر کے عالم میں بڑی سڑک کے کنارے اس انتظار میں بیٹھی رہتی کہ وہ ادھر سے گزرے گا اور پرندوں کی آواز سنا کرتی تھی ۔ آج کل موٹریں اور لاریاں ان سڑکوں سے گزرتی ہیں اور وہ بے چاری بے ہوش جاتی ہے ۔ پھر اسی بے ہوشی کے عالم میں وہ ہماری دنیا میں لائی جاتی ہے ۔ ہوش میں آنے پر وہ ہماری زبان بولنے اور ہمارے طریقے اپنانے کی کوشش کرنے لگتی ہے ۔ اسے اور کوئی بات یاد نہیں رہتی ۔ اسی طرح وہ اپنی زندگی گزارے چلی جاتی ہے ۔ یہاں تک کہ کسی دن حادثے کا شکار ہو کے وہ پھر اپنی دنیا میں لوٹ جاتی ہے "۔

ہنیل خاموش تھی اور کپتان نے بھی کوئی اور بات نہ کی ۔

آخر کار ہنیل نے پوچھا " تو تمہیں اُس سے محبت تھی ؟"

" ہاں ۔ لیکن کچھ اس طرح کی کہ جیسے لڑکیں میں ، میں نے ایک کالی کلغی والی چڑیا کو پکڑ کے پنجرے میں بند کرلیا تھا اور میں اُس چڑیا سے محبت کرنے لگا تھا ۔ نہ جانے کیوں ، مگر مجھے اُس سے محبت ہو گئی تھی ۔ بس میں اُس کو دیوانہ وار چاہنے لگا تھا ۔ رنگ برنگے پھول پودے ، اُن کی خوشبوئیں ، کنکر پتھر ، اور کبھی ختم نہ ہونے والا آسمان --- غرضیکہ وہ سب چیزیں جن پر لڑکے جان دیتے ہیں ، وہ سب کی سب اس پھڑ پھڑاتی ننھی چڑیا میں نظر آنے لگی تھیں ۔ یہ چڑیا دانہ یوں چگنے لگتی جیسے اُسے اور کوئی کام نہ سوجھ رہا ہو ، اپنے چاروں طرف دیکھتی اور پھر گانا شروع کر دیتی ۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد یہ چڑیا مر گئی ۔ ہاں ، وہ مر گئی ۔ مجھے پھر اس قسم کا احساس پیدا نہ ہو سکا جیسا کہ بچپن میں اس چڑیا کو دیکھ کے ہوا تھا یہاں تک کہ میری ملاقات اپنی بیوی سے ہوئی ۔ اور اس کے بعد میرا دل پھر اسی احساس سے بھر گیا ؟ بالکل ویسا ہی احساس ۔ ہو بہو اسی قسم کے جذبات پھر میرے دل میں اُمنڈ آئے اور میں جلد ہی سمجھ گیا کہ یہ بھی ضرور مر جائے گی ۔ وہ پہلی چڑیا کی طرح دانہ چگے گی ، ادھر اُدھر دیکھے گی لیکن پھر آخر میں مر جائے گی ۔ البتہ یہ اُس چڑیا سے زیادہ دیر زندہ رہے گی ۔ لیکن وہ مرے گی اُسی چڑیا کی طرح ۔ پنجرے میں بند "۔

" لیکن اُسے تو پنجرہ پسند تھا ۔ اُسے اپنے کپڑوں اور زیور سے پیار تھا اور اسی طرح وہ اپنے گھر اور ساز و سامان کو بھی دیوانہ وار چاہتی ہو گی "۔

" ہاں ، وہ سب کو دیوانہ وار چاہتی تھی ۔ لیکن اُسی طرح جیسے کسی بچے کو اپنے کھلونوں سے پیار ہو ۔ فرق اتنا تھا کہ وہ اُس کے لئے بڑے بڑے اور بہت خوب صورت کھلونے تھے ۔ ہاں ، وہ کبھی اُن سے الگ نہ ہوتی تھی ۔ وہ ان چیزوں کو کبھی نہ بھولی تھی --- اپنے زیورات ، کپڑوں اور دوسرے ساز و سامان کو --- وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اُن سے جدا نہ ہوتی اور اُس کا ہر ذہنی تصور انہیں چیزوں میں گڈ مڈ ہو کے رہ جاتا تھا "۔

" اُف توبہ ! " ہنیل بول اُٹھی ۔

" ہاں ، بڑی ہولناک بات تھی "۔
" اُف ۔ " ہنیل نے پھر دھرایا ۔
" ہاں ، بالکل ! اُس کی حالت بدتر ہی ہوتی چلی گئی ۔ اُس کے بات کرنے کا انداز بھی بگڑتا چلا گیا تھا ۔ گویا الفاظ اُس کے ہونٹوں سے پھسلتے چلے جا رہے ہوں ۔ لیکن اُس کی آنکھوں سے چمک کبھی غایب نہ ہوئی ، اُن کا پریوں کا سا انداز ختم نہ ہؤا ۔ البتہ مجھے اُن میں خوف کی سی جھلک دکھائی دینے لگی تھی ۔ ہر چیز کا خوف — اُن تمام چیزوں کا بھی جو اُس کے ارد گرد جمع رہتیں ۔ ایسے ہی جس طرح میری کالی چڑیا اپنے چاروں طرف دیکھا کرتی تھی اور اُس کی نظر سے عقل و فراست جھلکتی تھی ۔ تاہم ایسا لگتا جیسے وہ یہ نہیں جانتی کہ باہر کی دنیا اور اُس کے درمیان صرف ایک پنجرہ حائل ہے ، وہ چڑیا یہ سمجھتی تھی کہ یہ رکاوٹ اُس کے اندر ہے اور اُس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ یوں بند رہے ۔ میری بیوی بھی اسے اپنی فطرت کا تقاضا سمجھتی تھی ۔ اس لئے وہ دونوں مر گئیں "۔
ہنیل بولی " میں یہ نہیں سمجھ سکتی کہ اپنے پنجرے سے نکل کے وہ کیا کرتی ۔ آخر ان بٹنوں ، ساز و سامان اور اپنے کپڑے زیوروں کے علاوہ وہ اور کیسی زندگی گذارتی ؟ "
" کسی طرح کی بھی نہیں ۔ انسانوں کے لئے باہر کی کوئی زندگی ہے ہی نہیں " ۔
" اس کا مطلب ہے دنیا میں کچھ بھی نہیں " ۔ ہنیل نے کہا ۔
" ہاں ، کچھ نہیں ۔ بڑی حد تک کچھ بھی نہیں " ۔
" اچھا سکریہ " ۔
خاموشی کافی طویل ہو گئی ۔
" اور شاید قصور میرا ہی تھا ۔ کیونکہ مجھے کوئی قدم اٹھانا ہی چاہئے تھا ۔ لیکن میں یہ سمجھ سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے ۔ بخدا مجھے سوائے اس کے اور کچھ پتہ نہ تھا کہ مجھے اپنی بیوی کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے ۔ اُس کے پاس پیسہ بہت تھا اور میرا خیال تھا کہ اگر میں بھی اس میں حصے دار بن جاؤں تو کوئی حرج نہ ہوگا ۔ میں ہمیشہ باغ میں بیٹھا رہتا — وہاں میں تھا اور میرا علم فلکیات ۔ چاند دیکھ کر مجھے بڑا سکون ملتا ۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے ۔ پنجرے کے اندر دیکھنے کے بجائے جیسے کہ میں اپنی چڑیا یا بیوی کو دیکھا کرتا تھا — اب میں باہر دیکھ سکتا ہوں — آزادی کی طرف — آزاد فضاؤں کی طرف ....
" تمہارا مطلب چاند سے ہے ؟ " ہنیل نے پوچھا ۔
" ہاں ، چاند سے "۔
" اور اسی کو تم آزادی کہتے ہو ! "
" ہاں ، اُسی میں مجھے آزادی کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے "۔
" خیر ، میں چاند کو اپنا رقیب نہیں سمجھوں گی "۔ آخر کار ہنیل بول اٹھی ۔
" ہاں ، یہ چیز ایسی تو نہیں کہ اسے اپنا رقیب سمجھا جائے "۔
تھوڑی ہی دیر بعد اُس نے کپتان کو شب بخیر کہا اور اپنے کمرے میں آ گئی ۔

(۸)

اس نازک لمحے میں کپتان کو جس خاص چیز کا احساس تھا وہ یہ تھی کہ کسی نے کلہاڑی سے اُن تمام ناطوں اور بندھنوں کو کاٹ کے رکھ دیا ہے جو اُسے اپنی محبوب ہستیوں سے وابستہ کئے ہوئے تھے ۔ اور اب اُسے یوں معلوم ہوتا تھا گویا سارے اہم انسانی رشتوں

کے رستے ناسور ہی باقی رہ گئے تھے ۔ ایسا کیوں تھا یہ خود وہ بھی نہ جانتا تھا ۔ اور پھر اپنی جذباتی تبدیلیوں کے اسباب ہمیشہ تو سمجھ میں نہیں آیا کرتے ۔

بس وہ تو اتنا جانتا تھا کہ یہ ایک حقیقت ہے ۔ وہ جذباتی دھارا جو اسے اپنے تمام واقف کاروں اور عزیزوں سے وابستہ کئے ہوئے تھا ٹوٹ چکا تھا اور فی الحال صرف اس کے ٹوٹنے کا احساس تھا ۔ وہ خلیج جو اس کے اور اس کے دوستوں کے درمیان حائل ہو گئی تھی ، وہ شگاف جو اس کے اور ان کے درمیان واقع ہو چکا تھا ۔ یہ کسی انسان یا کسی چیز کا قصور نہ تھا ۔ وہ نہ اپنے آپ کو اس کا ذمہ دار سمجھ سکتا تھا اور نہ دوسروں کو ۔ جو کچھ ہوا تھا اس کی تیاریاں مدت سے ہو رہی تھیں اور اب تک لخت یہ خلیج پیدا ہو گئی تھی ۔ ایک عرصے تک وہ دونوں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ دور ہوتے چلے گئے تھے ، اور اب نہایت خاموشی کے ساتھ اچانک یہ بندھن ٹوٹ گیا تھا ۔

ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ ہنیل سے بھی ملنا نہ چاہتا تھا ۔ یہاں تک کہ اسے اب ہنیل کے بارے میں سوچنا بھی پسند نہ تھا ۔ لیکن ویسے وہ کسی اور سے بھی ملنا یا کسی اور کے بارے میں سوچنا تک نہ چاہتا تھا ۔ اسے اپنے دوستوں اور جان پہچان والوں اور ان کے ہمدردی کے اظہار سے سخت نفرت ہونے لگی تھی اور جب کبھی کوئی اس کا دکھ بٹانے کی کوشش کرتا تو کپتان پر ایک فوری تنفر عالم آ جاتا ۔ وہ اپنے کسی احساس یا جذبے میں کسی اور کو شریک نہ کرنا چاہتا تھا ۔ بس وہ تو یہ چاہتا تھا کہ خواہ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ میل جول ہی رکھتا ہو تاہم اپنے احساسات کی حد تک وہ تنہا رہے ۔

چنانچہ وہ اپنے سب معاملات کا تصفیہ وغیرہ کرنے کی غرض سے انگلینڈ چلا گیا ۔ دوسرے جا کے اپنے بچوں سے ملنا بھی تو اس کا فرض تھا ۔ وہ اپنے بچوں کو دنیا کی ہر راحت پہنچانے کا خواہش مند تھا البتہ اپنے آپ سے ان کا کوئی جذباتی تعلق اسے قطعی پسند نہ تھا اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی لڑکی کو فوراً کانونٹ سے نکال کے کسی اچھے سے انگریزی سکول میں داخل کر دے ۔ اس کا بیٹا جہاں تھا وہی جگہ اس کے لئے ٹھیک تھی ۔

کپتان کی آمدنی اب اتنی تھی کہ وہ اطمینان سے خود مختارانہ زندگی بسر کر سکتا تھا البتہ اپنی بیوی کے مکان کو برقرار رکھنا اس کے بس کا کام نہ تھا ۔ چنانچہ اس نے وہ مکان اور اس کی بہت سی چیزیں بیچ ڈالنے کا انتظام کر لیا ۔ پھر اس نے یہ بھی ارادہ کر لیا کہ جتنی جلدی ہو سکا وہ فوج سے بھی چھٹکارا حاصل کر لے گا ۔ اس نے سوچا کچھ عرصے تک میں یونہی ادھر ادھر کے ملکوں میں گھومتا پھروں گا یہاں تک کہ اتفاقاً مجھے کوئی ایسی چیز ہاتھ آ جائے جسے میں واقعی اپنا لینا چاہوں ۔

چنانچہ ساری سردیاں گذر گئیں اور وہ جرمنی نہ جا سکا ۔ فوج سے بھی اسے چھٹی مل گئی تھی ۔ وہ اپنے معاملات کے تصفیے میں لگا رہا ۔ گو یہ سب کوئی ایسے اہم کام نہ تھے ۔ اس پورے عرصے میں اس نے ایک بار بھی ہنیل کو خط نہ لکھا ۔ یہ سوچ کر کہ لوگ اس کے جذبات میں مخل ہونا چاہتے ہیں ان سے اس کی نفرت بڑھ جاتی تھی ۔ ان کی سرگرمیاں اور جذبات وہ بالکل برداشت نہ کر سکتا تھا ۔ دوسرے لوگ ہر طرح کے جذبات ، احساسات ، دلچسپیاں اور مصروفیتیں رکھ سکتے تھے ۔ یہ بھی اچھی بات تھی کہ ان کے اندر مختلف قسم کا ہیجان تو برپا ہوتا تھا ۔ لیکن جونہی وہ لوگ اپنے احساسات کو اس تک پہنچانے کی یا اسے اپنی مصروفیات میں الجھانے کی کوشش کرتے تو کپتان کو ایسی کوفت ہوتی کہ وہ اپنی نفرت پر قابو نہ پا سکتا اور وہ ان کے پاس سے بھاگ نکلنے کی ٹھان لیتا ورنہ ان کی صحبت میں تو روحانی کیا جسمانی طور پہ بھی اس کا جی مالش کرنے لگتا ۔

اس قسم کی ذهنی کیفیت تو ایک عاشق کے شایان شان نہیں هوتی - هنیل کے بارے میں وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا اور کسی دوسرے کے بارے میں سوچنے کی وہ کوئی ضرورت هی محسوس نہ کرتا تھا -- اُسے یہ جان کے انتہائی طمانیت اور سکون حاصل هوتا کہ میری بیوی مر گئی هے - اب ترس کھانے کی گنجائش باقی نہیں رهی تھی کیوں کہ وہ بے چاری اس دنیا سے جهت کے یوں ایک خلا میں جا پہنچی تھی جیسے کوئی پرندہ اُڑ جاتا هے -

(۹)

بهرحال مرد کی زندگی چالیس سال کی عمر میں ختم تو نہیں هو جاتی - البتہ یہ هو سکتا هے کہ اُس کی زندگی کا ایک بڑا دور ختم هو جائے -

اور الگز سنڈر هیپ برن ایسا آدمی نہیں تھا کہ اکیلا رہ سکتا - جیسا کہ کسی دانا کا قول هے هماری ساری مصیبتوں کی بڑی وجہ یہ هے کہ هم اکیلے نہیں رہ سکتے - اور یہ کہاوت بالکل ٹھیک هے - همیں تنہا رهنے کی صلاحیت پیدا کرنی چاهئے ورنہ هم دوسروں کا شکار هو کر رہ جائیں گے - لیکن جوں هی هم تنہا رهنے کی عادت پیدا کرنے میں کامیاب هوتے هیں همیں یہ احساس هونے لگتا هے کہ اب صرف ایک هی کام باقی رہ گیا هے اور وہ یہ کہ هم کسی اور سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دیں -- کسی اور کے ساتھ -- یا پھر اُسی هستی کے ساتھ - دوبارہ تعلق پیدا کر لیں اگر انسانوں سے یہ توقع کی جائے کہ وہ بجلی کے کھمبوں کی طرح الگ الگ گاڑ دئے جائیں گے تو یہ محض بکواس هے -

چنانچہ کچھ یہی حال همارے عزیز کپتان کا تھا - اُسے یہ جنون سا هوگیا کہ وہ بجلی کے کھمبے کی سی علیحدگی اختیار کرلے اور یہ اُس کے لئے تھی بھی انتہائی ضروری چیز - لیکن پھر اُس کے دل میں تمنا کی ایک نئی کلی پھوٹ نکلی -- کس چیز کی تمنا ؟ محبت کی ؟

یہ ایک ایسا سوال تھا جو وہ بار بار اپنے آپ سے کیا کرتا تھا - اور یہ حقیقت تھی کہ اٹھارہ یا بیس سال کی نو عمر اور خوب صورت لڑکیاں اُسے بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں - وہ لڑکیاں تر و تازہ ، بہت جذباتی قسم کی هوتی تھیں اور اُس کی طرف یوں دیکھتی تھیں جیسے وہ کوئی بہت هی عجیب و غریب چیز هو - کاش ایک کی بجائے وہ اُن میں سے دو تین کے ساتھ شادی کر سکتا !

محبت ! جب آدمی کے دل میں کوئی خاص خواهش باقی نہ رهے تو اُس کا ذهن بار با اس جذبہ کی طرف گھومتا رهتا هے جیسے مقناطیسی سوئی قطب شمالی کی طرف - یہ لفظ ' محبت بھی کتنا بے زار کن هے - اس کے بہت سے معنی نکلتے هیں - اس سے وہ جذبہ مراد تھا جو اُسے اپنی بیوی کے لئے محسوس هوتا تھا - اُسے اپنی بیوی سے محبت تھی - لیکن پھر اُسی قسم کی محبت میں گرفتار هونے کے خیال سے وہ کانپ اُٹھتا تھا - پھر اس سے مراد وہ جذبہ بھی تھا جو انتہائی نفیس نوجوان لڑکیوں سے ادھر اُدھر مل کر اُس کے دل میں پیدا هوتا تھا : وہ تر و تا اور جذباتی سی لڑکیاں جو هر وقت اُس پر دل و جان نچھاور کر دینے کو تیار رهتی تھیں هاں ، وہ اُسی قسم کی کوئی آدھی درجن لڑکیوں سے محبت کر سکتا تھا - لیکن یہی سوچ خاموش هو جاتا کہ ایسا کرنا مناسب نہیں -

بالآخر اُس نے هنیل کو خط لکھا جس کا اُسے کوئی جواب نہ ملا - پھر اُس نے م کے نام ایک خط بھیجا لیکن وهاں سے بھی اُسے جواب نہ آیا - پھر اُس نے اطلاعات کے دف سے پتہ کرنا چاها لیکن اس سے زیادہ وہ اور کچھ معلوم نہ کر سکا کہ وہ دونوں عورت

سیونک چلی گئی ہیں ۔

فی الحال کپتان نے بات یہیں چھوڑ دی ۔ در اصل ھنیل اُس کے لئے کسی مثالی محبت کی مظہر نہ تھی بلکہ ایک " تقدیر کے نوشتے " کی سی حیثیت رکھتی تھی ۔ اُسے ھنیل سے کوئی والہانہ لگاؤ نہ تھا اُس کے لئے لپنان کے دل میں ذرہ بھر بھی جذبۂ پرستش نہ تھا ۔ اور حقیقت تو یہ تھی کہ عورت کی تمام خوبیاں اور حسن انگیز کی دولت سمیٹ بھی اُس کے سامنے رکھ دی جاتیں تب بھی اب وہ اس والہانہ محبت کے لئے تیار نہ ہوتا ۔ ایک بار اُس نے گھٹنوں کے بل جھک کر لرزتی ہوئی آواز میں اپنی دیوی کو خوش رکھنے کی قسم کھائی تھی ۔ اور اب -- نہیں ۔ اب پھر وہ ایسا نہیں کرے گا ۔

اب تو اُس کی خواہش یہ تھی کہ کوئی میری پرستش کرے ۔ اور ان نو عمر لڑکیوں میں سے کوئی ایک اُسے یوں پوجنے کو تیار ہو جاتی جیسے وہ کوئی دیوتا ہو ۔ اس کا خیال ہی اُسے بہت دل فریب معلوم ہوتا —— انتہائی دل فریب ۔ ایسے مکان میں قادر مطلق دیوتا کی سی حیثیت رکھنا جہاں ایک نہایت حسین ہستی آپ کی پرستش کے لئے موجود ہو اور جہاں آپ سورج کی طرح دنیا کو منور کرتے معلوم ہوں ! چالیس سال کی عمر میں بھلا یہ خیال کسے دل فریب نہ معلوم ہوگا ؟ اور یہی وجہ تھی کہ وہ ایسی ہی فضول باتوں میں وقت گزار رہا تھا ۔

لیکن آخرکار ایک دن اچانک وہ سیونک جانے والی گاڑی میں سوار ہو گیا اور وہاں پہنچنے پر اُسے وہ شہر انتہائی تکلیف دہ معلوم ہوا کیوں کہ وہاں اُجڈ اور گنوار قسم کے دیہاتی لوگوں کی بھر مار تھی ، ان کم سدہ عورتوں کا بھی کوئی سراغ نہ مل سکا ، یہاں تک کہ وہ اُسے کبھی سٹیشن میں بھی نہ ملیں ۔ وہ ادھر اُدھر چکر لگاتا رہا ۔

اور پھر ، اُف خدایا ۔ ایک دن گھومتے پھرتے اُسے ایک دکان میں اپنا ہم شکل گڈا نظر پڑا ۔ وہ ایک چھوٹی سی تصویروں کی دکان تھی ۔ دم بخود کھڑا اُسے یوں گھورتا رہا جیسے کسی نے اُس پر جادو کر دیا ہو ۔

وہ سوچنے لگا " کتنی مکروہ چیز ہے ! اپنی تصویر دکان کی کھڑکی میں رکھی ملے ! "

اُسے اتنی کراہت ہوئی کہ وہ دکان کے اندر بھی نہ گیا ۔

پھر ہفتے بھر تک اُس کا یہ معمول رہا کہ ہر روز اُس گلی میں جاتا ۔ دکان کی الماری میں سجا ہوا اپنا گڈا دیکھا کرتا ۔ ہاں ، وہ ایک ہاتھ جیب میں ڈالے گلی میں کھڑا رہتا اور وہ گڈا بھی سامنے ایک ہاتھ جیب میں ڈالے کھڑا ہوتا ۔ کپتان اپنی ٹوپی پیشانی پر خوب جھکائے رکھتا تھا اور اسی طرح گڈے کی ٹوپی بھی آگے کو جھکی ہوئی تھی ۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب فوجی ٹوپی کی جگہ کپتان دوسری ٹوپی پہنے تھا ۔ خیر تو وہ سر آگے کو بڑھائے اپنی سیاہ آنکھوں سے گڈے کو کھڑا گھورتا رہتا اسی طرح گڈا بھی یوں معلوم ہوتا جیسے اُس پر اپنی سیاہ آنکھیں گاڑے کھڑا ہے ۔ یہ گڈا کپتان کو بالکل ننھا منا سا اصلی آدمی لگتا اور وہ اُسے دیکھ کر مبہوت رہ جاتا ۔ جتنا زیادہ وہ اُسے دیکھتا اسی قدر کپتان کی حیرانی بڑھتی جاتی ۔ اور وہ اُس سے اتنا ہی متنفر ہوتا جاتا ۔ لیکن اس کے باوجود گڈے میں ایسی کشش محسوس ہوتی کہ وہ بار بار اسے دیکھنے آتا ۔

اور گڈا ہمیشہ اُسی جگہ رکھا ہوتا ۔ ایک ننھا ننھا منا سا آدمی ایک ہاتھ جیب میں ڈالے کھڑا یوں دکھائی دیتا جیسے اس گہما گہمی اور افراتفری میں خود اُسے کوئی کام نہ ہو ۔ بے چارہ پھنسا ، اس دنیا میں کسی نامناسب جگہ پر اسے ٹھونس دیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود اُس کی مردانگی میں قطعی کوئی فرق نہ آیا تھا ۔

اپنی تنہائی کے باوجود وہ ایک ننھا سا مرد آدمی تھا ۔ لیکن اس میں عجیب علیحدگی

کا سا انداز تھا جیسے کسی چیز سے اُس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ تاہم اپنی چست پتلون میں وہ ایک مکمل مرد کا نمونہ تھا کیسا عجیب ماحول تھا اُس کا ــــ سنہرے پالش والی چھوٹی سی جاپانی ساخت کی الماری سے کمر لگائے، بائیں ہاتھ پر پیتل کا ایک بھدا سا قلم دان، دائیں ہاتھ چند پرانے برتن۔ پشت پر معمولی سے فیتے کا بھدا سا لٹکتا ہوا جال ــــ بے چارا گڈا .. ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جان بوجھ کر اُس کا مذاق اُڑانے کی کوشش کی گئی ہو۔

اور پھر ایک دن یہ گڈا وہاں سے غائب ہوگیا۔ وہ الماری، جھالر اور بھدا سا قلم دان ویسے کا ویسے رکھا تھا لیکن وہ ننھا آدمی وہاں موجود نہ تھا۔ کپتان فوراً دکان کے اندر پہنچا۔

"کیا آپ نے وہ گڈا بیچ ڈالا ــــ جو کسی اجنبی فوجی کی شکل کا تھا؟" کپتان نے یہ جملہ یوں بے ساختہ کہا کہ وہ خود نہ سمجھ سکا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

گڈا بک چکا تھا

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ اسے کون خرید کر لے گیا ہے؟"

دکان والی لڑکی نے بے اعتنائی سے اُس کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ گڈا کس نے خریدا۔

کپتان نے کہا "کسی زمانے میں میری اس خاتون سے واقفیت تھی جنھوں نے یہ گڈا بنایا تھا در اصل وہ گڈا میری ہی شکل کا تھا"۔

لڑکی نے فوراً ایک نئی دلچسپی کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا "آپ کا کیا خیال ہے وہ گڈا میری شکل کا تھا نا؟"

"شاید ــــ" لڑکی اب مسکرانے لگی۔

"وہ گڈا میری شکل کا تھا اور جس خاتون نے اسے بنایا تھا وہ میری دوست تھیں۔ کیا آپ کو اُن کا نام معلوم ہے؟"

"جی ہاں"۔

"گرافن زو راسینٹلو" وہ زور سے بولا۔ اُس کی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔

"جی ہاں۔ اُن کی بنائی ہوئی گڑیاں بہت مشہور ہیں"۔

"کیا آپ کو معلوم ہے وہ ہیں کہاں؟ کیا وہ میونک میں ہیں؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں"۔

"کیا آپ اُن کا پتہ چلا سکتی ہیں؟"

"معلوم نہیں۔ خیر میں کسی سے پوچھوں گی"۔

"یا بیرینس فان پری لاؤ کیرولٹ کا ہی پتہ پوچھ لیجئے"۔

"بیرینس کا تو انتقال ہو گیا"۔

"انتقال ہو گیا!"

"جی، سالز برگ کے ایک فساد میں اُن کے گولی لگ گئی تھی۔ کہتے ہیں اُن کے عاشق نے ......"

"آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

"اخباروں میں پڑھا تھا"۔

"مر چکی ہیں! کیا یہ ممکن ہے؟ بے چاری ہنیل"۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔

وہ کہنے لگا "اچھا، اگر آپ اُن کا پتہ معلوم کریں تو میں پھر آ کے آپ سے پوچھ لوں گا"۔

وہ دروازے تک پہنچ کے پھر پلٹا اور بولا ۔
" اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں اس گدے کو آپ نے کتنے میں بیچا ؟ "
لڑکی ذرا جھجکی کیونکہ اپنی خرید و فروخت کی تفصیلات بتانے کا اسے مطلق شوق نہ تھا ۔ لیکن بالآخر ذرا بے دلی سے کہنے لگی :-
" پانچ سو مارکس میں " ۔
" اتنا سستا " کپتان بولا ۔ " اچھا شکریہ ۔ میں کل پھر آؤں گا "۔

(۱۰)

اسے کاؤنٹس کا سراغ ایک اخبار کے گپ شپ کے کالم میں ملا ۔ تصویروں پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار میں لکھا تھا کہ تھیوڈور وار لپسویڈے کی تازہ ترین تصویر ' ایک سٹل لائف ' ہے جس میں ایک گدا ، شبنمے کے مرتبان میں لگے ہوئے سورج مکھی کے دو پھول اور ٹوسٹ کے اوپر ایک تلا ہوا انڈا پیش کیا گیا ہے ۔ ان تینوں چیزوں کا تقابل انتہائی سبق آموز اور دل فریب ہے اور شاید یہ وار لپسویڈے کی انتہائی دلچسپ تصویروں میں سے ہے ۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ گدا ہماری مشہور و معروف کاؤنٹس ھنیل کا شاھکار ہے ، یہ کسی انگریز یا غالباً کسی سکاٹ لنڈ کے افسر کا پتلا ہے جس نے اپنی وھی مشہور و معروف چست پتلون پہن رکھی ہے جسے دیکھ کر حواس سزر اور اس کے ساتھی دنگ رہ گئے تھے ۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں اب یہ پتلون بری نہیں لگتی ۔ بلکہ ہم تو اپنی عزیز کاؤنٹس کی خدا داد قابلیت پر نازاں ہیں ۔ یہ گدا خود ایک شاھکار ہے اور اس نے اپنے ساتھ ساتھ تھیو ڈور وار لپسویڈے کی ' ایک سٹل لائف ' کی شکل میں ایک اور شاھکار کو جنم دیا ہے ۔ ھمیں اڑتی اڑاتی یہ خبر ملی ہے کہ کاؤنٹس زوراسبہٹلو کی منگنی ہو گئی ہے ۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوش قسمت انسان ھر ریچیرنگسریٹ فان بولنڈی ہیں ۔ جو ٹائرول کے حسین اور صحت افزا مقام کاپرون کے باشندے ہیں ۔

(۱۱)

کپتان نے ' سٹل لائف ' والی تصویر خرید لی ۔ اپنی شکل کے ساتھ تلے ہوئے انڈے اور سورج مکھی کے پھولوں کی یہ سنگت اسے بہت ڈراؤنی معلوم ہوئی چنانچہ وہ بستر باندھ کے تصویر سمیت آسٹریا چل دیا ۔ پہلے تو یہ منحوس چیز جرمنی سے باھر لے جانے میں مشکل پیش آئی اور پھر آسٹریا کے اندر لے جانے میں ۔ بڑے غصے کی حالت میں اور تھکا ماندہ وہ سالز برگ جا پہنچا ۔ راستے بھر اسے کسی چیز میں ذرا بھی حسن نظر نہ آیا ۔ اگلے دن وہ کاپرون میں تھا ۔

جنگ سے پہلے یہ ایک نہایت شاندار اور بے حد فیشن ایبل قسم کا شہر تھا جہاں لوگ اپنی صحت ٹھیک کرنے آیا کرتے تھے ۔ ایلپس کی پہاڑیوں کے درمیان یہاں ایک خوب صورت سی چھوٹی جھیل تھی اور ٹائرول کا یہ قدیم شہر اس کے کنارے آباد تھا ، پہاڑیوں کے سر سبز ڈھلان سامنے پھیلے ہوئے تھے ۔ اور دور اوپر کی طرف برف کا پہاڑ واقع تھا ۔ یہ جگہ اب بھی نہایت شاندار تھی ۔ اور لوگوں کا بھی بہت اژدھام تھا ۔ لیکن افسوس حالت اب بہت خستہ اور شان و شوکت کنگال قسم کی تھی اور دکانیں خالی پڑی تھیں ۔

کپتان تو بالکل حواس باختہ ہو کے رہ گیا وہ جس ہوٹل میں اترا تھا وھاں بہت سے امیر

اور مہمل قسم کے بھونڈی بھرے بڑے تھے اور کپتان حیران تھا کہ نہ جانے آئندہ کیا حشر ہو۔ جگہ بہت خوب صورت تھی لیکن یہاں کی زندگی حسین نہ تھی ۔

(۱۲)

پہلی نظر میں ہورسٹ پیر گسمریٹ کا کچھ اثر نہ پڑتا تھا ۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی ۔ اب وہ خاصا فربہ اور ڈھیلا ڈھالا سا لگنے لگا تھا جیسے کہ اکثر اس کی قوم اور فرقے کے لوگ ہو جایا کرتے ہیں ۔ پھر وہ خوب بڑے گھیرے کا بھدا سا کوٹ پہنتا تھا جو ہمارے گھیر دار فراک کوٹ کی ایک نامعقول سی نقل معلوم ہوتی ہے ، اسے خاندانی کوٹ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا ۔ جب وہ چلتا تو یہ کوٹ اس کے ارد گرد پھڑ پھڑاتا رہتا اور پہلی بار دیکھنے میں وہ ایک نچلے متوسط طبقے کا فرد معلوم ہوتا تھا ۔

لیکن یہ بات نہ تھی ۔ شکست خوردہ آسٹریا میں عہدہ دار ہونے کی وجہ سے وہ جمہوریت کا طرفدار تھا لیکن طبعاً وہ بادشاہت کا حامی تھا ، نہیں ، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہر سچے آسٹریا کے رہنے والے کی طرح شہنشاہیت پرست ۔ اور وہ واقعی سچا آسٹرین تھا ۔ اور اسی لئے وہ اتنا نفاست پسند اور عقل مند تھا جتنا شکل سے نہ لگتا تھا ۔ جوں جوں انسان اس کے پھولے ہوئے چہرے ، خوب صورت ناک ، قدرے تلخ اور سکڑے سے دہانے کا ذرا عادی ہو جاتا اسے فوراً قدیم رومی بادشاہوں کے مجسموں کا خیال آنے لگتا اور اسی طرح اس کے ساتھ رہتے رہتے انسان کو اس کی ڈھیلی ڈھالی متوسط حال طبقے والوں کی صورت کے بجائے اس کے بلند مرتبے کا احساس پیدا ہونے لگتا تھا ۔ وہ اپنی ہیئت کو بدلنے سے معذور تھا ۔ اس کی روح میں عجب بے پروائی اور لاابالی پن موجود تھا ۔ وہ چوڑا چکلا ، ہٹیلا اور ناشائستہ معلوم ہوتا تھا لیکن حقیقت یہ نہ تھی بس بات اتنی تھی کہ وہ ذرا تند مزاج تھا اور اپنے ماحول سے بڑی حد تک بے نیاز رہتا تھا ۔ پہلی بار دیکھنے میں وہ بہت مبتذل اور نو دولتا معلوم ہوتا پھر فوراً انسان کو یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک زبردست اور قدیم سلطنت کا رکن ہے ۔ جو اب عیاشی کی طرف راغب ہوگیا ہے اور اس کے مزاج میں تلخی آ گئی ہے ۔ ویسے اس میں کسی قسم کی کمینگی ، ناشائستگی یا چھچھورا پن نہ آتا تھا ۔ البتہ وہ بڑا باتونی تھا اور اپنے سامعین پر بڑا ظلم ڈھاتا تھا ۔

ہملن تو اس کی باتوں نے ہی گرویدہ کر لیا تھا ۔ جونہی کھانا میز پر لگتا وہ باتوں کا سلسلہ شروع کر دیتا اور اپنے ساغر و مینا سمیت باہر مکان کی چھت پر چل دیتا ، یا جھیل پر جا پہنچتا اور آدھی رات تک اسی طرح باتیں کرتا رہتا ۔ گرمیوں کی رات بہت گرم اور پر سکون تھی ، جھیل بہت گہری اور پانی سے لبالب بھری ہوئی تھی ۔ اور اس کے ارد گرد پرانا شہر جھلملا رہا تھا ۔ برفیلے پہاڑ کی چوٹیاں پرلے کنارے پر رات کی تاریکی میں چھپی ہوئی تھیں اور ہوا میں برف کا ایک خفیف سا احساس ہوتا تھا ۔ کبھی کبھی کوئی کشتی لالٹین لئے جھیل سے گذرتی تو اس میں سے گٹار کی آواز سنائی دے جاتی ۔ بالا خانے سے لٹکتی ہوئی عشق پیچاں کے پھول اور پتیاں بالکل سیاہ معلوم ہو رہی تھیں ۔

ٹائرول کے عین بیچوں بیچ یہ بہت خوب صورت جگہ تھی ۔ ہوٹلوں میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں ، برقی روشنی اب بھی بہت سستی تھی ۔ رات حسین اور بھر پور معلوم ہوتی تھی ۔ لیکن اس کے باوجود نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ جگہ بہت اجاڑ اور ویران لگتی تھی گویا زندگی کی روح تڑپ رہی ہے ، سسک رہی ہے ۔

اور ایسے میں ھرریجیرنگسریٹ ایک خوش گفتار آسٹرین کے انداز میں بڑی زندہ دلی اور بشاشت سے باتیں کرتا چلا جاتا ۔ وہ واقعی بہت زندہ دل ، خوش باش شخص تھا اور ساتھ ہی ساتھ اُس میں کسی قدر کابینٹ بھی موجود تھی جسے دیکھ کر وہ بالکل قدیم رومی سلطنت کا باشندہ معلوم ہونے لگتا تھا ۔ خوشی اور غم کی طرف سے بے نیازی ، وہ غیر جذباتی قسم کی لذت کی تلاش ، وہ لاأبالی قسم کی مایوسی — یہی باتیں عورتوں کو بھا جاتی ھیں اور بالخصوص هنیل کو — وہ باتیں کرتا چلا جاتا تھا — جنگ سے پیشتر اپنے کام کے بارے میں جب کہ وہ ایک اهم عہدے پر فائز تھا اور حاکم طبقے سے تعلق رکھتا تھا — پھر جنگ کا تذکرہ چھیڑ دیتا اور اس کے بعد موجودہ زمانے کے مایوس کن حالات کا ذکر کرنے لگتا : اور ان سب باتوں میں ایک بڑا پن اور ایک ایسی لاپروائی جھلکتی تھی جو بے نیازی پر مبنی تھی اور اس کے علاوہ ایک ایسی مایوسی جو خود اپنا مذاق اڑاتی معلوم ہوتی تھی ۔ اصلی قدیم آسٹریا همیشہ هنیل کو بہت دل فریب معلوم ہوا تھا اور اب اس زندہ دل اور بے زار و بے نیاز ھرریجیرنگسریٹ میں قدیم آسٹریا کی جھلک دیکھ کر تو وہ بالکل فریفتہ ہو کے رہ گئی ۔

اور بلا شبہ وہ آسٹرین بھی فطری طور پہ اُس کی طرف مائل ہوگیا ۔ وہ بڑی تیزی اور کبھی ختم نہ ہونے والے انداز سے باتیں کرتا ، بس کے ذرا دیر کے لئے شراب پینے کے لئے رکتا اور پھر باتیں شروع کر دیتا ۔ هنیل کو اس کا آسٹرین لہجہ پسند تھا — اُس کی تیزی اور لاپروائی ، زبان کی صحت کی طرف سے اُس کی دل چسپ بے نیازی ۔ ھاں ، اُس شخص میں وہ قدیم شان و شوکت اب بھی باقی تھی ۔

وہ اپنا چوڑا چکلا سینہ هنیل کی طرف پھیر کے اپنے موٹے سے خوش وضع ھاتھ کے ساتھ بے سوچے سمجھے ایک بڑا پر معنی اور بے ڈھب سا رومان انگیز اشارہ کرتا اور اپنا منہ سکیڑ کے پھر گلاس خالی کر دیتا ۔ اس کے بعد وہ اپنے اُس سگار کی طرف متوجہ ہوتا جسے وہ قریب قریب بھول ہی چکا تھا اور نئے سرے سے باتیں کرنے لگتا ۔

اُس کی حرکتیں کچھ اضطراری سی ہوتیں اور ان سے لڑکپن ٹپکتا ۔ مثلاً جس طرح وہ اُس کی طرف پلٹتا اور جس عجیب انداز سے وہ اپنی چوڑی چھاتی اُس کے سامنے کھول کے رکھ دیتا اور پھر اپنے گھٹنے کھولے جب وہ کرسی پر بیٹھا ہوتا تو بالکل غیر فانی سا معلوم ہونے لگتا تھا ۔ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پھر کبھی نہیں اُٹھے گا بلکہ همیشہ اسی طرح وھاں بیٹھا باتیں کرتا رہے گا ۔ ایسا لگتا جیسے اُس کی ٹانگیں بس بیٹھے رہنے ہی کے لئے بنائی گئی ھیں گویا اپنے پیروں پر کھڑے ہونا اور چلنا پھرنا اُس کے لئے کوئی فطری فعل نہیں ۔

بہر حال ، آخر کار وہ اُٹھ کھڑا ہوتا اور اس شان سے هنیل کے ھاتھ پر بوسہ دیتا کہ فرانس اور جرمن والوں کو وہ طریقہ کبھی آیا ہی نہیں — یعنی وہی لاپروائی ، دوسرے لوگوں کے طور طریقوں سے مکمل بے نیازی کا سا انداز اور پھر اچانک خاموشی کے بعد اُس کا جھک کے ھاتھ چوم لینا — هنیل کو بالکل یوں محسوس ہونے لگتا جیسے میں کوئی جلا وطن ملکہ ہوں ۔

اور شاید اصل ملکہ کے بجائے اگر اپنے آپ کو جلا وطن ملکہ تصور کرنے لگیں تو یہ زیادہ خطرناک بات ثابت ہوتی ہے ۔ چنانچہ هنیل کو اس لمبے چوڑے مضبوط اور ڈھیلے ڈھالے پچاس سالہ رنڈوے اور دو بچوں کے باپ سے محبت ہوگئی — اُس کے پاس تھوڑے سے آسٹرین سکوں کے سوا اور کوئی پیسہ نہ تھا اور ان سکوں کی بھی آسٹریا سے باھر کوئی قیمت نہ تھی ۔ یہاں تک کہ وہ جرمنی بھی نہ جا سکتا تھا ۔ بس وہ تو ٹائرول کے اس وسطی علاقے میں گڑ کے رہ گیا تھا ۔

انحطاطی دور کا رومن ہونے کی حیثیت سے اُس کی اب بھی ایک آرزو تھی - وہ چپ چاپ سال بہ سال اپنے مضمون یعنی جم گاؤ اور ہنزگاؤ کے تاریخی حالات بڑی تفصیل کے ساتھ اکٹھے کرتا رہتا تھا - ھنیل نے معلوم ہوا کہ اس موضوع پر اُس شخص کی معلومات کا ذخیرہ بے بناد ہے ، وہ اسی لطیف ذہانت کا مالک ہے اور اُس کی دل چسپیاں اتنی وسیع ہیں کہ ھنیل اُن کا احترام کرنے لگی - وہ اپنے ضلع کی تاریخ لکھنا چاہتا تھا اور ھنیل اس کام میں اُس کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار تھی -

بہر حال جہاں تک حالات کا تعلق تھا وہ لکھنے کا کام کبھی نہ کر سکتا تھا وہ ریجیرنگسرٹ یعنی امیرِ شہر اور ملحقہ ضلع کا معمولی گورنر تھا - گورنر ایک قدیم اور زبردست عمارت میں رہتا تھا اور اس جگہ نوجوان عورتیں اونچی ایڑی کے جوتے پہنے ، ڈھیروں سرکاری کاغذات لئے اور گھٹنوں تک کا ڈرول والوں کا لباس پہنے ہوئے مردوں کے درمیان ناز و ادا دکھاتی پھرا کرتی تھیں - کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ یہ مرد ان سے الگ ہو کے ذرا خوش اور دل چسپ رویہ اختیار کرتے ہوئے ایک آدھ لفظ کہہ ڈالتے اور اس کے بعد پھر کسی تفریح میں مشغول ہو جاتے - یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا تھا کہ اُس زمانے کے ایسے خوب صورت اور گٹھیلے جسموں والے نوجوان جو صرف عشق و محبت ہی کے لئے موزوں تھے کیوں کر اس ٹیکسی کے مخلف کام سرانجام دیتے ہیں اور ھرریجیرنگسرٹ اس قدیم بڑے کمرے کے اندر ادھر ٹہلاتا پھرتا تھا - اُس کا گھیردار کوٹ پروں کی طرح پھڑ پھڑاتا اور کاغذوں کو کھڑکھڑاتا رہتا اور اُس کے سراب پہنے ہوئے اتنے سرخ پڑے ہوئے قدیم رومی وضع کے چہرے پر وہی مخصوص تلخ مسکراہٹ بکھری رہتی - اور اس میں شک نہیں کہ ہمیشہ پہلے پہل اُس کے منہ سے کوئی ظرافت آمیز کلمہ ہی سننے میں آتا خواہ ھنگری کے لوگ سرحد پر حملہ ہی کر رہے ہوں یا وی آنا میں ہنگامہ پھیل گیا ہو -

جب کبھی وہ اٹھ کھڑا ہوتا تو بڑی تیزی سے اور جلدی جلدی قدم اٹھایا کرتا اور اُس کے کوٹ کا دامن ہوا میں اڑنے لگتا - چنانچہ وہ شہر میں سے نکلتا تو ہر چند قدم کے بعد کسی واقف کار کا حال چال پوچھنے کے لئے رک جاتا اور بات بات پر کھل کھلا اٹھتا لیکن اس کے باوجود اُس میں ایک اکڑ اور کم آمیزی پائی جاتی تھی - اس مخصوص اکڑ اور تکبر کی وجہ سے لوگ اُسے بڑا با اعتبار شخص سمجھتے تھے - اور پھر وہ مقامی زبان بھی بڑی فر فر بول سکتا تھا -

ھنیل کو یوں محسوس ہوا کہ میں اُس سے شادی کر کے خوش رہوں گی ، اُس سے قریب رہنا مجھے بہت اچھا لگے گا - میں چاہوں گی کہ وہ اپنی تاریخ ضرور لکھے - وہ مجھے جلا وطن ملکہ ہونے کا احساس دلاتا رہے گا جو مجھے بہت پسند ہے - کبھی کسی نے میرے ہاتھ کو اس طرح نہیں چوما تھا جیسے یہ چومتا ہے — کس اچانک بے خودی و خاموشی ، اور کیسی جانبازانہ خود سپردگی کے ساتھ - کس خوبی سے وہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دے گا ! — کس عجیب لیکن ذرا خوفناک انداز کے ساتھ اُس نے بہت دیر میں شادی کی تھی - اُس کی بیوی کا سات سال بعد ہی انتقال ہو گیا تھا - ھنیل اس چیز کو بھی بخوبی سمجھتی تھی - ایک نہ ایک کا تو مرنا ضروری ہوتا ہے -

ھنیل کی منگنی ہو گئی - لیکن نہ جانے وہ شادی سے کیوں جھجک محسوس کر رہی تھی - آسٹریا میں رہنا اُسے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی تباہ شدہ جہاز پر سوار ہو جو تھوڑے دن بعد ڈوب جائے گا اور ھرریجیرنگسریٹ سے شادی کرنا اُس ڈوب جانے والے جہاز کے کپتان سے شادی کروانے کے برابر تھا - اور ھلاکت کا احساس بھی اس کشش کا ایک

حصہ تھا ۔

لیکن اس کے باوجود وہ جھجکتی رہی ۔ موسم گرما کے ہفتے گذرتے چلے گئے شہر اجنبی لوگوں سے بھر گیا جو غذا کے ذخیرے کو ٹڈیوں کی طرح چٹ کر گئے ۔ لوگوں نے کاغذوں کے نوٹوں کو گننا چھوڑ کے تولنا شروع کر دیا تھا ۔ کسانوں نے انہیں کھانے کے ڈبوں میں بھر کے کونوں میں دبا لیا تھا جہاں چوہے آ آ کے ان میں سوراخ کئے ڈالے تھے ۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اب ان کی غذا کہاں سے آئے گی لیکن ہمیشہ اس کا انتظام ہو ہی جاتا تھا ۔ جھیل پر نہانے والوں کی بھرمار رہتی تھی جب کپتان وہاں پہنچا تو وہ ان تندرست و توانا لوگوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا جو پورا دن تیرنے نہانے میں گذار دیتے تھے اور عورتوں مردوں کی چمکیلی اور گوری چٹی جلدیں دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی ۔ لہذا اگر قدیم رومی لوگ جرمنی کے لیے چوڑے وحشیوں کے سفید جسم دیکھ کر بھونچکے رہ گئے تھے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ۔

ہاں ، تو یہاں زندگی ایک دیوانگی بن کے رہ گئی تھی ۔ ہوٹل والے پندرہ سو کرونن روز کے لیتے تھے ۔ عورتیں خواہ جوان ہوں یا بوڑھی ، وہ کسانوں کا سا لباس یعنی بھڑکیلا پھولدار سوتی فراک اور ریشمی ایپرن پہنے پھرا کرتی تھیں ۔ مرد ٹائرول والوں کی طرح گھٹنوں سے اونچی لبکرین اور چھوٹی چھوٹی جیکٹیں پہنے رہتے تھے ۔ مردوں کا معمول لباس پرانی سے پرانی چرمی برجس اور نیلی لنن کی جیکٹ سمجھا جاتا تھا ۔ اگر اس چرمی برجس میں کوئی سوراخ ہو تو اور بھی اچھا تھا ۔

ہر چیز سے جسمانیت نمایاں تھی ۔ نہایت شان دار اور برہنہ جسم اور ننگی ننگی بانہیں اور ٹانگیں ۔ ہوٹلوں سڑکوں اور ہر جگہ پر عورتوں کے سفید برہنہ بازو اور مردوں کی ننگی مضبوط اور گندمی سی رانیں اور گھٹنے دکھائی دیتے تھے ۔ ہر جگہ جسمانیت کا احساس ہوتا — جسم کے بے پناہ دکھ درد کا — وہ دیہاتی بھی جو کشتیوں میں کھڑے ہلکی ہلکی بوجھلی جنبشوں کے ساتھ پتوار چلاتے تھے — ان کے اندر بھی جسمانی آرزو کا وہی بے پناہ درد موجود تھا ۔

(۱۳)

اگست کے مہینے میں الگزینڈر کی ہنیل سے ملاقات ہوئی ۔ وہ اس وقت جھینٹ کی چھتری لئے ، نیلا سرخ گلاب کے چھوٹے چھوٹے پھولوں والا سوتی فراک پہنے اور لال ریشمی ایپرن لگائے چلی جا رہی تھی ۔ اس کے سر پہ ٹوپی نہ تھی ، اس کے بازو نرم نرم اور برہنہ تھے اور اس نے سفید جرابیں پہن رکھی تھیں ۔ ہرریجیرنگسریٹ جو بڑا لمبا جوڑا ، حست و چالاک آدمی تھا وہ کوئی نیا فقرہ کہہ کے ہنستا ہوا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا ۔

اس وقت الگزینڈر ایک ہلکے سے ٹھنڈے کپڑے کا سوٹ پہنے اور سر پہ باناما ہیٹ رکھے بیس ہزار کرونن اپنی جیب میں ٹھونستا ہوا بنک سے باہر نکل رہا تھا ۔ کپتان نے ہنیل کو دھوپ میں سے ہرریجیرنگسریٹ کے ساتھ سڑک پار کرتے ہوئے دیکھا ۔ وہ ہنس رہی تھی اور اس کی نظر الگزینڈر پر نہ پڑی تھی ۔

ہنیل نے کپتان کو اس وقت دیکھا جب اس نے اپنی ٹوپی اتار کے اسے سلام کیا ۔ اس کے بعد ہنیل کو ایک سیاہ ، چکنے بالوں والا سر نظر آیا اور اسے دیکھتے ہی وہ ہنس پڑ گئی ۔ اس کا سیاہ ، چکنا اور چھوٹے چھوٹے بالوں والا سر دیکھ کر اسے ٹروبا کا یہ نیلا دن اسے مرجھاتا سا معلوم ہوا ۔

”کاؤنٹس ، کیسا مزاج ہے آپ کا ؟ مجھے اُمید تھی کہ آپ سے ملاقات ضرور ہوگی “ ۔

ھنیل نے اُس کی دھیمی ، اُداس اور لرزتی سی آواز پھر سنی اُس نے جس ہاتھ میں چھتری پکڑ رکھی تھی اُس سے اپنا سینہ دبا لیا ۔ وہ تو اسے بھول چکی تھی .. اُس کی یہ عجیب اور دھیمی آواز فراموش کر چکی تھی اور اب اس وقت یہ آواز یوں سنائی دے رہی تھی جیسے رات کی خاموشی میں کوئی شور لرز اُٹھے ـــ ہائے کیا آفت تھی یہ کہ جیسے دنیا اُس کی نظروں کے سامنے دو نیم ہوجائے اور اسے یہ اندر کی تاریکیاں دکھائی دینے لگیں ... اُس کا جی چاہنے لگا کہ کاش کپتان نہ آیا ہوتا ۔

ھنیل نے اُس کا تعارف ھرریجہ نگسرسٹ سے کرایا جو بڑی رکھائی اور بے رخی سے پیش آیا ۔ ھنیل نے کپتان سے یہ بھی پوچھا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے ۔ پھر اُسے کہنے کے لئے کوئی اور بات نہ سوجھی اور وہ بولی : ۔

” آپ آ کے میرے ساتھ چائے پیجئے “۔

ھنیل جھیل کی پرلی طرف ایک مکان میں رہتی تھی ۔ کپتان نے چائے پر آنے کا وعدہ کر لیا ۔

وہ ھنیل کے گھر چل دیا ۔ اُس نے جھیل پار کرنے کے لئے ایک آدمی اور کشتی کرائے پر لی ۔ گھر کچھ زیادہ دور نہ تھا ۔ مکان سامنے ہی نظر آ رہا تھا ۔ اُس کی کاٹھ کی بالکنیاں ایک دوسرے پر بنی ہوئی تھیں ، چاروں طرف چمکیلے لال اور سفید پھول جھلملا رہے تھے ۔ اور عشق پیچاں کی بیل ایک کونے میں ڈھیر ہوئی پڑی تھی ۔ ساری سبز کھڑکیوں کے پٹ کھلے تھے لیکن مکان کے باہر کوئی نظر نہ آ رہا تھا ۔ پانی کے کنارے چھوٹے سے باغیچے میں گلاب کے اونچے لمبے ، نازک پودے لگے تھے جن کی پچھلی طرف گہرے سبز رنگ کے ساز دکھائی دے رہے تھے ۔ باغیچے میں بیٹھنے کی نشستوں اور کرسیوں کے ساتھ بڑے سے بید مجنوں کے پیڑ تلے ایک سفید میز رکھی ہوئی تھی اور اُس کے پیچھے ایک جھولا لٹک رہا تھا جس کے اوپر گدیاں پڑی تھیں ۔ لیکن وہاں بھی کوئی شخص دکھائی نہ دیتا تھا ۔ باغیچے میں پہنچ کر اُترنے کے لئے ایک پل تھا اور باغ کے ایک سرے پر کافی بڑا کشتی گھر بنا ہوا تھا ۔

کپتان کو ٹھیک پتہ نہ تھا کہ آیا یہ کشتی گھر اس مکان کے ساتھ ہے یا نہیں ۔ پانی کی سطح سے تیرنے والوں کے ہنسنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں ۔ ایک لمبا سا ننگا نوجوان کشتی گھر کی سیڑھیوں پر کھڑا قریب تیرتی ہوئی تین عورتوں کو آوازیں دے رہا تھا ، اُس نے ایک چھوٹی سی لال ٹوپی پہن رکھی تھی اور ایک چھوٹا لال رنگ کا لنگوٹ باندھا ہوا تھا ۔ ایک کالے بالوں والی عورت جس نے سفید ٹوپی اوڑھ رکھی تھی تیرتی ہوئی سیڑھیوں کے قریب آئی اور لڑکے کا ٹخنہ پکڑ لیا ۔ وہ خوب چلایا اور ہنسا اور پیر سے اُس عورت کے سینے میں ٹھوکا لگایا ۔

” نہیں ، نہیں ، ہارڈو ـــ ! “ لڑکے نے پاؤں سے گدگدی کی تو وہ چلائی ۔ ”ہارڈو ، ہارڈو ، چھوڑ دو ! “ ـــ اور وہ دھپ سے پھر پانی میں جا گری ۔ نوجوان زور سے ہنسا ۔ یہ ایک ایسے لڑکے کی ہنسی معلوم ہو رہی تھی جو ابھی بہت نو عمر ہو ۔

” کیا کر رہا ہے یہ لڑکا ـــ ؟ “ پانی میں سے ایک آواز نے زور سے پکارا ” یہ کیا کر رہا ہے ؟ “ یہ ایک گہری سرخ رنگت والی لڑکی کی آواز تھی جو بڑی تیزی سے تیر رہی تھی ، اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پانی میں سے بڑے غلط انداز میں باہر دیکھ رہی تھیں ۔

” دیکھو ہارڈو ، جانے دو ! اب چھوڑو بھی ! تنگ مت کرو “ ۔ اور کالے بالوں والی عورت اوپر چڑھ کے باہر دھوپ میں کشتی گھر کی زرد سی کچی لکڑی کی سیڑھیوں پر

نکل آئی ۔ اُس کے نرم اور لچک دار جسم پر بنی ہوئی گہرے نیلے رنگ کی بنیان اور جانگیا میں سے پانی چمک رہا تھا ۔ لڑکا اپنا پاؤں آگے بڑھا کے اُسے پھر پانی میں دھکیل دینے کی کوشش کر رہا تھا ۔ بہر حال وہ پانی میں سے باہر آ کے سیڑھیوں پر دھوپ میں بیٹھ گئی ۔ اُس کی سانس قدرے پھولی ہوئی تھی ۔ وہ گہرے گندمی رنگ کی بڑی دلکش عورت تھی ۔ اُس کا بھرا بھرا جسم بہت خوب صورت تھا اور تندرست و توانا عورت کی سی مضبوط اور نفیس ٹانگیں تھیں ۔

باغیچے میں ایک سفید کپڑے پہنے سیاہ فام خادمہ سبی اٹھائے ہوئے دکھائی دی اور بولی : ''بی بی جی کافی تیار ہے '' ۔

اُس کی آواز پانی کی سطح پر بڑی دور تک گونج اٹھی ۔

غسل خانے کی سیڑھیوں پر کھڑی ہوئی عورت نے آواز دی '' ھنیل ! ھنیل ، کافی تیار ہے ! ''

ھنیل خالہ ! کافی آ گئی ! '' سیاہ آنکھوں والی لڑکی نے پانی میں سے مڑ کے کہا اور پھر تیزی سے گھر کی طرف تیرنے لگی ۔

'' کافی ! کافی ! '' لڑکا بھی کافی پینے کے سوق میں خوب زور سے دھاڑا ۔

'' اچھا —— ! میں آتی ہوں '' ۔ ھنیل کی آواز پانی میں سے آتی معلوم ہوئی ۔

سیاہ آنکھوں والی لڑکی جس کے بال ریشمی رومال سے بندھے تھے اب سیڑھیوں تک پہنچ کے اوپر چڑھنے لگی تھی ۔ وہ اپنے چست لباس میں بالکل ایک دبلی پتلی مچھلی لگ رہی تھی ۔ یہ تینوں سیڑھیوں پر پاس پاس کھڑے تھے ۔ بڑی عمر کی عورت نے اپنا ایک ہاتھ لڑکے کے برھنہ کندھوں پر رکھا ہوا تھا اور دوسرا بازو لڑکی کے کندھے پر ٹکا لیا تھا ۔ وہ تینوں اکٹھے چلائے جا رہے تھے ۔

'' ھنیل ! ھنیل ! ھنیل ! ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں '' ۔

کشتی والے نے کھینا بند کر دیا تھا اور اب کشتی آہستہ آہستہ اندر کی طرف جا رہی تھی ۔ اس خلل اندازی کے باعث یہ لوگ خاموش ہوگئے ۔ خوب صورت سی عورت نے مڑ کے اپنا گاؤن اٹھا لیا جس کا رنگ گدلا نیلا سا تھا اور اُس کے جسم پر خوب پھبتا تھا ۔ اُس نے یہ گاؤن اس طرح اپنے اوپر ڈال لیا گویا یہ کوئی تھیئٹر پہن کر جانے والا گاؤن ہو ۔ نو عمر لڑکا کھڑا کشتی کی طرف گھور گھور کے دیکھتا رہا ۔

کپتان ھنیل کو دیکھ رہا تھا ۔ وہ اپنے ملائم گندمی بالوں پر سفید رومال باندھے اپنے گھر کی سمت تیرتی چلی آ رہی تھی ۔ کپتان کو اُس کے سفید بازو اور پانی کے نیچے سے ہلتی ہوئی سفید سفید ٹانگیں نظر آرہی تھیں ۔ اچانک کشتی کے اردگرد مچھلیاں اُچھلنے کودنے لگیں ۔

سیڑھیوں پر سے دونوں عورتیں اور لڑکا چپ چاپ کھڑے یوں مخل ہونے والی کشتی کو نا پسندیدگی سے دیکھ رہے تھے ۔ ملاح نے بھی سر گھما کے اُن کی طرف دیکھا کپتان جو عین اُن کے سامنے تھا اُس کی نظر ھنیل پر پڑی ۔ وہ آہستہ آہستہ بڑی آسانی سے تیرتی ہوئی کنارے تک آئی ۔ سیڑھیوں کا کنارہ پکڑ کے آگے بڑھی اور پھر آہستگی کے ساتھ پانی سے باہر نکل آئی ۔ اُس کی ٹانگیں بھری بھری ، لمبی اور خوب سفید تھیں اور اسی طرح اُس کی رانیں بھی بہت مضبوط اور گوری چٹی لگ رہی تھیں اور کمر ڈھلوان اور ملائم ۔

'' آھا ، خوب مزا رہا پانی بہت اچھا ہے '' ۔ ھنیل کی آواز ہانپتے ہوئے بڑی سریلی معلوم ہو رہی تھی ۔

'' بڑا لطف آیا '' ۔

" ھاں " اوپر کھڑی ہوئی عورت بولی " پانی خوب گرم گرم ھے "۔

وہ عورت نے ھٹ کے ھنیل کو راستہ دیا جو سیڑھیاں چڑھ کے سیدھی کھڑی ھو گئی ۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا وہ کسی قدر ھانپ رھی تھی ۔ وہ اپنے ھاتھوں سے سر پر بندھے ھوئے رومال کی گرہ کھول رھی تھی ۔ اس کی ٹانگیں بڑی سفید اور شان دار لگ رھی تھیں ۔

نیلے کپڑوں والی عورت دھیمی آواز میں کہنے لگی " وہ سامنے کھڑے ھوئے لوگوں کو دیکھو "۔

" کون ! " ھنیل بڑی بے پروائی سے بولی ۔ پھر اس نے ادھر نظر ڈالی وہ یوں چونک اٹھی جیسے ڈر گئی ھو ۔ چاروں طرف اس طرح دیکھا جیسے بھاگ جانے کی ۔ دوبارہ ادھر دیکھنے پر کپتان کی نظروں سے نظریں ملیں ۔ کپتان نے اپنی ٹوپی اتار کے سلام کیا ۔

وہ زور سے کچھ ڈری ھوئی آواز میں چلائی :—

" ارے ، لیکن میرا خیال تھا میں نے کل کے لئے کہا تھا ! "

" نہیں ، آج کہا ! " پانی پر سے کپتان کی پر سکون آواز نے کہا ۔

" آج ! کیا آپ کو پورا یقین ھے ؟ " وہ کشتی کی طرف دیکھتے ھوئے بولی ۔

" بالکل یقین ھے ۔ لیکن اگر آپ چاھیں تو میں کل آجاؤں گا "۔

" آج ! آج ! " ھنیل نے بڑی حیرانی سے دھرایا " نہیں ۔ ذرا دیر ٹھہرئیے "۔ یہ کہہ کر وہ کسی گھر کی طرف دوڑ گئی ۔

کالی عورت نے اس کے پیچھے جاتے ھوئے پوچھا " یہ کیا بات ھے ؟ "

" یہ میرے ایک دوست ھیں — ایک ملاقاتی — کپتان ھیپ برن "۔ ھنیل کی آواز اندر سے سنائی دی ۔

ملاح نے اپنی کشتی آھستہ آھستہ کنارے سے لگا دی ۔ گہری سرخ رنگت والی عورت بالکل نھتبٹر جانے والے کاؤں کی طرح اپنی نیلی شال لپیٹے بڑے ناز اور بے توجہی سے باغیچے کے پیچھے سے ھوتی ھوئی سیڑھیاں طے کر کے پہلی بالکنی پر چلی گئی ۔ ھنیل ڈھیلے ڈھالے سلیپر پہنے کمر بٹر کرتی اور ایک پرانی سی شال لپیٹے کشتی کے پاس آ گئی اور کپتان سے ھاتھ ملاتے ھوئے بولی :-

" مجھے بڑا افسوس ھے ۔ میں بھی کتنی بے وقوف ھوں ۔ مجھے یہی یقین تھا کہ میں نے کل کے لئے تم سے کہا ھے "۔

" نہیں ، کہا تو آج ھی کے لئے تھا لیکن اب تمہاری خاطر میرا بھی جی چاہ رہا ھے کہ کل ھی ھوتا تو اچھا تھا "۔

" نہیں ، نہیں ۔ کوئی بات نہیں ۔ تمہیں ذرا دیر ٹھہرنا ناگوار تو نہ گزرے گا ؟ میری حماقت پر تم مجھ سے ناراض نہ ھو جانا "۔

یہ کہہ کر وہ چلی گئی بغیر ایڑی کے سلیپر اس کی برھنہ ایڑیوں میں پھٹ پھٹ لگ رھے تھے ۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں والی گندمی رنگ کی لڑکی بھی خاموشی سے مکان کے اندر چلی گئی ۔ پھر وہ برھنہ نو عمر لڑکا بھی نہایت خود اعتمادی کے ساتھ چل دیا ۔ وہ بڑا ھو کر نہایت خوب صورت مرد نکلے گا اور اس بات کا اسے خود بھی احساس تھا ۔

(۱٤)

برف کے پہاڑ ھمیشہ بڑی سرد مہری سے مسکراتے نظر آتے ۔ ھیپ برن اور ھنیل اسی جگہ تھوڑی دیر کے لئے سیر کو جانے والے تھے ۔ پچھلے دنوں موسم بہت گرم رھا تھا لیکن آج صبح سے

آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے ۔ کپتان صبح سویرے ہی کشتی کھیتا ہوا جھیل کے پار آ پہنچا تھا ۔ ہنیل اس چھوٹی سی کشتی میں آ بیٹھی اور وہ پھر واپس شہر کی طرف چل دئے ۔ ہوا پانی کو ہلکورے دے رہی تھی جس کی وجہ سے کشتی بھی ڈولی جا رہی تھی ۔ برف کی چٹان سلسلہ وار پہاڑیوں کے درمیان کھڑی بڑی سرد مہر اور ناراض معلوم ہو رہی تھی ۔ لیکن آسمان پر نکھری ہوئی صبح بڑی دلفریب تھی ۔ جھیل کے شمالی کنارے والے میدانوں سے ہوا کے ساتھ سوکھی گھاس کی بڑی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی ۔ سامنے دور بھوری برہنہ چٹان پہاڑوں کی دیوار سی لگتی تھی ، خالص چٹان جس پر برف کے ہلکے اور پتلے ٹکڑے پڑے تھے ۔ کل جھیل پر بارش ہوئی تھی ۔ سورج ابھی پہاڑ کے پیچھے سے طلوع ہونے والا تھا آسمان پر تیرتے ہوئے بادل نیلی اور پیلی روشنی میں بڑے خوب صورت اور مسرت انگیز معلوم ہو رہے تھے ۔ لیکن ہنزگاؤ کی وادی سے سیاہ بادل امڈے چلے آ رہے تھے اور ان کے یکبارگی جھیل پر چھا جانے سے سایہ پڑنے لگا ۔ اب پانی میں صبح کے آسمان کا کوئی عکس نمایاں نہ تھا ۔

آج کوئی تہوار تھا اور چھٹی کا دن ۔ اتنی سویرے بھی تین پہاڑی نوجوان بیدن سٹالٹ کی سیڑھیوں کے قریب نہا رہے تھے ۔ وہ خوب صورت اور ہٹے کٹے لوگ تھے اور ان کے گٹھیلے اعضاء صبح کے پانی میں ابھرا رہے تھے ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں بڑا لطف آ رہا ہے ۔ لیکن ہیپ برن کو پورا وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پہاڑوں کے اوپر ایک سیاہ بدروح کی طرح چھایا ہوا ہے اور یہ تین تندرست برہنہ نوجوان اس سائے میں تیر رہے تھے ۔

صبح صبح سب سے پہلے ہیپ برن کی کشتی چلنی شروع ہوئی ۔ کپتان نے کشتی کو ہوٹل کے کشتی گھر میں کھڑا کر دیا ۔ ہنیل اور وہ چھوٹے سے شہر کی طرف چل دئے ۔ سایہ ابھی کافی گہرا تھا گو بادلوں کے اوپر آسمان کی روشنی خاصی چمک دار ہو چکی تھی ۔ لیکن یہ سایہ اس سیاہ و سفید شہر پر ملجھٹ کی طرح بوجھل ، تاریک اور خنک لگ رہا تھا ۔

ساری دکانیں بند تھیں لیکن پہاڑیوں پر بسنے والے کسان ابھی سے اپنے چھٹی کے لباس پہنے ادھر ادھر گھومتے پھر رہے تھے — یعنی چھوٹی جرسی پتلونیں جیسی کہ فٹ بال کھیلتے وقت کھلاڑی پہنتے ہیں ، گندمی گھٹنے باہر نکلے ہوئے ، بڑے بڑے بوٹ چڑھائے ، چھوٹی خاکستری جیکٹیں پہنے جن کے سامنے کی طرف سبز رنگ کی پٹی تھی اور سروں پر سبز ٹوپیاں جن کے پیچھے بڑے فخر کے ساتھ بارہ سنگھے کی کھال لگی ہوئی ۔ وہ بھٹکی ہوئی روحوں کی طرح منڈلاتے معلوم ہو رہے تھے ۔ یہ لوگ پتلون کی سامنے والی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اپنی ٹوپی کی پیچھے والی ہرن کی دم اس فخر کے ساتھ پھڑکاتے پھر رہے تھے جیسے پہاڑوں پر بارہ سنگھا اپنی دم اٹھائے رکھتا ہے لیکن بھٹکی ہوئی روحوں کے سے انداز نے اس شان اور ٹھسے کو باطل کر کے رکھ دیا تھا ۔ چند عورتیں بھی چل پھر رہی تھیں ۔ یہ دھقانی عورتیں عجیب و غریب قسم کی چھوٹی چھوٹی کالی ٹوپیاں پہنے تھیں جن کے کناروں تلے بھاری گوٹا لگا ہوا تھا اور کالے فیتوں کے لمبے لمبے پھریرے ہوا میں اڑ رہے تھے — چوڑے ، سیاہ اور لہراتے ہوئے فیتے جو ٹوپی کے پچھلی طرف والی گرہ سے شروع ہو کے دامن کے نچلے سرے تک لٹکتے تھے ۔ ان عورتوں کے فراک کسی موٹے اور گہرے رنگ کے کپڑے سے بنے ہوئے تھے جن کی چولیاں خوب کسی ہوئی اور گھیر بہت چوڑے اور بھاری تھے ۔ ان فراکوں کے اوپر خوب چمکیلے اور گہرے رنگ کے ایپرن تھے ۔ یہ عورتیں پہاڑی لوگوں کی طرح بھاری بھاری قدم اٹھاتی آگے کو جھکی ہوئی تیز تیز چل رہی تھیں ۔ انہیں میلہ شروع ہونے کا انتظار تھا ۔

ہیپ برن کی کمر پر ایک جھولا تھا جس میں دن بھر کے لئے کھانے کا سامان موجود تھا البتہ ڈبل روٹی کی کمی تھی وہ جب قریب پہنچے تو بیکری کا دروازہ کھلا ہوا پایا ۔ یہاں

سے انہوں نے ایک گرم گرم ، لمبی سفید خوب صورت اور میٹھی ڈبل روٹی خرید لی ۔ اُس کی قیمت ستر کرونز تھی ۔ ہیپ برن کے لئے ہمیشہ یہ ایک اچنبھا ہی رہا کہ ایسی جگہ پر اتنی اچھی ڈبل روٹی کہاں سے آتی ہے ۔

چھوٹے سے چوک میں جہاں ایک گھنٹہ گھر بھی بنا تھا لوگوں کی ٹولیاں جگہ جگہ کھڑی تھیں اس جگہ ایک بڑی سی بس بھی تھی اور ایک موٹر کار جس میں کوئی آٹھ لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی ۔ ہیپ برن نے دو ٹکٹوں کے پیسے دے دئے تھے ۔ ہنیل نے اپنے سر پہ ایک باریک رومال باندھا اور موٹا سا کوٹ پہن لیا پھر وہ اور ہیپ برن ڈرائیور کے پاس سامنے والی نشست پر بیٹھ گئے اور ساڑھے نو بجے کار چل کھڑی ہوئی یہ فراٹے بھرتی شہر سے باہر نکلی جارہی تھی ۔ راستے میں کسی رئیس کی ایک خوب صورت کوٹھی آئی ۔ جس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ برجیاں اوپر کو نکلی ہوئی تھیں ، اسٹیشن آیا ۔ درختوں کے نیچے جھیل آئی ۔ سڑک کچھ ایسی اچھی نہ تھی لیکن وہ بڑی تیز رفتاری سے گزرتے جا رہے تھے ۔ آخر جھیل بھی پار کر کے جہاں سر کنڈے اگے ہوئے تھے اب وہ کھلی وادی میں پہنچے جس جگہ پہاڑوں میں دو شگاف پیدا ہو گئے تھے ۔ کار میں خوب سردی تھی ۔ ہیپ برن نے اوپر تک اپنے کوٹ کے بٹن بند کر لئے اور ٹوپی کو اپنے کانوں تک کھینچ لیا ۔ ہوا سے ہنیل کی شال پھڑا پھڑا رہی تھی ۔ وہ چپ چاپ سیدھی بیٹھی تھی اُس کا چہرہ خوب صورت اور تیکھا معلوم ہو رہا تھا وہ سامنے کی طرف دیکھتی جا رہی تھی ۔ بنزگاؤ کی گہری وادی سے دریا گرجتا اور شور مچاتا بہہ رہا تھا ۔ یہ زرد اور ہیجان خیز برفیلے پانی کا دریا تھا ۔ یہاں سے بھی کار لٹھے کے پل کو طے کرتی ہوئی تیزی کے ساتھ سامنے کے بڑے بڑے ڈھلانوں کی طرف چل دی ۔ پھر اچانک ایک بہت ہی بڑا موڑ آیا —— اونچے پہاڑ والے ایک بل کھاتی ہوئی سڑک —— اس جگہ سے بھی کار زوروں میں نکل گئی ۔ اونچی سڑک کے کنارے لگے ہوئے ناشپاتیوں کے پیڑوں کے نیچے سے ہوتی ہوئی اُسی بڑے قدیم تباہ شدہ محل کے پاس سے ہو کر گزری جو عین جھاگ اڑاتے دریا کے مقابل واقع تھا اور بہت شاندار معلوم ہوتا تھا ۔ پھر دہقانوں کی بڑی بڑی چھتوں اور چھجوں کے نیچے سے گزر کے دوسری وادی کے دھانے کی طرف جا پہنچی جہاں پہاڑ کی چوٹی پر سیاہ و سفید مکانوں والا ایک گاؤں آباد تھا یہاں ایک سفید گرجا بھی بنا تھا جس کے گرد سیاہ دیوار تھی اور ایک محل تھا اور اس کے چاروں طرف سیاہ کانٹوں کی باڑ لگی تھی اور پھر ٹائرول کے سفید و سیاہ مکانوں کا جمگھٹ تھا ۔ ان دیہاتی مکانوں میں بھی ایک عجیب شان ہے جہاں بڑی بڑی کشادہ غلام گردشیں بنی ہوئی ہیں جن میں ابابیلیں اپنے گھونسلے ایسے بڑے بناتی ہیں کہ انگریزوں کی پوری جھونپڑی اس جگہ سما جائے ۔

چنانچہ اُن کی موٹر اس نئی ، تنگ ، ویران اور منحوس وادی کا راستہ طے کرنے لگی ۔ جنگلی قسم کے خوب صورت لال لال کم عمر گھوڑوں کا ایک غول کار کے چاروں طرف آ نکلا ۔ ایک بڑی سی بھری بھری رانوں والی گھوڑی سامنے سڑک پر دوڑتی چلی گئی ، سڑک پر اُس کی ایڑیوں سے شعلے نکلتے معلوم ہوئے اور اُس کا بچہ پیچھے سے ہنہناتا ہوا چلا لیکن وہ سڑک پر مڑ نہ سکی ۔ وہ آگے آگے دوڑتی چلی گئی اور کار اُس کے پیچھے تھی ۔ پھر آخر کار وہ گھوڑی طوفانی دریا کی وادی میں اگے ہوئے پتلے پتلے درختوں کی طرف پلٹ گئی ۔

" اگر یہ گائے نہیں تو گھوڑی ضرور ہوگی "۔ ڈرائیور نے کہا ۔ وہ ایک دبلا پتلا ، خاموش اور اودبلاؤ کی طرح کا انسان تھا ۔ اُس نے اپنے کانوں پر ٹوپی کھینچ رکھی تھی ۔

لیکن گھوڑی پھر بڑے زور سے جوش میں پلٹی اور اپنے چیختے ہنہناتے بچے کی طرف بڑھی ۔ ہنیل ڈر گئی تھی ۔

کار چراگاھوں میں سے ھوتی ھوئی تنگی تنگی سفید پہاڑی سڑک پر دوڑتی چلی جا رھی تھی - سامنے سڑک پر پہاڑی سلسلے اور صنوبر کے درختوں کی وجہ سے اندھیرا تھا - دائیں طرف پتھریلا ، طوفان خیز پھرا ھوا سا دریا بہتا تھا - جو اس طرف سے گدلا گدلا دکھائی دیتا تھا اور دور ایک ڈھلان تھا - لیکن فی الحال تو سڑک اس بے حس و حرکت چراگاہ کی جنگلی وادی میں خاصی ھموار جا رھی تھی - راستے میں پھاٹک پڑے جنہیں اتر کے کھولنا تھا یہ کام ھیپ برن نے انجام دیا جیسے وہ خادم ھو - موٹے موٹے مہمان سے یہودی جو پیچھے بیٹھے تھے ٹس سے مس نہ ھوئے -

پہاڑی پر بنے ھوئے ایک مکان پر پہنچ کے ڈرائیور نے ھارن بجایا اور بچے " ابا ! ابا ! " چلاتے ھوئے گھر سے نکل آئے --- پھر ایک عورت نکلی اس کے ھاتھ میں ٹوکری تھی - اس اودبلاؤ نما شخص نے مختصر الفاظ میں ان سے کچھ باتیں کیں وہ اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھوں سے بڑے پر شفقت انداز سے دیکھ رھا تھا اور پھر مسکراتے ھوئے کار چلا کے آگے بڑھ گیا - اپنے خاندان کی طرف دیکھتے ھوئے اس کا انداز ھی بدل گیا تھا - یہاں تک کہ جب ھیپ برن نے پھاٹک کھولے تو وہ شکریہ بھی ادا نہ کر سکا - اسے اپنے اس متوسط طبقے کے لوگوں کے بوجھ سے نفرت بلکہ سخت چڑ تھی - یہ طبقاتی نفرت بہت گہری ھے اور اپنی گہرائی میں یہ تمام انسانی جذبات کو ھڑپ کرنا شروع کر دیتی ھے - چنانچہ اپنے کرایہ داروں سے بے نیاز یہ چھوٹا سا ڈرائیور کانوں کو ڈھانپے اور باریک سی ٹھنڈی ناک سمیت چپ چاپ اور اکڑا اکڑا بیٹھا تھا -

کار اچانک درختوں کے جھنڈ میں مڑی اور گھاٹی میں داخل ھو گئی - خلیج کی تہ میں دریا چنگھاڑ رھا تھا - صنوبر کے گھنے درخت چاروں طرف پھیلے ھوئے تھے - یہاں ھوا بڑی سرد تھی اور اس جگہ دھوپ کا گزر نہ ھوتا تھا اس لئے تاریکی چھائی رھتی تھی - ان کی کار اس تاریکی ، چٹانی سلسلے اور صنوبر کے درختوں میں سے فراٹے بھرتی چلی جا رھی تھی -

پھر اچانک کار رک گئی - آگے ایک بہت بڑی ستری رنگ کی بس چلی آ رھی تھی - پچھلی رات جو لوگ برفیلی چٹان دیکھنے گئے تھے وہ واپس آ رھے تھے - یہ بس ایک عظیم چٹان کی طرح جمی کھڑی تھی - چھوٹی سی کار کنارے سے ھو کر پہاڑی سلسلے سے بالکل قریب ھو کر جھکی ھوئی گزر گئی -

چنانچہ تھوڑی دیر تک موت کے سائے کی اس وادی میں سفر کرتے ، گہری کھائیوں اور اونچے پہاڑوں پر سے ھوتے ھوئے کار بڑے عجیب و غریب طریقے سے درختوں میں سے گزر کے بالآخر منزل پر پہنچ گئی - بادامی رنگ کی لکڑی سے بنی ھوئی ایک بہت بڑی سرائے یا سیاحوں کا ھوٹل بنا تھا اور یہاں چھوٹی سی خلیج کی شکل میں آ کے سڑک ختم ھو گئی تھی اور اس کے اطراف درخت اگے ھوئے تھے - پرلی طرف ایک گھر سا تھا اور طوفانی دریا کا پل تھا - جھکے ھوئے درختوں کے باعث ھمیشہ یہاں تاریکی چھائی رھتی اور بالکل اوپر گہری اور تندتند قسم کی ڈھلانیں تھیں -

ھنیل نے اپنا بڑا کوٹ وھیں چھوڑ دیا - اس تاریکی میں سے اوپر کا آسمان نیلا معلوم ھو رھا تھا وہ برفیلے پانی کے ھمیشہ بے تحاشا بہتے ھوئے دھارے کے اوپر والے کھوکھلی سی آواز نکالتے ھوئے پل پر سے گزرے ، چڑھائی پر چڑھتے ھوئے گھنے درختوں کے نیچے سے برفیلی چٹان کی طرف روانہ ھو گئے - راستے میں ایک چھوٹا سا بوڑھا آدمی ایک ڈبہ ھاتھ میں لئے ھوئے پچاس یا ساٹھ کرونن مانگ رھا تھا جو غالباً اس سڑک کی دیکھ بھال کے لئے ایک قسم کا محصول تھا -

دوسرے لوگ بھی پیچھے آ رھے تھے --- ان میں سے بعض تو پینے پلانے کے لئے ٹھہر

گئے ۔ دوسری بس ابھی تک نہیں پہنچی تھی ۔ ھنیل اور ھیپ برن سب سے پہلے شخص تھے جو آھستہ آھستہ درختوں کے اس تاریک راستے پر چل کھڑے ھوئے ۔ چٹانوں پر اُگی ھوئی گھاس کے اوپر ابھی تک اوس کے قطرے پڑے تھے ۔ ادھر ادھر رس بھریاں اور بہت سی قسم کے بیر لگے تھے ۔ اور سینکڑوں سیاح یہاں سے گزرتے تھے اس لئے بہت کم بیر باقی بچے تھے ۔ بعض بوڑی پھول اپنی سیاھی کے باعث خوب چمک رہے تھے ۔ کہیں کہیں کوئی ھلکے نیلے رنگ کا پہاڑی پھول ننھا اپنا سر جھکائے خوب تنا ھوا کھڑا نظر آ جاتا ۔ کبھی کبھی بڑا سا نم آلود ڈیزی کا پھول رہاں اٹکائے کھڑا دکھائی دے جاتا ۔

یہ دونوں آھستہ آھستہ سڑک کا اونچا راستہ طے کرتے رہے ۔ یہ وادی کیا تھی پہاڑوں میں ایک شگاف تھا جس میں یہ کائی درخت ایسے معلوم ھوتے تھے جیسے اس برھنہ زمین کے خفیہ حصے میں بال اُگ آئے ھوں ۔ اس کھلی وادی کی تہ میں ھمیشہ ایک زور دار ، کبھی ختم نہ ھونے والا پانی موجزن رھتا تھا ۔ اوپر سے آسمان بالکل ایک نوکیلی میخ کی طرح لگتا تھا جو زمین کے اس شگاف میں دھنس گئی ھو اور وہ خوف ناک پانی اس میخ کے فولادی کنارے سے مشابہ تھا جس کی ھیبت ناک نوک چٹان کی ٹھوس مٹی میں گڑ گئی تھی ۔ بھلا کون یہ خیال کر سکتا تھا کہ روشن نرم و نازک آسمان اور پانی کی نرم و نازک جھاگ دون آبل اور دھنس کے اس تاریک اور سخت زمین میں جگہ بنا لیں گے ؟ لیکن یہ ایک حقیقت تھی ۔ ھنیل اور ھیپ برن بڑی مشکل سے اس چھوٹی سی اونچی سڑک پر چڑھتے جا رہے تھے ۔ یہ سڑک خلیج کی طرف آدھے راستے تک یوں ھی چلتی جاتی تھی ۔ وہ کبھی کبھی پیچھے مڑ کے ھوٹل کے کھڑکی شہتیروں اور لٹھے کی بنی ھوئی دیواروں کی طرف دیکھ لیتے تھے جو اب دور نیچائی پر ھونے کی وجہ سے سیلے سیلے اور چکنے گڑے ھوئے پتھر معلوم ھوتے تھے اور پھر ان کی نظر پیچھے آنے والے ساتھوں پر پڑ جاتی جو بڑی محنت اور مشکل سے اوپر چڑھے آ رہے ھوتے ۔ اس کے بعد انہیں تیزی سے بہتا ھوا پانی دکھائی دیتا جو شکاری جانور کی طرح لڑکا چلا جا رہا تھا اور اوپر پہنچ جانے کے بعد ان کی نگاہ سب سے جیسی بڑی بڑی چٹان کی دیواروں پر بڑی سیاہ و سفید ننگی ننگی چٹان جو آسمان کے پہاڑی سلسلے سے ایک ھیبت ناک دائرے کی شکل میں نیچے کو آتی معلوم ھوتی تھی ۔

ھیپ برن کو اس سے دلی نفرت محسوس ھوئی ۔ اسے اس سے نفرت تھی ۔ اس سے گھن آتی تھی ، بلکہ اسے تو یہ بڑی محض جبر معلوم ھوتی تھی ، یہ سب سے کی سی ننگی ننگی چٹان کا پھیلاؤ جو اتنی زبردست تھی کہ انسان کے وھم و گمان میں بھی نہ آ سکتی تھی اور اس خلیج تک پھسلتی چلی آئی تھی جہاں جھاڑیاں تاریکی میں بالوں کی طرح اُگی ھوئی تھیں اور پانی زور شور سے بہتا تھا ۔ اس کے اوپر پتلی پتلی برف کے ٹکڑے بکھرے ھوئے تھے ۔

یہ دونوں آھستہ آھستہ وادی کی اس طویل و عریض سڑک پر چڑھتے چلے گئے اور اس جد و جہد کی وجہ سے وہ پسینہ پسینہ ھو گئے ۔ سورج اب کافی بلند ھو چکا تھا اور کبھی کبھار ان کے راستے پر پوری طرح چمکنے لگتا تھا ۔ سیر و تفریح کے لئے آئے ھوئے لوگ پہاڑ سے نیچے بھی اتر رہے تھے ۔ ان میں دو لڑکیاں تھیں جو بڑے بڑے بوٹ چڑھائے ننگے سر اور بغیر آستین کے فراک پہنے ھوئے تھیں ۔ مردوں نے بڑے بڑے کھانے کے تھیلے لٹکا رکھے تھے اور ان کی ٹوپیوں میں سفید پھول اڑسے ھوئے تھے ۔ لوگ ایک دوسرے کا نہایت تپاک کے ساتھ استقبال کرتے تھے لیکن کہیاں بس سلام کر لیتا تھا ۔ اسے یہ گرم جوشی پسند نہ تھی ۔ ان خوفناک پہاڑوں پر لوگوں کا یہ جم غفیر دیکھ کر اسے سخت کوفت محسوس ھو رھی تھی ۔

اُس کی اور هنیل کی صحبت بھی کچھ ایسی خوش گوار ثابت نہ هو رهی تھی - اُن دونوں کے درمیان ایک قسم کی خاموش مخاصمت سی موجود تھی - هنیل کو چڑھائی کی محنت نے چڑچڑا کر دیا تھا لیکن بلندی کی هوا اس کی خنکی ، پانی کی زور دار گرج کی آواز ، چمکیلی چٹان کی بڑی بڑی دیواریں ، ان سب چیزوں نے هیجان دلا کے اسے ایک اور هی قسم کے وحشیانہ پن کی طرف مائل کر دیا تھا اور اس گھرے رنگ کے دبلے پتلے اور بلیوں کی طرح پھرتیلے کپتان کو جس میں ایک تیز قدم قوم کی سی جسمانی نزاکت تھی اس چٹان کے اوپر چڑھنے سے سخت نفرت تھی ، پانی کی آواز سے نفرت تھی ، اُس سے اُسے ڈر معلوم هوتا تھا اور بلندی کی یہ هوا اُس کے سینے کو سانپ کی طرح ڈس رهی تھی -

" بہت خوب ! بہت خوب !" وہ اپنی خوب صورت چھاتی سے لمبے لمبے سانس کھینچتی هوئی خوشی سے چلائی -

" هاں - کتنا خوفناک - کس قدر قابل نفرت "- کپتان بولا -

هنیل بڑی تیزی سے پلٹی اُس کی آواز میں پہاڑوں کی سی گونج تھی ، وہ بڑے طنز سے کہنے لگی :—

" اگر تمہیں یہ پسند نہ تھا تو پھر آئے کیوں تھے ؟ "

" مجھے کوشش تو کرنی هی تھی " -

"پھر اگر تمہیں یہ پسند نہیں تو میرا مزا کرکرا کرنے کی کیوں کوشش کر رهے هو ؟"

" مجھے اس سے نفرت هے " هیپ برن نے جواب دیا -

وہ اب زیادہ بلندی پر چڑھتے چلے جا رهے تھے جہاں زیادہ روشنی ، زیادہ کھلی جگہ اور زیادہ دھوپ تھی - وادی کا شگاف نیچے دور هی دور هوتا چلا گیا تھا - مخالف سمت میں برهنہ چٹان کا چمکیلا ڈھلان پاکیزہ آسمان کو چھوتا معلوم هو رها تھا - ایک خاص زاویے سے انہیں دور جھیل چھوٹی سی دکھائی دیتی تھی پھر دوسری چٹانوں کی دیوار سی پتھریلے پردے کی طرح تھی جو دور افق کی طرف دھیمی هوتے هوتے غائب هو جاتی تھی - اور آسمان پر کبھی بادل چھا جاتے اور کبھی نیلی دھوپ جھلملانے لگتی تھی -

هنیل نے پھر لمبے لمبے سانس لیتے هوئے کہا " بہت خوب ، اوپر آنے میں بھی کیسا مزہ هے "-

" هاں ، بہت اچھا - لیکن قابل نفرت بھی - مجھے تو سمندر کی سطح کے قریب رهنا زیادہ پسند هے - پہاڑوں پر چڑھ کے رهنا مجھے قطعی پسند نہیں " -

" هاں ، یہ تو ظاهر هی هوتا هے " هنیل بولی -

ایک نوجوان نے بڑے تپاک سے سلام کیا جس کے بازو اور سینہ برهنہ تھے اور جس کا سر بھی ننگا تھا - اُس نے نوکیلے بوٹ پہن رکھے تھے - کندھے پر کھانے کا جھولا تھا اور هاتھ میں ایک ڈنڈا - تمام دھوپ هوا اور پہاڑ کی برف اُس کی جلد اور اُس کے هلکے سفید سے بالوں میں جذب هوئی جا رهی تھی - چنانچہ اپنے بھاری کھانے کے تھیلے ، بڑی بڑی موٹی جرابوں اور عجیب و غریب سے نوکیلے بوٹوں کی وجہ سے هیپ برن کو اُس سے بہت نفرت محسوس هوئی -

هیپ برن نے بھی رکھائی سے سلام کر لیا - لیکن هنیل نے ذرا خندہ پیشانی سے جواب دیا -

اور وہ نوجوان دیوتا چٹانوں پر اچھلتا کودتا اپنے ڈنڈے کو سنبھالے اترتا چلا گیا - اس نوجوان کے فوراً بعد هی ایک لڑکی آئی جس کے بال هوا سے اُڑے جا رهے تھے اور اُس کی

قمیص کے بٹن سینے پر سے کھلے تھے اُس نے کارڈرائے کی برجس پہنی ہوئی تھی ، مڑی تڑی اُونی جرابیں ، موٹے موٹے بوٹ ، کھانے کا جھولا کندھے پر اور ہاتھ میں ڈنڈا ۔ وہ سلام کئے بغیر گذر گئی اور ہمارا یہ جوڑا خفگی آمیز خاموشی کے ساتھ کھڑا اُسے پہاڑ سے نیچے اُترتے دیکھتا رہا ۔

(۱۵)

ہاں تو خیر ہر چیز آخر کہیں نہ کہیں ختم ہو ہی جاتی ہے اور اسی طرح طویل سے طویل چڑھائی بھی ۔ چنانچہ بہت سی چڑچڑ ہٹ ، جد و جہد اور پسینہ بہانے کے بعد ہنیل اور ہیپ برن ایک کونے سے ڈھلان پر آ نکلے جہاں سڑک گھوم کے اس خوفناک وادی کے شگاف سے باہر اُوپر والے حصے کی طرف جاتی تھی ۔ اب وہ زیادہ ہموار سڑک پر آ گئے تھے ۔ اُن درختوں سے نکل کے اس برہنہ چٹان اور گھاس کے بڑے سے کنارے پر آ پہنچنے کے بعد یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی خوفناک جگہ سے نکل آئے ہوں ۔

” شکر ہے خدا کا ! “ ہنیل نے کہا ۔

وہ اس ڈھلوان کے گرد گھسٹتے ہوئے چل رہے تھے اور پھر انہیں سامنے ایک ایسی چیز دکھائی دی جو ہمیشہ نہایت دلفریب اور دل کش معلوم ہوتی ہے یعنی اُوپر بنی ہوئی ایک کم گہری برہنہ سی وادی جہاں پانی پہلی بار ہلکورے لیتا نکلا کرتا ہے ۔ ایک کم گہری ، ہموار اور انتہائی ویران وادی ــ آسمان تلے ایک چوڑے پیالے کی مانند ــ چٹان کی ڈھلانیں ، بھورے پتھر کے نشیب ، ارد گرد پھیلی ہوئی کھڑی چٹانیں ، آڑی ترچھی برف کی لکیریں اور نیچے پھسلتے ہوئے برف کے ڈلے ، پھر دریا اور چشمے ہر جانب سے بہتے ہوئے ، برف کے خنجر جیسے تیز ٹکڑوں میں سے نکلتا ہوا پانی جو یوں جنون آمیز تیزی سے پھسل رہا تھا جیسے ابھی ابھی رہائی ملی ہو ۔ جھرنوں اور آبشاروں سے پانی کشادہ اور کم گہری وادی میں گر رہا تھا ۔ اس وادی میں بے شمار چٹانیں اور لاتعداد پتھر پڑے تھے لیکن کسی درخت یا جھاڑی کا نام نشان تک نہ تھا ۔

البتہ دو ہوٹل یا سرائیں ضرور تھیں لیکن یہ نیچی اور پھیلی ہوئی دیہاتی سی جگہیں بھی اپنی پتھریلی چھتوں کے باعث اس پتھریلے علاقے کی وادی کا ایک حصہ ہی معلوم ہوتی تھیں ۔ سامنے اس وادی میں چٹانوں اور سنگریزوں کی بھر مار تھی ، دو سرائیں تھیں ، اور لاتعداد ننھے ننھے چشمے پھوٹے پڑ رہے تھے اور اس صحرا میں ایک پھٹی سی آواز والا سنگریزوں سے پٹا ہوا دریا بہتا تھا اور ایک پتلی سی پگڈنڈی تھی جو بل کھاتی ہوئی اس ویران ہموار حصے میں سے گذرتی تھی ، پہلے ایک سرائے کے پاس سے نکلتی پھر دوسری کے پاس سے اور دور اُس اونچی پہاڑی تک جا کے ختم ہوتی تھی جس کے اُوپر وہ برفیلی چٹان کسی باہر نکلی ہوئی بڑی خوفناک زبان کی طرح بڑی ہونک رہی تھی ۔

” آہا ، کتنا خوب صورت منظر ہے ! “ کپتان کچھ اس طرح بولا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو ۔

ہنیل نے جلدی سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا اُس کے چہرے پر عجیب و غریب کھویا کھویا اور ناقابل بیان سا تاثر نظر آیا اُس کی نظریں جیسے اپنے آپ سے کہیں پرے دیکھ رہی تھیں ۔ اُس کی آنکھیں سیاہ اور کسی مرکز پر جمی ہوئی تھیں ، وہ یوں بے حس و حرکت تھا جیسے اٹل اور ان مٹ ہو اور بلند حقائق پر غور کر رہا ہو ۔

وہ کامرانی کے جذبے سے تھرتھرا اٹھی ۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کپتان مغلوب ہو

گیا ہو اور وہ اس پر چھا چکی ہو !

" یہ بہت خوب صورت منظر ہے " ھنیل بولی ۔

" بہت خوب صورت اور ہمیشہ خوب صورت رہے گا " کپتان نے کہا ۔

" اُف ، سردیوں میں تو — " وہ چلائی ۔

کپتان کے چہرے کا انداز بدل گیا اور وہ اس کی طرف دیکھنے لگا ۔

" سردیوں میں تو تم اتنے اوپر آ ہی نہ سکوگی " ۔

وہ چلتے چلے گئے ۔ اوپر والی ڈھلانوں پر مویشی چر رہے تھے ان کی الگ الگ گھنٹیوں کی ٹن ۔ ٹنا ۔ ٹن ایسے لگ رہی تھی جیسے محصور فضا میں دھیمے سے برف گرنے کی چھنک ۔ اس آواز سے ہمیشہ کپتان کے اندر ایک قدیم اور مانوس سی آبادی پیدا ہو جاتی تھی اسے یوں لگنے لگتا جیسے اس کا جہاز ڈوب گیا ہو ۔ اس نے چاروں طرف نظر ڈالی وہاں کوئی درخت یا جھاڑی نہ تھی بلکہ ان کے بجائے صرف بڑی بھوری چٹانیں اور زرد سے پتھر بکھرے پڑے تھے ۔ لیکن ہاں ، ایک جانب کسی سیاہ گھنی ڈاڑھی کی طرح چند گلاب کی جھاڑیاں کھڑی تھیں ۔

کپتان کہنے لگا " مئی میں تو وہ سارا حصہ پھولوں کی وجہ سے گلابی ہو جاتا ہوگا" ۔

" میں اس زمانے میں ضرور آؤں گی ۔ ضرور آؤں گی " ۔ ھنیل خوشی سے چلائی ۔

دوسرے سیاح لوگوں سے سڑک بھری ہوئی تھی ۔ اور دو ننھی منی نیچی سی گاڑیاں تھیں جنہیں لمبے لمبے ملائم کانوں والے خچر کھینچ رہے تھے ۔ یہ گاڑیاں سیدھی نیچے موٹروں تک جا پہنچتی تھیں جہاں سے وہ ہوٹل کے لئے سامان وغیرہ لے کر آتی تھیں کیوں کہ آگے ہی ایک بہت بڑا ہوٹل تھا ۔ ہیپ برن اس بلند وادی میں پہنچ کے بڑا خوش تھا یہ وادی جو ابتدائی چشموں کا گہوارہ تھی ۔ اسے چٹان کے اوپر برف کے بڑے بڑے نوکیلے ٹکڑے بڑے اچھے لگتے تھے جو یوں معلوم ہوتے تھے جیسے زمین کی جلد کو کاٹے ڈال رہے ہوں اور برف کے نوکیلے سروں سے جنم لیتا ہوا دریا روتا ، شور مچاتا تیزی سے نیچے گر رہا تھا ۔

گھاس سے ڈھکی ہوئی سڑک کے کناروں اور چٹانوں کے نیچے بہت سے پھول اُگے ہوئے تھے ۔ یہ پھول بہت خوبصورت ، بڑے بڑے ٹھنڈے اور گہرے رنگوں کے تھے جو سیاہی مائل اودی برف کی طرح لگتے تھے ۔ پھر ننھے منے ہلکے نیلے رنگ کے پھول دیکھ کر تو یہ گمان ہوتا تھا جیسے کسی پریوں کے ملک کے مینڈک نے برف کی جھاگ اور بلبلے اڑا دئے ہوں ۔ ان کے علاوہ روئیں والے بڑے بڑے اور سخت پہاڑی پھول تھے ، پھر مٹیالے سے رنگ کے سرخی مائل اور ہلکے نیلے پھول بھی تھے ۔ پہلے پہلے گلاب بھی دکھائی دیتے تھے اور بعض جگہوں پر خوب گہرے گہرے رنگوں کے پھول اُگے ہوئے تھے ۔ ان عجیب اور خوفناک سے رنگوں کو ہیپ برن بار بار دیکھتا جا رہا تھا ۔ بھلا اس چمک دار اودی سی شدید تاریکی میں برف کہاں سے آ گئی ؟

(۱۶)

ان زور دار چشموں میں سے ایک کے کنارے بہت سے خوشبودار پھول اُگے ہوئے تھے ۔ یہیں ایک چٹان تلے دھوپ میں بیٹھ کے ھنیل اور کپتان نے کھانا کھایا ۔ کوئی گیارہ بجے کا عمل تھا ۔ ایک دبلی شہد کی مکھی ان پھولوں میں منڈلاتی پھر رہی تھی ۔ باقی تمام تر جوش سے

پتھروں پر بلا کسی روک ٹوک کے بہے جا رہا تھا ۔ کپتان نے ہماری ہنیل کے لئے یہ چمکیلا اور ٹھنڈا پانی ایک پیالے میں بھرا اور ہنیل نے اس میں ہنگری کی لال شراب ملا لی ۔

نیچے سڑک پر لوگ زائرین کی طرح پھر رہے تھے اور وادی کے بند خاتمے پر کاٹی ہوئی سڑک پر چڑھتے ہوئے جو بالکل سیڑھیوں کی طرح معلوم ہوتی تھی وہ لوگ بہت ننھے منے لگ رہے تھے ۔ اُن کے حرکت کرنے سے ہی پتہ چلتا تھا کہ وہ آدمی ہیں ۔ لیکن وادی کے اوپر چلتے ہوئے وہ بالکل گول گول پتھر سے معلوم ہوتے تھے ۔ اُن کے پاس سے ایک بہت ہی خوب صورت خچر گزرا جس کے پیچھے پیچھے ایک اڈھیر عمر کی عورت گرم کپڑے پہنے اور ایک چوڑی پیشانی والا مرد ترچھی چڑھائے آ رہا تھا ۔ خچر ایک نہایت عجیب چھوٹی سی گاڑی کھینچ رہا تھا جس میں بس ایک کرسی تھی جیسی اکثر گول سی دفتروں میں رکھی ہوتی ہیں ، اُس کرسی پر سرخ مخمل چڑھی ہوئی تھی اور اُس میں دو پہیے لگے ہوئے تھے ۔ لال مخمل پرانی ہونے کی وجہ سے بھوری ، نارنجی اور پھلوں کے رس کے رنگ کی سی ہو کے رہ گئی تھی ۔ واقعی بہت عمدہ رنگ تھا اس کا — ایک چھوٹا سا میلے کپڑوں میں ملبوس خچر بان بڑے جوش میں ساتھ ساتھ چل رہا تھا ۔

” آہا ، یہ تو بالکل جنگ سے پہلے کا سا نظارہ معلوم ہو رہا ہے ۔ اسی طرح پرسکون “ ہنیل زور سے بولی ۔

” سوائے اس کے کہ کرسی بہت ہی پھٹی پرانی ہے اور وہ لوگ ضرورت سے زیادہ خوش ہیں “ کپتان نے کہا ۔

اوپر کی وادی میں سکون کا ذرا سا بھی احساس نہ ہوتا تھا ۔ پانی کا شور بالکل ہتھیاروں کی سی کھڑکھڑاہٹ کی طرح معلوم ہوتا تھا اور سب کے سب سیاحوں پر جنون کی سی کیفیت طاری تھی گویا وہ خوشی یا سرور حاصل کرنے کی دیوانہ وار کوشش کر رہے ہوں ۔ یہ ایک ایسا جذبہ تھا جو دل کو ویران کر کے رکھ دیتا تھا ۔

وہ دونوں جس چٹان تلے بیٹھے تھے وہاں بار بار دھوپ کا رخ بدل رہا تھا ۔ یہاں پہاڑی پھولوں کی مہک تھی اور ہوا بے حد سرد ۔ انہوں نے ساتھ لائے ہوئے انڈے ، گوشت اور مکھن کھایا اور ہنگری کی چمک دار لال شراب پی ۔ سب چیزوں کا بہت ہی لطف آ رہا تھا ، بالکل اس طرح جیسے جنگ چھڑنے سے پہلے آیا کرتا تھا ۔ ابدی تعطیل کا سا احساس گویا یہ دنیا محض انسان کی تفریح طبع کے لئے خلق کی گئی ہو ۔ لیکن نہیں بالکل ویسی نہیں ۔ اُس طرح کا احساس تو پھر پیدا ہو ہی نہیں سکتا ۔ یہ دنیا محض انسان کی تفریح کے لئے نہیں بنائی گئی ہے ۔

الگزینڈر کھانے کے تھیلے میں ڈبل روٹی رکھتے ہوئے کہنے لگا :—

” ارے ، ذرا یہ تو دیکھو ! “

ہنیل نے دیکھا ۔ کپتان ایک پتلا سا کاغذ میں لپٹا ہوا پیکٹ نکال رہا تھا یہ کوئی تصویر معلوم ہوتی تھی ۔

” تصویر ! “ وہ زور سے بول اٹھی ۔

کپتان نے وہ چیز کھول کے ہنیل کے ہاتھ میں دے دی ۔ یہ تھیوڈور وار پسویڈے والی تصویر تھی جو کچھ ایسی بڑی نہ تھی اور ایک تختے پر بنی ہوئی تھی ۔

ہنیل نے اسے دیکھا تو پہلی بڑگئی اور مبہم سے لہجے میں چیخی ” اچھی ہے “۔

” بہت اچھی ہے “ کپتان بولا ۔

” خصوصاً یہ تلے ہوئے انڈے “۔

" ہاں ، یہ انڈے تو بالکل اصلی معلوم ہوتے ہیں "۔
" لیکن تمہیں یہ ملی کہاں سے ؟ " ہنیل نے پوچھا ۔
" ارے ، یہ تو میں نے مصور کے سٹوڈیو سے لی تھی "۔ اور پھر کپتان نے ہنیل کو بتایا کہ مجھے کس طرح تمہارا پتہ چلا ۔
" کتنی غیر معمولی چیز ہے ! " وہ چلائی " لیکن تم نے اسے خرید کیوں لیا ؟ "
" میں خود اچھی طرح نہیں جانتا "۔
" کیا تمہیں یہ پسند آئی تھی ؟ "
" نہیں ، کچھ ایسی زیادہ تو نہیں "۔
" تم اسے کبھی لٹکا تو سکتے ہی نہیں "۔
" نہیں ، کبھی نہیں "۔
" لیکن کیا تمہارا خیال ہے کہ یہ مصوری کا کوئی شاہکار ہے ؟ "
" میرے خیال میں جہاں تک رنگ بھرنے کا تعلق ہے یہ بڑی عمدہ تصویر ہے ۔ البتہ مجھے اس کے معنی کچھ ایسے پسند نہیں — مجھے تنگ نظری اچھی نہیں لگتی "۔
" نہیں ، نہیں " ہنیل ذرا پس و پیش کرتے ہوئے بولی " یہ تو خاصی خوفناک سی چیز ہے اسی لئے مجھے تعجب ہوتا ہے کہ تم نے اسے کیوں خریدا "۔
کپتان نے کہا " شاید اس لئے کہ کوئی اور اسے نہ خرید لے "۔
" تو کیا تمہیں اس کی بہت فکر ہے ؟ " ہنیل نے پوچھا ۔
" نہیں ، کوئی ایسی زیادہ تو نہیں ۔ ویسے مجھے تمہارے گدا بیچ دینے والی بات بالکل پسند نہیں آئی "۔
" در اصل مجھے پیسے کی ضرورت تھی " ہنیل نے آہستہ سے جواب دیا ۔
" اچھا ، یہ بات تھی "۔
"چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری رہی ۔
" مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے تم نے مجھے بیچ دیا ہو "۔ ہنیل نے بہت غصے کے ساتھ دھیمی آواز میں کہا ۔
" کب ؟ "
" جب تمہاری بیوی کو میں نے پہلی بار دیکھا اور جب تم غائب ہوگئے "۔
پھر کچھ دیر سکوت رہا ۔ اس بار کپتان چپ ہوگیا تھا ۔
" میں نے تمہیں خط تو لکھا تھا "۔ کپتان بولا ۔
" کب ؟"
" شاید مارچ میں لکھا تھا "۔
"ہاں ، وہ خط مجھے ملا تھا "۔ ہنیل کا لہجہ اسی قدر دھیما لیکن زیادہ غضب ناک تھا۔
اب کی دفعہ ایسی خاموشی چھا گئی جس میں دونوں برابر کے شریک تھے ۔ اس کے بعد ہنیل اٹھ کھڑی ہوئی ۔
" اب مجھے چل دینا چاہئے ، ورنہ اس رفتار سے ہم کبھی برف کی چٹان تک نہ پہنچ پائیں گے "۔

کپتان نے تصویر پھر باندھ لی اپنا کھانے کا تھیلا اٹھایا اور دونوں روانہ ہوگئے۔ کہیں کہیں ہنیل جھک کے سڑک کے کنارے والے چمکتے ہوئے مٹیالے رنگ کے پھول توڑنے لگتی ۔ جب وہ وادی کے دوسرے ہوٹل کے پاس سے گزرے تو انہوں نے دیکھا کہ میاں بیوی باہر چھوٹی سی میز پر بیٹھے ڈبل روٹی اور پنیر کھا رہے تھے اور وہ لال مخمل کی خچر سے کھینچی

بانے والی کرسی ایک طرف گھاس پر رکھی تھی - اُن کے بائیں طرف سیاہ اور آودے مکو کے جھنڈ تھے اور جند لمبی اور نیچی چھتوں والے مویشیوں کے باڑے بنے تھے جن کی چھتوں پر پڑے ہوئے پتھر ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے وہ آگ آئے ہوں جس طرح کہ ایسی جگہوں پر گھاس میں سے پتھر نکل پڑتے ہیں اس جنگل اور ویران سی جگہ میں کچھ سیاہ سؤر ناک سے مٹی کھود رہے تھے -

وہ گھومتے کھاتے وادی کے اوپر والے سرے تک پہنچ گئے - انہیں وہ ڈھلوان چٹان بالکل سامنے دکھائی دے رہی تھی اور جس طرح کسی زہریلے جانور کے منہ سے جھاگ یا بھاپ نکلتی ہے اسی طرح برف کی گہری تہ میں سے آبشار بہ رہے تھے اور یہیں سے برف کے پہاڑ کا ایک سرا بھی ایک بڑے نیلے اور سفید سمور کی طرح پھسلتا معلوم ہو رہا تھا -

وادی کے اختتام پر پھر خوبصورت خوبصورت بڑے اور گہرے رنگ کے پھول دکھائی دینے لگے جن میں سے بعض تو ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ہوا کے ہلکے جھونکے سے بھی جھک پڑیں گے - لیکن وہ در اصل نہایت مضبوط اور پہاڑی پھولوں کی طرح ذرا بھی حرکت نہ کرتے تھے - سڑک چٹان کی جانب ڈھلوان اور لمبی سی ہو کر پلٹ گئی تھی جہاں یہ سڑک بالکل سیڑھیوں کی طرح معلوم ہو رہی تھی - یہ دونوں بہت آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگے - اب پھر پیچھے سے نیچے کی طرف انہیں وادی نظر آ رہی تھی - خچر کی گاڑی بھی اسی جانب بڑھتی چلی آ رہی تھی کرسی کا منہ دوسری طرف تھا اور اس میں وہ عورت پھنس کے کمبلوں میں لپٹی بیٹھی تھی - اس کا دراز قد گورا چٹا درمیانی عمر کا خاوند برجس پہنے ننگے سر عین اس کے پیچھے پیچھے چلتا چلا آ رہا تھا -

الگزینڈر اور ہنیل آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتے جا رہے تھے - عین اُن کے سروں پہ لٹکی ہوئی چٹان واقع تھی جہاں سے سفید اور رگوں والے پھول سائے میں بالکل سیدھے اور سرد کھڑے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پانی نے سفید پھول کا روپ دھار لیا ہو - اوپر کی طرف انہیں برفیلی چٹان کا سرا پھسلتا ہوا ایسا لگتا تھا گویا کوئی عظیم خوفناک سا نیلا پنجہ ہو - آسمان سے گہرے بھورے رنگ کے بادلوں کی بھاپ اس طرح نکل رہی تھی جیسے کسی برفیلی دیگ میں سے سرد و سیاہ بخارات اٹھ رہے ہوں -

" بارش ہونے والی ہے "- الگزینڈر بولا -

" کچھ ایسی زیادہ نہیں ہوگی " - ہنیل نے مختصر سا جواب دیا -

کپتان نے کہا " خدا کرے ایسا ہی ہو " -

اور اس کے باوجود اسے ڈھلان کے اوپر چڑھ جانے کی کوئی جلدی نہ تھی بلکہ وہ تو مصر تھی کہ کھڑے رہ کر اس منظر کو دیکھتے رہے - چنانچہ سیاہ اور برفیلے بادل ٹھوس بنے چلے گئے اور سرد ہوا کے ساتھ بارش گرنی شروع ہو گئی - خچر کی گاڑی تیزی سے گذر گئی ، وہ عورت بڑے آرام سے خچر کی طرف پشت کئے بیٹھی تھی اس کی ٹوپی میں چھوٹا سا بٹیر کا پر لگا ہوا تھا - اس کے میاں نے ایک جھالر دار جبہ لپیٹ لیا تھا -

الگزینڈر کے پاس مٹی سے بچانے والا کوٹ تھا لیکن ہنیل نے تو صرف ایک سوئیٹر نما کوٹ پہن رکھا تھا جو عموماً عورتیں گھر پہ پہنتی ہیں - اوپر والے نشیبی سرے سے سرد مینہ برس رہا تھا - وہ ڈھلان کے اوپر گھسٹتے ہوئے بڑھنے گئے - پیچھے سے ایک اور خچر ان کے قریب سے ہو کر گذر گیا جس کے پیچھے پیچھے ایک بونا سا بوڑھا جلدی جلدی چلا آ رہا تھا - اس کے بعد ایک گاڑی گذری جو بالکل ٹھیلہ سا معلوم ہوتی تھی اس میں اوپر والے ہوٹل کے لئے ایک بڑے سے ٹوکرے میں گوبھی ، گاجریں ، مٹر اور گوشت کے ٹکڑے بھرے پڑے تھے -

"کیا بہت بارش ہوگی ؟ " الگزینڈر نے بونے سے پوچھا -
" صاحب ، آپ کیا پوچھ رہے ہیں ؟ " اس بونے آدمی نے دریافت کیا -
" بارش بہت دیر تک رہے گی ؟ "
" نہیں ، نہیں ، یہ بارش زیادہ نہ ہوگی "۔
اس جگہ بونے کا خچر لید کرنے کھڑا ہوگیا تھا - ذرا دیر بعد ہی وہ شخص اپنا خچر لے کر چل دیا - اب الگزینڈر اور هنیل ہی اس ڈھلان پر باقی رہ گئے تھے- ہوا میں سے فولادی سرد بارش اور خچر کی گرم گرم لید کی بو آ رہی تھی - الگزینڈر هنیل کے شانوں اور اس کے نیلے دامن پر مینہ برستا دیکھ رہا تھا - وہ کہنے لگا :-
" یہ بہت بری بات ہوئی کہ تم اپنا بڑا کوٹ نیچے ہی چھوڑ آئیں "۔
" اب اس کا ذکر کرنے سے کیا حاصل ! " هنیل نے جواب دیا - اس کی ناک غصے کے مارے پیلی پڑ گئی تھی -
" ہاں ٹھیک ہے " کپتان کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس کی پیشانی پر اداسی جھلکنے لگی - " بظاہر تو کوئی تجویز پیش کرنا ہر وقت ہی لاحاصل ہوتا ہے ! "
وہ بارش میں کپتان کی طرف پلٹ کے کھڑی ہوگئی - اس وقت وہ دونوں تقریباً ڈھلوان چٹان کی چوٹی پر کھڑے تھے - برف کی چٹان کا پنجہ عین ان کے سروں پر تھا اور نظر بھی نہ آتا تھا ، نیچے خلیج میں پانی زور شور سے بہے جا رہا تھا -
هنیل کپتان کے مقابل کھڑی ہوگئی اور کپتان هنیل کے مقابل -
" کیا تم نے کبھی میرے سامنے کوئی تجویز پیش بھی کی ہے ؟ " هنیل کے چہرے پر ایک سخت سرد قسم کی خفگی تھی ، بارش میں بھیگ جانے کے باعث اس کا چہرہ ننگا ننگا سا لگ رہا تھا - " کیا تم نے کبھی مجھ سے کسی بات کا تذکرہ کیا ہے ؟ "
" تم کسی کی بات سنتی ہی کب ہو ؟ " یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ بہت دھندلا ہو گیا اور آنکھیں عجیب طرح سے چمک اٹھیں -
" میں ؟ میں ؟ آہ ! کیا میں ہمیشہ تمہارے منہ سے ایک بات سننے کی منتظر نہیں رہی ہوں ؟ اور اب بالآخر اگر تم آئے ہی ہو تو تصویر لے کر یہ طعنہ دینے کہ میں نے تمہارا گڈا کیوں بیچ ڈالا - مجھے خوشی ہے کہ میں نے اسے بیچ ڈالا - وہ تو بالکل بے کار اور فضول سی چیز تھی ، پھٹی پھٹی آنکھوں والا احمق سا گڈا — اسے بیچ ڈالنے کے سوا اور میں کیا کرتی - تمہیں یہ کیوں کر خیال ہوا کہ میں اسے سنبھال کے رکھ چھوڑوں گی ، میں ایسا کیوں کرتی ؟ "
" پھر آج تم میرے ساتھ یہاں کیوں چلی آئی ہو ؟ "
هنیل بولی " آج میں تمہارے ساتھ یہاں کیوں چلی آئی ہوں - میں یہاں پہاڑ دیکھنے آئی ہوں جو اتنے خوب صورت ہیں اور مجھے تقویت بخشتے ہیں - اور میں برف کی اس چٹان کو دیکھنے آئی ہوں - کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں یہاں تم سے ملنے کی غرض سے آئی ہوں ؟ میں ایسا کیوں کرتی ؟ تم سے تو نیچے کسی ہوٹل وغیرہ میں بھی ملا جا سکتا تھا "۔
" تو تم ان پہاڑوں اور برف کو میرے ساتھ دیکھنے آئی ہو "۔ کپتان نے جواب دیا -
" اوہو پھر تو مجھ سے بھول ہوئی - تمہارا بس چلے تو تم خدا کے بنائے پہاڑوں تک میں عیب ڈھونڈ نکالو "۔
اچانک کپتان کے چہرے پر ایک تاریک شعلہ سا کوند گیا - وہ بولا :-
" ہاں ، مجھے ان پہاڑوں سے نفرت ہے - مجھے ان سے نفرت ہے - مجھے ان کی برف اور ان کے دکھاوے کی شان سے نفرت ہے "۔

" دکھاوے سے ! " هنیل هنس پڑی " اوه ! تو کیا تمہارے خیال میں پہاڑوں میں بھی دکھاوا اور نمود ہے ؟ "

" ہاں ، اُن کی بلندی اور اُن کی رفعت دکھاوے هی کا نام ہے - مجھے اُن کی بلندی سے نفرت ہے - مجھے اُن لوگوں سے بھی نفرت ہے جو پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ کے اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتے هیں - میرا جی چاہتا ہے ایسے لوگ وهیں رهیں اور اپنا پیٹ برف چبا چبا کے بھریں - میں انہیں نیچے کبھی نہ اُترنے دوں گا ، کبھی نہ اُترنے دوں گا - سن رکھو ، مجھے ان دونوں سے نفرت ہے ، جڑ ہے "۔

هنیل نے بڑے تعجب سے اُس کے گہرے سرخ ، روشن اور جامد سے چہرے کی طرف دیکھا - اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی گہرا شعلہ دن کی روشنی اور برفیلی بارش کے درمیان بھڑک اُٹھا ہو - ۔۔۔ ، هی فضول اور بے فائدہ ۔

هنیل نے ذرا تن کر کہا " تم ضرور کچھ دیوانے هو جو پہاڑوں کے بارے میں اس قسم کی باتیں کرتے هو ، وہ تو تم سے بہت بڑے هیں "۔

" نہیں " وہ کہنے لگا " وہ مجھ سے بڑے نہیں هیں "۔

" اچھا ! " وہ زور سے هنس پڑی " پہاڑ تم سے بڑے نہیں هیں ؟ تم ایسے هی غیر معمولی هو کیا ؟ "

وہ چلا اُٹھا " پہاڑ مجھ سے بڑے نہیں هیں - بالکل ایسے هی جیسے اگر تم کسی سیڑھی پر کھڑی هو جاؤ تو مجھ سے لمبی هو جاؤ گی - پہاڑ مجھ سے بڑے نہیں - وہ مجھ سے چھوٹے هیں "۔

" اوه ! اوه ! " وہ قدرے متحیر اور حیرانی کے عالم میں چیخی - " تو پہاڑ تم سے چھوٹے هیں " -

" ہاں " وہ چلایا " چھوٹے هیں " -

هنیل کے دیکھتے دیکھتے اچانک وہ بڑا خاموش اور کچھ دور دور معلوم هونے لگا - اُس کے چہرے پر گفتگو کا شائبہ تک نہ رہا تھا اور هنیل کو وہ یوں نظر آنے لگا جیسے وہ بہت دور کسی سرحد کے پار هٹ گیا ہے - اور اپنی خشمناک حیرت کے درمیان وہ اُسے بڑے تعجب اور لگاؤ کے سے انداز میں تکنے لگی - نہ جانے وہ کس ملک کا باشندہ تھا ، کس پراسرار اور مختلف فضا کا باسی تھا ؟

" تم میں یقیناً خود ستائی کا مادہ ہے "۔ هنیل بول اُٹھی اور اُس نے وهی کہا جو وہ محسوس کر رهی تھی -

لیکن کپتان نے صرف اُس کی طرف اپنی سیاہ ، خوفناک اور متکبر آنکھوں سے دیکھا - وہ خاموشی کے ساتھ بارش میں راستے پر چلتے چلے گئے - کپتان کے دل میں تند خاموشی اور مطلق العنانی کا جذبہ موجزن تھا — ایک عجیب و غریب ، گہری اور حاکمانہ سی طاقت جس نے اُس کے اندر خیالات کی جگہ لے لی تھی اور هنیل جو همیشہ سوچ بچار میں ڈوبی رهتی تھی وہ اس وقت بھی سوچ میں غرق تھی " کیا یہ شخص پاگل ہے ؟ آخر اس کا مطلب کیا ہے ؟ کیا یہ دیوانہ ہے ؟ یہ مجھ پر رعب جما کر مجھے قائل کرنا چاهتا ہے - آخر رعب جما کر مجھے کس چیز پر آمادہ کرنا چاهتا ہے ؟ کیا یہ چاهتا ہے کہ میں اُس سے محبت کروں ؟ "

اس سوال پر آ کے وہ رک گئی - اُس نے یہی سمجھ لیا کہ وہ مجھ سے محبت کی توقع رکھتا ہے - اس خیال سے اُس کے پندار اور غرور کو بڑی تسکین ملی اور کپتان سے هنیل کی خفگی بھی بڑی حد تک سرد پڑ گئی - اُسے یوں محسوس ہوا کہ اب مجھے کپتان سے کوئی شکایت نہیں رهی -

لیکن اس کے بارے میں کپتان* نے کیا طریقہ اختیار کیا تھا ! وہ چاهتا تھا کہ هنیل

اسے چاہے اس بات کا ہنیل کو یقین تھا ۔ وہ تو ہمیشہ بلکہ شروع ہی سے چاہتا تھا کہ میں اس سے محبت کروں بس بات اتنی تھی کہ اس کے بارے میں وہ کوئی مصمم ارادہ نہ کر سکا تھا ۔ اس نے کوئی پختہ ارادہ نہ کیا تھا ۔ اپنی بیوی کی موت کے بعد وہ پکا ارادہ کرنے کی [illegible] دیا تھا ۔ اور اب وہ تہیہ کر چکا تھا ۔ وہ چاہتا تھا کہ ہنیل اس سے محبت [illegible] لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ہنیل نے کیا بیچ ڈالا ہے تو یقینی بات ہے کہ [illegible] پہنچا ۔

چنانچہ [illegible] غور و فکر کے بعد ہنیل اس نتیجے پر پہنچی ۔ اس بات سے ہنیل کو اتنی خوشی [illegible] معمولی نہ سا رہی تھی ۔ اور اس وقت بارش میں چلتے ہوئے اسے کپتان کے ساتھ [illegible] محسوس ہونے لگا ۔ اس وقت بارش کسی قدر کم ہوتی جا رہی تھی ۔ جس چوٹی کی [illegible] چڑھ رہے تھے اس پر بکھری ہوئی بھاپ اب چھٹنے لگی تھی ۔ ذرا ہی اوپر آسمان پھر وہ [illegible] کا پنجہ اٹکا ہوا نظر آ رہا تھا ۔ اب بارش ختم ہونے والی تھی اور وہ دونوں ہوٹل سے اور [illegible] کی تیسری سطح سے کچھ زیادہ دور نہ تھے ۔

کپتان چاہتا تھا کہ ہنیل اس سے محبت کرے ۔ ہنیل کو اس خیال سے ایک کامرانی [illegible] مسرت کا احساس ہوا اور وہ ایسی چہک اٹھی کہ اب اسے اپنے شانوں پر گرتی ہوئی بارش کا بھی زیادہ خیال نہ تھا ۔ وہ چاہتا تھا کہ ہنیل اسے چاہے ۔ ہاں ، ہنیل نے اس کا یہی مطلب لیا تھا کہ وہ خود ہنیل سے محبت کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ اس کی خواہش تھی کہ ہنیل اس سے محبت کرے ۔

اور پھر جیسا کہ ظاہر ہے عورتوں کی طرح اس نے بھی یہ باور کر لیا کہ کپتان کو مجھ سے محبت ہے ۔ بہت سے مرد ایسے تھے جو ہنیل سے محبت کرنے کو تیار رہے تھے ۔ وہ تنہا اس بات پر مصر تھا کہ ہنیل مجھ سے محبت کرے — اسے اس بات پر حیرت بھی تھی اور غصہ بھی آتا تھا ، مگر دل میں اس پر یک گونہ اطمینان بھی تھا ۔ بہت خوب — وہ یہ بھی کر دکھائے گی ۔ بس یہی بات تھی! وہ سختی سے مصر تھا کہ ہنیل مجھ سے محبت کرے ۔ اس کے بارے میں خود کپتان کیا محسوس کرتا تھا ۔ اس کا مطلق خیال نہ کرنا چاہئے تھا ۔ ہنیل کو تو بس اس سے محبت کرنی تھی ۔ کپتان کے رعب میں آ کے یہ بات کرنی تھی ۔ اس سب کا ماحصل یہی تھا ۔ کپتان کی خاموشی ، تاریک اور غالب آ جانے والی روح کا تقاضا تھا کہ وہ ہنیل کو مجبور کر دے ، اس پر قابو پا لے ۔ وہ چاہتا تھا ہنیل اس سے ایسی محبت کرنے لگے کہ پوری طرح اس کے قبضے میں آ جائے ۔ وہ جسمانی اور جنسی طور سے ، اندر سے اس پر حاوی ہو جانا چاہتا تھا ۔

اور ہنیل ! اسے تو پورا یقین تھا کہ میں رعب میں نہ آؤں گی ۔ وہ اس سے محبت کرے گی ۔ شاید وہ محبت کرے گی : اور غالباً اسے اب بھی کپتان سے محبت تھی ۔ لیکن وہ کسی طرح بھی اس کے رعب میں آنے پر تیار نہ تھی ۔ نہیں ، اگر کپتان کو ہنیل کی محبت درکار ہے تو اسے گھٹنوں کے بل ہنیل کے سامنے جھک کر التجا کرنی ہوگی اور پھر وہ اس سے محبت کرنے لگے گی ۔ کیوں کہ اسے محبت تو کپتان سے تھی ہی ۔ لیکن ایک سیاہ آنکھوں
1 والا ہیکڑ آقا اسے بالکل قبول نہ تھا ۔

چنانچہ یہ تھا وہ شاندار نتیجہ جو ہنیل نے اس کی باتوں سے اخذ کیا تھا ۔ اس دوران میں بارش تھم چکی تھی اور وہ تقریباً اس اوپر والی سطح کے آخیر تک جا پہنچے تھے جہاں وہ چڑھ رہے تھے اور کپتان کچھ اس قسم کی خاموش ہچکچاہٹ کے ساتھ چل رہا تھا کہ ہنیل اسے بغور دیکھنے لگی کیوں کہ اسے بالکل معلوم نہ تھا کہ اس وقت وہ کیا محسوس کر رہا ہے ، کیا سوچ رہا ہے بلکہ یہ تک نہ جانتی تھی کہ وہ ہے کیسا ۔ وہ ہنیل کے لئے بالکل ایک

معمہ سا بن کے رہ گیا تھا — حس کے احساسات اور کلمات ہمیشہ سے ناقابل فہم قسم کے رہے تھے ـ کپتان جو کچھ کہتا یا محسوس کرتا تھا ہنیل کو اُس میں کوئی وجہ یا منطق دکھائی نہ دیتی تھی ـ اُسے کبھی پتہ نہ چلا تھا کہ ابھی پل بھر میں اُس کے مزاج میں کیا تبدیلی واقع ہو جائے گی ـ اور اس خیال نے ہنیل کو بے چین کر دیا اور وہ کپتان کو زیادہ غور سے دیکھنے لگی اور ساتھ ہی ساتھ ہنیل کی توجہ بھی زیادہ شدید ہوتی گئی ـ کپتان میں کچھ وہ کشش تھی جو ناقابل فہم چیزوں میں ہوتی ہے اور اُس کا عجیب سا نہ سمجھ میں آنے والا چہرہ — نہ کوئی بے معنی سا نقاب نہ تھا کیوں کہ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے ہی تو ہنیل نے اُس پر ایک شدید جذبہ طاری ہوتے دیکھا تھا جو اُس کے خیال میں بہت ہی احمقانہ قسم کی محبت کا مظہر تھا ـ عجیب و غریب ، تاریک اور بے نتیجہ محبت کا مظہر — پھر عجیب تند مزاجی کے ساتھ اُس کا دعویٰ سے یہ کہنا کہ میں پہاڑوں سے بڑا ہوں ـ دیوانگی تھی! دیوانگی ! خود ستائی ـ

لیکن چونکہ اب کپتان کا راز فاش ہو چکا تھا ـ اس لئے ہنیل نے اُسے معاف کر دیا بلکہ اُسے پسند کرنے لگی اور اُس کی وہ عجیب و غریب سی محبت جس سے ناقابل فہم قسم کی جھک سی پیدا ہونے لگی تھی وہ اب ہنیل کے لئے کافی سحر انگیز بن گئی تھی ـ ہنیل کو کپتان سے کسی قدر ہمدردی بھی تھی ـ لیکن وہ اُس کے رعب میں ہرگز نہ آئے گی ـ وہ اپنے آپ کو اُس کے اور اُس کے تاریک جذبے کے حوالے نہ کرے گی ـ نہیں ، کبھی نہیں ـ محبت میں تو دونوں کو برابر کا شریک ہونا چاہیے یا محبت قطعی نہ ہو — اور اس مساوی طور پر محبت کرنے کے لئے وہ تیار تھی ـ وہ تو بس اس بات کی منتظر تھی کہ کپتان اُس کے سامنے یہ تجویز پیش کرے ـ

(۱۷)

ہوٹل میں سیاحوں کی بھرمار تھی ـ الگزینڈر اور ہنیل ریستوران میں بیٹھے گرم گرم کافی اور دودھ پی رہے تھے اور برہنہ شانوں والی سوتی فراک پہنے اور ایپرن باندھے ہوئے لڑکیوں ، خوب صورت ، لڑکیوں کی سی نازک گردنوں اور بڑے بڑے بوٹوں والے نوجوانوں اور بہت سے بد وضع اور مہمل قسم کے یہودیوں کو دیکھ رہے تھے ـ یہ یہودی ٹائرول والوں کا سا لباس پہنے ہوئے تھے جو اُن پر بالکل زیب نہ دیتا تھا اور وہ بڑی حد تک آسٹرین معلوم ہوتے تھے ـ اُن کا انداز اور لب و لہجہ آسٹریا کے نوابوں کا سا تھا ـ اور اگر آپ اُن کی باتیں نہ سن رہے ہوں یا اگر اُنہیں غور سے نہ دیکھا ہو تو آپ اُنہیں آسٹریا کے نواب سمجھ بیٹھیں گے ـ بہرحال تعصب کو بالائے طاق رکھ کے یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ وہ ایلپس کے مالک یا کم از کم اس موسم گرما میں کسی ہوٹل کے مالک ضرور تھے ـ یہ مہمل قسم کے یہودی — تاہم یہ لوگ بھی اس جوش و خروش کی فضا میں تھوڑی سی صحت مندی ، سمجھ بوجھ ، غیر جذباتیت اور حقیقت پسندی پیدا کر رہے تھے ـ اُن کی طنز آمیز سیاہ آنکھیں ، اُن نازک گردنوں والے نوجوانوں سے یہ کہتی معلوم ہوتی تھیں ” عزیزو ، روح کو زیادہ پر پرواز نہ دو ! “

بارش تھم چکی تھی ـ بھورے آسمان پر تھوڑی دھوپ بھی چمکنے لگی تھی ـ الگزینڈر نے کھانے کا تھیلا وہیں چھوڑ دیا اور وہ دونوں باہر ہوا میں نکل گئے ـ اب اُن کے سامنے لیمربوڈن کی آخری چڑھائی تھی ـ یہ بلند چوٹیوں کے درمیان ایک بڑا سا بھیانک سا نشیب تھا ، آخری نشیبی وادی جو کوئی ایک میل لمبی تھی ـ اس کے آخر میں برف کے ناہموار پہاڑ پر سے برف کا ایک زبردست دھارا اندر گر رہا تھا ـ برف کی رنگت بڑی مٹیالی اور اداس سی تھی

کیوں کہ سخت گرمی کی وجہ سے وہ اوپر سے پگھل چکی تھی چنانچہ یہ ایک بہت بڑی ، مصور ، طوفان خیز ، پتھروں کی چتی دار برفیلی لہر کی دیوار سی معلوم ہوتی تھی جو ٹوٹے پھوٹے پتھروں کے ڈھیر والی وادی میں گر رہی تھی ۔ اس چھوٹی سی وادی میں پتھروں اور چٹانوں کے ٹکڑوں کے نزول کے ساتھ ساتھ دیوانوں کی طرح بہتا ہوا ایک دریا تھا ۔ بائیں طرف بھوری چٹان کھڑی تھی لیکن اوپر سے وہ ہولناک برف کا ڈھیر بڑے بڑے برف کے پنجے سے نیچے لڑھکاتا جا رہا تھا ۔ بالکل ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا گھنے بالوں والا سفید ریچھ بلندی پر پاؤں پھیلائے بیٹھا ہو اور اس کے خوفناک برف کے پنجے نیچے وادی کی طرف لٹک رہے ہوں ۔ گویا کوئی بڑا سا آسمانی ریچھ اوپر سے زمین کے ٹھوس نشیب میں مچھلیوں کا شکار کھیل رہا ہو ۔ ہیپ برن اسے دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا اور ہنیل کو بھی بڑی دہشت محسوس ہوئی لیکن اس سے ایک مسرت کا بھی احساس ہوا ۔ ان چٹان میں سے لٹکے ہوئے بڑے بڑے برف کے پنجوں کا کچھ حصہ تیز نیلے رنگ کا تھا لیکن یہ انتہائی لرزہ خیز اور زہریلی قسم کی نیلاہٹ تھی جیسے نیلی گندھک کے ٹکڑے ۔ برف کا بیشتر حصہ بہت ہی مٹیالا اور نیم روشن سا سبزی مائل بھورے رنگ کا تھا ۔

دونوں اس بڑے ویران اور پتھروں سے پٹے ہوئے حصے پر چٹانوں کے نیچے اور پانی کے اوپر سے ہوتے ہوئے برف کے ڈھیر کی جانب روانہ ہو گئے ۔ اس آخری حصے میں پھول زیادہ ہی خوبصورت تھے خصوصاً گہرے رنگ کے پھول تو بہت بڑے تقریباً سیاہ اور دھات کی طرح ٹھنڈے تھے ۔ اور بڑی آسانی سے یہ سوچا جا سکتا تھا کہ ان میں سے دھندلی شعاعیں نکلتی ہیں اور وہاں کی گھاس بالکل سیدھی کھڑی تھی ۔ سفید رگوں والے بڑے بڑے پیالے بہت ننگے اور برفیلی ہوا کے جانب کھلے کھڑے تھے ۔

برف کی اس بڑی بھدی چوٹی کے پیچھے سے جس نے وادی کے اخیر میں راستہ بند کر رکھا تھا ، ایک ہلکے بھورے رنگ کی گھنی دھند یا بادل امنڈا پڑ رہا تھا اور اس کی وجہ سے آسمان میں ایک ویران سی بھوری رنگت حلول ہو کے برف کے ڈھیر کا سرا ڈھانپ رہی تھی ۔ وادی کے راستے بھر لوگ چلتے چلے جا رہے تھے وہ یہاں بہت ہی غیر اہم سے لگتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان بھورے پتھروں اور چٹانوں کے ڈھیر میں کیڑے رینگ رہے ہوں ۔ ہنیل اور الگزینڈر اس تھکا دینے والے راستے پر جلدی جلدی بڑھتے چلے گئے ۔

ہنیل نے کپتان کی جانب دیکھتے ہوئے بڑی فتح مندی کے سے لہجے میں پوچھا " اب تو تم یہاں آنے پر خوش ہو نا ؟ "

" ہاں ، میں یہاں آجانے پر بہت خوش ہوں " وہ بولا ۔ اس کی آنکھیں جوش اور ولولے کے باعث پھیلی پھیلی تھیں ، ان میں سخت آزمائش کی جھلک تھی ۔ کپتان کے جوش کے اس عجیب و غریب تاثر نے اس منظر کو ہنیل کے لئے بہت ہی انوکھا اور خوفناک سا بنا دیا تھا ۔ وہ کانپ اٹھی ۔ لیکن یہ عظیم خاموش اور جان دار برف کا ڈھیر اب بھی ایسے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا کی تمام مسرت اور شان و شوکت کی کلید ہو ۔ یہ اسے ایک بہت شان دار جانور معلوم ہوتا تھا ۔

جب وہ قریب پہنچے تو انہیں برف کی دیوار نظر آئی ! برفیلی چٹان کا سرا ، دبیز ، سخت ، پتھروں اور مٹی کے ڈھیلوں سے پٹا ہوا ۔ نیچے سے پتھروں میں سے رس رس کے پانی زور کے ساتھ باہر نکل رہا تھا ۔ جب وہ زیادہ نزدیک پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ عظیم عفریت پسینہ پسینہ ہوئے جا رہا ہے ، اس کی منزہ اور چمک دار برف کی دیواروں پر سے پسینے کے دھارے اور سوتے بہے جا رہے تھے ۔ سامنے برفیلی چٹان آگئی تھی اور اچانک اس برف کی دیوار کے پاس آ کے ختم ہوئی تھی جس کے نیچے یہ لوگ کھڑے تھے ۔ قریب میں برف بالکل خالص

تھی لیکن ڈھیروں پانی اُس میں رکا پڑا تھا اور موسم گرم ہونے کی وجہ سے ساری سطح سڑ گل گئی تھی ۔ اس میں ایک بھدی چمک اور پانی کی سی گہری نیلی اور سبز رنگت تھی ۔ لیکن زمین کی سطح سے قریب پہنچ کر یہ پھر خوب چمک دار اور رنگین ہو جاتی تھی اور چھوٹے غاروں کے اوپر سفید پتھروں میں سے جہاں کی دیواروں میں سے ہمیشہ پانی ٹپکتا رہتا تھا فیروزے کی سی سبز رنگت اور ہلکے رنگ کے نیلم کی طرح پتلی اور نیلی سی شعاعیں نکل رہی تھیں ۔

الگزینڈر اس برف کے پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا ۔ اُس کی واحد خواہش یہی تھی کہ اُس پر چڑھ جائے ۔ چنانچہ اُس بلوریں گیلی دیوار پر چٹانوں کے درمیان وہ بڑی کوشش سے چڑھتے چلے گئے جہاں سے برف کے اوپر راستہ جا نکلتا تھا ۔ اُن سے آگے آگے بھی بہت سے لوگ دن بھر کی سیر کے لئے آئے ہوئے تھے اور اُن میں سے کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ وہ اور آگے چل پائیں گے یا نہیں کیوں کہ برف کا ڈھلان گہرا اور پھسلواں ہوتا جا رہا تھا اور یہاں پر برف بہت صاف تھی ۔ دھوپ کا یہاں ذرا بھی گزر نہ ہوتا تھا ۔ تا ہم یہ ایک خمیدہ کمر سے مشابہ تھی اور انسان اس پر اوندھا سیدھا ہو کے چڑھ ہی سکتا تھا اور پھر اس پہلی ہموار سطح پر پہنچ سکتا تھا جو اس بڑے پنجے کے اوپر تھی ۔

دھندلی دھندلی اور بھیگی ہوئی برف کے ٹیلے کے سامنے ایک چھوٹا سا جھمکٹ لگا ہوا تھا ۔ وہ سب کے سب خوف زدہ تھے اور یہ ڈر ایک فطری چیز تھا ۔ لیکن جیسا کہ انسان کا خاصا ہے وہ سب کے سب اپنے خوف کی حد سے دور پہنچ جانا چاہتے تھے یہ عجیب سی بات تھی کہ برف اتنی پاکیزہ اور بالکل جلد کی طرح دکھائی دیتی تھی ۔ یہ چمک دار نہ تھی کیوں کہ اس کی سطح نرم تھی کسی گہری اور نرم جلد کی اوپر والی تہ کی طرح ۔ لیکن دور نیچے گہرائیوں تک برف بالکل صاف اور پاکیزہ تھی ۔

الگزینڈر پہلے تو بدرے ہچکچاتا رہا لیکن بالآخر ڈرتے ڈرتے برف پر چلنا شروع کر دیا ۔ وہ برف سے ڈرتا تھا ۔ اُس کے پاس کوئی چھڑی بھی نہ تھی اُس نے صرف ایک نرم تلے والے بوٹ پہن رکھے تھے ۔ لیکن اُسے برف کے پہاڑ پر جا کھڑے ہونے کی بڑی خواہش تھی ۔ چنانچہ کانپتے اور ڈرتے ہوئے اُس نے صاف ڈھلان پر مشکل سے دو چار قدم طے کئے ۔ اوپر سے برف نرم تھی یہاں وہ اپنی ایڑیاں اس میں گاڑ سکتا تھا اور ادھر اُدھر بھی پاؤں جما سکتا تھا ۔ چنانچہ لڑکھڑاتا اور ادھر اُدھر جھولتا ہوا وہ کئی گز اوپر چڑھ گیا اور اب بالکل برف کی برہنہ ڈھلان پر جا پہنچا ۔

فوراً ہی نیچے کھڑے ہوئے چند نوجوانوں اور موٹے آدمی نے بھی چڑھنا شروع کیا ۔ اُن کے پیچھے دو لڑکیاں بھی تھیں ۔ کچھ دیر تک تو الگزینڈر ڈرتا ڈراتا اور لڑکھڑاتا آگے آگے چلتا رہا ۔ برف کی ڈھلان بہت سیدھی اور گول گول ہو گئی تھی ۔ اس لئے اس پر کسی طرح بھی کھڑے رہنا ممکن نہ تھا ۔ بعض دفعہ وہ پھسل جاتا اور پھر اپنی برف سے جلی ہوئی انگلیوں سے نرم برف کے ڈھیر کو پکڑے ہوئے لٹک جاتا ۔ وہ اپنا کوٹ نیچے ڈال کے اُس پر پیر جمانے کی کوشش کرتا ۔ بعض اوقات وہ کافی تیزی سے پیچھے کو جھکتا اپنی انگلیوں سے ذرا سہارا لیتا ہوا آگے بڑھنے لگتا اور بالکل چوپایوں کی طرح چلتا ۔

ہنیل نیچے کھڑی اس مضحکہ خیز مظاہرے کو دیکھ رہی تھی اُسے ڈر بھی لگ رہا تھا اور ہنس بھی رہی تھی لیکن اُسے خوف زیادہ لگ رہا تھا اور وہ نیچے کھڑی برابر یہی کہتی رہی :—

” واپس آ جاؤ ۔ واپس چلے آؤ “۔ اور یہ سن کر ہنیل کے پاس کھڑے ہوئے آسٹریا کے لوگوں کو مزہ آتا تھا ۔

لیکن جب وہ پھر اپنے پیروں کے بل کھڑا ہو جاتا تو نیچے دور نیلا فراک پہنے کھڑی ہوئی ھنیل کی طرف دیکھ کر قدرے ناراضگی کے انداز میں ھاتھ ھلا دیتا ۔ دوسرے لوگ جو کیل کے تلوں والے جوتے پہنے اور ھاتھ میں لکڑیاں لئے ہوئے تھے اُن کی اب ھمت بڑھ گئی تھی اور وہ کیکڑوں کی طرح رینگتے ہوئے ھمارے ھیرو سے بھی آگے نکل گئے اور اُس سے زیادہ تیزی کے ساتھ فاصلہ طے کرنے لگے ۔

کپتان ایک ایسی جگہ جا پہنچا تھا جہاں برف میں ایک شگاف تھا وہ یہاں کنارے پر بیٹھ کر اندر کی طرف جھانکنے لگا ۔ برف بہت صاف ستھری ، زردی مائل اور شگاف کے اندر کی نیلی نیلی تھی ۔

اور شگاف کی گہرائی

میں پہنچ کے تو یہ بہت ھی تیز اور گہری نیلی ہو جاتی تھی ۔

اُس نے اُوپر کی طرف نظر ڈالی ۔ ابھی تو وہ ڈھلان کا آدھا فاصلہ بھی طے نہ کر پایا تھا ۔ چنانچہ وہ پھر چل پڑا ، نرم نرم جلد والی برف کے بے پناہ ڈھیر پر جہاں بعض دفعہ اُسے چاروں ھاتھ پاؤں سے کام لینا پڑتا ، کبھی اپنا کوٹ استعمال کرتا اور عموماً اپنی ایڑیاں برف میں گاڑ دیتا ۔ نیچے کھڑی ھنیل چیخ چیخ کر اُسے واپس آجانے کو کہہ رہی تھی ۔ لیکن اب دو اور نوجوان کپتان کے برابر جا پہنچے تھے ۔

چنانچہ وہ جد و جہد کرتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ تقریباً سرے تک جا پہنچا ۔ وہ کھڑا ہو کے برف کو دیکھنے لگا ۔ یہ اُوپر سے بالکل برف کی ایک کھلی کھلی دنیا معلوم ہو رہی تھی — پہاڑوں ، ڈھلان اور وادیوں کی خوفناک دنیا — بے حس و حرکت ، اور تمام کی تمام برف کی بنی ہوئی — دور اُوپر بھوری دھند کا بہت بڑا بادل جھول رہا تھا اور قریب ھی ساتھ ساتھ لمبے اور بڑے بڑے شگاف تھے جیسے برف کے کھپڑے ہوں ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان بڑے بڑے پتھریلے کلھڑوں میں برف سانس لے رہی ہو ۔ بہت سی خلیجیں اور ڈراؤنے غار بھی تھے ۔ یہ دراڑ جتنی گہری ہوتی جاتی ، نیلا رنگ اُتنا ھی تیز اور چمکیلا ہوتا جاتا ۔ یوں لگتا تھا جیسے برف وھاں سانس لے رہی ہو ۔

اس پہاڑ کی حیرت انگیز رفعت ، اس کی ھولناکی ، اس کی کھائی سب بڑی واضح تھیں ۔ یہاں ایک کونپل تک نہ پھوٹتی تھی ، زندگی کی ایک رمق بھی نہ پہاڑ ، نہ برف ظاھر نہیں کرتی تھی ۔ یہ ایک ایسی دنیا تھی جو زندگی کے عدم میں اپنی برف ھی میں مگن تھی ، اپنے لئے کافی و وافی تھی ۔

اگرچہ نوجوان اُس سے آگے چلے جا رہے تھے لیکن وہ نیچے اُترنے کے لئے مڑ گیا اور نیچے ایک منحوس سی کمان کی شکل میں پھیلی ہوئی گہری اور چمکدار برف کو سانس لیتے ہوئے دیکھ کر اور اپنے قدموں تلے بھی وھی حرکت محسوس کر کے وہ ڈر گیا ۔ اگر وہ پھسلتا تو یقیناً نیچے تک لڑھکتا ھی چلا جاتا ۔ اور اُس کی کچھ نہ کچھ ھڈیاں ٹوٹ کے رہ جاتیں ۔ جب کبھی وہ بیٹھتا تو اپنے ھاتھ کے ناخن برف میں گاڑ لیتا کیوں کہ اگر وہ یونہی پھسلنا شروع کر دیتا تو نیچے تک تیزی سے لڑھکتا چلا جاتا اور خدا جانے کہاں جا کے رکتا ۔

ھنیل نیچے کھڑی اُسے دیکھ رہی تھی اور وہ خوفزدہ تھا ، برف کی چٹان پر بیٹھے ہوئے اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نیچے کیسے اُترے ۔ اُوپر کی طرف اُسے نیلے برف

کے کلپھڑے ہوا میں بلند دکھائی دے رہے تھے ۔ نیچے دو نیلے شگاف تھے — پھر آخر میں پتھروں پر برف کے ہموار اور گیلے پنجے تھے ۔ پھر نیچے ھنیل کھڑی تھی اور اس کے پاس تین چار لوگ اور بھی جو وہاں تک آ پہنچے تھے ۔

بہر حال کپتان کو اب اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر وہ خوب زور سے اپنی ایڑیوں کو برف میں دھنسا دے تو خواہ ڈھلان کتنی ہی سیدھی ہو اس کا قدم جما رہے گا ۔ چنانچہ اس نے آڑے ترچھے ہو کر جھٹکے کھاتے نیچے کی طرف اترنا شروع کر دیا ۔

جب وہ نیچے پہنچا تو اس نے ایک سیاہ ڈاڑھی والے رہنما کو دیکھا جس کے ہاتھ میں رسیاں ، ڈنڈا ، بھاری بھاری بوٹ اور اسی قسم کے تمام لوازمات تھے ۔ وہ اور اس کے ساتھ والا صاحب برف کے اوپر چڑھنے لگے ۔ ان بھاری بھاری کیلوں والے بوٹوں کے ساتھ چڑھنا بہت آسان تھا اور پھر ڈنڈے کا سہارا بھی تو لیا جا سکتا تھا ۔

ھنیل جو کپتان کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی اور خوفزدہ بھی ہو رہی تھی واپسی میں سرپٹ چلی وہ بھی جلدی جلدی اس کے پیچھے چل دیا وہ برف سے اتر آنے پر خدا کا شکر ادا کر رہا تھا ۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے وہاں چڑھنے سے خوشی اور تسلی بھی ہو رہی تھی ۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے پر اسے معلوم ہوا کہ وہ اوپر چڑھنے والا آدمی اور رہنما ادھر ادھر دیکھ کر برف اور موسم کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ کچھ دیر بعد وہ بھی واپس پلٹ آئے ۔ کیونکہ دن خطرے سے خالی نہ تھا ۔

(۱۸)

وہ دونوں سوچ بچار میں غرق اور کافی مسرور پتھریلے علاقے اور زور سے بہتے ہوئے پانی کی طرف سے گزرتے ہوئے واپس ہوٹل میں آ پہنچے ۔ سورج ایک لمحے کے لئے خاصی تیزی سے چمک اٹھا اور کپتان کو کافی خوشی محسوس ہو رہی تھی حالانکہ برف پر چلنے کی وجہ سے اس کی انگلیوں کے سروں سے تھوڑا تھوڑا خون نکلنے لگا تھا۔

ھنیل کہنے لگی ” لیکن کسی دن ایک راستہ دکھانے والے کو ساتھ لے کر میں بھی بالکل اوپر اس برف کے پہاڑ پر جا چڑھوں گی “۔

” نہیں “ کپتان بولا ۔ میں کافی دور تک جا پہنچا تھا ۔ مجھے بھی دنیا زیادہ پسند ہے جہاں کم از کم کوئی بھی تو آگئی ہے ۔ برف پر تو کچھ بھی نہیں اگ سکتا “۔

” لوگ کہتے ہیں برف پر پسو ہوتے ہیں جو صرف برف ہی پر زندہ رہ سکتے ہیں “۔ ھنیل نے کہا ۔

” میرے خیال میں تو کوئی پسو بھی برف کھائے تو اسے اچھی نہ لگے “۔

” خدا جانے “۔ وہ ہنس پڑی ” لیکن تمہیں وہاں جا چڑھنے پر تو خوشی ہو رہی ہے نا ؟ “

” ہاں ، میں بہت خوش ہوں ۔ اب مجھے پھر کبھی وہاں جانے کی ضرورت نہیں “۔

” لیکن تمہیں چڑھنا بہت اچھا معلوم ہوا تھا ؟ “

” بہت اچھا ۔ لیکن میرا ذہن خوفزدہ ہو کے رہ گیا تھا “۔

(۱۹)

انہوں نے ہوٹل میں ہرن کا گوشت اور پالک کھایا ۔ اس کے بعد وہ نیچے اترنے لگے ۔

دونوں جھٹ خوش تھے۔ ھنیل نے کچھ پھول اکٹھے کر کے اپنے رومال میں رکھ لئے تا کہ وہ مرجھانے نہ پائیں اور تھوڑی سی شراب پینے کے لئے وہ پھر چشمے کے کنارے بیٹھ گئے ۔

لیکن برف کے پہاڑ کے پیچھے سے بادل کا دھؤاں پھر نکلنا شروع ہو گیا تھا ۔ ھنیل کچھ بے چین ہو گئی ۔ وہ نیچے اتر جانا چاہتی تھی ۔ چنانچہ وہ خاصا تیز چلنے لگے ۔ بہت سے دوسرے سیاح بھی جلدی میں تھے ۔ بارش شروع ہوگئی -- جیسے برف کے پہاڑ سے چند برفیلے قطرے ٹپک پڑے ہوں ۔ چنانچہ ھنیل اور ھیپ برن سستانے کے لئے رکے نہیں بلکہ آسانی کے ساتھ ڈھلوان چٹان سے تاریک وادی کی طرف اتر پڑے جہاں موٹروں کا اڈا تھا ۔

یہاں پہنچ کر انہوں نے چائے پی ۔ تھکے ہونے کے باوجود وہ خاصے مطمئن معلوم ہو رہے تھے ۔ ہوٹل کا بڑا ریسٹوران ڈراؤنا اور گندہ گندہ سا لگتا تھا ۔ چنانچہ ابتدائی شام کی تاریکی اور دھندلی سی روشنی میں وہ پھر باہر نکل گئے اور ایک نشست پر بیٹھ گئے۔ وھاں سے وہ آوارہ گردوں ، سیاحوں اور موٹر والوں کو دیکھتے رہے ۔ سیر کے لئے آنے والے لوگوں میں وی آنا کے تین یہودی تھے اور ایک لڑکی تھی جس کے پاس ایک بہت بڑا سفید اور بالوں والا کتا تھا ۔ یہ کتا اتنا بڑا تھا کہ گائے کا بچھڑا معلوم ہوتا تھا اور اس قدر سفید ، بالوں والا ، نرم نرم اور پیارا تھا کہ کھلونا لگتا تھا ۔ سب لوگ حسب عادت اسے پیار کرتے پچکارتے ہوئے گزرے جیسے کہ اکثر ناولوں میں یا روزمرہ کی زندگی میں لوگوں کا دستور ہوتا ہے ۔ لڑکی اس کی زنجیر پکڑے پیچھے کو جھک کے ایسے انداز سے بیٹھی تھی جیسے ناول کے سر ورق پر ھیروئن کی تصویریں ہوا کرتی ھیں --- اس لڑکی کا کہنا تھا کہ یہ سفید لمبا تڑنگا کتا سائبیریا کے گھاس کے میدانوں کا رہنے والا ہے ۔ الگزینڈر حیران تھا کہ گھاس کے میدانوں میں ایسے حیوان کا کیا مصرف ہوتا ہو گا ۔ اور تینوں یہودی مرد یوں ظاھر کر رہے تھے جیسے وہ مقبول ناولوں کے نفیس اور شائستہ ھیرو ہوں ۔

الگزینڈر نے کہا ” کیا تمہارا ھر ریجیرنگسرسٹ سے شادی کرنے کا ارادہ ہے ؟ “

ھنیل خوب بڑی بڑی آنکھیں کھول کے چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولی :—

” کچھ معلوم تو یہی ہوتا ہے نا ! “

” ھاں بالکل “۔

ھنیل اس سفید بالوں والے کتے کو دیکھتی رہی ۔ وہ کتا معمول کے مطابق اپنی ٹانگیں بڑے پیار سے اس کی طرف بڑھاتا ہوا چلا آ رہا تھا ۔ وہ چپ چاپ اسے تکتی رہی لیکن اسے چھؤا نہیں ۔

” تم نے یہ سوال کیوں کیا ؟ “ ھنیل بولی ۔

” میں کچھ کہہ نہیں سکتا ۔ لیکن پھر بھی تم نے در اصل اس کا جواب ہی نہیں دیا کیا واقعی ھر ریجیرنگسریٹ سے شادی کرنے کا تم نے پکا ارادہ کر لیا ہے ؟ کیا اس وقت یہ تمہارا قطعی فیصلہ ہے ؟ “

ھنیل نے کپتان کی طرف دیکھا اور بولی :—

” لیکن جواب دینے سے پہلے کیا میں یہ جان سکتی ہوں کہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ “

” یہ تو شاید تم جانتی ھی ہو “۔

” نہیں ، یقین مانو میں کچھ نہیں جانتی “۔

وہ کچھ دیر تک خاموش رہا ۔ وہ بڑا سا بالوں والا کتا اس کے سامنے زبان باھر نکالے بڑے پھسلانے والے انداز میں کھڑا تھا ۔ کپتان یونہی بے خیالی میں اس کی طرف دیکھتا رہا ۔

” اچھا “ وہ کہنے لگا ” اگر تمہارا ارادہ ھر ریجیرنگسریٹ سے شادی کرنے کا نہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ مجھ سے شادی کر لو “۔

... کے گراج کی طرف گھورتی رہی ۔ اس کے چہرے پر کچھ ... وقت نمایاں تھی ۔ اور ...

... کپتان سے فوراً دریافت کیا ۔

"تم نے یہ تجویز کیوں پیش کی کہ میں تم سے شادی کر لوں ؟"

"کیوں ؟" کپتان نے اپنے مخصوص گھسٹتے ہوئے لہجے میں کہا ۔ "کیوں ؟ بھلا عموماً ایک آدمی کیوں کسی عورت سے شادی کی درخواست کیا کرتا ہے ؟"

"کس مقصد کے لئے !" اس نے قدرے اکڑ کے پھر دھرایا ۔

"تمہارا مطلب ہے اس کی وجہ کیا ہے !" کپتان نے تصحیح کی ۔

ھنیل تھوڑی دیر چپ رہی ۔ اس کا چہرہ کچھ بند بند اور بے حس و حرکت معلوم ہو رہا تھا ۔ اس کے ہاتھ چپ چاپ گود میں پڑے تھے ۔ وہ کپتان سے نظریں بچا کے سڑک کی طرف تک رہی تھی ۔

"وجہ عام طور پہ ایک ہی ہوا کرتی ہے"۔ ھنیل نے بڑی باریک آواز میں کہا ۔

"اچھا ؟" کپتان نے عجیب طرح سے پوچھا ۔ "تمہارے خیال میں وہ کیا وجہ ہے؟"

وہ کچھ جھینپی لیکن پھر ذرا ترشی سے کہنے لگی : ۔

"وہ یہ کہ میرے خیال میں مرد اس سے واقعی محبت کرتا ہو ۔ بس میرے نزدیک تو ایک مرد کا عورت سے شادی کر لینے کی درخواست کرنا اسی بات کی دلیل ہے "۔

اس کے بعد موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی اور ھنیل اسے توڑنا نہ چاہتی تھی ۔ کپتان جانتا تھا کہ مجھے اس کا جواب دینا ہوگا لیکن کسی وجہ سے وہ نہیں چاہتا تھا کہ جو چیز اس قدر واضح ہو اسے زبان پر لائے ۔

"اس بات کو چھوڑو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے یا مجھے تم سے"۔ بالآخر وہ بولا ۔

"لیکن میں اس بات کو قطعی نہیں چھوڑ سکتی "۔ ھنیل نے کہا ۔

"اور میں قطعی اس بات پر توجہ نہیں دے سکتا "۔ وہ پھر اسی ڈھٹائی سے بولا ۔

اس بار ھنیل نے پلٹ کر بڑے تعجب ، تمسخر اور غصے سے پوری طرح کپتان کے چہرے پر نظر ڈالی اور کہا :۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ تم دیوانے ہو گئے ہو" ۔

"میرا خیال ہے کہ تم اصل میں مجھے ایسا نہیں سمجھتیں ۔ یہ تو محض بدلہ لینے کی ترکیب ہے ورنہ مجھے پتہ ہے کہ تم میرا مطلب بخوبی سمجھ گئی ہو "۔

"تمہارا مطلب ! تمہارا مطلب !" وہ چیخی "اچھا تو اس ساری بکواس سے تمہارا کچھ مطلب بھی ہے ؟"

"ہاں ۔ ضرور !"

وہ تھوڑی دیر تک خفگی کے عالم میں خاموش رہی ۔ پھر غصے سے بولی :۔

"میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میں تمہارا مطلب بالکل نہیں سمجھی ۔ مجھے اس میں کوئی مطلب نظر نہیں آتا سوائے اس کے کہ تمہاری باتوں میں صرف نا معقولیت جھلکتی ہے "۔

"بہت اچھا" کپتان نے جواب دیا ۔ "مطلب یہ ہے کہ کیا ہم صرف محبت کی بنیاد پر شادی کرتے ہیں "۔

"یقیناً ! شادی ! ہم شادی کریں ! میں نہیں سمجھتی کہ مطلب یہ ہے "۔

کپتان نے نشست کے نیچے سے کھانے کا تھیلا پاؤں میں دبا کے باہر کھینچا ۔ پھر اس

میں سے اُس نے وہ مشہور و معروف تصویر نکالی اور کہنے لگا :—

" جب یہ فرض کیا جاتا تھا کہ تم اور میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اُس تم نے میرا وہ گدّا بنا ڈالا تھا ۔ کیوں بنایا تھا نا ؟ " اور وہ بیٹھا اُس منحوس تصویر طرف دیکھتا رہا ۔

ہنیل نے ذرا تلخی سے کہا " میں نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اپنے آپ کو اس فرصت میں نہیں رکھا کہ تمہیں مجھ سے واقعی محبت ہے "

" اچھا تو دوسرا رخ لے لو کہ تمہیں مجھ سے محبت تھی یا نہیں " کپتان بولا ۔

وہ زور سے کہنے لگی " میں بھلا تم سے کس طرح محبت کر سکتی تھی جب کہ مجھے تمہاری محبت ہی کا یقین نہ تھا ؟ "

اُس نے اپنے گھٹنوں سے تصویر ہٹا کر نیچے رکھ دی اور کہنے لگا :—

" محبت کے بارے میں یہ سب باتیں بہت پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی ہیں "۔

" ہاں بہت زیادہ ! خصوصاً تمہارے سلسلے میں ۔ میرے لئے محبت بہت سیدھی سادی چیز ہے "۔

" کیا واقعی ؟ واقعی ؟ اور کیا اُسی سیدھی سادی محبت نے ہی تمہیں مجبور کیا تھا کہ میرا گدّا بنا ڈالو ؟ "

" میں تمہارا گدّا کیوں نہ بناتی ؟ کیا اس سے تمہیں کوئی نقصان پہنچا ۔ بخدا ، تم تھے بھی گدّے ہی ! تمہاری حقیقت ایک گدّے سے زیادہ اور کیا تھی ۔ اس لئے میں نے تمہارا گدّا بنا دیا تو تمہارا کیا بگڑا ؟ "

" مجھے تکلیف ہوئی ہے ۔ اس نے مجھے شدید ترین نقصان پہنچایا ہے "۔ کپتان نے جواب دیا ۔

ہنیل بڑی بڑی آنکھیں نکالے بڑی حیرانی اور غصے سے کپتان کی طرف پلٹی ۔

" کیوں ؟ بتاؤ نا کیوں ؟ مجھے بتاؤ نا کیوں ؟ "

" نہیں ، میں بتا نہیں سکتا "۔ کپتان نے تصویر اس سے لے کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا ۔ ہنیل نے تصویر کو دیکھ کر اپنا منہ اس طرح پھیر لیا جیسے کوئی بلی جلتے ہوئے سگرٹ سے بدک جاتی ہے — " جب بھی میں اس تصویر کو دیکھتا ہوں ۔ مجھے پتہ چلتا ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان ذرا سی بھی محبت نہیں تھی "۔

" پھر تم میرے ساتھ اس شرمناک انداز میں کیوں باتیں کر رہے ہو "۔ وہ بھڑک اُٹھی ۔ اُس کی آنکھوں میں غصے اور رنج کے آنسو اُمنڈ آئے ۔ میرے خیال میں تم مجھ سے اپنا بدلہ لینا چاہتے ہو کہ میں نے تمہارا گدّا کیوں بنایا "۔

" ہاں ، ممکن ہے کسی حد تک تمہارا خیال صحیح ہو "۔ وہ بولا ۔

" نہیں ساری بات یہی ہے ۔ تمہارا تمام تر مقصد ہی یہ ہے "۔ وہ چلائی " تم یہاں آئے ہی اس غرض سے ہو — اپنا انتقام لینے ۔ خیر ، اب تم نے بدلہ لے لیا ہے ۔ لیکن برائے مہربانی اب مجھ سے اور بات نہ کرو ۔ میں پتہ چلاتی ہوں کہ بڑی بس میں گھر پہنچ سکتی ہوں یا نہیں "۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور چل دی ۔ کپتان نے دیکھا کہ وہ بس کے کنڈکٹر کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے ۔ اُس نے ہنیل کو گیراج کے اندر جاتے اور تھوڑی دیر بعد پھر باہر نکلتے ہوئے دیکھا ۔ اب وہ دریا کی طرف مڑ گئی تھی ۔ وہ ہوٹل کے سامنے والے حصے میں بیٹھا رہا ۔ اور وہ کر بھی کیا سکتا تھا ۔

جو لوگ بڑی بس میں آئے تھے وہ جمع ہونا شروع ہو گئے ۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بڑی سی بس خود ہوٹل کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی اور بالکل ایک مکان معلوم ہونے لگی ۔ مسافر اپنی اپنی نشست پر آ کے بیٹھنے لگے ۔ سفید کتے کے ساتھ والے دو آدمی جا رہے تھے لیکن سفید کتے والی عورت اور کتا وہیں ٹھہرنے والے تھے ۔ ہیپ برن سوچ رہا تھا نہ جانے ہنیل اپنی نشست اس بس میں منتقل کروا سکی یا نہیں ۔ اسے شک ہی تھا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ وہ بس بہت بھری ہوئی ہے ۔

علاوہ ازیں ہنیل کا ٹکٹ تو اسی کے پاس تھا ۔

مسافر اندر گھسا ٹھس بھر گئے تھے ۔ کنڈکٹر ٹکٹ جمع کر رہا تھا اور بالآخر وہ بڑی بس کھڑ کھڑاتی ہوئی چل دی ۔ سڑک کے کونے والی خالی خالی سی لگنے لگی تھی ۔ یہاں تک کہ وہ سفید کتے والی عورت بھی جا چکی تھی ۔ ابھی تھوڑی ہی دیر میں دوسری لکسس نامی کار بھی نمودار ہو گی ۔ ہیپ برن بیٹھا انتظار کرتا رہا ۔ شام سرد ہوتی جا رہی تھی اور درخت بڑے بھیانک دکھائی دینے لگے تھے ۔

بالآخر ہنیل بڑی بے دلی سے بھرتی بھرانی آ پہنچی اور کہنے لگی :—

” میرے خیال میں تمہارے پاس میرا ٹکٹ ہے “۔

” ہاں ، میرے پاس ہے “۔ کپتان نے جواب دیا ۔

” کیا تم مہربانی فرما کر مجھے ٹکٹ دے دو گے ؟ “

کپتان نے اسے ٹکٹ دے دیا ۔ وہ لمحے بھر کے لئے ٹھہری پھر وہاں سے چلی گئی ۔ دوسری کار لکسس بھی گیراج سے نکل کر ہوٹل کے دروازے پر آ گئی ۔ ہنیل بھی جلدی جلدی پہنچی اور سیدھی پچھلے دروازے پر چڑھی — اس کی اور ہیپ برن کی نشستیں سامنے ڈرائیور کے قریب تھیں ۔ اس نے اپنا قدم پچھلی نشست پر رکھا اور پھر وہ ڈر گئی ۔ پستہ قد اور ذہین چہرے والا ڈرائیور کار کو دیکھتا ہوا آ گیا ۔ اس میں کوئی کنڈکٹر نہ تھا ۔ ڈرائیور نے جلدی سے کاریگروں والی تیز اور دھات کی طرح سخت نظر ہنیل پر ڈالی ۔

” کیا وہ سب لوگ واپس جا رہے ہیں جو صبح آئے تھے ؟ “ ہنیل نے جھجکتے ہوئے پوچھا ۔

” جی ہاں “۔

” کیا یہ کار بھری ہوئی ہے ؟ “

” جی ہاں “۔

” کیا اور کوئی جگہ نہیں ہے ؟ “

” نہیں “۔

ہنیل پیچھے ہٹ گئی ۔ ڈرائیور انتہائی اختصار پسند واقع ہوا تھا ۔

چھ مسافر یہاں آ گئے تھے ۔ چار تو بیٹھ بھی چکے تھے ۔ ہیپ برن چپ چاپ ہوٹل کے دروازے پر بیٹھا تھا ۔ ہنیل سڑک پر کار کے پاس ٹھہری رہی اور وہ پستہ قد ڈرائیور اپنے گلے میں بڑا سا اونی مفلر لپیٹے ادھر ادھر دوڑ کے دو گم شدہ مسافروں کو تلاش کر رہا تھا ۔ یقیناً دو مسافر غائب تھے ۔ نہیں ، ڈرائیور انہیں نہ ڈھونڈ سکا ۔ اور پھر خاموشی سے واپس آ گیا جیسے کوئی نیولا دو خرگوشوں کے پیچھے پھر رہا ہو ۔ اور آخر کار جب ہر مسافر ناراض ہونے لگا تو ڈرائیور دونوں مسافروں کو ڈھونڈ کر موٹر کی طرف لے ہی آیا ۔

اب ہنیل اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور ہیپ برن اس کے ساتھ آ بیٹھا ۔ ڈرائیور نے بڑی پھرتی سے سب کے ٹکٹ اکٹھے کئے اور پھر اوپر چڑھ کے ان دونوں کے پاس سے گزرا ۔ کار ایک زور دار ہارن بجاتی گھاٹی میں سے چلنے لگی ۔ ایک اور خوفناک دورہ بھی ختم ہوا اور

ایک پر مسرت تعطیل انجام پذیر ہوئی۔

ھیپ برن کہنے لگا " میں سمجھتا ہوں جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ سب میں کہہ ڈالوں "۔

" کیا ؟ " ھنیل نے زور سے پوچھا ۔ تیز چلتی ہوئی کار میں سے تیز ہوا کپڑے اور بال اڑائے دے رہی تھی ۔

کپتان اپنا پورا زور لگاتے ہوئے بولا " بہتر یہ ہو گا کہ جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ کہہ ڈالوں "۔

" پھر کہہ بھی چکو " ۔ ھنیل نے چیخ کر کہا ۔ اس کی شال پیچھے پھڑ پھڑا رہی تھی ۔

وہ کہنے لگا " جب میری بیوی کا انتقال ہو گیا تو میں جانتا تھا کہ اب میں کسی سے محبت نہ کر سکوں گا ۔

" اوہ — ھو ! " وہ بڑے طنز سے بولی ۔

وہ پھر چیخا " در اصل جہاں تک میرا تعلق تھا مجھے یہ احساس ہوا کہ محبت صرف ایک غلطی ہے "۔

" کیا غلطی ہے ؟ " وہ چلائی ۔

" محبت کرنا "۔ وہ زور سے بولا ۔

" محبت ! ایک غلطی ہے ؟ " ھنیل کا لہجہ تمسخر آمیز تھا ۔

" کم سے کم میرے لئے "۔ کپتان نے پھر چیخ کے کہا ۔

" اچھا ، صرف تمہاری ذات کے لئے "۔ ھنیل پھر مذاق اڑاتے ہوئے ھنس دی ۔

کار ایک بڑے سے موڑ پر پلٹی اور ھنیل ڈرائیور پر جا گری ۔ اس نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا ۔ کار پھر دوسری طرف مڑی اور اس بار ھیپل الگزینڈر پر آ پڑی ۔ اس نے غصے کے ساتھ اپنے آپ کو ٹھیک کیا ۔ اب کار سیدھی سڑک پر چلنے لگی تھی اور ذرا سکون سا معلوم ہونے لگا تھا ۔

کپتان نے پھر کہنا شروع کیا " مجھے یہ احساس ہوا کہ محبت کی ذمے داری مول لے کے میں نے ہمیشہ غلطی کی ہے "۔

" یہ تمہارے لئے واقعی بڑا بھاری کام ہو گا "۔ وہ چیخی ۔

" ہاں ، بات تو ایسی ہی تھی ۔ مجھے کبھی محبت کرنے کی خواہش نہ ہوئی تھی ، لیکن میں نے ایسا کیا ضرور اور بس یہی میری غلطی تھی "۔

" اچھا ، یہ مشکل کام ہی سہی لیکن تم نے آج تک کس کس سے محبت کی ہے ؟ " ھنیل نے دریافت کیا ۔

" شروع میں تو ماں سے مجھے محبت تھی اور وہ میری غلطی تھی ۔ پھر بہن سے ، وہ بھی غلطی تھی ۔ پھر میں نے ایسی لڑکی سے محبت کرنا شروع کر دی جسے میں عمر بھر سے جانتا تھا ، وہ بھی غلطی تھی ۔ پھر اپنی بیوی سے مجھے محبت ہوئی جو میری زندگی کی بد ترین غلطی تھی ۔ اور اس کے بعد میں نے تم سے محبت شروع کر کے غلطی کی ۔

" تمہارا مطلب ہے کہ مجھ سے محبت کرنے کی ذمے داری مول لے کر ، لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ٹھیک طرح ذمے داری لی ہی نہیں ۔ تم نے کبھی اصلیت میں مجھ سے محبت نہیں کی "۔

" کیا واقعی یہ بات ہوئی ؟ " کپتان نے کہا ۔

اور وہ ناراض سی بیٹھی رہی کہ کپتان نے کبھی مجھ سے در اصل محبت نہیں کی ۔

" نہیں " کپتان نے سلسلہ کلام جاری رکھا " ٹھیک طرح نہیں ۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں تمہارے پاس واپس آ گیا ہوں ۔ میں تم سے محبت کرنا نہیں چاہتا ۔ میں محبت کی بنیاد پر شادی کرنا نہیں چاہتا ۔

" پھر اور کس چیز کی بنیاد پر چاہتے ہو ؟"

" میرے خیال میں مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ، تم سب کچھ جانتی ہو "۔

" نہیں ۔ بقین جانو ، میں کچھ نہیں جانتی ۔ تم تو نہایت ہی پر اسرار آدمی ہو " ۔

تیز چلتی ہوئی گاڑی میں باتیں کرنا بڑا تھکا دینے والا کام ہوتا ہے ۔ وہ دونوں سستانے کی غرض سے خاموش ہو گئے اور کسی ہموار سڑک کے انتظار میں رہے ۔

" اپنے مطلب کو الفاظ میں بیان کرنا کچھ آسان کام نہیں " بالآخر کپتان نے کہنا شروع کیا " لیکن میں ایک دفعہ محبت کی بنیاد پر شادی کا تجربہ کر چکا ہوں اور بالآخر یہ ایک نہایت خوفناک حماقت ثابت ہوئی ۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ ہمیشہ یہی ہو گا خواہ کوئی عورت کیوں نہ ہو ۔

" پھر اس میں کچھ تمہارا ہی قصور ہو گا " ہنیل نے کہا ۔

" ہاں جہاں تک محبت کا تعلق ہے یہی ہو گا اس کے باوجود میں شادی کرنا چاہتا ہوں ۔ میں ایک ایسی عورت چاہتا ہوں جو میری عزت کرے اور میرا حکم مانے "۔

" بشرطیکہ تم اپنے احکام میں ذرا معقولیت سے کام لو اور اس بات کا بھی خاص خیال رکھو کہ تم حکم کس انداز سے دیتے ہو "۔ ہنیل بولی ۔

" در اصل مجھے گریسلڈا قسم کی صابر بیوی چاہئیے ۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ میری عزت کرے اور میرا حکم مانے ۔ مجھے محبت کی ضرورت نہیں " ۔

" میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حکم ماننے والی بات تو چھوڑئیے نہ جانے گریسلڈا اپنے اس بے وقوف خاوند کی عزت کیوں کر کر سکی ۔ میں تو یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اپنے میاں کے بارے میں در اصل اس کے خیالات کیا تھے ۔ بھلا اس قسم کے احمق اور رعب گانٹھنے والے خاوند کے بارے میں عورت کیا سوچ سکتی ہے "۔

" خیر ، اس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں "۔ کپتان نے کہا ۔

اب دوسرے اسٹیشن پر پہنچنے تک وہ دونوں چپ رہے ۔ یہاں اتر کے جھیل کے کنارے درختوں کے نیچے ٹہلنے لگے ۔

" آؤ کہیں بیٹھ جائیں اور اپنی بات ختم کر لیں "۔ کپتان نے تجویز پیش کی ۔

"ہنیل خود یہ جاننے کے لئے بڑی بے چین تھی کہ وہ کیا کہنے والا ہے ، اور عورتوں کی طرح اسے بھی وہ مرد بہت دل فریب معلوم ہو رہا تھا جو اپنے پوشیدہ ترین خیالات کا اظہار کئے دے رہا ہو --- خواہ بعد میں وہ ان باتوں کا کتنا ہی مذاق اڑائے ۔ چنانچہ وہ اس کے پاس بیٹھ گئی ۔ شام کچھ دھندلی سی تھی اور اندھیرا ہونے والا تھا ۔ جھیل پر روشنی جھلملا رہی تھی کیوں کہ سامنے والے ہوٹل کی بتیاں اپنی روشنی لہروں پر بکھیر رہی تھیں ۔ چند چھوٹی چھوٹی کشتیاں آہستہ آہستہ بہتی ہوئی کنارے پر آ کے لگ رہی تھیں ۔ یہ ایک دھندلی اور بوجھل سی شام تھی اور اس میں مخصوص ویرانی کا احساس تھا جس پر عموماً تعطیل کا خاتمہ ہوتا ہے ۔

" میری عزت اور اطاعت اور ان کے ساتھ مناسب جسمانی احساسات میرے لئے تو یہی شادی کا مفہوم ہے اور بس "۔

" لیکن مناسب جسمانی احساسات محبت نہیں تو اور کیا ہیں ؟" ہنیل نے پوچھا ۔

" نہیں ہر عورت مرد سے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ میری پرستش کرے گا اور مجھ سے محبت کرے گا ــــ لیکن میں ایسا نہیں کر سکوں گا۔ میں زندگی میں ایک بار پھر ایسا نہ کروں گا خواہ مجھے ساری عمر راہب بن کر ہی گزار دینی پڑے۔ میں نہ تمہاری پرستش کروں گا اور نہ تم سے محبت کروں گا "۔

" تمہیں اس کا موقع ہی نہ ملے گا۔ شکریہ۔ اگر تمہیں محبت نہیں تو پھر تم اپنے جسمانی احساسات کو کیا نام دو گے؟ شاید تم کوئی ذلیل چیز چاہتے ہو "۔

اگر کوئی عورت میری عزت کرتی ہے، اپنے دل کی گہرائی سے میرا احترام کرتی ہے اور اسی جذبے کے تحت میرا حکم مانتی ہے تو میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسی حالت میں اُس کی قدر میری نظروں میں محبت یا پرستش کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہو گی۔

" یہ تو وہی چیز ہے۔ اگر انسان کو محبت ہو تو یہ سب کچھ آپسے حاصل ہوتا ہے۔ عزت، اطاعت اور سب کچھ ــــ اور اگر محبت نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں "۔ ہنیل نے کہا۔

کپتان بولا " یہ درست نہیں۔ ایک عورت خواہ مرد سے کتنی ہی محبت اور اُس کی پرستش ہی کیوں نہ کرتی ہو لیکن وہ اُس کی اطاعت اور عزت ہرگز نہ کرے گی۔ دنیا کی سب سے زیادہ چاہنے والی اور فدا کار لڑکی اپنے خاوند کو جب چاہے گڈا بنا کے ہنس کر سکتی ہے ــ جس طرح تم نے میرا بنایا تھا۔

" اُفوہو، پھر وہی گڈا! وہ اس طرح تمہارے ذہن میں کیوں گڑ کے رہ گیا ہے؟"

" میں نہیں کہہ سکتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے اس میں کوئی برا جذبہ کار فرما نہ تھا۔ اسے اگر تم چاہو تو ایک طرح کی خوشامد بھی کہہ سکتی ہو، لیکن یہ میرے دل میں پھانس سی بن کے اٹک گیا ہے۔ بالکل ایک پھانس کی طرح۔ اور پھر وہ اس دنیا میں موجود ہے، جرمنی میں ہی کسی جگہ۔ تم تو جو چاہو کہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج کوئی عورت بھی خواہ وہ اپنے شوہر سے کیسی ہی دیوانہ وار محبت کرتی ہو ــــ کسی لمحے بھی اپنے خاوند کو گڈا بنا کے رکھ سکتی ہے۔ اور یہی گڈا اُس کا ہیرو ہوتا ہے اور اُس کے ہیرو کی حیثیت گڈے سے زیادہ نہ ہو گی۔ میری بیوی نے بھی یہی کیا ہوتا۔ اُس نے اپنے ذہن میں یہی کیا تھا۔ میری بیوی نے اپنے خیال میں میرا گڈا بنا کے رکھ لیا تھا۔ میں نے اُسے دوسری عورتوں سے اپنے بارے میں باتیں کرتے سنا تھا اور میں نے دیکھا کہ اُس کے ذہن میں میرا تصور تمہارے گڈے سے کہیں زیادہ احمقانہ تھا لیکن خیر بات ایک ہی ہے۔ اگر کوئی عورت کسی مرد سے محبت کرتی ہے تو وہ ضرور اُس کو گڈا بنا دے گی۔ ایسا کئے بغیر اُسے چین ہی نہ آئے گا۔ اور جب ایک بار وہ گڈا بنا لے تو اُس کی خواہش پوری ہو جاتی ہے۔ محبت کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے۔ اور اسی لئے میں نہیں چاہتا کہ کوئی عورت مجھ سے محبت کرے۔ اور نہ میں محبت کروں گا۔ میں کسی کو اپنے آپ سے محبت کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ ایک بے عزتی ہو گی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ محبت نے اور اُن عورتوں نے جنہوں نے مجھے چاہا چالیس سال تک میری بے عزتی کی ہے۔ میں محبت کروانا نہیں چاہتا اور نہ میں خود محبت کرنا چاہتا ہوں۔ میں عزت اور اطاعت چاہتا ہوں یا پھر کچھ بھی نہیں "۔

" تو پھر غالباً کچھ بھی نہ ہو گا "۔ ہنیل نے طنز سے کہا " کیوں کہ یقین کرو میرے پاس محبت کے سوا اور کچھ بھی پیش کرنے کے لئے نہیں ہے "۔

" تو پھر اپنی محبت سنبھال کے رکھو "۔

ہنیل تھوڑا سا ہنس دی۔

" اور تم؟ " وہ چلائی " تم! فرض کرو اگر تمہاری عزت و اطاعت ہو۔ میرے خیال میں پھر سوائے اس کے کہ تم بادشاہوں کی طرح بیٹھے عیش کرتے رہو اور کرو گے کیا "۔

" ابھی نہیں ، میرے پاس اور بہت سے کام ہوں گے اور خواہ مجھے کوئی عورت ملے یا نہ ملے میں وہ کام کرنے شروع کر دوں گا "۔

" بتاؤ تو ، وہ کام کیا ہیں "۔

وہ کوئی ایسے غیر معمولی کام نہیں ۔ میں مشرقی افریقہ ایک ایسے شخص کا شریک کار بننے جا رہا ہوں جو اپنی تین ہزار ایکڑ زمین کا انتظام کرنے کی دھن میں جان توڑ کوشش کر رہا ہے اور جب میں چند اور مشاہدات اور تجربات حاصل کر لوں گا اور تمام ضروری مواد جمع کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا تو پھر چاند پر ایک کتاب لکھوں گا ۔ عورت مجھے ملے یا نہ ملے میں یہ کام ضرور کروں گا "۔

" اور عورت --- فرض کرو کوئی بے چاری تمہیں مل بھی جائے تو ؟"

کپتان نے جواب دیا " تو پھر وہ بھی میرے ساتھ جائے گی اور وہاں ہم جا کے رہنے سہنے لگیں گے "۔

اور وہ عزت و احترام اور اطاعت وغیرہ کے تمام فرائض انجام دیتی رہے گی جب کہ تم دن بھر گھوڑے پر گشت کیا کرو گے اور رات کو بیٹھ کر چاند کی طرف گھورتے رہا کرو گے "۔

کپتان نے کچھ نہ کہا ۔ وہ جھیل کے پار کہیں دیکھ رہا تھا ۔

" تم اس بے چاری عورت کے لئے کیا کرو گے جو افریقہ میں گھر داری کی ذمہ داریاں نبھانے کے علاوہ تمہاری عزت و اطاعت بھی کرے گی ۔ مجھے معلوم ہے اس ملک میں یہ کام بہت کٹھن ہو گا ۔ انتہائی مشکل "۔

وہ دھیمی آواز میں بولا " بھئی ، وہ میری بیوی ہو گی اور میں اس کے ساتھ بیوی کا سا سلوک کروں گا ۔ اگر نکاح کے وعظ میں یہ کہا جاتا ہے کہ بیوی سے محبت کرو اور اس کا خیال رکھو تو ان معنوں میں میں بھی یہی کروں گا "۔

"اوھو" ھنیل چلائی ۔ " کیا اس سے محبت کرو گے ؟ واقعی اس بے چاری سے محبت کرنے لگو گے ؟"

" نہیں ، ان لفظی معنوں میں نہیں ۔ میں اس کی پرستش یا اس سے محبت نہیں کروں گا ۔ لیکن وہ میری بیوی ہو گی اور ایک بیوی کی حیثیت سے میں اس سے محبت بھی کروں گا اور اس کا خیال بھی رکھوں گا "۔

" محض اس لئے کہ وہ تمہاری بیوی ہے ۔ اس لئے نہیں کہ خود اس کا ایک وجود ہے ۔ بے چاری عورت کی کس قدر بد قسمتی ہو گی "۔

"میرا تو یہ خیال نہیں ۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ اس کی سب سے بڑی خوش نصیبی ہے"۔

" تمہاری بیوی بننا ؟ "

" بیوی بن جانا --- بیوی کی طرح چاہی جانا اور مرد کی حفاظت میں ہونا --- محض ایک عشوہ طراز عورت کی طرح نہیں "۔

" صرف اس لئے چاہی جانا کہ وہ ایک بیوی ہے ، نہیں ، تمہارا شکریہ ۔ میں تمہارے اس خیال خام اور ڈھٹائی کی داد دیتی ہوں "۔

" بہت اچھا ، تو پھر ایسا ہی سہی "۔ کپتان نے اٹھتے ہوئے کہا ۔

ھنیل بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر وہ دونوں اس جگہ جا پہنچے جہاں کشتی بندھی ہوئی تھی ۔

وہ خاموشی سے جھیل پر کشتی کھیتے جا رہے تھے ۔ آخر کپتان کہنے لگا :---

" میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا "۔

هنیل نے کوئی جواب نہ دیا ۔ وہ بیٹھی اپنے مکان کی بتیاں نزدیک تر آتے ہوئے دیکھ رہی تھی ۔ اور پھر بولی :۔

" میں تمہارے ساتھ افریقہ چلوں گی ۔ لیکن اس کا وعدہ نہیں کرتی کہ تمہاری عزت اور اطاعت بھی کروں گی "۔

" تو پھر مجھے تمہاری ضرورت نہیں "۔ کپتان نے بڑے پر سکون لہجے میں کہا ۔

کشتی اب گھاٹ کے قریب پہنچ رہی تھی ۔ هنیل کے دوست بالکنی میں سے اشارے کر رہے تھے ۔

" ہیلو ! " وہ زور سے چلائی ۔ " میں واپس آگئی ہوں ۔ وہاں بہت مزہ آیا "۔ پھر وہ کپتان سے کہنے لگی :۔

" تم اندر چلو گے نا ؟ "

" نہیں ۔ میں اب واپس جاؤں گا "۔

هنیل کے دوست گھر سے نکل کے دوڑتے ہوئے سیڑھیوں پر اسے لینے آ رہے تھے ۔

" لیکن اگر میں تم سے محبت کروں تو کیا پھر بھی مجھ سے شادی کرنا پسند نہ کرو گے ؟" هنیل نے کپتان سے پوچھا ۔

" تمہیں مجھ سے اور باتوں کا وعدہ کرنا چاہئیے ۔ اُن کا ذکر نکاح میں ہوا کرتا ہے "۔

" کیا وہاں بارش ہوئی تھی ؟ موسم کیسا تھا ؟ کیا تم لوگ برف کی چٹان پر چڑھے تھے "۔ باغ میں سے اس کے ساتھیوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی ۔ هنیل نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ میں ابھی آ رہی ہوں ۔

" ایسا تکلف نہ برتو ، اندر چلے آؤ "۔ وہ کپتان سے کہنے لگی ۔

" نہیں ، میں اندر آنا نہیں چاہتا "۔

" تو کیا تم کل جانا چاہتے ہو ؟ اگر یہی تمہاری مرضی ہے تو چلے جاؤ ۔ لیکن میں شادی سے پہلے تو ان باتوں کا وعدہ کروں گی نہیں ۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ یہ وعدے کرتی پھروں ؟ "

هنیل کشتی میں سے اتر کے تختے پر آ گئی ۔

" ارے " وہ پلٹ کے بولی " مہربانی کر کے کیا مجھے وہ تصویر دے دو گے ؟ میں اسے جلا دینا چاہتی ہوں "۔

کپتان نے اسے تصویر دے دی ۔

" اور کل ضرور آنا ۔ آؤ گے نا ؟ " هنیل نے پوچھا ۔

" ہاں صبح کے وقت آؤں گا ! "

کپتان کشتی کھیتا ہوا جلدی سے اندھیرے میں غائب ہو گیا ۔

مضامین

ناول

ایف ، آر ، لیوس
ترجمہ : مختار صدیقی

محمد حسن عسکری

وقار عظیم



منظر عمل : رُواو

کپتان کا گڈا: ایک جائزہ

ایف، آر، لیوس

یہ لارنس کے فن کا کمال ہے کہ اس کا ناولٹ کپتان کا گڈا اس کی باقی تمام کہانیوں سے مختلف اور ممتاز ہے۔ لارنس کے فن میں جو رچاؤ اور لچک تھی وہ اس طویل کہانی میں بڑی خوبی سے ظاہر ہوتی ہے۔ کرداروں اور پلاٹ کے رویے اور لہجے کو جس چابک دستی سے اجاگر کیا گیا ہے اور ان کے بدلتے رنگوں کی جس طرح عکاسی کی گئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ لارنس نے نہایت ہی نازک طریقے پر اس نفیس تانے بانے کی پیچیدگیاں سلجھائی ہیں۔ کسی نہایت باتکلف، شستہ اور نفیس طربیے میں جس خوش ذوقی، زندہ دلی اور طنز کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کہانی کے بنیادی عناصر کے طور پر موجود ہے۔ اور ہمیں ناولٹ کے آغاز میں ہی یہ پتہ چل جاتا ہے کہ شستگی اور نفاست اور تکلف و تہذیب کو کہانی کے تانے بانے میں بڑے ذوق سلیم اور بڑی لطیف طنز کے ساتھ سمویا گیا ہے۔

ناولٹ کا پہلا منظر هنیل اور مچکا کے درمیان گفتگو کا سین ہے۔ اس منظر کو پڑھنے میں یہ بات دل پر نقش ہو جاتی ہے کہ جیتی جاگتی زندگی کا عکس پیش کرنے، زندہ کرداروں کے رویے اور لہجے کی تصویر کشی کرنے اور لفظوں میں ان کو زندہ کر دکھانے میں لارنس سے بڑھ کر کمال فن خیال میں نہیں آسکتا۔ لارنس اپنے کرداروں کی تخلیق جس طرح کرتا ہے اسے دیکھ کر لارنس کے مشاہدے کی سچائی اور قوت اور اس کی اپج کی داد نہیں دی جاسکتی۔ کپتان کا گڈا کے پہلے منظر میں جن دو خواتین سے قاری دو چار ہوتا ہے وہ دو عالی نژاد، غیر ملکی (جرمن) خواتین ہیں —— مگر یہ دونوں کردار گویا ہماری آنکھوں کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ دونوں عالی نسب جرمن امیر زادیاں گوشت پوست میں ہمارے سامنے آگئی ہیں۔ ان کی ذاتی قسم کی باتیں، ان کی حرکات، ان کا وجود ہمارے لئے یقینی اور حقیقی بن جاتا ہے اور یہ سب کچھ الفاظ اور فنکاری کی ایسی کفایت کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے کہ ہمیں کسی طرح کی سعی و کوشش کا گمان نہیں گزرتا، بلکہ الٹا یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ سب کچھ بڑی روا روی بلکہ بے پروائی سے ہوا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہوتی۔

الفاظ کی اس کفایت میں اس چیز کا بڑا ہاتھ ہے کہ مکالموں اور گفتگو کی تخلیق اور عکاسی میں لارنس کو حیرت انگیز ملکہ حاصل تھا۔ کرداروں کی ایسی گفتگو جو حقیقی زندگی کے عین مطابق ہو اور جس کی لطافتوں میں کرداروں کے چلن اور ان کی فطرت کی نفاستیں چھپی ہوں، مشاہدے کی گہرائی اور گیرائی پر دال ہوتی ہے اور صاحب مشاہدہ کی بصیرت کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ گویا لارنس کو جو تمثیلی ملکہ حاصل ہے وہ اپنی وسعت میں حقیقتاً بڑا زبردست ہے۔ اس کی پہنائی ایک عظیم تمثیلی شاعر سے کسی عنوان کم نہیں۔ اس کے تمثیلی ملکہ کی وسعت اور گیرائی کا نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ اب بھی یہ کہنے والے نقادوں کی کمی نہیں کہ لارنس موعظت اور مقصدیت کا پیغمبر ہے۔ غالباً ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لارنس کے فن کو محدود ثابت کر دکھائیں۔

لارنس کی تمثیلی عظمت کے سلسلے میں میں نے زیر نظر کہانی کے پہلے منظر کا ذکر کیا ہے —— کہانی کے آغاز میں آتا ہے :—

” هنیل اپنا کام کرتی رہی اور سر تک نہ اٹھایا۔ وہ ایک نیچی سی کرسی پر لیمپ کے پاس بیٹھی تھی۔ پاس ہی ایک ٹوکری میں رنگ برنگ کے ریشمی

ٹکڑے پڑے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک گڈا یا پتلا سا تھا جسے وہ کپڑے پہنا رہی تھی ۔ اس وقت وہ پتلے کے گھٹنے کو کچھ ٹھیک کر رہی تھی اور اس وجہ سے وہ بے چارا منہ کے بل ، بازو پھیلائے ، معلق سا تھا ۔ اس حالت میں گڈا کچھ بے ڈھنگا سا لگ رہا تھا کیونکہ اس کی شکل سکاٹ لینڈ کے سپاہی کی سی تھی جس نے گرم کپڑے کی چست پتلون پہن رکھی ہو "۔

دروازے پر دستک ہوئی اور اسی نسوانی آواز نے پھر پکارا :

" ہنیل ؟ "

" ہا آں ! "

" کیا تم یہاں ہو — اکیلی ہو نا " — اسی آواز نے حیرت میں پوچھا ۔

"ہاں ۔ اندر آ جاؤ "۔

ہنیل کا لہجہ کچھ زیادہ ہمت افزا نہ تھا ، دروازہ کھلنے پر اس نے اپنے گڈے کو کھڑا کر کے اس کا کوٹ سیدھا کر دیا ۔ دروازے سے ایک سیہ چشم نوجوان عورت نے بڑی شرارت آمیز جھینپ کے ساتھ اندر جھانکا ۔ اس نے باہر جانے کے عمدہ کپڑے پہن رکھے تھے ۔ کندھوں پر ایک دبیز شال اور سر پر کالی چھوٹی ٹوپی ، جسے اس نے کانوں تک کھینچ رکھا تھا ۔

" ارے واقعی ، بالکل ہی اکیلی بیٹھی ہو — " آنے والی عورت نے بڑی حیرت سے کہا ۔ " تو پھر وہ کہاں ہے ؟ "

ہنیل نے جواب دیا — " مجھے نہیں معلوم "۔

" اور تم یہاں اکیلی بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو — سچ مچ یہ تو میرے خیال میں واقعی بڑی ہمت کا کام ہے! کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا ؟" — مچکا ٹہلتی ہوئی اپنی سہیلی کے پاس آ کھڑی ہوئی ۔

" بھلا میں کیوں ڈروں ؟ " ہنیل نے قدرے تیزی اور رکھائی سے کہا ...

" اور یہ گڈا عین مین وہی ہے ۔ بالکل اسی طرح کا — صرف پتلون کا فرق ہے .... گڈا جس کے شانوں میں ہلکا سا خم تھا اور جس نے چست پتلون پہن رکھی تھی ، ہو بہو کسی سکاٹ رجمنٹ کا افسر معلوم ہوتا تھا ——— وہی کم آمیزی اور ہچکچاہٹ کا سا انداز جو ایک افسر اور شریف النسب آدمی کی خصوصیت ہوتا ہے "۔

آپ پوچھیں گے ، یہ عبارت لارنس کی ہے ؟ — اس کا جواب یہ ہے کہ محولہ بالا عبارت کا آخری فقرہ دیکھئے — "وہی کم آمیزی اور ہچکچاہٹ کا سا انداز جو ایک افسر اور شریف النسب آدمی کی خصوصیت ہوتا ہے — " آپ اس پر بے کھٹکے انگلی رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ صرف لارنس ہی یہ لکھ سکتا تھا — لیکن کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ " آخر کس بنا پر آپ اتنے یقین کے ساتھ یہ کہتے ہیں ؟ " تو پھر آپ کو اپنے تیقن کا جواز پیش کرنا آسان نہیں ہوگا — آپ یہ ضرور کہہ سکیں گے کہ لارنس نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ کم آمیزی اور ہچکچاہٹ کے الفاظ کسی شریف اور عالی نسب شخص کے اطوار ، اس کی وضع بیان کرنے کے سلسلے میں استعمال کئے ہیں ۔ لیکن یہ الفاظ گڈے یا پتلے کی ساری تصویر کسی ہر حکم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایسا اثر پیدا کرتے ہیں کہ ہم اسے لارنس کا امتیازی نشان سمجھ کر اسی نشان پر انگلی رکھ دیتے ہیں ۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ گڈے یا پتلے کے بیان میں

جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور جو جو ٹچ رکھے گئے ہیں وہ ، بلکہ محولہ بالا سارے کا سارا اقتباس اتنا اہم کیوں ہے ۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ سارا اقتباس اس زندگی سے بھر پور ہے جس کی وہ عکاسی کرتا ہے ۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لارنس کا لہجہ ہے ۔ اگر اس لہجے کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں ایسا پیچیدہ نظام ملے گا جس کی بدولت ہر واقعے کے ہر پہلو پر نگاہ ڈالی جا سکے ۔ اس نظام کو متوقع و اقعات اور ان واقعات کے ردعمل کے بدلتے رنگوں کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے ۔ اس نظام کی پیچیدگی میں فنکار کی ہمدردی ، اس کا تاثر ، اس کی تنقیدی صلاحیت ، سبھی کچھ شامل ہے ۔ اور قاری بھی جب اس عبارت کو پڑھتا ہے تو اس کا ردعمل اسی ہمدردی ، اسی تاثر پذیری ، اسی تنقیدی صلاحیت ، اور آنے والی باتوں کے انتظار سے عبارت ہوتا ہے اور اسی مرکب جذبے کی مہمیز پر وہ آگے بڑھتا جاتا ہے ۔

اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ پہلے پہل فنکار کے رویے کی لطیف پیچیدگی گدھے یا پہلے پر مرکوز ہوگئی ہے تو فوراً یہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ گدا اس سکاچ افسر کا ہے جس کے بارے میں ہمیں بہت جلد معلوم ہوجاتا ہے کہ اس کا نام کیپٹن ہیپ برن ہے — گویا کہانی کے آغاز میں ہی ہم کیپٹن ہیپ برن سے اس طرح متعارف ہوتے ہیں کہ وہ ایک گدا بھی ہے اور ایک شریف زادہ بھی — اسی طرح کہانی کے شروع ہی میں گدے کی حیثیت بھی ظاہر ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ " یہ بچارا شریف زادہ " پردہ اٹھتے ہی ہمیں کسی باوقار طریقے پر نہیں دکھایا جاتا بلکہ اس کی حالت بڑی حد تک مضحکہ انگیز ہوتی ہے ۔

" گدا کچھ بے ڈھنگا سا لگ رہا تھا کیونکہ اس کی شکل سکاٹ لینڈ کے سپاہی کی سی تھی جس نے گرم کپڑے کی چست پتلون پہن رکھی ہو —"

شریف زادوں کی دنیا میں ایسی گستاخی اور بے تکلفی کی گنجائش کہاں — اس کے باوصف اس بے ڈھنگی حالت میں بھی اس میں شریف زادوں کا مرعوب کن وقار موجود ہے — ذرا اس گدے کی شباہت کا بیان غور سے پڑھئے اور پھر دیکھئے کہ اس توصیف کے ہجوم میں کپتان ایک باوقار وجود بن جاتا ہے یا نہیں ۔ اس گدے کی وضع میں بڑا امتیازی بانکپن نظر آتا ہے ۔ اس کا پیکر بڑی خوبی ، بڑے حسن سے بنایا گیا ہے ۔ اس کی سیاہ آنکھیں بڑی بڑی اور کھلی ہوئی ہیں — یہ محض گدے کے ظاہری امتیازات نہیں ہیں بلکہ یہ امتیازات کسی نہایت شاندار ہستی کا ہیولیٰ بنا رہے ہیں ۔ اس بیان کی بدولت ہی کپتان ایک ایسی ہستی ، ایسی حقیقت بن جاتا ہے جو رہتی تو پس منظر میں ہے مگر ہے بڑی اہم — اس کی اہمیت واضح ہے ۔ اور وہ یہ کہ اس کی حقیقت سے کوئی واقف نہیں ، اس کا کوئی مالک نہیں (وہ جیتا جاگتا کپتان ہے ، محض گدا نہیں) ۔ منظر میں جو قوت یہاں موجود ہے ، اس میں جو لطیف کشمکش عکس فگن ہے اور دونوں خواتین میں اس کے (گدے کے) بارے میں جو گفتگو ہوتی ہے وہ ہمیں بلا واسطہ اس کی ہستی تک پہنچا دیتی ہے — ہمیں یہ بھی علم ہو جاتا ہے کہ اس میں اس شریر اور بانکی عورت کے دل پر اپنے وقار کا رعب جمانے کی صفات بھی موجود ہیں جو صاف پتہ چلتا ہے کہ ہنیل کی طرح اس سے محبت تو نہیں کرتی ۔ کیونکہ یہ عورت کہتی ہے :—

" ارے واقعی ، بالکل ہی اکیلی بیٹھی ہو — " آنے والی عورت نے بڑی حیرت سے کہا — " تو پھر وہ کہاں ہے ؟ "

ہنیل نے جواب دیا — " مجھے نہیں معلوم "۔

" اور تم یہاں اکیلی بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو ؟ سچ مچ یہ تو میرے خیال میں واقعی بڑی ہمت کا کام ہے ! کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا ؟ " — مجکا

ٹہلتی ہوئی اپنی سہیلی کے پاس آ کھڑی ہوئی ۔
" بھلا میں کیوں ڈروں ؟ " ہنیل نے قدرے تیزی اور رکھائی سے کہا —
ان دو الفاظ ، ' تیزی اور رکھائی' میں بڑی باتیں پنہاں ہیں ۔

ہاں تو پھر وہی سوال سامنے آتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ تحریر لارنس کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی — اس کا جواب یہ ہے کہ ان فقروں کی جان داری (جس کی مختلف صورتوں اور جس کے مظاہر پر بات ہو چکی ہے) سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ صرف لارنس کی تحریر ہے ۔ ان فقروں میں تخلیقی یا شاعرانہ قوت کی جو تازگی اور روانی موجود ہے ان کے حساس اظہار میں فلوبیر کے عین الٹ جو انداز نظر آتا ہے اور ان کی سلاست میں سچائی کا جو محکم اور اٹل انداز ہے اور مکالمہ ان خصائص کا جس طرح قدم بقدم ساتھ دیتا ہے وہ لارنس کے سوا کسی اور سے ممکن ہی نہیں — اس کے باوجود اگر لارنس کی مخصوص چھاپ کی تلاش ہو تو اس کا جواب اور بھی وضاحت سے انہی فقروں میں موجود ہے ۔ ذرا اس گڈے کی چست پتلون کا ۔ ذکر دیکھئے جس کے بارے میں لارنس نے کہا ہے کہ گڈے کو سکاٹ لینڈ کے سپاہیوں کی مخصوص چست پتلون پہنائی گئی تھی — آپ نے دیکھا ہوگا کہ محولہ بالا اقتباس میں اس چست پتلون کا ذکر خاص طور سے موجود ہے اور اگر اس اقتباس سے ذرا آگے کی عبارت پڑھیں تو پھر اسی چست پتلون کا ذکر ملتا ہے ۔ ملاحظہ ہو :—

" مچکا ذرا آگے جھک کر گڈے کا جائزہ لینے لگی ۔ وہ بڑی حسین عورت تھی ، گرم گرم سنہری جلد ، سیاہی مائل کنھئی آنکھیں ، صاف اور سیاہ بھنویں "۔
" نہیں " — وہ آپ ہی بڑبڑائی جیسے مرعوب ہو کر رہ گئی ہو — " یہ وہی ہے ۔ یہ وہی ہے ۔ بس پتلون اس جیسی نہیں — مگر (گڈے کی) پتلون (بھی) ہے بڑی خوبصورت — کیا اس کی (کپتان) کی ٹانگیں واقعی اتنی نفیس اور خوبصورت ہیں ؟"
ہنیل نے کوئی جواب نہ دیا —

اس سے پہلے کے اقتباس میں ہنیل نے ، مچکا کے جواب میں کہا تھا " بھلا میں کیوں ڈروں ؟" یہ جواب کچھ ترشروئی سے دیا گیا تھا ۔ اب کی دفعہ مچکا نے جو سوال پوچھا (کیا اس کی ٹانگیں بھی اتنی خوبصورت ہیں ؟) تو اس کا جواب خاموشی سے دیا گیا — پہلے سوال کے جواب میں رکھائی اور اس سوال کے جواب میں خاموشی — ان دونوں کی اہمیت ایک سی ہے ، اور ان دونوں سے ہمیں صاف پتہ چل جاتا ہے کہ ہنیل اور اس غیر ملکی (یعنی برطانوی) افسر کے باہمی تعلقات بڑے گہرے ہیں ۔ مگر بات یہیں تک نہیں رہتی — یہ سوال کہ " کیا اس کی ٹانگیں واقعی اتنی نفیس اور خوبصورت ہیں ؟" ہمیں اس چست پتلون کی اہمیت کا سراغ دیتا ہے جو گڈے کو پہنائی گئی تھی ۔

اس چست پتلون کے مسلسل تذکرے سے ایک بات ظاہر ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس کہانی کا موضوع " شخصیت " کے سلسلے میں اس مخصوص چیلنج کا حامل ہے جو لارنس کا طرۂ امتیاز ہے — یعنی دو کرداروں کے ذاتی تعلقات خصوصاً ایک مرد اور ایک عورت کے باہمی تعلقات کی بندھی ٹکی تفہیم کے سلسلے میں " شخصیت " کو کیا مقام حاصل ہے اور " شخصیت " کی اہمیت کیا ہے ؟ — یہ لارنس کا مخصوص فن ہے کہ وہ کردار کی " شخصیت " کو کسی " نصب العین " کے ساتھ یا مخصوص " نظریات " کے ساتھ یا اس " شخصیت " کی اپنی ہی " قوت ارادی " کے ساتھ کشمکش میں ڈال دیتا ہے ۔ تخلیقی قوتوں کا یہی عمل

اس کے فن کا مرکزی نقطہ ہے -- اور اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کہانی کی دونوں خواتین ، ہنیل اور مچکا ، چست پتلون اور ٹانگوں کے حسن کے بارے میں بار بار جو کچھ کہہ رہی ہیں اس کی اہمیت اسی بنیادی اہمیت کا ایک حصہ ہے جو لارنس ، اپنے کرداروں کے "جسم" کو دیتا تھا ۔

"جسم" کی یہ اہمیت ہنیل خود محسوس نہیں کر پائی ۔ اگر وہ اس اہمیت کو جان سکی تو اپنے محبوب کپتان کا گڈا ہی کیوں بناتی -- لیکن اس نے یہ گڈا محض من کی موج میں آ کر بنا ڈالا تھا ۔ من کی یہ موج اپنی اہمیت میں پوری کہانی کے بعد واضح ہوتی ہے ۔ فی الوقت یہی نظر آتا ہے کہ اس نے موج میں آ کر یہ گڈا بنا ڈالا اور ساتھ ساتھ اپنے کپتان کو اس گڈے کی شکل میں سکاچ سپاہیوں کی مخصوص چست پتلون پہنے دکھایا ۔ حالانکہ زندگی میں کپتان ایسی پتلون ہرگز نہیں پہنتا تھا -- حقیقت اور بے جان پیکر میں یہ تضاد بڑا عجیب اور بے حد معنی خیز ہے ۔ اور یہ تضاد اسی منظر میں مچکا کے جانے پر (اور اس کا یہ جانا بھی کتنی دل آویزی سے بیان ہوا ہے) واضح ہو جاتا ہے کیونکہ فوراً ہی کپتان الگزنڈر ہیپ برن کمرے میں داخل ہوتا ہے :--

"وہ بالکل گڈے کی طرح تھا ، لمبا لڑنگا ، دبلا پتلا -- شائستہ اور وردی میں ملبوس ، -- وہ بڑا تو اس کی سیاہ آنکھیں خوب کھلی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں -- " اس بیان سے محسوس ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تضاد خود کپتان میں ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کپتان کا "گڈے کی طرح" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے مختلف بھی تھا ! -- گویا فن کار اپنی تشبیہ (گڈے کی طرح !!) کو خود جھٹلا رہا ہے ۔ مگر " اس کی بڑی بڑی کھلی ہوئی آنکھیں " اس تاثر کے تجزیے میں آگے چل کر مدد دیتی ہیں --- اور اس تضاد کی وضاحت بھی ذرا آگے بڑھ کر ہو جاتی ہے :--

"کیا تم اسے دیکھنا چاہتے ہو؟" ہنیل نے بڑی صاف انگریزی میں پوچھا ۔

"ہاں" ۔

اس نے تاگا توڑ کے گڈا کپتان کے ہاتھ میں دے دیا ۔ وہ ایک ٹانک دوسری پر رکھے ، گڈا ہاتھ میں لئے بیٹھا رہا ۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک نا قابل فہم سی مسکراہٹ تیر رہی تھی ۔ اس کے بال بڑی نفاست سے ایک طرف جمے ہوئے تھے اور ان کی رنگت بڑی کالی اور چمکیلی تھی ۔ بالآخر وہ اپنی سریلی اور مسرور آواز میں بولا -- " آخر تم نے مجھے اپنا ہی لیا ! "

ہنیل نے پوچھا --- " کیا ؟"

" تم نے مجھے اپنا ہی لیا "۔

" مجھے اس کی کوئی پروا نہیں "۔ وہ بولی ۔

" کیا -- تمہیں اس کی کوئی پروا نہیں ؟" --اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی ۔ اس کے جواب دینے کا طریقہ بھی عجیب تھا -- جیسے بات کی طرف اس کا پورا دھیان نہیں بلکہ وہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچ رہا ہے ---"

کپتان کا یہ فقرہ " آخر تم نے مجھے اپنا ہی لیا یہ واضح کر دیتا ہے کہ کپتان نے ہنیل کے من کی موج کا بھید پا لیا ۔ اسے معلوم ہو گیا کہ اس نے اس کا گڈا کیوں بنایا ہے -- مگر ہنیل کو اس پر کوئی غلبہ حاصل نہیں ہو سکا ، وہ اس پر چھا نہیں سکی ۔ کپتان کی موجودگی میں ہنیل کا احساس لاچار سا رہتا ہے ۔ اس کی موجودگی میں اگرچہ وہ اسے آنکھوں

سے دیکھ سکتی ہے اور اس کی باتیں کانوں سے سن سکتی ہے لیکن اس کی آواز اور اس کی کالی آنکھوں سے جو کبھی ، ان کہی باتیں ہنیل تک پہنچتی ہیں وہ کسی ایسی ہستی کا سراغ دیتی ہیں جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی اور جسے وہ کبھی اپنا نہیں بنا سکتی — یہ حقیقت بڑی شدت سے قاری پر ظاہر ہوتی ہے ۔ چنانچہ وہ اپنی شکست پر کھسیانی اور لاچار ہوتی ہے اور اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے ۔ مگر اسے اس حقیقت کا خوب احساس ہوتا ہے کہ جس چیز کے خلاف وہ بغاوت کر رہی ہے وہی چیز (یعنی کپتان کو نہ جان سکنا ، اور اس کی ہستی پر چھا جانے میں ناکام رہنا) اس کو کپتان کی طرف والہانہ طور پر کھینچتی ہے ۔ اور وہ عنصر یہ ہے :—

”کپتان نے نگاہیں اٹھائیں اور ہنیل کی طرف دیکھا ۔ جب کبھی وہ ہنیل کی طرف یوں اپنی سیاہ آنکھوں سے دیکھنے لگتا تو ہنیل کا دل ہمیشہ پگھل کے رہ جاتا اور کپتان کی وہ عجیب و غریب چمکیلی سی نگاہ ، اور لاابالی سی نظر ، انسانی نظر نہیں کوئی دوسری چیز معلوم ہوتی تھی ۔ وہ کبھی نہیں سمجھ سکی تھی کہ جب وہ اس کی طرف دیکھتا ہے ، تو کیا دیکھ رہا ہوتا ہے —“

گویا وہ کبھی نہیں جان سکی تھی کہ جب وہ اس کی طرف دیکھتی ہے تو اسے کیا نظر آتا ہے ۔ اور یہ اس بات کا محض ایک پہلو ہے ۔ اس کا ایک اور پہلو ، ایک ضمنی پہلو بھی ہے حالانکہ ہنیل کو اس ضمنی پہلو کا کوئی شعور نہیں — وہ یہ کہ وہ خود بھی ، حقیقت میں ، اپنے ظاہری عناصر کی قطعیت کے باوجود اپنے چھریرے سہرے اور اپنی شخصیت کی قطعیت کے باوجود اسی طرح کی ایک نا معلوم ہستی ہے جس طرح کپتان ہیپ برن ہے — ہنیل کو جو مسئلہ الجھا رہا ہے (اور یہی مسئلہ اس کہانی کی ڈرامائی کشمکش کا واحد عنصر ہے) وہ یہ ہے کہ ہنیل یہ جاننا چاہتی ہے کہ آیا کپتان ہیپ برن نے اس پر جو جادو کر رکھا ہے وہ حقیقی ہے یا محض ایک سراب ، ایک وہم کی جبلیت رکھتا ہے ؟ — اور یہ کہ آخر یہ کپتان ہیپ برن ہے کیا ؟ اور کبھی اس کی حقیقت کو جاننے کا مسئلہ یہ صورت بھی اختیار کر لیتا ہے :—

” وہ اپنے آپ کو بوجھل بوجھل اور سحر زدہ سی محسوس کر رہی تھی اور یہ سحر جو اسے اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا اسے بہت ہی محبوب تھا ۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس سحر سے نفرت بھی کرتی تھی “۔

لارنس کی یہ کہانی مرد اور عورت کے تعلقات کی گہری بصیرت کا آئینہ ہے ۔ قانونی قسم کی رسمی شادیوں کے بارے میں لارنس کے جو معتقدات ہیں وہ اس کہانی سے پوری طرح ظاہر ہوتے ہیں ۔ یہ بصیرت اور یہ معتقدات ، رسمی اقدار اور خیالات کے لئے کھلا چیلنج ہیں — ظاہر ہے کہ اس قسم کے چیلنج کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس بصیرت اور ان معتقدات کی مخالفت کی جائے گی ۔ یہ مخالفت یا تو سیدھے انکار کی صورت اختیار کرتی ہے یا پھر مخالفت کرنے والا اپنی مخالفت کی شدت کے باعث ان معتقدات پر سرے سے غور کرنے کے ہی کے قابل نہیں رہتا ۔ چنانچہ اس کہانی میں بھی جب ہنیل ان معتقدات اور اس بصیرت کو کپتان ہیپ برن کی شخصیت میں دیکھتی ہے تو ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جاتی ہے ۔

کہانی میں الگزینڈر ہیپ برن کے کردار کو یعنی ”گڈے الگزینڈر“ کو جس قوت کلام سے زندہ کیا گیا ہے اس سے شروع میں ہی ایک بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اگرچہ لارنس کے ناول اور اس کی کہانیاں اتنی عام فہم اور اتنی مقبول عوام نہیں ہو سکیں لیکن

اس میں بڑے اہم ناول نگار کی ساری اعلیٰ صلاحیتیں موجود ہیں ۔ گڈے ہی کو لیجئے — نہایت صاحب ذوق قسم کے قاری بھی یہ اُمید کر سکتے تھے کہ لارنس اپنے مرکزی مردانہ کردار کو اجاگر کرنے کے لئے فلاں فلاں قسم کی بات کرے گا ، گویا کردار کو واضح کرنے کے لئے لارنس نے جو فنی پیچ دئے ہیں گڈا اُن کی علامت ہوگی — قاری کہے گا کہ ناول نگار اس سے بڑھ کر کیا کرسکے گا کہ انسانوں کی ایسی لفظی تصویر کھینچے جو زندگی کے مماثل ہو اور اُس کے کردار ویسے ہی بولتے چالتے پھریں جیسے اُن کی طرح کے انسان کریں گے! باذوق قاری کی توقعات پوری بھی ہوتی ہیں لیکن لارنس کا کہنا تو یہ ہے کہ وہ قاری کی توقعات سے بڑھ کر بات کرتا ہے ۔ مگر چونکہ لارنس کا آرٹ عام توقعات کا پابند نہیں ہوتا ہے اور لارنس " شخصیت " کی تہوں میں چھپی ہوئی باتوں تک پہنچنا چاہتا ہے اور عام طور پر ناول نگاروں کو انسانی زندگی سے جو دلچسپی ہوتی ہے لارنس کی دلچسپی اور اُس کا انہماک اس سے کہیں زیادہ ہے اس لئے اب تک لارنس کو سمجھنے والے بہت کم ہیں اور بڑے بڑے بقراط قسم کے نقاد بھی تحریر میں اس عجز کا اظہار بڑے اطمینان سے کر دیتے ہیں —

اگر کوئی دوسرا ادیب اس کہانی کا مصنف ہوتا تو وہ یقینی طور پر کپتان کی گہری سیاہ آنکھوں کو شخصیت کا ایک خاصہ قرار دیتا ، کپتان کی شخصیت کا بڑا جادو انہی کو قرار دیتا — مگر لارنس نے یہ نہیں کیا ۔ ان آنکھوں کا تعلق اور اُن کا ناطہ تو اس چست پتلون کے ساتھ ہے جو کپتان ہمارے سامنے کبھی نہیں پہنتا — سکاٹ سپاہیوں کی یہ مخصوص چست پتلون اس انہماک کو بالکل ممیز کر دیتی ہے جو کرداروں کے سلسلے میں لارنس کا خاصہ اور اس کا امتیاز ہے ۔ کپتان ہیپ برن کی شخصیت کے جادو اور اس کی گفتار کے جادو کے بارے میں ہنیل عام طور پر ہراساں نظر آتی ہے ۔ اس کا یہ خوف بڑا پیچیدہ اور سلون ہے ۔ یہ خوف اس بات کا پیش خیمہ اور جواز ہے کہ ہنیل ، کپتان کے ساتھ اپنی شادی کو رومانی محبت کی بنیادوں پر استوار نہیں کرے گی ۔ اور وہ اس بات پر اندر ہی اندر رضامند بھی ہوچکی ہے ۔ یہ تصور ، شادی کے مغربی تصور کے شدید طور پر متضاد اور مخالف ہے ۔ مگر ہنیل کو اس کا شعور نہیں ۔ اُسے تو صرف اتنا شعور ہے کہ کپتان الگزینڈر کی ذات میں جو دلکشی ہے وہ بہت ہی عجیب قسم کی دلکشی ہے ، اور اس دلکشی کا اثر اس پر کبھی کچھ ہوتا ہے اور کبھی کچھ — شروع شروع میں ہم بھی کپتان کے بارے میں جو کچھ سمجھتے ہیں وہ ہنیل کے خیالات پر مبنی ہے ۔ (اس کا یہ مطلب نہیں کہ کپتان کی ذات تک ہماری بلاواسطہ رسائی نہیں — کہنا یہ ہے کہ ہمارا تعارف اُس سے اُن تصورات کی بدولت ہوتا ہے جو ہنیل کے ہیں) لیکن کہانی کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہم ہنیل کے ساتھ ، اس کے استعجاب و حیرت ، کپتان سے اس کے روٹھنے بگڑنے ، پھر اس سے بالکل پیچھے ہٹ کر بے تعلق ہو جانے ، اور پھر اُسی کے قدموں میں جھک جانے کا ڈرامہ کھیلتے ہیں اور اس دوران میں کپتان کی ذات کا جو شعور ہمیں حاصل ہوتا ہے ، وہ اس کے بارے میں ہنیل کے خیالات سے مطابقت نہیں رکھتا ۔ اس مرحلے پر ہمیں ہنیل کے مقابلے میں بہتر طریقے پر یہ پتہ چل جاتا ہے کہ گڈے کی اہمیت کیا ہے ۔ چنانچہ کہانی کے آخری مرحلوں میں جب کپتان ہنیل سے یہ کہتا ہے کہ " اس بات کو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے یا مجھے تم سے ! " تو اس بات کا ہم پر جو اثر ہوتا ہے وہ ہنیل کے رد عمل سے بہت مختلف ہوتا ہے ۔

مگر یہ تو بہت آگے کی باتیں ہیں — بات کپتان ہیپ برن کی شخصیت کی تھی ۔ اس کی شخصیت میں جو عجیب قسم کی دلاویزی اور دلکشی ہے اور اس پر جس طرح ہنیل مر مٹتی ہے اس کا احساس ہنیل کے ساتھ ہمیں بھی ہوتا ہے ۔ ہمیں بھی ہنیل کی طرح یہ یقین ہو جاتا ہے کہ الگزینڈر ہیپ برن کی ذات میں ایسی دلکشی ہے جو انجانی بھی ہے اور ناقابل بیان بھی ۔ یہ

دلکشی اتنی حقیقی ہے کہ اس کے اظہار کے لئے لفظ نہیں ملتے ـــ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ لارنس ہمیں اس انجانی دلکشی کے طلسمی پردوں کے پیچھے کیسے لے جاتا ہے کیونکہ ہیپ برن ” بھونرا سی سیاہ آنکھوں اور ان کی کہیں نہ تکتی ہوئی نظر “ اور اس کے ہر قسم کے ” تاثر اور جذبات سے عاری چہرے “ کے پیچھے ، اور اس کی آواز کے اندر چھپی ہوئی حقیقت ناقابل اظہار ہوتے ہوئے بھی ہمارے لئے ایک ٹھوس حقیقت بن جاتی ہے ـــ اور یہ حقیقت اس کہانی میں پوری خوبی و شدت سے اپنا اہم کردار ادا کرتی ہے ـــ باقی رہا کپتان کا مادی وجود تو اگرچہ وہ اتنا ”متعین“ نہ سہی پھر بھی اس کے خد و خال کافی حد تک اجاگر ہیں ۔ ان خد و خال کو متعین کرنے میں اس کے عجیب و غریب اور دلکش جسم ، اور اس کے رہن سہن کی خصوصیات کے بیان کو بڑا دخل ہے ۔ اس کی ذات سے ہماری وابستگی کا تعلق اس لمبے چوڑے بالا خانے سے بھی ہے جس میں وہ مقیم ہے ، یہ بالاخانہ ایک بے حد خوبصورت اور بڑے کمرے پر مشتمل ہے جس میں ہلکی ہلکی روشنی آتی ہے ، جس کی محراب دار چھت سفید ہے ۔ اس کمرے میں فرنیچر ' کم کم ہے ' لکھنے کی میز بہت بڑی ہے اور اس میز پر ” لکھائی کے سامان کے علاوہ کچھ سائنس کے آلات پڑے تھے اور اس پر ایک پودا بھی دھرا تھا جس میں بڑے عمدہ سرخ پھول لگے ہوئے تھے “۔ پھر اس کمرے میں دو بڑی دوربینیں ہیں جن میں سے ایک کھڑکی کے پاس سٹینڈ پر نصب کی گئی ہے ـــ لیکن ہنیل نے جس چیز کو اس کی ” تاثر سے عاری پیشانی ، اس کا لاابالی پن “ ٹھہرانا ہے وہ خصوصیت خاص طور پر کپتان کی گفتگو میں شدت سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کا تاثر ایک واضح نہج اختیار کر لیتا ہے ۔ ذرا اس کی گفتگو کا بیان دیکھئے :-

> ” اس کی آواز کی نرمی ، سریلے پن اور کھوئے کھوئے انداز سے وہ بے بس ہو گئی ۔ ہنیل کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے (کپتان نے) کبھی اس کی باتوں کا جواب دیا ہی نہیں بلکہ الفاظ تو یونہی اس کی زبان سے نکل پڑتے تھے کیونکہ بات کے جواب میں اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا لیکن جیسے وہ خود کبھی نہیں بولتا تھا ـــ اس وقت بھی وہ ہنیل کے سامنے اپنی خالی خالی سی خاموشی لئے بیٹھا تھا ـــ “

جوں جوں ہم آگے بڑھتے جاتے ہیں ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہنیل کا یہ احساس اس گفتگو کا لازمی نتیجہ تھا جو ان فقروں سے پہلے ان دونوں میں ہو چکی ہے ۔ اس سے پہلے گفتگو میں وہ بمشکل ہنیل کو بتا سکا ہے کہ اسے اپنے کرنل سے باتیں کرتے ہوئے دیر ہو گئی ۔ اور یہ کہ یہ باتیں ہنیل کے بارے میں تھیں ، اور اس کی بیوی نے (جو انگلستان میں ہے) اب کچھ جھگڑا کھڑا کر دیا ہے ـــ جس طریقے سے اور جس لہجے میں یہ خبر ہنیل تک پہنچائی گئی ہے (اور یہ بات واقعی اپنے انداز میں بالکل ” خبر “ کی سی حیثیت رکھتی ہے) اس کا تعین بڑا دشوار ہے ۔ کیونکہ یہ اہم باتیں اس کی گفتگو میں بڑی قطعیت کے ساتھ موجود تھیں ـــ پھر ہنیل تک اپنے خاص انداز میں یہ پریشان کن خبر پہنچانے کے بعد (اور یہ کہنے کے بعد کہ کرنیل کے مشورے کے بموجب اس کا خیال ہے کہ وہ رخصت لے کر وطن چلا جائے) وہ پیٹی کمر سے کھول کر لٹکا دیتا ہے ، فوجی کوٹ اتار کر دوسرا کوٹ پہنتا ہے ، بھاری فوجی بوٹ اتار کر سلیپر پہنتا ہے ، اور کرسی پر دوبارہ براجمان ہو کر دل کھول کر انگڑائی لے کر ہاتھ پاؤں پھیلا دیتا ہے ـــ اور ـــ :-

> ” لو ، اب ذرا سکون ہوا ہے “ ـ وہ ہنیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ۔
>
> ” اچھا اب یہ کہو کہ تم کیسی ہو ؟ “
>
> ” میں ؟ “ وہ کہنے لگی ” میرا کیا ہے ؟ “ اس وقت وہ بڑی تلخی محسوس کر رہی تھی ۔

" تمہارا کیا ہے ؟ " اُس نے لہجے کی تلخی کو محسوس نہ کرتے ہوئے ھنیل کا فقرہ دھرایا - " ارے یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ؟ — بے شک ، تم تو میرے لئے بڑی اہمیت رکھتی ہو — کیوں ؟ کیا تم اہم نہیں ہو ؟ " وہ پھر اُسی عجیب و غریب انداز میں مسکرا دیا - ھنیل کو لمحے بھر کے لئے بندروں کے وہ چینی مجسمے یاد آگئے جو ہر وقت رنجیدہ سے لگتے ہیں - کپتان نے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کے ایک انگلی بڑی نرمی سے اُس کے رخسار پر پھیری - ھنیل سرخ پڑ گئی -

" پھر حال میں اتنی اہم نہیں جتنے کہ تم — کیا خیال ہے تمہارا ؟ " اُس نے بڑی جرأت کر کے پوچھا -

" کیا کہا ؟ تم اتنی اہم نہیں جتنا میں — ارے توبہ کرو ، میں تو ذرا بھی اہم نہیں ہوں - قطعی اہم نہیں ہوں ! " اُس کے الفاظ کچھ اکھڑے اکھڑے اور کھوئے کھوئے سے تھے - آخر اس کا مطلب کیا تھا ؟ وہ چکرا گئی -

" تو پھر میں اس سے بھی کم اہم ہوں —" ھنیل نے پھر ترش لہجے میں کہا -

" ارے نہیں ، ایسا نہیں ہے - ایسا قطعی نہیں ہے - تم تو بہت اہم ہو - میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری اہمیت بہت زیادہ ہے —"

" اور تمہاری بیوی کی ؟ " اس کے سوال میں باغیانہ انداز تھا - " تمہاری بیوی اہم نہیں کیا ؟ "

" میری بیوی ؟ میری بیوی ؟ " اُس نے اپنی زبان سے یہ لفظ ایسی بے دلی سے ادا کیا جیسے وہ اس کا مطلب ہی سمجھ نہ سکتا ہو - " ہاں ، ہاں میرے خیال میں اپنی جگہ وہ کافی اہم ہیں "۔

" کون سی حد تک ؟ " ھنیل بے اختیار بول اٹھی -

"... یعنی — اپنے گھر تک اپنے مقام اور دونوں بچوں کی حد تک - ان کی زندگی کا دائرہ تو وہیں تک محدود ہے "۔

" ... اور تم اس دائرے میں کہاں آتے ہو ؟ "

" فی الحال تو میں اس دائرے میں نہیں ہوں " وہ بولا -

ھنیل نے کہا " لیکن یہی تو سارا جھگڑا ہے - اگر تمہاری بیوی اور تمہارا گھر موجود ہے تو تمہارا یہ فرض ہے نا کہ تم اُسی کے ہو کے رہو "۔

اُس نے جواب دیا " ہاں ہونا تو یہی چاہئے بشرطیکہ میں یہ چاہوں ! "

" تو کیا تم ایسا کرنا چاہتے ہو ؟ "

" نہیں میں نہیں چاہتا "۔

" تو پھر " وہ بولی -

کپتان نے جواب دیا — " بس یہی تو الجھن ہے ! "

لہجے کی یہ عجیب بے پروائی ، الفاظ کے اس " خود بخود زبان سے ادا ہونے " اور " بے خیالی میں کہے جانے " کے باوجود سطحیت پر مبنی نہیں - یہ بے پروائی ہر قید سے آزاد ہے ، اسی لئے ھنیل اس سے ہراساں بھی ہے اور اسے سمجھ بھی نہیں پاتی - لیکن یہ ظاہری بے پروائی نہایت گہری سنجیدگی بھی ہے - اس کی کنجی اسی سین کے آخر میں ملتی ہے :-

ھنیل نے تلخی سے دھرایا " لیکن مستقبل بھی تو کوئی چیز ہے - مجھے مستقبل کی بھی فکر ہے "۔

" مستقبل ؟ ...... مستقبل تو ہر روز ختم ہوتا رہتا ہے — میری نظر میں

تو مستقبل سیاہ الجھے ہوئے دھاگے سے زیادہ نہیں ــ ہر صبح تم اس کا سرا ڈھونڈ کر دھاگا کھولنا شروع کر دیتی ہو ، یہی تمہارا دن ہوتا ہے ۔ اور ہر شام کو تم اپنے کھولے ہوئے دھاگے کو توڑ کے پھینک دیتی ہو ، اور وہ الجھا ہؤا ڈھیر اسی طرح کم ہوتا رہتا ہے ــ ایک تاگا کم ہوا تو سمجھو ایک دن گزر گیا ــ بس میرے نزدیک تو مستقبل کی یہی وقعت ہے "۔

" پھر تو تمہارے نزدیک کسی بھی چیز کی کوئی وقعت نہیں ۔ میری بھی تمہارے نزدیک کوئی وقعت نہیں ، جیسا کہ تم نے خود کہا ، بس ایک بے کار تاگے سے زیادہ نہیں ــ" وہ مدافعت پر اتر آئی ۔

" نہیں یہ تم بالکل غلط سمجھی ہو ۔ تم میرے لئے مستقبل نہیں ہو "۔

" پھر میں کیا ہوں ؟ ــ ماضی ؟ "

" نہیں ان میں سے کچھ بھی نہیں ــ تم کچھ بھی نہیں ہو ــ جہاں تک ان چیزوں کا تعلق ہے تم کچھ بھی نہیں ہو "۔

" اگر میں کچھ بھی نہیں ہوں تو شکریہ " ھنیل طنز سے بولی ۔

لیکن کپتان کے اس مہمل انداز نے ہی آس پر غلبہ پا لیا ــ !

کپتان کے رویے کی اس بے پروائی اور گہری سنجیدگی کا جادو اسی انداز ــ "مہمل انداز" میں پنہاں ہے ۔

اس 'مرد' سے شعوری طور پر وہ کن باتوں کی امید کرتی ہے ؟ کون سے تصورات اس توقع سے تعلق رکھتے ہیں ؟ یہ ساری چیزیں اس حقیقت سے بالکل بے تعلق ہیں کہ کپتان کی ذات میں ھنیل کے لئے بڑا جادو ، بڑی دلکشی موجود ہے ۔ کپتان کی موجودگی ھنیل کے مفروضات کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے ۔ خیالات اور احساسات کے وہ انداز ، خصوصاً محبت اور مسرت کے بارے میں اس کے خیالات اور جذبات کے سارے تانے بانے جن میں وہ پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے ، سب کپتان کی موجودگی سے بکھر جاتے ہیں اور وہ صرف اتنا جانتی ہے کہ اس کا کپتان ایک ناقابل بیان سحر آفرینی کا پیکر ہے ــ بس ایک " مہمل " سی دل کشی اس کی ذات میں ہے اور کہ عورت فطرتاً مرد سے جن باتوں کی لازمی طور پر آرزو کرتی ہے کپتان کی ذات اور اس کی دلکشی کا ان سے کوئی " تعلق " نہیں ۔

اس الجھن کو کپتان کی بیوی کی آمد اور اس کے نتائج اور بھی گہرا کر دیتے ہیں اسے اور الجھا دیتے ہیں ۔ نتیجۃً ھنیل کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ آخر کپتان کے بارے میں اس کے دل کی تمنا کیا ہے اور وہ کیا چاہتی ہے ؟ ــ لیکن اسی دھندھا سے قاری کوگڈے کی اہمیت سمجھنے کے سلسلے میں بے حد شاندار مواد ملتا ہے ــ سب سے پہلے تو وہی عجیب سی خواہش ہے جو ھنیل کو کہانی کے شروع میں ایک " غیر ملکی گڑیا سی خاتون " کو کپتان کا گڈا دکھانے پر اکساتی ہے ۔ یہ " غیر ملکی خاتون " اس اسٹوڈیو میں آتی ہے جو ھنیل اور اس کی سہیلی مچکا نے کھول رکھا ہے ۔ ان دنوں کپتان ھیپ برن وہاں موجود نہیں ، وہ کئی دن سے کسی کام کے سلسلے میں کہیں باہر گیا ہوا ہے اور " ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس کی ہستی ھنیل کی زندگی سے یکسر غائب ہو چکی ہے "۔

" ...... اصلیت میں اس کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی ــ وہ تو ایک موہوم چیز تھا ــ اور کسی طور وہ اس موہوم چیز کے ساتھ الجھ کے رہ گئی تھی ... "

لیکن جونہی باہر سیڑھیوں پر وہ اس کی آواز سنتی ہے اور اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس عجیب سی ، چھوٹی سی ، غیر ملکی خاتون سے باتیں کر رہا ہے تو " وہ پھر ڈر گئی ــ وہ سمجھ گئی کہ وہاں کوئی موجود تھا ! "

اور جب وہ حقیقتاً اس گوشت پوست کے پتلے کے سامنے آجاتی ہے تو یہ سوال کہ "وہاں کیا ہے ؟" ایک نئی اور زچ کر دینے والی قوت کا حامل بن کر رہ جاتا ہے - ہم ھیبل کے ساتھ مل کر یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اس شخص میں ایسی عجیب خاصیت موجود ہے جس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جان سکتا۔ چنانچہ جونہی یہ سین ختم ہوتا ہے ہمارا بھی وہی حال ہوتا جو ھنمل کا ہے - ہم کہانی کے مصنف یا حکم کی حیثیت رکھتے ہوئے بھی ھنمل کی طرح ہی لاچار محسوس کرتے ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ عام توقعات کے برعکس کپتان کا انداز گفتگو اور اس کے فقرے بے حد ناموزوں ہیں اور جن اہم مسائل پر بات ہو رہی ہے آن سے اتنے بے تعلق ہیں کہ کیا کہئیے - -

کپتان کی ہستی کے اس عجیب پہلو کو کہانی کے اس مرحلے پر دیکھئیے جب ھنمل ایک رات سو نہیں سکتی اور واپس جا کر اس کے کمرے میں جھانکتی ہے - وہ دیکھتی ہے کہ اوپر والی چھت پر جو چھوٹا سا چبوترہ ہے ، وہ وہاں موجود ہے اور چاند کی طرف تک رہا ہے - اس نے کھڑکی کے دروازے پر کھٹ کھٹ کی ، اور اس آہٹ پر وہ چونک کر یوں اس کی طرف دیکھتا ہے جیسے کوئی جنگلی بلا اپنی بڑی بڑی شب بینا آنکھوں سے دیکھے - وہ ھیبل سے کہتا ہے کہ آؤ تم بھی چاند کی طرف دیکھو (وہ انکار کر دیتی ہے) اس پر وہ ایک بڑی غیر معمولی بات ، بڑے معمولی انداز میں ھیبل کو بتا دیتا ہے کہ کل والا ملاقاتی اور کوئی نہ تھا بلکہ اس کی بیوی تھی :-

" تمہاری بیوی "— وہ بولی ، وہ واقعی بھونچکا رہ گئی -

اس منظر کا تاثر ہی ایسا ہے - کپتان اپنے متین اور بڑے عام سے انداز میں جو کچھ کہتا ہے اس کا قدرتی رد عمل گہرا استعجاب ہی ہونا چاہئیے - لیکن اس کے لہجے اور اس کے انداز سے یہی پتہ چلتا ہے کہ اسے دوسروں کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے کا کچھ احساس ہی نہیں — لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اس عجیب خاصیت کی وجہ سے وہ اپنے غیر حساس ہونے کا ثبوت نہیں دے رہا -

لیکن یہ شعور تو قاری کو حاصل ہوتا ہے - ھیبل اس میں شریک نہیں - کیونکہ ھیبل اس کہانی کی قاری نہیں ، اس کی ایک کردار ہے - اس کا احساس (ذرا نوٹ کیجئیے) اتنا بے لاگ اور غیر ذاتی نہیں ، نہ اتنا کلی ہے جتنا ہمارا ہے - وہ اتنا سنتی ہے کہ اس کا کپتان اس کے سامنے اپنے مخصوص لا ابالی سے انداز میں یہ عجیب سانحہ (بیوی کی آمد) بیان کر رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ وہ ہوٹل میں اپنی بیوی کے ساتھ ایک ہفتہ بسر کرے گا -- اور وہ یہ بات کہتے ہوئے حسب دستور اپنی بڑی بڑی سیاہ اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے خلا کو گھور رہا ہے - اسی وجہ سے ھنیل کا سر گھومنے لگتا ہے - وہ سوچتی ہے :-

"کیا وہ مرد ہے؟ آخر کیا چیز ہے وہ ، وہ بس اتنا جانتی تھی کہ یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہے (آخر) اس نے کہا : اچھا خدا حافظ امید ہے وبریارس زائٹین (ہوٹل) میں (بیوی کے ساتھ) تمہارا وقت خوب کٹے گا "۔

اس کے بعد ہوٹل میں ھنیل اور کپتان کی بیوی مسز ہیپ برن کے درمیان گفتگو کا سین آتا ہے - دونوں کی ملاقات بازار میں اچانک ہو گئی تھی — پتہ چلتا ہے کہ مسز ھیپ برن اس وہم میں مبتلا ہے کہ جس عورت نے اس کے خاوند کپتان ھیپ برن کو اپنا بندۂ بے دام بنا لیا ہے وہ کالی آنکھوں اور کالے بالوں والی خوب صورت امیر زادی مجذا ہے (ھنمل نہیں) چنانچہ مسز ھیپ برن کہتی بھی ہے — " مجھے معلوم تھا کہ اگر میں اپنے شوہر کے پاس نہ ہوں تو وہ اسی قسم کی لڑکی کی طرف مائل ہوں گے "۔ اس پر یقین فقرے سے ھنمل بھڑک اٹھی ہے کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ اس کی توھین کی گئی ہے - لیکن وہ چپ چاپ " گڑیا سی

مسز ہیپ برن" کی باتیں سنتی رہتی ہے - اور مسز ہیپ برن اس وقت ہنیل کو یہ بتا رہی ہے کہ اُس کا " الگزینڈر" خاوند کی حیثیت سے کتنا فرمانبردار اور کتنا اچھا ہے :-

"مگر وہ تو میرے ساتھ بہت ہی اچھے رہے ہیں - انہوں نے مجھ سے کبھی کوئی سخت بات نہیں کہی اور شادی کی رات تو انہوں نے میرے سامنے دو زانوں ہو کر قسم کھائی تھی کہ مجھے زندگی بھر خوش رکھیں گے - اور میری زندگی کو خوشگوار بنائے رکھنا ان کا واحد مقصد رہا ہے "۔

ان لفظوں کی بنا پر ہنیل یہ دیکھ رہی ہے کہ یہ عورت " کسی داستان کی ہیروئن بن رہی تھی جو خود اپنی زندگی کی داستان میں بڑا اہم کردار ادا کر رہی ہے " -- ہمیں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ تماشا دیکھنا عورت کی فطرت میں داخل ہے - اور اگر کسی عورت کو تماشائی بنا دیا جائے تو وہ برا نہیں مانتی ! اس جھوٹی سی عورت مسز ہیپ برن کی مضحکہ انگیز مگر بے حد قابل یقین کامیڈی کے پیش نظر ، گڈے کی اھمیت افزوں ہی نہیں ہوتی بلکہ اس میں بڑی تعمیم ، بڑی وسعت آ جاتی ہے - اور یہ مرحلہ بڑے نازک اور غیر محسوس طریقے پر طے کیا گیا ہے - ابھی تک اس گڈے میں کوئی علامتی چھاپ نہیں آئی - لیکن اسی سین کے آخر میں یہ گڈا اپنی پوری علامتی اہمیت کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتا ہے - پھر اس ساری گفتگو میں گڈا باتوں میں جا بجا در آتا ہے - مثلاً اس گفتگو کے قریب قریب درمیان میں مسز ہیپ برن ہنیل سے یہ کہتی ہے کہ جب تم نے مجھے اُس کا گڈا دکھایا تو مجھے یقین ہو گیا (کہ وہ مچکا کے دام میں پھنس چکا ہے) اسی لئے وہ گفتگو کے آخر میں یہ کہتی ہے " کیا یہ ممکن ہے کہ وہ گڈا مجھے مل جائے "۔

" آپ گڈا مجھے گھر بھجوا دیں گی نا ؟ آپ کی بڑی عنایت ہو گی "۔

" مجھے پہلے اپنی سہیلی (مچکا) سے پوچھنا ہو گا "۔

" ہاں ، بے شک - مگر مجھے یقین ہے کہ وہ اتنی فراخ دل ہوں گی کہ گڈا مجھے بھجوا دیں ، ورنہ آپ جانیں یہ تو بڑی نا مناسب سی بات ہو گی نا "۔

" جی نہیں کوئی ایسی نا مناسب بات تو نہیں ہے -- آخر وہ محض ایک تصویر ہی تو ہے !" ہنیل نے کہا -

" اچھا کیا آپ کا یہ خیال ہے ؟" اس کی میزبان رکھائی سے بولی - " بہر حال خواہ تصویر ہی ہو ، اُسے بھی میں اپنی ملکیت میں رکھنا زیادہ پسند کروں گی -- یہ گڈا تو ..."

ہنیل منتظر رہی - مگر بات ختم ہی نہیں ہو رہی تھی، آخراس نے خود ہی کہا "خیر تو اس کی قیمت بن گئی ہے -یا اتنے پیسے جرمن سکے میں ادا کر دیجئے !"

" بہت اچھا -- گڈا مل جانے پر میں تین گنی آپ کو بھیج دوں گی ! "

گویا ہنیل نے الگزینڈر کا جو گڈا بنایا ہے وہ حقائق پر قوت ارادی اور تصور کی ایسی مضحکہ انگیز فتح نہیں جتنی خود مسز ہیپ برن کی ذات ہے - اس کے باوجود یہ ایک پتلا ہے، اس کے بنانے میں جو جذبے کار فرما تھے اب ان کا ناطہ محبت کی توقع سے واضح ہو چکا ہے - یہ بھی ظاہر ہوگیا ہے کہ جس محبت کی توقع ہنیل کو تھی اس میں پرستش بھی شامل تھی - یہ بات بھی تھی کہ اس کا عاشق اس طرح اُس کا بن جائے کہ وہ اُسے (یعنی محبوب) کو اس پرستش، اس وفاداری سے خوش رکھے - اس توقع کے ساتھ لازمی طور پر ملکیت کا جذبہ وابستہ ہوا کرتا ہے - اور جب کسی کے دل میں ایسی محبت اور پرستش اور وفا اور ملکیت کی توقع ہو تو جیتی جاگتی حقیقت یعنی اپنی ملک کے حقیقی اعمال و افعال سے اس کی آنکھیں بند رہا

کرتی ہیں ۔ یہ فقرے ملاحظہ ہوں :۔

..... اور ایلک (کپتان ہیپ برن) کا یہ نقشہ کہ اس نے شادی کی رات اپنی بیوی کے قدموں میں بیٹھ کے یہ قسم کھائی کہ میں اپنی ساری زندگی تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کروں گا ۔ ھنیل کو جب کبھی اپنے پیارے کپتان کا خیال آتا تو یہ تصویر بار بار اس کے ذہن پر چھا جاتی — اگر کپتان نے یہی قسم خود اس کے قدموں میں بیٹھ کر کھائی ہوتی تو یہ حرکت ھنیل کو بالکل فطری معلوم ہوتی ۔ وہ اسے محبت کے اظہار کا ایک لازمی حصہ گردانتی ، لیکن ایک دوسری اور چھوٹی سی عورت کے قدموں میں (یہ ڈلس) ۔

اس تصویر سے کپتان کی وقعت اور منزلت کو ھنیل کے دل میں جو نقصان پہنچتا ہے وہ نا قابل تلافی ہے ۔ مگر ھنیل یہ نہیں جانتی کہ کپتان کو بزعم خود گھٹیا سمجھنے میں ھنیل خود اپنے آپ پر نکتہ چینی کر رہی ہے ۔ اسے یہ بات اس وقت تک معلوم نہیں ہوتی جب تک اس کہانی کے آخر میں کپتان بڑی لمبی چوڑی باتوں کے بعد ھنیل سے باقاعدہ طور پر شادی کرنے کی درخواست کرتا ہے ۔ مگر فی الوقت اس کا یہ رویہ اس کے ایک جوابی فقرے سے ظاہر ہوتا ہے جو اس نے کپتان کی تجویز کے سلسلے میں تیز ہو کر کہا ہے :۔

” میں تمہارا گڈا کیوں نہ بناتی ؟ کیا اس میں تمہیں کوئی نقصان پہنچا ۔ بخدا ، تم تھے بھی گڈے ہی — تمہاری حقیقت ایک گڈے سے زیادہ اور کیا تھی ۔ اس لئے میں نے تمہارا گڈا بنا دیا ، تو تمہارا کیا بگڑا ؟“

اس لئے وہ اپنے آپ سے پوچھتی ہے کہ میں اس چھوٹی سی عورت کے اس تابعدار شوہر کے دام الفت میں کیوں کر پھنس گئی ؟ اس سے مجھے محبت کیوں کر ہوئی ؟ — یہ شخص ، جو اپنی شادی کی رات کے اس مضحکہ انگیز منظر کا ہیرو تھا ، میرا محبوب کیوں کر بن گیا ؟ یہ تابعدار شوہر ، میرے سامنے جس کی بیوی نے اس کے ساتھ گڈے کا سا سلوک کیا ہے اور جس نے بالکل ایک پتلے کی طرح اپنے مالک کا حکم مانا ہے ، مجھے اس سے محبت کیوں کر ہو گئی ؟

” اوہ ، خدایا !“ ھنیل کف افسوس ملنے لگی ، وہ ایسے شخص کے ساتھ کیسے الجھ گئی ؟ وہ اسے مردانگی کا مجسمہ معلوم ہوا تھا ۔ اس میں مردانہ گرم جوشی کا خاموش طوفان سمٹا ہوا نظر آتا تھا — مگر.. . وہ — وہ چھوٹی سی عورت کیا کہتی تھی بھلا ؟ ”میرے خاوند کا ہمیشہ میرے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک رہا ہے !“ بھلا سوچو تو ! پھر وہ گھٹنوں کے بل بھی اس عورت کے سامنے جھکا تھا ، اور اس کا یہ کہنا ” اچھا پیاری — بہت اچھا “ یہ تو نہیں کہ وہ اس چھوٹی سی عورت سے ڈرتا تھا ۔ یہ بات نہ تھی ، اس نے تو بس اپنے آپ کو اس عورت کے سپرد کر دیا تھا ، جس طرح کسی کو سپرد زنداں کر دیا جائے یا مرنے کے بعد سپرد جنت کر دیا جائے “۔

ھنیل اب کپتان کی ذات کو ایک بڑی عامیانہ ، بڑی محدود ، بڑی گھٹیا سی چیز سمجھنے لگی ہے ۔ مگر وہ اس جادو کو کبھی فراموش نہیں کر پاتی جو کپتان کی ہستی میں موجود ہے :۔

” بہر حال اگر کبھی اس کشش کا وجود تھا ، تو اب اس سے کون منکر ہو سکتا ہے ، اور اگر کبھی یہ چیز موجود تھی تو اب بھی اسے قائم رکھنا چاہئے ۔ آپ چاہیں اسے دھوکا کہہ لیں ۔ لیکن ایسا دھوکا جس کا حقیقت میں تجربہ کیا جا چکا ہے ، وہ اس قابل ضرور ہے کہ اسے برقرار رکھا جائے ۔ شاید یہ بیزاری خود اس دھوکے سے بھی زیادہ بڑا دھوکا تھی ۔ شاید اس چھوٹی سی عورت اور اس

کے شوہر کے متعلق یہ بیزاری، ان چند شاموں کے جادو اور دھوکے سے بھی زیادہ چھوٹی تھی !''

اس تجربے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ھنیل نے اپنی طوفانی امنگوں کا مرکز ، کھو دیا ہے ۔ اس کے بدلے ہوئے رویے کا مرکز اب وہ بیزاری ہے جو اُسے اپنی محبت کو ایک دھوکا سمجھنے پر مجبور کر رہی ہے ۔ اب وہ اپنے خیالات کے لئے ایک نیا توازن تلاش کر چکی ہے ۔ اسی لئے وہ فیصلہ کر لیتی ہے کہ وہ اب گڈا ، کپتان کی بیوی کو کبھی نہیں دے گی ۔ اس سین کا آخری فقرہ یہ ہے :۔

'' نہیں وہ ہرگز اُسے گڈا نہیں بھیجے گی ۔ اس جھوٹی سی عورت کو وہ گڈا نہیں ملے گا ۔ اور --- اس طرح وہ خود کیسی اچھی گڑیا بن سکتی تھی ؟ خدایا --- کیسی عجیب و غریب اور نادر --- ؟!''

اس کے بعد ، گڈے کی اہمیت کو اور زیادہ واضح ، اور زیادہ وسیع کیا گیا ہے ۔ گڈے کے کردار کی یہ بھرپور کیفیت اس گفتگو میں پوری طرح سامنے آتی ہے جو کپتان ھیپ برن اور ھنیل کے درمیان ، کپتان کی بیوی کے کھڑکی سے گر کر مر جانے کے بعد ہوتی ہے ۔ اس گفتگو سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ آخر کپتان کی ہستی میں وہ کیا ناقابل بیان کشش اور جادو تھا جسے ھنیل کبھی سمجھ نہیں سکی ۔ اب یہ کشش ایک واضح اور مثبت رنگ اختیار کر لیتی ہے ۔ اس کا اظہار اس ہلکی سی دستک میں بھی موجود ہے جب وہ بیوی کی موت کے خوف ناک حادثے کے بعد ھنیل کے کمرے پر آتا ہے ، اور جب ھنیل دروازہ کھولتی ہے تو اس سے کہتا ہے '' کیا تھوڑی دیر کے لئے باتیں کرنے کے لئے آ سکو گی ؟'' یہ کشش اور جادو ، اس بڑی غیر جذباتی ، سیدھی سیدھی گفتگو میں بھی موجود ہے جس میں وہ ھنیل کو اس حادثے کے بارے میں بتاتا ہے اور پھر ھنیل کو اپنی مرحوم بیوی کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کرتا ہے --- اس گفتگو کا لہجہ حسب دستور عام سا ہے ۔ مگر :۔

'' ھنیل کے کان کافی تیز تھے ۔ لیکن انتہائی کوشش کے باوجود وہ کپتان کی آواز اور لہجے کا مطلب نہ سمجھ سکی '' ۔

کپتان اس سے بے نیاز ، اپنی بات جاری رکھتا ہے ۔ وہ ھنیل کو بتاتا ہے کہ میری بیوی ایک پر اسرار ، ایک انجانی ہستی تھی ۔ اس کی جو ' شخصیت ' ظاہر میں نظر آتی تھی اصل میں وہ نہ تھی --- یہ ساری باتیں بظاہر بڑی نا قابل یقین ہیں ۔ ہم کپتان کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ '' میری بیوی ایک پری تھی جسے انسانی گھر میں رہنے اور انسانی سازو سامان استعمال کرنے کی سزا دے دی گئی ہو ! '' --- اس پر ھنیل بڑی بے یقینی اور بڑے اچنبھے سے کہتی ہے ''کیا واقعی ..... ؟ '' اور یہی رد عمل قاری کا ہوتا ہے ۔ اس بے یقینی کے باوجود کپتان نے اپنی بیوی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے ، وہ اتنا غیر ممکن بھی نہیں ۔ ہم نے اس مرحوم عورت کو جس روپ میں دیکھا ، اس میں اور کپتان کے بیان میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور نظر آتی ہے --- ملاحظہ ہو :۔

بالکل اس طرح جیسے گرم ملکوں کے جنگلوں سے کوئی نازک مخلوق پیدا ہوتے ہی نکال لی جائے ، اور اُسے انسانوں کے سے کرتب سکھا دئے جائیں ۔ امید ہے تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو گی ۔ شاید تمام عمر اس بے چاری نے یہی کرتب کئے ہیں ۔ اس کی حالت بالکل ایک چالاک سے ، چھوٹے سے بندر کی تھی ، اور یہ دیکھ کر خود مجھے چکر سا آنے لگتا تھا ---''

ذرا اس بیان کو ذہن میں رکھئے اور خود یہ یاد کیجئے کہ جب پہلی دفعہ کہانی میں آپ اُس سے متعارف ہوئے تھے تو آپ کا رد عمل کیا تھا ۔ ہمیں یاد آتا ہے کہ وہ کچھ

کچھ اسی طرح کی تھی اور بولتی بھی اسی طرح تھی ، یہ کہ اُس نے بڑا اچھا میک اپ کر رکھا تھا ، اُس کے کپڑے امیرانہ ٹھاٹھ کے تھے ، اس کی باتوں سے اس کے انداز سے، مخصوص انگریزی امارت کی شان ، بلکہ اکڑ ہویدا تھی -- اور یہ کہ اُس نے مخصوص نسائی عزم سے " اپنے مرد " کو دوسری عورت سے بچانے کا اقدام کیا تھا - اسی محدود سی ہستی کے بارے میں ہیپ برن ، ھنیل کے اس چیلنج کے جواب میں کہ " کیا تمہیں اس سے محبت تھی ؟" بڑی دل جمعی سے کہتا ہے :--

" ھاں ، لیکن کچھ اس طرح کی کہ جیسے میں نے لڑکپن میں ایک کالی کلغی والی چڑیا کو پکڑ کے پنجرے میں بند کر لیا تھا ، اور میں اس چڑیا سے محبت کرنے لگا تھا ، ...... لیکن تھوڑے ھی دن بعد یہ چڑیا مر گئی ... . پھر اس قسم کا احساس پیدا نہ ھو سکا جیسا کہ بچپن میں اس چڑیا کو دیکھ کے ھوا تھا یہاں تک کہ میری ملاقات اپنی بیوی سے ھوئی اور اُس کے بعد میرا دل اسی احساس سے بھر گیا ..... اور میں جلد ھی سمجھ گیا کہ یہ ضرور مر جائے گی - وہ پہلی چڑیا کی طرح دانہ چگے گی ، ادھر اُدھر دیکھے گی لیکن پھر آخر میں مر جائے گی -- لیکن وہ مرے گی اسی چڑیا کی طرح پنجرے میں بند ! "

اس عجیب و غریب بیان میں ، کپتان کی مرحوم بیوی کے علاوہ خود کپتان کی ذات پر جو روشنی پڑتی ہے وہ قابل غور ہے - جہاں تک کپتان کی مرحوم بیوی کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس کے بیان میں کچھ نہ کچھ صداقت کا عنصر ضرور ہے - کیونکہ ہر شخصیت جو کچھ نظر آتی ہے اصل انسان اس سے کہیں زیادہ پہلو دار ھوا کرتا ہے - مگر اس بیان سے کپتان کے بارے میں ہمارا یہ خیال (ھنیل کی طرح) پختہ ہو جاتا ہے کہ اُس کی ذات میں کوئی نا معلوم اور نا قابل بیان عنصر ضرور موجود ہے - اب ہم ھنیل کے ان تلخ الفاظ کا ساتھ نہیں دے سکتے کہ وہ بالکل احمق ، ایک محدود شخصیت -- ایک عامیانہ سا شخص بلکہ گدھا ہے - بلکہ اب اُس کی ذات کچھ اور غیر متعین ، کچھ اور نا معلوم سی ھو جاتی ہے -- ذرا مندرجہ بالا منظر کا اختتامی حصہ ملاحظہ ھو :-

" اور شاید قصور میرا ھی تھا --کیونکہ مجھے کوئی قدم اُٹھانا ھی چاھئے تھا - لیکن میں سمجھ نہ سکا کہ مجھے کیا کرنا چاھئے-- بخدا مجھے اس کے سوا اور کچھ پتہ نہ تھا کہ مجھے اپنی بیوی کو خوش رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاھئے اس کے پاس پیسہ بہت تھا ، اور میرا خیال تھا کہ اگر میں اُس میں حصے دار بن جاؤں تو کوئی حرج نہ ھوگا - میں ھمیشہ باغ میں بیٹھا رھتا-- وھاں میں تھا اور میرا علم فلکیات ...... چاند دیکھ کر مجھے بڑا سکون ملتا - پنجرے کے اندر دیکھنے کے بجائے جیسے کہ میں اپنی چڑیا یا اپنی بیوی کو دیکھا کرتا تھا اب میں باھر دیکھ سکتا ھوں -- آزادی کی طرف -- آزاد فضاؤں کی صرف ..."

" تمہارا مطلب چاند سے ہے ؟" ھنیل نے پوچھا -

" ھاں ، چاند سے "-

" اور اسی کو تم آزادی کہتے ھو ؟"

" ھاں اسی میں مجھے آزادی کا سب سے زیادہ احساس ھوتا ہے "-

" خیر میں چاند کو اپنا رقیب نہیں سمجھوں گی " ھنیل آخر کار بول اٹھی -

" ھاں -- یہ چیز ایسی تو نہیں ، کہ اسے اپنا رقیب سمجھا جائے --"

اب ھم پر یہ واضح ھو گیا ہے کہ کپتان کی دور بینوں اور چاند میں اس کی دلچسپی

کی اصل وجہ کیا ہے ۔ یہ زندگی کے ایک مقصد ، ایک مدعا کی طرف اشارہ کرتی ہیں ، اور یہ مقصد و مدعا ایسی چیز ہے کہ ہر فرد کی زندگی کےلئے ضروری ہے اگر اس فرد میں کوئی خود داری، کوئی معقولیت ، کوئی دیانتداری کا عنصر موجود ہو — اس " مقصد و مدعا " کو کسی اور چیز کے لئے چھوڑا نہیں جاسکتا ۔ زندگی کا آخر یہی مقصد تو نہیں کہ کسی اور کو خوش رکھنے کی کوشش میں زندگی گزار دی جائے ۔ اور اگر زندگی کا مقصد اسی چیز کو قرار دیا جائے اور اسی کو زندگی کی معقولیت کا مرکز بنا دیا جائے تو اس سے نہایت برے نتائج پیدا ہوسکتے ہیں — اس کے علاوہ مندرجہ بالا منظر سے ایک بات اور واضح ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہم ایک دوسرے کو پوری طرح کبھی اپنا نہیں سکتے، غیریت اور اجنبیت کا کچھ نہ کچھ عنصر ضرور باقی رہتا ہے ۔ اور اگر عورت اور مرد کے باھمی تعلقات کو جائز بنیادوں پر استوار رہنا ہے تو اس کا دارو مدار محض اسباب پر ہے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں ، یہ جان لیں کہ ایک دوسرے کو پوری طرح اپنی ملکیت بنا لینا ممکن نہیں ۔

اس احساس کے بعد الگزینڈر ھیپ برن ، اب ھمیں وہ کچھ نظر نہیں آتا ، جو ھنیل اسے سمجھتی ہے ۔ اب اس کے کردار ، اس کی شخصیت تک ھماری رسائی ہو چکی ہے ۔ اب وہ ھمارے لئے ایک پراسرار ، اور پر کشش انجانی ہستی نہیں رھا ۔ اب وہ ایک مرد ہے جو کچھ مشکلات ، کچھ مسائل سے دو چار ہے ، ویسے ھی جیسے ہر مرد ہوا کرتا ہے ۔ اسی مرحلے پر وہ واپس انگلستان چلا جاتا ہے تاکہ وھاں جا کر اپنے معاملات کو سلجھا سکے ۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اب اس کے اور اس کے جاننے والے لوگوں کے درمیان جو ناطہ تھا ، وہ ٹوٹ چکا ہے ، ان تعلقات میں وہ روانی ، وہ بے ساختگی نہیں رھی ، جو ہوا کرتی تھی — وہ خدا کا شکر کرتا ہے کہ اس کی بیوی مر چکی ہے اور اب ترحم ، دوسرے پر ترس کھانے کا وہ عذاب ختم ہو چکا ہے — انگلستان پہنچ کر وہ سردیوں کا طویل موسم وھیں گزار دیتا ہے ۔ علائق سے آزاد ہوتے ہوئے بھی وہ نہ تو ھنیل کو خط لکھتا ہے ، نہ جرمنی واپس جاتا ہے بلکہ " ھنیل کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا " — تا ہم ھپ برن ایسا آدمی نہیں تھا کہ اکیلا رہ سکتا — حالانکہ :—

> "یہ کہاوت بالکل ٹھیک ہے ، ھمیں تنہا رہنے کی صلاحیت پیدا کرنی چاھئے ورنہ ہم دوسروں کا شکار ہو کر رہ جائیں گے— لیکن جونہی تنہا رہنے کی عادت پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں ھمیں یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اب صرف ایک ھی کام باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ ہم کسی اور سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دیں — کسی اور کے ساتھ — یا پھر اسی ہستی کے ساتھ دوبارہ تعلق پیدا کر لیں —"

کچھ یہی حال ھمارے عزیز کپتان کا تھا ، اسے یہ جنون ہوگیا کہ وہ بجلی کے کھمبے کی سی علحدگی اختیار کر لے— یہ اس کے لئے تھی بھی انتہائی ضروری چیز — لیکن اس کے دل میں تمنا کی ایک نئی کلی پھوٹ نکلی — کس چیز کی تمنا ؟ — محبت کی ؟ ھنیل اس کے لئے ، محبت کی سرشاریوں کا مظہر نہیں ۔ بلکہ ھنیل سے محبت تو جیسے اس کی " نوشتہ تقدیر ہے " جسے پورا ہونا ھی چاھئے ۔ وہ اسے خط لکھتا ہے مگر کوئی جواب نہیں ملتا ۔ آخر وہ جرمنی جاتا ہے مگر ھنیل اور مچکا دونوں کو تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہے ۔ یکا یک میونک کے شہر میں ایک دن وہ اپنے گڈے کو ایک دکان میں دیکھ لیتا ہے ۔ یہ گڈا سنہرے پالش والی چھوٹی سی جاپانی ساخت کی الماری سے کمر لگائے (کھڑا تھا) بائیں ھاتھ پر پیتل کا ایک بھدا سا قلم دان اور دائیں ھاتھ چند پرانے برتن — پشت پر معمولی سے فیتے کا بھدا سا لٹکتا ہوا جال …… ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جان بوجھ کر اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کی گئی

ہو !" — اس مکان پر وہ دو دفعہ جاتا ہے ۔ مگر اس دوران میں گدا بک چکا ہے ۔ (پان سو مارک قیمت لگی تھی) اُسے ہنیل کا کوئی اتا پتا معلوم نہیں ہوتا — پھر وہ ایک دن اخبار میں پڑھتا ہے کہ مصور تھیوڈور وار پسو ویلڈے نے ایک تصویر بنائی ہے ، "ایک سٹل لائف ہے جس میں ایک گدا ، شیشے کے ایک مرتبان میں لگے ہوئے سورج مکھی کے دو پھول اور ٹوسٹ کے اوپر ایک تلا ہوا انڈا پیش کیا گیا ہے"۔ گپ شپ کے اسی کالم میں لکھا ہے کہ یہ گدا جس خاتون کی تخلیق تھا ، اس کی منگنی ہرریجیرنگسریٹ فن پولڈی سے ہوگئی ہے ۔ جو ٹائرول کے ایک صحت افزا مقام کپرون سے تعلق رکھتے ہیں — اس کالم کو پڑھنے کے بعد ، کپتان وہ تصویر خرید لیتا ہے اور اس تصویر کے ساتھ ، جلد از جلد ، سرحد پار کر کے آسٹریا کے شہر کپرون جا پہنچتا ہے —

کپرون پہنچنے کے بعد ہم اُسے پھر ہنیل کی نظروں سے دیکھتے ہیں ۔ ہنیل کپرون میں اپنے سنگیتر کے ساتھ چلی جا رہی ہے کہ یکا یک کپتان اُس کے سامنے آ جاتا ہے :—

"ہنیل نے کپتان کو اس وقت دیکھا جب اُس نے اپنی ٹوپی اُتار کے اُسے سلام کیا ۔ اس کے بعد ہنیل کو ایک سیاہ اور چمکیلے اور چمکدار بالوں والا سر نظر آیا ۔ اور اُسے دیکھتے ہی وہ پہلی پڑ گئی ۔ اُس کا سیاہ ، چکنا اور چھوٹے بالوں والا سر دیکھ کر ہنیل کو اسٹریا کا یہ دن مرجھاتا سا معلوم ہوا "۔

اور پھر کپتان بولا :—

" کاؤنٹس ! کیسا مزاج ہے آپ کا ؟ — مجھے امید تھی کہ آپ سے ملاقات ضرور ہو گی "۔

ہنیل نے اس کی دھیمی ، اداس ، لرزتی سی آواز پھر سنی ۔ اُس نے جس ہاتھ سے چھتری پکڑ رکھی تھی اُسی سے اپنا سینہ دبا لیا ۔ وہ تو اُسے بھول چکی تھی ، اُس کی یہ عجیب اور دھیمی سی آواز فراموش کر چکی تھی ۔ اور اب اس وقت یہ آواز یوں سنائی دے رہی تھی جیسے رات کی خاموشی میں کوئی شور لرز اٹھے ۔ ہائے یہ کیا آفت تھی کہ دنیا اُس کی نظروں کے سامنے دو نیم ہو جائے اور اُسے اندر کی تاریکیاں بھی دکھائی دینے لگیں — اس کا جی چاہنے لگا کہ کاش کپتان نہ آیا ہوتا !

اور پھر برف کے پہاڑ — گلیشیئر کا سین ہے ۔ ہنیل اور کپتان کی باہمی گفتگو کا یہ پس منظر بڑا عجیب ہے ۔ اس پہاڑ کی غیر ارضی فضا بھی اتنی ہی چابکدستی سے بیان کی گئی ہے جتنی انسانی دنیا کی عام چیزیں جو وہاں موجود ہیں ۔ مثلاً سیاح ، موٹر ، ہوٹل وغیرہ — ہنیل اور کپتان کی اس باہمی گفتگو میں دلوں کی گھتیاں کھلتی ہیں ۔ یہاں کوئی اسرار کوئی پردہ نہیں ، یہ سب کچھ دن کی روشنی میں ہوتا ہے ۔ اور پھر اس حصے میں آسٹریا کی وہ تصویر بھی ملتی ہے جو ۱۹۱۴ء والی جنگ عظیم کے بعد اس ملک کی تھی ۔ یہ تصویر اپنے حقائق میں بڑی جاندار اور سچی ہے ۔ اس کی واقعیت بار بار ہمیں چونکاتی ہے اور اسی کو پس منظر میں رکھ کر یہ عاشق و معشوق ایک دوسرے سے آئندہ زندگی پر بات کرتے ہیں — اب اُنہیں عاشق و معشوق کہنے میں ہمیں کوئی باک نہیں کیونکہ وہ اس پہاڑی سیر و سفر پر جب روانہ ہوتے ہیں تو ہم جانتے ہیں کہ دل کے نہاں خانے میں انہیں اس بات کا احساس ہے — ہم جانتے ہیں کہ وہ اسی سفر کے دوران میں اپنی آئندہ راہ متعین کر لیں گے ۔

لیکن جونہی وہ بلندیوں پر پہنچتے ہیں تو اُن کی سنگت میں کوئی اپنایت کا احساس نہیں رہتا ۔ کپتان کو اس ساری کوہ پیمائی سے نفرت ہے ۔ وہ اس کا علانیہ اظہار بھی کرتا ہے اور ہنیل کو یہ بات ناگوار بھی گزرتی ہے — وہ کہہ اُٹھتی ہے " اگر تمہیں یہ پسند نہیں ، تو

میرا مزا کیوں کرکرا کرتے ہو ؟"۔ اور پھر وہ اوپر کی بلندی پر ایک وادی میں جانکلتے ہیں جو برف کے پہاڑ (گلیشیئر) کے عین نیچے واقع ہے ۔ اس موقعے پر وہ (گویا اپنے آپ سے) بڑی حیرت سے (منظر کی تعریف میں) پکار اٹھتا ہے ۔ اس پر :—

ہنیل نے جلدی سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا ۔ اُس کے چہرے پر عجیب و غریب کھویا کھویا اور نا قابل بیان سا تاثر نظر آیا — اُس کی نظریں جیسے اپنے آپ سے کہیں پرے دیکھ رہی تھیں ..... وہ یوں بے حس و حرکت تھا جیسے اٹل اور ان مٹ ہو اور بلند حقائق پر غور کر رہا ہو —

وہ (ہنیل) کامرانی کے جذبے سے تھر تھرا اُٹھی ۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کپتان مغلوب ہو گیا ہو اور وہ اُس پر چھا گئی ہو !

یہ ہنیل کی بھول ہے ۔ اصل میں بلند حقائق کے بارے میں کپتان کا رویہ عام قسم کی رفعتوں یا وجد کی حالتوں سے کہیں مختلف ہے ۔ اس میں خوف کی وہ جھلک بھی نہیں جو بعض لوگوں کا رد عمل ہوسکتا ہے ۔ اور یہ بات جلد ہی ظاہر بھی ہو جاتی ہے — وہ ایک چٹان کے سائے تلے لنچ کھانے بیٹھتے ہیں تو کپتان اپنے تھیلے سے گلڈے کی وہ تصویر نکالتا ہے تا کہ آخرکار ہنیل سے اپنے پرانے تعلقات کا سوال پھر سے زندہ کر سکے۔ وہ کہتا ہے کہ تم نے میرا گلڈا فروخت کر دیا تو اچھا نہیں کیا ۔ مجھے یہ بات کچھ پسند نہیں آئی ۔ ہنیل اس پر کہتی ہے کہ جب تمہاری بیوی آ گئی اور تم غائب ہو گئے تو مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ تم نے جیسے مجھے بیچ دیا ہے ۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں اُلجھ پڑتے ہیں ۔ اس تکرار میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے اور اس جھگڑے میں پہاڑ کی سیر کا موضوع پھر آ نکلتا ہے ۔ چنانچہ وہ بڑے سدبد اور گہرے غصے کی گہری سرد مہری سے سرد بارش میں دکا یک پلٹ کر اُس سے پوچھتی ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ میں یہاں تم سے ملنے کی غرض سے آئی ہوں ...... تم سے تو نیچے کسی ہوٹل وغیرہ میں بھی ملا جا سکتا تھا ۔

(اور وہ کہتا ہے)

" تم ان پہاڑوں اور برف کو میرے ساتھ دیکھنے آئی ہو ! "

" اوہو ؟ پھر تو مجھ سے بھول ہوئی ۔ تمہارا بس چلے ، تو تم خدا کے بنائے ہوئے پہاڑوں تک میں عیب ڈھونڈ نکالو —"

اچانک کپتان کے چہرے پر ایک تاریک سا شعلہ کوند گیا — وہ بولا :—

" ہاں مجھے ان پہاڑوں سے نفرت ہے ۔ مجھے ان سے نفرت ہے ۔ مجھے ان کی برف ، اور ان کے دکھاوے کی شان سے نفرت ہے ! "

.... ہنیل ہنس پڑی — " تو کیا تمہارے خیال میں پہاڑوں میں دکھاوا اور نمود ہے ؟ "

"ہاں" وہ بولا ۔ " ان کی بلندی اور ان کی رفعت دکھاوے کا نام ہے ۔ مجھے ان کی بلندی سے نفرت ہے ۔ مجھے اُن لوگوں سے بھی نفرت ہے جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو بلند سمجھنے لگتے ہیں ، میرا جی چاہتا ہے کہ ایسے لوگ وہیں کے وہیں رہیں اور برف چبا چبا کے اپنا پیٹ بھریں (میرا اختیار ہو تو) میں انہیں نیچے کبھی نہ اُترنے دوں گا ۔ کبھی نہ اُترنے دوں گا— سن رکھو ، مجھے ان سب باتوں سے نفرت ہے — جڑ ہے ؟ "

ان دونوں میں اب جو تکرار ہو رہی ہے ان فقروں کی گہری جذباتی پرچھائیں کا اب اُس سے ناطہ واضح ہو جاتا ہے — یعنی کپتان کوہ پیمائی کے شوق کو اور آدرشی محبت کی غیر حقیقی حماقتوں کو ایک چیز سمجھتا ہے ، دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر رہا

ہے --- اس بات کی تصدیق بلکہ توثیق خود کہانی میں مل جاتی ہے — اور یہ توثیق کہانی کا جزو ہوتے ہوئے بھی نہ کپتان کے منہ سے نکلی ہوئی بات ہے ، نہ ہنیل کا تاثر ہے — (یہ بلندی پر واقع ہوٹل میں پناہ لیتے وقت کے فقرات ہیں جو مصنف کے ہیں) ۔

(یقیناً یہ یہودی) ایلپس (پہاڑوں) کے مالک ، یا کم از کم اس موسم گرما میں کسی ہوٹل کے مالک ضرور تھے۔ یہ مہمل قسم کے یہودی — تا ہم یہ لوگ ھی اس جوش و خروش کی فضا میں تھوڑی سی صحت مندی ، سمجھ بوجھ ، غیر جذباتیت اور حقیقت پسندی پیدا کر رہے تھے ۔ ان کی طنز آمیز سیاہ آنکھیں ان نازک گردنوں والے نوجوانوں سے یہ کہتی معلوم ہوتی تھیں --- ”عزیزو روح کو زیادہ پر پرواز نہ دو !“ بات یہیں ختم نہیں ہوتی ۔ کپتان کو پہاڑوں کی رفعت اور ان کی اکڑ سے جو نفرت ہے وہ محض ایک منفی جذبہ نہیں ۔ بلکہ وہ اتنی بات کی معنویت اور گہرائی ، زندگی کے اثبات اور زندگی کی اہمیت سے ظاہر کرتا ہے — چنانچہ اس تکرار کے درمیان میں یہ بات کہاتی ہے ۔

ہنیل نے ذرا تن کر کہا --” تم ضرور کچھ دیوانے ہو جو پہاڑوں کے بارے میں اس قسم کی باتیں کرتے ہو ۔ وہ تو تم سے بہت بڑے ہیں ! “

نہیں --- وہ کہنے لگا — ” وہ مجھ سے بڑے نہیں ہیں ! “

” کیا ؟“ وہ زور سے ہنس پڑی ”پہاڑ تم سے بڑے نہیں ہیں — تم ایسے ھی غیر معمولی ہو کیا؟“ وہ چلا اٹھا ۔ ”پہاڑ مجھ سے بڑے نہیں ہیں ۔ بالکل ایسے ھی جیسے اگر تم کسی سیڑھی پر کھڑی ہو جاؤ تو مجھ سے لمبی ہو جاؤگی ۔ پہاڑ مجھ سے بڑے نہیں ۔ وہ مجھ سے چھوٹے ہیں “۔

” اوہ! اوہ! !“ وہ تمسخر اور حیرانی کے عالم میں جھنجی — ” تو پہاڑ تم سے چھوٹے ہیں “۔

” ہاں “ وہ چلایا — ” چھوٹے ہیں !“

ہنیل کے دیکھتے دیکھتے اچانک وہ بڑا خاموش اور کچھ دور دور معلوم ہونے لگا ۔ اس کے چہرے پر گفتگو کا شائبہ تک نہ رہا تھا ... جیسے وہ بہت دور کسی سرحد کے پار ہٹ گیا ہے — وہ اپنی خشم ناک حیرت کے درمیان آتے بڑے تعجب اور لگاؤ کے انداز میں تکنے لگی ۔ نہ جانے وہ کس ملک کا باسندہ تھا کس پر اسرار اور مختلف فضا کا باسی تھا ؟

باوجود اپنے اختلاف کے ہنیل پہاڑوں کے بارے میں کپتان کے رویے کو محض ایک دیوانگی یا رفعت سے نفسیاتی ڈر پر محمول نہیں کرسکتی ۔ اس ڈرامے میں الگزینڈر کا کردار زندگی کی معنویت سے ہر مرکز کے طور پر آتا ہے ۔ اور اس کردار کو ، اس پس منظر سے ھی اہمیت نصیب ہوتی ہے ، اس تضاد سے اس میں معنویت پیدا ہوتی ہے جو بلندی کے حقائق میں اور اس کی ذات میں ہے ۔ اور لارنس نے یہ اثبات ، یہ وضاحت بڑی چابک دستی سے کی ہے :—

” اس پہاڑ کی حیرت انگیز رفعت ، اس کی ہولناکی ، اس کی رکھائی سب بڑی واضح تھیں ، یہاں ایک کونپل تک نہ پھوٹتی تھی ، زندگی کی ایک ہلکی سی رمق بھی یہ پہاڑ یہ برف ظاہر نہیں کرتی تھی ۔ یہ ایسی دنیا تھی ، جو زندگی کے عدم میں ، اپنی برف ھی میں مگن تھی ۔ اپنے لئے کافی و وافی تھی --“

مگر ہنیل کے لئے برف کی یہ بے جان دنیا ، ہر مسرت ہر شان اور ہر رفعت کی علم بردار تھی ۔ اس کے لئے یہ خاموش برف کا بے جان تودا خود ایک وجود رکھتا تھا ۔

اسی لئے وہ پوچھتی ہے :—

” اب تو تم یہاں آنے پر خوش ہو نا ؟ “

"ہاں ۔ میں یہاں آنے پر بہت خوش ہوں"— وہ بولا " اس کی آنکھیں جوش اور ولولے کے باعث پھیلی پھیلی تھیں ، ان میں سخت آزمائش کی جھلک تھی ؛ کپتان کے جوش کے اس عجیب و غریب تاثر نے اس منظر کو ہنیل کے لئے بہت ہی انوکھا اور کچھ خوفناک سا بنا دیا تھا — وہ کالپ آٹھی —"

برف پر چڑھنے کی اس آزمائش کی اہمیت آگے چل کر ظاہر ہو جاتی ہے ۔ وہ نیچے سے دیکھتی ہے تو کپتان برف کے تودے پر چڑھنے کی آخری بھرپور کوشش کر رہا ہے ۔ پھر وہ اوپر چڑھ کر ، لوگوں کے ایک مختصر گروہ کے ساتھ دھندلی دھندلی ، ہولناک اور روندی ہوئی برف کی پہاڑی کی طرف منہ کئے کھڑا نظر آتا ہے — یہ سارے لوگ ڈرے ڈرے اور سہمے ہوئے ہیں ۔ لیکن وہ انسان ہیں اور انسان اپنے خوف پر غالب آنا ہی چاہتا ہے — اس منظر میں اس بے جان اور عدم زار برفانی پہاڑوں کا وجود ہی ایک تنبیہہ ہے کہ انسان کچھ نہیں ۔ لیکن کپتان زندگی کے اثبات اور اہمیت کا ان کے سامنے اعلان کرتا ہے اور کہہ دیتا ہے کہ " یہ پہاڑ مجھ سے جھوٹے ہیں " زندگی کی اہمیت کا یہ اقرار ، ان " حقائق بالا " ان پہاڑوں کی عین موجودگی میں ہوا ہے ۔ اس میں کوئی رومانی لڑ کا عنصر نہیں ۔ برف کے اونچے تودے سے اتر کر وہ کہتا ہے : ۔

" میں کافی دور تک جا پہنچا تھا— مجھے یہی دنیا پسند ہے ، جہاں کم ازکم گوبھی تو اگتی ہے ، برف پر تو کچھ بھی نہیں اگ سکتا "۔

اس مباحث کا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ ہیپ برن کا انداز جو پہلے ہر چیز کے بارے میں بڑا منفی نظر آتا تھا ، اب بڑا مثبت اور بڑا جائز ثابت ہو جاتا ہے ۔ وہ مروجہ " محبت" اور ایسی " محبت کی بے معنی باتوں" کی نفی کرتا ہے ۔ اس رویے کے مطابق وہ حقائق پر زور دیتا ہے ، حقائق کو اہم ثابت کرتا ہے ۔ ہنیل کو یہ انداز بھی انکار اور نفی کا انداز نظر آتا ہے مگر یہ انداز آخر میں ایسے جاندار عقیدے ، زندگی اور اس کی کائنات پر ایسے زبردست یقین کا اظہار بن جاتا ہے کہ اس میں جذباتیت اور آدرشی باتوں کی کوئی گنجائش نہیں ۔

چنانچہ بس کے اڈے پر ، سواری کا انتظار کرتے ہوئے کپتان ہیپ برن ، ہنیل کے سامنے شادی کی تجویز پیش کرتا ہے ۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہنیل پر کپتان کے خیالات کا کوئی اثر نہیں ہوا ۔ وہ جیسی تھی ، ویسی اس وقت بھی ہے ۔ اس کے سامنے دونوں راہیں کھلی ہیں ۔ چنانچہ شروع ہی میں کپتان کے اس فقرے پر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے — کیا تمہارا ہر ریجینلڈ سرنگسرٹ سے شادی کرنے کا ارادہ ہے ؟ — یہ وہ شخص ہے جو بڑا پختہ کار اور بڑا وجیہ ہے ۔ وہ ہنیل کی اس طرح خدمت کرتا ہے ، اس کی ایسے عزت کرتا ہے جیسے ہنیل کوئی " جلاوطن ملکہ ہو !"— اس کے بر عکس کپتان ہیپ برن ہے جو کھری بات کرتا ہے ، جس کی ہستی میں بظاہر کوئی بھربور بات نہیں اور جو بڑے سیدھے سبھاؤ اس سے کہتا ہے کہ " مجھ سے شادی کر لو (اور) اس بات کو چھوڑو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے یا مجھے تم سے" یہ فقرہ وہی انجانی ہستی کہتی ہے ، اسی انداز سے کہتی ہے جو اس کے ساتھ مخصوص ہے ، مگر ہمیں یہ مخصوص صاف گوئی ، یہ سیدھا سادا فقرہ معنی و بیان کے اعتبار سے ذرا بھی ادھورا معلوم نہیں ہوتا ۔ اس تجویز کے اچانک سامنے آنے پر ہنیل ، کپتان کی طرف حیرت ، تضحیک اور غصے کے ملے جلے آثار چہرے پر ہویدا کئے دیکھتی ہے ۔ مگر اسے اصل میں اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا ۔ ہنیل جب کہتی ہے کہ" مجھے پورا یقین ہے کہ تم دیوانے ہو گئے ہو" تو اس کا جواب بالکل صحیح ہے کہ :۔

" میرا خیال ہے تم اصل میں مجھے ایسا نہیں سمجھتیں ۔ یہ تو محض بدلہ لینے کی ترکیب ہے ورنہ مجھے معلوم ہے کہ تم میرا مطلب بخوبی سمجھ گئی ہو !"

اس کے بعد جب وہ تھیلے سے وہ "مشہور تصویر" نکالتا ہے تو اس حرکت کا مطلب صرف یہ ہے کہ دونوں میں اب جو حجت ہوئی ہے اس کا خلاصہ اور اس کا مرکزی نقطہ قاری کے ذہن میں پوری طرح جاگزین ہو جائے، اور وہی نقطہ توجہ کا مرکز بن جائے۔ اس تکرار میں وہ ساری ضروری باتیں واضح نہیں ہو سکتیں جو کپتان کرنی چاہتا ہے کیونکہ یہ تکرار ان دونوں کے درمیان ایک پبلک جگہ میں ہو رہی ہے۔ مگر یہ ان کہی، ضروری باتیں ساری کی ساری گڈے کے وجود (اور اب تصویر کے وجود) کی بدولت ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اب یہ گڈا، ہنیل اور الگزینڈر ہیپ برن دونوں کے لئے ایک بھرپور معنویت کی حامل علامت بن چکا ہے۔ چنانچہ جب ہنیل یہ کہتی ہے کہ "میرے لئے محبت بہت سیدھی سادی چیز ہے"۔ تو وہ جواب دیتا ہے "اور کیا اسی سیدھی سادی محبت سے ہی مجبور کیا تھا کہ میرا گڈا بنا ڈالو؟" گڈے کے وجود پر بار بار زور دینے سے ہنیل بھڑک اٹھتی ہے۔ آسے اس بات پر حیرت بھی ہوتی ہے کہ ہنیل نے اس کا جو گڈا بنایا تھا آخر کپتان کو اس سے کیا بڑا نقصان پہنچا تھا۔ اسی لئے وہ کہتی ہے:-

"کیوں؟ بتاؤ نا کیوں؟"

"نہیں، میں بتا نہیں سکتا" کپتان نے تصویر اس سے لے کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ہنیل نے تصویر کو دیکھ کر اپنا منہ اس طرح پھیر لیا جیسے کوئی بلی جلتے ہوئے سگرٹ سے بدک جاتی ہے۔ کپتان بولا — "جب بھی میں اس تصویر کو دیکھتا ہوں مجھے پتہ چلتا ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان ذرا سی بھی محبت نہیں تھی۔"

پھر موٹر بس کا سین ہے۔ ہنیل کو جب غصے میں بیٹھنے کو جگہ نہیں ملی تو آسے مجبوراً کپتان کے پاس بیٹھنا پڑا۔ اس بار بار مڑتی، تیز رو بس میں کپتان بقول خود "اپنی بات ختم کرتا ہے" یعنی ہنیل کو اپنی صحیح پوزیشن سمجھاتا ہے۔ ضرورت پڑے تو شور کی وجہ سے چیخ چیخ کر بھی بولتا ہے۔ یہ بڑا ڈرامائی منظر ہے۔ اور یہی منظر اس کہانی کا نتیجہ بلکہ اخلاق بھی ہے — اس سین میں وہ پیرا بھی آتا ہے جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ اس پیرے میں وہ بتاتا ہے کہ اب اس گڈے کی اہمیت مکمل طور پر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

"میری بیوی نے بھی (میرے ساتھ) یہی کیا ہوتا (جو تم نے کیا) اس نے اپنے ذہن میں یہی کیا تھا۔ میری بیوی نے اپنے خیال میں میرا گڈا بنا کے رکھ لیا تھا ...... اگر کوئی عورت کسی مرد سے محبت کرتی ہے تو وہ ضرور اس کا گڈا بنا دے گی۔ ایسا کئے بغیر اسے چین ہی نہ آئے گا — اور جب ایک بار وہ گڈا بنا لے تو اس کی خواہش پوری ہو جاتی ہے — محبت کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے۔ اور اس لئے میں نہیں چاہتا کہ کوئی عورت مجھ سے محبت کرے۔ اور نہ میں کسی سے محبت کروں گا!"

ایسی تلخ بات ایسے کھرے لہجے میں ہنیل سے کہنے میں ایک رمز پنہاں ہے۔ ان دونوں کے باہمی تعلقات میں بہت کچھ بلند و پست بیان ہو چکا ہے۔ اس نشیب و فراز کے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان دونوں کے باہمی تعلقات میں حقیقت کا عنصر موجود ہے، اور یہ کہ ان تعلقات کی حیثیت عارضی نہیں، مستقل ہے۔ یعنی دونوں کے تعلقات ایسی شادی پر منتج ہوں گے جس میں ایک فریق دوسرے کی پوجا نہیں کیا کرے گا، یا اسے اس طرح نہیں چاہے گا کہ اس کی ہستی پر چھا جائے اور اسے اپنی ملک بنا لے۔ اس شادی میں یہ وعدے وعید بھی نہیں ہوں گے کہ ایک فریق دوسرے فریق کو پوری طرح خوش رکھنے کو

زندگی کا مدعا بنا لے گا - دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہوا کہ کپتان کا منفی رویہ اصل میں اثبات کا دوسرا رخ ہے - اس کا اعتقاد یہ ہے کہ ہر عورت کے ساتھ ایسے تعلقات بھی قائم کئے جا سکتے ہیں جو مستقل قسم کے ہوں - (آیسے ان تعلقات کی ضرورت بھی ہے) اصل میں یہی اعتقاد وہ چہرہ ہے جسے ہیپ برن کی ہستی میں پراسرار عنصر کا نام دیا گیا ہے - وہ ہیپ برن جس کی نظروں میں ایک سیہ خلا جھانکتی ہے ، جو کچھ سوچتا نظر نہیں آتا — یہی ہیپ برن بڑے روایتی اور پرانے فیشن کے الفاظ میں ایسی بات کہتا ہے جو بڑی فرسودہ اور پیش پا افتادہ سی بات ہے :—

کپتان نے کہنا شروع کیا " لیکن میں ایک دفعہ محبت کی بنیاد پر شادی کا تجربہ کر چکا ہوں - اور بالآخر یہ ایک نہایت خوفناک چیز ثابت ہوئی - مجھے یقین ہے کہ میرے ساتھ ہمیشہ یہی ہو گا ، چاہے کوئی عورت کیوں نہ ہو "۔

" پھر اس میں کچھ تمہارا ہی قصور ہو گا " ہنیل نے کہا -

" ہاں جہاں تک محبت کا تعلق ہے یہی ہو گا - اس کے باوجود میں شادی کرنا چاہتا ہوں - میں ایسی عورت چاہتا ہوں جو میری عزت کرے اور میرا حکم مانے "۔

عورت کے ساتھ مستقل تعلقات کی ان شرائط کو وہ اور بھی زیادہ واضح کرتا ہے :—

" میری عزت اور اطاعت اور ان کے ساتھ مناسب جسمانی احساسات — میرے لئے تو یہی شادی کا مفہوم ہے اور بس "۔

" لیکن مناسب جسمانی احساسات محبت نہیں تو اور کیا ہیں ؟ ہنیل نے پوچھا -

" نہیں — ہر عورت مرد سے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ میری پرستش کرے گا اور مجھ سے محبت کرے گا - لیکن میں ایسا نہیں کر سکوں گا - میں زندگی میں ایک بار پھر ایسا نہیں کروں گا خواہ مجھے ساری عمر راہب بن کر ہی گزار دینی پڑے - میں نہ تمہاری پرستش کروں گا اور نہ تم سے محبت کروں گا —"

اور پھر آگے چل کر —:

" اگر کوئی عورت میری عزت کرتی ہے ، اپنے دل کی گہرائیوں سے میرا احترام کرتی ہے اور اسی جذبے کے تحت میرا حکم مانتی ہے تو میں حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسی حالت میں اس کی قدر میری نظروں میں ، محبت یا پرستش کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہو گی "۔

(ہنیل نے کہا) "یہ تو وہی چیز ہے - اگر انسان کو محبت ہو تو یہ سب کچھ آپسے حاصل ہو جاتا ہے ...... اور اگر محبت نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں —"

کپتان بولا " یہ درست نہیں - ایک عورت ایک مرد سے کتنی ہی محبت ، اس کی پرستش ہی کیوں نہ کرتی ہو لیکن وہ اس کی اطاعت اور عزت ہرگز نہ کرے گی - دنیا کی سب سے زیادہ چاہنے والی اور فدا کار لڑکی ، اپنے خاوند کو جب چاہے ، گدا بنا کر پیش کر سکتی ہے — جس طرح تم نے میرا بنایا تھا ! "

یہ غیر معمولی بات قاری کے سامنے اپنی پوری شدت اور اپنے ظاہری کھُرّے پن سے آتی ہے - قاری کے ذہن میں وہ باتیں بھی موجود ہیں ، جو اس سے پہلے کہانی میں آ چکی ہیں ، اور ان باتوں کے پس منظر میں یہ اعلان عورت اور مرد کے تعلقات کے بارے میں ایک ایسے تصور کو پیش کرتا ہے جسے کسی طرح بھی غیر مہذب نہیں کہا جا سکتا - الگزینڈر

ہیپ برن شادی کے بارے میں اپنی یہ شرائط بڑے پُر اعتماد لہجے میں پیش کرتا ہے ۔ اور اُس کے منہ سے یہ باتیں قابل یقین بھی معلوم ہوتی ہیں ۔ یہی بات لارنس کے کمال فن کی طرف ایک پر معنی اشارا بن نکلتی ہے ـــ وہ عورت کے بارے میں ان خیالات کو بڑے رسمی ، روایتی بلکہ فرسودہ الفاظ میں ہیپ برن کے منہ سے کہلواتا ہے ۔ مگر یہ الفاظ اپنے سیاق و سباق میں بالکل رسمی یا روایتی معلوم نہیں ہوتے ۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں نئی جان ڈال دی گئی ہے اور انسانی ضرورتوں اور خواہشوں کی جو گہری بصیرت لارنس کو حاصل تھی ، ان الفاظ کو اسی بصیرت کا آئینہ دار بنا دیا گیا ہے ۔

اتنا عرض کردوں کہ ہر قاری لارنس کے کمال فن کے اس پہلو کا محرم نہیں بلکہ نقاد حضرات تو لارنس کے فنی شہ پاروں کی فہرست گنواتے وقت عجیب و غریب قلابازیاں کھاتے ہیں ۔ اُن کا کہنا ہے کہ زیر نظر کہانی ، " کپتان کا گڈا " لارنس کے ان خیالات کی زندہ مثال ہے کہ وہ عورت پر رعب جمانے والی مردانگی کا بڑا قائل تھا کیونکہ زندگی میں وہ یہی کچھ کرنا چاہتا تھا ! لارنس کے بارے میں یہ خیال اصل میں کہانی کی ہیروئن ھنیل کی اس ضد ، اس مخالفت سے بہت مماثل ہے جو وہ کپتان کے مقابلے میں ظاہر کرتی ہے ۔ اور یہی وہ ضد ، وہ ہٹ ہے جسے ھنیل کو آخرکار ترک کرنا ہی پڑتا ہے ۔ ھنیل کے لئے تو اس ضد اور مخالفت کا کوئی جواز بھی ہے کیونکہ وہ خود اس تانے بانے میں الجھی ہوئی ہے ۔ اس لئے اس کی مخالفت وہی رنگ رکھتی ہے جو " خیالات " اور کسی اہم اور تہ دار حقیقت کے درمیان پرخاش کا رنگ ہے کیونکہ جونہی اس حقیقت ، اس سچائی کو تسلیم کر لیا جائے " نظریات " کا سارا طلسم ریت کے گھروندے کی طرح بیٹھ جاتا ہے ۔

اس کہانی میں لارنس اس توازن اور اعتدال کو پیش کرنا چاہتا ہے جو زندگی کی جان ہے ۔ چنانچہ الگزینڈر ہیپ برن جب اس توازن کو پیش کرتا ہے تو وہ روایتی نظریے کا بظاہر سہارا لیتا ہے : یعنی یہ کہ مرد ، مرد ہے ، عورت نہیں بن سکتا ۔ اور عورت ، عورت ہے ، مرد نہیں ہو سکتی ۔ یہ فرق سطحی یا معمولی نہیں ۔ اسی لئے ہیپ برن عورت اور مرد کے مستقل ناطے کے سلسلے میں یہ الفاظ استعمال کرتا ہے کہ میری جیون ساتھی وہ ہو گی جو میری عزت کرے اور میرا حکم مانے ! ـــ اس کی یہ بات اُس گہرے اعتقاد پر مبنی ہے جو تجربے نے اُسے سکھایا ہے اور وہ اعتقاد یہ ہے کہ اس نے یہ وعدہ کر کے کہ اُس سے (اپنی پہلی بیوی سے) ہمیشہ محبت کر کے بڑی فاش غلطی کی ـــ اس پر ھنیل جب اعتراض کرتی ہے ، تو اس کا جواب بڑا دلچسپ اور معنی خیز ہے :-

> (ھنیل نے کہا) : " اور تم ؟ فرض کرو اگر تمہاری عزت و اطاعت ہو ، تو میرے خیال میں پھر سوائے اُس کے کہ تم بادشاہوں کی طرح بیٹھے رہو اور عیش کرو ، اور کرو گے کیا ؟ " " ابھی نہیں ؛ میرے پاس اور بہت سے کام ہوں گے ۔ اور خواہ مجھے کوئی عورت ملے یا نہ ملے ، میں وہ کام کرنے شروع کر دوں گا ! "
>
> " بتاؤ تو وہ کام کیا ہیں ؟ "
>
> " وہ کوئی ایسے غیر معمولی کام نہیں ۔ میں مشرق افریقہ ایک ایسے شخص کا شریک کار بننے جا رہا ہوں ، جو اپنی تین ہزار ایکڑ زمین کے انتظام کرنے کی دھن میں جان توڑ کوشش کر رہا ہے ـــ اور جب میں کچھ اور مشاہدات اور تجربات حاصل کر لوں گا ، اور تمام ضروری مواد جمع کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا تو پھر چاند پر ایک کتاب لکھوں گا ـــ عورت مجھے ملے یا نہ ملے ، میں یہ کام ضرور کروں گا ! "

ایک انسان ، ایک مرد کی زندگی کا یہ مقصد ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ کسی عورت کی پوجا کرتا رہے ۔ یا وہ اسے یا کسی اور ہستی کو خوش رکھنے کی دھن ہی میں لگا رہے ۔ (کیونکہ یہ مقصد ہی سراب ہے !) مرد کی زندگی کا مفہوم بیوی بچوں کی خدمت ہی تک ختم نہیں ہو جاتا ۔ جب تک مرد اپنی جگہ ، اپنی ہستی میں پوری طرح مرد نہیں ، وہ عورت کے متضاد و متقابل ایک الگ وجود کی حیثیت سے قائم نہیں ۔ اس وقت تک دونوں میں کسی ایسے مستقل ناطے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جس سے دونوں کی ہستی گھٹ کر رہ نہ جائے ۔ اسی لئے ہیپ برن کہتا ہے کہ مرد کو دنیا میں کوئی ایسا کام بھی کرنا چاہئے جس کا تعلق گھر کی چار دیواری سے نہ ہو ۔ یہ کام ایسا ہو کہ وہ بحیثیت مرد اپنی ہستی کا تعین کر پائے ۔ اگر مرد ایسا نہیں کرتا تو عورت چاہے اپنے خیال میں اس مرد کی ذات سے کچھ چاہتی ہو پھر بھی اس مرد نے اس عورت کے ساتھ فریب کیا اور وہ اس کی امیدوں پر پورا نہ اترا ۔ اور خواہ وہ اسے کتنا ہی چاہتا ہو ، وہ اس عورت کی توقعات کو پورا کرنے میں ناکام رہا ۔

لارنس کی یہ کہانی ، کپتان کا گڈا کسی خاص نظریے کی پرچارک نہیں ۔ اس کہانی میں ایک خاص کردار پیش کر کے ، اس نے اسی کی متعلقہ باتوں کو ساری انسانی دنیا پر منطبق نہیں کر دیا ۔ گویا یہ کہانی نظریہ آموز یا تعمیم انگیز نہیں ۔ لارنس بار بار اپنی تحریروں میں ایسی عورتیں پیش کرتا ہے جو اعصاب زدہ ہوتی ہیں ، جنہیں جذبات و حالات کی عجیب کشمکش سے دو چار رہنا پڑتا ہے ، جو طنز و تلخی کا زندہ مجسمہ بن چکی ہوتی ہیں ۔ گویا یہ عورتیں وہ ہیں جن کی ہستی میں زندگی کی دھارا کا رخ بگڑ جاتا ہے ۔ کیونکہ یہ عورتیں عورت کا کام نہیں ، مرد کا کام کرنے پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں ۔ یا اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ عورت پن ہی کو حقیر خیال کرتی ہیں ، یا ان کی طرز زندگی ایسی ہوتی ہے کہ اس میں عورت اور مرد کے حلقہ ہائے کار کی تخصیص ہی نہیں ہو سکتی ۔ بعض دفعہ لارنس کا موضوع یہ ہوتا ہے کہ (" انگلستان ، میرا انگلستان" کی طرح) ایک مرد اس ذمہ داری سے بھاگتا پھرتا ہے جو مردانہ کاموں اور مرد کی زندگی کے مقاصد سے عبارت ہوتی ہے ۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی کی توقعات اس طرح نا کام بنا دیتا ہے کہ عورت کی محبت یا خیر خواہی بھی کسی رنگ میں اسے معاف یا نظر انداز نہیں کر سکتی — مگر یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ ایسے امکانات اور ایسے مسائل ہیں جن کا زیر نظر کہانی ، کپتان کا گڈا سے کوئی واسطہ نہیں ۔ بلکہ اس کہانی پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس کہانی میں ایسے سوالات پیش کر دئے گئے ہیں جن کے بارے میں خود مصنف کو بھی زیادہ معلوم نہیں تھا ۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ھنیل گڑیا سازی کے فن میں کمال رکھتی تھی اور ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ اس میں اس فن لطیف کا اصلی جوہر موجود تھا ، کیا اس کے لئے یہ سہارا کافی نہ تھا؟— اگر چاند کے بارے میں کپتان ہیپ برن کے شوقیہ مشاہدات کو کہانی میں اتنی اہمیت دی جا سکتی ہے تو کیا ھنیل کی فنی صلاحیت کو کہانی سے اس طرح غایب کر دینا مناسب تھا ؟ — چنانچہ ان اعتراضات کے پیش نظر اسی پلاٹ کے اندر ، ایسے موقع و محل بھی تصور میں لائے جا سکتے ہیں جب اسی قسم کے سوالات بڑی شدت سے سامنے آتے ہیں ، اور انہی سوالات کو پیش نظر رکھ کر ایک عظیم ناول نگار ، (اسی پلاٹ کو) لے کر اپنے ناول کا ایسا خاکہ تیار کر سکتا ہے جو لارنس سے بڑی حد تک مختلف ہو گا ۔ اور اس ناول میں عورت اور مرد کے باہمی ناطے کا تصور اس سے کہیں مختلف ہو گا جو لارنس نے اس کہانی میں پیش کیا ہے ۔

مگر لارنس کا میدان اور ہے ۔ لارنس کے موضوع کی بنیاد وہ عجیب و غریب "تصورات"

ہیں جو "محبت اور والہانہ لگاؤ" اور "جیون ساتھی کو خوش رکھنے" کے بارے میں عام طور پر رائج ہیں ۔ اسی لئے لارنس کے موضوع کا مثبت پہلو اُس کے منفی پہلو سے الگ کرنا نا ممکن ہے ۔ یہ اعتراض اپنی جگہ وقیع سہی کہ گڑیا بنانے میں ہنیل کی فنی صلاحیت کو اس سے زیادہ اہمیت دی ہی نہیں گئی کہ اُس نے کپتان کا گڈا تیار کر دیا ، اور بس — لیکن اس صلاحیت سے اصل میں اتنا ہی کام لینا مقصود ہے۔ اس کی افادیت اس کے بعد ختم ہوجاتی ہے ۔ چنانچہ الگزینڈر کے خلاف ہنیل کے دل میں جو غصہ پیدا ہؤا ہے اس میں اس شکایت کا کوئی عنصر نہیں کہ الگزینڈر ، ہنیل کی ان صلاحیتوں کے لئے زندگی میں کوئی جگہ ، کوئی مقام متعین نہیں کرتا نہ وہ ان کو کوئی اہمیت دیتا ہے ۔

اصل میں ہنیل کے رویے اور اُس کی تبدیلی، دونوں کی اہمیت کا براہ راست گڈے سے تعلق ہے — ہمیں ہنیل سے پہلے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس کا رویہ بدلنے والا ہے اور وہ کپتان کی بات مان لے گی ۔ یعنی یہ چیز پہلے سے موجود ہے اور ہنیل اسے بعد میں تسلیم کرتی ہے ۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے سامنے دونوں کی کشمکش کے جو مناظر پیش ہوئے اُن کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ ہنیل کو ہتھیار ڈالنے پڑیں گے — چنانچہ شادی کی پیش کش کے قریب قریب جب وہ کہتا ہے کہ " میرا خیال ہے تم میرا مطلب بخوبی سمجھ گئی ہوگی " تو ہمیں اس وقت یہ احساس ہو جاتا ہے کہ ہنیل اپنے جائز غصے کے باوجود غلطی پر ہے اور کپتان ٹھیک کہہ رہا ہے ۔ ہنیل کی اندرونی کشمکش کے بدلتے رنگوں کی عکاسی ان مناظر میں بڑی نفاست اور بڑی مہارت سے کی گئی ہے ۔ چنانچہ جب وہ پہاڑوں کی سر بلندی کو بناوٹ اور اکڑ قرار دیتا ہے تو اُسی وقت ہنیل کو پتہ چل جاتا ہے کہ کپتان سے اُس کے تعلقات ایسے رہے ہیں جیسے کسی اور مرد سے نہیں تھے۔ بلکہ وہ غیر ارادی طور پر یہ بھی کہہ دیتی ہے کہ یہ تعلقات اُس کے لئے بڑے اہم ہیں :

> (ہنیل نے سوچا) " کیا یہ شخص پاگل ہے؟ آخر اس کا مطلب کیا ہے ؟ یہ شخص کیا یہ دیوانہ ہے ؟ یہ رعب جما کر مجھے قائل کرنا چاہتا ہے ۔ آخر رعب جما کر مجھے کس چیز پر آمادہ کرنا چاہتا ہے ؟ کیا یہ چاہتا ہے کہ میں اس سے محبت کروں ؟ " چنانچہ ہنیل اسی نتیجے پر پہنچتی ہے : ہنیل کو تو اس سے کامرانی اور مسرت کا احساس ہوتا ہے ۔ بارش میں چلتے چلتے اس احساس نے اس کے دل میں کپتان کے لئے ایک عجیب گرم جوشی پیدا کر دی .... " ہاں وہ یہ چاہتا تھا کہ ہنیل اُسے چاہے " ہنیل نے کم از کم یہی مطلب سمجھا تھا کہ وہ خود ہنیل سے محبت کرنا نہیں چاہتا بلکہ اُس کی خواہش تھی کہ ہنیل اُسے چاہے اور پھر جیسا کہ ظاہر ہے ، عورتوں کی طرح اُس نے یہ بھی باور کر لیا کہ وہ اُس سے محبت کرے گا ہی ۔ آخر بے شمار مرد ، ہنیل سے محبت کرنے کو تیار رہتے تھے ، مگر یہ شخص تنہا اس بات پر مصر تھا کہ وہ نہیں بلکہ اُلٹا ہنیل اُس سے محبت کرے ، اُسے اس بات پر حیرت بھی تھی اور غصہ بھی آتا تھا ، مگر دل میں ایک گونہ اطمینان بھی تھا ! — بہت خوب ...... وہ یہ بھی کر دکھائے گی !

چنانچہ ہنیل کا یہ غصہ تو شادی کی پیشکش اور اس کی متعلقہ بحث میں ہی ختم ہوتا ہے ۔ تاہم وہ آخر تک اپنی رضا مندی کا سراغ نہیں دیتی ۔ اور یہ وہ سین ہے جہاں کپتان ، ہنیل کے بنگلے کے سامنے کشتی کے گھاٹ پر دن بھر کی سیر کے بعد اُس سے رخصت ہو رہا ہے ۔ اُس وقت بھی ، اس کی رضا مندی کا یہ اظہار ہتھیار ڈالنے ، یا ہار ماننے کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا ، کیونکہ دونوں اب ایک ہی بات کے قائل ہو چکے ہیں اور ان کا یہ متفق

ہو جاتا کہانی میں پوری وضاحت سے سامنے آ جاتا ہے ۔ اُن کے ایک دوسرے سے رات کی رات جدا ہوتے وقت تو اور بھی یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ ہنیل باغ میں بیٹھے ہوئے دوستوں کے بلند آواز سے کہے ہوئے روز مرہ کے فقروں کا جس طرح جواب دیتی ہے اُس کی بدولت اُسے عصے کی اوج گاہ سے اُتر کر بات مان لینے کی ٹھوس زمین پر آ جانے میں بڑی آسانی ہوتی ہے ۔ سین ملاحظہ ہو :-

ہنیل کے دوست گھر سے نکل کے دوڑتے ہوئے سیڑھیوں پر اُسے لینے آ رہے تھے ۔

"لیکن اگر میں تم سے محبت کروں تو کیا پھر بھی تم مجھ سے شادی کرنا پسند نہ کرو گے ؟" ہنیل نے کپتان سے پوچھا ۔

(وہ بولا) " تمہیں مجھ سے اور باتوں کا وعدہ کرنا چاہئے۔ ان باتوں کا ذکر نکاح (کے وعظ) میں بھی ہوا کرتا ہے — "

ہنیل کے دوست چیخ چیخ کر پوچھ رہے تھے :-

" کیا وہاں بارش ہوئی تھی ؟ موسم کیسا تھا ؟ کیا تم لوگ برف کی چٹان پر چڑھے تھے ؟"

اور پھر ہنیل نے ان کے سولات کا جواب دے کر کپتان سے کہا :-

" ایسا تکلف نہ برتو — اندر چلے آؤ !"

" نہیں میں اندر آنا نہیں چاہتا "۔

" تو کیا تم کل جانا چاہتے ہو ؟ اگر یہی مرضی ہے تو چلے جاؤ لیکن میں شادی سے پہلے تو ان باتوں کا وعدہ کروں گی نہیں ۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ میں یہ وعدے کرتی پھروں "۔

ہنیل کشتی میں سے اُتر کر (گھاٹ کے) تختے پر آ گئی ۔

" ارے !" وہ پلٹ کے بولی —" مہربانی کر کے کیا مجھے وہ تصویر دے دو گے ؟ میں اُسے جلا دینا چاہتی ہوں —"

کپتان نے اُسے تصویر دے دی ۔

" اور کل ضرور آنا — آؤ گے نا ؟" ہنیل نے پوچھا ۔

" ہاں صبح کے وقت آؤں گا ! "

کپتان کشتی کھیتا ہؤا جلدی سے اندھیرے میں غائب ہوگیا —

گویا اس مرحلے پر معقولیت اور حقیقت پسندی ہر چیز پر غالب آ چکی ہے ۔ اور ہم کہانی کو ، لفظ " اندھیرے " پر ختم کرتے ہیں ۔ وہ " اندھیرا " جس کے ساتھ اس کہانی میں کیا کچھ وابستہ کیا گیا ہے — مثلاً کپتان کی " سیہ کھلی کھلی آنکھیں " اور پھر وہ لمحہ یاد کیجئے جب ہنیل ، اپنے سابق منگیتر کے ساتھ بازار میں چلی جا رہی ہے کہ ایکا ایکی کپتان اُس کے سامنے آ جا تا ہے ، اُس وقت "ہائے ، کیا آفت تھی یہ کہ جیسے یہ دنیا اُس کی نظروں کے سامنے دو نیم ہو جائے اور اُسے اندر کی تاریکیاں دکھائی دینے لگیں "۔

اور پھر — جب وہ یہ سوچ رہی ہے کہ " کیا یہ شخص پاگل ہے " تو کیسی نا قابل بیان اور اندھیری قوت اُس کے تمام خیالوں پر غالب آ جاتی ہے !

گویا یہ تاریکی کا تاثر ، ہر چیز کو ایک حقیقت ، ایک ٹھوس حقیقت کا روپ بخش دیتا ہے اور اُس کی سچائی بڑی اٹل نظر آتی ہے ۔

(ترجمہ : مختار صدیقی)

آدمی اور انسان

محمد حسن عسکری

کوئی آٹھ سال ہوئے میں نے ایک مضمون "انسان اور آدمی" کے عنوان سے لکھا تھا، آج اس مضمون کا دوسرا حصہ یا ضمیمہ لکھتے ہوئے نہ تو میں اُن خیالات کی تردید کر رہا ہوں نہ اُنہیں دہرا رہا ہوں۔ اگر نئے تجربات کا تقاضا ہو تو میں اپنی رائیں بڑی بے شرمی سے بدل دیتا ہوں۔ ایسی ضرورت پیش آتی تو مجھے خود اپنے مضمون کے خلاف لکھنے میں کوئی جھجھک نہ ہوتی۔ مگر فی الحال میں اُس پرانے مضمون کا ایک لفظ بھی واپس لینے کو تیار نہیں ہوں۔ یہ ضمیمہ اس لئے لکھنا پڑا کہ اب مجھے موضوع کے دوسرے رُخ کی طرف توجہ دلانی ہے۔ اُس مضمون کا پس منظر دوسری قسم کا تھا، اس مضمون کا پس منظر کچھ اور ہے۔ آٹھ سال پہلے ہمارے ادب میں روس کے زیر اثر "انسان" اور "انسانیت" یہ دو لفظ ایسے دھڑلے سے استعمال ہو رہے تھے کہ لوگ یہ تک نہ سوچتے تھے کہ ہمیں کہنا کیا ہے، ان دو لفظوں کی اُلٹ پھیر سے نظم یا افسانہ یا تنقیدی مضمون تیار کر کے رکھ دیتے تھے۔ میں نے اپنے مضمون میں اس رجحان پر اعتراض کیا تھا، اور صرف اتنی بات کہی تھی کہ اگر زندگی کے ٹھوس تجربات سے آنکھیں بند کر کے انسان کی تعریف متعین کی جائے اور ایک مجرد خیال کو حقیقت سمجھ لیا جائے تو اس کے نتائج نہ تو ادب کے لئے خوشگوار ہوں گے نہ زندگی کے لئے۔ اُس زمانے میں میرے اس مضمون کو ترقی پسندی پر حملہ تصور کیا گیا تھا۔ لیکن اب خود روس میں ادب کو ایک نئے انداز سے سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور روسی ادیب باقی دنیا کے اصطلاحی معنوں میں غیر ترقی پسندانہ ادب سے بھی رشتہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات میں کسی فتح مندانہ جذبے کے ساتھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ روس کی اشتراکی تہذیب انسانی تاریخ کا ایک عظیم تجربہ ہے۔ اگر میں اس کے مقابلے میں اپنا ایک مضمون لاؤں تو یہ میرا چھچھورا پن ہوگا۔ مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ اب ترقی پسند اور غیر ترقی پسند ادیبوں کے درمیان مکالمے کی گنجائش نکل آئی ہے، پہلے تو بس خود کلامی ہوا کرتی تھی۔ ترقی پسندوں سے مجھے ہزاروں میں اختلاف رہا ہے اور شاید آئندہ بھی ہوتا رہے۔ لیکن اس ادبی تحریک کے پیچھے انسانی روح کے جو مطالبات کام کر رہے ہیں اُن سے انحراف کر کے میں ادیب نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اُس مضمون میں بھی سوال ترقی پسندوں سے مناظرے کا نہیں تھا، بلکہ اُردو کے ادیبوں اور اُن ادیبوں کے پڑھنے والوں کو ارسطو کی سیدھی سادی بات یاد دلانی تھی کہ تعمیم تخصیص سے آزاد ہو جائے تو اصول سازی خطرناک چیز بن جاتی ہے۔

اس نئے مضمون میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر آدمی تعمیم کی ذمہ داری قبول کرنے سے گھبرانے لگے یا ہر قسم کے تجربات سے بس ایک ہی نتیجہ اخذ کرتا رہے تو تخصیص ایک دلدل بن جاتی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت مجھے اس لئے پیش آ رہی ہے کہ آج ٥٦ء میں حالات کچھ اور ہیں۔ انسانی زندگی اور انسانی تاریخ کو سمجھنے میں روس نے جو غلطیاں کی ہیں اُن کا تو اب خود روسیوں کو احساس ہو چلا ہے۔ لیکن اب اُن ملکوں میں جو اپنے آپ کو "جمہوری" کہتے ہیں، دو قسم کے رجحانات اُبھر رہے ہیں۔ یہ عقیدہ کہ انسان فطرتاً بالکل معصوم اور پاک و صاف ہے کچھ روس ہی تک محدود نہیں رہا۔ روس والوں نے تو اس عقیدے کو ایک نیا معاشرہ قائم کرنے کی خاطر اپنایا تھا۔ مغربی ملکوں کی حکومتیں پرانے سماجی نظام کو مستحکم بنانے کے لئے اس عقیدے کو استعمال کر رہی ہیں، حالانکہ اُن کا عمل اس نظریے کی تردید کرتا ہے۔ خصوصاً امریکہ والے دنیا

میں ایک نئے مذہب کا پرچار کر رہے ہیں جس کا خدا ہے "امریکی انسان"۔ یہ انسان ہر قسم کی آلائشوں سے تو خیر پاک ہے ہی ، اس پر طرہ یہ کہ بیمار تک نہیں پڑتا ۔ سمون دبووار نے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے کہ نیویارک میں، زکام کی شکایت کرنا بد تمیزی ہے ، کیونکہ " اچھے امریکن " کو کبھی زکام نہیں ہوتا ۔ اس نئے مذہب کی فقہ میں برے کام حلال ہیں ، برے جذبات کا اظہار حرام ۔ " انسان پرستی" میں امریکہ روس کو منزلوں پیچھے چھوڑ گیا ہے ۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ امریکہ میں جو واقعی سچا ادب پیدا ہوا ہے وہ کچھ اور کہتا ہے ۔ جس طرح انیسویں صدی کے روسی ناول نگاروں نے روایتی بھل منساہت سے بے لیاز ہو کر انسانی فطرت کی تفتیش کی تھی ، اسی طرح میل‌ول اور ہاتھورن کے زمانے سے لے کر آج کالڈویل اور فاکنر کے زمانے تک انسانی تقدیر اور انسانی اقدار کی تخلیق کا مسئلہ امریکن ناول کا بنیادی موضوع بنا رہا ہے ۔ (ہیمنگ وے کا نام میں نے اس لئے نہیں لیا کہ آن کے آخری ناول سے بوئے یونیسکو می آید ۔) ان امریکی ناول نگاروں کے تصورات حیات یا تصور انسان پر اعتراض تو ہو سکتے ہیں ، آن میں شاید کچا پن بھی نکالا جا سکتا ہے ، لیکن آن پر یہ الزام عائد نہیں ہو سکتا کہ آنہوں نے زندگی کے کسی مظہر سے جان بوجھ کے آنکھیں چرائی ہیں ۔ مگر آج کل امریکہ میں (یعنی جس چیز کو سرکاری طور پر امریکہ کہا جاتا ہے) ان لوگوں کو یہ کہہ کے نظر انداز کردیا جاتا ہے کہ یہ تو امریکہ کی نمائندگی کرتے ہی نہیں ۔ اسٹالن کے زمانے میں روس والے بھی دوستوئفسکی سے اتنا نہیں گھبراتے تھے جتنا آج کل امریکن فاکنر سے متوحش ہوتے ہیں ۔ ایلیٹ نے انگلستان کی شہریت اختیار کر لی ، ایزرا پاؤنڈ تو امریکہ میں ہی رہتا ہے ۔ لیکن " امریکی طرز زندگی" کے مطابق وہاں کے سب سے بڑے شاعر رابرٹ فراسٹ اور کارل سینڈ برگ ہیں ۔ کیونکہ یہ دونوں اپنی نظموں کے ذریعے دنیا کو بتاتے ہیں کہ امریکہ کے آدمی تو آدمی ، وہاں کے تربوز اور چچینڈے تک اپنا جواب نہیں رکھتے ۔ مجھے وہ دن دور نہیں دکھائی دیتا کہ جب امریکہ میل ول اور ہاتھورن تک کو عاق کر دے گا ۔ اسکائی اسکریپروں پہ ناز کرنے والے انسانی روح کی بلندی سے کتنے خوف زدہ ہیں ! امریکہ کے اس سرکاری رویے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے نقاد ایسے خطرناک مصنفوں کی فنی خوبیوں پر تو صفحے کے صفحے کالے کرتے ہیں ، لیکن یہ بات صاف گول کر جاتے ہیں کہ آنہوں نے کہا کیا ہے ۔ یعنی اپنے معاشرے میں ایسے نقادوں کا فریضہ یہ ہے کہ ادب کا زہر نچوڑ کے آسے بے ضرر بنا دیں ۔ لیکن جس ادب میں کسی نہ کسی قسم کا زہر نہ ہو آس میں جان کیا ہوگی ؟ اور جن لوگوں میں زہر پینے کی صلاحیت باقی نہ رہے وہ زندگی کو کیا بنا کے رکھ دیں گے ؟

اگر اس قسم کی " سلامت روی " اور " نیک اندیشی " امریکہ تک محدود ہوتی تو بھی غنیمت تھا ۔ مگر نیک جذبات کا یہ سیلاب یو این او کے ذریعے دنیا کی سیاست میں اور یونیسکو کے ذریعے تہذیبی حلقوں میں امنڈتا چلا آ رہا ہے ۔ نہایت منظم طریقے سے پڑھنے لکھنے والے طبقے میں یہ ذہنیت پیدا کی جا رہی ہے کہ انسانی زندگی کی حقیقتوں کو نہ دیکھا جائے ، اور ادب کی حیثیت یو این او کی تقریروں سے زیادہ باقی نہ رہے ۔ اس کا سیدھا سادا مطلب یہ نکلتا ہے کہ روس میں ہی نہیں ، بلکہ "جمہوری" دنیا میں بھی حکمران طبقہ چاہتا ہے کہ ادیب اپنا دل و دماغ سیاست بازوں کے حوالے کر دیں ، اور اپنا احساس ، اپنی بصیرت آن کے قبضے میں دے دیں ۔ روس کے حکمران ادیبوں پر پابندیاں عائد کرتے ہوئے آن سے مستقبل کی خاطر قربانیاں چاہتے تھے ۔ جمہوری دنیا کے حکمران صرف موجودہ صورت حال کے تحفظ کی خاطر آنہیں اپاہج کرنا چاہتے ہیں ۔ روسی ادب میں انسان کا جو تصور ڈنڈے کے زور سے رائج کرایا گیا تھا وہ جھوٹا خواب سہی ، لیکن خواب ضرور تھا — ایک ایسا خواب جس کے

بغیر انسانی زندگی میں حسن اور وقار پیدا نہیں ہوتا ۔ جمہوری دنیا میں انسان کی شرافت ، نیکی اور معصومیت کا جو عقیدہ پھیلایا جا رہا ہے وہ صرف ایک جذباتی افیم ہے لوگوں کے ذہن کو سلانے کے لئے۔ پھر ایک اور فرق ہے ۔ روسیوں کے پاس انسان کا سچا یا جھوٹا جیسا بھی تصور موجود تھا ، وہ موقع بے موقع اور جا بے جا اس کا اعلان کرتے تھے ۔ اسٹالن کے زمانے میں روسی ادب کی سب سے بڑی خرابی یہی تھی کہ ادب اعلان نامہ بن کے رہ گیا تھا ۔ لیکن جمہوری دنیا کے سرکاری مبلغ مطلب انداز میں صاف صاف نہیں بتاتے کہ انسان کیا ہے ۔ ان کے یہاں تو چند منفی قسم کی پابندیاں ہیں ۔ اور ان پابندیوں کی بھی صراحتاً تعریف نہیں کی جاتی ، بلکہ جو ادیب زندگی کے بارے میں کسی قسم کا بھی سچ بولتے ہیں ان کے خلاف کانا پھوسی ہونے لگتی ہے ۔ جمہوری دنیا کے سرکاری حلقے نہ تو آدمی کے ٹھوس تجربات کو قبول کرنے کی ہمت رکھتے ہیں نہ انسان کی کوئی سچی یا جھوٹی تعریف متعین کرنے کی جرأت ۔ وہ ادیبوں کو ان دونوں باتوں کی اجازت دینے سے گھبراتے ہیں ۔ پھر انہیں یہ بھی نمائش کرنی پڑتی ہے کہ ہم علم و ادب کے سرپرست ہیں اور ہمارے یہاں پوری آزادئ فکر ہے ۔ چنانچہ ان ملکوں میں پروفیسروں ، نقادوں اور فلسفیوں کی بن آئی ہے ۔ کیونکہ ان لوگوں کی مدد سے ہر بنیادی مسئلے کو سات پردوں میں چھپا کے رکھا جا سکتا ہے ۔ آج سے دس بارہ سال پہلے مالرو نے اعلان کیا تھا کہ یورپ کے مستقبل کا دارومدار اس سوال پر ہے کہ انسان مر گیا یا نہیں ۔ لیکن چند ادیبوں کو چھوڑ کر یورپ اور امریکہ دونوں براعظم اس سوال سے بچنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ۔ وہاں کا برسراقتدار طبقہ نہ تو انسان کے بارے میں کوئی بری بات سننے کو تیار ہے نہ کوئی ضرورت سے زیادہ اچھی بات ۔ کیونکہ دونوں قسم کے خیالات سے لوگ گمراہ اور اپنے حکمرانوں سے بد ظن ہوتے ہیں ۔

جن دو رجحانات کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں سے پہلا تو یہ ہوا ۔ اس کی صفت ہے ابہام ۔ دوسرے رجحان میں وضاحت تو زیادہ ہے ، لیکن ساتھ ہی ساتھ پیچیدگی بھی اس قدر ہے کہ آسانی سے کسی کو ملزم قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ مگر اس وقت افراد کے ساتھ انصاف یا بے انصافی کرنے کا سوال نہیں ، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ مغربی دنیا کا ذہن کس کس سمت میں چل رہا ہے اور ادب میں اس کی کیا شہادتیں ملتی ہیں ۔ اس لئے اگر ایسی بحث میں مبالغے کا رنگ پیدا ہو جائے تو کوئی ہرج نہیں ۔

وہ دوسرا رجحان یہ ہے کہ لکھنے والے انسان کے بجائے آدمی کو دیکھتے ہیں اور اس کے خوفناک سے خوفناک یا گھناؤنے سے گھناؤنے تجربے کی بھی ستر پوشی نہیں کرتے ۔ یہ کام دلیری نہیں بلکہ دلاوری کا ہے ۔ مگر جب ان ٹھوس تجربات کی بنا پر انسان کی تعریف متعین کرنے کا نمبر آتا ہے تو پھر یہ دلاوری یا بزدلی ہچکچاہٹ یا تشویش میں بدل جاتی ہے ۔ اور بعض اوقات انسان کا کوئی گھڑا گھڑایا تصور قبول کر لیا جاتا ہے جو عموماً عیسوی دینیات سے اخذ کیا جاتا ہے یا نفسیات سے ۔

آگے چلنے سے پہلے میں ایک چیز کی تصریح کردوں ۔ یہ مضمون لکھتے ہوئے میرے ذہن میں خاص طور سے وہ ناول ہیں جو پچھلے بیس سال میں پیدا ہوئے ہیں ، اور ساتھ ہی ساتھ وہ تنقید بھی ہے جو ان ناولوں پر ہوئی ہے ۔ ناول کے فن میں ایک بڑی خوبی یا خامی ہے ۔ ناول نگار کو پرواز کی وہ اجازت یا آسانی حاصل نہیں ہوتی جو مثلاً شاعر یا ڈراما نگار کو ہوتی ہے ۔ والیری کو ناول کی صنف سے نفرت تھی ۔ وہ کہتا تھا کہ میں اس قسم کا جملہ لکھنے کو تیار نہیں ہوں کہ بیگم صاحبہ گاڑی میں بیٹھ کر چار بجے گھر سے روانہ ہوئیں ، کیونکہ ان میں سے ایک بات بھی ناگزیر نہیں ۔ جی چاہے تو چار بجے کی جگہ چھ

بجے کر دیجئے ، گھر کے بجائے ہوٹل ، گاڑی کے بجائے موٹر ۔ ہر ناول کے ہر جملے سے یہ مطالبہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی کیفیت یا واردات کا جوہر نکال کے پیش کرے ۔ عام ناول میں مصنف کو ہزاروں جملے ایسے لکھنے پڑتے ہیں جو درحقیقت کچھ کہتے ہی نہیں ، بس اطلاعات فراہم کرتے ہیں ، اور جو اتنے ہی بے رنگ ، پھس پھسے اور بے جان ہوتے ہیں جتنی عام زندگی کی عام گھڑیاں ۔ شاعر یا ڈراما نگار کے یہاں تو یہ معاملہ ہوسکتا ہے کہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو تھو ۔ مگر ناول نویس کو میٹھا ، کڑوا ، کسیلا ، بے نمک سب کچھ زہر مار کرنا پڑتا ہے ۔ شاعر تو اپنے قاری سے یہ وعدہ کر سکتا ہے کہ میں تمہارے اعصاب جھنجھوڑ کے رکھ دوں گا ۔ ناول نویس بڑی دیر دیر تک خود بھی بور ہوتا ہے اور پڑھنے والے کو بھی بور کرتا ہے ۔ زندگی کی اکتا دینے والی بے رنگی کو قبول کئے بغیر ناول نہیں لکھا جاسکتا ۔ ناول نویس میں زندگی سے محبت کے علاوہ زندگی کی یکسانی کو سہارنے کی طاقت بھی ہونی چاہئے ۔ اس لحاظ سے آپ چاہیں تو ناول سے نفرت کرسکتے ہیں ۔ مگر ناول میں ایک چیز بڑی ناگزیر ہے ۔ ناول زمان و مکان اور عمل کی قید سے کبھی آزاد نہیں ہوسکتا ۔ ٹھیٹ تخیلی داستان لکھتے ہوئے بھی آدمی ان پابندیوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا ۔ مثلاً کافکا کی داستانیں ۔ یوں تو ان میں بڑی جوہری صداقت پیش کی گئی ہے ، لیکن وہ ظاہر ہوتی ہے روز مرہ کی بے رنگ اور اکتا دینے والی چیزوں اور واقعات کے پردے میں ۔ کافکا کے یہاں ہیرو ہمیشہ بنیادی اور جوہری انسان ہوتا ہے ، لیکن اسے ہمارے سامنے پیش کرتے ہوئے کافکا کو بتانا پڑتا ہے کہ وہ کمبل میں لپٹ کر کس طرح کروٹوں پہ کروٹیں بدل رہا تھا ۔ یہ کمبل ناول کو کبھی نہیں چھوڑتا ۔ اسی لئے ڈی ، ایچ لارنس نے کہا ہے کہ ناول نگار کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے ، اس کی کتاب میں ''حقیقت'' کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی حد تک زبردستی داخل ہو جاتی ہے ۔ آپ ناول میں زندگی یا انسان کے متعلق کچھ ہی کیوں نہ کہنا چاہیں ، سب سے پہلے روز مرہ کی زندگی کے حقیر سے حقیر اور معمولی سے معمولی حقائق کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے ۔ اس مضمون کی اصطلاح میں ، اسی بات کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ناول ایک صنف کی حیثیت سے کسی نہ کسی حد تک ''آدمی'' کے ٹھوس تجربات پیش کرنے پر مجبور ہے ۔

یہ پابندی تو خیر ہر زمانے کے ناول پر عائد ہوتی ہے ۔ لیکن بیسویں صدی کے ناول کی ایک اور مجبوری ہے ۔ ہر دور میں کوئی نہ کوئی صنف ادب ایسی ہوتی ہے جسے انسانی تقدیر کا کوئی نہ کوئی تصور تخلیق کرنے کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے ۔ اس تصور میں چونکہ اس پورے معاشرے کی روح کھنچ آتی ہے ، اس لئے اس دور میں یہ صنف ادب کی تمام اصناف سے اعلیٰ اور برتر سمجھی جاتی ہے ۔ یونان میں اور شیکسپیئر کے انگلستان میں یہ درجہ المیہ کو حاصل تھا ۔ پچھلے سو سال سے یورپ میں یہی فریضہ ناول انجام دے رہا ہے ۔ اور بیسویں صدی میں جوئس جیسے ناول نگاروں نے اپنے قارئین سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ان کے ایک ایک ناول کو پڑھنے اور سمجھنے میں لوگ پوری عمر لگا دیں ۔ یہ مطالبہ اس لئے بے جا نہیں کہ انسانی تقدیر کے مسئلے کی تفتیش میں بیسویں صدی کا ناول شاعری سے بھی آگے رہا ہے ۔ انسانی اقدار کی نئی تشکیل اور انسان کی تعریف متعین کرنے کی مہم اس ناول نے اس طرح اپنے ذمے لی ہے کہ نفسیات اور فلسفہ تو ابھی تک اس کے پیچھے گھسٹ رہے ہیں ۔ ''روح کی بھٹی'' میں اپنی تہذیب کا ''ضمیر'' ڈھالنے کی ذمہ داری بیسویں صدی میں ناول نگار نے ہی قبول کی ہے ۔ انسان کیا ہے ؟ انسان کی تقدیر کیا ہے ؟ ان دو سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی جیسی شدید پیاس آپ کو مالرو ، سارتر ، کامیو ، میں تیگزوپری میں ملے گی ویسی کسی فلسفی یا ماہر عمرانیات میں نظر نہیں آئے گی ۔ نفسیات ، فلسفہ اور دوسرے علوم

پڑھ پڑھ کے چاہے آپ چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا بن جائیں ، لیکن اگر آپ نے ناول نہیں پڑھے تو آپ بیسویں صدی کے انسان اور اُس کے روحانی مطالبات کو نہیں سمجھ سکتے ۔

غرض بیسویں صدی میں ناول کو دو کام کرنے پڑ رہے ہیں ۔ ایک تو "آدمی" کی حقیقت بیان کرنا ۔ دوسرے "انسان" کی تعریف ڈھونڈنا ۔ اسی لئے میں نے اس مضمون میں بحث کی بنیاد ناولوں پر قائم کی ہے ۔

بیسویں صدی کے ناول انسان کے بارے میں کیا کہتے ہیں ؟ دس پندرہ سال ہوئے انگلستان کے ادبی حلقوں میں اس پورے موضوع کا ایک تجزیہ بہت مقبول ہوا تھا ۔ اس نظریے کے مطابق بیسویں صدی کے ناول انسان کے تین تصورات پیش کرتے ہیں ۔ نمبر (۱) سیاسی انسان (لارنس نے اس کا نام سماجی انسان رکھا ہے) ۔ اس قسم کے انسان کی داخلی زندگی اتنی اہم نہیں ہوتی جتنی خارجی زندگی ۔ اس کی شخصیت اور عمل کا دارومدار سماجی اور سیاسی نظام پر ہوتا ہے ۔ اگر سماجی نظام بدل دیا جائے تو انسان کو بھی اپنی مرضی کے مطابق بدلا جاسکتا ہے ۔ یہ تصور ایچ ، جی ، ویلز اور گالزوردی کے یہاں ملتا ہے، اور ان کے بعد اشتراکی حقیقت نگاروں کے یہاں ۔ نمبر (۲) فطری انسان ۔ یہ انسان ہر قسم کی سماجی اور اخلاقی بندشوں سے آزاد ہو کر فطری جبلتوں کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہتا ہے ۔ اور اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ سماجی ذمہ داریوں سے آزاد ہو کر انفرادی اور ذاتی تسکین حاصل کرنے کا ہوتا ہے ۔ اُن دنوں اس رجحان کی مثال کے طور پر لارنس کا نام تجویز کیا گیا تھا ۔ لیکن اُس زمانے میں لارنس کے خلاف بہت سے تعصبات کام کر رہے تھے ، ورنہ لارنس کو محض اس تصور کی چار دیواری میں بند نہیں کیا جاسکتا ۔ اُس نے تو انسان کے متعلق اس سے زیادہ بہت کچھ کہا ہے ۔ ان محدود معنوں میں فطری انسان کی مثال ڈھونڈنی مقصود ہو تو ارسکین کالڈویل کے یہاں ملے گی ۔ خصوصاً God's Little Acre کے ہیرو کے اُس وعظ میں جو وہ اپنی بھابی سے زنا بالجبر کرنے کے بعد فرماتا ہے ۔ نمبر (۳) نامکمل انسان ۔ یہ وہ انسان ہے جس کی اندرونی زندگی خارجی زندگی سے زیادہ اہم ہے ، اور جس کے اندر کوئی تبدیلی صرف داخلی عمل کے ذریعے واقع ہو سکتی ہے ۔ یہ انسان صلاحیتیں تو بہت سی رکھتا ہے ، لیکن اس میں خامیاں بھی اتنی ہیں کہ وہ مکمل کسی طرح نہیں ہوسکتا ۔ کم سے کم پورا سکون اور پوری خوشی کبھی حاصل نہیں کرسکتا ۔ انسان کا یہ تصور جوئس کے یہاں ملتا ہے ، اور اس کا تعلق ازلی گناہ کے عیسوی عقیدے سے ہے ۔ اُس زمانے میں کہا جاتا تھا کہ انسان کا یہ تصور سب سے گہرا اور حقیقت آگیں ہے ، اور سچا ادب صرف اسی کے ذریعے پیدا ہوسکتا ہے ۔

اگر انسان کے صرف تین ہی تصور ممکن ہوں تو یہ رائے بالکل درست ہے ۔ سیاسی یا سماجی انسان صرف آدھا انسان ہے ۔ اگر ہم آدمی کے اندر سماجی تعلقات کے سوا اور کچھ دیکھیں ہی نہ تو ہم اُس کی شدید ترین اور عمیق ترین زندگی کو حذف کر دیں گے ، اور نہ صرف ادب کو سطحی بنا دیں گے بلکہ اگر اس نظریے کی روح سے معاشرے کی تشکیل ہوئی تو انسانی زندگی مسخ ہوجائے گی ۔ اسی طرح کالڈویل کے فطری انسان میں پھیلاؤ اور لطافت کی گنجائش نہیں ۔ اس قسم کا انسان دس پانچ جبلی خواہشات کے مجموعے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوسکتا ۔ اُس سے آپ دیر تک دلچسپی نہیں لے سکتے — ہو پھر کے اُنہیں باتوں کا کہاں تک مشاہدہ کریں گے ۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کا بہت سا غیر سرکاری ادب تک بیزار کن یکسانی کا شکار ہوگیا ہے ۔ پھر سماجی تعلقات اور سماجی پابندیوں کو قبول کرنے سے آدمی میں جو وسعتیں پیدا ہوتی ہیں فطری انسان میں اُن کا امکان نہیں ہوتا ۔ نامکمل انسان کے تصور میں خوبی یہ ہے کہ فطری انسان اور سماجی انسان کو رد کرتے ہوئے یہ ان دونوں کا

مطالعه بھی کر لیتا ہے اور اُن سے آگے بھی نکل جاتا ہے ۔ اس لئے میں نے کہا کہ اگر انسان کا اور کوئی تصور ممکن نہ ہو تو ان تینوں میں یہ نظریہ سب سے زیادہ وقیع ہے — ادب کے لئے بھی اور زندگی کے لئے بھی ۔

انسان کے اس تصور کی قدر و قیمت تو خیر ہم نے تسلیم کرلی ، لیکن جب ہم جوئس جیسے عظیم ناول نگار کو اس نظریے کی روشنی میں پڑھتے ہیں تو اس میں تھوڑی سی کوتاہی بھی نظر آتی ہے ۔ اگر " نامکمل انسان " کو انیسویں صدی کے اس عقیدے کا جواب سمجھا جائے کہ سماجی نظام کو بدل کر انسان کو ہر اعتبار سے مکمل بنایا جاسکتا ہے تب تو ٹھیک ہے ۔ جوئس واقعی یہی کہتا ہے کہ انسان " مکمل " کبھی نہیں ہوگا ۔ اس کے لئے خارجی اور داخلی مسئلے پیدا ہوتے رہیں گے ، وہ انہیں حل کرے گا ، لیکن اس حل سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگا جسے از سر نو حل کرنا پڑے گا ۔ جوئس نے نامکمل انسان کو جس طرح پیش کیا ہے اُس میں مستقل اور ابدی تکمل کی نہ سہی ، عارضی تکمیل کی گنجائش ضرور باقی رہتی ہے ۔ " یولی سیز " کے آخر میں تینوں بڑے کرداروں نے کسی نہ کسی قسم کی تسکین اور سیرابی ضرور حاصل کی ہے ۔ اسٹیون کو وہ اعتماد مل گیا ہے جس کے بغیر تخلیقی کام نہیں ہوسکتا ۔ بلوم نے مردانہ وقار دوبارہ پالیا ہے ۔ میرین کے یہاں اپنے شوہر کے سلسلے میں خود سپردگی از سر نو پیدا ہوئی ہے ۔ بلکہ میرین بلوم کی خود کلامی میں تو " فطری انسان " کا اثبات بھی نظر آتا ہے ۔ پھر ان تینوں نے جو عارضی " تکمیل " پائی ہے وہ صرف حیوانی یا حیاتیاتی قسم کی تسکین نہیں بلکہ انسانی معنویت رکھتی ہے ۔ ان کرداروں نے غیر آسودگی سے آسودگی تک کا جسمانی اور روحانی سفر طے کیا ہے ۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ آسودگی لازوال نہیں ہوگی ، لیکن بہر حال یہ لوگ آسودگی تک جا پہنچے ہیں ۔ اس لحاظ سے جوئس کا انسان صرف و محض نا مکمل انسان نہیں ، بلکہ ایک جدلیاتی حقیقت ہے — ایک ایسی نا مکمل ہستی ہے جو مکمل بننے کےلئے جد و جہد کرتی رہتی ہے ۔ جوئس اسی جدلیاتی کشمکش کا رزمیہ لکھتا ہے ۔ یہ کشمکش خالص انسانی چیز ہے ، اور انسانی سطح پر چلتی ہے ۔ اگر کسی ماورائے انسان قوت کے وجود کا سوال نہ اٹھایا جائے تو بھی جوئس کے ناول کی معنویت میں فرق نہیں آتا ۔ اُسے ازلی گناہ کے عقیدے کے اندر بند کر دینا اُس کے ساتھ سرا سر ظلم ہے ۔ لیکن یورپ کی تنقید میں ایک فیشن یہ بھی چل گیا ہے کہ ہر بڑے مصنف کو کھینچ تان کر عیسائی ثابت کیا جاتا ہے ۔ بلکہ اُس کی عظمت کی دلیل ہی یہ پیش کی جاتی ہے کہ وہ عیسائی ہے ۔ اس قسم کی تفسیروں نے کم سے کم جوئس کو بہت نقصان پہنچایا ہے ، اور اُس کے ناولوں کی معنویت کو محدود کر کے رکھ دیا ہے ۔ ورنہ جوئس نے تو انسان کو ہر سطح پر قبول کیا ہے ، اور اُس کی ہر حیثیت کو مد نظر رکھا ہے ۔

خیر ، اب جوئس جیسے عظیم ناول نگاروں کو چھوڑیے جن کو اس طرح عقیدوں کے اندر محصور نہیں کیا جا سکتا ۔ اب اُن ناول نویسوں کو لیجئے جن پر بے واسطہ یا بالواسطہ ازلی گناہ کے عقیدے کا اطلاق ہو سکتا ہے ۔ ان لوگوں کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک طرف تو وہ ناول نگار ہیں جو آدمی کی فطرت میں اچھائیوں کے وجود سے تو انکار نہیں کرتے ، لیکن مطالعہ بدی کا کرتے ہیں ۔ ایسے ناولوں میں آپ کو ہر طرف بغض ، عداوت ، بد اندیشی ، غیظ و غضب ، شہوت ، اسی قسم کی چیزوں کے مظاہرے ملیں گے ۔ مگر یہ ناول نگار اپنے مشاہدات کو کسی مذہبی عقیدے کے ماتحت نہیں لاتے ۔ پھر یہ لوگ صراحتاً انسان کی کوئی تعریف بھی مہیا نہیں کرتے ، چند حقائق پیش کر دیتے ہیں ، جن کی بنا پر انسان کا ایک تصور مرتب کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً آپ نہایت آسانی کے ساتھ ان ناولوں سے انسان کا مشینی تصور اخذ کر سکتے ہیں — وہ یہ کہ انسان کاٹھ کا پتلا ہے جو چند جبلتوں کے ہاتھ میں کھیلتا ہے ۔ میں ان

ناول نگاروں پر یہ الزام نہیں لگا رہا ہوں کہ وہ انسان کے بارے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہتے ۔ میں تو اُن کے مشاہدے کی جرأت اور ایمانداری کا بھی قائل ہوں ۔ مگر اُن کے یہاں انسان کا کوئی واضح اور قطعی تصور نہیں ملتا ۔ غالباً یہ لوگ اس مسئلے کا کوئی فیصلہ نہیں کر سکے ہیں کہ انسان صرف جسم ہی جسم ہے ، یا اُس کے اندر روح بھی ہے ، اور اگر ہے تو روح اور جسم کا آپس میں کیا تعلق ہے ۔ میرے اس قیاس کا ثبوت فاکنر کے اُس بیان میں ملتا ہے جو اُنھوں نے نوبیل پرائز پانے کے وقت دیا تھا ۔ وہ کہتے ہیں کہ ایٹم بم نے سارے روحانی مسائل کو ختم کر کے رکھ دیا ہے ، اب انسانیت کے سامنے صرف ایک جسمانی مسئلہ رہ گیا ہے کہ نسل انسانی زندہ بچی ہے یا نہیں ۔ لیکن اسی بات کا دوسرا رخ یہ ہے کہ روحانی مسائل اتنی عریاں اور ہیبت ناک شکل میں انسان کے سامنے پہلے کبھی نہیں آئے تھے ۔ اور پوری نسل انسانی کے جسمانی وجود کا دارو مدار چند روحانی مسائل کے تصفیے پر اس حد تک کبھی نہیں رہا تھا ۔ ایٹم بم نے روحانی مسئلوں کو ختم نہیں کیا ہے بلکہ پہاڑ بنا دیا ہے ۔ انسانیت کو موت سے بچانے کا یہی طریقہ ہے کہ انسان کا ایک تخلیقی تصور پیدا کیا جائے ۔ مگر یہ ناول نگار ہمیں " آدمی " کی تو رگ رگ دکھا دیتے ہیں ، لیکن صاف صاف یہ نہیں بتاتے کہ اس " آدمی " کے اندر سے " انسان " کس قسم کا نکلنا ہے ۔ یعنی انسان کی تعریف متعین کرنے کے کام کو یہ لوگ ملتوی کرتے رہے ہیں ۔ اس التوا کو ہچکچاہٹ کہا جائے یا گھبراہٹ؟ بہر حال ایک بات ضرور ہے ۔ فاکنر جیسے بڑے ناول نگار کے متعلق تو جلدی سے فیصلہ نہیں کرنا چاہئے ۔ لیکن اُس سے چھوٹے ناول نگاروں کے یہاں یہ ہچکچاہٹ ایک دلدل بن جاتی ہے جس میں پڑا آدمی ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے اور باہر نہیں نکل سکتا ۔ حقیقت کے مشاہدے اور اظہار کے لئے جتنی ہمت اور ایمانداری درکار ہے وہ تو ان لوگوں کے پاس ہوتی ہے، لیکن جب وہ حوصلہ دکھانے کا وقت آتا ہے جسے فلسفۂ زیست والے "اندھیرے میں چھلانگ لگانا " کہتے ہیں تو یہ لوگ کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں ۔

دوسری قسم کے ناول نگار وہ ہیں جو آدمی کی وہی تصویر پیش کرتے ہیں جو پہلے گروہ والے ، مگر ان کے پاس انسان کا ایک پہلے سے بنا بنایا تصور موجود ہوتا ہے ۔ یعنی یہ لوگ انسانی زندگی کا مطالعہ ابتدائی گناہ کے عیسوی عقیدے کی روشنی میں کرتے ہیں ، اور انسان کی فطرت ہی کو داغ دار سمجھتے ہیں ۔ اس عقیدے کے مطابق انسان اپنی فطرت کی بدی اور گندگی سے بس خدا کی رحمت ہی کے ذریعے آزاد ہو سکتا ہے ، ورنہ نہیں ۔ چونکہ خدا کی رحمت زبردستی تو حاصل کی نہیں جا سکتی اس لئے انسان کے پاس معصیت کاری ہی رہ جاتی ہے ۔ چنانچہ اس عقیدے کے طفیل بعض دفعہ ناول نگاروں میں ایک طرح کی اذیت پرستی آ جاتی ہے، اور وہ انسان کا ایک ایک گناہ کرید کرید کے نکالنے لگتے ہیں جیسے اپنے دشمن سے انتقام لے رہے ہوں ۔ اور تو اور خود موریاک کے بعض ناولوں میں زندگی ایک کال کوٹھڑی بن جاتی ہے جس میں پڑا انسان دوسروں کو اور اپنے آپ کو اذیت پہنچا رہا ہے ، اور اس کوٹھڑی سے نکلنے کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی جب تک کہ خدا نہ نکالے ۔ موریاک کے یہاں سے تو کبھی کبھی انسانی رحم کا جذبہ تک غایب ہونے لگتا ہے ، کیونکہ جب انسانی زندگی کی لازمی کیفیت ہی یہ مجبوری ہے تو پھر رحم کا جذبہ کوئی معنی نہیں رکھتا — کم سے کم یہ جذبہ تخلیقی قوت نہیں بن سکتا ۔ گریہم گرین کے یہاں بعض اوقات یہ چیز سنگ دلی بن جاتی ہے ، اور اُس کے طنز میں سستا پن آ جاتا ہے ۔ اگر انسان اپنی گناہ گاری میں واقعی اتنی ہی بری طرح گرفتار ہے تو چاہے وہ عیسوی دینیات کو سمجھنے میں ناکام رہے، لیکن ہمیں اُسے مطعون نہیں کرنا چاہئے ۔ اس کے برخلاف گریہم گرین نے Brighton Rock میں ایک طوائف نما عورت کو جو زندگی سے ہر حالت میں لطف اندوز ہونا چاہتی ہے اور لذت کے علاوہ زندگی سے کسی

اور چیز کا مطالبہ نہیں کرتی ، آزاد خیالی اور بے دینی کی علامت بنا کر جا و بے جا اُس کا مذاق اڑایا ہے ۔ لیکن انسان کی گناہ‌گاری پر تو چوسر کا بھی ایمان تھا ، پھر اُس کا معاشرہ بھی عیسائیت میں ڈوبا ہوا تھا ۔ اس کے باوجود وہ Wife of Bath کو قبول کر لیتا ہے ۔ گریہم گرین صاحب خدا کے فرائض خود انجام دینے شروع کر دیتے ہیں ۔ آخر انہیں کیسے پتہ چلا کہ خدا کی رحمت اس طوائف پر نازل نہ ہو گی ؟ غرض جن لوگوں نے ابتدائی گناہ کے عقیدے کی روح سے زندگی کی تفسیر کی ہے انہیں انسان کا ایک ٹھوس اور بے لاگ تصور تو ضرور مل گیا ہے ، لیکن ساتھ ہی اُن میں ایک راہبانہ اذیت پرستی بھی آ گئی ہے ، اور اُن کا انداز کچھ احتسابی کارروائی کا سا ہو گیا ہے ۔

مگر ایسی بھی دو ایک مثالیں موجود ہیں جہاں اس گروہ کے ناول نگاروں نے اپنے کرداروں میں ایک روحانی انقلاب پیدا ہوتے دکھایا ہے ۔ مثلاً موریاک کا ناول Vipers' Tongle ہے ۔ یہ ایک ایسے آدمی کی داستان ہے جس کا دل مایوسی ، غصے ، نفرت اور انتقام سے لبریز ہے اور جو خود اپنی اولاد سے اپنی محرومی کا بدلا لینا چاہتا ہے ۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوتا ۔ ناکامیوں کے ذریعے اُس کے دل میں اتنی وسعت پیدا ہونے لگتی ہے کہ وہ غلط کاروں سے بھی ہمدردی کر سکے ۔ اور اس طرح مرنے سے پہلے اُس کی روح میں ایک نئی محبت اور ایک نیا سکون جنم لیتا ہے ۔ اس حد تک تو اس ناول میں انسان کا جدلیاتی تصور پیش کیا گیا ہے ، اور انسان میں تخلیقی عمل کی اہلیت تسلیم کی گئی ہے ۔ لیکن اس تخلیقی عمل کو عیسوی عقیدے کے مطابق خدا کی رحمت کا اتنا پابند بنا دیا گیا ہے کہ اس اندرونی انقلاب کی انسانی معنویت کم ہو جاتی ہے ۔ یہ سارا عمل بنیادی طور سے ایک ایسی سطح پر واقع ہوتا ہے جو انسان کی تخلیقی صلاحیت سے بلند ہے ۔ موریاک نے یہ تو مانا ہے کہ انسان اپنی بدی کی گہرائیوں کو پار کر کے دوسری طرف نیکی تک پہنچ سکتا ہے ۔ مگر نیکی تک پہنچنے کے وسائل محض انسانی نہیں ہیں ۔ موریاک '' آدمی'' کے مشاہدے سے آگے بڑھ کر '' انسان '' کی تعریف متعین کرنے کی منزل تک تو آ پہنچا ہے ۔ لیکن یہ تعریف خود انسان کی تخلیقی صلاحیتوں پر پوری طرح بھروسا نہیں کرتی ، اور انسان کو خلا میں لٹکتا چھوڑ جاتی ہے ۔ یہ تعریف انسان کی ذمہ داری کو اُس کے کندھوں پر اس طرح نہیں لا کے رکھتی کہ وہ تخلیقی عمل کے فریضے سے بھاگ ہی نہ سکے ۔ موریاک کے ناولوں میں تو آدھا بوجھ انسان کے کندھوں پر ہوتا ہے ۔ اور آدھا خدا کے کندھوں پر ۔

موریاک کے نقطۂ نظر پہ میں نے یہ اعتراض اس لئے کیا کہ چیزوں کی تعریف متعین کرنا کوئی خالص علمی مشغلہ نہیں ہے ، اور نہ محض تفنن طبع ہے ۔ میز ، کرسی ، گھڑے اور لوٹے تک کی تعریف ہم اس غرض سے متعین کرتے ہیں کہ زندگی کے تخلیقی عمل میں آسانی رہے ۔ کسی انسانی مسئلے میں گرفتار ہو کر ہی ہمیں اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ۔ یہ کام کسی خاص صورت حال کے اندر سے ہوتا ہے ، باہر سے نہیں ۔ چنانچہ '' انسان '' کی تعریف ہم اس لئے متعین کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری تخلیقی صلاحیتیں آزاد ہوں اور بر سر کار آئیں ۔ انسان کی ہر تعریف کا آخری معیار یہی ہو گا ۔ اب اس لحاظ سے دیکھنا چاہئے کہ آج انسانیت کی صورت حال کیا ہے ۔ یہاں میں مغرب کو انسانیت کے مترادف سمجھوں گا ، کیونکہ ایٹم بم تو بہر حال مغرب نے بنایا ہے اور ہماری تقدیر بھی بڑی حد تک مغرب کی تقدیر کے ساتھ بندھی ہوئی ہے ۔

رانغ نے بتایا ہے کہ جو لوگ عام طور سے نفسیاتی علاج کے لئے آتے ہیں اُن کی شخصیت میں اوپر نیچے تین تہیں ہوتی ہیں ۔ باہر سے تو آدمی ایسا لگتا ہے جیسے اس میں کوئی خرابی نہ ہو ، اپنا کام بھی کرتا ہے ، لوگوں سے ملتا جلتا بھی ہے ، غرض کوئی غیر معمولی

بات نظر نہیں آتی ، البتہ اُس کی تخلیقی صلاحیتیں پوری طرح کام نہیں کرتیں ۔ معالج اس تہ کو توڑ دیتا ہے تو نیچے سے غصہ ، نفرت ، حسد ، اور دوسرے تخریبی رجحانات برآمد ہوتے ہیں ۔ پھر اس تہ کے نیچے سے تخلیقی صلاحیتیں ، مسرت ، محبت ، بھر پور طریقے سے زندہ رہنے کی خواہشیں نکلتی ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ یہ اصول معاشرے اور ادب پر بھی صادق آتا ہے ۔ پہلے مغربی معاشرے کا جائزہ لیجئے ۔ اُنیسویں صدی کی حالت رائخ والی پہلی تہ جیسی تھی ۔ معاشرے کی گہرائیوں میں تخریبی رجحانات پرورش پا رہے تھے ، لیکن ظاہر میں راوی چین ہی چین لکھتا تھا ۔ خود اطمینانی کا یہ عالم تھا کہ لوگ سمجھتے تھے جنگ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی ۔ ۱۹۱۴ء میں یہ تہ ٹوٹی تو خون ریزی اور تباہی بربادی کا سیلاب اُمڈ پڑا ۔ چنانچہ مغرب اور اُس کے ساتھ ساتھ باقی دنیا بھی اب تک اسی دلدل میں پھنسی پڑی ہے ۔ اور اس تہ کو توڑ کر نیچے آبِ حیات کے سر چشموں تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ۔ نظریاتی اور عملی کوششیں البتہ ہوتی رہتی ہیں ۔ اس قسم کی سب سے بڑی کوشش روس میں اشتراکی معاشرے کا قیام تھا ، لیکن اسٹالن کی تنگ نظری نے اسے پوری طرح کامیاب نہیں ہونے دیا ۔

اب ادب کی طرف آئیے ۔ چونکہ ادب سے توقع کی جاتی ہے کہ انسان کی پوری ہستی کا احاطہ کرے گا ، اس لئے یہاں زمانے وار تقسیم نہیں چل سکتی ۔ پھر جو ادب تیسری تہ تک نہ پہنچے وہ بڑا نہیں ہو سکتا ، اور جو پہلی تہ سے آگے نہ بڑھے وہ سچا ادب نہیں ہو سکتا ۔ چنانچہ عام طور سے ادیبوں میں ہر تہ کی کوئی نہ کوئی بات مل جائے گی ۔ اس تنبیہ کے بعد ہم رائخ کے اصول کو ادب میں بھی کار فرما دیکھ سکتے ہیں ۔ پہلی تہ سے تو روس اور امریکہ کا سرکاری ادب مطابقت رکھتا ہے ۔ دوسری تہ کی مثال گریہم گرین ، فاکنر اور وہ ادیب ہیں جو انسانی فطرت کے تخریبی رجحانات پیش کرتے ہیں ۔ تیسری تہ تک انگریزی ناول نگاروں میں در حقیقت صرف دو آدمی پہنچے ہیں ، جوئس اور لارنس ۔

اس تجزیے کی روشنی میں دنیا کے ادب کا مسئلہ کچھ یوں نظر آتا ہے ۔ دنیا میں جو لوگ بر سر اقتدار ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ادب خود اطمینانی اور نیازمندی کی حد سے آگے نہ بڑھے ۔ ایسی چیزیں لکھنے کے لئے " آدمی " کے ٹھوس تجربات سے آنکھیں بند کر کے ایک فرضی " انسان " ایجاد کرنا پڑتا ہے ۔ ایسا جھوٹ ادب کے لئے بھی مہنگا پڑے گا اور زندگی کے لئے بھی ۔ پھر وہ سچے ادیب آتے ہیں جو خارجی دباؤ سے آزاد ہو کر اپنے آپ زندگی کو تجربے میں لانا چاہتے ہیں ۔ ان میں اتنی ہمت ہے کہ انسانی فطرت کے تخریبی رجحانات کو گھبرائے بغیر تسلیم کریں ۔ لیکن بعض دفعہ وہ اس بدی کے گھنے جنگل میں ایسے پھنس جاتے ہیں کہ اس سے آگے انسانی مسرت کے سبزہ زاروں تک نہیں جا سکتے ۔ بلکہ بعض ناول نگار تو شاید مسرت کو سطحیت کے مترادف سمجھتے ہیں ۔ اس لئے وہ " آدمی " کے اندر سے " انسان " کا کوئی ایسا تصور نہیں نکال سکتے جس میں انسان کو اپنی مسرت کا خالق سمجھا گیا ہو ۔ چنانچہ اس وقت دنیا ایک ایسے ادب کی ضرورت محسوس کر رہی ہے جس میں " آدمی " کو رد کئے بغیر "انسان " کا ایک تخلیقی تصور وضع کیا جائے ۔ اس روحانی ضرورت کا سب سے شدید احساس آج کل فرانس کے ادیبوں کو ہے ، اور اسی احساس نے وہاں " نئی شاعری " کی تحریک پیدا کی ہے ۔

" آدمی " اور " انسان " کا ایسا امتزاج بیسویں صدی میں ممکن بھی ہے یا نہیں؟ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے ، اس امکان کا اشارہ خود بودیلئر کے یہاں موجود ہے ۔ مگر وہاں یہ "غم " اور یہ " نشاط " ایک دوسرے سے کچھ الگ الگ نظر آتے ہیں ۔ اپولی نیئر نے اس المیہ رنگ کے خلاف بغاوت کر کے نشاطیہ رنگ کو اُبھارا ۔ فرانس کے " نئے شاعر " اپولی نیئر کی اس روایت کی پیروی کر رہے ہیں ، لیکن اُن کے یہاں اندیشہ یہ ہے کہ یہ روایت ہی

روایت بن کے نہ رہ جائے ، اور یہ محض جعل ہوگا - آدمی کے الم اور تخلیقی انسان کے نشاط کا سب سے عظیم اور حقیقی امتزاج شاعری میں ییٹس اور لورکا کے یہاں ملتا ہے ، اور ناول میں جوئس اور لارنس کے یہاں - (پروست اور ٹامس مان کے متعلق میں کوئی فیصلہ کرنے سے معذور ہوں -) مگر یہ تو دیو قامت لوگ ہیں ، انہوں نے اپنی تخلیقات میں مکمل امتزاج حاصل تو کر لیا ہے ، لیکن اس عمل میں جو منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں ان کی نشان دہی اس طرح نہیں کی کہ پورا ہدایت نامہ تیار ہو جائے - یہ کام اس درجے کے ادیبوں کا ہے بھی نہیں - اس کے لئے تو ہمیں دوسرے درجے کے ادیبوں سے رجوع کرنا پڑتا ہے -

یہ فریضہ پچھلے بیس سال سے چند فرانسیسی ناول نگار انجام دے رہے ہیں - سارتر ، سیمون دبووار ، کامیو ، سین تیگزوپری ، مالرو ، ان سب کی روحانی کاوشوں کا مرکز یہی انسانی تقدیر کا مسئلہ ہے - اور سب کے سب یہی کہتے ہیں کہ " آدمی " کے تجربات کو چھوڑ کر " انسان " کی کوئی تعریف مقرر نہیں کی جا سکتی ، دوسری طرف اگر ٹھوس تجربات میں سے انسان کا کوئی تصور برآمد نہ ہو سکے تو ان میں کوئی معنویت نہیں ہوتی - یہ لوگ انسان کی بدی سے انکار نہیں کرتے ، لیکن بدی میں الجھ کے رہ جانے کے بجائے یہ دیکھتے ہیں کہ انسان اپنے تخریبی رجحانات کے باوجود تخلیقی قوت کس طرح بنتا ہے، اور کسی ماورائی طاقت کی مدد کے بغیر خود اپنے خارجی اور داخلی عمل سے اپنے وجود کے الم کو نشاط میں کس طرح تبدیل کرتا ہے - چنانچہ سب سے پہلے تو یہ لوگ انسان کے اندر چند متضاد کیفیتوں کی بیک وقت موجودگی کا اعتراف کرتے ہیں - مثال کے طور پر انسانی ہستی کے تضاد کے دو چار پہلو یہ ہیں :- (۱) موت اور زندگی (۲) تنہائی اور دنیا سے رشتہ (۳) مجبوری اور آزادی (۴) خارجی وجود اور داخلی وجود - ایسے تضادوں کو قبول کرنے کے بعد ہی انسان اپنے جوہر کی تخلیق کر سکتا ہے ، اور اس جوہر کی تخلیق کے بغیر انسانی زندگی میں اہمیت ، معنویت ، وقار ، حسن اور گیرائی نہیں آتی - یہی چیز زندگی کو حال کے لمحوں میں بٹ کر ریزہ ریزہ ہو جانے سے بچاتی ہے - اسی کے ذریعے ماضی ، حال اور مستقبل میں ربط قائم ہوتا ہے ، اور انسانی زندگی ایک وحدت بنتی ہے - پھر یہ جوہر ایسی چیز نہیں جو ایک دفعہ بنا کے رکھ لی جائے اور ہمیشہ کام دے - یہ جوہر ایک خاص صورت حال میں "پھنسنے" کے بعد تخلیق کیا جاتا ہے، اور نئی صورت حال پیدا ہوتے ہی ٹوٹ جاتا ہے - چنانچہ یہ ایک ہمیشہ جاری رہنے والا تخلیقی عمل ہے - انسان کو ہر ہر لمحے اپنے آپ کو از سر نو تخلیق کرنا پڑتا ہے - یعنی آدمی اور انسان کا تعلق ایک جدلیاتی عمل ہے ، اور اس عمل کی جدلیت انسانی زندگی کو سیراب کرتی ہے - اس جدلیاتی عمل سے انکار کرنا یا اس کی ذمہ داریوں سے بچنا بے ہمتی اور یاس پرستی ہے ، بلکہ موت کو دعوت دینے کے برابر ہے - کیونکہ انسان اپنے آپ کو صرف اسی جدلیاتی اور تخلیقی عمل کے ذریعے زندہ رکھ سکتا ہے - ایٹم بم نے اس حقیقت کو دبایا نہیں بلکہ اور ابھار دیا ہے - ہمارے روحانی مسائل ختم نہیں ہوئے ہیں - آج ہم انسانی زندگی کے سب سے بنیادی مسئلے سے دوچار ہیں - ہم " آدمی" کے اندر سے " انسان " اخذ کرنے کی اہلیت اور طاقت رکھتے ہیں یا نہیں ؟ اسی سوال کے جواب پر نسل انسانی کے مستقبل کا دار و مدار ہے - غالب نے کہا ہے ع

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہاں 'انسان ' کے لفظ کو غالب نے اپنے ہی معنوں میں استعمال کیا ہے - اور وہ ایک بات نہیں سمجھ سکے تھے کہ آدمی اپنی اسی مجبوری سے تخلیقی قوت حاصل کرتا ہے - اگر اس مضمون کے اصطلاحی معنوں میں آدمی کو انسان بننا میسر نہ ہوا تو پھر آدمی زندہ نہیں رہ سکے گا -

اردو ناول کا ارتقاء

وقار عظیم

جب کوئی اردو ناول کے ارتقا کا جائزہ لینے بیٹھتا ہے اور سوچتا ہے کہ فن کے اس دل کش سفر کی پہلی منزل کون سی ہے ، اس کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے تو اس کی نظر سب سے پہلے نذیر احمد کے ان ناولوں پر پڑتی ہے ، جنہیں بعض نقادوں نے ناول تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے ۔ اس انکار یا تامل کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ نذیر احمد کے جن قصوں کو متفقہ طور پر ناول کا نام دیا گیا ہے اُن میں فن کے وہ لوازم موجود نہیں ہیں ، جن کا مطالبہ " فن کے رسیا " کرتے ہیں ۔ پلاٹ ، اور اس کے مختلف فنی اجزا — ایک اہم موضوع ، اس اہم موضوع کے پیش کرنے کے لئے ایک موزوں اور پر کشش آغاز ، اُلجھن ، ارتقاء ، منتہا ، منطقی انجام ، پھر زندگی سے بھرپور کردار ، ایک واضح نقطۂ نظر کی موجودگی ، مقصد اور فن کا باہمی توازن ، موضوع اور بیان میں مکمل مطابقت اور ہم آہنگی ، مصنف کی شخصیت کا گہرا پرتو اور اس کی فکری اور جذباتی صلاحیتوں اور قوتوں کا پورا رچاؤ ، مشاہدہ اور احساس (یا دوسرے لفظوں میں خارجی عناصر اور داخلی کیفیتوں) کی موزوں آمیزش — نذیر احمد کے قصوں میں یہ سب کچھ تلاش کیا جاتا ہے اور نہیں ملتا تو یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں برتا جاتا کہ یہ قصے ناول نہیں ہیں ۔ اور جو لوگ ان سارے تکلفات سے بے نیاز ہو کر صرف یہ دیکھتے ہیں کہ داستان کی خیالی دنیا کی جگہ ان قصوں میں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں ، ان ٹھوس حقیقتوں سے دو چار ہونے والے ہم سے آپ سے ملتے جلتے کردار نظر آتے ہیں تو وہ یہ محسوس کر کے خوش ہوتے ہیں کہ یہ قصے ، قصہ گوئی کے ایک نئے اسلوب اور فن کے ایک نئے دور کی آمد کا پیش خیمہ ہیں ۔ یہ صحیح کہ وہ اُس مفہوم میں ناول نہیں ہیں ، جو ہم نے مغرب سے لیا ہے ، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ ناول کی داغ بیل انہیں قصوں نے ڈالی ہے ۔ مراۃ العروس اور بنات النعش میں ، اس سے بھی کچھ زیادہ توبتہ النصوح اور ابن الوقت میں اور پھر ان سب سے بڑھ کر فسانۂ مبتلا میں ہمیں آہستہ آہستہ وہ سارے خط و خال دکھائی دیتے ہیں ، جن سے ناول کے پیکر کی تخلیق و تعمیر ہوتی ہے ۔

نذیر احمد کے ابتدائی دو قصوں میں واقعات کے ربط ، تسلسل اور ارتقا کا احساس سرے سے ناپید ہے ۔ ان واقعات کی منطق فن کار کی منطق ہونے کے بجائے واعظ ، مصلح ، اور کہیں کہیں مولوی کی منطق ہے ۔ ان قصوں کے کردار حقیقت کے آئینہ دار ہونے پر بھی مثالی ہیں ۔ لیکن اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ ان دونوں قصوں نے ہمیں پہلی مرتبہ یہ بات بتائی ہے کہ معاشرے کے اہم مسائل قصے کہانی کے پیرائے میں پیش کئے جاسکتے ہیں اور ان مسائل کو پیش کرتے وقت زندگی کا ایسا پس منظر استعمال کیا جاسکتا ہے جو سادگی کے باوجود موثر اور دل نشین ہو سکتا ہے ۔ توبتہ النصوح اور ابن الوقت میں بھی مقصدیت اور مذہبی احساس کا پلہ بھاری ہے اور اپنے مقصد کے ساتھ مصنف کو جو جذباتی لگاؤ ہے اُسے وہ نہ خود بھولتا ہے اور نہ چاہتا ہے کہ اُس کا قاری اس کے احساس سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہونے پائے ۔ مقصد کے ساتھ اسی گہری وابستگی اور جذباتی شدت نے اُسے قاری کی ذہانت اور ذکاوت پر بھروسہ کرنے کی قطعی اجازت نہیں دی اور اس لئے اکثر اوقات مصنف اور قاری کے درمیان وہ جذباتی ہم آہنگی نہیں پیدا ہوسکی جس کے بغیر قصہ گو اور قصہ خواں ایک دوسرے کے ہم خیال نہیں بنتے — لیکن فنی احساس کی اس کمی کے باوجود توبتہ النصوح اور ابن الوقت نے قصہ نویسی کے فن کو بعض اہم چیزیں دی ہیں — قصہ کہنے اور لکھنے والے کو اپنے موضوع اور مقصد کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی ہونی چاہئے ، اُسے اپنے مقصد

پر پوری طرح غور و فکر کرنا چاھئے ، اُسے اُس ماحول سے پوری واقفیت ھونی چاھئے جسے وہ اپنے قصے کا پس منظر بنانا چاھتا ھے ، قصہ کے کرداروں کو نیکی اور بدی میں مثالیت سے قریب ھونے کے باوجود زندگی کا حامل ھونا چاھئے — اور پھر یہ کہ کہانی میں مکالموں سے دلچسپی بھی پیدا ھوتی ھے اور وہ کسی نہ کسی حد تک واقعات کو آگے بڑھانے میں ، قاری کو اپنے مقصد سے ھم آھنگ کرنے کے لئے قصہ میں دلچسپی کے مختلف وسائل کا استعمال کرنا ضروری ھے ، واقعہ نگاری ، منظر کشی اور طنز اور مزاح کی آمیزش ان وسائل میں سے چند اھم وسائل ھیں ۔ یوں گویا قصہ گو نے قصہ گوئی کے بنیادی مقصد (یعنی قاری یا سامع کی دلچسپی کا خیال) اور اپنے مقصد ، یعنی اصلاح کی خواھش اور تدبیر کے درمیان پہلی مرتبہ توازن پیدا کرنے کی طرف توجہ کی ھے اور پھر وہ نذیر احمد ، جنھوں نے اپنی پہلی چار کتابوں میں مقصد کو اپنا سب کچھ سمجھ کر بہت آھستہ آھستہ اور یوں محسوس ھوتا ھے کہ جیسے ڈرتے ڈرتے ، جھجکتے جھجکتے اور شرم ساری کے احساس کے ساتھ فن کی طرف قدم بڑھایا ھے ، فسانۂ مبتلا میں واعظ اور مصلح کا لبادہ اُتار کر فن کار کے نازک لباس میں ملبوس دکھائی دیتے ھیں ۔

نذیر احمد نے کہانی اور اصلاح معاشرت میں لازم و ملزوم کا جو رشتہ قائم کیا ھے اس میں ایک خاص قسم کی منطقی فکر اور اصلاحی اور تبلیغی مزاج کو دخل ھے ۔ نذیر احمد اُردو کے پہلے قصہ نویس ھیں جنھوں نے ایک خاص معاشرے کی سیاسی ، معاشرتی ، معاشی اور اخلاقی زندگی کا غور سے مطالعہ کرکے اور اس زندگی کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی پیدا کرکے اُس کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا ۔ اور اس اھم کام کے لئے قصہ (یا کہانی) کا استعمال کیا ۔ اس طرح قصہ کو ایک ایسا مقام اور مرتبہ حاصل ھوا جس سے وہ اب تک محروم رھا تھا ۔ قصہ اب محض دلچسپی یا وقت گزاری کا مشغلہ ھونے کے بجائے معاشرتی زندگی کے مسائل کی مصوری اور اصلاح کا ذریعہ بن گیا ۔ یہ گویا سنجیدہ قصہ نویسی کی طرف پہلا قدم تھا ۔ اس پہلے قدم کے ساتھ ساتھ ، بہت آھستہ آھستہ ھی سہی ، لیکن پورے یقین کے ساتھ زندگی اور فن کا رشتہ اُستوار ھوتا رھا ۔ مقصد اور فنی احساس کے درمیان توازن قائم ھونے کی ابتدا بھی ھوئی اور اس توازن نے فسانۂ مبتلا تک پہنچتے پہنچتے ایک ایسی شکل اختیار کرلی جب واعظ اور فن کار کی شخصیتیں ایک دوسرے میں جذب ھوتی ھوئی دکھائی دینے لگیں ۔ پلاٹ میں ربط و تسلسل اور ارتقا واقعات کے بیان میں اھم غیر اھم اور ضروری اور غیر ضروری تفصیلات کا امتیاز ، کرداروں کی شخصیت اور مزاج میں مثالیت کے بجائے حقیقت کا غلبہ ، کرداروں کے عمل اور گفتگو میں اُن کی انفرادی شخصیت کا عکس ، بیان میں ادبی چٹخارہ اور مزاح کی چاشنی اور ان سب سے بڑھ کر افسانہ پر شروع سے آخر تک چھائی ھوئی سچی زندگی کا رنگ ۔ یوں فسانۂ مبتلا اُردو کا پہلا ناول ھے جس نے صحیح معنوں میں زندگی اور فن دونوں کی انفرادی اھمیت اور باھمی رشتے کے احساس کی داغ بیل ڈالی اور نذیر احمد کے بعد آنے والے ناول نگاروں کو فن کی روایت کا ایک ایسا معیار ملا جس میں بہت سی خامیوں کے باوجود مکمل فن کی ساری نشانیاں ملیں — لیکن قبل اس کے کہ فسانۂ مبتلا کی فنی روایت اُردو ناول کی عام روایت بنے ھمارے ناول کی تاریخ میں بعض ایسی تخلیقات کا ظہور ھو چکا تھا جنھیں کچھ تو اس بنا پر سنگ میل کی حیثیت حاصل ھے کہ اُنھوں نے ناول کی روایت میں بعض غیر فانی عناصر کا اضافہ کیا اور کچھ اس لئے کہ وہ بعض ایسی خصوصیات کے حامل ھیں جنھوں نے انھیں قبول عام کا شرف بخشا ھے — ان تخلیقات میں شرر کے فسانۂ آزاد اور شرر کے ملک العزیز ورجنا کا نمبر پہلا ھے ۔

سرشار کے متعلق یہ بات ھر ایک کو معلوم ھے کہ انھوں نے اودھ اخبار کے لئے

مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا ۔ ان مضامین کے ذریعے سے وہ ہر روز لکھنؤی ماشعرت اور تہذیب کے کسی نہ کسی پہلو کی تصویر کھینچتے تھے ۔ آزاد ، جس کی آنکھوں سے انہوں نے اس گونا گوں زندگی کے بے شمار پہلوؤں کو دیکھا ہے ایک رند آزاد مشرب سیلانی ہے — ذہین ، طباع ، تیز ، طرار ، شوقین ، جس نے زندگی کی ہر لذت سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کو اپنا مسلک و مشرب بنایا ہے ، اور جہاں معاملہ زندگی کے فوائد سے متمتع ہونے کا ہے وہاں اس کے لئے تہذیب و اخلاق کی ساری اقدار ہیچ اور بے معنی ہیں ۔ لکھنؤی معاشرت اور تہذیب کے یہ سارے مرقعے اسی رند آزاد مشرب کے مشاہدے کا عکس ہیں ۔ ان میں چونکہ پڑھنے والوں نے ایک خاص طرح کی رنگینی اور ایک خاص قسم کا نشہ محسوس کیا اس لئے سرشار نے لوگوں کے تقاضے سے ان منتشر تصویروں کو یکجا کر کے ایک تصویر خانہ بنانے کی کوشش کی ہے ۔ یہ تصویر خانہ یوں تو حد درجہ دلکش اور دل فریب ہے لیکن اس کے گونا گوں مرقعوں کا آپس میں کوئی ربط و تسلسل نہیں — یہی تصویر خانہ فسانۂ آزاد ہے ۔

اُردو ناول کی تاریخ میں اس تصویر خانے کی بڑی اہمیت ہے ، فن کے نقطۂ نظر سے فسانۂ آزاد پر کئی ایسے اعتراض کئے جاتے ہیں جن کا وزن ہر ایک نے تسلیم کیا ہے ۔ پلاٹ ، جیسے کہانی میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اس ضخیم کتاب میں سرے سے ناپید ہے ۔ نہ اس کا کوئی آغاز ہے نہ انجام ۔ نہ کوئی بنیادی مسئلہ یا موضوع ، اور اس لئے لازمی طور پر نہ کوئی اُلجھن ، نہ کشمکش ، نہ اشتیاق ، نہ پڑھنے والے کے دل میں یہ سوال کہ دیکھیں اب کیا ہو ۔ کہانی میں کسی بنیادی مسئلے کا عدم اور آغاز ، ارتقا اور انجام کے ساتھ ساتھ کسی قسم کی اُلجھن ، اشتیاق اور اضطراب کا عیب کہانی کو کہانی نہیں بننے دیتا ۔ اور کہانی میں کہانی پن نہ ہو تو اُس میں کرداروں کا عدم وجود (کہانی سمیے اور پڑھنے والوں کے نقطۂ نظر سے) برابر ہو جاتا ہے ۔ پڑھنے والے کو کرداروں کے ساتھ وہ وابستگی ، وہ ہمدردی اور وہ تعلق خاطر نہیں پیدا ہوتا جس کی بنا پر وہ اُن کی اُلجھنوں میں شریک ہونے اور انہیں کسی خاطر خواہ انجام تک پہنچانے کے خواہش مند ہوتے ہیں ۔ کردار کسی اُلجھن اور کشمکش میں مبتلا نہ ہوں تو اُن کی سیرتوں اور شخصیتوں کے جوہر نہیں اُبھرتے اور وہ کٹھ پتلیوں کی طرح ناچ اور تھرک کر دیکھنے والے کا جی ضرور خوش کر جاتے ہیں لیکن اُس کے دل پر کوئی قائم رہنے والا نقش نہیں چھوڑتے — اُن کی حرکتوں میں لچک اور چمک تو ہوتی ہے لیکن زندگی کے خون کی روانی ہرگز نہیں ہوتی ۔ فسانۂ آزاد کی کہانی اور پلاٹ اور اُس کے کرداروں میں یہی ساری خرابیاں ہیں ۔ اس سے بھی بڑی خرابی یہ ہے کہ فسانۂ آزاد کا مصنف زندگی کے متعلق کوئی واضح نقطۂ نظر نہیں رکھتا ۔ اپنے سیلانی اور بے راہ رو ہیرو کی طرح اُسے بھی نیک و بد کی قدروں کا کوئی احساس اور امتیاز نہیں اور اس لئے اُس کے اور ناظر کے درمیان کوئی ہم نوائی ، کوئی یگانگت اور کوئی ذہنی اور جذباتی مطابقت اور ہم آہنگی نہیں پیدا ہوتی ۔

فسانۂ آزاد میں ناول کی حیثیت سے یہ سارے عیب ہیں ، اور ایسے عیب کہ ان کی موجودگی میں اُسے ناول کہنا محض تکلف کی بات معلوم ہوتی ہے — اس کے باوجود اُسے ناول کہا جاتا ہے ، اُس کی بڑائی کو تسلیم کیا جاتا ہے اور ناول کی تاریخ اور اُس کے ارتقا کی داستان میں اُسے ایک ایسی جگہ دی جاتی ہے ، جو اُسی کے لئے مخصوص ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فسانۂ آزاد میں ناول کی حیثیت سے بعض ایسی خصوصیتیں ہیں جن کا ہمارے ناول کے ارتقا پر گہرا اثر پڑا ہے ۔ فسانۂ آزاد کے مصنف نے مستقبل کے ناول نگار کو فن کے بعض ایسے سبق دئے ہیں کہ انہیں فراموش کر دینے والا فنی عظمت کا مستحق اور دعویدار نہیں بن سکتا ۔

ناول کے نقادوں اور خود ناول نگاروں نے ناول کی جو متعدد تعریفیں کی ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ " ناول زندگی کی وسعتوں کا حامل ہے " یعنی زندگی کو اس طرح ادب کے

سانچے میں ڈھالنا کہ اُس کی ساری وسعتیں اور گہرائیاں اس سانچے میں سما سکیں ادب کی کسی اور صنف کے ذریعے سے ممکن نہیں ، سوائے ناول کے ۔ زندگی کو جن چیزوں نے زندگی بنایا ہے ، وہ اُس کا پھیلاؤ ، اس کی گہرائیاں اور اُس کی الجھنیں ہیں ۔ اس پھیلاؤ ، اس گہرائی اور اس اُلجھن کی کوئی حد نہیں ۔ انسان اس پر جتنا غور کرے اس کی حدیں وسیع تر نظر آتی چلی جاتی ہیں ، اور جتنا اُنہیں سلجھانا چاہے اُن کی پیچیدگی میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ اس لئے فن کار کی عظمت اور بزرگی کی کسوٹی یہی ہے کہ وہ اس پھیلاؤ اور گہرائی پر کس حد تک قابو پاتا اور کس حد تک اسے اپنی نظر میں سمو سکتا ہے ، اور کس حد تک ان اُلجھنوں کی مصوری ایک ایسے انداز میں کر سکتا ہے کہ یہ اُلجھنیں اُلجھنیں نہ معلوم ہوں ۔ وہ زندگی کو اس طرح دیکھ سکے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس طرح دکھا سکے کہ زندگی کے چھپے ہوئے بھید نظر کے سامنے آجائیں ، اُس کا حسن زیادہ نکھرا ہوا دکھائی دینے لگے اور اُس کی اُلجھنیں سلجھتی ہوئی معلوم ہونے لگیں ۔

کوئی فن کار یا اس جگہ یوں سمجھئیے کہ کوئی ناول نگار پوری انسانی زندگی کے پھیلاؤ ، گہرائی اور اُلجھن کا احاطہ کرنے پر قادر نہیں ۔ یہ بات کسی ایک آدمی کے بس کی ہے ہی نہیں ۔ اس لئے جو کوئی زندگی کے مشاہدے اور مصوری کا بھرپور حق ادا کرنا چاہے اُسے انسانی زندگی کے کسی ایک محدود پہلو کا انتخاب کرنا پڑتا ہے ۔ یوں اس محدود پہلو میں بھی زندگی کی وہ بنیادی صفات (پھیلاؤ ، گہرائی اور پیچیدگی) موجود ہوتی ہیں ۔ اور اس لئے فن کار کی عظمت کے امتحان کے لئے زندگی کا یہ محدود اور مخصوص پہلو بھی وہی حیثیت رکھتا ہے جو پوری زندگی — سرشار اُردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنہوں نے زندگی کے پھیلاؤ اور اُس کی گہرائی پر احاطہ کرنے کی طرح ڈالی اور اُردو ناول کو اُس کے بالکل ابتدائی دور میں ایک ایسی روایت سے آشنا کیا جسےفنیعظمت کا پیش خیمہ کہنا چاہئے ۔ سرشار نے لکھنؤی معاشرے کو اپنا موضوع بنایا اور اس موضوع کو منتخب کر لینے کے بعد اس بات کو اپنا منصب جانا کہ اس معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کی اس طرح مصوری کریں کہ دیکھنے والے ان سب پہلوؤں کو جیتا جاگتا اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں — ایک مخصوص معاشرے کا سارا پھیلاؤ ، اُس کی ساری گہرائی اور اُس کی ساری پیچیدگی مجسم اور بے نقاب ہو کر سامنے آ جائے اور ناظر سے کہے کہ " دیکھو ، یہ میں ہوں — اب میرا کچھ تم سے چھپا ڈھکا نہیں ۔ میرا ظاہر ، باطن سب تم پر عیاں و آشکارا ہے " ۔

' فسانۂ آزاد ' اُردو ناول کی تاریخ میں اسی لئے زندہ رہے گا کہ ایک خاص عہد کا لکھنؤ اُس کی بدولت زندہ ہے اور اس لئے زندہ ہے کہ ناول نگار نے اس کا پوری طرح مشاہدہ کیا ہے ، اس کے گوشے گوشے میں جھانک کر اُس کی ہر چھپی ہوئی چیز کو باہر نکالا ہے ، اور اس کی مجلسوں میں پوری بے تکلفی سے شریک ہو کر اُس کے مزاج کی نزاکتوں میں دخل حاصل کیا ہے اور یوں پوری طرح اُس کا ہمدم و ہم راز بن کر اُس کے بھید کھولے ہیں ۔ لکھنؤی معاشرے کے جسم و جان میں دوڑتے ہوئے خون کی روانی مصنف نے اُس کی نسوں میں چھپ کر دیکھی اور اُس کے دل کی دھڑکنیں سینے میں سما کر سنی ہیں — ایک مخصوص موضوع کا انتخاب ، اس موضوع میں پوری طرح جذب ہو کر گہری نظر سے اس کے ہر پہلو کا مشاہدہ اور پورے انہاک کے ساتھ اس کی ایسی مصوری کہ ہر خط و خال نمایاں ہو کر سامنے آ جائے ۔ فسانۂ آزاد کا دیا ہوا یہ سبق اُردو ناول نگاری کی روایت کا ایک اہم جزو بن گیا ہے — " زندگی — وسیع ، گہری اور بھر پور زندگی ناول کا موضوع ہے "۔

موضوع سے پوری واقفیت ، مشاہدے کی گہرائی ، زندگی کی وسعت اور گہرائی کا احساس اور ایک مخصوص معاشرے کی مکمل ترجمانی — ان چیزوں کے علاوہ فسانۂ آزاد میں

اور بھی بعض چیزیں ہیں جن سے ناول کے فن کی روایت کو کچھ حاصل ہوا ہے ۔ سرشار نے داستانوں کی چھوڑی ہوئی روایت کے راستے پر چل کر ہمیں کئی ایسے کرداروں سے متعارف کرایا ہے ، جو ایک مخصوص مزاج اور ایک طبیعت کے حامل ہونے کے باوجود مثالی ہیں ۔ اُن کی حرکات و سکنات میں کہیں کہیں ایک ایسی بات آ جاتی ہے کہ پڑھنے والے کو اُن کے صحیح ہونے میں شبہ ہونے لگتا ہے ۔ لیکن ان بہت سے ''مشکوک'' اور ''مشتبہ'' کرداروں کی بھیڑ بھاڑ میں سے ایک کردار یوں اپنی واضح شخصیت کی نمائش کرتا ہوا باہر نکلتا ہے کہ دیکھنے والے فوراً اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔ اُسے دیکھتے ہی اُس سے قرب حاصل کرنے کی خواہش اُنہیں بے تاب کرتی ہے اور یہ خواہش اُنہیں ہر جگہ اس کردار کے ساتھ لئے لئے پھرتی ہے ۔ وہ اُس کی ہر بات میں لطف لیتے ہیں ، اُس کی خوشیوں میں ، اُس کے غموں میں ، اُس کی ہنسی میں ، اُس کے رونے میں ، اُس کی سنجیدگی میں اور اُس کے مسخرے پن میں برابر کے شریک ہوتے ہیں ۔ جب تک کتاب ختم نہیں ہو جاتی وہ اُس کے ساتھ رہتے ہیں اور جب کتاب ختم ہو چکتی ہے تو اُس کی یاد کو ہمیشہ کے لئے اپنا ساتھی بنا لیتے ہیں ۔ وہ اُسے کبھی نہیں بھولتے — یہ کردار خوجی کا ہے ۔ اور یہ کردار ناول نگاری کے فن کی روایت کا ایک ناقابلِ فراموش عنصر ہے ۔ اس کردار نے مستقبل کی ناول نگاری کو ایک بہت ضروری سبق سکھایا ہے — ''ہر اچھے ناول کے ساتھ ایک ناقابلِ فراموش کردار کی تخلیق''۔ ناول نگاری کے سلسلے میں سرشار نے فن کو ایک بات اور بھی دی ہے ۔ لکھنؤی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی مصوری کرتے ہوئے ، اور اس معاشرے کے مزاج کی عکاسی کرنے کے سلسلے میں اُنہیں بہت سے ایسے کرداروں کا تعارف کرانا پڑا ہے جو زندگی کے ایک خاص پہلو کے ترجمان ہیں ۔ یہ سب کردار اپنی وضع قطع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں ۔ ان کی حیثیت types کی سی ہے ۔ مختلف نواب ، اُن کے مختلف مصاحب اور حاشیہ نشین ، سب کی وضع اور مزاج ایک سے ہیں ۔ لیکن سرشار کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے ان مماثل کرداروں کی یکسانی کے باوجود اُن میں ہر جگہ ایک انفرادی رنگ بھی نمایاں کیا ہے اور اس طرح کردار اپنی وضع کے دوسرے کرداروں کے رنگ میں رنگا ہوا ہونے پر بھی اپنا ایک خاص رنگ رکھتا ہے — مماثلت اور یکسانی میں بھی انفرادیت کی ایک شان موجود ہے ۔ اُردو ناول کی روایت کے ارتقا میں یہ بھی ایک نئی چیز ہے ۔

فسانۂ آزاد کے مصنف نے ناول نگاری کے فن اور اس کی روایت کو ایک ایسی بیش بہا دولت دی ہے جس کا اب بھی وہ بلا شرکت غیرے مالک ہے ۔ نذیر احمد کے ناولوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ نذیر احمد نے قصہ کے کرداروں اور قصہ کے قاری کے درمیان کبھی یگانگت اور بے تکلفی کا رشتہ قائم نہیں ہونے دیا ۔ نذیر احمد کو ، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے قاری کی ذہانت پر ذرا بھی بھروسہ نہیں ۔ وہ جیسے ہر گھڑی اس اندیشے میں مبتلا رہتے ہیں کہ اگر اُنہوں نے قاری کو اپنے قصہ کے کرداروں کے ساتھ تنہائی میں چھوڑ دیا تو وہ آپس میں کوئی ایسی سازش کرلیں گے جس سے اُن کے اصلاحی مقصد کو نقصان پہنچے گا ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہر صورت دونوں کے درمیان حائل رہتے ہیں ، دونوں پر اپنی برتری کا غلبہ رکھنا چاہتے ہیں ، اور اپنا کام یگانگت ، دوست داری اور شفقت کے بجائے رعب سے نکالنا چاہتے ہیں — یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مصنف کے مقصد کے لئے اس طرح کا انداز نظر مفید ہونے کے بجائے مضر ہے ۔

سرشار نے قصہ کے کرداروں اور قاری کے اس باہمی رشتے کی نزاکتوں کو پوری طرح محسوس کیا ہے ۔ نذیر احمد کی طرح اپنے آپ کو کسی اُونچی سطح پر رکھنے کے بجائے وہ اپنے آپ کو ، اپنے اہم کرداروں کو اور ناظر کو ایک ہی زنجیر کی کڑیاں سمجھتے ہیں ۔

کرداروں کی چھوٹی بڑی کوئی بات ایسی نہیں جو قاری کی نظر سے چھپی ہوئی ہو ، وہ اُس کی ہر اچھائی برائی میں اُس کا ہم راز بھی ہے اور ہمدم و دمساز بھی ۔ رقص و سرود کی محفلوں میں ، شعر و شاعری کی بزموں میں وہ دونوں سر سے سر جوڑ کر اور شانے سے شانہ ملا کر بیٹھتے ہیں ، ہنسی مذاق ، فقرے بازی ، پھبتی ، ضلع جگت ، ہر چیز میں بے تکلفی کے روابط قائم رکھتے ہیں ۔ سڑکوں پر ، گلی کوچوں میں ، میلوں ٹھیلوں میں ، ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے اور زندگی سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں ۔ دونوں میں سے کوئی ، کسی معاملے میں آپس میں بخل برتنے کا قائل نہیں ۔ اس حد درجہ کی بے تکلفی اور یگانگت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ قاری کو قصہ کے اہم کرداروں کی بری بات بھی بری نہیں معلوم ہوتی ۔ وہ ایک دوست کی طرح اُس کی اچھی باتوں کو زیادہ اچھا اور بری باتوں کو گوارا سمجھ کر قبول کرتا ہے اور اس لئے قاری اور کرداروں میں کبھی ایک لمحے کے لئے بھی بعد و بیگانگی نہیں پیدا ہوتی ۔ مصنف کے لہجے کی بے تکلفی اور کہیں کہیں بے باکی قاری اور کرداروں کی اس یگانگت کو استوار کرنے میں اور بھی زیادہ مدد دیتی ہے ۔

سرشار کے ساتھ ھی ساتھ شرر نے اُردو میں ناول نگاری کی ایک نئی روش کا آغاز کیا ۔ شرر نے اُردو میں تاریخی ناول لکھنے کی ابتدا کی اور اس روش کو ایک واضح نصب العین کے ماتحت استعمال کیا* ۔ جس طرح نذیراحمد اپنے ناولوں کے ذریعے سے مسلمانوں کے متوسط طبقے کو اُبھار کر معاشرتی ، اخلاقی اور معاشی نقطۂ نظر سے اس قابل بنانا چاہتے تھے کہ وہ مستقبل کا مقابلہ یقین اور اعتماد کے ساتھ کر سکیں ، اسی طرح شرر عظمت ماضی کی داستانیں دھرا کر مسلمانوں کے دل میں وہ جوش اور ولولہ پیدا کرنے کے خواہش مند تھے جو افسردہ دلوں کی راھنمائی کر کے اُنھیں عمل کے راستے پر گامزن کر سکے اور اس طرح اُن کے لئے ایک روشن مستقبل کی راھیں استوار کر سکے ۔

شرر کا مخاطب کسی محدود طبقے سے نہیں بلکہ پوری قوم سے ہے اور ایک ایسی قوم سے ہے جس کے زیادہ افراد علم و فن سے بے تعلقی کی بنا پر فن کے بلند اور نازک معیاروں سے پوری طرح آشنا نہیں ہیں اس لئے اس بڑی جماعت کو اپنا ہم خیال اور ہم نوا بنانے کے لئے فن کے ایسے معیار تلاش کرنے کی ضرورت تھی ، جو فوری تاثر کے حامل ہوں ۔ یہی وجہ ہے کہ شرر نے اپنی ناول نگاری میں فن کا وہ راستہ اختیار کیا جو ذہن کو کسی آزمائش میں مبتلا کئے بغیر اور فنی احساس کے نازک ، پیچیدہ اور کبھی کبھی پُر خطر مرحلوں سے گزارے بغیر اُس کے لئے شدید تاثر اور لطیف انبساط کا باعث بن سکے ۔ شرر کے پہلے ناول کے قسط وار دل گداز میں شائع ہونے ھی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُنھیں اپنے رسالے کے قاری کی پسندیدگی اور خوشنودی باقی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے ۔ یہ پسندیدگی اور خوشنودی صرف

---

* ۱۸۸۸ء کے دلگداز میں جب ' ملک العزیز ورجنا ' چھپ چکا تو شرر نے اس کے خاتمہ پر یہ عبارت لکھی :

" غالباً اردو میں اپنی طرز کا یہ پہلا ناول ہے ۔ ھمارے مسلمان دوستوں نے اس ناول کو حد سے زیادہ پسند کیا ۔ اس ناول نے قوم اسلام کے وہ کارنامے دکھائے جو بجھے ہوئے جوشوں اور پژمردہ حوصلوں کو از سر نو زندہ کرسکتے ہیں ..."

" ھمارے قدر افزا اور دلگداز کے قدردان گواہ ہیں کہ اس کا ہر ہر جملہ رگ حمیت اسلامی کو جوش میں لاتا تھا اور یقین ہے کہ وہ حضرات جنھوں نے غور سے اور شوق سے اس ناول کو اول سے آخر تک ملاحظہ فرمایا ہوگا ان کے دلوں میں قومی خون جوش مار رھا ہوگا اور وہ ترقی پر تلے بیٹھے ہوں گے "۔

اسی صورت میں حاصل کی جا سکتی ہے کہ اسے جو کچھ پڑھنے کو دیا جائے اسے پڑھتے وقت وہ کسی طرح کا بوجھ محسوس نہ کرے ، اور بوجھ محسوس کئے بغیر بھی اپنے دل میں ان جذبات کے تموج سے متاثر ہو جو ناول نگار کا مقصود و مطلوب ہیں -

پھر ایک بات اور بھی ہے - شرر نے ناول کو اپنے خیالات اور تصورات یا یوں کہئے کہ اپنے اصلاحی مقصد کو دوسروں تک پہنچانے کا وسیلہ بنایا تو یہ بات شروع ہی سے پیش نظر رکھی کہ ناول کے کچھ فنی مطالبات ہیں اور جب تک ناول نگار ان مطالبات کو پورا نہ کرے اس کی بات مؤثر اور دل نشین نہیں ہو سکتی - اسی لئے انہوں نے اپنے ناول میں ان شرائط کی پیروی ضروری سمجھی جنہیں ناول نگاری کے فن کے مبادیات کہا جا سکتا * - اور اس طرح گویا شرر اردو کے پہلے ناول نگار ہوئے جنہوں نے بالارادہ ناول کے فن کو اردو میں برتنا شروع کیا - ان کے پہلے ہی ناول پر نظر ڈالنے کے بعد ، ناول کا فنی تجربہ کرنے والا آسانی سے محسوس کر لیتا ہے کہ شرر نے فن (یا تکنیک) کے ضروری لوازم کو بالالتزام برتا ہے - ملک العزیز ورجنا میں (ان خامیوں سے قطع نظر جو ایک تاریخی ناول کی حیثیت سے اس کتاب میں نظر آتی ہیں) پلاٹ ، کردار نگاری اور واقعہ نگاری کے وہ سارے اصول موجود ہیں جن کی تلقین و تبلیغ فن کے پرستار کرتے ہیں - شرر کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ ناول کا پلاٹ واقعات کی ایک ترقی پذیر (یا ارتقائی) صورت ہے - ناول میں کہانی ایک دلچسپ اور دل نشین تمہید سے شروع ہوکر مختلف مرحلے اور منزلیں طے کرتی ہوئی ایک منطقی انجام تک پہنچتی ہے - ان مرحلوں اور منزلوں سے گذرتے وقت کبھی کبھی ایسے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ، اور یہی دشواریاں قاری کے اشتیاق کو بیدار کرتی اور اس کے دل میں انجام تک پہنچنے کی خواہش پیدا کرتی ہیں † — پلاٹ کے ارتقا اور کردار کے احساس و عمل میں جو لازمی تعلق ہے اس کے آثار بھی اس ناول میں موجود ہیں - (یہ بات اور ہے کہ ناول نگار آسانی سے خوش اور مطمئن ہو جانے والے قاری کے مزاج سے واقف ہونے کی بنا پر کرداروں کی گفتگو اور عمل میں غیر معمولی جوش پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح اس کے کردار حقیقت اور صداقت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے نظر آنے کے بجائے ناول نگار کے تخیل اور تصور کی رنگینی میں ڈوبے دکھائی دیتے ہیں) - کہانی میں (اور خاص کر ناول کی کہانی میں) مقالمے کی جو اہمیت ہے اس کا اظہار بھی شرر کے اس ناول میں پہلے پہل ہوتا ہے ، اس لئے کہ نذیر احمد اور سرشار نے کثرت سے مقالموں کا استعمال کرنے پر بھی ان سے کہانی کو آگے بڑھانے یا کرداروں کے ماضی کے نقوش کو ابھارنے کا کام نہیں لیا -

شرر نے ناول نگاری کے فن کے مبادیات کے برتنے کی اہمیت بھی محسوس کی ہے اور فن کے ان مطالبات کو مشرقی مزاج اور اس کی پسند کے سانچوں میں ڈھال کر ناول نگاری کے فن میں

---

* شرر نے بعض موقعوں پر ناول نویسی کے متعلق اپنے خیالات کی وضاحت کی ہے - یہ خیالات وقتاً فوقتاً دلگداز کے پرچوں میں چھپتے رہے ہیں اور اب ان کے مضامین کے چوتھے حصے میں شامل ہیں -

† فن کے اس پہلو کو سامنے رکھ کر شرر کے ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں سے اکثر میں یہ خرابی نظر آتی ہے کہ کہانی کا انجام واقعات کی اس روش کا لازمی (اور منطقی) نتیجہ نہیں معلوم ہوتا جس پر کہانی شروع سے چلتی رہی ہے - یہ کمزوری ظاہر ہے کہ ناول نگار کی اس خواہش کا نتیجہ ہے کہ وہ قاری کو ایک مسرت آگیں انجام کے ذریعے سے خوش کرنا چاہتا ہے - اس کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ حق اور صداقت کو بہر صورت مظفر و کامیاب دکھانا مقصود ہوتا ہے -

ایک نئے دور کا آغاز کیا ۔ اور اس کے باوجود کہ اُن کے ناول مجموعی حیثیت سے (اس ضمن میں اُن کے وہ ناول بھی آتے ہیں ، جو فنی اعتبار سے نسبتاً بہتر ہیں) فن کا کوئی اونچا معیار پیش نہیں کرتے ، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شرر نے اردو میں ناول نگاری کو ایک مسلمہ فن کی طرح برتنے کی طرح ڈالی ۔ اور ناول نگاری کی تاریخ میں اس روش اور روایت کا آغاز کیا کہ جب کوئی اپنے مقصد کے اظہار کے لئے اس مخصوص صنف ادب کو اختیار کرے تو یہ بات ہرگز نہ بھولے کہ کہانی کی دوسری قسموں (اور خصوصاً داستان) سے الگ اس کا ایک فن ہے ، جو اس صنف اور دوسری اصناف میں فرق اور امتیاز پیدا کرتا ہے — اور پھر یہ کہ مغرب سے آئے ہوئے اس فن کو برتتے وقت اپنے قاری کی پسند ، مذاق اور مزاج کو ہرگز نظر انداز نہ کیا جائے ۔ اسی پسند ، مذاق اور مزاج کو پیش نظر رکھ کر شرر نے اپنے ناولوں میں پُر تکلف منظر نگاری ، رنگین اشعار ، زبان کے لطف ، چاشنی اور چٹخارے اور ایک خاص قسم کی انشا پردازی کو اس طرح جگہ دی ہے جیسے یہ بھی فن کے لازمی اور ناگزیر تقاضے ہیں — مغربی فن کے مبادیات اور مشرقی مزاج کی شوخی اور رنگینی کا امتزاج شرر کی قائم کی ہوئی روایت ہے اور اس روایت کی پیروی اور تقلید ہمارے ناول نگاروں نے جتنی زیادہ کی ہے کسی اور روایت کی نہیں کی ۔

نذیر احمد ، سرشار اور شرر ہماری ناول نگاری کی تاریخ میں فنی روایت کے پیش رو ہیں ۔ ان تین ابتدائی ناول نگاروں نے اپنے ادراک کی دور بینی سے قصہ گوئی کی دنیا میں ایک نئی ڈگر کا کھوج لگایا اور اپنے فنی عمل کے ذریعے سے اس ڈگر میں ایسی شمعیں روشن کیں جنہوں نے ہر آنے والے کی راہ روشن کی ۔ مراۃ العروس ، بنات النعش ، توبۃ النصوح ، ابن الوقت ، فسانۂ مبتلا ، فسانۂ آزاد ، ملک العزیز ورجنا وغیرہ راہ فن کی بھی روشن شمعیں ہیں ۔ ان شمعوں کی روشنی میں آنے والے راہی کو قصہ گوئی کی روایت کے ابتدائی آثار صاف نظر آتے ہیں ۔ نذیر احمد کے قصوں کو پڑھ کر ہم پر پہلے پہل قصہ گوئی کے وسیع امکانات واضح ہوتے ہیں ، ہمیں پہلی مرتبہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قصہ فرد اور معاشرے کی زندگی میں اصلاح کا ایک موثر ذریعہ بن سکتا ہے ، قصہ فوق الفطرت عناصر اور تخیل اور تصور کی رنگینی کے سہارے کے بغیر بھی قصہ بن سکتا ہے ، دیکھی بھالی اور سیدھی سادی سچی زندگی کو بھی قصہ کہانی کا موزوں پس منظر بنایا جا سکتا ہے ۔ قصہ کہانیوں میں ایسے کردار بھی فعل و عمل کا سر چشمہ بن سکتے ہیں ، کہانی کی ساری گہما گہمی ، ساری رونق اور ساری ہلچل ایسے انسانوں سے ہو سکتی ہے جو ہمارے دیکھے بھالے ہیں ، سرشار کے ضخیم قصہ کو پڑھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کی پوری وسعت ، گہرائی اور پیچیدگی قصہ کے مختصر پیمانے میں سما سکتی ہے ۔ قصہ ایک خاص معاشرے کے ہر تار کو اس طرح اپنے تانے بانے میں پرو سکتا ہے کہ یہ معاشرہ زندۂ جاوید ہو جائے ، قصہ بہت سے مثالی اور مماثل اور یکساں کرداروں کے ساتھ ایک ایسے کردار کو بھی جنم دے سکتا ہے جسے انسان ایک ناقابل فراموش یاد کی طرح ہمیشہ اپنے دل میں جگہ دیتا ہے ۔ شرر کے ناولوں کے مطالعہ سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ قصہ کہانی کی دوسری قسموں سے الگ ناول کا ایک علحدہ فن ہے اور ناول نگار جب اس فن کو اختیار کرتا ہے تو اسے اس کے بنیادی مطالبات پورے کرنے پڑتے ہیں — اور ان سب باتوں سے الگ تینوں ناول نگاروں نے اپنے اپنے مخصوص انداز کے ناول لکھ کر یہ روایت بھی قائم کی ہے کہ مغربی فن کی پیروی کے ساتھ ساتھ لکھنے والے کے لئے اس قاری کے مذاق اور مزاج کو بھی پیش نظر رکھنا ناگزیر ہے جس کے لئے وہ ناول لکھ رہا ہے — اسی مزاج اور مذاق کا احترام ہے جس کی بنا پر ہمارے ان تین ناول نگاروں نے ناول نگاری میں ادبیت کی ایک روایت قائم کی ہے ۔ بیان میں شاعرانہ رنگینی اور انشا پردازی کی شان ، سادگی کی جگہ ادبی تکلف کی

چاشنی ، مزاج کی شوخی اور شگفتگی ، اشعار کا بر محل استعمال ، محض لطف کی خاطر زبان کا چٹخارہ ، منظر نگاری میں واقعیت کے بجائے شعریت کا پرتو — یہ سب ہمارے ناول کی ابتدائی فنی روایت کے ضروری عناصر ہیں ، جن کی بدولت مغرب کے سائنٹفک فنی مزاج اور مشرق کی ادبی اور شاعرانہ فطرت میں امتزاج پیدا ہوا ہے ۔

اور پھر ناول نگاری کی روایت کے ان پیش روؤں کے بعد ناول نگاری کا ایک ایسا دور آیا جسے ابتدائی فنی روایت کی تقلید اور پیروی کا دور کہنا چاہیے ۔ اس دور میں نذیر احمد ، سرشار اور شرر کی شروع کی ہوئی روایت کی پیروی بھی ہوئی اور اسے جلا بھی ملی — راشدالخیری ، منشی سجاد حسین اور محمد علی طبیب اسی روایت کے پیرو اور علمبردار بھی ہیں اور انہوں نے اس روایت کو زیادہ مستحکم بنانے کی خدمت بھی انجام دی ہے ۔

راشد الخیری کے پورے فن کی بنیاد نذیر احمد کی دی ہوئی اس روایت پر ہے ، جس کا آغاز مراۃالعروس اور بناۃالنعش سے ہوا ۔ فرق صرف یہ ہے کہ نذیر احمد نے عورت کی اصلاح کو ایک وسیع تر اصلاحی پروگرام کا جزو بنا کر پیش کیا ہے اور راشد الخیری نے اس کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اس کی معاشرتی حیثیت کے بلند کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے ۔ نذیر احمد نے عورت اور اس کے مسائل کو ایک ایسے مصلح کی طرح دیکھا تھا جو اسے پورے معاشرتی نظام کا ایک حصہ سمجھتے ہیں اور اس اپنے معاشرے کی اغراض کی خاطر اس کی اصلاح کے خواہاں ہیں ۔ اس کے برخلاف راشدالخیری نے عورت کے مسائل کو عورت کی نظر سے دیکھا اور اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ بنا کر اس کا مداوا تلاش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس کوشش میں ان کی نظر اس کی زندگی کے ہر پہلو پر گئی ہے اور اس طرح پہلی مرتبہ ہمارا ادب عورت کی معاشرتی حیثیت کا صحیح مصور اور مفسر بننے کے علاوہ اس کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا آئنہ دار بنا ۔ اور یوں زندگی کا ایک ایسا گوشہ جس پر اب تک لوگوں کی نظر پوری طرح نہیں گئی تھی ایک اچھے ادیب اور ناول نگار کے صحیح اور باریک بین مشاہدے کی وساطت سے جیتا جاگتا ہو کر سامنے آیا ۔ اور اس طرح ہماری ناول نگاری میں موضوع کی وہ تخصیص جس کی ابتدا سرشار نے کی تھی عام ہونی شروع ہوئی ۔

راشد الخیری کے ناول یوں بظاہر نذیراحمد کی پیروی و تقلید اور ان کے مخصوص انداز کی صدائے بازگشت ہیں لیکن حقیقت میں انہوں نے ہماری ناول نگاری میں کسی خاص معاشرے یا گروہ کی ہمدردانہ حمایت کی روش کی بنا ڈالی ۔ کوئی ناول نگار جب تک کسی خاص فرد ، جماعت یا گروہ یا معاشرے اور اس کے مسائل کے ساتھ صحیح ہمدردانہ نقطۂ نظر نہ پیدا کرے اور اس کے غموں کو اپنے دل کا ناسور نہ بنائے وہ اس تجزیاتی مشاہدے کی طرف مائل نہیں ہوتا جس سے اچھے ناول کا واقعاتی پس منظر بنتا ہے ۔ راشدالخیری کے ناول اسی مخصوص نقطۂ نظر کے حامل اور ترجمان ہیں ۔

سجاد حسین کے ناولوں میں صاف اسی روش کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو فسانۂ آزاد کی مقبولیت اور اس کی عظمت کا باعث بنی ۔ ایک مخصوص معاشرہ ، اس مخصوص معاشرے کے امتیازی اور منفرد کردار اور ان دونوں چیزوں سے مل جل کر بننے والی ایک ہلکی پھلکی لیکن زندگی کی صداقتوں اور حقیقتوں سے مملو فضا ان ناولوں کی خصوصیات ہیں ۔ حاجی بغلول اور طرحدار لونڈی میں یہ ساری چیزیں ایک جگہ جمع ہیں — مصنف کے مزاج اور فکر و احساس کا امتیازی عکس البتہ ان ناولوں میں بھی موجود ہے ۔ زبان و بیان پر زیادہ عبور ، بہت سی تفصیلات میں سے چند کو منتخب کر کے کہانی کو انہیں کے محور پر گھمانا ، کرداروں کے مکالمے کو ایک واضح اور معین صورت دینا ، اور بکھری ہوئی چیزوں کو ایک ہی لڑی میں پرونا ، ان ناولوں کی مستزاد صفات ہیں ۔

ناول نگاری کے اس تقلیدی دور میں راشدالخیری اور سجادحسین نے ایک خاص روش سے متاثر ہو کر بھی اپنا مخصوص رنگ قائم کیا ہے اور اس لئے اُنہیں ناول کی تاریخ میں ایک منفرد مقام ملا ہے ، لیکن محمد علی طبیب نے شرر کی تقلید میں جو کچھ لکھا ہے اُس میں کسی انفرادیت کی نمایاں کمی ہے ۔ اُن کے ناول شرر کے طرز کا ایک ایسا چربہ ہیں جن میں نام کو بھی کوئی الگ رنگ نہیں جھلکتا — ایک چیز البتہ ایسی ہے جس میں شرر کی تقلید بہت موثر اور دل کش ثابت ہوئی ۔

شرر نے ناول کو ایک خاص قسم کے اصلاحی ، تبلیغی اور قومی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنانے کے ساتھ ساتھ اُسے فنی اور ادبی اقدار کا حامل بنایا ۔ فنی اقدار مغرب کے اثر کا نتیجہ تھیں اور ادبی اقدار مشرقی مزاج اور مذاق کا عکس اور پرتو ۔ مشرقی مزاج اور مذاق کی تسکین کی خاطر شرر نے ناول کے لئے جو ادبی اقدار مہیا اور یکجا کیں، وہ اُردو ناول کی ایک مستقل روایت بن گئیں ۔ آگے چل کر ان اقدار نے ہمارے ناول پر جو گہرا نقش بٹھایا اس سے قطع نظر شرر کے فوراً بعد (بلکہ خود اُن کے زمانے ہی میں) بعض ادیبوں نے ناول نگاری کو اس لئے اختیار کیا کہ اُس میں اُنہیں مشرق کے ادبی اور شاعرانہ مزاج کی تشفی کے وسیع امکانات نظر آئے ۔ ہندوستان (اور خاص کر اودھ) کی مجلسی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں میں جو تہذیبی کشش ہے وہی کشش ان مجلسی ناولوں کا پس منظر اور موضوع ہے ۔ سجاد حسین کسمنڈوی کے معروف ناول ' نشتر ' کے علاوہ ، آغا شاعر، ریاض خیر آبادی ، شاد عظیم آبادی ، شوق قدوائی ، سلطان حیدر جوش اور قاری سرفرازحسین کے ناول اس ضمن میں آتے ہیں ۔ ان ناولوں کو زمانہ نے فراموش کر دیا ۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان سب ناولوں کے مخاطب ایک ترقی یافتہ ادبی اور تہذیبی مذاق کے قاری ہیں ۔ ان ناولوں سے عوام کے مذاق کی تشفی نہیں ہوتی ۔

تقلیدی اور ادبی ناول نگاری کے اس دور کا شباب بیسویں صدی کے ابتدائی چند سال ہیں ۔ اور یہی زمانہ ہے جب اُردو میں دو ایسے ناول لکھے گئے* جنہوں نے ہمارے ناول کو فنی حیثیت سے ایک ہی جست میں کہیں سے کہیں پہنچا دیا ۔ ہمارے ناول نے اب تک زندگی اور فن کے درمیان جو رشتہ استوار کیا تھا وہ بالکل سیدھا سادا تھا — اس رشتہ میں نہ زندگی کی پیچیدگیاں تھیں اور نہ فن کی نزاکت اور لطافت ۔ فن کاروں نے زندگی کے خارجی مظاہر کو دیکھ کر اُنہیں کہانی کی شکل دے دی ۔ انہیں خارجی مظاہر میں اُلجھے ہوئے کرداروں کو کہانی میں چلتا پھرتا دکھا دیا ۔ منظر نگاری کے حسن سے پڑھنے والوں کا جی خوش کر دیا ، کسی خاص معاشرے کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرکے واقع نگاری کا حق ادا کر دیا ۔ مختلف قسم کے ادبی اور شاعرانہ وسیلوں سے کام لے کر پڑھنے والے کے لئے عارضی طور پر ذہنی لذت کا سامان مہیا کر دیا ، اور زیادہ سے زیادہ اجتماعی زندگی کے کسی مسئلے کی طرف متوجہ کرکے اصلاح کی خدمت انجام دے دی ۔ ہمارے ناول نگار ناول کے فن کو اب تک اس سے آگے نہیں بڑھا سکے تھے ۔ اجتماعی زندگی کے بظاہر چھوٹے چھوٹے مسائل کس طرح معاشرے کا ناسور بن جاتے ہیں ، اور کس طرح یہ ناسور جماعتی زندگی کے ساتھ فرد کے دل و جگر کو رستا ہوا زخم بنا دیتے ہیں ، اس کی طرف ہمارے ناول نگاروں نے اب تک توجہ نہیں کی تھی ۔ انسان کی ظاہر بیں نظر زندگی میں جو کچھ ہوتا دیکھتی ہے اُس کے سیاسی معاشرتی اور معاشی محرکات کیا ہیں ، اسے ناول نگاروں نے اب تک قابل اعتنا نہیں جانا تھا ۔ فرد جو کچھ کرتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے اُس کے پردے میں کیا چھپا ہوا ہے ، اُس تک اب تک اُن کی نظر نہیں گئی تھی ۔ چشم و ابرو کی ایک ہلکی سی جنبش ،

---

* مرزا رسوا کا ' امراؤ جان ادا ' اور مرزا محمد سعید کا 'خواب ہستی' ۔

ہاتھ پیروں کی ایک معمولی سی حرکت اور زبان سے نکلا ہوا بظاہر ایک بےضرر سا لفظ اور فقرہ ، دل کی کتنی دھڑکنوں کا غماز اور سینے کے کتنے رازوں کا امین ہے ، اس کی ہمارے ناول نگاروں کو اب تک خبر نہیں ہوئی تھی - اور اس لئے نذیر احمد ، سرشار ، شرر - راشد الخیری ، محمد علی طبیب اور منشی سجاد حسین — آغا شاعر ، ریاض خیر آبادی ، قاری سرفراز حسین اور سلطان حیدر جوش — ان سب کے ناولوں میں زندگی کا تنوع بھی ہے ، اس کا پھیلاؤ بھی ہے ، اور کہیں کہیں اس کی گہرائی بھی ہے ، لیکن زندگی کے تنوع اور رنگینی اور اس کی وسعت اور گہرائی کو فن کی نزاکتوں اور لطافتوں میں کس طرح سمویا جاتا ہے ، اس کا سراغ ان میں صرف کہیں کہیں ملتا ہے - ان رنگینیوں ،گہرائیوں ، لطافتوں اور نزاکتوں کو امراؤ جان ادا اور خواب ہستی میں شیر و شکر کیا گیا ہے - اجتماعی اور انفرادی عمل کے محرکات کو لکھنے والوں نے پہلے پہل کہانی کا موضوع بنایا ہے اور اس طرح ان دو ناولوں سے ہماری ناول نگاری میں نفسیاتی اور تجزیاتی ناول کا آغاز بھی ہوا اور ادبی اور شاعرانہ قدروں کو ایک وسیع تر مفہوم بھی ملا -

امراؤ جان کا پس منظر لکھنؤ کا وہی انحطاط پذیر معاشرہ ہے جس کی مصوری سرشار نے فسانۂ آزاد میں کی ہے اور اس طرح کی ہے کہ اس معاشرے کے جسم و جان کو حیات جاوداں حاصل ہوگئی ہے - لیکن فسانۂ آزاد ایک مخصوص معاشرے کے بے شمار اور گوناگوں پہلوؤں کا مرقع ہونے کے باوجود فن کے اس توازن ، نزاکت ، لطف اور حسن سے عاری ہے جس سے کوئی ادبی اور فنی تخلیق گہرے اور دیر پا تاثر کی حامل بنتی ہے - اس میں اس حسن تاثیر کی بھی شدید کمی ہے جو کسی ادبی اور فنی شہ پارہ کے مطالعے اور مشاہدے کا فوری نتیجہ ہوتی ہے اور جسے اصطلاح میں مجموعی تاثر کہا جاتا ہے - یہ مجموعی تاثر عموماً دو باتوں سے پیدا ہوتا ہے — ادبی اور فنی تخلیق کے مختلف عناصر و اجزا کے درمیان صحیح قسم کے ربط و تعلق سے ، اور فن کار کے موضوع اور اس کے فکر ، تخیل اور احساس کے باہمی مکمل امتزاج سے - مثلاً جب تک ناول کا پلاٹ ، اس کے کردار اور مصنف کا نقطۂ نظر اس طرح ایک دوسرے سے شیر و شکر نہ ہو جائیں کہ ایک کی ہستی دوسرے میں جذب ہوکر باہمی نمو اور ارتقا کا سامان مہیا کرے ، اور کسی کو ان میں سے کسی ایک چیز کے دوسری سے الگ ہونے کا احساس تک نہ ہو ، اس وقت تک ناول ایسی کشش کا باعث نہیں بن سکتا کہ وہ قاری کو کسی اور طرف متوجہ نہ ہونے دے - یہ ساری باتیں فسانۂ آزاد میں مفقود ہیں اور امراؤ جان ادا کی ساخت اور اس کے رگ و پے میں سمائی ہوئی ہیں - ایک پھیلی ہوئی زندگی کے اچھے اور برے سارے پہلوؤں کی تفصیلات کا بغور مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے بعد اس میں سے صرف ایسی جزئیات کا انتخاب جن سے ایک خاص قسم کا تاثر پیدا کرنے میں مدد ملے ، ان جزئیات میں صحیح منطقی ، لیکن فن کارانہ ربط اور تعلق پیدا کر کے اس تاثر کو شدید تر بنانا ، اپنے مواد کو فکر ، احساس اور تخیل کے رنگ میں پوری طرح جذب ہونے کا موقع دینا اور پھر جب خارجی حقیقتیں اور داخلی کیفیتیں ایک دوسرے میں شیر و شکر ہوکر ایک جان دو قالب ہو جائیں تو انہیں غور و فکر کے بعد ایک فنی ترتیب دینا ،کرداروں کی ظاہری گفتار و رفتار میں کسی گہری جذباتی یا حسی حقیقت کی جستجو کرنا ، ہر قدم اور ہر لفظ کے پیچھے دل کی دھڑکنوں کا سراغ لگانا امراؤ جان کی فنی تشکیل ، تعمیر اور ترتیب کے سر چشمے ہیں - رسوا نے فلسفیانہ فکر ، نفسیاتی تجزیہ ، ادبی اور شاعرانہ ذوق اور فنی حسن ترتیب کو یکجا کر کے امراؤ جان ادا کو ناول نگاری کے فن میں بلندی ، تعمق ، ہمہ گیری ، لطافت و نزاکت اور ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ تاثیر کی اقدار کا حامل بنایا اور اس طرح ناول نگاری کا فن پہلی مرتبہ اس عروج پر پہنچا جہاں فلسفہ اور شاعری کی اعلیٰ

مدریں پوری طرح ایک دوسرے کی ہم نوا اور ہم عناں نظر آتی ہیں ۔ رسوا نے امراؤ جان ادا لکھ کر پہلی مرتبہ لکھنے والوں کو یہ سبق دیا کہ زندگی کے سیدھے سادے ، معمولی اور ظاہر غیر اہم مشاہدات کے پیچھے تہذیب ، معاشرت ، سیاست ، معیشت اور اخلاق اور بعض اوقات تاریخ کے حقائق پوشیدہ و پنہاں ہوتے ہیں ۔ انسان کے حال سے ہمیں ہمیشہ اس کے ماضی کا سراغ ملتا ہے ، اور ایک معمولی سے اشارے سے وضاحتوں اور صراحتوں کی ہزارہا کرنیں پھوٹتی اور انسان کے مشاہدہ ، تخیل ، تصور ، جذبہ اور احساس کی تاریک راہوں کو منور کرتی ہیں ۔

'خواب ہستی' اسی دور کا دوسرا ناول ہے جس میں مرزا محمد سعید نے ایک خاص زمانے کے معاشرتی انتشار کو واقعات کی شکل دے کر واضح کرنے کی طرف قدم اٹھایا ہے ۔ ناول نگار کی نظر انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے کے اس انتشار اور اضطراب پر ہے جس میں سیاست ، تہذیب اور معیشت سب اس طرح گھرے اور جکڑے ہوئے ہیں کہ ایک جز کو آسانی سے دوسری سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ پورا معاشرہ عمل اور رد عمل کے ایک سلسلے اور پیچیدہ دام میں اسیر ہے اور زندگی کی اضطراب انگیز اور انتشار آفریں پیچیدگی کا اثر فرد پر پڑتا ہے ۔ اس کے فکر اور احساس پر نادانستہ یہ چیزیں اپنا اثر کرتی رہتی ہیں ۔ وہ ایک نادان مکھی کی طرح آہستہ آہستہ خود کو مکڑی کے جال میں پھنساتا رہتا ہے اور اسے پتہ نہیں چلتا کہ کیا ہو رہا ہے ۔ یہاں تک کہ جال کے پھندے اتنے مضبوط ہو جاتے ہیں کہ نہ ان کا کھولنا آسان رہتا ہے نہ توڑنا ۔ لیکن انسان کی فطرت اس سے آزادی کے حصول کا تقاضا کرتی رہتی ہے ۔ وہ آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پیر مارتا اور اس طرح اپنی قید کو زیادہ مستحکم کرتا رہتا ہے ، اور جسم کے ساتھ دل اور دماغ بھی اسیر حلقۂ دام ہو جاتے ہیں ۔ یہاں تک کہ انتشار و اضطراب کی یہ کیفیت مستقل بن جاتی ہے ۔

ہمارے ناول نگاروں میں سے کسی نے اب تک زندگی کے مسائل کو اس طرح زندگی میں ڈوب کر اور فرد کے ذہن کو اس کی گہرائیوں میں جا کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی ۔ کسی لکھنے والے نے مشاہدات کا تجزیہ کر کے ان کی بنیادوں تک پہنچنے کی اہمیت کو نہیں پہچانا تھا ۔ کسی نے فرد اور جماعت کے باہمی رشتے کے ناگزیر قرب کو کہانی کا موضوع نہیں بنایا تھا —— اور سب سے بڑھ کر یہ ، کسی نے اس اہم مسئلہ کو کہانی کے فنی وسیلے سے حل کرنے کے امکان پر غور نہیں کیا تھا ۔

امراؤ جان ادا اور خواب ہستی دونوں فنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن دونوں نے آنے والے ناول نگار کو بعض مشترک سبق دئے ہیں —— ہر موضوع خواہ وہ کتنا ہی اہم ، کتنا ہی پیچیدہ اور کتنا ہی نازک اور لطیف کیوں نہ ہو کہانی کا موضوع بن سکتا ہے ۔ موضوع خواہ کچھ بھی ہو ناول نگار سے اس کی یہ طلب اور تقاضا ہے کہ وہ موضوع پر اپنے فکر ، تخیل اور احساس کا پورا رنگ چڑھائے —— وہ کہانی (یا ناول) لکھنے کے فن کو یہ سمجھ کر اختیار کرے کہ اس میں لکھنے والے کو پورا خون جگر کھپانا پڑتا ہے ۔ خون جگر کی رنگینی کے بغیر فن میں رچاؤ اور سوز احساس کے بغیر تاثیر کی تپش نہیں پیدا ہوتی —— موضوع پر پوری گرفت فن کار (یا ناول نگار) کے کام کی پہلی اہم منزل ہے اور یہ منزل صرف مشاہدے کے سہارے طے نہیں ہوتی ، مشاہدہ ، فکر اور احساس کی مکمل ہم آہنگی اس کی ناگزیر شرط ہے ۔ امراؤ جان ادا اور خواب ہستی دونوں نے اس ناگزیر شرط کو پورا کر کے فکر و احساس اور فلسفہ و شعر کو شیر و شکر کرنے کی روایت قائم کی ۔

اور اسی روایت پر پریم چند نے ، جو بلاشبہ ہمارے سب سے بڑے ناول نگار ہیں ،

ناول نگاری کے فن کا محل کھڑا کیا اور اُسے ہر طرح کے نقش و نگار سے آراستہ و پیراستہ کیا — پریم چند کی ناول نگاری کی ابتدا دو چار برس کے فرق سے اُسی زمانہ میں ہوئی جب امراؤ جان ادا اور خواب ہستی لکھے گئے ۔ اُن کے بالکل ابتدائی ناول خالص ہندو معاشرت اور اس معاشرت کے محدود اور مخصوص مسائل سے تعلق رکھنے والے اصلاحی ناول ہیں ۔ ان ناولوں کا پس منظر پریم چند نے ایسی زندگی کو بنایا ہے جس کا مشاہدہ انہوں نے بہت قریب سے کیا ہے اور جس کے دکھ درد میں در حقیقت اُن کے اپنے دکھوں کی کسک موجود ہے ۔ زندگی کی تخصیص کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پریم چند نے جو کچھ لکھا ہے اُس پر حقیقت اور صداقت کی مہر ثبت ہے ۔ واقعات کی رَو کے ساتھ ساتھ جو کردار ہمارے سامنے آتے ہیں وہ بھی زندگی کے بالکل صحیح نمونے ہیں ۔ اُن کی ہر اُلجھن اور کشمکش اور اس اُلجھن اور کشمکش کا مداوا ، زندگی کے حقائق پر مبنی ہے — یہ سب کچھ ہے لیکن پریم چند کے ان ابتدائی ناولوں میں مصنف کی شدید جذباتیت اور اس جذباتیت کے علاوہ خیر کے ساتھ اُس کی غیر منطقی جانب داری نے ان کی فنی سطح بلند نہیں ہونے دی — ان میں ادبیت اور شعریت کی تو کمی نہیں لیکن فن کا توازن یقیناً ڈانواں ڈول ہے ۔ بلکہ کہیں کہیں تو فنی لحاظ سے اُن ناولوں میں ایک طرح کی گھٹن اور بے اعتباری ہے ۔ اور یوں گویا مجموعی حیثیت سے پریم چند کے ان ابتدائی ناولوں نے فن کی روایت کو بعض نئی چیزیں دینے اور روایت کے بعض عناصر کو زیادہ مستحکم بنانے کی خدمت انجام دینے کے باوجود بلندی اور عظمت کی وہ اقدار ہرگز نہیں دیں جو پریم چند کی بدولت آگے چل کر اس فن کو ملنے والی تھیں — بازار حسن ، گوشۂ عافیت ، میدان عمل اورگئودان فن کی اس بلندی و عظمت کے سنگ میں ہیں ۔ ان ناولوں نے آہستہ آہستہ ناول کے فن میں ایک مسلسل انقلاب کی طرح ڈالی ۔

پریم چند کے ان ناولوں کو (خصوصاً گئو دان اور میدان عمل) کو بڑھ کر بڑھنے والے کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوتی کہ نذیر احمد ، سرشار اور شرر اور پھر مرزا رسوا اور مرزا محمد سعید نے ناول کے فن کی روایت کو اپنے اپنے مخصوص انداز میں جو کچھ دیا تھا اُسے پریم چند نے نہ صرف بڑے حسن اور بصیرت کے ساتھ سمودیا ہے بلکہ اس میں ہر خصوصیت کو وسعت اور گہرائی دی ہے ۔ نذیر احمد ہمارے ناول میں مقصدیت کے بانی اور سب سے بڑے علم بردار ہیں ۔ لیکن مقصد کے ساتھ اُن کی حد درجہ جذباتی وابستگی نے فن کو بری طرح مجروح کیا ہے ۔ پریم چند کی پوری ناول نگاری پر بھی اصلاحی مقصد کا بڑا گہرا سایہ ہے ، لیکن نذیر احمد اور پریم چند میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ پریم چند نے مقصد پسندی کو اپنا دین ایمان سمجھنے کے باوجود فن کے حسن اور اُس کی عظمت کو اس کی قربان گاہ پر بھینٹ نہیں چڑھنے دیا ۔ اور مقصد اور فن کے اس مکمل توازن کا نتیجہ ہے کہ پریم چند اور اُن کے قاری میں ہمیشہ وہ ذہنی اور جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے جس سے نذیر احمد ہمیشہ محروم رہے ہیں ۔

سرشار نے ہمارے ناول کو جو کچھ دیا ہے اُس میں امتیازی حیثیت اس خصوصیت کو حاصل ہے کہ زندگی کی پہنائی اور گیرائی کا احاطہ صرف ناول کر سکتا ہے ۔ سرشار نے زندگی کے ایک بہت وسیع اور پھیلے ہوئے دریا کو فن کے کوزے میں بند کر دینے کی روایت کی بنا ڈالی ہے — لیکن اس وسعت کو کوزے میں بند کرنے کے عمل میں اُن سے فن کی کئی نا قابل عفو خطائیں سر زد ہوئی ہیں ۔ پریم چند نے اس شاندار روایت کو بھی جس طرح برتا ہے اس سے اُن کی حقیقت بینی اور فنی بصیرت دونوں کا کمال ظاہر ہے ۔ سرشار اپنے مشاہدہ کی وسعت کے باوجود نہ زندگی کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کر سکے ، اور نہ ضروری اور غیر

ضروری ، اہم اور غیر اہم میں امتیاز قائم کر سکے ۔ پریم چند کے ناول معاشرتی ، سیاسی اور اقتصادی پہلوؤں کا اس طرح احاطہ کرتے ہیں کہ اُن کے ناول نہ صرف ایک خاص عہد کی معاشرتی اور سیاسی زندگی کے مرقعوں کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ایک خاص قوم کے مزاج کے مفسر اور مبصر بھی ہیں ۔ اُن کے ناولوں نے نہ صرف ایک بہت بڑی قوم کی زندگی کے خارجی پہلوؤں کا صحیح عکس ہمارے سامنے پیش کیا بلکہ اُس کی داخلی کیفیتوں کو بھی اس طرح آشکارا کیا کہ اس قوم کے جسم اور روح دونوں کے امتیازی رنگ نمایاں ہو گئے ۔ پریم چند کے ناول کسی محدود اور مخصوص معاشرے کے بجائے ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں ، اُس کے نچلے اور متوسط طبقوں ، اُس کی تہذیبی اور قومی اُلجھنوں اور کشمکشوں کے آئینے ہیں — ایسے آئینے جن کی جلا نہ ظاہر کو پوشیدہ رکھتی ہے نہ باطن کو ۔

سرور کی منظر نگاری ، اُن کی ادبیت و شعریت اور اُن کے مشرقی و مغربی اندازوں میں سموئی ہوئی انشا پردازی میدان عمل اور گئو دان میں اور بھی زیادہ نکھری ہوئی صورت میں جلوہ گر ہے ۔

امراؤ جان ادا اور خواب ہستی کی نفسیاتی کردار نگاری اُردو ناول کی تاریخ میں بالکل نئی چیز تھی اور اس نئی چیز سے ناول کے فن کو بلندی و عظمت بھی حاصل ہوئی اور لطافت و حسن بھی ، لیکن نفسیاتی تجزیے نے پریم چند کے ناولوں میں جو رنگ اختیار کیا ہے اُسے دیکھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار محبت اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کا پرستار اور فطرت انسانی کے راز ہائے سربستہ کا جویا ہو تو اُس کے کرداروں کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات اور ہر جنبش قدم میں نہ جانے کتنے چھپے ہوئے بھید نظر آتے ہیں ۔ پریم چند کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو اُس کے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر جاننے پہچاننے اور اُس کے دکھوں کا کھوج لگانے کو اپنا انسانی فرض اور فنی نصب العین سمجھتے ہیں ۔ اس لئے انہیں کسی کی گفتار و رفتار کا فنی تجزیہ کرنے کے لئے کسی طرح کی کاوش نہیں کرنی پڑتی ۔ اُن کی انسان دوستی اور محبت کی آغوش میں پلا ہوا مشاہدہ انہیں ہر قدم پر جو جلوے دکھاتا ہے وہ ہزار نفسیاتی تجزیوں پر بھاری ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ناولوں میں واقعہ نگاری اور کردار نگاری پر ایک ایسے نفسیاتی احساس کا گہرا پرتو نظر آتا ہے جو دیکھنے میں تو بالکل سادہ ہے لیکن اس سادگی کے پردے میں زندگی کی ساری وسعت اور گہرائی موجود ہے ۔

پریم چند کے ناول اردو ناول کی تاریخ میں زندگی اور فن کی عظمت اور بلندی کے بہترین مظہر ہیں ۔ پریم چند سے پہلے اچھے اچھے ناول نگاروں نے فن کی جو روایت قائم کی تھی پریم چند نے نہ صرف اُسے وسعت دی بلکہ اپنی فنی بصیرت سے اُسے ایک نیا مفہوم دیا اور اُسے ایسے امکانات کا حامل بنایا کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کا کوئی موقع ، اور فکر ، احساس اور جذبے کی کوئی پیچیدگی اُس کے لئے بیگانہ نہیں رہی — پریم چند کے ناول بہ یک وقت ٹالسٹائے کی وسیع النظری اور ڈکنس کی مردم شناسی کے حامل بھی ہیں اور مشرقی مزاج کے صحیح آئینہ دار بھی ۔

پریم چند کے انتقال کو اب تقریباً بیس سال ہو چکے ہیں ۔ اس بیس سال کی مدت میں بلامبالغہ صدہا ناول لکھے گئے لیکن پریم چند نے ناول کو فن کے اعتبار سے جس جگہ چھوڑا تھا وہ اُس سے آگے نہیں بڑھ سکا ۔ پریم چند نے ناول کو زندگی اور انسان کی خدمت گزاری کا جو منصب سونپا تھا ، وہ اب بھی ناول کے ہاتھوں میں ہے لیکن پریم چند کے بعد کے بیس برسوں میں فن کی داستان اس لحاظ سے بھی رنگ و روح سے خالی ہے — پھر بھی اس مدت میں جو کچھ لکھا گیا اُس میں کہیں کہیں کچھ ستارے جگمگاتے دکھائی دیتے ہیں ۔ اور

پریم چند کے بعد ناول کے ارتقا کی کہانی انہیں ستاروں کی کہانی ہے۔

ان ستاروں کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اس دور کے نمایاں ترین ناول ہیں — سجاد ظہیر کا مختصر ناول 'لندن کی ایک رات' کرشن چندر کا 'شکست' عزیز احمد کا 'گریز' اور عصمت کا 'ٹیڑھی لکیر'۔ ان سب ناولوں میں ناول نگاروں کے مزاج، انفرادی رنگ طبیعت اور مخصوص انداز فکر و نظر نے جو فرق پیدا کئے ہیں اُن سے قطع نظر بعض باتیں مشترک ہیں۔ ان سب ناولوں میں لکھنے والے کی توجہ کا مرکز واقعات نہیں بلکہ کردار ہیں، یہ کردار ایک خاص عہد کے سیاسی اور معاشی انتشار اور اضطراب کے پیدا کئے ہوئے انتشار و اضطراب کا عکس ہیں۔ اس انتشار اور اضطراب نے انسان کو ایسے دوراہے پر کھڑا کیا ہے، جہاں اس کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ کون سی راہ اختیار کرے۔ اُسے اپنے گرد و پیش کی دنیا میں پرانی اقدار کی جو شکست و ریخت اور جو خواری و زبوں حالی نظر آتی ہے اُن سے افسردہ و مضطرب ہو کر وہ نئی قدروں کی جستجو کرتا ہے، لیکن نئی قدریں اب تک معلق ہیں، اُنہیں پھسلتی اور ہر گھڑی ایک نئے بھونچال سے دو چار ہوتی ہوئی زمین پر قدم جمانے کا موقع نہیں ملا — اور اس لئے وہ فرار کی کوئی راہ اختیار کرتا اور رومانیت کی آغوش میں پناہ لیتا ہے — اُس کا ذہن بے شمار اور کبھی ختم نہ ہونے والی اُلجھنوں کی آماجگاہ ہے۔ یہ اُلجھنیں سیاسی نظریات، معاشی تصورات اور جنسی محرکات کی باہمی کشمکش اور تصادم سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ سب ناول فرد کی ان اُلجھنوں اور اس کے اُلجھنوں سے گھرے ہوئے ماحول کی مصوری اور عکاسی کرتے ہیں۔ اور اس مصوری اور عکاسی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح ماحول میں کوئی ٹھہراؤ نہیں اور خود اطمینان و سکون سے محروم ہے اسی طرح ان ناولوں کی ترتیب میں ٹھہراؤ، تنظیم و ترتیب اور ربط و آہنگ کے عناصر معدود ہیں — مصنفوں کی شخصیتوں کے فرق نے، ان سب خصوصیات میں تھوڑا تھوڑا فرق ضرور پیدا کیا ہے۔

'لندن کی ایک رات' میں ماحول اور فرد کے انتشار کی جو تصویریں کھینچی گئی ہیں اُن میں شروع سے آخر تک مصنف کے فکر اور فنی خلوص کا پرتو نمایاں ہے، زندگی کی مختلف اقدار کو معاشی حقائق کی روشنی اور پس منظر میں دیکھنے کا رجحان پورے ناول پر چھایا ہوا ہے، جوائس اور پروسٹ کے نفسیاتی فن سے پہلی مرتبہ کسی اردو کے ناول کی ساخت میں مدد لی گئی ہے۔ اور اس طرح اس ناول کی بدولت ہمارا ناول فن کے ایک ایسے رجحان سے آشنا ہوا جو مغرب کے مخصوص حالات سے مطابقت رکھتا ہے اور چونکہ بین الاقوامی روابط نے سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر سے مشرق اور مغرب کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا ہے اس لئے فن کے اس نئے تجربے کو ناول نگاری کی روایت کے ارتقا میں ایک موثر تیر سمجھنا چاہئے۔

'شکست' نئے دور کے انتشار میں ایک نئی اور دل کش دنیا کی تلاش و جستجو کا ترجمان ہے۔ شکست میں فرد کے ذہن اور اُس کے گرد و پیش کے ماحول کا اضطراب فطرت کی حسین دنیا میں پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی کبھی فطرت کا حسن آوارہ، اس حسن کی پر سکون آغوش، مضطرب انسان پر خود فراموشی طاری کر دیتی ہے اور زندگی میں حسن فطرت کے رومان کے علاوہ ہر حقیقت کھوکھلی اور بے جان معلوم ہوتی ہے۔

'گریز' پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں کے درمیانی وقفے کے پرشورش یورپ اور انگلستان کی زندگی کا ناول ہے۔ اس میں اس عہد کی سیاسی اور معاشی فضا کا ایک منتشر سا خاکہ ہے — لیکن ناول کے سیاسی اور معاشی پس منظر پر جنسی حقائق کا غلبہ ہے، جنہیں مصنف نے مزے لے لے کر بیان کیا اور اپنے قاری کو اس مزے میں پوری طرح شریک ہونے

کی دعوت دی ہے ۔ جنسی معاملات کے اس طرح غیر ضروری آزادی اور بے باکی سے بیان کرنے میں بظاہر فرائڈ کی جنسی نفسیات کا سہارا لیا گیا ہے — لیکن اس ناول میں یہ سہارا نفسیاتی ادبی سہارا ہونے کے بجائے محض اُس کا فریب معلوم ہوتا ہے ۔

"ٹیڑھی لکیر" کی بنیاد اس نفسیاتی حقیقت پر ہے کہ انسان کا ماحول اُس کی سیرت اور شخصیت کی تشکیل میں سب سے بڑا حصہ لیتا ہے ۔ اور سیرت کی تشکیل و تغیر اُس کے ظاہر اور باطن کے امتزاج کا دوسرا نام ہے — انسان کا باطن ، اُس کا ذہن ، اُس کی نفسیاتی الجھنیں اور پھر ان سب کے ساتھ تحت الشعور کا غیر مرئی عمل انسان کے ظاہری فعل کو کس طرح متاثر کرتا ہے ۔ انسانی ذہن ماحول کی اُلجھنوں سے نادانستہ طرح طرح کی گرھوں اور گتھیوں کا مجموعہ بن جاتا ہے اور یہ گرھیں خارجی عوامل میں عجیب و غریب قسم کی گرہیں ڈال دیتی ہیں ۔ ان چیزوں کے علاوہ سماجی بندھنوں اور آزاد فطرت کے تقاضوں سے پیدا ہونے والے اصادم بھی انسانی زندگی کا ایک مستقل عذاب ہے — عصمت نے اپنے ناول میں ان حقائق کو خاصے سوچ بچار کے بعد ، فن کارانہ حسن کے ساتھ پیش کیا ہے ۔

اور اس طرح مجموعی طور پر اُردو کے یہ چار ناول فن کی روایت میں ایک نئے جلے نفسیاتی اور معاشی اسلوب کے حامل اور پیش رو ہیں — اس نفسیاتی اور معاشی اسلوب میں سیاست اور جنس کی لہریں مد و جزر کی طرح اٹھتی ، بیٹھتی اور کبھی کبھی پورے ماحول پر چھائی ہوئی نظر آتی ہیں ۔

لیکن ان جنسی ، معاشی اور نفسیاتی ناولوں کے ساتھ ساتھ اسی دور میں ناول نگاری کی ایک اور روش بھی عام رہی جس میں ایم ۔ اسلم اور عظیم بیگ چغتائی کے نام سب سے نمایاں ہیں ۔ ان دو مقبول و معروف ناول نگاروں نے فن کی ترقی اور فنی روایت کے مغربی رجحانات کے دور میں بھی اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا کہ ناول زندگی کا مصور ، مفسر ، ترجمان نقاد اور فن کی نئی سے نئی اقدار کا علم بردار اور مبلغ ہونے کے باوجود کہانی کی ایک قسم ہے اور اس لئے اُسے زندگی اور فن کی نزاکت ، لطافت ، وسعت اور گہرائی کا حامل ہو کر بھی "افسانوی" اقدار سے عاری ہرگز نہیں ہونا چاہئے ۔ قاری پر وہ خواہ اور جس طرح چاہے اثر کرے لیکن اُس کی بنیادی خصوصیت دلچسپی ہے اور دلچسپی کہانی میں اشتیاق پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کا دوسرا نام ہے ۔ عظیم بیگ اور ایم ۔ اسلم دونوں کے ناول کہانی کے بنیادی مقصد کو پورا کرتے اور ہر دوسری مصلحت سے زیادہ قاری کے مذاق کی تسکین کو اپنا نصب العین بناتے ہیں ۔ عظیم بیگ نے اپنی کہانیوں کی بنیاد ایسے واقعات کو بنایا ہے جن کی ساخت میں دلچسپی کے عناصر کا غلبہ ہے ۔ واقعات کو ہمیشہ ایک نئی اور کبھی کبھی مضحکہ خیز شکل دینا ، اپنے کرداروں کو عجیب و غریب مشکلات میں مبتلا کر کے اُن کی سیرت کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اُبھارنا اور اپنے بیان اور ظرافت سے پوری فضا کو محض دلچسپی اور شگفتگی کی فضا بنا دینا عظیم بیگ کے ناولوں کی خصوصیت ہے ۔

ایم ۔ اسلم کا فنی نقطۂ نظر تو وہی ہے جو عظیم بیگ کا ، لیکن اُنھوں نے اپنے ناولوں میں دلچسپی کا سامان کہانی کے مختلف اجزا میں ربط پیدا کر کے اور کہانی کے واقعات میں ایک ایسی ترتیب قائم کر کے فراہم کیا ہے کہ پڑھنے والا کہانی پڑھتے وقت اشتیاق کے ساتھ ، برابر یہ جاننے کا منتظر رہے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے ۔ ایم ۔ اسلم نے کہانی لکھتے وقت اپنے قاری کے معتقدات کو ٹھیس لگانے کے بجائے اُنہیں اصلاح کا راستہ دکھانے کی کوشش کی ہے اور ہر صورت میں زندگی کی ایسی قدروں کو فتح یاب بنایا ہے جن کی پرورش خیر کے سائے میں ہوئی ہے ۔ ایم ۔ اسلم کے ناولوں میں اصلاحی مقصد کی لہر کے ساتھ ساتھ

رومان کی رنگینی کی جو آمیزش اکثر نمایاں ہے اس سے بھی پڑھنے والے کے شوق کی تسکین ہوتی ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہیں (اور عظیم بیگ کو) پڑھنے والوں کا نسبتاً زیادہ بڑا حلقہ ملا ہے ـــــ ناول لکھنے والے جب تک کہانی کو کہانی سمجھ کر لکھتے رہیں گے محبوبی کا یہ تمغہ ان کا حصہ رہے گا ـــ خواص البتہ ناک بھوں چڑھاتے رہیں گے ۔ وہ کہانی کی سطح کو بھی زمانے کی ذہنی اور جذباتی اور بڑی حد تک نفسیاتی سطح کے ساتھ بلند ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں ـــ اور عظیم بیگ اور ایم ۔ اسلم کے ناول ان کی اس توقع کو پورا نہیں کرتے ، بالکل اسی طرح جیسے فلسفیانہ اور نفسیاتی ناول عوام کے فطری مطالبات کی نفی نہیں کر سکتا ۔

ناول کے ارتقا کی یہ روداد ، جس میں ایک نئے انداز کے نفسیاتی ناول اور پرانے اسلوب کے رومانی ، اصلاحی اور تفریحی ناول ایک ساتھ چل رہے ہیں ، یہاں آ کر ختم ہو جاتی ہے ۔ اس کے بعد ہندوستان کی زندگی میں ایک عظیم اور دور رس انقلاب جنم لیتا ہے اور زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب ، اور ادب کی دوسری اصناف کی طرح ناول بھی اس سے متاثر ہوتا ہے ۔

تقسیم کے بعد کے آٹھ برسوں میں جتنے ناول لکھے گئے اتنے ہمارے ناول کی تاریخ کے کسی ایک دور میں نہیں لکھے گئے ـــ اس کی سب سے بڑی وجہ یقیناً یہی ہے کہ پڑھنے والا نظم اور افسانے کی یورش سے گھبرا کر اب لکھنے والوں سے صرف ناول طلب کرتا ہے ۔ ناول میں اسے زندگی بھی زیادہ ملتی ہے اور رومان بھی ۔ اس کی ناکام تمناؤں کی تکمیل بھی ناول سے ہوتی ہے اور اس کے جسم و روح کو جس بہتر دنیا کی ضرورت اور تلاش ہے وہ بھی اسے ناول ہی میں ملتی ہے ۔ اس طرح موجودہ دور کی ناول نگاری کا سب سے بڑا محرک پڑھنے والے کا تقاضا اور طلب ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ان سیکڑوں ناولوں میں جو اس دور میں لکھے گئے ہیں اسی طلب اور تقاضے کے مختلف پہلوؤں کا عکس ہے ۔

اس طلب اور تقاضے کو واضح سکیں دے کر اگر ہم موجودہ دور کے ناولوں کو خانوں میں تقسیم کریں تو سب سے پہلے ہماری نظر ان ناولوں پر پڑتی ہے جو خالص "فسادات" کے موضوع پر لکھے گئے ہیں ۔ رامانند ساگر کا 'اور انسان مر گیا' ایم ۔ اسلم کا 'رقص ابلیس' رشید اختر ندوی کا '۱۰ ۔ اگست' قیسی رام پوری کے ناول 'خون' 'بے آبرو' اور 'فردوس' رئیس احمد جعفری کا 'مجاہد' اور نسیم حجازی کا 'خاک اور خون' اسی ضمن کی تصنیفات ہیں ۔ ان سب ناولوں میں ہمارے معروف ناول نگاروں نے ۱۹۴۷ء کی خونیں داستان دہرائی ہے اور اس طرح دہرائی ہے کہ ناولوں کے مختلف حصے پڑھ کر پڑھنے والا پورے یقین کے ساتھ یہ محسوس کر لیتا ہے کہ انسان کی اصل سرشت حیوانی ہے اور اب تک اس نے اس سرشت اور فطرت پر تہذیب و اخلاق کے جو حریری پردے ڈال رکھے تھے انہیں خود ہی تار تار کر ڈالا ہے ، اور حیوانیت اپنے اصلی روپ میں بے نقاب ہو کر نظر کے سامنے آگئی ہے ۔ حیوانیت اور انسانیت سوزی کے یہ مختلف مرقعے مختلف ناول نگاروں کے مشاہدات و تجربات کا نتیجہ ہیں ۔ ان مشاہدات و تجربات پر ان لکھنے والوں کے تخیل نے تھوڑی سی رنگ آمیزی کر کے انہیں موثر صورت دینے کی کوشش کی ہے ۔ ان مشاہدات و تجربات میں شدت اور تاثر کی کمی بیشی ناول نگار کے مزاج کی انفرادیت اور احساس کی شدت کی مقدار پر منحصر ہے ۔ مصنف نے اپنے مزاج اور تاثر کی نوعیت کے مطابق ان مشاہدات اور تجربات کی کڑیوں کو زنجیر بنانے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں کبھی کبھی پڑھنے والوں کی نظر کے سامنے کوئی دل کش منظر ، کسی ناقابل فراموش کردار کی یاد یا کوئی دل نشین جذباتی تاثر پیش کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے ۔ لیکن ان سب ناولوں میں اس طرح کے مناظر ، ایسے کردار اور ایسے

ناثر اول سو بہت، کم ہیں ، دوسرے جہاں ہیں وہ پورے ناول کی فنی ترتیب کا کوئی غیر منفک جزو نہیں، ہیں ۔ اُس کے تانے بانے میں ایک واحد نقش یا ناثر کی کوئی معین حیثیت نہیں ۔

فسادات کے ان ناولوں میں جا بجا اخلاقی درس اور اصلاحی اشارے بھی ہیں ، انسانیت کی بلند قدروں کی سنہری کرنیں بھی کہیں کہیں جھلکتی اور چمکتی ہیں ، اور بلا شبہ کہیں کہیں فن کی لطافت بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہے — لیکن مجموعی حیثیت سے فسادات کے یہ سب ناول ، ناول کے فن کے حد درجہ جذباتی اور اس لئے انتہائی کمزور اور غیر فنی نقوش ہیں ۔ ان سب ناولوں میں (جستہ جستہ اور منتشر اجزا کو چھوڑ کر) فن نے ترقی کے بجائے تنزل اور انحطاط کی اقدار کو زندہ کیا ہے — اس کی وجہ ، اُس جذباتی ہیجان اور شدت سے قطع نظر جو اس موضوع کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ ہے ، یہ ہے کہ ہمارے ناول نگاروں نے یہ ناول لکھتے وقت فن کے مطالبات کا خیال رکھنے کے بجائے قاری کے ہنگامی تاثرات کی شدت کی ہم نوائی کی ہے اور ناولوں کی ساخت و ترتیب میں فکر کی گہرائی ، تخیل کی وسعت اور فن کی دقت نظر اور حسن انتخاب سے وہ کام نہیں لیا جو کسی تخلیق کو فنی بنانے کے لئے ضروری ہے ۔

ناول کی دوسری قسم میں اُن ناول نگاروں کے ناول آتے ہیں جنہوں نے قیام پاکستان کو ایک نئے دور کا آغاز سمجھ کر فرد اور جماعت کی زندگی کو کوئی ایسی راہ دکھانے کی کوشش کی ہے جس میں ہر طرف خوشیاں ہوں ، ہر طرف سکون ہو اور انسان انسانیت کی بلند اقدار کا پابند اور پرستار ہو کر زندگی کو آگے بڑھنے میں مدد دے ۔ اس واضح اور بلند نصب العین کے حصول اور تکمیل کے لئے مختلف لکھنے والوں نے مختلف راستے اختیار کئے ہیں اور اپنے ناولوں کے ذریعہ حال کے انتشار اور اضطراب کو دور کرنے اور ایک جہان نو کی تعمیر کا خاکہ مرتب کرنے میں انسان کی رہنمائی کی ہے ۔ ان لکھنے والوں کے سامنے اُس قوم کے ماضی اور اُس ماضی کے مہتم بالشان کارناموں کی بڑی ولولہ انگیز داستان ہے ، جو اس وقت آزمائش کے ایک بڑے سخت دور سے گذر رہی ہے ۔ ہمارے ناول نگاروں کو یہ بات بہت آسان معلوم ہوتی ہے کہ وہ ماضی کے ان کارناموں کو فن کی دل نشین صورت دے کر انسان کو مستقبل کے لئے روشنی حاصل کرنے میں مدد دیں ۔ نسیم حجازی کے تقریباً سب اور ایم ۔ اسلم اور رئیس احمد جعفری کے کئی ناول ایک واضح قومی نصب العین کے حصول کے وسیلے ہیں ۔

بعض ناول نگاروں نے تاریخی واقعات سے الگ ہٹ کر اسلام اور اس کے بنیادی تصورات کو سامنے رکھ کر زندگی کا ایک ضابطۂ خیر مرتب کیا ہے اور اس ضابطے کی بنیاد پر قائم ہونے والے ایک ایسے معاشرے کی تصویر بنائی ہے جس میں ہر طرف خیر کی حکمرانی ہو — ایم ۔ اسلم اور قیسی رام پوری کے بعض ناولوں کے جستہ جستہ حصے اسی طرح کے مثالی معاشرے کا تصور پیش کرتے ہیں — اس کے ساتھ ساتھ بعض ناولوں میں عہد حاضر کی ترقیوں اور ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر ایک ایسے معاشرے کی تصویر بنائی گئی ہے ، جس میں مادی ترقیوں کی طرف پوری توجہ صرف کی جائے اور علم و فن اور صنعت و حرفت کی انتہائی ترقی کے ساتھ اخلاقی اقدار بھی پامال نہ ہوں اور انسان مادیت اور اخلاق کے مکمل امتزاج کے بعد زندگی کا ایسا سکون اور مسرت حاصل کرے جس سے وہ اب تک محروم رہا ہے ، قیسی رام پوری کے ناول 'رضوان' اور ' فردوس' اسی طرح کے تصورات کے خاکے ہیں ۔

بعض ناول صرف اس مقصد سے لکھے گئے ہیں کہ پاکستان کے موجودہ معاشرے کی معاشرتی اور اخلاقی بد حالی کی تصویریں پیش کر کے پاکستانی عوام کو غیرت دلائی جائے اور اُنہیں ایسا انسان بننے میں مدد دی جائے جو اسلامی اقدار اخلاق کا صحیح اور مکمل نمونہ ہو ۔

ایم ۔ اسلم کے ناولوں میں فرنگن ، انجام ، چراغ محفل ، سیدھی لکیر اور ریحانہ اسی طرح کے ناول ہیں ۔

ان تاریخی ، معاشرتی ، اخلاقی اور اصلاحی ناولوں کے موضوع ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ ان سب میں لکھنے والوں کے مشاہدے ، تخیل اور تصور نے واقعات کو ایسی صورت دی ہے کہ وہ دلچسپ کہانی کی بنیاد بن سکیں ۔ ان سب ناولوں میں لکھنے والوں کے منفرد خیالات اور تصورات نے ایک مثالی معاشرے کے خاکے مرتب کرنے اور پاکستانی عوام کو معاشرت اور معیشت کے اخلاق کی تعلیم دینے میں ہر جگہ ایک نیا رنگ قائم کیا ہے ۔ فن کے متعلق اُن کے جو مخصوص تصورات ہیں ، یا فن کو جس خاص انداز میں برتنے کو اُنھوں نے اپنا شعار بنایا ہے اس کی بنا پر بھی ایک کا فنی نقش دوسرے سے مختلف ہے لیکن ان سب ناولوں میں مجموعی حیثیت سے بعض خصوصیات مشترک بھی ہیں ۔

ان ناولوں میں سے اکثر میں لکھنے والا کسی نہ کسی انداز میں اسلامی معاشرت اور اسلامی اخلاق کا ایک تصور پیش کرنا اور اُسے عام بنانا چاہتا ہے ، یہاں تک کہ بعض اوقات ناولوں کا انداز نمایاں طور پر تبلیغی ہوگیا ہے — قوم کے لئے کوئی موزوں نظام اخلاق مرتب کرنے کی فکر میں ہر لکھنے والے نے موقع بے موقع اخلاق اور اصول اخلاق کی بحثیں چھیڑی ہیں ۔ ہر لکھنے والے نے عوام کو اپنے انداز فکر کی طرف مائل کرنے اور ناول کے مقصد کو اُس کے دل سے قریب کرنے کے لئے ناول میں کہیں نہ کہیں رومان کی رنگینی ضرور شامل کی ہے ۔ ناول نگار نے ہر صورت قاری کی خوشنودی کو دوسری چیزوں پر ترجیح دی ہے — یہی وجہ ہے کہ فن کے نقطۂ نظر سے یہ ناول فن کی روایت میں کوئی اضافہ نہیں کر سکے ۔ بلکہ ان ناولوں میں سے اکثر کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے — اور کبھی کبھی شدت کے ساتھ محسوس ہوتا ہے — کہ ہمارے ناول نگار نے کبھی ایک وقتی ضرورت ، مقصد اور نصب العین کے پورا کرنے کے جوش میں یہ بات فراموش کر دی ہے کہ بے شک مقصد بے حد اہم ہے اور اس کی اہمیت پر بہت سی چیزیں قربان کی جا سکتی ہیں ، اس کے باوجود فن کار کا فنی منصب اہم تر ہے ۔ فن کار اس اہم تر منصب کو فراموش نہ کرے تو اصلاحی (یا تبلیغی) مقصد کی کامیابی زیادہ یقینی ہو جاتی ہے ۔ قاری کے نقطۂ نظر سے فن کے مطالبات کی پابندی اور مقصد کی تاثیر میں بڑا گہرا ربط ہے ۔ چنانچہ ہمارے ناول نگاروں نے اپنی فنی ذمہ داری کو جس حد تک یاد رکھا یا جس حد تک اُس کی طرف سے غفلت یا بے اعتنائی برتی ہے اُسی حد تک اُن کے ناول کی تاثیر بڑھی اور گھٹی ہے — ایم ۔ اسلم ، نسیم حجازی ، رئیس احمد جعفری اور قیسی رام پوری کے ناول اس اجمال کی تفصیل ہیں ۔

ایم ۔ اسلم کے ناولوں میں مرد غازی (نومبر ۴۸ء) کا مقصد سلف کے کارناموں کی یاد تازہ کرنا اور دلوں میں جوش پیدا کرنا ہے — عزم راسخ اور ہمت سر بلند کے واقعات دھرا کر قوم کی تعمیر مقصود ہے — لیکن ناول میں جا بجا تبلیغی رنگ غالب ہے ، جنگ و جدل کے مناظر اور کبھی کبھی سامنے آنے والے روحانی مناظر میں بھی عوام کی پسند اور مذاق کا غلبہ ہے ۔ ' فرنگن ' (اگست ۴۹ء) میں فرنگی اور پاکستانی بیویوں کا فرق اور مشرق اور مغربی تہذیب کا مقابلہ کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ فرنگیت سے نجات پائے بغیر اسلامی اخلاق کا پیدا ہونا ممکن نہیں — لیکن اس ناول میں بھی جا بجا واعظانہ اور تبلیغی رنگ کا غلبہ ہے اور طویل اور خشک مقالوں میں قومی اور مذہبی مسائل پر ایسی بحثیں کی گئی ہیں جن سے کہانی میں کہانی کا لطف باقی نہیں رہتا ۔ 'چراغ محفل' (جون ۵۰ء) کا مقصود یہ دکھانا ہے کہ عورتوں میں مغربی تعلیم کیسے برے معاشرتی نتیجے پیدا کرتی ہے — ناول نگار نے زندگی کے اس پہلو سے تعلق رکھنے والے چھوٹے سے چھوٹے جزئیات پر غور کر کے اُن پر بڑے

منطقی انداز میں بحث کی ہے ۔ بحث کی منطق موثر ضرور ہے لیکن ناول کی افسانویت پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ اس معاشرت کے سارے پہلوؤں پر بحث کرتے وقت ناول میں جا بجا معلمانہ رنگ جھلکنے لگتا ہے ، ناول میں نیتشے کے انسان کامل کے فلسفہ کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے کی خوشنودی کے لئے روحانی فضا بھی پیدا کی گئی ہے ۔ 'پاسبان حرم' (ستمبر ۵۰ء) کا پس منظر تاریخی ہے ۔ اس تاریخی پس منظر میں قوم کو اُن غلطیوں سے آگاہ کرنا مقصود ہے جو قوموں کی تباہی کا باعث بنتی ہیں ۔ ناول میں تاریخی صحت اور واقعات کی تاریخی ترتیب کے ساتھ جو چیز ناول نگار کے فنی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتی ہے یہ ہے کہ وہ اسلامی زندگی کے ولولہ انگیز اور رومان و محبت کے ہیجان انگیز مناظر سے عوام کے دلوں میں گھر کرنا چاہتا ہے ۔ پلاٹ کی ترتیب اور کردار نگاری سیدھی سادی ہے ۔ 'سیدھی لکیر' (فروری ۵۱ء) ایک ایسی حسینہ کی داستان حیات ہے جو مغرب زدگی اور خدا ناشناسی سے دنیا کو اپنے لئے جہنم بنا لیتی ہے اور پھر ایک نیک سیرت ، خدا پرست شوہر کے گھر میں پناہ لیتی ہے — ناول میں دلچسپی پیدا کرنے کا مطمح نظر ہر جگہ نمایاں ہے ، لیکن بعض جگہ اصلاحی اور تبلیغی نقطۂ نظر کی شدت ناول کے دلچسپ پہلوؤں کو دبا لیتی ہے ۔ ناول نگار نے بڑی وضاحت سے یہ چیز (واقعات ، مقالموں اور بیانیہ اظہار سے) اُبھاری ہے کہ اسلامی زندگی کیا ہے — اس دور کے ناولوں میں 'ضرب مجاهد' (مارچ ۵۱ء) اور 'فتنۂ تاتار' (اگست ۵۱ء) البتہ ایسے ہیں جن میں مقصدیت کو فن کے اعتدال اور حسن بیان میں سمویا گیا ہے اور پڑھنے والا مصنف کے مخصوص اصلاحی نقطۂ نظر سے متاثر ہوتا اور اسے اپنی رگ و پے میں سرایت کرتا محسوس کرتا ہے ۔ خصوصاً فتنۂ تاتار میں یہ بات اس لئے زیادہ ہے کہ یہاں ناول میں ادبیت اور شعریت بھی ہے اور ناول نگار نے غور و فکر کے بعد اپنے بیان میں روانی بھی پیدا کی ہے ۔ پلاٹ میں موزوں مقامات پر پیچ و خم پیدا کرکے ، اسے اس طرح ارتقا کی مختلف منزلوں سے گزارا گیا ہے کہ پڑھنے والے کا اشتیاق کہیں کم نہیں ہوتا ۔ ان دو ناولوں کے مطالعہ سے یہ بات آسانی سے محسوس کی جا سکتی ہے کہ ناول نگار اس پر قادر ہے کہ وہ جہاں چاہے فن اور مقصدیت میں صحیح توازن و تناسب پیدا کر سکتا ہے ۔ اور جب وہ اس فنی توازن و تناسب کو عزیز رکھتا ہے تو اُس کی بات زیادہ دل نشین بھی ہوتی ہے ۔

قیسی رام پوری کے ناولوں میں دو باتیں نمایاں ہیں — اُن کا ذہن اور تخیل ہر کہانی کے لئے ایک نیا پلاٹ ، ایک نئی فضا اور ایسے نئے تصورات تلاش کر لیتا ہے جن کی جدت بجائے خود ایک کشش کی چیز بن سکتی ہے ۔ دوسری خصوصیت اُن کے سب ناولوں میں موجود ہے یہ ہے کہ اُنہوں نے پاکستان اور اُس کی زندگی پر سیاسی ، مذہبی ، معاشرتی اور اقتصادی پہلوؤں سے نظر ڈال کر ، ان سب پہلوؤں کا پوری طرح تجزیہ کیا ہے اور ایک ناول نگار کی حیثیت سے وہ ان سب تصورات کو اپنے ناولوں میں جگہ دینا چاہتے ہیں ۔ لیکن بڑی خرابی یہ ہے کہ اُس دور اُس تخیل اور منطقی فکر کے نتائج کو فنی شکل دینے سے پہلے جس سوچ بچار اور ترتیب و توازن کی ضرورت ہوتی ہے اُس سے اُنہوں نے پورا کام نہیں لیا اس لئے اُن کے سب ناول فنی حیثیت سے ادھورے اور نیم پختہ رہ گئے ہیں ۔ اور اُن کے سب ناولوں میں اس ادھورے پن اور نیم پختگی کی وجہ سے پڑھنے والے کے لئے "عدم اعتماد" کی فضا پیدا ہو گئی ہے ۔ اُن کی تخلیقات میں پڑھنے والے کو ایک مجذوب کی وارفتہ خیالی کا لطف تو ضرور آتا ہے لیکن وہ اُنہیں سنجیدہ فکر کی تخلیقات اور لطیف فن کی واردات سمجھ کر نہیں پڑھتا ۔ ان ناولوں پر پوری طرح چھایا ہؤا رومان البتہ ہوس انگیز ضرور ہوتا ہے ۔ قیسی کے ناولوں میں فنی اعتدال کی افسوس ناک حد تک کمی ہے اور اس چیز نے اُن کے مقصد کو بڑا نقصان پہنچایا ہے ۔ "دھڑکتے ہوئے دلوں اور پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کی داستانیں" بھی سنجیدہ فکر کے علاوہ

فنی ترتیب و تنظیم کی دست نگر اور محتاج ہوتی ہیں ۔

سنجیدہ فکر اور فنی ترتیب و تنظیم کی اسی کمی اور محض عوام کے مذاق کی تسکین کی کوشش اور خواہش نے رئیس احمد جعفری کے ناول کو بھی فنی بے ربطیوں کا مجموعہ بنادیا ہے ۔ اُن میں سے ہر ایک میں محبت کے دلکش اور دل نشین مناظر ضرور ہیں ، اُن کے کردار محبت کے فلسفہ پر عملی اور نظری گفتگو کرنے میں بھی مہارت رکھتے ہیں ۔ لیکن ان کرداروں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات زندگی سے بہت دور کسی تخیلی دنیا کے واقعات معلوم ہوتے ہیں --- یہ بات اُن کے تاریخی ناولوں میں البتہ نہیں ہے ۔ لیکن اُن کے مطالعہ کے بعد انسان کم از کم یہ نتیجہ ضرور نکالتا ہے کہ تاریخی ناول نگاری کے فن کو وہ کبھی کبھی شرر کی سطح تک بھی نہیں پہنچا سکے ۔

ان چار کثیر التصانیف اور مقبول عام ناول نگاروں میں نسیم حجازی نے نسبتاً زیادہ مقبولیت حاصل کی ہے اور اُس کی کئی وجہیں ہیں --- ایک بڑی اور پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اُنھوں نے تاریخی ناول لکھتے وقت تاریخ اسلام کے ایسے واقعات منتخب کئے ہیں جن میں جرأت ، شجاعت ، صداقت اور حق پرستی کا سبق پوشیدہ ہے اور دوسری یہ کہ ان واقعات میں عموماً اس طرح کے امکانات موجود ہیں کہ اُنھیں فنی نقطۂ نظر سے موثر بنایا جا سکتا ہے ۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ ناول نگار نے واقعات کے فنی امکانات سے پورا فائدہ بھی اُٹھایا ہے ۔ مثلاً ہم اُن کے مختلف ناولوں پر الگ الگ نظر ڈالیں تو آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں کہ اُن کی ترتیب اور ساخت میں غور و فکر کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا ۔ ' آخری چٹان' میں اُسلوب اور فن کے اعتبار سے خطابت اور ادبیت کا بڑا موزوں امتزاج ہے ۔ ناول کے واقعات آہستہ آہستہ اُبھرتے اور نقطۂ عروج تک پہنچتے پہنچتے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں ، لفظوں ، فقروں اور جملوں کی ترتیب بھی موزوں ہے اور ناول کے بعض حصوں میں لفظوں کا سیلاب پڑھنے والے کو اپنے ساتھ بہاتا ہوا لے جاتا ہے ۔ عبارت کی ڈرامائی ساخت میں بھی عموماً یکسانی اور ہمواری ہے --- کہانی میں تبلیغی احساس کی لہر کہیں کہیں اُٹھتی ہے لیکن ادبیت برابر اُس کی عناں گیر رہتی ہے --- کرداروں کے نقش واضح ہیں اور اُن کی گفتگو میں اختصار ، ایجاز اور معنوی گہرائی ہے --- اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ مصنف نے کہانی کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے ، ہر چیز کو اُس کی مناسب حیثیت دی ہے ۔

' شاہین ' کی تاثیر میں جہاں ایک طرف اُس کے موضوع کو دخل ہے وہاں دوسری طرف مصنف کے شاعرانہ اور ایمائی اُسلوب ، اختصار و ایجاز سے اور حقیقت نگاری ، اور تخیل کی رنگ آمیزی کے امتزاج کا بھی بڑا ہاتھ ہے ---کچھ منظر نگاری میں مبالغے کی ہلکی سی جھلک ' کرداروں کی مصوری اور خاص کر اُن کے جذبۂ محبت کے اظہار میں سستی جذباتیت سے احتراز ، اصلاحی اور تبلیغی مقصد کے اظہار میں ولولہ اور جوش کے باوجود توازن اور اعتدال اس ناول کی ' مستزاد ' صفات ہیں ۔

اسی طرح 'یوسف بن تاشقین' کی مقبولیت اول تو تاریخ کے اُس باب کی اہمیت کی بنا پر ہے جو اس ناول کا موضوع ہے اور دوسرے مصنف کے فنی احساس کی بنا پر ۔ اس ناول کے اُسلوب میں بھی ہلکے ہلکے اشاروں میں کوئی اہم بات کہنے ، منظر نگاری اور واقعہ نگاری میں ایجاز اور اختصار سے کام لینے اور مقالموں میں ادبیت ، شوخی اور تیکھا پن برتنے کا وہ انداز برابر قائم ہے جسے نسیم حجازی نے موجودہ دور کی ناول نگاری میں عام کیا ہے ۔ اس ناول میں بھی پڑھنے والے کو ' آخری چٹان ' اور ' شاہین ' کے بعض حصوں کی طرح ڈیوما اور اسکاٹ کا عکس صاف نظر آتا ہے ۔

لیکن ' آخری معرکہ' پڑھتے وقت گو قاری کو جا بجا بیان کی قدرت اور مکالموں کی ایمائیت اپنی طرف کھینچتی ہے لیکن وہ یہ بھی محسوس کرنے لگتا ہے کہ نسیم حجازی کے فنی ترکش کے سارے تیر اب ختم ہو چکے۔ اور بار بار انہیں تیروں اور نشتروں سے صید افگنی کی کوشش کی جا رہی ہے جو کند اور ناکارہ ہو چکے ہیں ۔

ایم ۔ اسلم ، نسیم حجازی ، رئیس احمد جعفری اور قیسی رام پوری کے ناول — خواہ وہ تاریخی ہوں ، خواہ معاشرتی نمایاں طور پر قومی ، مذہبی ، اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نظر کے حامل ہیں ۔ لیکن ان چار ناول نگاروں کے علاوہ معروف اور غیر معروف کئی ناول نگاروں نے متعدد ایسے ناول لکھے ، جنھیں اُن کے موضوع اور اُسلوب کے اعتبار سے خالص ادبی اور فنی کہا جا سکتا ہے ۔ اگر پڑھنے والا ان ناولوں کی فہرست مرتب کرنے بیٹھے تو ان کی تعداد مل جل کر اُن اصلاحی ناولوں سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے ، جن کا ابھی ذکر ہوا ہے — پھر بھی جن ناول نگاروں کے کارناموں نے پڑھنے والوں کے مختلف حلقوں میں پسندیدگی کا شرف حاصل کیا ہے اُن میں شوکت تھانوی ، عزیز احمد ، قرۃ العین حیدر ، عشرت رحمانی ، ابو سعید قریشی ، اے ۔ آر خاتون ، اے حمید ، فاطمہ مبین ، عائشہ جمال ، انتظار حسین ، احسن فاروقی اور علی عباس حسینی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

ان ناموں میں سے قرۃ العین حیدر ، اے حمید ، فاطمہ مبین ، عائشہ جمال ، انتظار حسین اور علی عباس حسینی کے نام ناول نگاری کی دنیا میں نئے ہیں — گو ادبی دنیا علی عباس حسینی کو ایک جید افسانہ نگار اور اس فن کے ایک امام کی حیثیت سے اور قرۃ العین حیدر کو افسانہ نگاری کی ایک دلکش روش کے پیرو کی حیثت سے اچھی طرح جانتی ہے ۔ اور اس لئے اُن کے ناولوں کو بڑے اشتیاق سے پڑھتی ہے کہ ان دونوں ناول نگاروں کے ناول ' شاید کہ بہار آئی ' اور ' میرے بھی صنم خانے ' ناول ہونے کے بجائے ان دونوں افسانہ نگاروں کے طرز افسانہ نگاری کی ذرا پھیلی ہوئی شکلیں ہیں ۔ ان ناولوں میں اُسلوب کا وہ حسن تو یقیناً ہے جسے ان دونوں فن کاروں نے اپنا بنایا ہے ، لیکن ناول میں زندگی کا جو پھیلاؤ ، زندگی کے مسائل کی جو سنجیدگی اور فنی فکر کی جو گہرائی ہوتی ہے وہ ان دونوں ناولوں میں نہیں ۔ اس کی کمی ' شاید کہ بہار آئی ' میں ' میرے بھی صنم خانے ' کے مقابلے میں زیادہ محسوس ہوتی ہے ۔ اس لئے کہ ' میرے بھی صنم خانے ' میں فن کے نقطۂ نظر سے کم سے کم یہ بات ضرور ہے کہ انگریزی کے بعض نئے لکھنے والوں کے فن کا پرتو اس میں جا بجا جھلکتا ہے ۔ انتظار حسین اور اے حمید نے تقسیم کے بعد افسانہ نگاری کے فن میں اپنے لئے ایک خاص جگہ بنائی ہے ، انتظار حسین نے ایک خاص ماحول کے مزاج کی مصوری کرکے اور اے حمید نے رومانیت کا ایک اُسلوب اختیار کر کے ۔ انتظار حسین کا ناول چاند گہن ، اور اے حمید کے ناول ڈربے ، جھیل اور کنول اور جہاں برف گرتی ہے ، اُن کے مخصوص اُسلوب افسانہ نگاری کے یقیناً بڑے مرقعے ہیں ۔ ناول کے فن کو ان ناولوں سے اس سے زیادہ کچھ نہیں مل سکا ، جو اُن کے مختصر افسانے زیادہ مختصر اور اس لئے زیادہ دل نشین انداز میں اس سے پہلے دے چکے تھے۔ فاطمہ مبین کے ناول — ' ایرانی ' ' نگار ' اور ' ثریا ' — ایک لحاظ سے پسندیدہ ہیں کہ ان ناولوں میں ناول نگار نے سیاست اور فلسفہ کی اُلجھنوں سے الگ رہ کر روزانہ کی معاشرتی زندگی میں سیدھی سادی کہانیاں نکال لی ہیں اور فن کاری کے کسی ادعا کے بغیر اُنہیں اس طرح ترتیب دیا ہے کہ شروع سے آخر تک اُن کی دلچسپی قائم رہتی ہے ۔ عائشہ جمال کا ناول ' گرد سفر ' ان چند ناولوں میں البتہ ایک ایسا ناول ہے جسے پڑھ کر پڑھنے والے پر اس لئے گہرا اثر ہوتا ہے کہ اس میں خلوص کے آثار ہیں ۔ مصنف نے ناول لکھ کر جیسے دل کی پکار پر ' لبیک ' کہا ہے اور دل کی اس پکار کو اپنی صلاحیتوں کے

مطابق اس طرح مرتب کیا ہے کہ اس میں فن کی طرف سے تغافل کے آثار نہیں ہیں۔

فن کا یہی خلوص شوکت تھانوی ، عشرت رحمانی ، ابو سعید قریشی ، اے۔ آر۔ خاتون اور احسن فاروقی کے ناولوں کی بھی خصوصیت ہے۔ شوکت تھانوی کا خلوص اُن کے اس انداز خاص میں پنہاں ہے جسے اُنھوں نے اپنے سب ناولوں میں یکساں استعمال کیا ہے۔ اُن کے نزدیک ایک ہلکی پھلکی فضا قائم کرکے قاری کے لئے ذھنی سرور و انبساط کا سامان مہیا کرنا کہانی کہنے والے کا پہلا منصب ہے۔ اس منصب کی تکمیل میں شوکت کے شگفتہ مکالموں ، چست فقروں اور لطیف مزاح اور قدرت بیان نے اُن کی مدد کی ہے۔ عشرت رحمانی اور ابو سعید قریشی کے ناولوں کا خلوص اس بات سے ظاہر ہے کہ دونوں اپنے قریبی ماحول پر نظر رکھ کر اجتماعی اور انفرادی زندگی میں سے کسی ایسے مسئلہ کا انتخاب کرتے ہیں جس کی اہمیت معاشرتی بھی ہوتی ہے اور کسی نہ کسی حد تک نفسیاتی بھی۔ اس کے بعد اپنے اپنے مزاج اور صلاحیت کے مطابق اس مسئلہ کو فنی شکل دیتے ہیں۔ ناول کی فنی ترتیب و تشکیل کو دیکھ کر آسانی سے یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اس میں خواہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہو لیکن خلوص اور انہماک کی کمی نہیں۔ اے۔ آر۔ خاتون اور احسن فاروقی کے فن کا خلوص اس بات سے ظاہر ہے کہ یہ دونوں صرف اس ماحول کو اپنے ناول کا موضوع بناتے ہیں جس سے وہ پوری طرح واقف ہیں۔

اس خلوص کی کمی اگر تقسیم کے بعد کے ناولوں میں کہیں سب سے زیادہ نظر آتی ہے تو وہ عزیز احمد کے ناول ' شبنم ' میں۔ شبنم کا مطالعہ قاری کو دو متضاد نتیجے نکالنے پر مجبور کرتا ہے۔ ایک بات جو شبنم کے جستہ جستہ حصوں میں واضح طور پر نمایاں ہے یہ ہے کہ ناول نگار کو ناول نگاری کے فن سے پوری واقفیت بھی ہے اور وہ اسے بڑے حسن کے ساتھ برتنے پر قادر بھی ہے لیکن ساتھ ھی ساتھ یہ کہ اپنے علم اور قدرت سے اس نے سوائے سستی قسم کی پسندیدگی حاصل کرنے کے اور کوئی کام نہیں لیا۔ عزیز احمد کی ناول نگاری عہد حاضر میں فن کے ' استحصال ' اور نا قدری کی سب سے نمایاں مثال ہے۔

اور یوں مجموعی حیثیت سے ان سب ناولوں کو ناول نگاری کی پوری تاریخ میں ، ارتقاء کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو پڑھنے اور سوچنے والے کا تاثر یہ ہوتا ہے کہ ہمارے ناول نگاروں نے ناول کو ایک ہلکی پھلکی صنف سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ مشاہدہ کی جس وسعت اور فکر کی جس گہرائی کے بغیر کوئی فنی تخلیق دلوں کو تسخیر کرنے سے بھی قاصر رہتی ہے ، اور بقائے دوام کے امتیاز سے بھی محروم رھی ہے تقسیم کے بعد کے ناولوں میں عموماً معدوم ہے — ناول کی سب سے اونچی سطح اب بھی وھی ہے جہاں وہ پریم چند کے ہاتھوں پہنچ چکا تھا۔

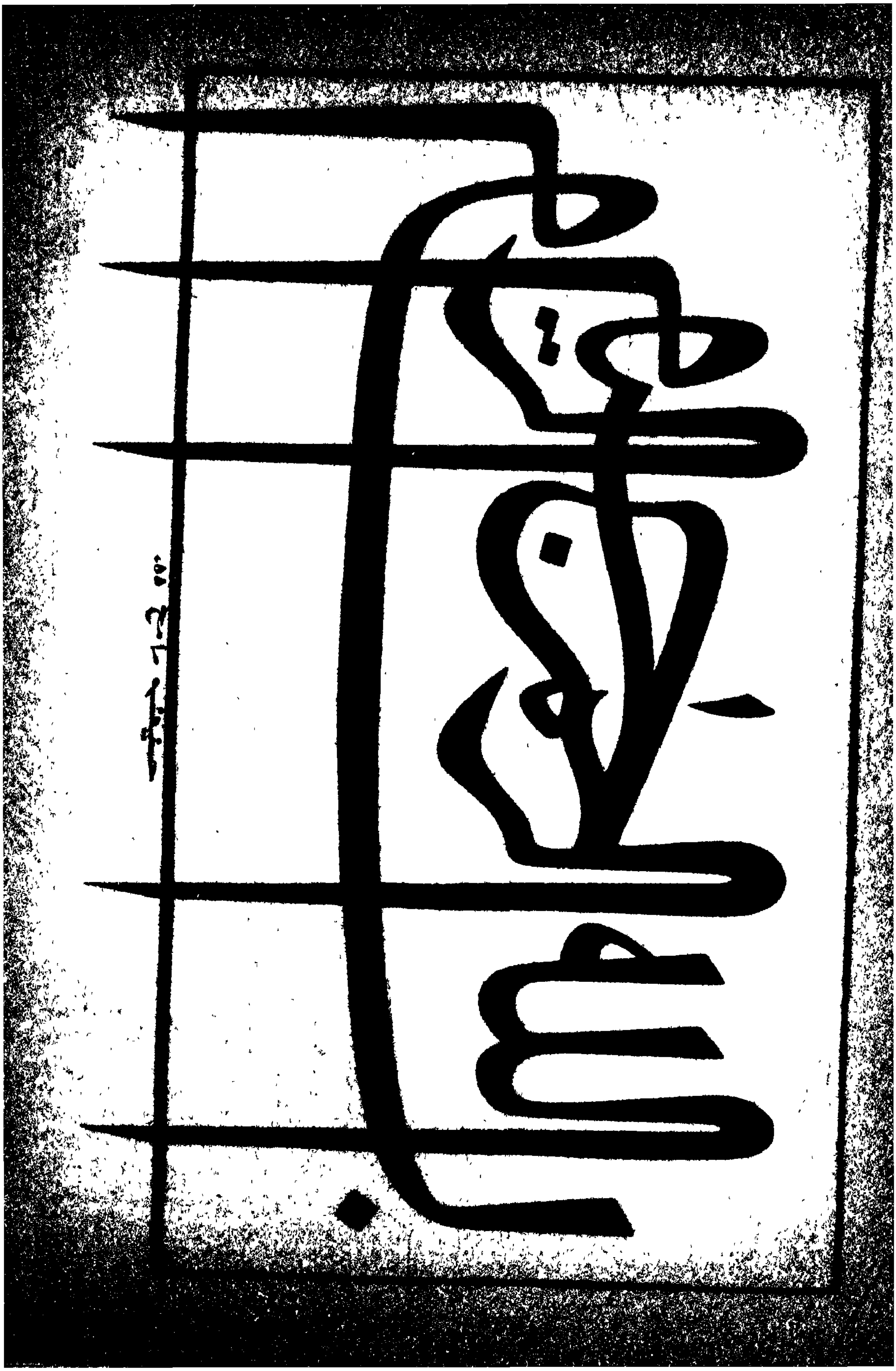
ناول کی تاریخ کے اس سرسری ارتقائی جائزہ کے بعد ، جائزہ لینے والا جب اپنی زبان کے اس سرمائے پر ایک دوسری نظر ڈالتا ہے تو اُسے ان بہت سے ناموں کے ساتھ جنھوں نے اس اہم صنف کے فن کے ارتقاء میں حصہ لیا ہے بعض اور نام بھی تاباں و درخشاں دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً ان ناموں میں ظفر عمر کا نام جاسوسی ناولوں کی ایک ادبی روایت کو استحکام دینے کے سلسلے میں فیاض علی اور صالحہ عابد حسین کے نام بعض ایسے ناول لکھنے کی ضمن میں نا قابل فراموش معلوم ہوتے ہیں جن میں گرد و پیش کی زندگی کے معاشرتی مسائل ، سیرت انسانی کے رد عمل ، فن کے احترام اور زبان و بیان کی صفائی اور پاکیزگی کو ایک ھی زنجیر کی کڑیاں سمجھ کر یکساں اہمیت دی گئی ہے۔ جب تک ہمارے ناول نگار کبھی کبھی ایسے ناول لکھتے رہنے کی روایت قائم رکھیں گے جن میں فنی احساس اور فکری انہماک کو برابر کی جگہ دی گئی ہو ہمارا ناول آگے بڑھتا رہے گا۔

جان پہچان

میر تقی میر

بنائے تازہ

ناصر کاظمی



اگلے زمانے میں کسی کو داد شجاعت دینی ہوتی تو کہتے تھے کہ کس جگی کا پسا کھاتا ہے ۔ یہ زمانہ اپنے ہیرو کو یوں نوازتا ہے کہ اُس کی تصاویر اخبارات اور رسائل میں چھاپ دی جاتی ہیں اور اُس کی مدح میں صفحات سیاہ کیے جاتے ہیں ۔ کچھ روز ممدوح کا نام باجتا ہے اور آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارتا ہے ۔ آج کل ناموں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے کام کو دیکھنے والے ذرا کم ہی ہیں اور یوں بڑے سے بڑا کارنامہ بے توجہی کا شکار ہو رہا ہے —— یہی حال شاعری کا ہے ۔ اگلے وقتوں میں شاعر ' میر مجلس ' ہوتا تھا اور اُس میں اور اُس کے پڑھنے والوں میں براہ راست رابطہ ہوتا تھا ، مگر اس زمانے میں شاعر اور اُس کے قاری کے درمیان کچھ وکلاء آ گئے ہیں ۔ اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ پڑھنے والا شاعر کو براہ راست نہیں پڑھتا بلکہ نقادوں کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور بالآخر اُن کے حتمی فیصلوں سے پریشان ہو کر شاعری ہی کو سلام کر دینا ہے ۔ اب یہ سوال کہ نقاد بھی تو ادب کا قاری ہوتا ہے جو شعر و ادب کو سمجھنے اور سمجھانے میں مدد دیتا ہے ، اس میں اُس کا کیا قصور ؟ یہ درست ہے لیکن شاید قصہ یہ ہے کہ یہاں کوئی ٹھکانے کا نقاد نہیں اور اگر دو ایک ہیں بھی تو وہ ادب کے میدان سے بھاگے ہوئے ہیں اور اُن کی تحریریں بالعموم اُن کے ذاتی مزاج کی جھلکیاں ہی ہوتی ہیں ۔ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو مانو دھرم اور کل انسانی برادری کا احساس فروغ پا رہا ہے تو دوسری طرف سچے انسانی تعلقات کی رسم اٹھتی جا رہی ہے ۔ لوگ یا تو اپنے آپ کو منوانے پر زور صرف کرتے ہیں یا پھر ہار کر کسی ایک کو مان لیتے ہیں ۔ بلکہ اب تو کچھ یہ حالت ہے کہ کیا شاعر ، کیا نقاد اور کیا قاری سب کے سب اپنے ذاتی جذبات کی کال کوٹھری میں رہتے ہیں ۔ اکثر و بیشتر شاعر اور نقاد کیا تو نئے افکار اور نئے تجربوں کی جستجو میں مغرب کی طرف نکلے تھے اب اپنی روایت اور آبائی ورثے کی کھوج میں پیچھے جا رہے ہیں ۔ شاعری میں صرف میر صاحب کو مشعل راہ بنایا گیا ہے ۔ خیر اس میں کیا قباحت ہے ! میر صاحب اس اعزاز کے مستحق ہیں لیکن اُنھیں بھی سمجھنے اور سجھانے کی بجائے اُن کے ایک آدھ رنگ کو لے لیا گیا ہے ۔

ہمارے زمانے میں میر صاحب کا بہت چرچا ہے ۔ آخر اس کی کیا وجہ ؟ اقبال تو خیر ہمارے قومی شاعر ٹھہرے ۔ کیا سرکار عالیہ ، کیا جنتا ، کیا خواص اور کیا عوام سبھی اُنھیں آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں ۔ اُن پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور اُن کی نظموں کے مختلف زبانوں میں تراجم بھی ہو رہے ہیں ، لیکن اقبال کی یہ آؤ بھگت عام طور پر قومی سرخروئی اور ایک مخصوص نقطۂ نظر کے تحت ہو رہی ہے ۔ اس لیے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہونے لگا ہے کہ اقبال شاعر کم ہیں اور لیڈر زیادہ ۔ پھر اُن کے ملی رجحانات اور فلسفیانہ خیالات پر اتنا زور دیا جا رہا ہے کہ شاعری کا قاری کچھ تشنگی سی محسوس کرتا ہے ۔ لیکن خیر کسی بہانے اس فن شریف کی عزت تو ہونے لگی ہے ۔ لوگوں کو یہ محسوس تو ہونے لگا ہے کہ شاعر بھی ملک و ملت کے لیے اہم ہوتا ہے ۔ رہا غالب ، تو غالب پرستی بھی ایک بدعت سی بن کر رہ گئی ہے ۔ وہ غریب شارحین اور مدرسوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے ۔ انیس محض عزاداری کے لیے وقف ہے اور نظیر کو تو خیر پوچ گو اور مبتذل کہہ کر رکھ دیا جاتا ہے ۔ اب میر صاحب کی باری آئی ہے سو اُنھیں بھی خوب خوب اُچھالا جا رہا ہے ۔ کوئی رسالہ اُٹھائیے یا تنقید کی کوئی کتاب دیکھ لیجیے میر ہی میر نظر آتے ہیں ۔

میں بھی میر صاحب کا رسیا ہوں لیکن میر پرست نہیں ۔ میں نے اگر میر صاحب کو مانا ہے تو بڑے جھگڑے اور فساد کے بعد شاید اسی لیے آپ کی سمع خراشی کرنا چاہتا ہوں ۔

میر اپنا جیون ساتھی ہے ، لیکن ایسا ساتھی جس سے ہر قدم پر جھگڑا رہتا ہے ۔ مدت سے ہم ایک گھر میں رہتے ہیں ، ہنستے بولتے ہیں اور روٹھتے منتے رہتے ہیں ۔ اُن سے میری بچپن ہی میں ملاقات ہو گئی تھی لیکن اُن کا تعارف نانا اور والدہ نے کرایا تھا ۔ ابتدائی جماعتوں میں اُن کی ' فقیرانہ آئے صدا کر چلے ' اور ' ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا ' والی غزلیں بھی پڑھی تھیں لیکن اُس وقت اُن کی کارستانیاں سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور نہ ہی پوری کلیات کے پڑھنے کی ہمت تھی ۔ پھر جب شاعری کا شوق ہوا تو غالب اور اقبال کا شہرہ تھا ۔ یوں غالب کوئی آسان شاعر نہیں لیکن اُس کے پڑھنے پڑھانے والوں کی ایک فوج ہے اور اُس کے کلام کا بہترین انتخاب ہمارے سامنے ہے ۔ والدہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ شاعری کا شوق ہے تو پہلے میر صاحب کو پڑھ لو ۔ میر کے بہتر نشتر تو چند دنوں میں حفظ ہو گئے تھے لیکن کلیات کی ضخامت سے جی گھبراتا تھا ۔ بس میر کی چند ننھی منی غزلوں ہی سے جی بہلا لیا تھا اور کبھی کبھی دل میں کڑھتا بھی تھا کہ میر صاحب کے اچھے اشعار اتنے تھوڑے کیوں ہیں اور اُن کا نام اتنا مشہور کیوں ہے ؟ ایک مرتبہ عجیب لطیفہ ہوا ۔ میر صاحب کا یہ شعر پڑھا :

میر صاحب رلا گئے سب کو   کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

شروع ہی سے یہ سکھایا گیا تھا کہ جس سے ملو مؤدبانہ ملو ۔ اپنے کو بڑا نہ سمجھو ۔ حالانکہ بڑا بننے کی ہوس تو شروع ہی سے ہر انسان کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے ۔ میر کا یہ شعر پڑھ کر بڑا تاؤ آیا کہ عجیب بے تمیز شاعر ہے اپنے لیے ' صاحب ' اور ' تشریف لانے ' ایسے لفظوں کا استعمال روا رکھتا ہے ۔ والدہ کے پاس گیا ، نانا ہنس پڑے اور اُنھوں نے غالب کا یہ مصرع پڑھا ع مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں ۔

اس مصرع پر بھی سر دھنے گئے ۔ والدہ کہنے لگیں مقطع میں تخلص تو سبھی شاعر لاتے ہیں لیکن یہاں پورے نام کے آنے سے شاعر کی پوری شخصیت سامنے آجاتی ہے ۔ میں اس وقت چپ سا ہوگیا اور اکثر یہ سوچتا کہ شاید غالب مشکل شاعر ہے اس لیے میر صاحب والدہ کو زیادہ پسند ہیں ۔ اسی عرصے میں گاہے گاہے کلیات میر کی ورق گردانی بھی کر لیتا تھا ۔ نرم شانہ لڑکوں کا ذکر دیکھتا تو حیا آتی ، کفر و الحاد کے شعر پڑھتا تو کانپ جاتا ، شمشیر ، خنجر، تلوار ، تیر، تبر اور کہاں ایسے لفظوں سے دم گھٹتا کہ یا اللہ یہ شاعر ہے یا توپ خانے کا داروغہ ۔ اُنہیں دنوں جدید ادب والوں کا شور تھا ۔ غزل کی مخالفت کے باوجود میں اسی دیوی کے چرنوں سے لگا رہا ۔ پھر یہ دیکھا کہ غالب سے لے کر حسرت تک سبھی غزل گو شاعروں نے اپنے مقطعوں میں ' بقول میر' میر کو تسلیم کیا ہے ۔ ایک دن یکایک مجھے احساس ہوا کہ میں نے میر کے دو تین سو نشتر تلاش کر لیے ہیں ۔ جوں جوں دن گزرتے گئے رنگ رنگ کے لوگوں سے بنی اور بگڑی ۔ کچھ آرزوئیں مرتیں تو اُن کی جگہ نئے ولولے بیدار ہوتے ۔ اب میر کی شاعری میں کسی حد تک مجھے اپنی شخصیت کے کچھ اور نئے پہلو بھی نظر آنے لگے یا یوں کہیے کہ میر صاحب کے کچھ اور رنگوں نے مجھے متوجہ کیا ۔ جگنو پکڑنے اور سنگریزے چننے کے ساتھ ساتھ لفظ تازہ کی تلاش تو مجھے ابتدا ہی سے تھی اب انہیں لفظوں میں جہان معنی نظر آنے لگا ۔ میر کی سیدھی سادی غزلوں اور چھوٹی اور پر سکون بحروں اور عام لفظوں کی تہ میں مجھے اپنے جذبات کا اضطراب محسوس ہونے لگا ۔ ننھے ننھے لفظوں کی کشتیاں عمیق خیالوں اور اتھاہ جذبوں کے سمندر میں کس طرح تیرتی ہیں یہ راز اس وقت سمجھ میں آیا ۔ میر صاحب کا یہ شعر بچپن میں پڑھا تھا :

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے   اُن کو اس روزگار میں دیکھا

یہ شعر اُس وقت بھی جی کو لگا تھا لیکن آج سے ۹ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک رنج دلی

سے دو چار ہونا پڑا ۔ وہ بات سنی جو کان میں نہ تھی اور وہ کچھ دیکھا جو خیال میں بھی نہیں تھا ۔ سننے اور دیکھنے کے دو متضاد تجربے ایک لمحے میں اس طرح سمٹ آتے ہیں کہ دیکھنے اور سننے کی دونوں کیفیتیں گھل مل کر ایک تیسری کیفیت کو جنم دیتی ہیں ۔ یہ 'بلائیں' انسانی دکھ سکھ کے وہ تجربات ہیں جو ہوش سے پہلے سمجھ میں نہیں آ سکتے ۔ اور یہ 'دیکھا' کا لفظ تو میر نے اس اس طور سے برتا ہے کہ جی ہی نکل جاتا ہے ۔ ماضی کے بے شمار تجربے جو انسانوں پر بیتے میر نے انھیں سنا اور ایک 'مقام نظر' پر اس طرح مجتمع کر دیا ہے کہ ہر لفظ ایک اسم بن گیا جو استعارے کا گداز لیے ہوئے ہے ۔

میر کی شاعری کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش آگے چل کر کی جائے گی ۔ پہلے میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کروں گا کہ میر کا پڑھنا ضروری سہی لیکن اسے اتنی غیر معمولی اہمیت کیوں دی جائے ؟ ہمارا اور میر کا آج کیا رشتہ ہے ؟

دیوان میر صاحب ہر اک کی ہے بغل میں   دو چار شعر ان کے ہم بھی لکھا رکھیں گے
شعر پڑھتے پھرتے ہیں سب میر کے   اس قلمرو میں ہے ان کا دور اب

چند اندھوں نے ہاتھی کو اپنے اپنے طور ٹٹولا ۔ کسی نے دم کو محسوس کیا ، کسی نے کان ، کسی نے سونڈ ، کسی نے دانت اور کسی نے ٹانگ اور باہم مل کر طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے ۔ یہی قصہ بڑے شاعر کا ہے کہ وہ آسانی سے قابو میں نہیں آتا ۔ ہوا یہ ہے کہ میر کی پوری شخصیت اور شاعری کے مختلف النوع عناصر کو ایک اکائی میں پرو کر نہیں دیکھا گیا البتہ اس کی شاعری کے چند نمایاں پہلوؤں کو الگ الگ لے کر قطرے میں دجلہ دیکھنے اور دکھانے کا دعویٰ ضرور کیا گیا ہے ۔ کسی نے انھیں غم کا امام کہا تو دوسری طرف سے آواز آئی کہ نہیں صاحب ! میر صاحب کی شاعری میں خوشگوار عناصر بھی ہیں ۔ کسی نے ان کے کفر و الحاد پر طنز کی تو ایسے فرشتہ سیرت انسان ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ۔ لیکن نظم نگاروں نے ہیئت کے تجربے چھوڑ میر کی طویل بحروں میں طبع آزمائی شروع کر دی یا ایک گروہ نے میر کی چھوٹی بحروں کو اصل میر سمجھا ۔ بہرحال یہ تو ہر بڑے شاعر کے ساتھ ہوتا ہے نہ وہ اپنے بعد بہت سے فرقے چھوڑ جاتا ہے :

اچھا پہلے یہ دیکھ لیں کہ میر صاحب کس چکی کا پسا کھاتے تھے ۔ قلم چکی چلائے گا ، میں لفظوں اور خیالوں کی مٹھیاں بھر بھر کر ڈالوں گا ، جو کچھ پس کر گرتا رہے آپ آپسے سمیٹتے رہیں — یہ چکی کیا ہے ؟ وہی دو پاٹ والی پتھر کی چکی ۔ مگر ایک اور چکی بھی تو ہے جسے کبیر جی دیکھ کو رو دیے تھے ۔ میر جی کے زمانے میں یہ چکی ایسی چلی کہ دامن روزگار میں جو تھا پس گیا ۔ بس کہیں کہیں کوئی دانہ جو محور کے قریب رہا وہ تسبیح میں پرویا گیا :

تازہ جھمک تھی شب کو تاروں میں آسماں کے   اس آسیا کو پھر کر شاید کسو نے راھا

میر جس درخت کی چھاؤں میں بڑھ رہے تھے وہ قبل از وقت گر گیا ۔ اس کے بعد انھیں کوئی مشفق نہ ملا ، عزیزان حال نے آنکھیں پھیر لیں اور ہمیشہ اپنا ہی ہاتھ ان کے سر پہ رہا ۔ چکی صبح و شام رنگ بدلتی تھی ۔ میر نوجوان کو چاند میں ایک شکل نظر آنے لگی ۔ وہ شہر غریب ہو گئے ، دیوانگی کی زنجیر پاؤں میں پہن لی ، بہت تڑپے بہت روئے مگر وہ شکل پھر نظر نہ آئی ۔ چکی برابر چلتی رہی ۔ سورج کہ زندگی کا پیام بر ہے میر کی دلی پر آگ اور لہو برساتا تھا اور تارے جو کاروانوں کی رہبری کرتے ہیں خلق خدا کو قہر کی آنکھوں دیکھتے تھے ۔ مسلمانوں کی سلطنت آخری سانس لے رہی تھی ۔ دولت در در کی بھیک مانگتی پھرتی تھی اور کار عدالت کم نسلوں اور ظالموں کے رحم و کرم پر تھا (چار لچے ہیں مستعد کار — دس تلنگے

جو ہوں تو ہے دربار) وہ بلاد اسلامیہ کو تاراج کر رہے تھے ۔ کال ، سیلاب ، خانہ جنگی اور آئے دن کی ہجرت غرض کون سی آفت نہیں تھی ۔ باغ زمانہ شہادت گاہ بنا ہؤا تھا :

رسم و عادت ہے کہ ہر اک دور کا ہوتا ہے ذکر
میر بارے یاد کر روویں گے کیا یہ دور لوگ

لشکریوں ، مزدوروں اور ہنرمندوں کو تنخواہ نہیں ملتی تھی ۔ بادشاہ اور امیر ٹھیکرے میں پانی پیتے تھے ۔ لاج کی ماریاں کنوؤں سے چاہ کرتی تھیں اور سورما رسم جوہر ادا کرتے تھے ۔ کھیتیاں خراب ، اناج کا دانہ گوہرنایاب ، اور محصول کا الگ عذاب :

بلا قحط مروت ہے کہ ہے محصول غلے پر   کہیں سے چار دانے لاد لیویں جابجا حاصل
خوبرو اب نہیں ہیں گندم گوں   میر ہندوستاں میں کال پڑا

کھانے کو اناج تو ملتا نہیں تھا چہروں پر گندمی رنگ اور نمک کہاں سے آتا ۔ پہلے نادر نے غارت گری کی ، پھر ابدالی نے حملے کیے ، مرہٹوں ، روہیلوں اور جاٹوں نے الگ تباہی مچائی ۔ دلی کے ساتھ میر کا دل بھی اُجڑتا رہا اور جمنا کا لال لہو پانی آنکھوں سے ٹپکنے لگا :

دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے   دل خرابہ جیسے دلی شہر ہے
خوش رنگ ہے کس مرتبہ انہار کا پانی   خوناب مری چشم کا ہے آب رواں میں

گلیوں میں کمر کمر گھاس اُگ رہی تھی ۔ انسان تو کیا پرندوں نے بھی بولنا بند کر دیا تھا ۔ بازار بند ، گری پڑی دیواریں ، شکستہ مکان ، دروازے جو بند تھے اندر ہی اندر فریاد و فغاں کرتے جو کھلے رہ گئے تھے دونوں ہاتھوں سے سینہ زنی کرتے تھے ۔ ہر لحظہ کوچ کا نقارہ بجتا اور شہر خالی ہو جاتے ۔ زخمی اور بھوکے جانور سوکھ کر کانٹا اور سوار ہراساں ، ستم رسیدہ خلقت چرخ سیہ کاسہ کی مہمان تھی اور سہر و مہ کی خالی رکابیوں میں حادثوں کے سوا کچھ نہ تھا ۔ ان اندوہ ناک واقعات کا اثر زبان اور ادب اور دوسری قدروں پر بھی پڑا :

احوال اُس شکار زبوں کا ہے جائے رحم   جس ناتواں کو مفت نہ قصاب لے گیا
غیر نے ہم کو ذبح کیا نے طاقت ہے نے یارا ہے
اس کتے نے کر کے دلیری صید حرم کو مارا ہے

یہ مزاحیہ یا پوچ اشعار نہیں ۔ شہر آشوب اور مثنویوں میں سودا اور میر صاحب کے دوسرے ہم عصروں نے بھی ان حالات کا نقشہ کھینچا ہے مگر دیکھیے میر صاحب نے پامال چیزوں ، بھوکے جانوروں اور شکستہ حال لشکریوں کو غزل میں کس طرح جگہ دی ہے ۔ کیسے کیسے کرخت اور سنگلاخ الفاظ میر جی نے اس طوطئ نفیس مزاج کو رٹا دیے ۔ غور کیجیے غزل میں آہو کی جگہ کتے کا لفظ کیا کام کر رہا ہے ۔ یہ کتا کون ہے جس نے دلیری کر کے صید حرم کو پچھاڑ دیا :

تیرا کوچہ ہے ستم گار وہ کافر جاگہ   کہ جہاں مارے گئے کتنے مسلماں یکجا
تری گلی میں سدا اے کشندۂ عالم   ہزاروں آتی ہوئیں چارپائیاں دیکھیں

یہ چارپائیوں کا لفظ اور یہ کشندۂ عالم کیسے بھونڈے اور ثقیل ہیں مگر میر کے یہاں ایسے اشعار خاصی تعداد میں ہیں جنھیں ایک تہ کا پڑھنے والا گھٹیا سمجھ کر سرسری طور پر گزر جاتا ہے ۔ بات یہ ہے کہ بیرونی حملہ آور اپنے ساتھ بہت کچھ لاتے ہیں اور بہت کچھ چھوڑ جاتے ہیں اور مختلف قوموں کی باہمی جنگ و جدل اور میل ملاپ کا اثر اجتماعی زندگی پر بھی پڑتا ہے ۔ میر صاحب کی شاعری پر بھی ان انقلابات کا غیر معمولی اثر پڑا ۔ اُن پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اُن کے کلام میں بھرتی کے اشعار بہت ہیں ۔ مگر اعتراض کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ اُنھوں نے میر صاحب کے مقابلے میں کتنی زندگی گزاری ہے اور اس کے بارے میں اُن کے تجربے کی کیا نوعیت ہے ۔ بڑا شاعر ایک بھرپور انسان بھی

ہوتا ہے اور اُس کی شخصیت میں بہت سی تہیں ہوتی ہیں مگر چونکہ اس کا ذریعۂ اظہار زبان ہے اس لیے وہ اپنے تخلیقی سفر میں بھی تنہا نہیں ہوتا ۔ وہ بے شمار تجربوں کے جہنم سے گزر کر اپنی جست تخلیق کرتا ہے ۔ لہٰذا پڑھنے والے کو بھی اُس کے فن کو پورے طور پر محسوس کرنے کے لیے اس جہنم سے گزرنا پڑتا ہے ۔ یوں سمجھیے کہ بڑے شاعر کا پڑھنا ایک سخت امتحان ہے وہ ہر لمحہ آپ کو زندگی کے نئے گوشے اور نئے تجربے سے روشناس کر کے چیلنج کرتا ہے ، وہ کسی قدر بے درد اور پھکڑ بھی ہوتا ہے اور اس پھکڑ پن سے غیر شاعر بدکتے ہیں ۔ شاید یہ شعر کبھی آپ کی نظر سے گزرا ہو :

یاں پلیتھن نکل گیا واں غیر   اپنی تکی لگائے جاتا ہے

بظاہر یہ شعر آدمی کے سستے اور عمومی جذبات کو اس قدر برانگیختہ کر سکتا ہے کہ معقول سے معقول قاری بھی اُن کی رو میں بہ کر اس طرح قہقہے لگانے لگے کہ آسے اپنے مبتذل ہونے پر کوئی شک نہ رہے لیکن ردعمل کے طور پر ایسا معقول قاری بالکل ویران ہو سکتا ہے اور انھیں ویران لمحوں میں یہ شعر اپنا آپا دکھاتا ہے ۔ اس میں بھونڈے قہقہوں کی گونج کے ساتھ وہ المناک تجربہ اپنی پوری سدت کے ساتھ سمویا ہوا ہے جس پر دھاڑیں مار مار کر رویا بھی جا سکتا ہے — دلی اُجڑ چکی تھی ، اُس کا تمدن اُس کی تہذیب دم توڑ رہی تھی اور موت بھی اُس سے گریزاں تھی ۔ یہ المیہ اتنا ناقابل برداشت ہے کہ اس پر رویا بھی نہیں جا سکتا ۔ اس الم کی دربستگی سے پیدا ہونے والے عجز سے بچنے کے لیے قہقہہ ھی لگایا جا سکتا ہے ۔ میر نے یہاں ایک ماہر نفسیات کی طرح انسان کے سستے جذبات کو جگا کر آسے بلندی کا زینہ دکھایا ہے ۔ کلیات میر میں اس نوع کے اشعار وہ منزلیں ہیں جہاں سے ذہین قاری بھی اس طرح بھٹک سکتا ہے کہ میر کی پوری شخصیت آس سے اوجھل ہو جائے ۔

میر کے اجداد سپاہی پیشہ ، عالم اور درویش تھے ۔ یہ قدریں انھیں ورثے میں ملی تھیں اور ان کی حفاظت کے لیے میر کو اپنے علاوہ بیرونی طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا اور انھیں قدروں نے اُن کی رہبری کی ۔ عبرت ناک میر کے یہ قہقہے اُس معاشرے کی عبرت ناک تصویریں ہیں ۔ یوں اُن کے غم کو محض غم پرستی بھی کہنا جائز نہیں کہ وہ اپنے دکھ اور خواہشات کو ایک عام انسانی جذبات کی حیثیت دے کر آسے اس طرح ادا کر جاتے ہیں جیسے وہ تمام دوسرے انسانوں کی طرف سے کہا ہو ۔ وہ اپنے ذاتی تجربے کو ایک اجتماعی رویے کی شکل دے دیتے ہیں ۔ اب رہی اُن کی غم پرستی تو اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اُس زمانے میں ایسی کون سی خوشی کی بات تھی اور بادشاہ سے لے کر ایک گدائے بے نوا تک کون خوش حال تھا کہ لال قلعے میں میاں تان سین طنبورہ لے کر بیٹھ جاتے اور ایسا کون مرد مجاھد تھا کہ دو آدمیوں کو بھی بغل میں دبا کر قلعے کی فصیل سے نیچے گرا دیتا ۔ شمشیر و سناں کی جگہ طاؤس و رباب نے لے لی تھی ۔ علم و ہنر کی رسم اُٹھ چکی تھی ۔ جس نے جو چاہا کیا ۔ جانے والے تخت طاؤس ، کوہ نور کا ہیرا ، عقیق و مرجاں کی ٹہنیاں اور عصمت کے پھول چن چن کر لے گئے ۔ خون کی ہولی اور زرد چہروں کی بسنت چھوڑ گئے مگر اس دور مصائب میں بھی میر نے اپنی قومی روایت ، خاندانی نجابت اور عالی حوصلگی کو نہیں چھوڑا :

معرکہ گرم تو ہو لینے دو خونریزی کا   پہلے تلوار کے نیچے ہمیں جا بیٹھیں گے
غربت سے تنگ آ کر غیرت سے لڑ مریں گے   آگے بھی میر سید کرتے رہے ہیں ساکا

ڈاکٹر کلیم الدین احمد کے تنقیدی سرمائے میں سے اردو غزل کے بارے میں بس یہ دلچسپ فقرہ کہ ' غزل ایک نیم وحشیانہ صنف سخن ہے ' مشہور ہؤا ہے ۔ اس میں کیا کہا گیا ہے یہ تو نقاد جانیں ۔ تعجب یہ ہے کہ پروفیسر صاحب کو میر صاحب کی شاعری میں ' اُمید کا ستارہ ' کہیں نظر نہیں آتا ۔ مگر اس میں اُن کا کیا قصور ؟ درسی کتابوں کی چھت کے نیچے تو آسمان

بھی نظر نہیں آتا ۔ معلوم نہیں انھوں نے میر کو کس طرح دیکھا ہے اور خود زندگی کیسے گزاری ہے ۔ یوں آج کل غم اور خوشی کا تصور بھی عجیب سا ہے ۔ جہاں غم کا لفظ سنا آنکھیں تر کر لیں خوشی کا لفظ پڑھا تو پھڑک گئے ۔ غم اور خوشی آمید اور نا آمیدی ایک دوسرے کی سوت نہیں بلکہ زوجین ہیں اور بڑے شاعر کا احساس الم غم پرستی نہیں بلکہ خود آگاہی اور زندگی کا پیغام ہوتا ہے :

لذت زہر غم فرقت دلداراں سے ہووے منہ میں جنھوں کے شہد و شکر مت پوچھو

یہاں غم اور خوشی ایک ایسی بھرپور کیفیت میں اس طرح حل ہوگئے ہیں کہ وجدان میں تھرتھری سی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اب آن کا رونا دیکھیے یہ رونا نہیں بغاوت کا اعلان ہے :

عشق میں دم مارا نہ کبھو تم چپکے چپکے میر کھپے
لوھو منہ پر مل کو اب فریاد کرو تو بہتر ہے
قطرہ قطرہ اشکباری تا کجا پیش سحاب
ایک دن تو ٹوٹ پڑ اے دیدۂ تر ھو سو ھو

میر نے تو جاگنے اور خواب کرنے کو بھی ملا رکھا تھا اور آن کے نزدیک موت بھی زندگی سے جدا نہ تھی :

جی میں پھرتا ہے میر وہ میرے جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں
موت اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

مجھے یہاں میر کے ایک شعر کے ساتھ میاں مصحفی کا بھی ایک شعر یاد آ گیا ۔

مصحفی	میر
بڑی بلا ہیں ستم کشتۂ محبت بھی	جب مصحفی تیغ اس نے کھینچی
جو تیغ برسے تو سر کو نہ کچھ پناہ کریں	ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی

یوں ایک اژدر کے مقابلے میں ایک کنسلائی کو لانا ستم ظریفی ہے مگر یہ زیادتی میں نے نہیں کی ۔ بڑے بڑوں کو مصحفی کے اس شعر پہ ریشہ خطمی ہوتے دیکھا ہے ۔ کسی نے اس پہ تغزل اور زبان دانی ختم کر دی کسی نے اسے لکھنؤ کلچر کا نمائندہ بنا دیا اور رنگ میر تو خیر ہر شاعر میں نکال ہی لیا جاتا ہے ۔ ایک زمانے میں یہ شعر مجھے بھی اچھا لگا تھا اور میں اس کی خوبیوں کو سمجھتا ہوں لیکن میر کا شعر پڑھ کر طبیعت بدل گئی ۔ مصحفی نے میر کے شعر کو الٹا کر نزاکت احساس تو پیدا کر دی پر میر صاحب کے شعر میں جو فاعلی عمل ہے آسے نہ دیکھا ۔ میر عشق پیشہ نے تیغ کے وار کو مردانہ وار روکا ہے اور محبت و شجاعت کو ملا کر شعر میں زندگی کا خون دوڑا دیا ہے ۔ یہاں شاید کسی کو یہ اعتراض ہو کہ یہ میدان جنگ کا قصہ نہیں بلکہ معاملات حسن و عشق ہیں ۔ چلو یہ بھی مان لیا مگر مگر عاشق مفعولیت ہرگز نہیں برداشت کر سکتا ۔ پھر ستم سہنے کا بھی سلیقہ ہوتا ہے ۔ غالب نے بھی معشوق کے ' دھول دھپے ' کھائے تھے اور میر بھی ' لات مکی ' کھا کر مزے میں ٹال گئے مگر کس طرح ؟ چھیڑتا ہوں کہ آن کو غصہ آئے (غالب) میں آپ چھیڑ چھیڑ کے کھاتا ہوں گالیاں (میر) ۔ اس بحث سے صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ میر کے یہاں عاشق و معشوق کے تعلقات بھی انسانی سطح پر ہوتے ہیں ۔ وہ انسان میں باہمی محبت ، آدمیت اور عزت نفس دیکھنا چاہتے ہیں ۔ یہ الگ بات کہ وہ حفظ مراتب کا لحاظ بھی رکھتے ہیں اور کسی کے مرتبے میں دوسرے کو شریک نہیں کرتے ۔ ویسے میر کی شاعری میں فلسفۂ زیست بھی نکالا جا سکتا ہے کہ آن کی شاعری کے محرکات عام انسانی تجربات ہیں ۔ وہ لفظوں کا انتخاب اس طرح کرتے ہیں کہ تخصیص اور عمومیت کا امتیاز نہیں رہتا بلکہ تجربات کے بہت سے مراحل شاعر کی اندرونی تحریک میں ڈھل کر ایک نئے تجربہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ۔ میر صاحب شعر کیا کہتے

ہیں ، باتیں کرتے ہیں اور شاید اسی لیے وہ اپنے اشعار کو ' باتیں ' کہتے ہیں ۔ سچے واقعات اور مشاہدات تخلیق کا مواد تو ہوتے ہی ہیں لیکن وہ بذات خود تخلیق کے عناصر نہیں ہوتے ۔ شاعر اپنے حافظے کے وجدان سے انہیں نیا تجربہ بنا دیتا ہے ۔ ویسے ایک عام انسان کا حافظہ بھی واقعات کو ہو بہو یاد نہیں رکھتا بلکہ انتخاب کرتا ہے ۔ اس سلسلے میں یہ شعر دیکھیے :

نیزہ بازان مژہ میں دل کی حالت کیا کہوں   ایک ناکسی سپاہی دکھنیوں میں گھر گیا
ہو گا کسو دیوار کے سائے کے تلے میر   کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

پہلا شعر اس زمانے کا ہے جب میر ایلچی بن کر شاہی لشکر میں گئے تھے ۔ ذکر میر میں امیر الدولہ ، حسام الدولہ یا شاید نجف خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ اول الذکر دونوں تو خبر اڑاؤ سپاہی تھے نجف خاں کو مخالفوں اور بے وقت موت نے کچھ کرنے نہ دیا پھر میر صاحب خود سپاہی پیشہ ہونے کے باوجود باعمل سپاہی نہ تھے ۔ مجھے تو یہ شعر اسی زمانے کے تجربے کی پیداوار لگتا ہے ۔ دوسرا شعر غالباً سفر لکھنؤ کے زمانے کا ہے ۔ میر کمہیر میں تھے ۔ یہ واقعہ ۱۷۶۶ یا ۱۷۶۷ء کا ہے ۔ ذکر میر میں میر لکھتے ہیں کہ " میں نے راجہ (ناگرمل) سے کہا ایک عرصہ سے آپ کا انتظار کر رہا تھا اب اجازت دیجیے کہ کسی طرف چلا جاؤں ۔" انہوں نے کہا " میں ایسی حالت میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا " — " کیونکہ شاہ جہان آباد اس وقت ویرانہ سے بڑھ کر تھا میں نے ان کی دیوار کے سائے میں رہنا غنیمت سمجھا ۔" اسی طرح دو تین جنگوں میں بھی میر بذات خود شریک تھے ۔ دو ایک بار انہیں بھی ہارے ہوئے سپاہی کی طرح واپس آ کر سرائے میں ٹھہرنا پڑا ۔ اس تجربے کو میر صاحب نے کتنا وسیع کر دیا ہے :

رہتے ہیں یوں پریشاں حواس کہ جوں کہیں   دو تین آ کے لوٹے مسافر اتر رہیں
اب صبر و عقل و ہوش کی میرے ہے یہ معاش   جوں قافلہ لٹا ہوا آ کر اتر رہے
عاشق خراب حال ترے ہیں گرے پڑے   جوں لشکر شکستہ پریشاں اتر رہے

میر نے ان حوادث کو اپنی شخصیت میں حل کیا ہے ۔ اور پریشاں حواس کو مسافر کہہ کر شخصیت بنا دیا ہے ۔ اس دور میں " زندگی کرنا " بلکہ زندہ رہنا میر جگرداری کا حوصلہ تھا ۔ جو شخص اپنے حواس بھی قائم رکھ سکا وہ نظامی ٹھہرا :

کیا فکر کروں میں کہ ٹلے آگے سے گردوں   یہ گاڑی مری راہ میں بے ڈول اڑی ہے
ہزار بار گھڑی بھر میں میر مرتے ہیں   انھوں نے زندگی کا ڈھب نیا نکالا ہے

میر کا ایک اور شعر مجھے خاص طور پر پسند ہے — یوں لگتا ہے کہ یہ شعر میر صاحب نے اپنے کسی بڑے ہم عصر کے بارے میں کہا ہے :

نعمت رنگا رنگ حق سے بہرہ بخت سیاہ کو نہیں
سانپ رہا گو گنج کے اوپر کھانے کو تو کھائی خاک

کسی فن پارے کو تاریخی دستاویز کے طور پر دیکھنا درست نہیں لیکن اگر شاعر کا تجربہ وسیع ہو تو اس کی شاعری بھی اپنے زمانے کی تصویر بن جاتی ہے ۔ یہ کام میر نے اپنے مقطعوں سے بھی لیا ہے اور اپنا تو یہ خیال ہے کہ میر سے بہتر تخلص کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا ۔ میر صاحب میر سوز سے اس اشتراک تخلص کی وجہ سے ناراض تھے لکھتے ہیں " ہر چند طرز علیحدہ دارد لیکن از خوش کردن تخلص من نصف نام ازو خوش است " غالب کے مقطعے بھی ایک پوری شخصیت کا اظہار ہیں مگر میر کے مقطعوں میں زیادہ وسعت ہوتی ہے ۔ یہ الگ بات کہ مومن و فانی کے مقطعوں کا بڑا شہرہ ہے مگر ان میں بالعموم ایک ہی طرح کا مضمون بار بار دہرایا گیا ہے ۔ میر کا تخلص محض میر تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ پورے معاشرے کا استعارہ بن جاتا ہے :

ع ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے ع میر ان لوگوں میں کس کا نام ہے
ع مر نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے ع ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا
قرط گریہ سے ہؤا سر تباہ اپنا جہاز تختہ پارے گئے کیا جانوں کدھر پانی میں

یوں لگتا ہے کہ اجڑی ہوئی دلی کے لوگ شہر سے باہر آ کر جمنا کے کنارے کھڑے ہو کر دلی کو رو رہے ہیں ۔ لفظوں کی آوازوں سے جہاز کے ڈوبنے کا پورا عمل سامنے آ جاتا ہے ۔ یہاں میر کا رونا ایک ڈوبتی ہوئی تہذیب کی کتھا بن گیا ہے ۔ میر نے ویرانی پر سینکڑوں شعر کہے ہیں جن میں اپنے زمانے کے Wasteland کی جانگداز تصویریں کھینچی ہیں ۔ دیکھیے اسمائے معرفہ نے ان اشعار میں کیا کام کیا ہے :

خالی پڑا ہے خانۂ دولت وزیر کا باور نہیں تو آصف آصف پکار دیکھ
مسکن جہاں تھا دل زدہ مسکیں کا ہم تو واں کل دیر میر میر پکارے ، نہیں ہے اب

ان ہولناکیوں میں بھی میر صاحب دل جمعی سے زندہ رہے، مٹتی ہوئی قدروں کی حفاظت کرتے رہے ۔ یتیمی ، مفلسی ، غریب الوطنی ، عزیزوں کی بے سہری اور ہم عصروں کی چشمکیں غرض کیا نہیں تھا ۔ وہ کم آمیزی کے باوجود دوستوں سے ملتے تھے ، مراختوں اور مشاعروں میں شریک ہوتے رہے ۔ غیرت مندی اور خود داری کے باوجود ہر چڑھتے سورج کے ساتھ رہے ۔ دیوانگی بھی کی لیکن شعور کے ساتھ ۔ اُن کی بے رہروی عام انسانوں کی سی نہ تھی بلکہ ایک تخلیقی سفر تھا :

مری کجروی سادگی سے ہے میر بہت اس روبے پہ گمراہ ہوں

میر کے عشق کا قصہ تو گلی گلی میں مشہور ہے ۔ اُن کی جان آرزو کون تھی یہ آج تک ایک سربستہ راز ہے ۔ خیال ہے کہ یہ فتنہ گھر ہی سے اُٹھا تھا ۔ تذکروں میں اتنا لکھا ہے کہ وہ ایک ' پری تمثال عزیزہ ' کی محبت میں گرفتار تھے ۔ گو اس عشق میں وہ ناکام رہے لیکن یہ جذبہ پھیل کر ایک وسیع انسانی تجربہ بن گیا ہے ۔ وطن اور محبوب کی جدائی میں وہ حضرت یوسف کی پیروی کرتے رہے ۔ یہ قصہ میر کی شاعری کا ' احسن القصص ' ہے ۔ اس پر تفصیل سے پھر کبھی لکھوں گا فی الحال دو شعر سن لیجیے :

نگیں عاشق و معشوق کے رنگ جدا رہتے ہیں ہم وہ ایک گھر میں
ہم وے ہر چند کہ ہم خانہ ہیں دونوں لیکن روش عاشق و معشوق جدا رہتے ہیں

میر صاحب ایک زندہ دل آدمی تھے مگر آوباش نہ تھے ۔ دختررز کو کبھی منہ نہ لگایا ، شاید افیون کا استعمال گاہ گاہ کر لیتے ہوں اور اس کی وجہ اُن کی بعض جسمانی بیماریاں معلوم ہوتی ہیں ۔ انھیں بے خوابی اور درد قولنج کی تکلیف شروع ہی سے تھی ۔ کیا عجب ہے کہ درد قولنج انھیں ورثے میں ہی ملا ہو ۔ ذکر میر میں میر صاحب نے اپنے والد کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اس قدر روتے تھے کہ اُن کا نالہ آسمان تک جاتا تھا ۔ یہی قصہ میر صاحب کی نالہ و زاری کا ہے ۔ اغلب ہے کہ یہ درد قولنج کی لہر ہے ۔ افیون درد قولنج اور بے خوابی کے مریضوں کو آج بھی کئی طریقوں سے دی جاتی ہے ۔ اب افیون کے بارے میں میر صاحب کے چند اشعار دیکھیے :

بادشاہ وقت تھا میں تخت تھا میرا دماغ جی کے چاروں اور اک جوش گل تریاک تھا
افیوں ہی کے تو دل شدہ ہم رو سیاہ ہیں ہو تخت کچھ دماغ تو پھر بادشاہ ہیں
تاحد نظر چھا رہے ہیں لالۂ صد برگ جنگل بھرے ہیں سب گل تریاک سے اب تک

پہلا شعر ذاتی تجربے کے بغیر نہیں کہا جا سکتا ۔ پھر میر صاحب کی اکثر لمبی اور بعض چھوٹی بحروں کی غزلوں میں کہیں کہیں اکھڑی ہوئی زبان سے نشے کی پینک مترشح ہوتی ہے ۔ یہ اکھڑے اکھڑے اشعار ہمارے زمانے کی ڈکشن کا خاصہ ہے ۔ یہ شعر قابل غور ہے ۔

ان اُجڑی اُجڑی بستیوں میں دل نہیں لگتا
جی میں ہے وہاں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

میرصاحب کے دل کے ساتھ شعر میں لفظوں کا بھی جی نہیں لگتا ۔ اسی طرح مذکورہ بالا اشعار میں آخری شعر کے الفاظ اس طرح ایک دوسرے پر گرتے پڑتے نظر آتے ہیں جیسے پولیس کی لاٹھی چارج کے بعد ہجوم کی حالت ہوتی ہے ۔ میر صوفی نہ تھے البتہ اُن پر فقرا اور صوفیا کی صحبت کا اثر ضرور پڑا ۔ وہ شیعہ مسلمان تھے اور تفضیل علی کے قائل تھے ۔ ذکر میر میں میر صاحب نے اپنے والد کی جو تصویر کھینچی ہے اسے دیکھ کر مجھے نہج البلاغۃ کے چند خطبے یاد آنے ہیں ۔ حضرت علی کا زمانہ بھی خاصا پر آشوب تھا ۔ چار سال کے عرصۂ خلافت میں انہیں سکون نصیب نہ ہوا ۔ اسی لیے اُن کے خطبوں میں بے ثباتی دنیا اور بے وفائی یاراں کی عبرت ناک تصویریں جا بجا نظر آتی ہیں اور کوچ کا نقارہ سنائی دیتا ہے ۔ مگر یہ قنوطیت نہیں ، عربی میں دنیا کے معنی (IMMIDIATE) کے ہیں یعنی حال کے فوری لمحات ۔ میر نے بھی اسی دنیا سے بیزاری کا اظہار کیا ہے ۔ جب عرصۂ حیات تنگ ہوا اور حکومت کا شیرازہ بکھر گیا تو وہ ایک عرصہ تک گوشہ نشین رہے لیکن اُن کی درویشی یک سچے مسلمان کی قناعت ہے کہ وہ انسان کو اس وقت ذہنی انتشار سے بچاتی ہے جب وہ کوشش کے باوجود بھی گوہر مراد نہ پا سکے ۔ یوں دیکھیے تو میر کی درویشی بھی میرزائی سے کم نہ تھی ۔

بے پروائی درویشی کی تھوڑی جب آئی
جب کہ فقیری کے اوپر میں خرچ بڑی سی دولت کی
خالی ہاتھ سیہ‌رو ایسے کا شے کو تھے گریہ کناں
جن روزوں درویش ہوئے تھے پاس ہمارے دولت تھی

اب تصوف اور اسلام کے بارے میں بھی اُن کے دو شعر سن لیجیے :

تصوف میں جب ڈال دیتے ہیں بات ۔۔۔ خدا رس کہیں ہیں یہ توحید ہے
معاذاللہ دخل کفر ہے اسلام میں کیوں ہو ۔۔۔ غلط ہے پوچ نامعقول بعضے یار کہتے ہیں

مگر اُن کا تصور مذہب محدود نہیں تھا ۔ وہ درد مندی ، آدمیت اور انسانی محبت کے متلاشی تھے کہ محض شاعری کمال انسان نہیں ۔ یہاں اقبال میر کے ہمنوا نظر آتے ہیں :

اے میر شعر کہنا کیا ہے کمال انسان ۔۔۔ یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آگیا ہے

اردو شاعری پر میر کی شاعری کے اثرات بڑے گہرے اور دور رس ہیں ۔ اُن کے بعد آنے والے سبھی کاملان فن نے اُن سے تھوڑا بہت فیض ضرور اٹھایا ہے مگر اُن کی تقلید کسی کو راس نہیں آئی ۔ غالب ہی ایک ایسا شاعر ہے جس نے میر سے بڑی کاریگری اور کامیابی سے رنگ لیا اور ایک الگ عمارت بنائی ، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ میرصاحب کا پہلا تخلیقی طالب علم تو غالب ہی ہے ۔ یہ بات میں نے غالب کو گھٹانے یا میر کو بڑھانے کی نیت سے نہیں کی بلکہ اس کی بعض وجوہات ہیں ۔ غالب نے جب آنکھ کھولی تو میر ہی اقلیم سخن کے فرمانروا تھے ۔ مشہور ہے کہ کسی نے غالب کی ایک غزل میر صاحب کو دکھائی تھی تو میر صاحب نے یہ کہا تھا کہ اگر یہ جوان صحیح راستے پر چل نکلا تو کبھی بڑا شاعر ہو جائے گا ۔ یوں دیکھیے تو میر صاحب ایک طرح سے غالب اور اقبال کے آنے کی خبر دے گئے تھے ۔

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد
تیز رکھیو سر ہر خار کو اے دشت جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ‌پا میرے بعد

غالب نے میر سے کیا کچھ لیا ہے وہ میں کسی اور وقت لکھوں گا فی الحال آپ خود دیکھنے

کی کوشش کیجیے ۔ غالب نے میر صاحب کو جہاں ' بقول ناسخ ' یا ' کوئی میر بھی تھا ' کہہ کر مانا ہے وہاں یہ شعر بھی تو کہا ہے ۔

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

اگلے زمانے میں صاحب دیوان بن جانا معمولی بات نہ تھی کہ دیوان کو شاعر کی بھرپور شخصیت کا اظہار سمجھا جاتا تھا ۔ یہ درست کہ دیوان میں بعض تکنیکی پابندیوں کی وجہ سے ایک تصنع پیدا ہو جاتا ہے مگر یہی تو ایک بڑے شاعر کا امتحان ہے ۔ میر صاحب کے چھ دیوان ہیں ۔ اس کے علاوہ دوسری اصناف سخن کو بھی برتا ہے ۔ یہ دعویٰ انھوں نے یونہی تو نہیں کر دیا تھا :

کس کس طرح سے میر نے کاٹا ہے عمر کو
ٹک آمر آخر آن کے یہ ریختہ کہا
ٹک سن کہ سو برس کی ناموس خامشی کھو
دو چار دل کی باتیں اب منہ پر آئیاں ہیں

اپنے دیوان کی ضخامت کا میر صاحب کو بھی احساس ہے اسی لیے اس کے بارے میں بھی انھوں نے اس قسم کے اشعار کہہ رکھے ہیں :

آج رہی نہیں خامے کی زباں رکھیو معاف　　حرف کا طول بھی جو مجھ سے گھٹایا نہ گیا
عیب طول کلام مت کریو　　کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا

دیوان ، غزل ، شعر ، بیت ، سخن ، کلام اور شاعری کے بارے میں بھی بہت سے اشعار ہیں ۔ یہاں ایک ہمسی کا شعر سن لیجیے :

قیامت کو جرمانۂ شاعری پر　　مرے سر سے میرا ہی دیوان مارا

' جرمانۂ شاعری ' کے احساس کے بغیر شاعری نہیں ہو سکتی ۔ یہ تخلیقی تنقید ہے ۔ اب کلیات میر کا تو یہ احوال ہے کہ بعض بزرگوں کو اس میں صرف بہتر کربلائی مجاہد ہی نظر آئے مگر اپنا خیال تو یہ ہے کہ ایک اعتبار سے ساری کلیات ہی انتخاب ہے ۔ میر صاحب نے غالب کی طرح انتخاب نہیں کیا تو اس کی کوئی وجہ بھی ہے ۔ غالب کو اپنے شعروں کے انتخاب نے خاصا رسوا کیا تھا مگر میر صاحب بھی اس سے بے خبر نہ تھے :

لگا نہ ایک بھی حیف اس کی بیت ابرو کو　　اگرچہ شعر ہیں سب میرے انتخاب زدہ

کہا جاتا ہے کہ میر صاحب شعر لکھ کر کاٹتے نہ تھے ۔ یہ ' انتخاب زدہ ' کی ترکیب دیکھیے ، کیا اب بھی کوئی شک ہے ۔ ویسے میر صاحب اردو شاعری کے پہلے نقاد بھی ہیں ۔ اُن کا تذکرہ ' نکات الشعراء ' تو خیر باقاعدہ طور پر ایک تنقیدی کتاب ہے ۔ اس میں میر صاحب نے چبھتی ہوئی باتیں بھی کہی ہیں کہ فن کے معاملے میں وہ بہت سخت تھے ، ادب اور شرافت کا گھپلا نہیں کرتے تھے ۔ اب دیکھیے انھوں نے اردو تنقید کو کس قدر الفاظ دیے ہیں ۔ بے تہی ، طرف ، طرفیں ، طرزیں ، طرز ، مرتبہ ، پر بے رتبہ ، ڈھب ، عیب ، ہنر ، طور ، معارض ، صانع ، صناع ، صنعت گری ، شاعران حال ، ناظمان حال ، ناظم ، شاعر ، موزوں طبع ، ہوج باقی ، بیت بحثی ، سرمشقی ، خشکئی شعر ، گرمئی مصرعہ ، شعر حالی اور ناخبردار فن غرض ایسی بے شمار تنقیدی اصطلاحات وضع کی ہیں جو آج مغرب کے کسی بڑے نقاد کے سوا شاید مشکل ہی سے کہیں ملیں ۔ بہت سی تخلیقی تنقید تو اُن کی معاصرانہ چشمکوں کا حاصل ہے ۔ ایک شعر میں سودا نے میر پر یوں چوٹ کی ہے :

نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے
وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا جانے

میر نے بحیثیت نقاد اس کا جواب دیا :

وہ ہے اک مندرس نالہ مبارک مرغ گلشن کو
وہ اس ترکیب نو کی نالہ و زاری کو کیا جانے

' مندرس ' کے معنی شاید طالب علم کے ہیں - نالہ بہ معنی شاعری اور دیکھیے ' ترکیب نو کی
نالہ و زاری ' میں کیا کچھ نہیں کہا - بہر حال میر کی شاعری کو سمجھنے کے لیے انھیں ان
کے معاصرین کے ساتھ بھی دیکھ لینا چاہیے -

اس سارے پس منظر کی روشنی میں میر صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے
آجاتے ہیں - انھوں نے نوے سال کی طویل زندگی میں عالم ، نقاد ، عشق پیشہ ، بادشاہوں
کے ہمنشیں ، درویش ، ایک بڑے شاعر غرض ایک بھرپور شخصیت کی حیثیت سے کیا کچھ
نہیں دیکھا - شاید اسی لیے ان کا فنی کارنامہ آج بھی ہمارے دلوں کو گرماتا ہے — بڑا
شاعر کسی ایک زمانے یا کسی ایک طبقے کے لیے نہیں لکھتا اس لیے اس کی شاعری ہر زمانے
سے بار بار ایک نیا رشتہ قائم کرتی ہے - پھر کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کسی عصر رواں
میں بعض واقعات اس طرح ظہور میں آتے ہیں کہ ان میں عہد رفتہ کا ہلکا سا عکس بھی شامل
ہوتا ہے شاید ایسے ہی حالات میں کسی نے کہا تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے مگر
بار لوگوں نے اس سے تجدید ماضی کا کام بنا لیا - یہ درست کہ ماضی انسان کی زندہ روایت
ہے جس سے وہ الگ نہیں ہو سکتا مگر فن کار اس روایت کو اپنے وسیع تجربوں سے ملا کر
ایک دوسری چیز کو جنم دیتا ہے جسے ہم تخلیق کہتے ہیں - تخلیق وقت کے ساتھ ساتھ پھلتی
پھولتی ہے اور منظر شہود پر آ جانے کے بعد اپنے خالق سے الگ ایک نئی شخصیت بن جاتی
ہے - میں نے تخلیق کو شخصیت اس لیے کہا ہے کہ اس میں شاعر کی شخصیت کے علاوہ اس
کے معاشرے کے تجربات ، عقائد ، آرزوئیں اور زبان ، سب مختلف شکلیں گھل مل کر ایک وحدت
بن جاتی ہیں - میر صاحب کی شاعری اپنے عہد کی ایسی ہی شخصیت ہے -

یہ اتفاق ہے کہ میر صاحب کی شاعری کے بعض اہم عناصر اور ہمارے عہد کے ذہنی
اور اجتماعی محرکات میں چند باتیں مشترک نظر آتی ہیں - آئیے اب انھیں بھی دیکھتے چلیں -
ہمارے زمانے میں بھی میر صاحب والی چکی نے بڑے رنگ دکھائے ، اس عہد کی پشت پر بھی
دنیا کی سب سے بڑی ہجرت اور ایک بڑے تاریخی انقلاب کے محرکات ہیں - ہجرت کی واردات
جو انسان کا مقدر ہے ایک دفعہ پھر ہماری قوم کی تاریخ میں نمودار ہوئی اور اب وہ ہمارے دور
کی مرکزی روحانی واردات بن گئی ہے - ہماری قوم کے ایک خاصے بڑے حصے نے جسمانی طور
پر یہ ہجرت کی ہے مگر ذہنی اور روحانی سطح پر تو پوری قوم نے یہ تجربہ کیا ہے - اب ہمارا
مسئلہ یہ ہے کہ اس جانگداز روحانی تجربے کو تخلیقی طور پر اپنے خون میں کس طرح حل کیا
جائے - ایک بار پھر ہماری بنی بنائی قدریں چکنا چور ہو گئیں - آج ہم نئی قدروں کی تلاش میں
سرگرداں ہیں - ہمیں از سر نو ایک ذہنی اور اخلاقی تصور ، زبان اور فلسفۂ حیات کی ضرورت
ہے - گو میر صاحب کے زمانے اور ہمارے زمانے میں بڑا بعد ہے ، دنیا اتنی بدل چکی ہے کہ
آج کے شاعر کے سامنے پہلے سے بھی کہیں وسیع منظر حیات کھل گیا ہے مگر واقعات کی مماثلت
کی وجہ سے میر صاحب کا زمانہ ہمارے زمانے سے مل گیا ہے - وہی غریب الوطنی ، وہی ۵
قافلوں کا سفر ، وہی رہزنی ، آئے دن حکومت کا بدلنا ، خوراک کی قلت ، سیلاب کی تباہی اور
پرانی اقدار کا بکھر جانا اور رواج ہنر اور وفا پیشگی کا اٹھ جانا ، غرض یہ حوادث ہمیں بھی
دیکھنے پڑے - مگر میر کے زمانے میں ان حوادث کی وجوہات مختلف تھیں - میر اور ان کے رفقا
کی ہجرت اور ہماری ہجرت میں بڑا فرق ہے - انھوں نے ہجرت کو ذہنی طور پر قبول نہیں
کیا تھا - ہم نے یہ ہجرت خود اختیار کی ہے - میر کے زمانے میں مسلمانوں کی سلطنت اور

تہذیب کا شیرازہ بکھر رہا تھا ۔ ہم نے ایک نئی ملت اور ایک نئے ملک کی بنیاد رکھی ہے اور اب ہم اس میں زندہ رہنے کے لیے نئی اقدار اور مکمل فلسفۂ حیات کی تلاش میں ہیں ۔ میر کا زمانہ رات تھا ۔ ہم نے صبح کی روشنی میں آنکھ کھولی ہے ۔ نیا سورج ناچ رہا ہے ، ہمیں للکار رہا ہے ۔ شیخ صلاح الدین نے میر کے زمانے کی جو تصویر کھینچی ہے وہ کس قدر صحیح ہے ۔

” میر کی تخلیقات کو پورے طور پر دیکھنے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک پوری رات تھی جس میں بجلی بار بار چمکتی ہے اور کائنات کا ایک پہلو منور کرتی ہے ، پھر کوئی اور پہلو منور کرتی ہے اور جو کچھ بجلی کے اس کوندے میں نظر آتا ہے وہ یقیناً ایسا ہے کہ ہر فن کار کو جو فن کے سامنے سر تسلیم جھکاتا ہے ایک اتھاہ دکھ بھرا لطف دیتا ہے جس کو بھولنے کی کوشش کے باوجود بھلایا نہیں جا سکتا اور وہ اس کے نظام فضائے یاد میں ایک عظیم سیارے کی شکل اختیار کر لیتا ہے ۔“

یہ رات میر کی شاعری میں زندگی کا استعارہ ہے :

غالب کہ دل خستہ شب ہجر میں مر جائے — یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے
بہت میر پھر ہم جہاں میں رہیں گے — اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک
دکھائی دیں گے ہم میت کے رنگوں — اگر رہ جائیں گے جیتے سحر تک

رات آرام کے لیے ہے مگر میر کے زمانے میں یہ رات گزار لینا بھی بڑا کام تھا ۔ انھوں نے اس رات کو محض رو پیٹ کر نہیں گزارا بلکہ اس ویران رات کے سناٹے میں کچھ شب چراغ روشن کیے ۔ وہ شاعر تھے ، تلوار لے کر بھی نکلتے تو کیا کر لیتے ۔ کوئی کفن بھی نہ دیتا ۔ انھوں نے اپنے معاشرے کو آئینہ دکھا کر عبرت دلائی ، جگانے کی کوشش کی مگر حوادث کا طوفان کسی کے بس میں نہ تھا ۔ میر ہمیں اس رات میں چھوڑ گئے مگر علم اور فن کی شمع جلا گئے ۔ سر سید اور ان کے رفقاء نے اس رات کو گزارنے کا منصوبہ بنایا اور اقبال آئے تو رات کا خاصا حصہ گزر چکا تھا ۔ اقبال نے دن کے قدموں کی آواز سن لی تھی ۔

یوں ایک طرح یہ اقبال کا زمانہ ہے ۔ وہ اس لیے کہ اقبال نے جو خواب ہمیں دکھایا تھا وہ پاکستان کی صورت میں ہمیں مل گیا ہے ۔ اب دن ہے اور ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ اس دن کو کس طرح گزارا جائے ۔ ظاہر ہے کہ یہ دن گزارنے کے لیے ہمیں اپنی روایت کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا کیونکہ ہمارے ورثے میں زبان اور اقدار کا زندہ ماضی بھی ہے ۔ یہ بات تو غلط ہے کہ اقبال کسی بھی شاعر کا بدل ہو سکتے ہیں مگر ان کے ہوتے ہوئے میر کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے ؟ گو اقبال نے میر صاحب کا کہیں ذکر نہیں کیا مگر میر کے یہاں جابجا ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو بڑی حد تک اقبال کے فلسفۂ حیات سے مماثل ہیں ۔ یہ درست کہ میر صاحب نے شاعری کے ذریعے براہ راست قوم کو خطاب نہیں کیا مگر ایک بڑا شاعر جب تخلیق کرنے بیٹھتا ہے تو لازمی نہیں کہ اس کے سامنے کوئی مخصوص قومی منصوبہ بھی ہو ۔ اقبال کے یہاں قلندری ، درویشی ، خودی ، اخلاق ، انسان اور عشق کے تصورات کی جھلک میر صاحب کے یہاں بھی دیکھیے :

میر	اقبال
عشق تھا جو رسول ہو آیا	عشق دم جبرئیل ، عشق دم مصطفیٰ
ان نے پیغام عشق پہنچایا	عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام
عشق حق ہے کہیں ، نبی ہے کہیں	
ہے محمد کہیں ، علی ہے کہیں	ع کہیں مولا علی خیبر شکن عشق

عشق عالی جناب رکھتا ہے
جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم جمع کیے کتنے تو دیوان کیا

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

ع مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ

معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر
مسجد میں ہے کیا شیخ پیالا نہ نوالا

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظۂ و پند

بت پرستی کو تو اسلام نہیں کہتے ہیں
معتقد کون ہے میر ایسی مسلمانی کا

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

گریباں شور محشر کا اڑایا دھجیاں کر کر
فغاں پر ناز کرتا ہوں کہ دل بے تیری ہتھ بلیاں

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

فریاد انھی رنگوں ہے گلزار میں ہر صبح
بلبل نے مری طرز سخن صاف اڑائی

اڑا لی طوطیوں نے قمریوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

صاف میداں ، لامکاں سا ہو تو میرا دل کھلے
تنگ ہوں معمورۂ عالم کی دیواروں کے بیچ

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لیے لامکاں ، میرے لیے چار سو

میر کیا ہے فقیر مستغنی
آوے اس پاس بادشاہ تو کیا

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

ع خراب و خوار ہیں سلطاں شکستہ حال امیر
ع کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

ع صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ع کیا خوار ہیں مردان صفا کیش و ہنر مند

ع دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ع تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا

ع عرش و دل دونوں کا ہے پایہ بلند
ع عرش معلیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں

تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا

ہوئی جو چشم مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

برسوں لگی رہے ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب ہم سا کوئی صاحب ، صاحب نظر بنے ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پیراہن صد چاک سلاتے ہیں مرا لوگ
تہ سے نہیں مطلق خبر ان بے خبروں کو

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

مسجد میں امام آج ہوا آ کے کہیں سے
کل تک تو یہی میر خرابات نشیں تھا

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

ع اسلامی کفری کوئی ہو، ہے شرط درد عشق
ع اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی

اگرچہ خشک ہیں جیسے پر کاہ
اڑے ہیں میر جی لیکن ہوا میں

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک
رکھتی ہے مگر طاقت پرواز مری خاک

عشق میں کیا دخل ہے نازک مزاجی کے تئیں
کوہکن کے طور سے جی توڑ کر محنت کرو

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شرر تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

خوش ہیں دیوانگیٔ میر سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

اک جنوں ہے کہ با شعور بھی ہے
اک جنوں ہے کہ با شعور نہیں

اقبال اپنے بنیادی فلسفۂ حیات میں میر سے کس قدر قریب ہیں ۔ کلیات میر کو بھی دیکھ لیجیے وہاں میر صاحب کے ایسے سینکڑوں اشعار ملیں گے جن میں فلسفۂ اقبال کے بنیادی عناصر تہ در تہ سمٹے ہوئے ہیں ۔ یہاں یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ یہ تو مسلمانوں کے بنیادی تصورات ہیں اور پھر اقبال نے یہ باتیں میر سے نہیں لیں بلکہ فارسی اور عربی روایات سے اخذ کی ہیں مگر یہ بھی تو دیکھیے کہ میر صاحب کی نظر انتخاب بھی انہیں بنیادی قدروں پر کیوں پڑی ۔ اقبال جب ملا اور صوفی کے خلاف آواز بلند کرتے تھے تو اُن پر کفر کا فتویٰ لگایا جاتا تھا ۔ میر صاحب بھی اپنے زمانے کے مجتہد تھے ۔ وہ بھی جب لب کشا ہوتے تھے تو خانقاہیں زیر و زبر ہو جاتی تھیں :

تسبیحیں ٹوٹیں خرقے مصلے پھٹے جلے
کیا جانے خانقاہ میں کیا میر کہہ گئے

اقبال مسائل تصوف کے خلاف ہیں میر بھی ان " مسائل کو مسل " دیتے ہیں ۔ (محو مست کو کیا نسبت اسے میر مسائل سے) اقبال نے نئے زمانے نئے صبح و شام پیدا کرنے کا پیغام دیا تھا ، میر صاحب چرخ جنبری کی نئی بنیاد رکھنے کا اعلان کرتے ہیں ، اقبال نے اپنے زمانے کو خارا تراشی کا زمانہ کہا تھا ، میر نے اپنی شاعری میں خارا تراشی کو انسانی عزم کا استعارہ بنا دیا بلکہ وہ توفرہاد کے ہنر کو بھی اپنے ناخن کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ کہتے ہیں ۔
اب میر خارہ تراش کے شعر سنیے :

کس زور سے فرہاد نے خارہ شکنی کی — ہرچند کہ وہ بیکس و بے تاب و تواں تھا
فرہاد پہلوان محبت پہاڑ تھا — بے طاقتی جو دل نے بہت کی بچھڑ گیا
تیشے سے کوہ کن کے دل کوہ جل گیا — نکلے ہے سنگ سنگ سے اکثر شرر ہنوز
خارا شگاف و سینہ خراش ایک سے نہیں — لیکن نظر نہیں ہے تجھے کام کی طرف

اقبال نے فرہاد کی خارا تراشی سے پیغام عمل لیا ہے مگر وہ " طرز کوہکن " کے " پرویزی حیلوں " کو نہیں سراہتے ۔ میر کی شاعری میں بھی خارا تراشی انسانی عمل کا استعارہ ہے مگر وہ بھی دیوانگئی عشق اور ہنرمندی کو محض ہتھوڑا چلانے تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اُن کے نزدیک " جگرکاوی " اور " سینہ خراشی " بھی تخلیقی عمل ہیں ۔ " طبقاتی شعور " والوں کا یہ دعویٰ ہے کہ آج کی شاعری میں مجنوں کی جگہ فرہاد و جم نے لے لی ہے کہ انسان کی محنت کشی کا تصور اس زمانے کا طرۂ امتیاز ہے ۔ میر صاحب کا پڑھنا تو خیر ایک ٹیڑھی کھیر ہے انھوں نے اقبال ہی کو دیکھ لیا ہوتا کہ اُن کا کلام ہمارے عہد میں مختلف حیثیتوں سے پڑھا جا رہا ہے ۔ بہرحال میں یہاں میر اور اقبال کے بنیادی فلسفۂ حیات کے عناصر میں باہمی رشتہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ چونکہ میر صاحب کو اس نظر سے اب تک کسی نے نہیں دیکھا اس لیے میں دو چار اور باتیں کروں گا ۔ اقبال نے بھی میر کی طرح اپنی شاعری کے بارے میں جا بجا کچھ اشارے کیے ہیں ۔ اس سلسلے میں اُن کا ایک شعر خصوصیت سے قابل ذکر ہے :

میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

یہ " آتش رفتہ " ایک وسیع روایت ہے جس میں میر صاحب بھی ایک شرر زندہ کی حیثیت سے شامل ہیں ۔ میر صاحب نے یہ دعویٰ یونہی تو نہیں کیا تھا :

جس کسی کو کہیں ہوا ہے عشق — ہے ہمارے بھی طور کا عاشق

میر و اقبال کے تقابلی مطالعے کی روشنی میں اس شعر کو دیکھیے کہ اقبال کے بہت سے

اشعار پڑھتے وقت، میر کے کتنے ہی اشعار دل میں چٹکیاں سی لینے لگتے ہیں ۔ اقبال کے جہان تازہ ، مرد آفاق ، امام بے حضور ، عشق یزداں شکار ، صدق مقال ، باشعور جنون اور ایسی بہت سی تراکیب کے مقابلے میں میر کے یہاں جہان دیگر ، انسان کامل ، جگردار آدمی ، مسوالله صیاد حق دانت ، باشعور جنون ایسی مشترک اندار ہیں جو محض الفاظ ہی نہیں بلکہ ان کے پیچھے پورا فلسفۂ حیات ہے ۔ اقبال اور میر دونوں کے یہاں انسان کو اولیت حاصل ہے ۔ اقبال نے نیستی کو اہمیت دی ، میر نے بھی اپنے اندازی عشق کو استعارہ بنایا ، اقبال نے فقر کی تلوار آلوائی میر بھی صولت فقر کے زور پر بے تیغ لڑتے رہے ۔ اقبال نے شاہین کو درویشی اور طاقت کا اسم بنایا تو میر نے اژدر ، فرہاد اور خارا شکن کے استعاروں سے کام لیا ۔ یہ درست ہے کہ اقبال نے دنیا کے انسانوں اور بالخصوص مسلمان قوم کو عشق ، عمل اور زندگی کا جو وسیع تصور دیا ہے اسے ہم نہ پاسکیں اور تلاش کرنا بے سود ہے مگر یہ بھی صحیح نہیں کہ اقبال کے علاوہ ہمارے تمام شاعر قنوطی اور غم پرست ہیں ۔ میر کو نہ تو ویسا ساز گار ماحول ملا اور نہ ہی ان کے زمانے میں تحصیل علم اور وسیع دنیا کے سیر و سفر کے وہ مواقع بہم تھے جو اقبال کو میسر ہوئے مگر یہ کہنا کہ میر صاحب کے دل میں قوم کا درد نہیں تھا ، ان کی شاعری محض ذاتی دکھوں کا رونا ہے بے سمجھی ہے ۔ میر صاحب کے سامنے کوئی زندہ معاشرہ تھا ہی نہیں کہ وہ باقاعدہ طور پر ولولۂ تازہ لے کر میدان میں آتے ۔ انھوں نے مرنے والوں پر آنسو بھی بہائے ، اور جو مر رہے تھے انھیں کبھی رلا کر کبھی ہنسا کر کبھی عبرت دلا کر ان کی کمزوریوں سے آگاہ کیا ۔ مگر وہ اپنی قوم سے مایوس بھی نہیں تھے :

یوں تو ہم عاجز ترین ، خلق عالم ہیں وے
دیکھنا قدرت خدا کی گر ہمیں قدرت ہوئی

قیام پاکستان کے بعد ہمیں پہلی بار ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کا موقع ملا ہے ۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے ساتھ ہماری بہت سی اجتماعی قدریں الٹ پلٹ ہو گئیں ۔ اس انقلاب نے ہماری اجتماعی زندگی کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ ہم اپنی بعض بنیادی قومی قدروں اور زبان کے سہارے سے اپنی قدیم روایتوں سے بھی جا ملے ہیں اور مغربی علوم و فنون کے رشتے سے ہمارے لیے نئے اجتماعی مسائل اور نئے نظریات بھی اہم بن گئے ہیں ۔ یوں پچھلے بیس پچیس سالوں میں جو نئی ادبی تحریک ظہور میں آئی تھی اس نے وقتی طور پر ہمارے ادب میں ایک تازہ دمی تو پیدا کر دی تھی مگر اس کا رشتہ اپنی روایت سے اتنا گہرا نہ تھا اس لیے اب وہ تحریک سرد پڑ گئی ہے ۔ آج کے ادیبوں اور شاعروں کے سامنے اب یہ مسئلہ ہے کہ وہ مشرق اور مغربی روایتوں کو اپنا کر اپنی زبان کو وسعت دیں اور فن و ادب کی ایک نئی عمارت کھڑی کریں ۔ حنیف رامے نے ایک جگہ مصوری کی روایت پر گفتگو کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ " میں تو یوں محسوس کرتا ہوں کہ میں ایسے ہی کسی مقام پر کھڑا ہوں جہاں کبھی میر صاحب کھڑے تھے ۔" جس طرح میر صاحب کو اپنے اظہار کے لیے ایک نئی زبان کی ضرورت تھی اسی طرح آج کے مصوروں کو بھی ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالنی ہے ۔ آج کے شاعر بھی یہی محسوس کر رہے ہیں کہ بڑی شاعری تخلیق کرنے کے لیے انھیں نئے موضوعات کے علاوہ ایک وسیع تر ذریعۂ اظہار کی ضرورت ہے ۔ میر صاحب اس سلسلے میں ہماری بڑی رہنمائی کر سکتے ہیں کہ وہ زبان ساز بھی تھے مگر اردو والوں کو دیکھیے کہ وہ سند کے سلسلے میں ناسخ ، داغ ، حسرت اور ان کے جانشینوں کی طرف بھاگتے ہیں ۔ ناسخ اور ان کے ہمنواؤں نے جہاں زبان کی تھوڑی سی خدمت کی وہاں یہ ستم بھی تو کیا کہ زبان سے لفظ متروک کرنے کی رسم ڈال دی ۔ ہمارے شاعر اور نقاد ان کی روش سے بدظن ہو کر مغرب کی طرف چل کھڑے ہوئے ۔ ویسے مغرب کے بعض نئے شاعروں کی یہ بات کسے قبول نہ ہوگی کہ کوئی لفظ شاعرانہ یا غیر شاعرانہ نہیں مگر اردو زبان کے معاملے میں وہ ہمارے کیا کام آ سکتے

ہیں - زبان پر میں اس لیے زور دے رہا ہوں کہ اس کے بغیر اظہار ہی ممکن نہیں ، پھر میر نے جو اردو ہمیں بنا کر دی ہے اُس کے مقابلے میں بمشکل ہی دو تین شاعروں کے نام لیے جا سکتے ہیں - آج پاکستان میں مختلف علاقوں کے لوگ بستے ہیں - ان حالات میں ہمیں ایک ایسی زبان کی ضرورت ہے جس میں دوسری مقامی بولیوں کے لیے بھی خاطر خواہ گنجائش ہو اور اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات بھی وسیع تر ہوں - میر نے ہندوستانی اردو کی بنیاد رکھی تھی ہمیں پاکستانی اردو کی ضرورت ہے جو ہماری علاقائی زبانوں کو بھی اپنے ساتھ لے کر آگے چل سکے - میر نے عربی اور فارسی الفاظ کو اردو میں اس طرح برتا ہے کہ ان میں ہندوستانیت کی روح رچ بس گئی ہے - یہی رجحان آج کل کے نئے لکھنے والوں میں بڑھ رہا ہے کہ ہماری زبان کا اپنے دیس کی مٹی اور روایت سے رشتہ قائم رہے ، ادب میں کسی خاص موضوع یا کسی خاص صنف کی پابندی نہ ہو اور کوئی لفظ محض شاعری یا عام بول چال کے لیے الگ الگ طور پر مقرر نہ ہو - یہاں پھر میر صاحب ہمارے کام آ سکتے ہیں کہ انہوں نے غزل کے علاوہ بعض نئی اصناف سخن (مثلاً واسوخت ، مثلث ، مربع اور تضمین) بھی ایجاد کی ہیں اور ان میں مختلف بحور کے استعمال سے اظہار بیان میں تنوع پیدا کیا ہے انہوں نے اپنی شاعری کے بارے میں کہہ رکھا ہے " انداز کہ ما اختیار کردہ ایم محیط ہمہ صنعت ہا است " یہ تمام صنعتوں کا احاطہ کرنے والا انداز آج کے فن کاروں کی گہری توجہ کا مرکز بن رہا ہے - انتظار حسین تو کلیات میر کو ایک ناول کی حیثیت سے بھی پڑھتا ہے اور ' بستی ' کا لفظ اس کے یہاں کلیدی لفظ بن گیا ہے ، یہ لفظ متروک نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی بدل ہے - ہر لفظ کے پیچھے ایک مخصوص دیس کی روح اور اجتماعی تجربہ ہوتا ہے اس لیے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ہمیں اپنی زبان کے لفظوں کو اولیت دینی چاہیے - مگر آج کل کے اکثر ادیب اردو میں لکھتے وقت انگریزی میں سوچتے ہیں - میر صاحب کو دیکھیے کہ اردو میں شعر کہتے وقت عربی اور فارسی میں بھی نہیں سوچتے :

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرور قلب
آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زبان کے بیچ

میں نے میر کے زمانے کو رات کہا تھا - یہ رات ہمارے زمانے کی رات سے آ ملی ہے - قافلے کے قافلے اس رات میں گم ہو گئے اور جو بچ نکلے وہ اس سے اب تک لڑ رہے ہیں - یہ روحانی واردات جو بیک وقت انفرادی بھی تھی اور اجتماعی بھی ہماری فضا کے یاد میں اظہار کے لیے بے چین ہے - ہم ایک ہولناک رات سے ہنگامہ و ہراس کے عالم میں گزرے ہیں - آزادی کی کرن چمکی تو ششدر رہ گئے کہ رات کب اور کیونکر گزری - نہ رنج سفر یاد رہا نہ عیش منزل کا سرور ملا - اس ذہنی دھچکے نے ہمارے ذہنی نظام میں افراتفری پیدا کر دی اب ہم کبھی ماضی کی طرف پلٹتے ہیں اور کبھی مستقبل کی طرف دوڑتے ہیں - یہ جمود نہیں حرکت ہے مگر محض حرکت بھی جمود سے ایسی مختلف تو نہیں ہوتی - ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ اس حرکت کو رفتار کیسے بنایا جائے - یہ کام تقلید یا تجدید سے تو ہو نہیں سکتا - یہ صحیح ہے کہ اس تجربے کا اظہار ، تجربہ جس میں ماضی حال اور مستقبل گڈ مڈ ہو گئے ہیں زبان کے ذریعے ممکن ہے اس لیے ہم زبان کے سہارے اپنی روایتوں سے بھی جا ملے ہیں - لیکن آخر حال کے بھی تو کچھ تقاضے ہیں اس لیے محض تقلید یا تجدید سے کیا کام چلے گا ، بیشک وہ میر کی تقلید کیوں نہ ہو - میر دریا ہی سہی اور دریا سے بجلی پیدا ہو سکتی ہے لیکن یارو دریا کا رخ شہر کی طرف اس طرح تو نہ موڑو کہ شہر کو سیلاب لے جائے - تو اس دریا کو کیسے پار کریں - ظاہر ہے کہ زقند لگا کر تو عبور نہیں کر سکتے مگر اپنی ناؤ تو ہونی ہی چاہیے -

موقوف غم میر کہ شب ہو چکی ہمدم

انتخابِ دیوانِ میر

١٣٧٦ھ

(١)

میں کون ہوں اے ہم‌نفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیٔ رازِ نہاں ہوں

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

پنجہ ہے مرا پنجۂ خورشید میں ہر صبح
میں شانہ صفت سایۂ روِ زلفِ بتاں ہوں

دیکھا ہے مجھے جن نے وہ دیوانہ ہے میرا
میں باعثِ آشفتگیٔ طبعِ جہاں ہوں

تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبشِ لب کی
میں صد سخن آغشتہ بخوں زیرِ زباں ہوں

ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے
اس باغ خزاں دیدہ میں میں برگ خزاں ہوں

رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بسکہ پریشاں
درپے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

اک وہم نہیں بیش مری ہستیٔ موہوم
اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

خوش باشی و تنزیہ و تقدس تھی مجھے میر
اسباب پڑے یوں کہ کئی روز سے یاں ہوں

(٢)

تیرا رُخِ مخطط قرآں ہے ہمارا
بوسہ بھی لیں تو کیا ہے ایمان ہے ہمارا

ہیں اس خراب دل سے مشہور شہرِ خوباں
اس ساری بستی میں گھر ویران ہے ہمارا

مشکل بہت ہے ہم سا پھر کوئی ہاتھ آنا
یوں مارنا تو پیارے آسان ہے ہمارا

ادریس و خضر و عیسیٰ قاتل سے ہم چھڑائے
ان خوں گرفتگاں پر احسان ہے ہمارا

ہم وے ہیں سن رکھو تم مر جائیں رک کے یکجا
کیا کوچہ کوچہ پھرنا عنوان ہے ہمارا

کرتے ہیں باتیں کس کس ہنگامے کی یہ زاہد
دیوانِ حشر گویا دیوان ہے ہمارا

ماہیتِ دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
یک قطرہ خون یہ دل طوفان ہے ہمارا

کیا خانداں کا اپنے تجھ سے کہیں تقدس
روح‌القدس اک ادنیٰ دربان ہے ہمارا

کرتا ہے کام وہ دل جو عقل میں نہ آوے
گھر کا مشیر کتنا نادان ہے ہمارا

سجر زمین دل کی ہے میر ملک اپنی
پُر داغ سینہ مُہری فرمان ہے ہمارا

(۳)

عہد جنوں ہے موسم گل کا اور شگوفہ لایا ہے
ابر بہاری وادی سے اٹھ کر آبادی پر آیا ہے

سن کر میرے شور شب کو جھنجلا کر وہ کہنے لگا
نالے اس کے فلک تک پہنچے کن نے اس کو ستایا ہے

دکن ، اتر ، پورب ، پچھم ہنگامہ ہے سب جاگہ
اودھم میرے حرف و سخن نے چاروں اور مچایا ہے

بے چشم و رو ہو بیٹھے ہو وجہ نہیں ہے ظاہر کچھ
کام کی صورت بگڑی ہماری منہ کیوں تم نے بنایا ہے

ظلم و ستم سب سہل ہیں اس کے ہم سے اٹھتے ہیں کہ نہیں
لوگ جو پرسش حال کریں ہیں جی تو انھوں نے کھایا ہے

ہو کے فقیر تو واں بیٹھے ہیں رہتے ہیں اشراف جہاں
ہم نے توکّل بہت کیا ہے نام خدا سرمایا ہے

برسوں ہم درویش رہے پردے میں دنیا داری کے
ناموس اس کی کیونکہ رہے یہ پردہ جن نے اٹھایا ہے

ڈھونڈ نکالا تھا جو اسے سو آپ کو بھی ہم کھو بیٹھے
جیسا نہال لگایا ہم نے ویسا ہی پھل پایا ہے

میر غریب سے کیا ہے معارض گوشے میں اس وادی کے
ایک دیا سا بجھتا ان نے داغ جگر بہ جلایا ہے

(۴)

کیا کہیں اپنی اس کی شب کی بات
کہیے ہووے جو کچھ بھی ڈھب کی بات

اب تو چپ لگ گئی ہے حیرت سے
پھر کھلے گی زبان ، جب کی بات

نکتہ دانان رفتہ کی نہ کہو
بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات

کس کا روئے سخن نہیں ہے ادھر
ہے نظر میں ہماری سب کی بات

ظلم ہے ، قہر ہے ، قیامت ہے
غصے میں اس کے زیر لب کی بات

کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم
ہے خدا جانیے یہ کب کی بات

گو کہ آتش زباں تھے آگے میر
اب کی کہیے گئی وہ تب کی بات

(۵)

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

دنیا و دیں کی جانب میلان ہو تو کہیے
کیا جانیے کہ اس بن دل ہے کدھر ہمارا

ہیں تیرے آئینے کی تمثال ہم، نہ پوچھو
اس دشت میں نہیں ہے پیدا اثر ہمارا

جوں صبح اب کہاں ہے طول سخن کی فرصت
قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا

ہے تیرہ روز اپنا لڑکوں کی دوستی سے
اس دن ہمیں کو کہتے تھا اکثر پدر ہمارا

سیلاب ہر طرف سے آئیں گے بادیہ میں
جوں ابر روتے ہوگا جس دم گزر ہمارا

نشو و نما ہے اپنی جوں گردباد انوکھی
بالیدہ خاکِ رہ سے ہے یہ شجر ہمارا

یوں دور سے کھڑے ہو کیا معتبر ہے رونا
دامن سے باندھ دامن اے ابرِ تر ہمارا

جب پاس رات رہنا آتا ہے یاد اس کا
تھمتا نہیں ہے رونا دو دو پہر ہمارا

اس کارواں سرا میں کیا میر بار کھولیں
یاں کوچ لگ رہا ہے شام و سحر ہمارا

(۶)

دل کے معمورے کی مت کر فکر فرصت چاہیے
اسے ویرانے کے اب بسنے کو مدت چاہیے

عشق و مے خواری نبھے ہے کوئی درویشی کے بیچ
اس طرح کے خرچ لاحاصل کو دولت چاہیے

عاقبت فرہاد مر کر کام اپنا کر گیا
آدمی ہووے کسی پیشے میں جرأت چاہیے

ہو طرف مجھ پہلواں شاعر کا کب عاجز سخن
سامنے ہونے کو صاحب فن کی قدرت چاہیے

عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو
قرب و بعد اس جا برابر ہے محبت چاہیے

نازکی کہ عشق میں کیا دخل ہے اے بوالہوس
یاں صعوبت کھینچنے کو جی میں طاقت چاہیے

تنگ مت ہو ابتدائے عاشقی میں اس قدر
خیریت ہے میر صاحب دل سلامت چاہیے

(۷)

عشق میں کھوئے جاؤ گے تو بات کی تہ کو پاؤ گے
قدر ہماری کچھ جانو گے دل کو کہیں جو لگاؤ گے

صبر کہاں بے تابی دل سے ، چین کہاں بے خوابی سے
تو تو سار گلی میں نکلیں گھر سے باہر آؤ گے

شوق کمال کو پہنچا تو نہیں خط و کتابت حرف و سخن
قاصد کے محتاج نہ ہو گے آپ ہی دوڑے جاؤ گے

صنعت گریاں صاحب سدہ دل کے لگے کٹ پٹ گئیں
ایک، نہیں وہ سنے کا تم باتیں بہت بناؤ گے

رنگ عجب کے ہیں کہتے کوئی، تمہیں خوش آوے گا
خون کروگے یا دل کو یا داغ جگر پہ جلاؤ گے

رہتے ہیں مبہوت الفت ہیں گم گشتہ کلفت میں
بھولے بھولے آپ ہی پھرو گے کس کو راہ بتاؤ گے

اشک تو پانی سے ہیں لیکن جلتے جلتے اویں گے
دل کی لگی حیران ہیں صاحب کس ڈھب مل کے بجھاؤ گے

چاہت میر سبھی کرتے ہیں رنج و تعب میں رہتے ہیں
تم جو ابھی بیتاب ہو ایسے جی سے ہاتھ اٹھاؤ گے

(۸)

لڑ کے پھر آئے ڈر گئے شاید
بگڑے تھے کچھ سنور گئے شاید

سب پریشاں دلی میں شب گزری
بال اس کے بکھر گئے شاید

ہیں مکان و سرا و جا خالی
یار سب کوچ کر گئے شاید

آنکھ آئینہ رُو چھپاتے ہیں
دل کو لے کر مُکر گئے شاید

لوھو آنکھوں میں اب نہیں آتا
زخم اب دل کے بھر گئے شاید

اب کہیں جنگلوں میں ملتے ہیں
حضرتِ خضر مر گئے شاید

بیکلی بھی قفس میں ہے دشوار
کام سے بال و پر گئے شاید

شور بازار سے نہیں اٹھتا
رات کو میر گھر گئے شاید

(۹)

آگاہ اس جہاں سے نہیں غیر بے خبر جو کوئی دم بہت ہے یاں
مہلت ہمیں بسانِ شرر کم بہت ہے یاں

حاصل ہے کیسا سوائے ترانی کے دھر میں
اٹھ آسماں تلے سے کہ شبنم بہت ہے یاں

مائل نہ غیر ہونا تجھ ابرو کا عیب ہے
تھی زور یہ کماں ولے خم چم بہت ہے یاں

ہم رہروانِ راہ فنا دیر رہ چکے
وقفہ بسانِ صبح کوئی دم بہت ہے یاں

اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورتِ آدم بہت ہے یاں

عالم میں لوگ ملنے کی گوں اب نہیں رہے
ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یاں

اعجازِ عیسوی سے نہیں بحث عشق میں
تیری ہی بات جانِ مجسم بہت ہے یاں

میرے ہلاک کرنے کا غم ہے عبث تمہیں
تم شاد زندگانی کرو غم بہت ہے یاں

دل مت لگا رخ عرق آلود یار سے
آئینہ کو اٹھا کہ زمیں نم بہت ہے یاں

شاید کہ کام صبح تک اپنا کھنچے نہ میر
احوال آج شام سے درہم بہت ہے یاں

(۱۰)

اب آنکھوں میں خوں دمبدم دیکھتے ہیں
نہ پوچھو جو کچھ رنگ ہم دیکھتے ہیں

جو بے اختیاری یہی ہے تو قاصد
ہمیں آ کے اس کے قدم دیکھتے ہیں

گہے داغ رہتا ہے دل ، گہ جگر خوں
ان آنکھوں سے کیا کیا ستم دیکھتے ہیں

اگر جان آنکھوں میں اس بن ہے تو ہم
ابھی اور بھی کوئی دم دیکھتے ہیں

لکھیں حال کیا اس کو حیرت سے ہم تو
گہے کاغذ و گہ قلم دیکھتے ہیں

وفا پیشگی قیس تک تھی بھی کچھ کچھ
اب اس طور کے لوگ کم دیکھتے ہیں

کہاں تک بھلا روؤ گے میر صاحب
اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

(۱۱)

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

خاطر بادیہ سے دیر میں جاوے گی کہیں
خاک مانند بگولے کے اڑانی اس کی

ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج
اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

مینہ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے
اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی

بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا
پر ملی خاک میں کیا سحر بیانی اس کی

کر کے تعویذ رکھیں اس کو بہت بھاتی ہے
وہ نظر پاؤں پہ وہ بات دوانی اس کی

اس کا وہ عجز تمہارا یہ غرور خوبی
منتیں اس نے بہت کیں پہ نہ مانی اس کی

کچھ لکھا ہے تجھے ہر برگ پہ اے رشک بہار
رقعہ داریں ہیں یہ اوراق خزانی اس کی

سرگزشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا
سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیے لوگوں کو
شہر دلّی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
درد مندی میں گئی ساری جوانی اس کی

اب گئے اس کے جز افسوس نہیں کچھ حاصل
حیف صد حیف کہ کچھ قدر نہ جانی اس کی

(۱۲)

عشق میں نے خوف و خطر چاہیے
جان کے دینے کو جگر چاہیے

قابل آغوش ستم دیدگاں
اشک سا پاکیزہ گہر چاہیے

حال یہ پہنچا ہے کہ اب ضعف سے
اٹھتے پلک ایک پہر چاہیے

کم ہیں شناسائے زر داغ دل
اس کے پرکھنے کو نظر چاہیے

عشق کے آثار ہیں اے بوالہوس
داغ بہ دل دست بہ سر چاہیے

شرط سلیقہ ہے ہر ایک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

خوف قیامت کا یہی ہے کہ میر
ہم کو جیا بار دگر چاہیے

ریاض قادر

ناصر کاظمی — ظہیر کاشمیری

یوسف ظفر — مجید امجد

احمد مشتاق — ضیا جالندھری

میراجی — فراق گورکھپوری

مختار صدیقی — اخترالایمان

ضیا جالندھری — مجید امجد

غالب احمد — ابنِ انشاء

ناصر کاظمی — سعید محمود

منیر نیازی — مقبول احمد پوری

ظفر صمدانی



غسل　　　　عمل : هنري ماتيس

رباعیات

ریاض قادر

☆

ہر لمحہ کسی یاد کا سازینہ ہے
تجدیدِ محرکاتِ پارینہ ہے
ہر لمحے میں موجود ہے گزری ہوئی عمر
ہر لمحہ حکایات کا گنجینہ ہے

☆

اک جھیل کے سینے میں شفق ڈوب گئی
پانی کے نگینے میں شفق ڈوب گئی
اپنی عریانیوں سے شرمائی ہوئی
بادل کے سفینے میں شفق ڈوب گئی

☆

ہستی کی بنا سراب ہے بھی تو بھلی
تاریخ تمامِ خواب ہے بھی تو بھلی
وحشت سے اگر طلسمِ دل قائم ہے
یہ رسمِ جنوں عذاب ہے بھی تو بھلی

☆

گم گشتۂ رقصِ سار یادیں دل میں
یا عکسِ حریمِ ناز یادیں دل میں
اپنے اپنے چمن سے دُور افتادہ
کرتی ہیں ادا نماز یادیں دل میں

☆

کیا لو گے زمانے کی شکایت بن کر
جی لو لبِ ہستی پہ حکایت بن کر
خونِ رگِ دوراں میں جنوں بن کے رہو
گزرو دلِ ہستی سے روایت بن کر

☆

بیٹھی رہی ، بیٹھی رہی ، بیٹھی ہی رہی
پر منزلِ امید کی آئی نہ گھڑی
دنیا پہ مہ و سال گزرتے ہی رہے
بہتی رہی ، بہتی رہی اشکوں کی جھڑی

☆

ہر لمحہ نیا دور جنم لیتا ہے
کچھ اور بھر طَور جنم لیتا ہے
لے جاتے ہیں اس در سے جنازہ باہر
اس در سے کوئی اور جنم لیتا ہے

☆

بیتی ہوئی ہر چیز زباں رکھتی ہے
گزرے ہوئے لمحوں کی فغاں رکھتی ہے
ہو جاتی ہے جب شکن شکن جسم پہ کھال
اک یادِ جواں دل کو جواں رکھتی ہے

غزلیں

ناصر کاظمی

☆

آرائشِ خیال بھی ہو جاں فزا بھی ہو
وہ درد اب کہاں جسے جی چاہتا بھی ہو

یہ کیا کہ روز ایک سا غم ایک سی امید
اس رنجِ بے خمار کی اب انتہا بھی ہو

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

ٹوٹے کبھی تو حسنِ شب و روز کا طلسم
اتنے ہجوم میں کوئی چہرہ نیا بھی ہو

دیوانگیِ شوق کو یہ دھن ہے ان دنوں
گھر بھی ہو اور بے در و دیوار سا بھی ہو

جز دل کوئی مکاں نہیں دہر میں جہاں
رہزن کا خوف بھی نہ ہو در کھلا بھی ہو

ہر ذرہ ایک محملِ عبرت ہے دشت کا
لیکن کسے دکھاؤں کوئی دیکھتا بھی ہو

ہر شے پکارتی ہے پسِ پردۂ سکوت
لیکن کسے سناؤں کوئی ہم نوا بھی ہو

فرصت میں سُن شگفتگیِ غنچہ کی صدا
یہ وہ سخن نہیں جو کسی نے کہا بھی ہو

کیوں چیختی ہیں تپتی دوپہروں میں قمریاں
وہ جانتا ہے جس کا کبھی دل دُکھا بھی ہو

بیٹھا ہے ایک شخص مرے پاس دیر سے
کوئی بھلا سا ہو تو ہمیں دیکھتا بھی ہو

پھرتے ہیں کیسے کیسے خیالات ذہن میں
لکھوں اگر زبانِ قلم آشنا بھی ہو

بزمِ سخن بھی ہو سخنِ گرم کے لیے
طاؤس بولتا ہو تو جنگل ہرا بھی ہو

ناصر کاظمی

☆

دل کے لیے درد بھی روز نیا چاہیے
زندگی تُو ہی بتا کیسے جیا چاہیے

میری نوائیں الگ ، میری دعائیں الگ
میرے لیے آشیاں سب سے جدا چاہیے

باغ تیرا باغباں ، تو ہے عبث بدگماں
مجھ کو تو اے مہرباں تھوڑی سی جا چاہیے

خوب ہیں گُل پھول بھی تیرے چمن میں مگر
صحنِ چمن میں کوئی نغمہ سرا چاہیے

ہے یہی عینِ وفا ، دل نہ کسی کا دُکھا
اپنے بھلے کے لیے سب کا بھلا چاہیے

تنگ ہیں ارض و سما اہلِ وفا پر تو کیا
دل تو ہے غم آشنا ، دل میں رہا چاہیے

سُست ہے دل کی صدا ، ماند ہے ساری فضا
شاعرو ! صورت گرو ! کچھ تو کیا چاہیے

بیٹھے ہو کیوں ہار کے ، سایے میں دیوار کے
چلنے کو ہیں قافلے اب تو چلا چاہیے

سر نہ کھپا اے جرس! مجھ کو مرا دل ہے بس
فرصتِ یک دو نفس مثلِ صبا چاہیے

نرم ہے برگِ سمن ، گرم ہے میرا سخن
میری غزل کے لیے ظرف نیا چاہیے

مانو میری کاظمی ، تم ہو بھلے آدمی
پھروہی آوارگی ! کچھ تو حیا چاہیے

☆

کیوں نہ سرسبز ہو ہماری غزل
خونِ دل سے لکھی ہے ساری غزل

جتنی پیاری ہے تیری یاد مجھے
لب پہ آتی ہے ویسی پیاری غزل

سالہا سال رنج کھینچے ہیں
میں نے شیشے میں جب اتاری غزل

جب بھی غربت میں دل اداس ہؤا
میں مرے ساتھ ہوں ! پکاری غزل

دمِ تخلیق پچھلی راتوں کو
یوں بھی ہوتی ہے مجھ پہ طاری غزل

ق

عہدِ رفتہ کے شاعرانِ کرام
سب سناتے ہیں باری باری غزل

راتوں اٹھ اٹھ کے جو لہو روئے
وہ کرے تیری آبیاری غزل

تہِ ہر لفظ شہر ہیں آباد
مرجعِ خلق ہے ہماری غزل

پیدا ہوتے رہیں گے دل والے
تا قیامت رہے گی جاری غزل

سمرِ خامہ طے ہؤا ناصر
تھک گئے ہم مگر نہ ہاری غزل

ظہــــیر کاشمیری

☆

جس حُسن کی نظروں میں خود اپنا ہی زیاں ہوں
اس حُسن کی جانب میں ابھی تک نگراں ہوں

ہاں میں ہی ستارہ تھا سرِ گنبدِ افلاک
ہاں میں ہی تیرے بعد خلاؤں کا دھواں ہوں

اے جلوۂ محتاط نہ کترا کے گزر جا
میں بھی تیرے ماضی کا کوئی ربطِ نہاں ہوں

جب سایۂ دامن تھا نہ اب سایۂ دیوار
دنیا میں کڑی دھوپ کی مانند تپاں ہوں

کل میں ہی تیری بزم کی تزئین سا تھا
صد حیف کہ آج اپنی طبیعت پہ گراں ہوں

کیا رقصِ صبا ، کیا گل و لالہ کا تبسم
اے موسمِ گل میں تو بہارِ گزراں ہوں

وارفتگیٔ شوق کا انجام تو دیکھو
رسوائے زمانہ ہوں ، سزاوارِ بتاں ہوں

شعلہ بھی ظہـیر آج ہوا تیرہ و تاریک
زندہ ہوں مگر آتشِ رفتہ کا دھواں ہوں

ظہیر کاشمیری

☆

تیرے دامن میں اگر لعل و گہر ہوتے ہیں
ہم بھی کیا کم ہیں کہ با دیدۂ تر ہوتے ہیں

وادیٔ عشق بہاروں کی گزرگاہ نہیں
اک شجر ہو تو کئی برق و شرر ہوتے ہیں

آمدِ صبح کی امید ، اجالوں کا خیال
اے شبِ غم یہی آوازِ سحر ہوتے ہیں

ہم ہیں باہوش کہ دیکھا ہے جمال سر مست
ہم ہیں آزاد ، کہ پابندِ نظر ہوتے ہیں

یہی جلوے جو کبھی مہر کبھی ہیں مہتاب
دیکھنے والوں کے اندازِ نظر ہوتے ہیں

دل اگر شعلہ بداماں ہے نوا ے لذتِ سوز
آگ میں سوختہ سامانوں کے گھر ہوتے ہیں

آج بھی تذکرۂ حسن و محبت ہے وہی
آج بھی وجۂ فغاں دیدہ و در ہوتے ہیں

منزلِ عشق تو اک لمحۂ تسکیں ہے ظہیر
منزلِ عشق سے آگے بھی سفر ہوتے ہیں

☆

شکستِ گل کی کہانی کہاں کہاں نہ گئی
چلی بہار کے بدلے مگر خزاں نہ گئی

بدن سے آنچ برستی ہے ، پیرہن سے لہو
حلالِ عشق گیا ، حوئے قاتلاں نہ گئی

کہاں کہاں نہ گئی دل کی داستاں لیکن
تیرے حضور میرے دل کی داستاں نہ گئی

دل و نظر نے اجالے کئی صنم حالے
جنوں کی ایک کرن بھی تو رائیگاں نہ گئی

زمیں نے مجھ کو تراشا ، بشر نے پالا ہے
میری نظر تو کبھی سوئے آسماں نہ گئی

بایں کمال کہ اذن سخن دیا تو نے
سخنوروں سے بھی کوتاہئ بیاں نہ گئی

چمن کو جنگ شبنم سے رابطہ بھی رہا
گلوں کے دل سے مگر آتشِ نہاں نہ گئی

چھپی ہوئی ہیں ابھی سینۂ بشر میں ظہیر
وہ منزلیں کہ جہاں گردِ کارواں نہ گئی

یوسف ظفر

☆

طے کر چکے مراحلِ شمس و قمر کو ہم
اے کاش یہ خبر ہو کہ جائیں کدھر کو ہم

پھر آج دیکھ آئے ترے بام و در کو ہم
پھر دیکھتے ہیں غور سے اپنی نظر کو ہم

وہ جس نے راستوں کو بھی منزل بنا دیا
گم ہو کے ڈھونڈتے ہیں اسی ہم سفر کو ہم

اے کاش تم وہی ہو جو ہوتے ہو خواب میں
اے کاش ہم نہ یہ ہوں جو اٹھیں سحر کو ہم

کوئی سکوتِ ساز کو پہچانتا نہیں
پہنچے نہ سوزِ دل سے لبِ نغمہ گر کو ہم

آئے تھے تیرے دل میں زمانے کی راہ سے
گھبرا کے تجھ سے جائیں تو جائیں کدھر کو ہم

امیدِ زندگی کی لگا کر دلوں میں آگ
بچھڑے تو پھر بچھڑ ہی گئے عمر بھر کو ہم

یوں ہے تو آؤ مل کے اٹھائیں غمِ حیات
تم بھی ادھر کو جاتے ہو شاید جدھر کو ہم

چشمِ امید نے تو ڈبویا بہت ظفر
اب آزمائیں حوصلۂ چشمِ تر کو ہم

☆

ڈھونڈو تو کوئی کہاں ملے گا
چاہو تو جہاں تہاں ملے گا

جب اپنی خبر ملی تھی ہم کو
جانا کہ ترا نشاں ملے گا

مانا کہ نہیں ہے تم سا کوئی
ہم سا بھی تمھیں کہاں ملے گا

پرواز کی انتہا نہیں ہے
سوچا تھا کہ آسماں ملے گا

سنتا ہے کہاں کوئی کسی کی
ہر شخص فسانہ خواں ملے گا

ہر راہ نہیں ہے راہِ منزل
ہر راہ میں کارواں ملے گا

ہر سنگ نہیں ہے لعل و یاقوت
ہر سنگ مگر گراں ملے گا

اچھا ہے قفس کہ اب چمن میں
اجڑا ہوا آشیاں ملے گا

وابستہ ظفر ہے تیرے غم سے
ہر حال میں شادماں ملے گا

مجید امجد

☆

روش روش پہ ہیں نکہت فشاں ، گلاب کے پھول
حسیں گلاب کے پھول ، ارغواں گلاب کے پھول

افق افق پہ زمانوں کی دھند سے ابھرے
طیور ، نغمے ، ندی ، تتلیاں ، گلاب کے پھول

کس انہماک سے بیٹھی کشید کرتی ہے
عروسِ گل بہ قبائے جہاں ، گلاب کے پھول

جہانِ گریۂ شبنم سے کس غرور کے ساتھ
گزر رہے ہیں تبسم کناں ، گلاب کے پھول

یہ میرا دامنِ صد چاک ، یہ ردائے بہار
یہاں شراب کے چھینٹے ، وہاں گلاب کے پھول

کسی کا پھول سا چہرہ ، اور اس پہ رنگ افروز
گندھے ہوئے بہ خمِ گیسواں ، گلاب کے پھول

خیالِ یار ، ترے سلسلے ، نشوں کی رتیں
جمالِ یار ، تری جھلکیاں ، گلاب کے پھول

مری نگاہ میں دورِ زماں کی ہر کروٹ
لہو کی لہر ، دلوں کا دھواں ، گلاب کے پھول

سلگتے جاتے ہیں ، چپ چاپ ہنستے جاتے ہیں
مثالِ چہرۂ پیغمبراں ، گلاب کے پھول

یہ کیا طلسم ہے ، یہ کس کی یاسمیں باہیں
چھڑک گئی ہیں جہاں در جہاں ، گلاب کے پھول

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد
مری لحد پہ کھلیں جاوداں ، گلاب کے پھول

احمد مشتاق

☆

گم ہے اسی گلیوں میں کوئی ہم سفر اپنا
یہ جھانکنا یونہی تو نہیں در بدر اپنا

آنکھوں ہی سے شاید کوئی صورت نکل آئے
باتوں سے تو قصہ ہوا مختصر اپنا

اب شوق کی آواز نہیں دور کی آواز
اب کر بھی چکیں کام یہ قلب و نظر اپنا

اب آنکھ بھی نم درد بھی کم تیرے لیے ہے
اب گریۂ شب ہے نہ سکونِ سحر اپنا

دل ہی سو نہیں منزلِ آشفتہ مزاجاں
اس آبلے پر ختم نہیں ہے سفر اپنا

رستے کے پلوں پر سے گزرتے ہیں مسافر
ٹھہری ہوئی جھیلوں میں گھرا ہے نگر اپنا

☆

روشنی گو میرے سخن میں نہیں
دل میں جو چاند ہے گہن میں نہیں

ریت میں دب کے مر گیا ہوگا
اب وہ آہو کسی ختن میں نہیں

چاک سب بند ہیں گریباں کے
دل کا اک تار پیرہن میں نہیں

ہونٹ کا چاند نین کا تارا
میری تنہائیوں کے بن میں نہیں

رنگ و نکہت ہوا کے ساتھی ہیں
پھول کا آشیاں کرن میں نہیں

احمد مشتاق

☆

تو آپ سے آپ آ گیا تھا
میں کب تجھے ڈھونڈنے چلا تھا

اب رات تھی اور گلی میں رکنا
اس وقت عجیب سا لگا تھا

دبلا پتلا نحیف سا چاند
شاخوں سے پرے گزر رہا تھا

بدلی بوسیدیں اتارتی تھی
اب چاند رکا ہوا کھڑا تھا

بادل کی گرج ڈراؤنی تھی
چھاجوں پانی برس رہا تھا

کوئی بے حد پرانا نغمہ
ساحل سے بلند ہو رہا تھا

ساز و آواز دینے والے
مشتاق فقیرِ بے نوا تھا

☆

ترانۂ غمِ دل ، قصّۂ شبِ محزوں
سنے تو کون سنے اور کہوں تو کس سے کہوں

بڑے گلاب کی شاخیں پسند ہیں مجھ کو
مرا نصیب یہی ہے کہ دور سے دیکھوں

زمیں کی پیاس مرے آنسوؤں سے بجھتی ہے
مگر یہ بات کھڑے بادلوں سے کیسے کہوں

یہ زرد شاخ مجھے کیوں اجاڑ دیتی ہے
اگر برا نہ مناؤ تو اس سے پوچھ ہی لوں

مرا وجود تو جب ہے کہ تم بھی ہو موجود
اب اپنے آپ سے باتیں کروں کہ تم سے کروں

کوئی ہزار کہے کوئی لاکھ سمجھائے
وہی کروں جو مرا دل کہے ، جو میں چاہوں

ضیا جالندھری

☆

اے دل نہیں تلاش مری کو بکو نہ تھی
اپنے سے اک فرار تھا وہ جستجو نہ تھی

کیوں موج کے جنوں پہ ہنسا چاند کا سکوت
کیا وہ ہنسی، وہ چاندنی خود آرزو نہ تھی

اظہار نارسا سہی وہ صورتِ جمال
آئینۂ خیال میں بھی ہو بہو نہ تھی

رویا کوئی تو ساتھ بھر آئی ہے میری آنکھ
اوروں کا غم شریک تھا جب پاس تو نہ تھی

اب اہلِ آرزو پہ ہے کیا کیا سکوں کو رشک
وہ دن کہاں کہ تابِ غمِ آرزو نہ تھی

کیا جانے اہلِ بزم نے کیا کیا سمجھ لیا
اخفائے آرزو تھی وہ چپ گفتگو نہ تھی

ہم بھی ملے تھے ان سے اے سادہ لوحِ دل
وہ اور یوں رلائیں یہ ان کی تو خو نہ تھی

ادراکِ آرزو کے تو دعوے ہمیں بھی تھے
اچھا ہؤا کہ اپنی نظر روبرو نہ تھی

وہ کون سی سحر تھی کہ روئی نہ پھول پھول
وہ شام کون سی تھی کہ غم سے لہو نہ تھی

وہ دردِ انبساط وہ بیتاب انہماک
وہ قرب تھا کہ اور کوئی آرزو نہ تھی

ہم تو فریفتہ تھے ضیا دل کی آنچ پر
منظور محض دلکشیٔ رنگ و بو نہ تھی

نظمیں

اجنتا کے غار — میراجی

دھیان کی جھیل میں لہرایا کنول کا ڈنٹھل
سوچ آتی ہے مجھے کیوں ہوئی پُروا چنچل
دھیان کی جھیل میں ہر چیز ہے کومل شیتل
جیسے ساری ہو اٹھائے ہوئے امرت چھاگل

آج چھاگل سے ٹپک اٹھی ہیں ننھی بوندیں
دھیان کی لہریں ہیں یہ لاج سے رسنی بانہیں
رستی بوندوں پہ نہیں اب مجھے کوئی قابو
شبِ فرقت میں چھلک آتے ہیں جیسے آنسو
پھیلتی جاتی ہے اب یاد کی چنچل خوشبو
دشتِ ویران میں آجاتے ہیں بھولے آہو

میلے کپڑوں کی طرح لٹکی ہوئی تصویریں
بیتے دن رات مرے سامنے لے آتی ہیں
کئی راجہ ہیں یہاں ایک ہی راجہ بن کر
ایک ہی تاج کے ہیرے ہیں ، کئی ہیرے ہیں
راج دربار ہو یا راج بھون ہو ، دونوں
ایک خوشبو سے بسے ہیں ، وہی گہری خوشبو
جس نے دیوانہ بنایا ہے بھکاری کو مدام
بھید لیکن اسے معلوم نہیں ہوتا ہے ،
اس کی نظروں کو دیا ہے دھوکا
بھوک نے پیاس نے — (کیا کہتے ہو
جیسے تم پیاس سمجھ بیٹھے ہو
وہ بھی اک بھوک ہے اب ۔ جان لیا
میں فقط پوچھتا ہوں

پانی پینے کو نہیں ملتا تو کیا ایک لنگوٹی تن کی
داسی کی یاد نہیں لا سکتی ؟)
کیا کنول تال کا منظر نہیں دیکھا تو نے
بالوں کو پھول سجاتے ہیں ۔ مگر کانوں میں
سبھی کلیوں کے لٹکتے بندے
لڑکھڑاتی ہوئی نظروں کو لیے جاتے ہیں
اُس کنول تال میں حسن کے سائے
پیڑ کی چھاؤں سے بھی بڑھ کے سکوں لاتے ہیں
بات کیا ہے کہ وہ جیون حس کو
مشعلیں اپنے اجالے ہی سے دکھلاتی نہیں
دھیان کی لہر کے اک نرم جھکولے ہی سے جاگ اٹھا ہے
رات چھائی بھی مگر
رات بھی دن کی طرح نور کو لے آئی ہے
نور تاروں کا بھی ہے ، چاند بھی ہے ، سورج بھی
تینوں اک دوسرے سے باری لیے جاتے ہیں
چاند رانی ہے تو سورج راجہ
داسیاں تاروں کی مانند نظر آتی ہیں
ان کی حرکات کے مفہوم مجھے کیا معلوم
میرا مفہوم ہے صرف ایک ہی بات
ایک ہی بات — مگر یہ تو ہے میرے بس کی
ایک ہی بات سے سو باتیں بنا لوں دن میں
اسی اک بات سے یاد آیا ہے
ناچنے والی کا ہلکا سا اشارہ مجھ کو —
ناچ بھی کیا تھا وہ پھولوں کی لڑائی تھی مگر اس میں بھی
ہاتھ ہلتے تھے تو اک پوری لغت مجھ کو نظر آتی تھی . . .
سست مفہوم بھی تھے تیز بھی تھے کچھ مفہوم
جب کسی نرم کلائی کی سنبھلتی لے میں
موج آتے ہوئے رک جاتی تھی

« چھوڑ دو ، چھوڑ دو » ۔ آواز یہی آتی تھی ۔
اور وہ کانوں کی کلیاں اس پر
کھل کے جو بالوں میں دو پھول بنی بیٹھی تھیں
ایک بے نام سی لرزش کھا کر
کانپتے کانپتے رک جاتی تھیں ، کچھ جاتی تھیں
وہی اک بات جو پہلو میں چھپائے ہوئے سو باتوں کو
رات کو دن کی طرح نور سے بھر دیتی ہے
دل پہ اک سحر سا کر دیتی ہے ــــ

کیا کنول بال کا منظر نہیں دیکھا تو نے
پیڑ ہیں ، پتے بھی ہیں ، پودے بھی لہراتے ہیں
سوکھتے جاتے ہیں جو پتے وہ گر جاتے ہیں
یہ سماں دیکھ کے اک دھیان مجھے آتا ہے
پہلے چپٹی تھی زمیں سیب نے گر کر اس کو
کرۂ ارض کی صورت دے دی

ایک ہی جست میں طے ہو گیا رستہ سارا
دل نے چھنا کی طرح اسپِ سبک سیر کو جب لمس کیا
راجدھانی میں کپل وستو کی
جلوۂ قلبِ جہاں مجھ کو نظر آنے لگا
ایک ہی رنگ پہ تھا وقت کے دریا کا بہاؤ
کس میں جرأت تھی کہ اس سیل کو وہ روک سکے
ایک انسان مگر آیا ، اُسی نے روکا
بن گیا وقت بھی اک ذہن کے دریا کا بہاؤ

میں نکل آیا ہوں اب سنگ کی محرابوں سے
جن کا اک گہرا تصور ہے مرے ذہن کے آئینے میں
ایک ہی جست نے پہنچایا ہے میرے دل کو
راجدھانی میں کپل وستو کی :

آج بر آئی ہے رانی کی تمنّا شاید
شہر ہنگامۂ عشرت ہے ، ہر اک پیر و جواں
رقص و نغمہ کے دھندلکے میں چھپا جاتا ہے
گویا چکر سے الٹ کر یہ چلے گا ہر گز
ان کا اندیشہ تھا اک خام خیال
پھر وہی دور پلٹ آیا ہے ، اب راج کمار
رشک فردوس محل کی زینت
یعنی شہزادی یشودھا کو لیے آتا ہے
ان کا اندیشہ تھا اک خام خیال

پھر وہی دور پلٹ آیا ہے
اب مہاراجہ نے پوتے کی مسرت کا سماں دیکھا ہے
لیکن افسوس کہ بیٹے کے جسم پر اس کے
عیش میں ایک چبھن درد کی در آئی تھی
وہم کیسے کہیں ؟ اک پنڈت نے
زائچہ دیکھ کے یہ بات کہی تھی سب سے
اور مہاراجہ کے فرماں کی ہی دیر تھی اک چشم زدن میں دیکھو -
بس گیا جھیل کے آغوش میں اک راج محل
کس کو معلوم تھا اک آنکھ جھپکنے میں — تمام
نقشۂ عیش یہ یوں اوس ہی پڑ جائے گی
سجی محفل ہی اجڑ جائے گی -
اک اچٹتی سی نظر — جاگ یہ اٹھے — چل دو
یہ خیال آتے ہی چھنّا کا خیال آیا اک
اور پھر اپنے وفادار ملازم سے بھی رخصت ہو کر
چھوڑ کر ریست کے ہنگاموں کو
چل دیا دور کہیں - دور - بہت دور کہیں
سوچتا جاتا ہے وہ — پاؤں زمیں پر اس کے ......
گرتے پھولوں کی طرح پڑتے ہیں

کہ کہیں دیکھ نہ پائے ان کو
سیر کرتے ہوئے وہ راج کمار
زندگی سے حسیں بچپن میں ، جوانی میں ، زمی نادانی
مجھ کو کنول وقت کی رفتار نے الجھایا ہے
پھر یہی لذت کا خیال آیا ہے
آم کے پیڑ کنول تال کنارے جھوم کر
سرسراتے ہوئے پتوں کی صدا سے پیہم
یہی اک سوچ میں کھو دیتے ہیں
آم کیسے ہیں ، کنول کیسے ہیں
اور میں سوچتا ہوں
آم شیرینی سے لذت کا مزہ دیتے ہیں
اور کنول جلوہ دکھاتے ہی ہر اک بات بھلا دیتے ہیں
یہ کنول تال پہ تُو آم کا سایہ مت جان
کیا تجھے یاد نہیں آتی ہے
کیوڑے کی وہ گھنیری چھاؤں
جس کے پردے میں کنول کھلتا ہے ، ہنس دیتا ہے
زندگی کیا ہے کوئی اس کی خبر لیتا ہے
ایسے لمحوں میں تو صرف ایک ہی بات
وہی اک بات جو پہلو میں چھپائے ہوئے سو باتوں کو
رات کو دن کی طرح نور سے بھر دیتی ہے
دل پہ اک سحر سا کر دیتی ہے
اور پھر اس کی خبر دیتی ہے
زندگی کیا ہے یہ تُو جان گیا
سوچ کیا جان لے اب بھید نیا
موت کیا ہے ـ مگر اس بات کو کیا جانے گا
موت کیا ہے ـ کوئی یہ پوچھتا تھا
اور پھر وقت کی رفتار الجھ کر مجھ کو
یہی دیتی ہے جواب

ریست کے پیڑ سے گرتا ہوا سیب
دیکھ کر جس کو کئی گیان کے چشمے پھوٹے۔
مجھ کو کیوں وقت کی رفتار نے الجھایا ہے
ابھی دل سیکڑوں برسوں کی خلا پھاند کے لوٹ آیا ہے
ایک ہی وقت ہے ۔ اک دور ہے ۔ رغبت کیوں ہے
ایک ہی نور مرے ذہن نے کیوں چھایا ہے
نور کے رنگ کئی ہیں کوئی آئے — آئے.......
نور کا رنگ ہے صرف ایک ، بدل دیتا ہے اس کو ماحول
وجہ تحریک ہیں پژمردہ نقوش
علم ہی سینۂ ماضی میں لیے جاتا ہے
ورنہ فردا بھی مجھے دوش کی مانند نظر آ جاتا
جیسے اب دوش نظر آتا ہے دیوار کی تصویروں میں
اور دیوار کی تصویریں بتاتی ہیں مجھے وقت کی رفتار کے ساتھ
ایک انساں لڑکپن سے جوانی میں گیا
اور جوانی کے گزرنے پہ بڑھاپا آیا
ہاں وہی راج کمار
باغ میں جس کے نہ تھی کوئی بھی پژمردہ کلی
دوش و فردا کی مصیبت ہی سے آزاد ہوا

تین منظر تھے فقط — ایک — دو — تین
نوع انساں کے نصیبے کو بدلنے والے
نوع انساں تو ہے جاہل کا دماغ
جس نے بھی گیاں کی اک بات کہی
دار پر اُس کو چڑھا کر مارا
ایک کہتا تھا زمیں گول ہے اور گھومتی ہے
نوع انساں نے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا کر چھوڑا
لیکن افسوس زمیں گول تھی اور گھومتی ہی جاتی تھی
اس کا چکر بھی مگر نور نہیں لا سکتا
اس اندھیرے میں ازل سے جو ابد تک پھیلے

نوعِ انساں بھی تو اک غار کی مانند ہے — تاریک مقام
اس کی تاریکی اجالے کو دبا سکتی نہیں ہے لیکن
کیا اسی واسطے کچھ گیانی یہاں آئے تھے
تاکہ ان غاروں میں چپ چاپ ۔ جہاں والوں سے
ہو کے روپوش ۔ سفر طے کر لیں ۔
دوش و فردا کا سفر طے کر لیں
لیکن افسوس یہاں بھی ان کو
نہ ملا مایا سے نروان ۔ یہی دیواریں
ان کے افسردہ دلوں کی غماز
آج تک دشت میں سر مارتی ہیں !
کوئی اتنا تو بتائے مجھے ۔ اس داسی کو
اس طرح سامنے لے آنے کا مقصد کیا تھا
اس کی گردن سے پھسلتے ہوئے جاتی ہے نظر
ایک وادی سے گزرتے ہوئے ۔ بس بس ۔ خاموش
سوچنے والوں کو صرف ایک سرا کافی ہے
دار پر ان کو چڑھا دینی ہے
نوعِ انسان ۔ وہی جاہل کا دماغ
ہاں ۔ وہ کیوں غاروں میں پابند ہوئے تھے آ کر
سوچتے سوچتے جاگ اٹھی تھیں دل میں یادیں
ایک جو بھاگ کے دربار سے آیا تھا یہاں
سوچتا تھا ۔ وہ محل کی داسی
جس پہ دربار میں راجے کی نظر رہتی تھی
کتنی سندر تھی ، بڑی سندر تھی
ایک جو رانی سے اک رات ملا تھا چھپ کر
اس جگہ آ کے نقوش اس کے بنا بیٹھا تھا ۔
اور اب اس کی بنائی ہوئی صورت پہ بھی اپنا دامن
وقت کی رات نے پھیلایا ہے ۔
اسی دیوار پہ اس ٹکڑے پہ میں دیکھ رہا ہوں جس کو

منتری ایک، تھا راجہ مگر اس کو بھی
راس آئی نہ ہوا راج کا تانا بانا
ایک مکھی کی طرح سوچ کے لے آیا یہاں
اور اب دیکھ رہا ہوں میں بھی ...
اس نے جو نقش بنائے تھے وہ سب ہیں باقی ....
ایک راجہ کا جلوس اور ہیں اس کے آگے
اک بھکاری کو ہٹاتے ہوئے دو گھوڑ سوار —
کشمکش زیست کی ہمراہ یہاں لائے تھے
پھر وہ کیوں غاروں میں پابند ہوئے تھے آ کر ؟

میں بھی پابند ہوں — کیوں وقت کی رفتار نے الجھایا ہے ؟
میں نکل آیا ہوں ان سنگ کی محراہوں سے
جن میں کندہ ہے کہانی دل کی
دل وہی حس کے ہزاروں جلوے
دھندلی دیواروں نے اک پل میں دکھائے ہیں مجھے
ان کے اک گہرے تصور کو میں لے جاؤں گا
اور پھر گھر کے سکوں میں جا کر
ایک ہی دھیان مجھے آئے گا — اک صدّی دھیان —
پہلے چپٹی تھی زمیں سیب نے گر کر اس کو
کرۂ ارض کی صورت دے دی

دھیان تو آتے ہی آئے گا میری آنکھوں کو
سیب ایک اور ہی شے بن کے نظر آتا ہے
اور تُو — سامنے لیٹی ہوئی صدّی مورت —
چند آسودہ خطوط —

حس نے بیتی ہوئی صدیوں میں مجھے الجھایا
تُو ہی داسی ہے تُو ہی رانی ہے
رات کی مہلتِ یک لمحہ کو انبار بنا دیتی ہے
رات کے جانے پہ بیزار بنا دیتی ہے

میرے دل کو — میرا دل راجہ ہے
اس کومل تال کے پژمردہ کنارے پہ نشستہ ہے مگر
بات اس کی نہیں سنتا کوئی —
اور یہ بیٹھے ہوئے سوچ کی لہروں میں بہا جاتا ہے
مدتیں بیت گئیں ناک اداؤں کا جلوس
دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے نکل جاتا ہے
اور پھر دھیان مجھے آتا ہے
لیٹے لیٹے جو تری آنکھوں میں نیند آ جائے
میں تجھے چھوڑ کے چل دوں — کہیں چل دوں — چپ چاپ
اک اچٹتی سی نظر جاگ نہ اٹھے چل دو
یہ خیال آتے ہی چھٹنا کا خیال آتا ہے
وہ نہ خوابیدہ ہے انجان ہے اور نازوں پلے
اؤ اب سوئیں بہت رات گئی — سدا آئی

اکتوبر ۴۱ء

(مختار صدیقی صاحب کی عنایت سے)

ہاں اے دلِ افسردہ

فراق گورکھپوری

(مدائن پر خاقانی کے اس قصیدے سے متاثر ہو کر جو یوں شروع ہوتا ہے)

ہاں اے دلِ عبرت بیں از دیدہ نگہ کن ہاں   ایوانِ مدائن را آئینۂ عبرت داں

ہاں اے دلِ افسردہ دنیا پہ نظر کر ہاں
یہ جلوہ گہ فطرت یہ کار گہ انساں

ہر درد ترے غم کا تاریخ کا اک عنواں   کس درجہ ہے پُر عظمت تیرا یہ غمِ پنہاں
ہر نعمتِ ہستی ہے تیرے لیے او ناداں   تیرے لیے فطرت کا ہر ایک سر و ساماں
دم سے ترے رونق ہے اس محفلِ ہستی کی   مہر و قمر و انجم تیرے لیے آویزاں
ہے راج گلستاں پر ، فرمان بیاباں پر   احکام سے تیرے ہی کھلتے ہیں درِ زنداں
ہر خطِ مصور میں ہیں دھڑکنیں تیری ہی   ہر نغمۂ شاعر میں تو ہی تو ہے گل افشاں
مہکے ہوئے گلشن میں دھکے ہوئے صحرا میں   ہے جوشِ نمو تیرا تیری تپشِ پنہاں
تو آگ بھی پانی بھی ، تو قہر بھی رحمت بھی   اس گلشنِ عالم میں تو برق تو ہی باراں
تیرے ہی لہو سے ہے گلشن کی حنابندی   بھیگے ہوئے تنکوں کو شعلے کا دیا داماں
پہنائی ہر عالم تیری ہی وراثت ہے   جاگیر تری ہی ہے ہر بیشہ و ہر میداں
ہاتھوں میں ترے جس ہے آنکھوں میں تری رس ہے   دھرتی کو کیا گلشن ، بنجر کو کیا بستاں
ہر برگ پر احساں ہے ، ہر نخل ترا ممنوں   تو میرِ چمن بنداں ، تو بارشِ گلکاراں
فطرت کے وحشتوں کی اصلاح بھی کی ، یوں تو   ہر بھول ہوئی تجھ سے ہر سہوِ خطا کاراں
فطرت کا عمل تجھ پر ، فطرت پہ عمل تیرا   تہذیب و تمدن کے اس امر میں سب امکاں
اس باہمی رشتے کے بڑھنے سے لگی آنے   انساں سے بوئے فطرت ، فطرت سے بوئے انساں
شاگرد بھی فطرت کا ، استاد بھی فطرت کا   تو طفل ابد کا ہے اور تو ہی ابوالدوراں
دنیا کو بدلنے میں تو بھی ہے بدل جاتا   اس دُھرے عمل کا ہے ہر ردِّ عمل پنہاں
زنجیرِ عمل کی ہی کڑیں ہیں جھنکاریں   معدود نہیں کڑیاں ، یہ سلسلہ بے پایاں
راحل ہے ازل کا تو ، سیاح ابد کا تو   کچھ تجھ کو خبر بھی ہے کب سے ہے سرگرداں
تنہا نہ سمجھ خود کو ، ہمراہ ترے اے دل   ہے گردِ ثوابت بھی ، سیّارے بھی ہیں رقصاں
مہر و مہ و انجم میں ہے عکس فگن تو ہی   اس آئنہ خانے میں اس درجہ نہ ہو حیراں
دنیا ہے وطن تیرا دنیا کا وطن تو ہے   گم کردہ وطن ہو کر از یادِ وطن نالاں
ہر دور کے غنچوں کی تجھ سے ہی کُھلیں گرہیں   ہر عصر کے دامن میں تو ہی ہے بہار افشاں
تیرے لیے دنیا ہے ، دنیا کے لیے تو ہے   ہاں خود پہ نظر کر کے دنیا پہ نظر کر ہاں

آئینۂ دوراں ہے یہ تیری اداسی بھی
ہر چینِ جبیں تیری تاریخ کا اک عنواں

ہر ایک جھجک تیری صد جائے تامل ہے
ہر وہم و گماں تیرا ہے رہ کشِ صد ایماں

قسمت میں تری اے دل راحت نہ سکوں، لیکن
ہر دکھ کا مداوا تو، ہر درد کا تو درماں

ہر دورِ سیہ کا ہے تو مطلعِ صبحِ نو
اے مامنِ غم زدگاں وے مونسِ مظلوماں

تیرا ہی جلال اے دل آتا ہے نظر مجھ کو
جب ٹھوکریں کھاتی ہے سرداریٔ سرتاباں

مردودِ خلائق بھی، مسجودِ ملائک بھی
اضداد کا مجموعہ، گہ نادم و گہ نازاں

تاریخِ تمدن کا تو راز ہے سربستہ
اخلاق کا پیغمبر سردارِ گنہگاراں

معصوم ہے تو پھر بھی گو تجھ سے ہوا سرزد
نشے میں محبت کے ہر جرمِ سیہ کاراں

پیے ہوئے ماتھے پر ہے مہرِ الوہیت
دکھتے ہوئے سینے میں صد کرب و عذابِ جاں

ہے وقت کے چہرے کا غازہ ترا خونِ گرم
سوزِ دلِ انساں ہے جلوہ دہ ہر عنواں

قطرے ترے آنسو کے آئینۂ مستقبل
تقدیرِ بنی آدم ہے غم میں ترے پنہاں

ہے تیری سیہ مستی جولانگہِ برقِ عقل
ہے عقل میں بھی تیری اندازِ بلا نوشاں

گونجی ہوئی دنیا میں ہیں تیری ہی آوازیں
اے نغمہ سرائے جاں، اے طائرِ خوش الحاں

اے جانِ جہاں دنیا انوار کی دنیا ہے
ہر روز ہے زر افشاں، ہر شب ہے گہر ریزاں

ہر منظرِ فطرت کو ہے تجھ سے ہم آہنگی
یہ مجمعِ ہمدرداں، وہ محملِ غم خواراں

ہاں مانگ لیا تو نے پھر بانٹ دیا تو نے
فطرت سے غمِ فطرت، انساں کو غمِ انساں

پایا ہے تجھے مضطر گہ سیج پہ پھولوں کی
گہ دار و رسن پر بھی پایا ہے تجھے خنداں

آزادی تری فطرت، ہر قید تری قسمت
آوارۂ ہر گلشن، شائستۂ ہر زنداں

اس گلشنِ ہستی کا پُر کیف ہے ہر منظر
پھولوں پہ نظر کر کے کانٹوں پہ نظر کر ہاں

نغموں میں ترے اے دل دیکھی ہے زمانے نے
تصویرِ غمِ دوراں تاثیرِ غمِ جاناں

ہر چیز نشانہ ہے، ہر تیر ترازو ہے
اس عالمِ ہستی کے اے فاتحِ عالیشاں

تیرا ہی تصرف ہے، تیرا ہی تکلف ہے
وہ بزمِ فریدوں ہو یا انجمنِ کیواں

رن بولتے ہیں اے دل یا تو ہی دھڑکتا ہے
ہیں تیری ہی زد میں سب کیا خیبر و کیا فاراں

دنیا میں ہوئے اے دل کتنے ہی مہا بھارت
ارجن کی کماں تھا تو، تو بھیشم کا تھا پیکاں

ہے کرشن کے گھنگھرو کی جھنکار ترے خوں میں
گینی کی ہے رادھا کا ہاتھوں میں ترے داماں

حسن بانسری کی لے پر مدہوں کو بھی وجد آیا
تھا اس کے بھی پردے میں ہاں تو ہی تو نغمہ خواں

اٹھی ہیں ترے غم میں تپ کر کئی تہذیبیں
تابندہ ترے خوں سے تاریخ کا ہر عنواں

ان ملکوں کی تہذیبیں تیرے ہی کرشمے تھیں
ہو چین کہ ہندستاں، وہ مصر ہو یا ایراں

ظلمات چکاں بھی تو، انوار فشاں بھی تو
تو بانیٔ خیر و شر، تو بیم و رجا کی جاں

بے وجہ نہیں تجھ کو ترجیح ملائک پر — ایک ایک ادا تیری تسخیر کنِ یزداں
جبریل کی ہمت بھی چھٹ جائے جہاں اے دل — ایسی بھی فضاؤں میں پایا تجھے پر افشاں
قائم تری ہمت سے ہے نظمِ جہاں اے دل — بے تیرے بکھر جائے شیرازۂ جسم و جاں
ہے کار اہم تیرا تہذیب کو دل دینا — حاصل ہے تمدن کا تیرا عملِ پنہاں
احسانِ گراں اے دل شاعر پہ بھی ہیں تیرے — ملتی یہ کہاں مجھ کو شائستگیٔ وجداں
جو غم کے دریچوں سے جنت میں پہنچی ہیں — وہ ٹھنڈی ہوائیں بھی ہیں تیری نسیمِ جاں
یہ بزم جہاں تجھ سے اک بزمِ محبت ہے — اے عشق کے سوزِ جاں ، اے جلوہ دہِ خوباں
ابرو میں لچک تیری ، تیور میں دمک تیری — تو حُسنِ طرحداراں ، تو نازشِ کج کلہاں
تیزیٔ سناں تیری ، تخلیقِ بتاں تیری — مطلوبِ جگر داراں ، محبوبِ نظر سازاں
کاشیٔ ازل ہے تو ، رومائے ابد ہے تو — تو کعبۂ دوراں ہے تو قبلۂ عالمیاں
دنیا میں نئے جُگ کا وہ شہر بسایا ہے — صد رشکِ مدائن ہے جس شہر کا ہر ایواں
اس ہند کی مٹی سے تخلیق ہوئی تیری — قرنوں سے رہی ہے جو سیرابِ جوئے حیواں
تجھ میں وہ گھلاوٹ ہے، تجھ میں وہ حلاوت ہے — آب و گلِ جنت بھی اس چاشنی کی خواہاں
غم میں ترے پلتا ہے انسان کا مستقبل — اہمیتِ غم تجھ کو معلوم نہیں ناداں
اک آیۂ رحمت ہے ہر خطِ خراشِ خم — ہر زخم کے ساتھ اترا سینے میں نیا قرآں
دنیا میں تری، اے دل، ہر روز ہے روزِ غم — دنیا میں تری اے دل ، ہر رات شبِ ہجراں
خاموش فضا لیکن دیتی ہے بشارت بھی — پھر بزم سجائے گا تیرا یہ غمِ پنہاں
دشمن کو بھی کر لے گا اک روز وہ دوست اپنا — سائے سے بھی اپنے ہے گو آج بشر ترساں
مانا کہ ہے دنیا کا یہ دور بہت نازک — گو موت کے سائے میں برروئے زمیں رقصاں
مایوس نہیں ہوتے ، افسردہ نہیں ہوتے — ہر جرم و گنہ کر کے انسان ہے پھر انساں
تاریخ ہٹاتی ہے گر ایک قدم پیچھے — دو گام بڑھ آنے کا کر لیتی ہے یہ ساماں
کچھ دیر نہ آئے جو فطرت سے بوئے فطرت — کچھ دیر نہ آئے جو انساں سے بوئے انساں
تو اے دلِ غم دیدہ یہ دور عبوری ہے — «خود غیریت» اس جُگ کا ہے اک اثرِ پنہاں
منسوخ بھی کرتی ہے تاریخ کچھ اپنے باب — اپنے لیے کرتی ہے قائم وہ نئے عنواں
اے دل یہ نئے عنواں بھی دین ہیں تیری ہی — تیرے ہی تو اشکِ خوں ہوتے ہیں چمن افشاں
ہے بادِ خزاں میں بھی بو تازہ بہاروں کی — مٹتی ہے سیہ بختی ، کٹتی ہے شبِ ہجراں
بے نام سی اک کاوش تقدیر تری اے دل — از صبحِ ازل کوشاں تا شامِ ابد کوشاں
پانے کے لیے جس کو گردش میں ہیں سارے — ہے تیرے ہی پردوں میں وہ رازِ غمِ دوراں

تیری یہ کہانی تو دنیا کی کہانی ہے
ہاں خود پہ نظر کر کے دنیا پہ نظر کر، ہاں

اب دل و دیدہ بیاباں ہیں.... مختار صدیقی

اب دل و دیدہ بیابان ہیں ، — نہ ساحل بھی
موجِ آشفتہ کی سرکوبی و شیون سے نزاد
کیسے دمساز ہے ، میری سُسک ساری کا !
اور میں — جس کو لگن رہتی تھی اس ساحل کی
سوچتا ہوں : میری منزل کے یہی ہیں آثار ؟
نمکی ، نم خوردہ چٹانیں ، یہ رواں ریگ ، یہ بیگانہ کنار ؟

آ لگا ایسے کنارے پہ سفینہ ، کہ جہاں
اپنے طوفان گزیدہ نہیں جانے جاتے !
ہے یہی میری تمناؤں کی قُدسی منزل ؟
میں نے جس کے لیے چھوڑے چہ زماں و چہ مکاں ؟
کتنے ماضی میرے ہاتھوں سے مٹے — حال گئے
وہ روایات ، اساطیر و صنادید ، چھٹے اس کے لیے ؟

موجیں اب جوار پہ ہیں ، ان کی غضب ناکی سے
بچ کے جاؤں تو کہاں ؟ کس کی پناہیں ڈھونڈوں ؟
ریت کے گھر بھی نہ نکلے ، مرے سپنوں کے محل !
جن فضاؤں سے یہ بیراگ لیا ہے میں نے
ماضی و حال کی اپنے وہیں آہیں ڈھونڈوں ؟
انہی یادوں ، انہی مانوس فضاؤں ہی کی راہیں ڈھونڈوں ؟ :

میری نظروں میں امنڈ آئیں گھٹائیں کیا کیا کالی ، متوالی ، شرابور ، گرجتی ، گھنگھور !
گھن گرج رعد کی ، کوندوں کے لپکتے نیزے ڈونگرے مینہ کے ، برستے ہوئے جھالے سرشور !

اور — کھلے ابر کے دل ، ہلکی ہوا بھی ساکت ایک عالم پہ محیط اپنی گراں باری سے
کبھی باریک پھواریں ، کبھی بوندیں ہلکی ! نہ برس کر ہی کھلیں اور نہ برسیں کھل کے !

اور — سرِ شام فضاؤں میں بھٹکتی بدلی شفقِ شام پہ ہر آن نئی صورت میں
کبھی اژدر ، کبھی تتلی ، کبھی سونے کا پہاڑ لمحہ در لمحہ نئی شان نئی حالت میں !

اور پھر — موسمِ گل کا وہ صدف‌گوں بادل   چرخِ مینائی کی پہنائی میں آئینہ بدست
شہر و صحرا پہ گُہربار دمِ بادِ شمال   سایۂ ابر و لبِ جو و نگارِ منِ مست !!

ایک موج آتی ہے پھر — کف بہ دہاں ، چرخ زناں
اپنے ساحل پہ بپھرتی ہوئی ، غرّاتی ہوئی
ریت کے کچّے گھروندوں کی الٹتی ہے بساط ؛
اور — بس جاتا ہے قطروں میں صدی اور سماں :
(موج پسپا بھی ہوئی جاتی ہے ، بل کھاتی ہوئی !)

(۱)

ارجمند ایسے بھی تقدیر کے کم دیکھے ہیں   حسنِ جاں سوز و جہاں تاب کا ، یہ نیا اعجاز :
صورت ، آئینۂ حیراں تھی فقط ، صورت کی   وہی رعنائی و تمکیں ، وہی زیبائی و ناز !

ایسے آشفتۂ اضداد بھی کم دیکھے ہیں !   سنگ دل ، آئنہ‌رُو — مہر بہ‌خُو ، عربدہ‌خُو !
موج و شعلہ ،گل و صرصر، رم و رغبت بہ‌کنار   شمعِ پروانہ صفت ، لالۂ وارفتہ نُمو !

بے نیاز، ایسے خدائی میں بھی کم دیکھے ہیں!   اوس کو روتا ہوا سمجھیں تو ہنسی پھر آئے !
ایک عالم تہ و بالا ہو ، بلا سے ان کی   اور — مسلی ہوئی پتّی بھی نہ دیکھی جائے !

ایسے نیرنگ تلوّن کے بھی کم دیکھے ہیں !   کبھی تقدیسِ مجسّم ، کبھی ترغیبِ گناہ
مل نہ سکے میں ستارہ ، رگِ جاں قربت میں   مہر میں مادرِ گیتی ، تو تغافل میں نگاہ !

ایسے خود بیں تو کتابوں میں بھی کم دیکھے ہیں!!   حسن کو گردشِ ایّام پہ حاوی جانیں
وقت جیسے ہو اسی ماہ وشی کا چاکر   دمِ پندار خدا کو بھی نہ قادر مانیں !

جودتِ ذہن پہ یہ نثار بھی کم دیکھا ہے !   زعمِ زیبائی کو بھی ماند کیا تھا حسن نے !
یک چمن گل تھا اگر گلبدنی کا عالم   صد چمن نکہتِ گل ، ذہن کا عالم جیسے !

ایسی آنکھیں بھی تو ان آنکھوں نے کم دیکھی ہیں!!   روح کے در بھی ہوں — اور پردۂ در بھی خود ہی
سُرمہ سا ، نیلمی، جھیلوں کی طرح گہری — اداس!   بے تعلق بھی ، گریزاں بھی ،کرم گُستر بھی!

ایسا گفتار میں جادو بھی تو کم دیکھا ہے !   چُپ بھی اک بات تھی، باتیں تو بھلا باتیں تھیں
پیاری ،تہ‌دار، سجل ، شرم میں ڈوبی ، بے باک!   ان کے ہونٹوں پہ تو پھولوں کی خدا باتیں تھیں!

(۲)

باتیں کیا کیا ھیں — نکل آئے گی ھر بات میں شاخ! وضع ، انداز ، پھبن ، رُوپ ، کرشمہ ، طلعت !
ایسے عالم بھی نکلتے تھے کہ جن کا عالم لفظ و معنٰی میں نہیں آتا ھے — میری قسمت!!

لہر پر لہر امنڈتی ھے — بگڑتی ، بڑھتی
خیل در خیل چڑھی آتی ھیں پیچاں موجیں !
دل کے دل پانی کے ، دیوار کی دیوار کبھی
اپنے ساحل کی چٹانوں، پہ جھپٹتی ، چڑھتی
اک نیا رنگ جماتی ھے مری نظروں میں :

اب وہ آبادیاں ـ بَن ھو گئی ھوں گی — کہ جہاں ھم جہاں بین و جہاں گیر تھے — صدیوں کی قسم
عہد در عہد وہ صدیاں ھوئیں زندہ مجھ میں جن میں ھم کار کن و کار کُشا تھے پیہم !

(۱)

میری نظروں میں — مرے پہلے مدا ن آئے : یہ خرابے — مری سطوت کے یہ پہلے مامن
میلوں پھیلے ھوئے کھنڈروں کا یہ دشتِ وحشت ! یہ عدم زار در و بام ، یہ اجڑے مسکن !
مسجد قوۃالاسلام ھے جن میں زندہ جس سے منسوب ، اسی ذات کے دم سے دائم!
قُطب مینار ، اذان گاہِ اَجَلّ و اعلٰی حکمِ تکبیر سے ھے آج بھی حیّ و قائم!

(۲)

میری نظروں میں چھلک آئی — دکن کی برسات مالوہ دیس کی راتیں جو گئیں ، پھر آئیں !
میری نظروں میں ابھر آئی تھیں — دو بھر راھیں کیسی پر چھائیاں آنکھوں میں مری گھر آئیں !
بستیاں — جو کہ بنوں سے بھی پرانی ھوں گی وہ گھنے بَن ـ کہ ھیں جیتی ھوئی ھر شے سے قدیم!
جھیلیں — میلوں سے بڑی دلدلیں — کالی مٹّی شہر — اور شہرِ خموشاں کے وہ راھی ، وہ مقیم!!
سُونی دانش گھیں ، ویران محل ، ٹوٹے حصار مقبرے ، خیرِ گزشتہ کے اثر سے آباد !
بیجا پور آج ھے بے جا ، تو ھے بیدر ، بے در اور گلبرگہ ھے بے برگ و نوا و برباد !!

(۳)

میری نظروں میں ھیں اب — اور ھی عبرت گاھیں : دو عقیدوں کے تصادم کا مآل و مظہر
قلعہ اور قلعہ شکن توپ ، فصیلیں ، روضے نظمِ اقبال* کا موضوع جلیل و ابتر !

* گورستان شاھی (بانگ درا)

دام و دد کے مُوئے رمنے، کہ جوایوان تھے کبھی   دشت در صحن ہے ، ہر کوشکِ معدوم یہاں
حوض بے آب ، چمن کور ، لٹی بارگہیں   جن کا مقسوم ہوا مرثیۂ بُوم یہاں !
گولکنڈے کا یہ معمورۂ وحشت آثار   خاک میں خاک ہوا ، اپنے ہی گورستاں میں
اور اس مدفنِ مرحوم کی جدول پہ ابھی   عشق کا بھاگ نگر* زندہ ہے بزمِ جہاں میں

پھر اٹھی موج ، کہ ساحل کو بھی قلزم کر دے
اس کی یلغار سے دیں گے یہ گھروندے نہ اماں
عین مجدھار میں ساحل کی چٹانیں آئیں
موج پلٹی پہ تو یہ چل پھر تھی کہ گرداب پڑے
اسی چل پھر نے دکھایا مجھے کچھ اور سماں :

میری نظروں میں ہیں — وہ دیدہ و دل کے باسی   جن کی خاطر سے نئے شہر ، چمن ، راج محل
نہریں ، مرمر کے کنول تال — جلو خانۂ مار   کنج ، مہتابیاں ، خلوت گہیں ، اور تاج محل !
ان کے خوابوں کے یہ پیکر ہیں — کہ جن کی فطرت   تھی خرد پیشہ بھی اور ساتھ جنوں مشرب بھی
سبھی فنکار ، سبھی محرم آشوب و طرب   سب کی فطرت میں وہی درد ، وہی فرِّ شہی!

(۱)

سیکری شہر ، یہ ساوت مغل کا پر تو   ہے ستونوں کی نفاست سے عیاں ، سنگینی
اونچی محرابوں کے گھیرے میں کشادہ ایواں   جس نے بے باک ارادوں سے بلندی چھینی
اکبر آباد کا یہ قلعۂ الوند مثال   برج و بارو کی یہ ہیبت ، یہ فصیلیں ، خندق
طنطنے اور جلالت میں ہے اکبر کی طرح   ایک خورشید لقا ، طرفہ جوانِ ارشق

(۲)

اب وہ نایاب نگیں ، بن گئیں میری آنکھیں   جو ثمن برج میں ہے تاج کے پر تو سے نہال
تاج کے نور و تناسب کو ہے آئینہ بدست   وہی البیلی تفاصیل — وہ بانکا اجمال
میری آنکھوں میں بسی . تاج کی وہ چاندنی رات   جس میں جانا تھا — کہ دورِ زماں کچھ بھی نہیں
اور ہر گردشِ دوراں سے رہے گی بالا   وہ بقا — وہ اَبدیّت کہ جو ہے تاج نشیں
سیم بر رات میں — اس رات کی سب باتوں میں   تاج کے حال میں آمیز تھا اپنا ماضی
روضۂ دلبر و دلدادۂ دلبر کا بیاں   ایک پیرایہ تھا — جس میں ہوئیں باتیں اپنی:

* حیدر آباد کا اصلی نام

باتیں :—

وہ :— « اس طرح آئنہ سیما نہیں ، ہر دل کی دُکھن ! »
(قول جس کا تھا ، میں اس دل کی لگی جانتا ہوں)

میں :— « ایسی طلعت بھی کہاں — تاج ہو جس کی یادیں! »
(میں یہ کہتا تھا — پہ میں اپنی کمی جانتا ہوں !)

وہ :— « پھر بھی ہر دیدۂ نم دیدہ میں یہ بات کہاں
کعبۂ نور و تناسب ہے اس کا آنسو ! »

میں :— « دل زدہ جانتے ہیں صنعِ گری کے اعجاز
ہو دلآرام اگر ایسا کوئی آئینہ رُو ! »

وہ :— « ہے لگن اور لگاؤ میں تو سو کوس کا بل
تم لگاؤ ہی کے الجھاؤ سے نکلو ، تو کہو !
وہ جو گیرائی و پہنائی لگن میں ہے نہاں
اس کے تم معجزۂ فن کو بھلا کیا سمجھو ؟ »

میں :— « دیکھیے — یہ تھے شہنشاہ بھی اور عاشق بھی
دھجیاں پھول بنا سکتے تھے داماںوں کی
نادرہ کار ، انہی کا غمِ ہجراں ہوگا
سعی مشکور انہی سوختہ ساماںوں کی ! »

وہ :— « درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
یہ بھی منزل ہے لگن ہی کی ، اگر تم سمجھو ! »

میں :— « آپ سچ کہتی ہیں ، لیکن مجھے مقسوم کہاں
وہ جنوں جو سر و ساماں میں سلیمان بھی ہو ! »

وہ :— « سُنو تم بات نہ سمجھو تو نہ بولو بے بات ! »
(میں سمجھتا تھا ، یہی رنگِ سخن ہے ان کا)

میں :— « آپ کی بات میں جو بات ہے میں جانتا ہوں »
(ان کا دعویٰ تھا کہ جو وہ کہیں ، میں سمجھوں گا ؟!)

دام و ددکے ، ہوئے رمنے ، کہ جو ایواں تھے کبھی　　دشت در صحن ہے ، ہر کوشکِ معدوم یہاں
حوض سنے آب ، چمن کور ، لٹی بارگہیں　　جن کا مقسوم ہوا مرثیۂ بوم یہاں !
گولکنڈے کا یہ معمورۂ وحشت آثار　　خاک میں خاک ہوا ، اپنے ہی گورستاں میں
اور اس مدفنِ مرحوم کی حدول بہ ابھی　　عشق کا بھاگ نگر* زندہ ہے بزمِ جہاں میں

پھر اٹھی موج ، کہ ساحل کو بھی قلزم کر دے
اس کی یلغار سے بہہ گئے یہ گھروندے بہ اماں
عین منجدھار میں ساحل کی چٹانیں آئیں
موج پلٹی یہ تو یہ چل پھر تھی کہ گرداب پڑے
اسی چل پھر نے دکھایا مجھے کچھ اور سماں :

میری نظروں میں ہیں — وہ دیدہ و دل کے باسی　　جن کی خاطر سے بنے شہر ، چمن ، راج محل
نہریں ، مرمر کے کنول تال — جلو خانۂ نار　　کنج ، مہتابیاں ، خلوت گہیں ، اور تاج محل !
ان کے خوابوں کے یہ پیکر ہیں — کہ جن کی فطرت　　تھی خرد پیشہ بھی اور ساتھ جنوں مشرب بھی
سبھی فنکار . سبھی محرمِ آشوب و طرب　　سب کی فطرت میں وہی درد ، وہی فرّ شہی!

(۱)

سیکری شہر ، یہ ساونت مغل کا پر تو　　ہے ستونوں کی نفاست سے عیاں ، سنگینی
اونچی محرابوں کے گھیرے میں کشادہ ایواں　　جس نے بے باک ارادوں سے ملسدی چھینی
اکبر آباد کا یہ قلعۂ الوند مثال　　برج و بارو کی یہ ہیبت ، یہ فصیلیں ، خندق
طنطنے اور جلالت میں ہے اکبر کی طرح　　ایک خورشید لقا ، طرفہ جوانِ ارشق

(۲)

اب وہ نایاب نگیں ، بن گئیں میری آنکھیں　　جو ثمن برج میں ہے تاج کے پر تو سے نہال
تاج کے نور و تناسب کو ہے آئینہ بدست　　وہی البیلی تفاصیل — وہ بانکا اجمال
میری آنکھوں میں بسی ، تاج کی وہ چاندنی رات　　جس میں جانا تھا — کہ دورِ زماں کچھ بھی نہیں
اور ہر گردشِ دوراں سے رہے گی بالا　　وہ بقا — وہ ابدیت کہ جو ہے تاج نشیں
سیم بر رات میں — اس رات کی سب باتوں میں　　تاج کے حال میں آمیز تھا اپنا ماضی
روضۂ دلبر و دلدادۂ دلبر کا بیاں　　ایک پیرا یہ تھا — جس میں ہوئیں باتیں اپنی:

* حیدر آباد کا اصلی نام

باتیں :—

وہ :— « اس طرح آئنہ سیما نہیں ، ہر دل کی دُکھن ! »
(قول جس کا تھا ، میں اس دل کی اگنی جانتا ہوں)

میں :— « ایسی طلعت بھی کہاں — تاج ہو جس کی یادیں! »
(میں یہ کہتا تھا — پہ میں اپنی کمی جانتا ہوں !)

وہ :— « پھر بھی ہر دیدۂ نم دیدہ میں یہ بات کہاں
کعبۂ نور و تناسب بنے اس کا آنسو ! »

میں :— « دل زدہ جانتے ہیں صنع گری کے اعجاز
ہو دلآرام اگر ایسا کوئی آئینہ رُو ! »

وہ :— « ہے لگن اور لگاؤ میں تو سو کوس کا بل
تم لگاؤ ہی کے الجھاؤ سے نکلو ، تو کہو !
وہ جو گیرائی و پہنائی لگن میں ہے نہاں
اس کے تم معجزۂ فن کو بھلا کیا سمجھو ؟ »

میں :— « دیکھیے — یہ تھے شہنشاہ بھی اور عاشق بھی
دھجیاں پھول بنا سکتے تھے داماہوں کی
نادرہ کار ، انہی کا غمِ ہجراں ہوگا
سعی مشکور انہی سوختہ سامانوں کی ! »

وہ :— « درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
یہ بھی منزل ہے لگن ہی کی ، اگر تم سمجھو ! »

میں :— « آپ سچ کہتی ہیں ، لیکن مجھے مقسوم کہاں
وہ جنوں جو سر و ساماں میں سلیمان بھی ہو ! »

وہ :— « سُنو تم بات نہ سمجھو تو نہ بولو بے بات ! »
(میں سمجھتا تھا ، یہی رنگِ سخن ہے ان کا)

میں :— « آپ کی بات میں جو بات ہے میں جانتا ہوں »
(ان کا دعویٰ تھا کہ جو وہ کہیں ، میں سمجھوں گا ؟!)

یوں وہ آشفتۂ اضداد کہ جس کی سیرت   ایک آئینۂ حیراں تھی فقط ، صورت کی
سحر گفتار سے ، جودت سے ، خود آرائی سے   یوں خدا بنتی رہی میری ، مری قسمت کی !
عہد در عہد — اسی طور دلوں کی باتیں   عکس اپنا اسی آئینے میں دیکھا کی ہیں
اور خوں گشتہ تمنائیں ہر اک سینے میں   دل کے ہر داغ کو اک تاج بنایا کی ہیں!

(۳)

میری آنکھوں میں ہیں جمنا کی امڈتی موجیں   لال قلعے کے ہر اک جلوے کی درشن پیاسی
سُرخ پتھر کے حصاروں میں یہ مرمر کے طلسم   بُوم اور لشکرِ غیر آج ہیں جن کے باسی !
اور اس قلعہ نما لال حویلی کا جمال   اتنا لٹنے پہ بھی فردوسِ نظر ہے کہ جو تھا
وقت سے مٹ نہیں سکتی ، یہ تجلیٰ شوکت   اب بھی یہ ایک شہنشاہ کا گھر ہے کہ جو تھا

اپنی مواجی و شوریدہ سری سے اب کے
آپ ہی زچ ہوئی جاتی ہیں بپھرتی موجیں
جیسے کہتی ہوں : کہ ساحل تو رہے گا ساحل
اور ہم بحر میں ہیں بحر ، ہمیں کیا اس سے!
بحر کے سینۂ ساکن کو نہ کیوں لوٹ چلیں!

اپنے ہی نیرِ اقبال سے خیرہ تھی نظر   نیم کوری تھی یہی چشمِ بصیرت کا حجاب
شامِ ادبار کی پرچھائیاں آئی دیکھیں   کسکو فرصت تھی کہ سوچے یہ حقیقت ہے کہ خواب
اور قبایل کی تاریخ کا ہر بابِ زبوں   آلِ تیمور نے پھر لکھا ، لہو سے اپنے
تخت کی رہ میں ہوا خون کا دریا حائل   جس کی ہر موج میں تھے جیت کے ٹوٹے سپنے!

(۱)

اور « بائیس علاقوں کی یہ خاوندی » * بھی   تھی خداوندیٔ خوں ہی کی غلامِ بے دام
لشکر اور صاحبِ لشکر ہوئے دونوں بے کار   تیغ ہی سے جو تھی ہو گئی مغلوں کی نیام

(۲)

میری نظروں میں ہے وہ دشتِ ملامت کہ جہاں   « شاہ اور چور اچکے ، کبھی سکھ ، مرہٹے »*
خاکِ رسوائی اڑاتے رہے دو صدیوں تک   ہم نے خود جس کو دیا غیر کے جھنڈے کے تلے!

---

* بحوالۂ مرزا سودا :   وہ شخص جو کہ تھا بائیس صوبوں کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداریٔ کول !

* میر تقی میر :   چور، اچکے، سکھ ، مرہٹے ، شاہ و گدا ، سب خواہاں ہیں
چین سے ہے جو کچھ نہیں رکھتا فقر بڑی دولت ہے یہاں

(۳)

میری آنکھوں میں کھٹکتے ہیں — وہ بکھرے دانے   ہار ٹوٹا بھی نہ تھا جن کے بکھر جانے تک
آلِ تیمور کی اس شامِ زیاں میں یہ لوگ   ہوش میں آ نہ سکے صبحِ بلا آنے تک!
اور ادبار کے چکراتے بگولوں کے وبال   باد آورد خزانوں کے بہانے تھے انہیں
اس عزا خانے کی وسعت میں بھٹکتے نالے   کان بجتے تھے — کہ عشرت کے ترانے تھے انہیں!

(۴)

حکمراں ہوتی گئی شومئ تقدیر یہاں
جس کی باندی تھی غلط کاریٔ تدبیر یہاں
ہر زیاں کوش ہؤا صاحبِ توقیر یہاں
جتنے بٹ مار تھے، کہلائے جہانگیر یہاں
کج نہادوں کو جو ٹھہرایا گیا مرشدِ وقت
کون تھا خود نگر و خود گر و خودگیر یہاں
کور و کر قافلہ سالار تھے، گمراہوں کے
راہیں تھیں راہ زنوں سے شکر و شیر یہاں
اپنے کابوس سے خوابوں کو بتاتی ہی رہی
جنّتِ عیش، زبوں کیشیٔ تعبیر یہاں
بستیاں — مدفنِ منحوس ہوئیں زندوں کی
جیتے جی، سب جو تھے مُردوں کے اساطیر یہاں!

(۵)

اور یہ بستیاں — بنگال سے تا رودِ اٹک   کالے بیوپار کے چھل سے، کبھی شمشیر سے بھی
ان کے فتراک میں، نخچیرِ فراموش ہوئیں   جن کی تدبیر، خداوندیٔ تقدیر بھی تھی!

سینۂ بحر پہ اب ہانپ رہے ہیں ریلے
جیسے میں ہوں — یہ کنارہ بھی سبک سار ہے اب!
آسماں اور سمندر جہاں ملتے ہیں — وہاں
چھٹ گئی دھند، ابھر آئے افق آن دیکھے!
میرا ماضی، مرے فردا سے ہؤا داد طلب:

ماضی :— آج تک دیکھا نہیں ، میں نے تجھے ، تو نے مجھے
میری ازل ھی ، تیری آن دیکھی حدیں ملتی ھیں !
حال کہلاتا ھے شاید یہی موھوم وصال
تو ھے مشکوک — تو بوسیدگیِ دوش ھوں میں !

مستقبل :— تو وھی حال ھے — جو آ کے گیا — رُک نہ سکا
میں وہی ھوں کہ کبھی آ جو سکوں — حال بنوں
حال کے دونوں ھی محتاج ھیں ، تو بھی ، میں بھی !
حال بن تُو جو ھے افسانہ ، تو میں ھوں افسوں ؟

ماضی :— حال ھی میں ھیں اگر دونوں ھی محتاجِ نمود
میں ازل رشتہ نہیں — تو ابد انجام نہیں !
حال بن ایسے جو بے مایہ ھیں ، تُو بھی ، میں بھی ،
میں بھی گمنام ھوں — تیرا بھی کوئی نام نہیں !

مستقبل :— تیرے جانے ، میرے آنے کی شد و آمد ھی
ایسے حیلے ھیں جو دونوں کو ھیں سامانِ وجود
حال ھی سے ھوں ابد یاب ، ابد تک میں بھی !
حال ھی سے ترے ماتھے پہ ازل کی ھے نمود !

(میرا ماضی بھی یہی حال ھے جو آ کے گیا ؟
آ کے جو حال بنے وہ کوئی فردا ھی نہیں ؟)
بحر اب ساکت و صامت ھے ، بچھی چادرِ آب
حال کے رخ پہ جو دُگدا کا دھندلکا امڈا
دوش و فردا سے نئے رنگ کی جوتیں پھوٹیں :

میں نے دیکھا کہ چھنا وقت سے نیرنگ و سرور — محورِ زیست ھوئی تاج کی وہ چاندنی شب
میری صدیوں — میرے تینوں ھی زمانوں سے ورا — خود ازل اور ابد کے لیے مفہوم طلب :

(۱)

اور — وہ خود بیں جو سمجھتے تھے کہ یہ زہرہ وشی — تا ابد گردشِ دوراں پہ رھے گی حاوی
اک نئے روپ میں بے واسطۂ دید ملے — آنی و فانی و باقی کی مٹی حد بندی !

(۲)

ارجمندی وهی تقدیر کی ــــ سیرت بھی وهی   وہ ــــ جو آئینۂ حیراں تھی فقط ، صورت کی
وهی آشفتگی امداد کی ــــ طلعت بھی وهی   بے نیازی بھی وهی ، رنگِ تلوّن بھی وهی !

صاحبی کی وهی تقدیس ــــ وهی بے باکی   وهی تسکین و تجمّل ، وهی رعنائی و ساز
رم و رغبت بھی وهی ــ مہر و تغافل بھی وهی   قربت و بُعد میں ویسے هی الوهی انداز !

وهی باتیں ــــ وهی تہ دار ، سجیلی باتیں   کھری جھیلوں کی طرح سرمگیں آنکھیں بھی وهی
صد چمن نکہتِ گل ــ دهن کی جودت بھی وهی   ایک دهن گل کی طرح ویسی هی گل پیرهنی !

(۳)

هاں یہ عالم بھی هیں اس روپ کے ــ جو هیں یکتا   وضع نہ انداز میں محدود بھرے بھولے مزہ کبھی
رنگ کے اوج میں نکھرا هوا ، سرگم کا سنگار   جوت ، ماتھے پہ ، تو هونٹوں پہ لویں شمعوں کی

اور ، وہ نُور کی بے باک هنسی ــ رنجوری   سوز حسرت سے شناسا ، سمِ جاں کے محرم
یا بہ گلِ رفتہ و حاضر میں ــ پہ ان سے آزاد   اتنے پُرکار ــــ کہ هے سادگی ان سے پُرحم

اور وہ سازکی احساس کی ــ وہ زندہ دلی   لب کھلے پھول ، تو آنکھوں میں گھٹائیں غم کی !
یا دلِ گرم و دمِ سرد ، بہ سازِ طلعت   کبھی دلبر ، کبھی دلدار ، تو دلگیر کبھی !

(٤)

یہ جو بے واسطۂ دید هیں اب حرفِ نظر   ان کو ڈھونڈو یاد ، بعنوانِ تجلّی میں بھی !
اور یہ بندھن هے ، لگن اور لگاؤ سے ورا   درد و درماں کے حجابوں سے ورا ، آفاقی !

پیاسہ پا هو بھی گئے رفتہ و آئندہ و حال
اور ان دیکھے زمانوں کے نئے شام سحر
لے کے آئے نیا آغاز و مالِ هستی !
اور کہتے هیں : شُد و بود فقط وهم و خیال
سُنو ، یہ وقت کی نیرنگی هے تم سے بڑھ کر ؟
کیوں پشیمانیٔ ماضی ؟ یہ غمِ حال ــــ یہ آئندہ کا ڈر ؟

اب زماں اور مکاں ایک ہوئے اور میں ہوں !
کیوں ہوں ماضی سے پشیمان بھی ، شرمندہ بھی میں ؟
بیم آئندہ ، غمِ حال ، پشیمانیِ دوش
سب حجابات جو اٹھتے ہیں تو پھر کیوں نہ کہوں :
اپنی صدیوں کی طرح زندہ و پائندہ بھی میں!
محورِ حال بھی میں ہی تو ہوں — اور حارۂ آئندہ بھی میں!!

اب دل و دیدہ میں — خود ایمن و برقِ ایمن
کہتی ہے - موجِ قدم بوس سے ریگِ ساحل
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
بحر کے دل کو لگی رہتی ہے ساحل کی لگن
اور ساحل کے لیے تو ہے نشانِ منزل !
تو حو کونین کا — اور عرصۂ آفاق کا ہے دیدہ و دل !!

« بگزر از غیب که ایں وهم و گماں چیزے نیست
درجہاں بودن و رستن ز جہاں - چیزے هست ! »
(اقبال)

ایک لڑکا

اختـــرالایمـان

دیـارِ شرق کی آبـادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں کی میڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پـانی میں کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کمسنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم ، جھٹپٹے کے وقت ، راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں ، ناٹک ٹولیوں میں ، ان کے ڈیرے میں
تعـاقب میں کبھی گم تتلیوں کے سونی راھوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خوابگاھوں میں
برھنہ پاؤں جلتی ریت ، یخ بستہ ھواؤں میں
گریزاں بستیوں سے ، مدرسوں سے ، خانقاؤں میں
کبھی ھم سن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ
کبھی پیچاں بگولـہ ساں کبھی جیوں چشـمِ خوں بستہ
ھوا میں تیرتـا خوابوں میں بـادل کی طرح اڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا ، مڑتا
مجھے اک لڑکا ، آوارہ منش ، آزاد ، سیلانی
مجھے اک لڑکا ، جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ھے ، یوں لگتا ھے جیسے یـہ بلائے جاں
مرا ھم زاد ھے ، ھر گام پر ، ھر موڑ پر جولاں
اسے ھم راہ پاتا ھوں ، یہ سایہ کی طرح میرا
تعاقب کر رھا ھے ، جیسے میں مفرور ملزم ھوں
یہ مجھ سے پوچھتا ھے اختـــرالایمـان تم ھی ھو ؟

خدائے عز و جل کی نعمتوں کا معترف ھوں میں
مجھے اقرار ھے اس نے زمیں کو ایسے پھیلایـا
کـہ جیسے بسترِ کمخواب ھو ، دیبا و مخمل ھو
مجھے اقرار ھے یـہ خیمۂ افلاک کا سایا

اسی کی بخششیں ھیں اس نے سورج چاند تاروں کو
فضاؤں میں سنوارا ، اک حد ِ فاصل مقرر کی
چٹانیں چیر کر دریا نکالے خاک ِ اسفل سے
مری تخلیق کی مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی،
سمندر سونیوں مونگوں سے کانیں لعل و گوھر سے
ھوائیں مست کن خوشبوؤں سے معمور کر دی ھیں
وہ حاکم ، دانا ، بینا ، قادرِ مطلق ھے ، یکتا ھے
اندھیرے کو اجالے سے جدا کرتا ھے ، خود کو میں
اگر پہچانتا ھوں اس کی رحمت اور سخاوت ھے
اسی نے خسروی دی ھے لئیموں کو ، مجھے نکبت
اسی نے یاوہ گویوں کو مرا خازن بنایا ھے
تونگر ھرزہ کاروں کو ، کیا دریوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ھے
یہ لڑکا پوچھتا ھے اخترالایمان تم ھی ھو ؟

معیشت دوسروں کے ھاتھ میں ھے میرے قبضہ میں
جز اک ذھن ِ رسا کچھ بھی نہیں پھر بھی مگر مجھ کو
خروش ِ عمر کے اتمام تک اک بار اٹھانا ھے
عناصر منتشر ھو جانے ، نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے صبح ھو یا نالۂ شب ، کچھ بھی گانا ھے
ظفرمندوں کے آگے رزق کی تحصیل کے خاطر
کبھی اپنا ھی نغمہ ان کا کہ کر مسکرانا ھے
وہ خامہ سوزی شب بیداریوں کا جو نتیجہ ھو
اسے اک کھوٹے سکّہ کی طرح سب کو دکھانا ھے
کبھی جب سوچتا ھوں اپنے بارے میں تو کہتا ھوں
کہ تو اک آبلہ ھے جس کو آخر پھوٹ جانا ھے
غرض گرداں ھوں بادِ صبح گاھی کی طرح لیکن
سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ھوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ھے اخترالایمان تم ھی ھو ؟

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلّا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج ، اندوہ پرور ، اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے ، یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب و افترا ہے ، جھوٹ ہے ، دیکھو میں زندہ ہوں !

طوفان کے بعد

سید ضیا جالندھری

(۱)

اسی پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ
تیرے چہرے پہ یہ سنگیں ، کڑی مایوسی
خشک ، ، لب شیریں لحد ، بیتی ہوئی باتوں کی
پھر سے ارمانوں میں بالیدگی دشوار سہی
آنکھ حیرت کدۂ رنگ سے بیزار سہی
تیرگی کیسے بڑھی آتی ہے مٹتی ہوئی راہوں سے نہ دیکھ
ایسی پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ

تو نے دیکھا ہے کہ دل
آس و سنگ میں ڈھل جاتے ہیں
دیکھتے دیکھتے احساس کے انداز بدل جاتے ہیں
تو نے ارمان جو پالے سالوں
اب ہیں اجڑے حالوں
پھر بھی اس طرح نہ رکھ آنکھوں پہ سِل
یوں تو پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ
دیکھ گر دیکھ سکے ، دیکھ اگر آنکھوں میں
کوئی احساسِ نظر باقی ہے
شاخِ بے برگ میں روحِ گُلِ تر باقی ہے
حس سے ہنستی ہے تمنّا کی سحر آنکھوں میں
جاگ ، پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ

رُت زمستاں کی بھی کٹ جاتی ہے
برف کے بوجھ کو سینے سے جھٹکتی ہوئی پھر شاخِ نہال
باہیں پھیلائے ہوئے نیلے اجالے سے لپٹ جاتی ہے
تو بھی اس بارِ گراں سے دلِ بے حس کو نکال

اور پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ

موت انجام بھی ، آغاز بھی ہے
وقت تخریب بھی ، تعمیر بھی ہے
زندگی دائم و قائم بھی ہے ۔ تبدیلی و تغئیر بھی ہے
خامشی وقفۂ آواز بھی ہے
دیکھ ، پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ

(۲)

رات وہ رات خزاں کی کہ اداسی میں بھی تسکین سی تھی
پھیکے مہتاب پہ شفاف ، دبیز ، ابرِ محیط
جس سے چھنتی ہوئی ضو
اپنے ہی خوابوں سے غمگین سی تھی
اس کے دامن میں درخت
جیسے اِستادہ ، گھنے سایے کہ جن میں کوئی آواز کی لرزش بھی نہ تھی
کوئی جنبش بھی نہ تھی
دیوداروں میں گھرے وادی و کہسار خموش
اور وہ گہرے نشیب
جن میں سب زیست کے آثار خموش
ایک احساسِ شکست
ایک آسودہ تھکن
دل پہ اک بار ، سبک تھا نہ گراں
جانے کیا تھی وہ خموشی ، وہ سکوں ، وہ شبِ مہتابِ خزاں

دفعتاً جیسے کوئی دھندلی سی یاد آنے سے جھجکے ، رُک جائے
کوئی مبہم سا خیال ابھرے پہ تشکیل نہ پائے
ایک احساسِ حیات
یونہی ان گہرے نشیبوں سے پر افشاں سا ہؤا
کوئی جنبش نہ تھی پھر بھی ہر شے

چونک کر گوش بر آواز ہوئی
اور آواز کہیں دور ، دھڑکتی سانسیں
جیسے گہرائی سے ہر لحظہ ابھرتی ہی چلی آتی ہوں
پور کوئی حسرتِ خوابیدہ کہیں مائلِ پرواز ہوئی
سرسراہٹ ہوئی سناٹوں میں
سایے تھرّائے ، گھنی شاخوں میں سرگوشیاں کرتے ہوئے سوکھے پتے
جا بجا گرنے لگے ٹوٹے پروں کی مانند
اک لگاتار سی پھنکار کی گونج
تیز تر ہوتی گئی
کوک سی بن کے بھٹکتی رہی کہساروں میں

اور پھر شور اٹھا
گھر کے آئے رہ سیہ مست گرجتے ہوئے بادل ، وہ پہاڑوں سے پہاڑ
سایے معدوم ہوئے چاند کی ضو ڈوب گئی

قہقہہ بار ، سیہ پوش ، ہوا
ایک وحشت زدہ دیوانی تھی
اپنے سینے میں کوئی درد کا طوفان لیے
پے بہ پے پتھروں ، کہساروں کی دیواروں سے
سنگ دل ، اونچی چٹانوں سے ، کہستانوں کے دربانوں سے
مٹھیاں بھینچ کے ٹکراتی پھری
ہر طرف چیختی چلاتی پھری
وہ چٹختی ہوئی شاخیں ، وہ تڑختے ہوئے پیڑ
ایک اک کر کے زمیں بوس ہوئے
اور تاریکی افق تا بہ افق کانپتی تھرّاتی پھری

تیز کوندوں کی لپک ، کاٹتی تلوار کی مانند اٹھی
رات کے سینے میں پیوست ہوئی
اور کہیں دور سے نوحوں کی صدا آنے لگی

ان گنت آنکھیں اندھیرے میں چھماچھم برسیں
اور پھر روتی رہیں ، روتی رہیں ، روتی رہیں

(۳)

کس نے چاہا تھا کہ دکھ ڈھل جائیں
کس نے پھولوں کے بکھرنے کی تمنا کی تھی
کون سے پیاسے لبوں کو تھی نمی کی خواہش
کون تھا سلسلۂ موجِ رواں کا خواہاں
کس کے خوابوں کی ہے تعبیر یہ دریا — یہ لہو کا دریا
جو افق پار پہاڑوں کے سبھ چشموں سے
آتشیں لاوے کی مانند بہا آتا ہے
جس کی ہر لہر کی رو میں ہیں گلوں سے ارمان
جس کی ہر موج ہے اک حلقۂ زنجیرِ فغاں
سطحِ دریا پہ ابھرتے ہوئے جسم
جن کی ہر چیخ ہوئی جاتی ہے
پردۂ گوش پہ اک نقشِ دوام
اور حیرت زدہ لوگوں کا ہجوم
جن کی نظروں میں کوئی آس نہیں اشک نہیں
اپنی سمت آتی ہوئی موجوں کی رہ تکتا ہے

سنو چپ چاپ سنو ، دل کے قریب
ایک ہمدرد سی ، گھمبیر آواز
جس کے ہر لفظ میں تسکیں کی رسیلی خوشبو
جس سے ہر چیخ کا دکھ درد مٹا جاتا ہے
سنو ، چپ چاپ سنو

« تجھ کو اس خون کے دریا سے گزرنا ہوگا
یہ شفق رنگ لہو موت نہیں
آمدِ صبح کا پیغام ہے یہ شام نہیں

زندگانی کا یہ آغاز ہے انجام نہیں
تیری رگ رگ میں رواں ہے یہ لہو کا دریا
تو اور میرا خون شفق رنگ سے گلزار بنا
تو نے دیکھا ہے کہ جینے کی تمنا لے کر
کس طرح نرم ملائم کونپل
کھردرے سخت تنے چیر کے رکھ دیتی ہے
دیکھو دریا کے کنارے پہ وہ زرس دھارے
آمد صبح کا پیغام ہے یہ شام نہیں »

(٤)

دل سے بچھڑے ہوئے ارمان کہاں سے لاؤں
اب امنگوں کو لہو روئے زمانہ گزرا
پھر سے خشک آنکھوں میں طوفان کہاں سے لاؤں

آج بھی پل تو سنور جاتے ہیں ، کھل اٹھتے ہیں
پھر بھی ہنستے ہوئے ہر پل کے گزر جانے پر
ٹوٹ پڑتی ہے وہ تنہائی کہ پہلے بھی نہ تھی
دل کی تسکین کا سامان کہاں سے لاؤں
سوکھے ہونٹوں پہ وہی تان کہاں سے لاؤں

دل میں ارمان تو تھے جینے کے جانے کیا کیا
لیکن اب دیکھتی آنکھوں نہیں دیکھا جاتا
عازۂ مہر و وفا مل کے کہن سال فریب
سرد سینوں میں لیے سود و زیاں کے خدشے
کس طرح سج کے نکلتے ہیں کمیں گاہوں سے

اس کے پہلو میں مجھے رات تری یاد آئی
تیری بے ساختہ باتوں کے کنول کھلنے لگے
تیرے رخساروں پہ گلرنگ حیا دوڑ گئی

تیری جھکتی ہوئی پلکوں میں وہ اقرار ، وہ عہد
قہقہے جن سے کہ جھرنوں کی صدا شرمائے
زندگی ایسی کہ ہرنوں کو کلانچیں بھولیں
سادگی ایسی کہ ہر شے پہ بفر آ جائے

اور پھر چیختی چلّاتی ہوا تیز ہوئی
پھر وہ طوفان ، وہ موجے ، وہ لہو کا دریا

جانے کس ظلم نے لُوٹے ترے یاقوت سے لب
جانے کس قہر نے روندا ترے رُخ کا کندن
جانے کس جور نے مسلے وہ سمن زار کنار
جانے تو ہے کہ نہیں ، ہے بھی تو کس حال میں ہے
بھول جانے کو تجھے خود سے گریزاں ہی رہا
اس کے پہلو میں مگر رات تری یاد آئی
اب وہ بچھڑے ہوئے ارمان کہاں سے لاؤں

(۵)

تجھ کو ہے اپنے ہی دکھ درد کے درماں کی تلاش
اپنے کھوئے ہوئے ارماں کی تلاش
غم کے فتراک میں تجھ ایسے کئی اور بھی ہیں
اپنے دُکھ درد کو تُو اوروں کے دکھ درد میں ڈھال
دل محبت سے ہو بھرپور تو ہے بزمِ جمال
خود کو تنہائی کے ورطے سے نکال
تیرے ہم قافلہ تجھ ایسے کئی اور بھی ہیں
تو بھی پتھرائی نگاہوں سے نہ دیکھ

پھر کوئی موجۂ خوں سینۂ سوزاں سے اچھال
کہ تمنّا ہی حقیقت ہے تمنّا ہی جمال
تو اگر چاہے تو گلرنگ حیا میں ڈھل کر
تیری گم گشتہ سحر لوٹ آئے

اپنے سینے میں لیے سُکھ کے سنہری سائے
شدتِ خون سے آنکھوں میں گہر بھر لائے
میری کھوئی ہوئی محبوب ہنسی ، تیرے لہو میں گھل کر
اب تو ٹھہرائی نگاہوں سے نہ دیکھ

موت انجام ہی ، آغاز بھی ہے
وقت تخریب ہی ، تعمیر بھی ہے
زندگی دائم و قائم بھی ہے ، تبدیلی و تغئیر بھی ہے
خامشی زمزمۂ آواز بھی ہے
دیکھ ، ٹھہرائی نگاہوں سے نہ دیکھ

مقبرۂ جہانگیر

مجید امجد

زنگ آلود کمر بستہ ، صدف دوز عبے ،
یہ محافظ ، — تہِ محراب عصا تھامے ہوئے .
کھانستی صدیوں کا تھوکا ہوا اک وصّہ ہیں!
اسی گرتی ہوئی دیوار کا اک حصّہ ہیں !

کھردرے ، میلے ، پھٹے کپڑوں میں بوڑھے مالی
یہ چمن بند ، جو گزرے ہوئے سلطانوں کی .
ہڈیاں سینچ کے پھلواڑیاں مہکاتے ہیں ،
گھاس کٹتی ہے کہ دن ان کے کٹے جاتے ہیں !

اور انہیں دیکھو — بہ جاروب کشانِ بے عقل .
صبح ہوتے ہی جو چُن چُن کے اٹھا پھینکتے ہیں ،
گٹھلیاں ، — عشرتِ دزدیدہ کی تلچھٹ سے بھری ،
کہنہ زینوں میں پڑی ، تیرہ دریچوں میں پڑی !

لاکھ ادوار کی لاشوں پہ بچھا کر قالین ،
چند لوگ اپنی ترنگوں میں مگن بیٹھے ہیں ،
عکس پڑتا ہے جو نظروں پہ حسیں زُلفوں کا ،
ڈوب جاتا ہے پیالوں میں دھواں سلفوں کا !

سنگِ احمر کی سلوں پر یہ سطورِ پُر نور ،
جن کی ہر جدولِ گل پیچ کے الجھاؤ میں
کتنے صنّاعوں کی صد عمرِ عزیز آویزاں ،
اس جگہ آج — سحر خیز مریض آویزاں !!

موجِ صد نقش میں لپٹے ہوئے میناروں کے
دودھیا برج ، — درختوں کے گھنے جھنڈ میں گم ، —
جن کے چھجوں سے نظر آتے ہیں مدفونِ غبار !
رینگتی روحوں سے آباد گناہوں کے دیار !

گنبدِ دل میں لیے رقصِ مہ و سال کی گونج ،
یہ جھروکا ، کہ جو راوی کی طرف کھلتا ہے ،
اپنی تنہائیٔ ویراں سے اماں مانگتا ہے ،
ہر گزرتی ہوئی گاڑی سے دھواں مانگتا ہے !

تین سو سال سے مبہوت کھڑے ہیں سر بہ سرو ،
ان کی شاخیں ہیں کہ آفاق کے شیرازے میں ،
صحفِ ایّام کی بکھری ہوئی ترتیبیں ہیں !
ان کے سائے ہیں — کہ ڈھلتی ہوئی تہذیبیں ہیں !!

سرسریں قبر کے — چمن و قصر و اطاق
کوٹلیں ، امربان ، جھروکے ، روشیں ، فوارے ،
اور — کچھ لوگ کہ جو محرمِ آداب نہیں !

سرسریں قبر کے اندر — تہِ ظلمات ، کہیں ،
کرمک و مور کے جبڑوں میں سلاطیں کے بدن !
کوئی دیکھے ، کوئی سمجھے تو اس ایواں میں ، جہاں
نور ہے ، حسن ہے ، تزئین ہے ، زیبائش ہے .
ہے تو بس ایک بجھی روح کی گنجائش ہے !

تم نے دیکھا کہ نہیں . آج بھی ان محلوں میں ،
قہقہے ، جشن مناتے ہوئے نادانوں کے
جب کسی ٹوٹی محراب سے ٹکراتے ہیں ،
مرقدِ شاہ کے مینار لرز جاتے ہیں !

بس سٹینڈ پر

مجید امجد

« خدایا ، اب کے یہ کیسی بہار آئی »

« خدا سے کیا گلہ ، بھائی . . . . .
خدا تو خیر کس نے اس کا عکسِ نقشِ پا دیکھا ،
یہ دیکھا تو بھی دیکھا اور دیکھا بھی تو کیا دیکھا .
مگر توبہ ، مری توبہ . یہ انساں بھی تو آخر اک تماشا ہے
یہ جس نے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہونا بڑے جتنوں سے سیکھا ہے .
ابھی کل تک جب اس کے ابروؤں تک موئے پیچاں تھے
ابھی کل تک جب اس کے ہونٹ محرومِ زنخداں تھے ،
ردائے صد زماں اوڑھے ، لرزتا ، کانپتا بیٹھا .
ضمیرِ سنگ سے بس ایک چنگاری کا طالب تھا »

« مگر اب تو یہ اونچی ممٹیوں والے جلو خانوں میں بستا ہے »

« ہمارے ہی لبوں سے مسکراہٹ چھین کر اب ہم پہ ہنستا ہے ،
خدا اس کا ، خدائی اس کی ، ہر شے اس کی ، ــــ ہم کیا ہیں ،
چمکتی موٹروں سے اڑنے والی دھول کا ناچیز ذرّہ ہیں ! »

« ہماری ہی طرح جو پائمالِ سطوتِ میری و شاہی ہیں ،
لکھوکھا پا پیادہ ، آبدیدہ ، دل زدہ ، وماندہ راہی ہیں
جنھیں نظروں سے گُم ہوتے ہوئے رستوں کی غم پیما لکیروں میں
دکھائی دے رہی ہیں آنے والی منزلوں کی دھندلی تصویریں »

« ضرور اک روز بدلے گا نظامِ قسمتِ آدم
سجے گی اک نئی دنیا ، بسے گا اک نیا عالم
شبستاں میں نئی شمعیں ، گلستاں میں نیا موسم »

« وہ رت ، اے ہم نفس ! جانے کب آئے گی
وہ فصلِ دیررس جانے کب آئے گی
یہ نو نمبر کی بس جانے کب آئے گی »

سفر

غالب احمد

کہاں تک چلوں ظلمتوں کے کنارے
کہاں تک مقدر ہو اپنا بسیرا
کہاں تک بناؤں اسے اپنا مسکن
یہ عالم شمس، نہ تیرا نہ میرا
کہاں تک بچاؤں اسے کلفتوں سے
اگر چھوڑ دوں آج میں ساتھ تیرا
تو زنجیر تقدیر کی ٹوٹ جائے
نئی آواز کی لرزشیں چارسو پھیل جائیں
نئے راگ رنگوں میں ڈھل کر ، سہاروں کے آنچل بہیں ، لہلہائیں
فضا اونگھ جائے
ستاروں کی پلکیں گھڑی دو گھڑی کپکپائیں
مگر زرد پھولوں کے دامن سے ہوتا ہوا دن بھی چند لمحوں میں پھر ڈوب جائے
کہ یہ سلسلہ روشنی کا بھی اتنا مسلسل نہیں ہے
مجھے تیرے ہمراہ چلنا ہے لیکن سنبھل کر
چلوں گا ترے ساتھ ہی زندگی کے نشیمن سے آگے
مجھے لے چلو زندگی کے نشیمن سے آگے
مجھے مرحلوں ، منزلوں کے نئے دائروں میں اکیلا نہ چھوڑو
اکیلے تو تم ہو ، رہو تم اکیلے ، مری روشنی تیری آنکھوں کا پرتو
مجھے اپنے پرپیچ بل کھاتے رستوں سے ، ان نور کی کہکشاؤں سے دم بھر کو مانوس کردو
مرے ساتھ چل کر مجھے جسم و جاں ، عقل و دل ، روح و راحت کی آواز کے ساتھ چلنا سکھادو
سمندر کی لہریں ، پہاڑوں کے دامن ، گھنے جنگلوں کی یہ پہنائیاں
تُو جہاں ، جب بھی چاہے یہ مسکن ہو میرا
یہاں دن ہو یا رات ہو ، روشنی ہو کہ ظلمت
مرے ساتھ تُو ہے تو میں ہر گھڑی ہر طرف آپ بسنے بسانے کو حاضر
تری روشنی میں ازل سے ابد تک یہاں سے وہاں تیر سکتا ہوں میں
گھڑی دو گھڑی تم اکیلا جو چھوڑو مجھے کیا گلا ہے

مگر آج تک میری ہستی کو تجھ بن ، اکیلے ، کبھی کچھ ملا ہے
رہوں گا یہیں میں ، یہاں ھی زمانے کے رنگوں نے ظلمت کو ڈھالا
یہیں ھے مرے دل کی دُنیا جو درد آشنا ھے
مجھے ظلمتوں کی گھنی وادیوں سے ڈراؤ نہیں
مری آنکھ کی روشنی کو اندھیروں کی خاطر لٹاؤ نہیں
مری روح میں رورن دل سے اپنی شگفتہ کرن کی کلی بھیج دو

اندھیرا فقط ایک ھے
ایک ھے
آنکھ جھپکا کے لاتا ھے لاکھوں اندھیرے
یہاں رات، دن رات ھے
ڈوبتے ھیں دنوں کے سفینے
یہاں ھیں یہاں زندگی کے دفینے
یہاں دم بخود ھیں سفر کے تقاضے
یہاں کالے پانی کے رنگوں میں دل کا لہو رس رہا ھے
یہاں چاندنی چیختی ھے اندھیروں میں غلطاں
یہیں زرد سپنوں کے دریا میں ٹوٹی پڑی ھے کہیں کشتیٔ جاں
یہیں مضطرب روح پیتی ھے زہراب دل کا
یہاں سونی تنہائیاں چار سو تیرتی ھیں
نہاتی ھیں لہروں کو اپنے لبادے
کسی سرد ساگر سے بہتی ہوئی آ لپٹتی ھیں ظلمات کے پانیوں سے
یہ آتی ھیں لینے کہاں سے یہاں کالے رنگوں میں دل کی حرارت
وھی دل جو درد آشنا ھے
جو غرقِ تہِ آب ھے
اور مدھوش و بے ہوش ھے کشتیٔ جاں کی آغوش میں

یہ کشتی کبھی آس تھی
دُور کے دیس کی
جو رنگ و حرارت کی حدِ نظر سے بھی اس پار آباد ھے

فضا بھی جہاں سانس لیتی ہے رُک کر
جہاں وقت ہے سنگِ مرمر کی سطحِ سمندر پہ برفاب موجوں کی ساکت لکیریں
جزیروں کے ٹھٹھرے ہوئے جسم ہیں جن کو کفنا دیا برف نے
جہازوں کے پنجر سفر کے ارادوں سے بے لوث بکھرے پڑے ہیں
سفیدی کفن اوڑھ کر سو گئی ہے
وہاں روح ، روئی کے گالوں کی صورت بکھرتی ہے ہر سو فضا میں
وہاں دن ہو یا رات ہو ، روشنی ہو کہ ظلمت
ہوا ، چاندنی ، دھوپ
سینوں میں رنگ و حرارت چھپائے ہوئے
سرد سایوں کی وادی میں مستور ہیں
وہاں چاند نکلے کہ سورج چڑھے
روشنی منجمد ہے
کہیں نام تک کو نہیں زندگی
چار سو برف ہے
مرگ ہے

نہیں کوئی سیال سیلانی لمحہ
تڑپ کر جگا دے جو رنگ و حرارت
سفیدی کے سینے کو بھی درد کا داغ بخشے
سمندر کی برفاب لہروں کو اپنا لہو دے
ہوا ، چاندنی ، دھوپ
تینوں کے آنچل ہلا دے
نئے رنگ و بُو سے سفیدی سیاہی ملا دے
دنوں کے سفینوں کو ظلمات کے پانیوں پہ بہا دے
اسی زرد سپنوں کے دریا میں ہلاھٹوں کو جگا دے
یہ کشتی جو ٹوٹی تھی اپنی ہی کسلاھٹوں سے پھر انگڑائی لے اور لنگر اٹھا دے
سمندر کی لہریں ، پہاڑوں کے دامن ، گھنے جنگلوں کی یہ پہنائیاں
سب سفر یاب کر دے

خلاؤں میں سہانیوں کو نئے جسم و جاں دے
نئے رنگ و بُو سے
فضا اک نئی تال پر ناچ اٹھے
یہ مرگ آشنا زندگی ، جسم و جاں ، عقل و دل کے نئے روپ دیکھے
نئے رات دن ہوں
نئی ابتدا میں نئی انتہا ہو
کہاں ہو ؟
مرے پاس آؤ
مری روح میں روزنِ دل سے اپنا شگفتہ مہکتا ہوا ایک لمحہ گراؤ
نئے رنگ و بو آزماؤ
مری زندگی میں نئی دھڑکنوں کو جگاؤ
مری آنکھ کی روشنی میں نیا دھول دن کا کھلاؤ
زمین و زماں سے نکالو مجھے اپنی پیلاھٹوں میں بہاؤ
نئے مرحلوں منزلوں کے نئے فاصلے
ہو رہے ہیں ترے دم قدم سے ہی آباد ہر سو
مجھے اپنے پُر پیچ بل کھاتے رستوں پہ ، ان نور کی کہکشانوں پہ چلنا سکھاؤ
مجھے لے چلو زندگی کے نشیمن سے آگے
چلوں میں ترے ساتھ ہی زندگی کے نشیمن سے آگے
ترے ساتھ رہ کر الگ بھی رہوں تجھ سے لیکن جدا نہ رہوں
تری آرزو میں تری آس میں ہر گھڑی ہر طرف میں روانہ رہوں

ایک دل آشوب

ابنِ انشا

ہم سمجھے تھے راہیں ملکِ وفا کی اجال گیا
اک دھند ملی جس راہ میں پیکِ خیال گیا
اک چاند ہمیں پھر رات کی گود میں ڈال گیا

ہم شہر میں ٹھہریں ، ایسا تو جی کا روگ نہیں
اور بن بھی ہیں سونے ، بن میں بھی ہم سے لوگ نہیں
اور کوچے کو تیرے لوٹنے کا تو سوال گیا

ترے لطف و عطا کی دھوم سہی محفل محفل
اک شخص تھا انشا نام محبت میں کامل
یہ شخص یہاں پامال رہا ، پامال گیا

تری چاہ میں دیکھا ہم نے بحالِ خراب اسے
پر عشق و وفا کے یاد رہے آداب اسے
ترا نام و مقام جو پوچھا ، ہنس کر ٹال گیا

اک سال گیا ، اک سال نیا ہے آنے کو
پر وقت کا بھی اب ہوش نہیں دیوانے کو
دل ہاتھ سے اس کے وحشی ہرن کی مثال گیا

اب حسن کے گڑھ اور شہر پناہیں سونی ہیں
جو آشنا تھے ان کی بھی نگاہیں سونی ہیں
پر تُو جو گیا ہر بات کا جی سے ملال گیا

ہم اہلِ وفا رنجور سہی ، مجبور نہیں
اور شہرِ وفا سے دشتِ جنوں کچھ دور نہیں
ہم ہوش نہ سہی ، پر تیرے تو جی کا وبال گیا

سرِ عاشقی و غمِ فرقت و شوقِ وصال گیا
کوئی چاند ہمیں کسی رات کی گود میں ڈال گیا

نشاطِ خواب

ناصر کاظمی

مطلعِ اوّل

ہر کوچہ اک طلسم تھا ہر شکل موہنی
قصہ ہے اس کے شہر کا یارو شنیدنی

پہنچے تھے ہم بھی رات وہاں مدتوں کے بعد
رستہ تھا ہولناک فضا تھی ڈراؤنی

کیا پوچھتے ہو دشتِ مسافت کے مرحلے
ہر سانس رنجِ راہ میں برچھی کی تھی انی

سناٹوں میں رات کے اٹھتے نہ تھے قدم
پردے میں دل کا وہم ہی کرتا تھا رہزنی

ہوتا تھا کنکروں پہ گماں چشمِ شیر کا
جب دفعتاً فلک پہ چمکتی تھی دامنی

کوسوں اکھڑ گیا ہے وہ طبقہ زمین کا
بجلی نے کی ہے رات جہاں کوہ افگنی

ناگاہ برق و باد کا طوفان تھم گیا
پھر چھیڑ دی ہوائے نیستاں نے راگنی

آمد تھی کس پری کی رواقِ سپہر میں
دھلی ہوئی تھی چاند ستاروں میں سنسنی

تھا اک عجیب شہر درختوں کی اوٹ میں
اب تک ہے یاد اس کی جگا جوت روشنی

سچ مچ کا اک مکان پرستاں کہیں جسے
رہتی تھی اس میں ایک پری زاد پدمنی

اونچی کھلی فصیلیں ، فصیلوں پہ برجیاں
دیواریں سنگِ سرخ کی دروازے چندنی

جھل جھل جھلک رہے تھے پسِ چادرِ غبار
خیمے شفق سے لال ، چھپر تخت کندنی

فوارے چھوٹتے ہوئے مرمر کے صحن میں
پھیلی تھی جن کے گرد گلِ یاس کی بنی

ہر بوستاں کے پھول تھے اس عیش گاہ میں
ہر دیس کے پرندوں نے چھائی تھی چھاؤنی

جھرمٹ کبوتروں کے اترتے تھے رنگ رنگ
نیلے ، اتال ، جوگیے ، گلدار ، کاسنی

پٹ بیجنا سی انکھڑیاں ، گل چاندنی سے تاج
چونچوں میں حسن کی تتلیاں ۔ پنجوں میں پینجنی

سارنگیاں سی بجتی تھیں جب کھولتے تھے پر
یکبار گونج اٹھتی تھی سنسان کنگنی

استادہ اصطبل میں سُبک سیر گھوڑیاں
ٹاپوں میں جن کی گرد ہو گردونِ گردنی

رہتی تھی اس نواح میں ایسی بھی ایک حلو
پوشاک جس کی دھوپ تھی خوراک چاندنی

کل رات اس پری کی عروسی کا جشن تھا
دیکھی تھی میں نے دور سے بس اس کی روشنی

جم راج ، دیو ، دیویاں ، جنّات ، آدمی
بیٹھے تھے زیبِ تن کیے ملبوس درشنی

جلنے لگیں درختوں میں خوشبو کی بتیاں
گانے لگے چکور چناروں میں سمنی

ہاتھوں میں رنگترے لیے ، سر پر صراحیاں
کچی نکور باندیاں نکلیں بنی ٹھنی

لیمو ، انار ، سیب ، شریفے ، الیچیاں
رکھے تھے رنگ رنگ کے میوے چشیدنی

مرغابیاں بھنی ہوئیں، تیتر بھنے ہوئے
خستہ کباب سیخ کے اور نان روغنی

صندل، کنول، سہاگ پڑا، سہرا، عطر، پھول
لائی سجا کے تھال میں اِک شوخ کامنی

شیشے اچھال اچھال کے گاتے تھے مغبچے
بیٹھی تھی شہ نشیں پہ اک دُختِ ارمنی

ساروں کی گت پلٹ گئی، طبلے ٹھٹک گئے
پی کر شراب ناچ رہی تھی وہ کنچنی

انگارا سا بدن جو دمکتا تھا بار بار
گل مہ پہ ڈھانپ لیتے تھے کرنوں کی اوڑھنی

ہر دانگ باجنے لگے باجے نشاط کے
مردنگ، ڈھول، تان پورہ، سنکھ، سنکھنی

آکاش سے برس پڑے رنگوں کے آبشار
نیلے، سبز، سفید، ہرے، لال، جامنی

اتنے میں ایک کفرِ سراپا نظر پڑا
پھرتی تھی ساتھ ساتھ لگی اس کے چاندنی

ماتھے پہ ٹیکا، کانوں میں چاندی کی بالیاں
ہاتھوں میں سرخ چوڑیاں، شانوں پہ سوزنی

پلکیں دراز خطِ شعاعی سی تیز تیز
پُتلی ہر ایک آنکھ کی ہیرے کی تھی کنی

ٹھوڑی وہ آئنہ سی کہ بس دیکھتے رہیں
جوبن کے گھاٹ پر وہ کنول دو شگفتنی

گردن بھڑکتی لَو سی کہ جی چاہے جل مریں
کوئل سے کالے بال کہ بدمست ناگنی

وہ انگلیاں شفق سی کہ ترشے ہوئے قلم
اجلے رو پہلے گال کہ ورقے نوشتنی

ریشم سے پیٹ پر کوئی بھٹکی ہوئی کرن
رنگیلے ساحلوں پہ چلے جیسے سانڈنی

کندن سا روپ، دھوپ سا چہرہ، پون سی چال
دامن کشیدنی، لب و عارض چشیدنی

صورت نظر نواز، طبیعت ادا شناس
سو حسن ظاہری تو کئی وصف باطنی

اڑ اڑ کے راج ہنسوں نے جنگل جگا دیا
گھوڑوں کی رتھ میں بیٹھ گئے جب بنا بنی

منہ دیکھتے ہی رہ گئے سب ایک ایک کا
منہ پھیر کر گزر گئی وہ راج ہنسنی

منظر مجھے ہوس نے دکھائے بہت مگر
ٹھہرا نہ دل میں حُسن کا رنگِ شکستنی

تارا فجر کا نکلا تو ٹھنڈی ہوا چلی
نیند آ گئی مجھے کہ وہاں چھاؤں تھی گھنی

مطلعِ ثانی

دل کھینچتی ہے منزلِ آبائے رفتنی — جو اس پہ مر مٹے وہی قسمت کے تھے دھنی

وہ شہر سو رہے ہیں وہاں کاظمین کے — ہیبت سے جن کی گرد ہوئے کوہِ آہنی

شاہانِ فقر وہ مرے اجدادِ باکمال — کرتی ہے ان کی خاک بھی محتاج کو غنی

سر خم کیا نہ افسر و لشکر کے سامنے — کس مرتبہ بلند تھی ان کی فروتنی

شرقی تھی ان کے سایۂ محمود میں قیام — عصمت مآبی ، خوش نسبی ، پاک دامنی

شب بھر مراقبے میں نہ لگتی تھی ان کی آنکھ — دن کو تلاشِ رزق میں کرتے تھے جاں کنی

تھی گفتگو میں نرم خرامی نسیم کی — ہر چند وہ دلیر تھے تلوار کے دھنی

جاتے ہیں اب بھی اس کی زیارت کو قافلے — اس در کے زائروں کو نہیں خوفِ رہزنی

اس آستاں کی خاک اگر ضو فگن نہ ہو — برجوں سے آسماں کے اڑ جائے روشنی

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے — میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی

اے ساکنانِ خطۂ لاہور دیکھنا — لایا ہوں اس خرابے سے میں لعلِ معدنی

جلتا ہوں داغِ بے وطنی سے مگر کبھی — روشن کرے گی نام مرا سوختہ تنی

خوش رہنے کے ہزار بہانے ہیں دہر میں — میرے ضمیر میں ہے مگر غم کی چاشنی

یا رب زمانہ ممتحنِ اہلِ صبر ہے — دے اس دنی کو اور بھی توفیقِ دشمنی

ناصر یہ شعر کیوں نہ ہوں موتی سے آبدار — اس فن میں کی ہے میں نے بہت دیر جاں کنی

ہر لفظ ایک شخص ہے ہر مصرع ایک شہر
دیکھو مری غزل میں مرے دل کی روشنی !

درختوں میں

ناصر کاظمی

گا رہا تھا کوئی درختوں میں
رات نیند آ گئی درختوں میں

چاند نکلا افق کے غاروں سے
آگ سی لگ گئی درختوں میں

مینہ برسا تو برگ ریزوں نے
چھیڑ دی بانسری درختوں میں

کتنی آبادیاں ہیں شہر سے دور
جا کے دیکھو کبھی درختوں میں

لیے جاتی ہے موسموں کی پکار
اجنبی اجنبی درختوں میں

یہ ہوا تھی کہ دھیان کا جھونکا
کس نے آواز دی درختوں میں!

ہم ادھر گھر میں ہوگئے بے چین
دُور آندھی چلی درختوں میں

جل اٹھے درد کے اندھیرے رنگ
رات بجلی گری درختوں میں

نیلے ، پیلے ، سفید ، لال ، ہرے
رنگ دیکھے سبھی درختوں میں

خوشبوؤں کی اداس شہزادی
رات مجھ کو ملی درختوں میں

دیر تک اس کی تیز آنکھوں سے
روشنی سی رہی درختوں میں

چلتے چلتے ڈگر اجالوں کی
جانے کیوں مُڑ گئی درختوں میں!

سہمے سہمے تھے رات اہلِ چمن
تھا کوئی آدمی درختوں میں

ساتواں رنگ

بال کالے ، سفید برف سے گال
چاند سا جسم ، کوٹ بادل کا
لہریا آستیں ، سرخ بٹن
کچھ بھلا سا تھا رنگ آنچل کا
اب کے آئے تو یہ ارادہ ہے
دونوں آنکھوں سے اسکو دیکھوں گا

گجر پھولوں کے

اک کرن چشم و چراغ دلِ شب
کیوں اسے خونِ رگِ دل نہ کہوں
رقص کرتی ہے کبھی شیشوں پر
کبھی روزن سے اتر آتی ہے
کبھی اک جامۂ آویزاں کی
نرم سلوٹ کے خنک گوشوں میں
گیت بُنتی ہے گجر پھولوں کے

سرگزشت

سعید محمود

خیالوں سے پہلے
درختوں سے بھی دوستی تھی
ہوا کے پُراسرار جھونکوں نے پہلی کہانی سنائی
کبھی مہ اندھیرے کوئی پھول جاگا تو پیغام آیا
کبھی چاند عریاں ہؤا ، میری پلکوں پہ تارے چمکنے لگے
رنگ پہلے مرے گھر میں آباد تھے

پھر یہ شکلیں اجڑنے لگیں
ایک دیوار سی درمیاں آ گئی

اب تو ہونٹوں پہ بھولے ہوئے نام ہیں
جو کہیں دور ، دل سے پرے رہ گئے
دن گزرتا ہے چپ چاپ چلتا ہؤا
شام آتی ہے
لیکن مجھے کچھ بھی کہتی نہیں

دل اور آنکھیں

سعید محمود

بے کفن ہے زمیں ، دور ہی دور پھیلی ہوئی
آسماں — خوف کا بے اماں سلسلہ
اور ہوا جیسے دیوار سر پر کھڑی ہو

یہ رات آج بھی دل کی مانند خالی ہے ، ویران ہے
سرد آنکھیں ابھی سنگریزوں سی ہیں
کوئی آواز دینے نہیں آئے گا

ان جنازوں کے ہمراہ کیا لوگ ہیں
سر جھکائے ہوئے
لالٹینیں — اندھیرے میں بے آسرا
کون مر جائے گا

شہر آباد ہے
ہر طرف سسکیاں لے کے ہر کوئی روتا ہے
سب بے گناہ اور گنہگار ہیں

کن پراسرار لمحوں کی زنجیر ہے
کیسی منزل ہے یہ
اس زمیں ، آسماں اور ہوا سے پرے کون ہے
کس کی آواز سننے کو بے چین ہیں

منیر نیازی

☆ آخری عمر کی باتیں
☆ موت
☆ نگار خانہ
☆ خلش
☆ شب خون
☆ کلپنا
☆ سپیرا
☆ حقیقت
☆ پاگل پن
☆ جادو کا کھیل
☆ بے بسی
☆ غزلیں

منیر نیازی کا نام اگرچہ نئے شاعروں میں شمار ہوتا ہے لیکن وہ سویرا پڑھنے والوں کے لیے نئے نہیں ۔ منیر کی نظموں میں ان کے پیش روؤں کی سی سنگین پختہ کاری اور بے رسی ہے نہ مبتدیوں کی سی لڑکھڑاہٹ اور جدت کی بے اگاہی ، ان کی تعمیر میں بس اتنا ہی کساؤ ہے کہ وہ میر کے درد آشنا خوابِ عشرت کا بوجھ نہ جوئی اٹھالیں ۔

خوشبو ہی جوہر کی پہچان اور راہِ عمل ہے ۔ خوشبو ہی شاعر کو ہجوم سے الگ اور ہم عصروں سے بالا بناتی ہے ۔ منیر کی نظمیں (اور غزلیں بھی) اتنا ضرور بتاتی ہیں کہ وہ کسی جوہر کی خوشبو ہیں ۔

۲

آخری عمر کی باتیں

وہ میری آنکھوں پر جھک کر کہتی ہے « میں ہوں »
اس کا سانس میرے ہونٹوں کو
چھو کر کہتا ہے « میں ہوں »
سونی دیواروں کی خموشی
سرگوشی میں کہتی ہے « میں ہوں »
« ہم گھایل ہیں » سب کہتے ہیں
میں بھی کہتا ہوں « میں ہوں »

موت

ہر طرف خاموش گلیاں زرد رو کودکے کس
سونے سونے بام و در اور اجڑے اجڑے شہر
مٹیوں پر ایک گہری خامشی سایہ فگن
رینگ کر چلتی ہوا کی بھی صدا آتی ہے

اس سکوتِ بے کراں میں اک طلسمی
سرخ ، گہرے سرخ لب اور چاند
آنکھ کے مبہم اشارے سے بلاتی ہے مجھے
ایک پراسرار عشرت کا خزانہ ہے وہ چشم

نگار خانہ

کسی کی شربتی نظر
کوئی مہکتا پیرہن
دمکتی سرخ چوڑیاں
چمکتا ریشمی بدن
کئی جھکے جھکے شجر
ہرے بھرے بنوں میں گھومتی
کوئی اداس رہگزر
جا بجا نگر میں سے
کسی نگر کے بام و در
رہیں گے یاد عمر بھر

خلش

وہ خوبصورت لڑکیاں
دشتِ وفا کی ہرنیاں
شہرِ شبِ مہتاب کی
بے چین جادو گرنیاں
جو بادلوں میں کھو گئیں
نظروں سے اوجھل ہو گئیں
اب سرد ، کالی رات کو
آنکھوں میں گہرا غم لیے
اشکوں کی بہتی نہر میں
گلنار چہرے نم کیے
ہستی کی سرحد سے پرے
خوابوں کی سنگیں اوٹ سے
کہتی ہیں مجھ کو « بے وفا !
ہم سے بچھڑ کر کیا تجھے
سُکھ کا خزانہ مل گیا ؟ »

شب خون

جب آسماں سیاہ رات کے تاروں سے بھر گئے
صحنِ چمن میں چمکے شگوفے نئے نئے
مجھ کو ہوا نے بات سجھائی عجب سی
بادل میں ایک شکل دکھائی عجیب سی
چاند آسماں کی سیج پہ سویا ہوا ملا
رنگِ گلِ انار میں لتھڑا ہوا ملا
اے عاشقانِ حسنِ ازل ! غور سے سنو
یہ داستانِ جنگ و جدل غور سے سنو
میں برگِ بے نوا تو نہیں ہوں کہ چپ رہوں
دل کے کسی بھی شعلے کو عریاں نہ کر سکوں
میں تیغ ہاتھ میں لیے سوئے فلک گیا
جذبوں کے رس سے مہکے ہوئے چاند تک گیا
کافی تھا ایک وار مری تیغِ تیز کا
مہتاب کے بدن سے لہو پھوٹ کر بہا

کلپنا

رات ہے کتنی گہری کالی
دکھ کی بات سجھانے والی
دور دور کی آوازوں کو
اجڑے گھروں میں لانے والی
سر پر ہے گھنگھور [illegible]
دل میں لگی برہ [illegible] کے [illegible]
شور مچاتی [illegible]
[illegible] ہوا سوئے مدھ [illegible]
چڑھتا ساگر [illegible]
[illegible] بجلی [illegible]
دور بہت ہے پی کی [illegible]
ہم سے تو [illegible] چلا نہ

سپیرا

میں ہوں ایک عجیب سپیرا
ناگ پالنا کام ہے میرا
نیلے پیلے ، کالے کالے
رنگ برنگے دھبوں والے
شعلوں سی پھنکاروں والے
زہریلی مہکاروں والے
ان کی آنکھیں تیز نشیلی
گہری جھیلوں جیسی نیلی
نئے لہو سے لال زبانیں
جیسے موت کی رنگیں تانیں
مخمل کے رومالوں جیسے
سرخ ، گلابی گالوں جیسے
مجھ کو تکتے رہتے ہیں یہ
مجھ کو ڈستے رہتے ہیں یہ
مجھ پر ہنستے رہتے ہیں یہ

حقیقت

نہ تو حقیقت ہے اور نہ میں
اور نہ تیری میری وفا کے قصے
نہ برکھا رُت کی سیاہ راتوں میں
راستہ بھول کر بھٹکتی ہوئی سجل ناریوں کے جھرمٹ
نہ اجڑے نگروں میں خاک اڑاتے
فسردہ دل پریموں کے نوحے
اگر حقیقت ہے کچھ تو یہ اک ہوا کا جھونکا
جو ابتدا سے سفر میں ہے
اور جو انتہا تک سفر کرے گا

پاگل پن

اک پردہ نازک مخمل کا آنکھوں پر چھانے لگتا ہے
اک بھوت ہزاروں شکلوں کا دل کو دہلانے لگتا ہے
اک تیز حنائی خوشبو سے ہر سانس چمکنے لگتا ہے
اک پھول طلسمی رنگوں کا گلیوں میں دمکنے لگتا ہے
سانپوں سے بھرے اک جنگل کی آواز سنائی دیتی ہے
ہر اینٹ مکانوں کے چھجوں کی خون دکھائی دیتی ہے

جادو کا کھیل

رنگ برنگے شیشوں والی کھڑکی بند پڑی [illegible]
وہ لڑکی جو اس میں کھڑی لوگوں کو خواب دکھاتی تھی
کالی کالی راتوں میں ہونٹوں کی شمع جلاتی تھی
تیز نگاہوں کی بجلی سے سب کے ہوش اڑاتی تھی
دستِ حنائی کے شعلے سے چق میں آگ لگاتی تھی
اب وہ دلوں سے کھیلنے والی لڑکی تو [illegible]
سنتے ہیں وہ لڑکی جاتے وقت بہت ہی [illegible]
یوں لگتا تھا اس کی کوئی قیمتی سی شے کھوئی تھی

بے بسی

پھلجھڑی سسکی کی گہری رات میں چھوٹی نہیں
جوئے خوں کوہِ سیہ کی آنکھ سے پھوٹی نہیں
سلسلۂ غم کی طنابِ ریشمیں ٹوٹی نہیں
تیرگی کے راہزن نے دختِ روز لوٹی نہیں

کشتیٔ دل بحرِ غم کی موج میں کھیتے رہو
اپنے ہی خوں کے چراغاں کے مزے لیتے رہو
عمر بھر شب کے اندھیرے کو صدا دیتے رہو

☆

جب بھی گھر کی چھت پر جائیں ناز دکھانے آ جاتے ہیں
کیسے کیسے لوگ ہمارے جی کو جلانے آ جاتے ہیں

دن بھر جو سورج کے ڈر سے گلیوں میں چھپ رہتے ہیں
شام آتے ہی آنکھوں میں وہ رنگ پرانے آ جاتے ہیں

جن لوگوں نے ان کی طلب میں صحراؤں کی دھول اڑائی
اب یہ حسیں ان کی قبروں پر پھول چڑھانے آ جاتے ہیں

کون سا وہ جادو ہے جس سے سم کی اندھیری سرد گپھا میں
لاکھ حنائی ہاتھ دلوں کے روگ مٹانے آ جاتے ہیں

« زے » کے ریشمیں رومالوں کو کس کس کی نظروں سے چھپائیں
کیسے ہیں وہ لوگ جنہیں یہ راز چھپانے آ جاتے ہیں

ہم بھی منیر اب دنیا داری کر کے وقت گزاریں گے
ہوتے ہوتے جینے کے بھی لاکھ بہانے آ جاتے ہیں

☆

وہ جو میرے پاس سے ہو کر کسی کے گھر گیا
ریشمیں ملبوس کی خوشبو سے جادو کر گیا

اک جھلک دیکھی تھی اس روئے دلآرا کی کبھی
پھر نہ آنکھوں سے وہ ایسا خوشنما منظر گیا

تھی وطن میں منتظر جس کی کوئی چشمِ حسیں
وہ مسافر جانے کس صحرا میں جل کر مر گیا

شہر کی گلیوں میں گہری تیرگی گریاں رہی
رات بادل اس طرح آئے کہ میں تو ڈر گیا

صبحِ کاذب کی ہوا میں درد تھا کتنا منیر
ریل کی سیٹی بجی تو دل لہو سے بھر گیا

☆

بیگانگی کا ابر گرانبار کھل گیا
شب میں نے اس کو چھیڑا تو وہ یار کھل گیا

گلیوں میں شام ہوتے ہی نکلے حسین لوگ
ہر رہگزر پہ طبلۂ عطار کھل گیا

تھا عشرتِ شبانہ کی سرمستیوں میں بند
بادِ سحر سے دیدۂ گلبار کھل گیا

ہم نے چھپایا لاکھ مگر چھپ نہیں سکا
انجامِ کار رازِ دلِ زار کھل گیا

آیا وہ بام پر تو کچھ ایسا لگا منیر
جیسے فلک پہ رنگ کا بازار کھل گیا

مقبول احمد پوری

مقبول احمد پوری اور گیت کی صنف ، چاہنے والوں کے لیے ، لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اردو کے معتبر جریدوں میں ایک عرصے سے یہ دھیمی دھیمی ، میٹھی میٹھی آواز کانوں کو بھی دعوت دیتی رہی ہے اور دلوں میں بھی شور پیدا کرتی رہی ہے ۔

احمدپوری کے جذبات کی تطہیر ہو چکی ہے اور وہ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے الفاظ و آہنگ بھی اس انداز سے چنتے ہیں کہ صورت و معنی یک جان ہو کر ایک اٹل وحدت بن جاتے ہیں ۔ احمدپوری کے گیتوں کی تاثیر گایک اور ساز کی محتاج نہیں ، ان کے الفاظ ہی میں ایسا نظام مضمر ہوتا ہے کہ تکمیل و آسودگی کی صورت پیدا ہو جائے ۔

گیت

تجھے کیا بتاؤں ساقی، تری انکھڑیوں میں کیا ھے ؟!
کبھی دیکھ پائے اس کو
مری آنکھ سے — نظر سے
جو ہے مئے مجسم
اسے چھو — سمت برسے
تجھے مے فروش بنتے ہوئے اب شرم آئے
وہ شرارہ بھڑکے دل میں، ترا تن بدن جلائے
تجھے کیا بتاؤں ساقی
تری انکھڑیوں میں کیا ھے ؟!

گیت

بہت قریب ہو، دل کو مگر قرار نہیں
سکوں سے جانِ حزیں اب بھی ھمکنار نہیں
یہ مانتا ہوں کہ تم سا وفا شعار نہیں

ابھر ابھر کے بجھے جا رہے ھیں سب ارماں
«سکونِ قلب» جسے ڈھونڈتا ھوں، پاؤں کہاں؟

جو آس توڑ سکے بیڑیاں جدائی کی
تو سچ ھے ساکھ نہ قائم رھے جدائی کی

مجھے یہ صبر و شکیبائی سازگار نہیں!
بہت قریب ہو دل کو مگر قرار نہیں

گیت

اے ہمنشیں، خزاں میں بھی کیفِ بہار ہے
غربت میں لذّتِ غمِ یار و دیار ہے
محرومِ آرزو ہوں مگر انتظار ہے
تاثیر پر نہ جا
میری آہوں میں گر ہو
کافی ہے داغِ دل جو ابھی برقرار ہے
اے ہمنشیں، خزاں میں بھی کیفِ بہار ہے

گیت

کیا شے ہے خزاں،
اب عیش نہ غم،
لے جاؤ، بہار سے کام نہیں
اس بار سے آگے پیار ہوئے
اب نازِ نگار سے کام نہیں!

یہ چھوٹی سی دنیا اپنی
ہے آپ کے عالم کا پرتو
حسن کا نہیں بار کسی کو ملا
واں حسد و شمار کا نام نہیں

سب آپ کے ہیں — ہم بھی سب میں
بیگانہ و غیر کسے کہیے
جی جان سے پاک اور صاف ہوئے
اب دل میں غبار کا نام نہیں

جب بھول گئے سب اپنا پن
بیکار کی بات ہے نام و نشاں
کیوں نام دھرا — «احمد پوری»
— اب شہر و دیار سے کام نہیں!

گیت

چترکار گایک اور شاعر
لے گئے سوں یہ ارماں
اپنے اپنے فن کے وسیلے
کرا سکیں تیری پہچان

چترکار نے روپ میں پائی
شرمائی سی اک مسکان
گایک ستار کے تاروں ہی میں
رہ گیا الجھ کے ڈور سماں

چترکار ، گایک اور شاعر
ہارے دیکھ سارا ابھمان
پایا اسی نے «احمد پوری»
تج دیا جس نے سب جی جار

تصویر

ڈولتی بولتی مورت ہوں میں
یا مہیوال کہو یا سوہنی
اور تو ہوں جیسا کا تیسا
صرف مری «من لہر» ہے موہی
دُکھ میں دکھیا میں سب کو دُکھیا
سُکھ میں خوش خوش دنیا دکھائی
کچھ بھی نظر آؤں «لہروں» میں
میں ہوں وہی جو تم ہو بھائی
شیام نے اپنے پرانوں کا سُر بھر کے بسی مجھ میں جائی !

ستارا ہے

ظفر صمدانی سید

دعوت

موسم کے ماتھے پہ جڑاؤ جھومر ہے
سوئے کوئے جاگ اٹھے ہیں
باغ کی ہر پگڈنڈی پر خوشبو کے چشمے پھوٹ نکلے ہیں
پھولوں کے ریشمی جسموں کی دھیمی دھیمی پاگل کر دینے والی خوشبو
رُت کے ذروں میں رس بس کر
رات کی گیلی گیلی ہواؤں سے لپٹی
باغ کی ہر پگڈنڈی پر پھیلی ہے
ہرے بھرے ہیں پیڑوں کی شاخوں کے دامن
رات کے گہرے سناٹے میں چلّانے والا الو بھی
برگد کی اونچی اور بوڑھی شاخوں سے اب اپنا بسیرا چھوڑ گیا ہے
رُت بدلی ہے!

رُت بدلی ہے، میری بھی قسمت سے خزاں کا سایہ ڈھلے
تم آجاؤ، اور یہ خزاں کی رُت جائے
اور یہاں بھی ایک جڑاؤ جھومر آئے
پھر میں ان پھولوں سے پوچھوں "خوشبو کیسی ہوتی ہے"؟
شام کو لوگ مکانوں کے دروازوں پر
روشن کرتے ہیں شمعیں
ایک مکان کا دروازہ لیکن اب تک
کالا اور اندھیارا ہے
تم آجاؤ تو میں لوگوں سے یہ پوچھوں "روشنی کیسی ہوتی ہے"؟

انتظار

پچھلے پہر کی نرم ہوا میں
جھول رہی ہیں نازک شاخیں
ہرے ہرے گیلے پتے
چمک رہے ہیں تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں
کلیوں کی مدھم خوشبو پھیلی ہے ہوا میں

پچھلے پہر کی نرم ہوا میں

پچھلے پہر کی نرم ہوا میں
جھوم رہی ہیں رنگیں پھولوں والی بیلیں
سرد ہوا سے شرمائی ہیں
پتوں کا آنچل رُخ پہ لے آتی ہیں

ناچ رہے ہیں بادل میں سہمے سہمے سے تارے
ڈھلتی رات کے روشن چاند میں
پیلے پیلے دانتوں والی بڑھیا چرخا کات رہی ہے
پچھلے پہر کی نرم ہوا میں
بادل چاند پہ چھا جاتے ہیں

یادیں

لال چمکتی آنکھوں والے سر میں دھول جمائے جوگی
یونہی سوچا کرتے ہیں ، اس دیوتا کی کوکھ نہیں ہے
اس دیوتا کے پیڑوں کے میٹھے پھل
اس کے چشمے کا شیریں پانی
ہونٹوں تک نہیں آتا ہے
سارے جوگی یونہی سوچا کرتے ہیں

یادیں کچھ راہوں کی ، کچھ سایوں کی
پہر کی کالی سڑکوں پر
تپتی دوپہروں میں شہروں کا شور و غل ہے
ہاڑ کے پورے سورج میں جلتے رستے ، چلتے راہی
راہی — راہی ، گنتے جاؤ تاروں کی تعداد نہیں ہے
لوگوں کا ایک سمندر ہے اور اس کا کوئی کنارا نہیں
اور شور کا ایک سمندر ہے اور اس کا کوئی کنارا نہیں
پھر بھی تنہائی —
— تنہائی اور خاموشی نے سانسوں میں ڈیرے ڈالے ہیں

کچھ شیشے ہیں رستوں پر بکھرے
پاؤں سے کچھ ایسے چمٹے

ماتموں کے بچھڑے ساتھی ہوں جیسے
اور کانٹے ہیں —
پیلے پتوں ، بھیگی شاخوں ، سوکھے رستوں کی یادیں ہیں
ڈالی پھول نہیں
اور رنگ رسیلا کوئی نہیں
خوشبو کا دریا کوئی نہیں

یادیں ہیں — تنہا تنہا ، کچھ اداس کی
کچھ آوازیں اب تک کانوں میں بجتی ہیں
کچھ دور سے بہتی آوازیں ہیں ، قرب نہیں ہے
ہوا میں تیرتی آتی اک سسکی کبھی سوتے سوتے جاگ اٹھتی ہے
سندر کی دیوی دور کہیں پھر جا بستی ہے

کچھ خواہشیں تھیں ، ان کی یادیں ، دھکی دھکی
اب راکھ ہے اور تو کچھ بھی نہیں
کچھ تصویریں ہیں خوابوں کی
وہ خواب کہ جن کی اب تک بھی تعبیر نہیں
— ہو گی بھی نہیں
ویرانی ہے ، اونچے اونچے ویران رستے
اک راہی ہے — تنہا تنہا
لوگوں کا ایک سمندر ہے کہ جس کا کوئی کنارا نہیں ،
پھر بھی تنہا !

مستقبل

سائے ہیں کبھی پھیلے ہیں ، کبھی سمٹے ہیں ، سائے
سائے کبھی ہلکے ہیں کبھی گہرے ہیں —
رستوں پر پگڈنڈیوں پر بھاری بھاری ، سوئے سوئے
ہر سو سائے — سائے سائے ،
یوں جیسے وقت بھی سایہ ہے ، بیتے لمحے بیتے سائے
بہتے لمحے ، بہتے سائے ،
شام کی اونگھتی روشنی میں پیڑوں کے بے ڈھنگے سائے
میناروں کے محرابی سائے دھندلے دھندلے ، روشن روشن
پورے چاند کی ریشم سی کرنوں کے تاروں کے ٹھنڈے سائے

دوپہروں کے تپتے سایے
آسماں کے سلگتے سایے اور سرما کے ٹھٹھرے سایے
سایے، سایے، ہر سو سایے،

دیواریں ہیں اونچی اونچی، چوڑی چوڑی
ہر جانب پھیلی ہیں کشادہ سینوں والی کالی چٹانیں
اور بے آب و گیاہ پہاڑوں کی گہری پُر ہول ڈھلانیں
صحرا میدانوں کے زہریلے کانٹوں والے پیڑوں کی امرت برسانی مالائیں
کون گلے کا جیون بنتی ہوں گی
کون رگوں کے پار اترتی ہوں گی، زہریلی، ہیروں کے ذرّوں کی مالائیں

دور بہت ہی دور پہاڑ کی چوٹی ہے
جس پر صدیوں سے برف جمی ہے
جس کے سینے کی مٹی تک دھوپ بھی نہیں پہنچی ہے

ایک آرزو

پھول کھلے میں نے نہیں دیکھے
بارش برسی لیکن دھرتی بانجھ رہی
قوس قزح بھی ابھری لیکن میری نظروں میں نہیں آئی
موتی چنتے چنتے میں نے عمر بتائی
کالے پانیوں کی گہرائی کی سیپیوں کے سچے موتی
پھر ان کا اک ہار بنایا
سجا نہیں کسی گلے میں ٹوٹا
موتی بکھرے۔

رنگ بہے خوشبو کے سوتے پھوٹے
کون سے دیس میں؟ کاش کوئی بتلائے
تو ہی دل بہلائے

کاش کبھی پھولوں کو کھلتا دیکھوں
قوس قزح کے رنگوں کا نظارہ کروں
تیرے گلے میں
کالے پانی کی گہرائی کی سیپیوں کے
سچے موتی کا اک ہار سجاؤں۔ دیکھوں!

شیخ صلاح الدین
مظفر علی سید
محمد حسن عسکری

[illegible]



مسحرا   عمل : رُواو

تخلیق کا ہنر

شیخ صلاح الدین

جب انسان شعور کے بغیر تھا ، بے لسان تھا ، جسم فطرت کا ایک عضو تھا ، حیوانوں میں سے ایک حیوان تھا تو جسم کی ضروریات سے الگ اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا ؛ وہ لمحہ بہ لمحہ جیتا تھا ، ماضی ، حال ، مستقبل سے بے خبر تھا ؛ وہ حیوانوں کی طرح پیدا ہوتا تھا ، کھاتا تھا ، پیتا تھا اور مر جاتا تھا ؛ اس وسیع و عریض ، ہر لحظہ بدلتی مگر جاوداں ، کائنات کے درمیان اس کی پیدائش ، حیات اور موت ایک معمولی حادثہ تھی -

مگر ایک وقت ایسا بھی آیا جب شعور نے اُس کے اندر جنم لیا ، اُس نے پہلی بار نئی آنکھوں سے دیکھا ، محسوس کیا ، اس نے اپنے آپ کو اپنے گرد و پیش سے الگ اور اس کا مد مقابل پایا ؛ اس نے دیکھا کہ اس کے گرد و پیش جو کچھ جنم لیتا ہے مٹ جاتا ہے مگر جانداروں کے جنم اور فنا سے فطرت کے رنگ روپ میں کوئی فرق نہیں آتا -

ہر جاندار کی فنا کے تصور سے اس کا دل خون ہو گیا ہوگا اور اس کے ساتھ جب اس کو اپنی فنا کا خیال آیا ہوگا تو وہ کانپ گیا ہوگا - اس نے خوف سے ، حسرت سے ، فطرت کے مظاہر پر نظر ڈالی ہو گی : اس نے سورج کو چڑھتے ، ڈوبتے دیکھا ہوگا ، سورج کے ڈوبتے ہی اس کی دنیا اندھیر ہو گئی ہو گی ؛ اندھیرا اس کے کمزور کندھوں پر نا قابل برداشت بن گیا ہوگا ؛ اس کو اپنی فنا کا یقین ہو گیا ہوگا ، وہ اپنے آپ کو فنا کے سپرد کر دینے پر راضی ہو گیا ہوگا مگر جب اُفق سے چاند چڑھ آیا ہوگا تو اس کی چاندنی سے اس کے مردہ دل میں زندگی لوٹ آئی ہو گی ، زندگی نے دوبارہ انگڑائی لی ہو گی ؛ وہ اپنے خیالوں پر دل ہی دل میں مسکرایا ہوگا ؛ اس نے چاند کی طرف دیکھتے دیکھتے رات گزار دی ہوگی ؛ نیا دن چڑھا ہوگا تو اپنے آپ کو زندہ پاکر وہ ناچا ہوگا ، اس نے قہقہہ لگایا ہوگا ، اپنے قہقہے کے آہنگ اور ترنم سے ایک بار تو وہ حیران ہؤا ہی ہوگا اور اس نے سوچا ہوگا کہ وہ قہقہہ لگانے کے علاوہ کیا کیا کچھ کر سکتا ہے ؟

اُس وقت سے آج تک انسان کے لئے خود اپنی ہی ذات سب سے بڑا مسئلہ رہی ہے - آج انسان نہ صرف اپنے آپ کو اشرف‌المخلوقات سمجھتا ہے بلکہ فطرت کا حاکم اور کائنات کا فاتح - اس احساس کے باوجود وہ اپنے لیے ایسا نظام زندگی وضع نہیں کر سکا جو اُس کو اُسی طرح زندگی کی ضروریات مہیا کر سکے جس طرح فطرت اس کو ہوا مہیا کرتی ہے ؛ اس کی زندگی کے بیشتر لمحے زندگی کی ضروریات مہیا کرنے کی نذر ہو جاتے ہیں - جب وہ تھک کر اپنے ہم جنسوں سے الگ ہوتا ہے تو ہر طرف سے خلا اس کو اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں - ان خلاؤں کی گرفت سے بچنے کی خاطر وہ اپنے خیالوں کو ، اپنے جذبات کو ، اپنی یادوں کو پکارتا ہے مگر خلاؤں کے لامتناہی سلسلوں کے ریلے کے آگے اس کے سب خیالات ، اس کے سب جذبات ، اس کی سب یادیں ، ٹھہر نہیں سکتیں اور بھاگ کھڑی ہوتی ہیں - اس بھگدڑ سے اس کے دل و دماغ پر مایوسی کی گرد بیٹھنے لگتی ہے ، وہ پریشان ہو جاتا ہے اور اس سے بچنے کے لئے تصورات کے عجیب و غریب قلعے تعمیر کرتا ہے مگر خلاؤں کی یلغار سے ان قلعوں کی دیواریں ڈگمگاتی ہی رہی ہیں -

انسانوں ہی کے درمیان فن کار جنم لیتا ہے - اس پر بھی یہ سب کچھ بیتتا ہے : اس کے مد مقابل خلا آتے ہیں ، وہ قلعے تعمیر کرتا ہے ، ان قلعوں کی دیواریں ڈگمگاتی ہیں تو وہ ان کی مضبوطی کے لئے بندوبست کرتا ہے - اسی تگ و دو میں دیکھتا ہے کہ وہ

ایک ایسے عالم کو جنم دے لیتا ہے جس کا زندگی کی کشمکش سے ، خلاؤں کی یورش سے محفوظ رہنے کے ساز و سامان سے کوئی علاقہ نہیں ، جو حیات کی تنگ و دو میں پیدا ہونے والی تمام قوتوں سے آزاد ہے ۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ انسان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خالق بھی ہے ۔ اس کی مخلوق میں کائنات کے نظام کی مثل ایک ارتقاء پذیر نظام مضمر ہے .... اور نظام کائنات میں جو تناسب ، جو رفتاریں ، جو شکلیں نظر آتی ہیں ان کے شائبے اس کی مخلوق میں سموئے ہیں ۔ جب وہ اپنی مخلوق کے مد مقابل آتا ہے تو اس کو اپنے آپ میں کمی محسوس ہوتی ہے ؛ اس کو اپنے آپ میں مخلوق کا سا نظام نظر نہیں آتا ۔ وہ اپنی مخلوق کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے ؛ اس پر احساس کمتری محیط ہو جاتا ہے ۔ اس احساس کمتری سے بچنے کی خاطر وہ اپنی مخلوق سے منہ پھیر لیتا ہے ، اسے بھول جانے کی کوشش کرتا ہے اور بھول جاتا ہے ۔ وہ ایک بار پھر زندگی کی کشمکش ہی کو سب کچھ سمجھنے لگتا ہے مگر وہ پھر پہلے کے مثل عالم کو جنم دے لیتا ہے اور دوبارہ احساس کمتری کے بس میں ہو جاتا ہے ۔ یوں عالم کے جنم کی تکرار سے پیدا ہونے والا احساس کمتری اس کی زندگی کا لازمی جزو بن جاتا ہے ۔ جب اس کی مخلوق اس کے لیے وجۂ امتیاز و ستائش بنتی ہے تو اپنی قوت خلق پر نازاں ہوتا ہے ، ایسی مخلوق کا خواہاں ہوتا ہے ، تنہائی میں اس کے جنم سے پیدا ہونے والے احساس کمتری سے گریزاں بھی ۔ جب اس کی مخلوق اور مخلوق کے جنم سے پیدا ہونے والا احساس کمتری اس کا پیچھا کرتے ہی رہتے ہیں تو وہ اُن کا سامنا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ اُن کا سامنا کرنے کے لیے اسے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی کنہ و ماہیت سے پوری طرح واقف ہو جائے ۔ جب فن کار ایسا کر لیتا ہے تو اپنی قوت خلق پر قادر و حاکم ہو جاتا ہے ، عالمیں کی تخلیق اس کے لیے کمزوری یا بیماری کے بجائے ہنر بن جاتی ہے ۔

تخلیق کے ہنر کی کنہ و ماہیت کی خبر لانا طلسم کشائی کے برابر ایک جوکھم ہے ۔ اس سفر پر نکلنے سے پہلے مناسب ہے کہ راہ میں آنے والی منازل کو صحیح طور پر پہچاننے کے لیے نشانیوں کا تصور ذہن نشین کر لیں کہ بھٹک نہ جائیں ۔

تخلیق کا ہنر فن کار سے متعلق ہے اور فن کار عام انسانوں کی طرح معاشرے کا رکن ہے اور زمان و مکان کے اندر رہ کر انسانوں کے جانے پہچانے اجسام کے ذریعے سے اپنی تخلیقات کو متعارف کراتا ہے ۔ چونکہ انسان ہی کے لیے ممکن ہے کہ فن کار بن سکے ، خالق بن سکے لہذا ضروری ہے اس کا بھی تعین کر لیں کہ انسان سے کیا مراد ہے ۔ انسان مظاہر فطرت کی طرح بلندیوں اور سطحوں کے ہمہ گیر نظام کی حرکت دم بہ دم کی پیداوار ہے ، تمام دوسری جان دار اور بے جان مخلوق سے کسی نہ کسی طرح ممثل ہے : وہ حیوانوں میں سے حیوان ہے مگر اس کی ضروریات حیوانی ضروریات سے ماوراء ہیں ، وہ ان کی طرح مکان کے فاصلوں میں گھرا ہؤا بھی ہے اور اُن کا ہمیشہ پابند رہنے پر مجبور بھی نہیں ، وہ مکان کے ساتھ ساتھ زمان کا شعور بھی رکھتا ہے ... اور کبھی کبھی اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسے عمل پر ، چند ہی لمحوں کے لئے سہی ، قادر ہو جائے جو مکان و زمان کی حدود سے آزاد ہو ۔ یہی آزادی انسانی زندگی کا امتیازی نشان بھی ہے اور منبع حرکت بھی لیکن اس خصوصیت کے باوجود ، بلکہ باوصف ، انسان کے لیے ممکن ہے کہ اس کی زندگی حیوانی ہو بلکہ اس سے بھی نچلی سطح پر — آزادی کی اتنی بڑی قیمت تو دینی ہی پڑتی ہے ۔ اس آزادی سے حد امکان

تک لطف اندوز ہونے کے لیے ضروری تھا کہ انسان نہ صرف اپنے تجارب بلکہ اپنے آبا و اجداد کے تجارب کو اپنی ذات کے اندر نقابلی حوالے اور راہ نمائی کا کام لینے کے لیے محفوظ کرسکتا ۔ اس لازمہ سے انسان مزین ہے : انسان کو حافظے کی قوت ملی ہے اور اس کے ساتھ اسے یہ نعمت بھی عطا ہوئی ہے کہ اگر عمل تنویم سے اس کے حافظے سے اس کی تمام محفوظ یادیں محو کردی جائیں تو بھی اس سے وہ منازل جدا نہ کی جا سکیں جن پر وہ عمل و شعور کے استعمال سے پہنچ چکا ہے ۔ عمل تنویم اس کی شعوری یادیں محو کر سکتا ہے مگر اس کے لاشعور سے اس کے اجداد کے تجربوں کی یادداشتیں ، اس کے معاشرے کے نظریات حیات کے عملی تاثرات کسی صورت بھی محو نہیں کرسکتا ، مٹا نہیں سکتا ۔

فن کار ان سب خصوصیات و اوصاف کا حامل ہوتے ہوئے ایک اور بڑی نعمت سے سرفراز ہے یہ نعمت ، نعمت ہوتے ہوئے بھی ، ایک بہت ہی بڑی ذمہ داری ہے جس کا اگر مناسب دھیان نہ رکھا جائے تو فن کار کی زندگی عذاب ہو جاتی ہے جہنم بن جاتی ہے ۔ فن کار کا حافظہ ، اس کا شعور ، اس کا لاشعور اس طرح رشتوں میں مربوط ہوتے ہیں کہ ہر نیا خیال ، ہر نیا تجربہ ' ارتقا پذیر نظام ' فضائے یاد ' کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے ۔ یہ نظام اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسا ہے کہ زمان و مکان کی حدود کے اندر اجسام کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے : یہ نظام اجرام فلکی کے نظام اور ایٹم کے اندر کے نظام سے مماثل ہے : ہیولے ، سرگرداں ہیولے ، جسم بنتے چلے جاتے ہیں ، نظام کا حصہ بن ، اپنے محور پر قائم ہو ، اپنا سفر شروع کر دیتے ہیں ، ان کی سرگردانیاں ختم ہو جاتی ہیں — ان کی منزلیں ، ان کے سفر کی حدود مقرر ہوجاتی ہیں ۔ اس نظام کا انسان کے خارجی ماحول سے بظاہر بے نظام مگر منظم رشتہ ہے : ہر لحظہ بکھرے ہوئے ، اپنے مرکز سے کٹ کر زمان میں سرگرداں ہوتے ہوئے مناظر : گل کے مزاج میں بھرتی ہوئی خوشبو ؛ مختلف رفتاروں میں رواں رنگ ؛ آفاق سے ابھرتے ، افاق میں گم ہوتے ہوئے رنگ رنگ کے بکھیرو ؛ دن اور رات کے ملاپ سے پیدا ہونے والے دمکتے دھندلکوں سے ابھرے ہوئے نغمے سے ابھرتی ہوئی قوسیں ، ان میں جذب ہوتے ہوئے انسانی جسموں کے خطوط : ان سب کو فن کار کا حافظہ ، اس کا شعور ، اس کا لاشعور اپنے حلقۂ کشش میں کھینچتا رہتا ہے اور کبھی لمحوں میں ، کبھی سالوں میں ، ان ہیولوں کو اپنے نظام کا حصہ بنا لیتا ہے ۔ اس کے برعکس ایک غیر فن کار کا حافظہ اور لاشعور ایک ہوٹل ہے جہاں مسافر آتے ہیں ، پھر نہ جانے کہاں کہاں چلے جاتے ہیں ؛ کچھ مسافر ہوتے ہیں کہ اکثر آتے رہتے ہیں ، دیر دیر تک قیام کرتے ہیں اور چلے جانے کے بعد نہ جانے کیوں لوٹ کر نہیں آتے ۔ جس طرح ہوٹل کے مسافروں کو کسی ایک دیر پا رشتے میں منسلک نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ایک غیر فن کار اپنے تجربوں ، یادوں ، آرزوؤں کو ایک نظام نہیں بنا سکتا ۔

جس انسان کے اندر ایسا نظام پرورش پا رہا ہو اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے نظام کی نوعیت کے لحاظ سے ایک مقررہ مدت کے بعد اس نظام کی حرکت سفر سے پیدا ہونے والی قوتوں کو اس طرح استعمال کر ڈالے کہ وہ اس کے اندر کے نظام سے خارج ہوجائیں تاکہ اس نظام کی پرورش کی رفتار میں رخنہ انداز نہ ہوں ۔ اس کی یہی صورت ہے کہ وہ اپنے خارجی ماحول میں ایسے اجسام تلاش کر لے جن کی یہ قوتیں جان بن جائیں ۔ لازم ہے کہ فن کار ان قوتوں کے جوہر کو پہچان لے اور ان کے لیے جو اجسام انتخاب کرے وہ ان طاقتوں کے جوہر کو گزند نہ پہنچائیں ورنہ احتمال ہوگا کہ جن قوتوں کو جسم جذب نہیں کرسکا وہ پھر فن کار کو تنگ کرنے کے لیے اس کے لاشعور یا شعور میں لوٹ آئیں ۔

صحیح جسم کا انتخاب بہت بڑا جوکھم ہے ۔ ہر قسم کے جسم میں یہ قوتیں جذب نہیں

ہوسکتیں کیونکہ ہر فن کار کے نظام فضائے یاد کی حرکت سے مختلف النوع قوتیں وجود میں آتی ہیں اور ان کے لیے مختلف النوع جسم درکار ہوتے ہیں ، جسم جو ساخت کے اعتبار سے ایسے ہوں کہ جب یہ قوتیں ان کو متحرک کردیں تو ان کی حرکات کے مجموعی تاثر سے ہر اُس انسان کے شعور و حافظہ میں جس کو اس جسم کا قرب حاصل ہو اُس نظام فضائے یاد کا شائبہ ترکیب پا جائے جس سے اُس جسم نے زندگی پائی ہو ۔

فضائے یاد کا نظام اُن تمام نظاموں کا مثل ہے جو کائنات میں کار فرما ہیں ۔ اسی لیے اس نظام کی تخلیقات اپنے اندر ان تمام نظاموں کے شائبے مضمر رکھتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پورے نظام کائنات کا حصہ بن جاتی ہیں ۔ یہ نظام کائنات جب تک وجود میں ہے تب تک اس کے شائبوں کا زندہ رہنا مقدر ہے ۔

نظام فطرت میں جو کچھ ہے ، انسان کی فضائے یاد میں جو کچھ در آ سکتا ہے ، اس کے شعور میں جو کچھ اُبھر سکتا ہے ، جو کچھ اس کے شعور میں چھپا ہؤا ہے ، ان میں سے ہر شے ، ہر خیال ، ہر تصور ، ہر جذبے ، ہر آرزو کا زوج ایک دوسرے سے نا آشنا ، ایک دوسرے کی تلاش میں سر گرداں ہے ۔ فن کار ایسے ہی یتیموں کو زوجیت کے ابدی رشتوں میں باندھ دیتا ہے کہ زوجین زماں کے زینۂ ہیجان پر درجہ بہ درجہ ، طبق بہ طبق ، عالم بہ عالم ، ارتقاء کرتے چلے جائیں — فطرت کی آغوش میں جو کچھ بھی محو خواب ہے اس وقت تک محو خواب رہے گا جب تک فن کار کی فضائے یاد اس کو اپنے حیطۂ نظام میں کھینچ نہ لے اور پھر دھیان کے صد راہوں پر نہ چھوڑ دے کہ ان راہوں پر وہ اپنے زوج کے مد مقابل آجائے ۔ جب بھی دھیان کے صد راہوں پر زوجین کا ملاپ ہوتا ہے فضائے یاد ٹھٹک جاتی ہے ، حرکت ساکت ہو جاتی ہے ، نظام میں خلل آجاتا ہے ، فضا کا سکوت زوجین کو چلنے پر مجبور کر دیتا ہے مگر اب کہ ان کی تلاش کی منزل آ چکی ہے اور نئے سفر کی سمت سے ناآشنا ہیں وہ کچھ دیر چلنے کے بعد پھر رک جاتے ہیں ۔ ان کو راہ دکھانے کی خاطر نظام فضائے یاد اپنی حرکت سے پیدا ہونے والی نسبی قوت کو اُن کا راہ نما مقرر کر دیتا ہے ۔ اب وہ کہ فطرت کی آغوش میں سوئے تھے اور فضائے یاد کے صد راہوں میں جاگ گئے ہیں فطرت کی طرف لوٹ آنے کے لیے بے قرار ہو جاتے ہیں مگر ان میں اتنی طاقت نہیں کہ فضائے یاد کے نظام کی کشش کے حیطہ سے ماوراء جاسکیں ۔ لہٰذا انہیں سانھیوں کی تلاش ہوتی ہے ، ساتھی ملنے شروع ہوتے ہیں تو نظام یاد ان کو کسی جسم کا روپ دکھاتا ہے ، اس جسم کا روپ ان کو اپنی طرف کھینچتا ہے ، اس کھچاؤ سے نظام یاد میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے ، نظام اپنی بقا کے لئے ان ساتھیوں کو اپنی کشش سے آزاد کر دیتا ہے ، یہ ساتھی نظام کے اندر سے اُڑ اُڑ کر جسم میں جذب ہونے لگتے ہیں ، جب ساتھی اس میں جذب ہو جاتے ہیں تو جسم زندہ ہو کر متحرک ہو جاتا ہے اور نظام یاد کی کشش سے ماوراء چلا جاتا ہے ، زماں کی فضاؤں میں محو سفر ہو جاتا ہے ۔

یہ فضائیں انسانی معاشرے پر محیط ہیں لٰہذ معاشرہ ایسے اجسام کو اپنی بقا کے لیے مطیع کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے ۔ یوں فنی تخلیق اور معاشرے میں ایک رشتہ قائم ہوجاتا ہے ۔

ماضی کے فن کار کے لیے اسی قسم کے جسم میسر آ سکتے تھے جن کے استعمال سے اس کا معاشرہ آشنا تھا یا جس قسم کے اجسام کے استعمال پر معاشرے نے حدود نہ لگائی تھیں ۔ اس طرح فن کار پر انتخاب کی بہت سی راہیں بند تھیں جس سے جہاں نقصان تھے وہاں کچھ فائدے بھی تھے ۔ ہمارے عہد میں اس انتخاب پر کوئی حدود عائد نہیں ، فن کار کے لیے تمام ممکن راہیں کھلی ہیں ۔ لہٰذا صحیح انتخاب بہت ہی مشکل ہو گیا ہے اور اس انتخاب میں غلطی کا ، غلطی میں عرصے تک غلطاں رہنے کا ، امکان اور احتمال بھی بڑھ گیا ہے ۔ ان امکانات اور

احتمالات کو مد نظر رکھتے ہوئے جب فن کار اپنے نظام فضائے یاد کے ارتقائی عوامل سے وجود میں آنے والی قوتوں کو اپنے اندر سے خارج کرنے کے لیے ایسا جسم تلاش کرلے جس میں یہ قوتیں اس طرح جذب ہو جائیں کہ وہ جسم متحرک ہو جائے ، نشو و نما کا اہل ہو جائے ، اس کی حرکات کے مجموعی تاثر سے ہر اُس انسان کے شعور و حافظہ میں جس کو اس کا قرب نصیب ہو فن کار کی فضائے یاد کے نظام کا شائبہ مرتب ہو جائے تو اس شائبی ترکیب کو تخلیق کہیں گے - فن کار کی تخلیق ایک غیر منقسم ، بہت ہی مربوط وحدت ہے ، یہ گفتگو کی طرح اپنے اجزا میں تحلیل نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس کو کسی دوسری طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے -

لسانی اجسام دوسرے اجسام سے ایک اعتبار سے اتنے مختلف ہیں کہ اس فرق کو درجہ کا فرق نہیں بلکہ خاصے کا فرق کہنا صحیح ہوگا - لسانی اجسام مرئی ہوتے ہوئے بھی ایسے شفاف ہوتے ہیں کہ اپنے مفہوم میں تحلیل ہو جاتے ہیں - ان میں اعضا کا تعلق عمارت میں اینٹ گارے کا سا نہیں ہے بلکہ اُڑتی ہوئی چنگاریوں کے تسلسل ، فضا میں مسلسل بھک سے اُڑتے ہوئے ، جذب ہوتے ہوئے شعلوں کے تسلسل کا سا ہے : اینٹوں کی طرح اس کے اجزا کی حدود نہیں ہوتیں کہ اینٹ کے ساتھ اینٹ جمائے چلے گئے ؛ معنی شعور میں شعلوں کی مانند چمکتے ، تھرکتے ، ایک موہوم سی لکیر بناتے ہوئے اُبھرتے ہیں اور لاشعور میں جذب ہوتے چلے جاتے ہیں - لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ انفرادی حیثیت سے لسانی اجسام کے اعضاء کے معنی کا نہ صرف تعین ہو سکتا ہے بلکہ یہ ان کا خاصہ ہے — ایک تصویر میں انفرادی حیثیت سے لکیر، قوس ، زاویے ، روشنی اور سائے کے معنی کا تعین ممکن ہی نہیں ہوتا : یہی حال موسیقی میں انفرادی اصوات کا ہے -

فن کار کو یہ دونوں حیثیتیں مد نظر رکھنی پڑتی ہیں - جب الفاظ ایک خاص آہنگ میں ، ایک خاص رفتار سے مربوط ہوں تو ان میں انفرادی طور پر معنی ہونے کے ساتھ ساتھ صوتی رفتار ہونے کے سبب ہر لفظ کے معنی میں فرق پیدا ہو جاتا ہے اور اس فرق کو الفاظ کی انفرادی حیثیت سے متعین نہیں کیا جا سکتا - یوں الفاظ کی ترتیب سے پیدا ہونے والی رفتار کے آہنگ سے وہ تمام انسانی تجارب جن کی الفاظ انفرادی حیثیت سے نشان دہی کرتے ہیں نئے نئے رشتوں میں مربوط ہو جاتے ہیں - اس طرح لسانی اجسام اپنے اعضاء کی انفرادی حیثیت سے معاشرے کی زندگی سے متعلق ہوتے ہوئے بھی جسم کی حیثیت سے معاشرتی زندگی سے الگ زندگی کے حامل ہو جاتے ہیں — اور ان کا الگ ہونا ناگزیر ہے — یہی ان کے خلق جدید ہونے کا ثبوت ہے -

جب زبان ابھی پاؤں چل رہی تھی تو الفاظ محسوس اشیا کے نام تھے اور بس - یہ اور بات کہ تب انسان کے لئے اشیا ایک دوسرے سے جدا جدا نہ تھیں ، ہر شے کی اسٹ محدود نہ تھیں ؛ جذبہ و تصور الگ تھلگ نہ تھے جیسے کہ اب نظر آتے ہیں - الفاظ کے معنی میں شروع ہی سے شاعرانہ اور بظاہر استعاراتی قدریں مضمر تھیں - بعد میں زبان اور خیال کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ یہ واحد معنی متضاد جوڑوں میں بٹ گئے : مجرد و مجسم ، مخصوص و عام ، معروضی و موضوعی - اپنی فطرت کے اعتبار سے زبان میں جنم ہی سے وحدت اور کثرت کے اصول جاری و ساری ہیں - الگ الگ اشیا میں جو رشتے استعارے کے ذریعے سے سمجھ میں آتے ہیں وہ کبھی فوری محسوس ہو جانے والے حقائق تھے ؛ ایسے ہی حقائق شاعر

اپنی محنت سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔

جب کسی ایک لفظ (الف) کو جو اپنی عام حالت میں کسی خاص شے یا خیال کی نشان دہی کرتا ہے اس طرح استعمال کیا جائے کہ وہ کسی دوسرے ہی خیال یا شے (ب) کی نشان دہی کرے اور وہ شے یا خیال اس سے اپنی خاصیتوں میں اتنا الگ ہو کہ دونوں کے امتزاج سے جو مرکب خیال (لا) بنے اس میں دونوں خیالوں کی تصوری ہستی جذب ہو جانے کے باوجود قائم رہے تو اس سارے عمل کو اور اس کے نتیجے کو استعارہ کہیں گے۔ اس استعارے کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے گردا گرد معنی کا ایسا نظام بنایا جائے جو (الف) اور (ب) کو اپنے اپنے مقام پر اس طرح قائم رکھے کہ دونوں متمیز رہیں ، ایک دوسرے کو منور کرتے رہیں اور اپنے لغوی مفہوم میں گم نہ ہو جائیں۔ اس نئے نظام میں جب ہر لفظ اپنے نئے اور عام معنی کو قائم رکھے ہوئے ایک دوسرے میں جذب ہو کر نئی قدر حاصل کر لیتا ہے تو ایک لسانی جسم تخلیق ہو جاتا ہے۔

دو مختلف لفظ ایک دوسرے کی نشان دہی اسی وقت کرنے کے اہل ہوں گے جب ان خیالوں یا اشیا میں مماثلت ہوگی جو ان لفظوں میں جلوہ گر ہوں۔ یہ مماثلت ہر حال میں رفتار و تناسب پر مبنی ہوگی کیونکہ ہر شے اور ہر خیال رفتار و تناسب کے باہمی عمل سے یا اس عمل کی تجرید سے وجود میں آتا ہے۔ لہذا ہر وہ لفظ ہر اس لفظ کی نشان دہی کے لیے استعمال ہو سکتا ہے جس میں رفتار و تناسب کا باہمی عمل اس عمل سے مماثل ہے جو پہلے لفظ میں مضمر ہے۔ ایسے الفاظ کے ایسے تعلق سے جو نئے رفتار و تناسب وجود میں آئیں گے وہ ان تمام تناسبوں اور رفتاروں کی نشان دہی کریں گے جو ان میں سے کسی ایک سے مماثل ہوں گے۔ یوں ایک استعارہ انسان اور معاشرے کی کئی جذباتی ، تصوری حالتوں کی نشان دہی کر سکتا ہے۔۔۔

کیوں ٹھہر جاتے ہیں دریا سر شام روح کے تار ہلا غور سے سن

دریا کی روانی اور روح کے ارتقائی سفر میں کبھی ٹھہراؤ نہیں آتا مگر جب ایسا وقت ہو کہ روشنی جا رہی ہو ، اندھیرا آرہا ہو تو یوں لگ سکتا ہے کہ دریا ٹھہر گیا ہے ، آمد کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ سر شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی میں ، کم ہوتی ہوئی روشنی میں ، دریا کی سطح پر روشنی اور تاریکی کی حدیں خلط ملط ہو جاتی ہیں اور یوں لگتا ہے کہ روشنی کی آخری حد سے پرے دریا ٹھہر گیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ جہاں دریا کی سطح پر تاریکی کی حد شروع ہوتی ہے وہاں دریا میں ہاتھ ڈال کر اس کی روانی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح روح پر جب تاریکی چھا جائے تو لگتا ہے کہ انسان کی ، معاشرے کی موت کا وقت قریب ہے مگر ایسا نہیں ہوتا۔

یاس کی چھاؤں میں سونے والے جاگ اور شور درا غور سے سن

استعارے کا یہی کام ہے کہ کائنات اور انسان کے اندر جو کچھ ہے ان کے لیے زوجیں کا رشتہ قائم کرے۔ دریا کی روانی اور روح کا سفر اب ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے زوجین ہیں۔

ہمارے یہاں غزل وہ صنف ہے جس میں تخلیق کا سواد خالص لسانی ہے۔ آواز ، لہجہ ، آہنگ ؛ قافیہ و ردیف ، لفظی تکرار ؛ الفاظ میں خیالات ، جذبات ، تصورات ، احساسات ،

مناظر کو پکارنے ، للکارنے اور حاضر کرنے کی قوت کے باھمی روابط سے غزل تخلیق ھوتی ھے ۔ غزلیہ شاعری زبان کے جذباتی کردار اور لہجے سے اپنا سبھی کچھ لیتی ھے اور یہ اس لیے کہ اس کے پاس تعمیر عمل کے لیے بہت ھی کم مواد ھوتا ھے : ایک خیال ، ایک پر گداز جذبہ ، کسی کیفیت کی ایک جھلک ، ایک نظارے ، ایک خیالی پیکر سے غزل کا تانا بانا تیار کیا جا سکتا ھے ۔ لیکن فرداً فرداً ان میں اتنی جان نہیں ھوتی کہ ایک سے واقعات ، خیالات ، جذبات کے کسی ایک سلسلے کے شائبے کی تخلیق کا تانا بانا تیار کیا جا سکے ۔ الفاظ کے جادو سے غزل جو ' صورت فی الواقعی ' تخلیق کرتی ھے وہ ایک تجربے کی شدت ، ایک جیتے جاگتے خیال کے ایک ابھیمانے ، ایک جذبے کی سبک رفتاری کے سوا کچھ بھی تو نہیں ھوتی ۔ غزل کے اختصاصی لوازمات شاعری کی دوسری اصناف میں بھی نظر آ سکتے ھیں، آتے ھیں، مگر ان لوازمات کو جو اھمیت غزل میں حاصل ھے اور ان کا استعمال جتنا غزل میں ھوتا ھے اس سے غزل کی نوعیت دیگر اصناف سے الگ ھو جاتی ھے ۔ کیونکہ غزلیہ شاعری بڑی طور پر لسانی تخلیق ھے لہذا شاعرانہ اظہار کا مقبول ترین ذریعہ رھی ھے ۔

دوسری اصناف میں ضمیر متکلم کا استعمال روایت سے انحراف کے مترادف ھو سکتا ھے مگر غزلیہ شاعری میں عین روایت ھے ۔ ضمیر مخاطب کا استعمال ھر صنف میں نظر آ سکتا ھے، مگر غزل میں اس قسم کے استعمال سے کسی غیر حاضر شخص سے ذاتی خطاب کا گمان نہیں ھوتا ۔ ایسا خطاب ناصحانہ نہیں بلکہ رسمی ھوتا ھے ۔ غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آ سکتی ھے کہ غزل میں نہ تو خود شاعر خطاب کرتا ھے اور نہ ھی قاری اس کا مخاطب ھوتا ھے ، شاعر غزل میں ایک راوی کی دھندلی سی تصویر تخلیق کرتا ھے اور اس کے ذریعے سے غزل میں شخصی داخلیت تخلیق کرتا ھے جو اس صنف کا اختصاصی تجربی شائبہ ھے ، جو نہ شائبہ کردار تخلیق کرتا ھے نہ عوامی واقعات ۔

فن کار جو کچھ تخلیق کرنے نکلتا ھے ، نہ کہ جو کچھ وہ محسوس کرتا ھے یا بیان کرنا چاھتا ھے ، اس کے فنی اعمال کا تعین کرتا ھے اور مختلف اصناف سخن کے قیام کی طرف فن کار کی راہ نمائی کرتا ھے ۔ جو نقاد فن اور تخلیق میں اس مقصد کو مد نظر نہیں رکھتے وہ ضمیر کے استعمال سے غلط راہ پر چل نکلتے ھیں ۔ فن میں ضمیر کے وھی معنی نہیں ھوتے جو گفتگو میں ھوتے ھیں ۔ جہاں غزل میں ' تو ' کا لفظ نظر آیا انھوں نے سمجھا کہ محبوب یا قاری سے خطاب ھے اور جہاں فعل حال کا استعمال نظر آیا سمجھ لیا کہ شاعر اپنے لمحاتی خیالات اور جذبات کا اظہار کر رھا ھے ۔ اگر نقاد حالت فعل اور اس کے ادبی استعمال کا بغور مطالعہ کریں تو انھیں شاعرانہ تخلیق کو سمجھنے میں انکشافی مدد ملے — فعل کی حالتوں کا استعمال ادبی صناعیوں کا پتہ دیتا ھے جو ادب کے حقیقی عرصہ کو عیاں کرتا ھے ، وہ عرصہ جس میں زندگی کا شائبہ تخلیق کیا جاتا ھے — ایسی صناعیوں میں فعل حال کا استعمال سب سے لطیف اور پر اسرار ھوتا ھے ؛ اس سے اعمال اور واقعات کی صورت حال کے بیان کے علاوہ بھی بہت سے کام لیے جا سکتے ھیں ۔

غزل میں عموماً ایک محدود واقعے ، ایک محسوس خیال ، ایک پر خیال جذبے ، کسی شے یا اس کے متعلق تصویر یا عطر سیرت کا شائبہ تخلیق کیا جاتا ھے ۔ اس کا تانا بانا واقعات سے نہیں ماجرائے خیال سے بنا جاتا ھے ۔ دھیان غزل کی بنیاد ھے جو نہ پیش کیے گئے جذبات کا نہ صرف محرک ھی ھوتا ھے بلکہ ظرف بھی ھوتا ھے ... اور صیغۂ حال دھیان کی فطری حالت ھے ۔ تصورات بے قید زماں ھیں : غزل میں تصورات گذر نہیں چکے ھوتے بلکہ فی الواقعی گذر رھے ھوتے ھیں یا جو رشتے ان کو مربوط رکھتے ھیں وہ زماں سے آزاد ھوتے ھیں ! غزل شخصی تجربے کی تخلیق ھے اور ان کی حالت ' بے قید زماں ' حال کے سوا کیا ھو سکتی ھے ؟ غزل

ایک تاثر یا تصور کو ایک جاوداں حال میں تجربہ بنا کر پیش کرنے کا ہنر ہے اور یوں ایک غزلیہ شاعر ایک مجسم حقیقت کا احساس تخلیق کر دیتا ہے جو ابدی ہے ، جس میں سے زماں کو منسوخ کر دیا گیا ہے ۔

بعض یادوں کی نمایاں خصوصیت یہی ابدیت ہے ۔ اداسی اور دیوانگیٔ بہار کی طرح بہت سی کیفیت کی دنیا کسی خاص موقع سے متعلق نہیں کی جا سکتی ۔ ایسا تجربہ ہمیشہ کے لیے شعور سے آشنا ہو جاتا ہے اور یادداشت میں جب بھی ابھرتا ہے وضاحت ، روشنی ، تازگی لیے ہوتا ہے ۔ حالانکہ زندگی میں واقعات کا رنگ روپ کچھ دیر کا ہوتا ہے ، غیر واضح ہوتا ہے ؛ ہمارے گرد و پیش کا ماحول بدلتا رہتا ہے ۔ وقت گذرتا رہتا ہے ، انسانی اور غیر انسانی طاقتیں ہمارا راستہ کاٹتی رہتی ہیں ، ہمیں للکارتی رہتی ہیں ۔

غزلیہ شاعر تجربات کا روپ ، بیتے ہوئے محسوس کئے ہوئے واقعات کے مثل تخلیق کرتا ہے اور ان کو اس طرح مجسم کرتا ہے کہ ایک شدہ اور مکمل بیتی ہوئی واقعیت کا شائبہ تر کیب پا جائے ، ایک 'سیرت فی الواقعی' انکھوں کے سامنے پھر جائے ۔

تیری زلفوں کے بکھرنے کا سبب ہے کوئی
آنکھ کہتی ہے ترے دل میں طلب ہے کوئی
آنچ آتی ہے ترے جسم کی عریانی سے
پیرہن ہے کہ سلگتی ہوئی شب ہے کوئی
ہوش اڑانے لگیں پھر چاند کی ٹھنڈی کرنیں
تیری بستی میں ہوں یا خواب طرب ہے کوئی
گیت بنتی ہے ترے شہر کی بھرپور ہوا
اجنبی میں ہی نہیں تو بھی عجب ہے کوئی
لیے جاتی ہیں کسی دھیان کی لہریں ناصر
دور تک سلسلۂ تاک طرب ہے کوئی

شاعر نے پہلے شعر میں ایک راوی اور راوی کے جذبات اور آرزوؤں کے پیکر خیال کی دھندلی دھندلی تصویریں اجاگر کی ہیں ۔ راوی اپنے پیکر خیال سے محو کلام ہے ۔ یہاں قاری کی حیثیت محض ایک تماشائی کی ہے ۔ وہ راوی کی سرگوشی کو ، پکار کو ، وحدی الحان کو سن سکتا ہے مگر دم بہ خود رہ کر ، اسے دخل کا کوئی حق نہیں ۔ شاعر نے دونوں کی جنس کو غیر واضح رکھا ہے مگر یہ سمجھ لینے میں کوئی قباحت نہیں کہ ایک مرد ہے اور دوسری عورت ۔ سیاہ و سرخ لباس میں ملبوس جسم کے تصور سے حدت محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس کا لباس اس کے جسم کے رنگ ، روپ ، خطوط کو طالب کی نظر سے چھپاتا نہیں ۔ پیرہن کے لیے شب اور وہ بھی سلگتی ہوئی شب کی تشبیہ استعمال کی ہے اور ملبوس جسم کو عریاں کہا ہے ، اس کی عریانی سے آنچ پیدا کی ہے ؛ یوں غور سے دیکھیں تو جسم و پیرہن کے ملاپ سے پیدا ہونے والی عریانی کو ہی سلگتی ہوئی شب کہا ہے ؛ اور یوں تشبیہ میں اپنے سیاق و سباق کے التزام سے تشبیہ رہتے ہوئے بھی استعارے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے ۔ تخیل کی داخلیت کو تشبیہ و استعارہ کی خارجیت میں مدغم کر کے داخلیت اور خارجیت کا امتیاز مٹا دیا ہے ۔ اسی تاثر کو قائم رکھتے ہوئے اور قائم رکھنے کی خاطر پہلی داخلی کیفیت سے نئی داخلی کیفیت کو ابھارا ہے ؛ اس کیفیت کے لیے چاند کی ٹھنڈی کرنوں کا استعارہ استعمال کیا ہے اور پھر اسی کیفیت کو ایک نئی خاصیت عطا کی ہے کہ مطلوب کی بستی ہے یا خواب طرب ہے ؛ ایک کیفیت کو خارجی مقام بخشا ہے اور پھر اس مقام کو ایک نئی داخلی کیفیت میں جذب کیا ہے ۔ تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ دوسرے شعر کی تمام کیفیات کے لیے ایک استعارہ ہے ؛ اس استعارے کو ایک نئے استعارے میں جذب کیا ہے ؛ ان دونوں نے ایک تیسرے استعارے میں جنم لیا ہے ۔ (زماں اپنے تمام لوازمات سمیت مناظر میں جذب ہو رہی ہے ۔) خواب طرب ایک منظر میں ڈھلتا ہے ؛ داخلی اور باہمی رشتوں کو رشتوں کے ایک بہت بڑے نظام سے منسلک کرنے کی خاطر شاعر طالب کو مطلوب کے شہر میں لے آیا ہے جہاں وہ اجنبی ہے ، جہاں ہوا بھرپور ہے اور

چلتی ہے تو گیت بنتی ہے ۔ گیت بننے والی بھرپور ہوا کے استعارے میں کیا کیا کچھ جلوہ گر نہیں : موسم ، سماں ، وقت ، داخلی کیفیات ۔ انہی کیفیات کے آہنگ سے ذہن اور تخیل میں ایک نئی زندگی کے تصور نے جنم لیا ہے : اس کو شہر و قریہ ایک وسیع و عریض باغ نظر آتا ہے ۔ غزل کے مکمل ہوتے ہی غزل کے راوی کی شخصیت کی تصویر میں پورے رنگ ابھر آتے ہیں ۔

شاعر نے لہجے ، الفاظ کی آوازوں کے پورے پورے پھیلاؤ ، بعض الفاظ بلکہ ان کے حروف کی صوت ، الفاظ کے معنی سے زیادہ الفاظ کی تخئیل جگانے کی قوت کے استعمال سے جو طلسم باندھا ہے اس میں صوت و معنی گم ہو گئے ہیں ، ہر لفظ بطن نظارہ بن گیا ہے ، ان سب کے باہمی عمل سے نظاروں کے سلسلے نے جنم پایا ہے ، ان نظاروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ۔

جب اس ننھی منی ، پیاری پیاری صنف سخن سے نظر ہٹا کر دوسری اصناف کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ایک نیا عنصر ، حکایتی بیان ، نظر آتا ہے ۔ غزل اس عنصر سے نا آشنا تو نہیں ، غزل میں اس کی حیثیت ضمنی ہے مگر دوسری اصناف میں یہ عنصر غالب ہوتا ہے ۔

وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

غزل کے اس شعر میں حکایتی بیان کا عنصر ہے تو مگر اس کا کام اتنا ہے کہ ایک محل ، ایک حالت ، ایک تصور سے روشناس کراتا ہے ۔ مگر جب بیان کسی صورت شعری کی بنیادی خصوصیت ہو تو اس میں کہانی کا عنصر شامل ہو جاتا ہے ۔ اس نئے عنصر سے اس خیال کی ہیئت بدل جاتی ہے جو ایسی صورت میں کارفرما ہو ۔ غیر ذاتی حوادث کا بہاؤ شاعرانہ شئے کا نہایت مضبوط تانا بانا ہے ؛ یہ بہاؤ اس صورت کا بنیادی نقشہ بن جاتا ہے اور ادبی تخلیق کے دوسرے لوازمات کو متاثر کرتا ہے اور ان پر چھا جاتا ہے ۔ ذاتی خطاب جو کہ غزل میں محض ایک خطیبانہ ترکیب ہے کہانی میں عمل بن جاتا ہے جب کہ ایک شخص دوسرے شخص سے مخاطب ہو ۔ تشبیہ و استعارہ اکثر غزل کا اہم جوہر ہوتے ہیں اور یوں لگ سکتا ہے کہ خیالات کے آزاد تلازم نے ان کو جنم دیا ہے ، ایک نظارہ دوسرے نظارے کو جنم دیتا چلا گیا ہے — جیسا کہ اس غزل میں ہے جسے اوپر درج کیا گیا ہے — ، مگر بیانیہ شاعری میں ان کی اہمیت اور آزادی کم ہو جاتی ہے ، وہ عمل کی ضرورتوں کے تابع ہو جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔ اگر ایسا نہ ہو تو فن پارہ اپنا نامیاتی کردار کھو بیٹھتا ہے اور نامیاتی کردار ہی سے شاعری فطرت کا حصہ معلوم ہوتی ہے حالانکہ اس میں ہر شے طبیعی لحاظ سے نا ممکن ہوتی ہے ۔

فعل کی حالت کا حال سے ، جو غزلیہ شاعری کا معمول ہے ، ماضی مطلق میں ، جو کہ کہانی کا خاص فعل ہے تبدیل ہو جانا نفوذ کے اعتبار سے کسی ادب پارے ہر بیان کے گہرے اثر کو عیاں کرتا ہے ۔ چونکہ ادب کا معتدبہ حصہ بیانیہ ہے اس لئے افسانوی ادب میں ماضی مطلق کا استعمال بہت عام ہے بلکہ اتنا رچا ہوا ہے کہ اس کا جواز پیش کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی جب تک کہ ہم اس بات پر غور نہ کریں کہ خواب بیداری ، میں جس کو عموماً ادب کا محرک سمجھا جاتا ہے ، جو کچھ بھی نظر آتا ہے اس کو بیان کرنے کے لیے فعل حال کا استعمال ہو گا ۔ خواب بیداری بچوں کے کھیل کی طرح محض جھوٹ موٹ کا کھیل ہے ؛ بچے ہر کھیل کو اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں مگر ایک

کہانی زندگی کی کشمکش کی طرح هم پر بیت نہیں جاتی ؛ اگر ایسا هوتا تو کہانی میں بھی فعل کی حالت حال هؤا کرتی ۔ ادب کتنا هی عجیب و غریب ، جدیلا یا مثال خواب کیوں نه هو کبھی واقعهٔ حیال نہیں هوتا ۔

ادب میں حیات فی الواقعی همیشه ایک مکمل صورت ، ایک تجربی وحدت هوتی هے جس میں هر عنصر چاهے وه کتنا هی متفرق اور متلون نظر آئے ایک دوسرے سے نامیاتی طور پر مربوط هوتا هے ۔ یہی تلون اور تفرقه ایک مجموعی تاثر هے جو ایک فی الواقعی سوانح ، سیرت یا تاریخ کے تمام تر واقعات کا ڈهانچ هونے کا شعور چاهتا هے ۔

واقعاتی تجربے کی کوئی محدود صورت نہیں هوتی لہذا شکسته اور چٹیل هونے کی وجه سے هر تجربه ایک هی سطح پر دکھائی دیتا هے ؛ جبھن اور بلندان هم پله نظر آتے هیں ؛ تدریج اور تکمیل آرزو هم درجه معلوم هوتے هیں ۔ حافظه هر تجربے کو ایک امتیازی طرز عطا کرتا هے جس کی وجه سے اس تجربے کو سمجھا جا سکتا هے اور اس کی قدر کی جا سکتی هے ، جو بیت چکا هے اس کو کردار و صورت عطا کرتا هے ، همارے احساسات میں بعد میں آنے والے واقعات کے زیر اثر ترمیم کرتا رهتا هے اور شعور کو منظم کرتا رهتا هے : حافظه هی یه شعور پیدا کرتا هے که ماضی مکمل طور پر قائم کیے هوئے واقعات کا ڈهانچ هے جو زمان و مکان میں جاری هے اور مسلسل علت و معلول میں بندها هوا هے ۔ ایسے هی شعور کو تاریخی شعور کہیں گے ۔ کسی واقعه کا یاد آنا اس کا دوباره تجربه کرنے کے مترادف هے مگر یه تجربه اسی طرح نہیں هوتا جس طرح پہلی بار هؤا تھا ۔ یاد ایک مخصوص قسم کا تجربه هے کیونکه یه منتخب واقعات سے مرکب هے ۔ اس کے برعکس واقعاتی تجربه نظاروں ، آوازوں ، حدیوں وغیره پر مشتمل ایک افراتفری کا عالم هے ۔

ادب حافظے کی طرز پر استوار کیا جاتا هے اور تجربی افراتفری کے عالم کا مثل نہیں هوتا ۔ اس کا یه مطلب نہیں که ادب کا تانا بانا خالق کی اپنی یادوں سے بنا جاتا هے (ایسا بھی هوسکتا هے) یا کسی اور کی یادوں سے (یوں بھی هو سکتا هے) ؛ جس طور پر واقعات ظاهر هوئے هیں وه طرز مکمل شده واقعات یعنی ماضی کی سی هوتی هے مگر اس فرق کے ساتھ که اس میں جو وحدت هوتی هے وه واقعیت میں کسی آدمی کے سوانح میں نہیں هوتی کیونکه همارا ماضی محض تجربی نہیں ، هماری زندگی بیتے هوئے واقعات کا مجموعه نہیں ، اس میں هماری سوچ ، همارے نظریات اور نه جانے کیا کیا شامل هوتا هے ۔ افسانوی ادب میں یادداشت فی الواقعی کے سوا کچھ نہیں هوتا ؛ زندگی کا شائبه اول سے آخر تک تجربی هوتا لازمی هے ۔ شاعری کا تخلیق کیا هؤا عالم احساسات میں محدود هے ، هر واقعه علت و معلول کے رشتوں میں جکڑا هے ، امید و محرومی ، تکمیل و حیرانی کا محرک هے ۔

لہذا بیان هر حالت میں یادداشت کا شائبه هوتا هے ، ایسی یادداشت کا جو هم جنس هے ، همه گیر هے ، معروضی هے ، غیر ذاتی هے ۔ جب بیان قاری یا سامع کے لیے هو تو زبان کے تمام لوازمات اس مقصد کے لیے استعمال کیے جاتے هیں که ایک فی الواقعی ماضی کا شائبه ترکیب پا جائے جس میں هر واقعه اور تجربه تکمیل کو پہنچ چکا هو ۔ ایسے شائبے کے قیام کے لئے ضروری هے که فعل کا صیغه ماضی مطلق هو یا ماضی بعید ۔ جب واقعات سیاق و سباق کے ساتھ بیان کیے جائیں تو ماضی کے صیغوں کا استعمال ناگزیر هے مگر شاعرانه بیان کے اور هی مقاصد هوتے هیں ؛ شاعر کا یه مقصد نہیں هوتا که بتائے کیا هؤا اور کب هؤا بلکه آپ بیتے هوئے ، محسوس کیے هوئے واقعات کا اس طرح شائبه تخلیق کرتا هے که ایک تکمیل شده یادداشت معلوم هو ۔ اسی لئے فعل کے صیغوں کو محض تجربوں کو نام دینے

یا ان کے سیاق و سباق کا تعین کرنے کے لیے استعمال نہیں کرتا بلکہ ان کے ذریعے سے فی الواقعی تجربوں کی صورت گری کرتا ہے ۔ لہذا جب بھی بیانیہ شاعری میں صیغۂ حال کا استعمال ہو گا تو اس سے داخلی تاریخ یا سوانح کے اختتام کو عیاں کرنا یا دھیان کے سفر کو زماں سے آزاد ظاہر کرنا یا پھر واقعات کے بہاؤ کی تیزی کا احساس کرانا مقصود ہوتا ہے ۔

اگر یہ نہ بھولا جائے کہ جو کچھ شاعر لکھتا ہے وہ صرف فی الواقعی کی تخلیق میں ضرب کلمی کا کام کرتا ہے تو یہ سمجھ لینا کچھ خاص مشکل نہیں کہ کسی صنف سخن کی اختراع کا مقصود یہی ہے کہ ادیب یا شاعر کسی مخصوص تکنیکی اصول کے استعمال اور اس کے اثر سے مروجہ مواد اور طریقوں کی شاعرانہ صلاحیتوں سے زیادہ کام لینا چاہتا ہے ۔ چونکہ حکایتی بیان کے استعمال سے ایک نظم کو وجود میں لانے کے لیے سیدھا سادا لہجہ اور چست مصرعے کافی ہیں اسی لیے مثنویوں میں خیال اور احساس کی وہ گرمی نظر نہیں آتی جو غزل میں نظر آتی ہے ۔ مثنوی میں ارتکاز کے بجائے وسعت ہوتی ہے ، اس کی روانی کو تیز کرنے کے لیے واقعات میں تسلسل ہوتا ہے اور کہانی کی وضاحت کو قائم رکھنے کے لیے اس کو مختلف حصوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے ، صرف شعر کے دو مصرعے ہی ہم قافیہ ہوتے ہیں اور غزل کے بر عکس ردیف کی پابندی آڑا دی جاتی ہے --- کہانی کی روانی میں کسی بات کو حائل ہونے نہیں دیا جاتا ۔

مہارت اور مشق سے کہانیوں میں وسعت پیدا ہوتی گئی ، واقعات پیچ دار ہوتے چلے گئے ، ایک ہی کہانی میں کئی کئی کہانیوں کو ملا دیا گیا ، ایک ہیرو کے بجائے نئی نئی ہیرو ایک ہی مسلسل کہانی در کہانی میں سموئے گئے ۔ کہانی کا یہ نیا روپ داستان کہلایا ۔ داستان میں منظر نگاری کی بھی گنجائش نکال لی گئی مگر اس کی ضرورت آرائشی نہ تھی بلکہ اس سے کہانی میں تیسرا بعد پیدا کیا گیا ۔ منظر نگاری سے کہانی کی رفتار ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور اس میں پھیلاؤ پیدا ہونے کا گماں ہونے لگتا ہے ۔ واقعات ، منظر نگاری اور کرداروں کے باہمی اثر سے داستان میں ایک نیا عنصر شامل ہو گیا : کرداروں کے باہمی تعلقات کا بیان لازمی ہو گیا ۔ داستانوں میں جب کسی کردار کی ضرورت نہیں ہوتی تو کردار اس منظر میں چلا جاتا ہے کیونکہ پس منظر اسی لیے بنایا جاتا ہے ۔ جن پریوں کی کہانیوں کے مصنوعی نیچری ماحول کے بر عکس داستانوں میں واضح طور پر سماجی ماحول ہوتا ہے ۔ ایسے انسانی ماحول میں لازم ہے کہ کردار ایک دوسرے کا رشتہ کاٹیں ، ان کے اعمال دوسروں پر اثر انداز ہوں ۔ داستانوں کے کرداروں کی شخصیت نہیں ہوتی صرف حسب و نسب ہوتا ہے ، سماجی مقام ہوتا ہے ۔ ان کا کردار ہر دم ، ہر حال ایک سا رہتا ہے ۔ یہ اس لیے نہیں کہ داستان گو کردار نگاری نہیں جانتا بلکہ اس لیے کہ داستان کے اصلی کردار مرد اور عورت نہیں بلکہ ایسا معاشرہ ہوتا ہے جس میں عظیم معرکے وجود میں آ سکتے ہوں جو معاشرے کی ساخت میں فرق نہ ڈالیں ۔ لہذا ایسی رومانوی دنیا میں ایسے کرداروں کی قطعاً ضرورت نہیں جن کی شخصیت ہو ۔

اس صنف کا سارا نیاپن اور زور کارہائے نمایاں کے حکایتی بیان میں ہے ۔ ایک ایک واقعہ کے مفصل بیان سے جانے پہچانے اعمال نیا روپ اختیار کر لیتے ہیں ۔ منظر نگاری کی تکنیک داستان کے ایک سلسلۂ واقعات کو روک کر دوسرے سلسلے رواں رکھتی ہے ۔ اس سے فی الواقعی تجربے میں ایک لطیف سی ٹیڑھ آ جاتی ہے جس سے یوں لگتا ہے کہ پس منظر میں واقعات ہو رہے ہیں ، زندگیاں بیت رہی ہیں ، ایسے واقعات جن کا تعاقب نہیں کیا جا رہا کسی وقت بھی پس منظر سے ابھر کر سامنے آ سکتے ہیں ۔ چونکہ واقعات کے رکاؤ ہمیشہ عام زندگی کے مثل نہیں ہوتے ، ایسی جگہ نہیں آتے جہاں عمل فطری طور پر رک گیا ہو اس

لیے گماں ہوتا ہے کہ منظر نگاری کی تفصیلات آرائش بیان سے سوا کچھ نہیں — ایسا نہیں ہے! منظر نگاری کی طوالت ہی تو داستان کی جان ہے۔ چونکہ یہاں واقعات کی بیانی ترتیب ہی سب سے بڑی ترکیب ہے لہذا حکایتی دلچسپی کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ باوجودیکہ داستان نہ صرف واقعات بلکہ مہمات تک مخصوص ہوتے ہیں پھر بھی داستان گو کے پاس دلچسپی پیدا کرنے کے بہت سے ذرائع ہوتے ہیں۔ جب چاہے، جہاں چاہے، محاکاتی بیان میں حکایتی عنصر پیدا کر لے، ضمنی کرداروں، مہمات کا اضافہ کر لے اور سب سے بڑھ کر حسن و عشق کے ذکر سے وہ داستان میں گرمی، شوکت اور سحر پیدا کر سکتا ہے۔

جب داستان گو کو یہ سب کچھ میسر ہو تو آسے موزوں کلامی کے سحر کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے پاس شاعرانہ شائبے کو برقرار رکھنے کے لیے اور اس کو اظہاری صورتیں عطا کرنے کے لیے بہت سے ذرائع ہوتے ہیں۔ لہذا بحور و قوافی کا استعمال روایت بن کر رہ جاتا ہے۔ جب داستانیں سنانے کے بجائے لکھی جانے لگیں تو سماعی سہاروں کی ضرورت نہ رہی؛ وزن، بحر، قوافی کو داستانوں سے رخصت کر دیا گیا؛ داستانیں نثر میں لکھی جانے لگیں۔

آج ناول کو وہی اہمیت حاصل ہے جو شبانی دور میں رزمیہ کو، سامنتی دور میں داستان کو حاصل تھی اور یہ ہماری ذہنی زندگی میں وہی کام انجام دیتا ہے جو کبھی داستان یا رزمیہ انجام دیتی تھی۔ رزمیہ، غزلیہ شاعری اور داستان کے تمام اوصاف و خصوصیات نئے رابطوں اور رشتوں میں ڈھل کر ایک نئی لسانی مخلوق کے اعمال کے ذریعے سے اپنے امکانات کو مشہود کر رہے ہیں۔ ناول انسان کی، معاشرے کی، بدلتی شخصیت کے شائبی اظہار کا سب سے لطیف، پر اثر اور پر زور طریق بن چکا ہے مگر اس کے متعلق ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نئی مخلوق نے اپنی تمام صلاحیتوں اور امکانات کو مشہود کر لیا ہے۔ انسانی ذہن اور تخیل کے آفاق کی حدود وسیع تر ہونے کے ساتھ ساتھ، انسان اور معاشرے کی شخصیت کا تصور بدلنے کے ساتھ ساتھ ناول کے نامشہود امکانات اظہار پا کر اسے شائبی عالم میں اس رتبے پر پہنچا دیں گے جو کائنات میں انسان کو حاصل ہے۔

ناول چونکہ شائبی تخلیق ہے اس لیے اس کو معاشرتی عوامل کا پرتو، تصویر یا معاشری رپورٹ یا دستاویز یا ناول نگار کے ذاتی مسائل، آرزوؤں، تجربوں کا مرتب و مربوط بیان سمجھنا ناول کے وجود کے مقصود کا غلط اندازہ ہے۔ ناول کے فرضی کردار قاری کو ایک ایسے بیان کی طرف متوجہ کرنے کے لیے خطیبانہ چال نہیں جس کو اگر مدلل مبحث کے طور پر پیش کیا جائے تو قاری بحث کے لئے تیار نہ ہو؛ یہ بھی نہیں کہ ناول عصری مسائل کو ایک انسانی زندگی کی مثال دے کر سمجھانے کا ذریعہ ہو۔ اگرچہ ناول سے ایسے کام لینے کی بھی کوششیں کی گئی ہیں مگر یہ کوششیں تخلیق کا درجہ حاصل نہیں کر سکیں کیونکہ شائبے کے عالم میں حیات امر واقعی پنپ نہیں سکتی۔ اس قسم کی کوششیں اس مغالطے کی وجہ سے کی جاتی ہیں کہ گفتگو اور ناول میں لسانی اجزا استعمال ہوتے ہیں حالانکہ گفتگو کا مقصد صرف لوگوں سے اطلاعات کا تبادلہ کرنا ہوتا ہے اور ناول نگار ایسے فی الوقعی تجربے کو خلق کرتا ہے جو انسانی احساس اور جذبے بلکہ حیات انسانی کی فطرت کا مظہر ہو۔

ایک شاعر کی طرح ناول نگار ایک بیتی ہوئی، محسوس کی ہوئی زندگی کا اس طرح شائبہ

بنتا ہے کہ یادداشت معلوم ہو مگر ایسی یادداشت جس سے ذات کو تطہیر کرلیا گیا ہو ، جو معروضی ہو۔ وہ شائبے کو اتنا قابل قبول بناتا ہے کہ شائبہ واقعیت سے کتنا ہی دور کیوں نہ ہو حقیقت معدوم ہوتا ہے ؛ ناول کا حقیقت معلوم ہونا ہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے ۔ ایک کہانی سے جو احساس پیدا ہو سکتا ہے وہ ایک واقعی تجربے سے پیدا ہونے والے احساس سے واضح اور یقینی ہو سکتا ہے ۔ عام انسانوں کی زندگی شعور پر اثر انداز ہوئے بغیر بھی گزر سکتی ہے مگر ایک قاری کا شعور کبھی خواب آلود نہیں ہونا چاہیے ۔ قاری کے دھن میں جو شائبہ بھی ابھارا جائے وہ کبھی ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کسی واقعہ یا ایسے شخص کی زندگی پر منطبق ہو جائے جو واقعی ہو ۔ ادب کے حقیقت معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ فن کار کے لیے ادب کی مفروضی حیثیت کا قائم رکھنا بہت بڑا مسئلہ ہے ؛ زندگی اور فن الگ الگ ہیں اور فن کار دونوں کے فرق کو قائم رکھنے کے لیے کئی طریقے استعمال کرتا ہے ۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ ناول اور کہانی میں واقعات اگر کسی کردار کے دیکھے ہوئے ہونے کے بجائے سنے سنائے ہوں ، اور وہ بھی کسی اور سے سنے ہوئے ہوں تو ان کی حقیقت پر ایمان لانا آسان ہو جاتا ہے ۔ عام زندگی میں سنی سنائی بات مشاہدے کے ہم پلہ نہیں ہو سکتی ۔ ایسا کیوں ؟ اس لیے کہ جب کردار سنے سنائے واقعات دھراتے ہیں تو ایسے واقعات تجربی طرز میں ڈھل جاتے ہیں جس سے ان کی جوہراً ادبی صورت یقینی ہو جاتی ہے ۔ کسی کردار کے واقعات دھرانے سے کہانی میں ان واقعات کے مستند ہونے کا گمان تو نہیں ہوتا مگر ان کی شاعرانہ قلب ماہیت ضرور ہو جاتی ہے ؛ یادداشت اس واقعہ کو بھی مفروضے میں ڈھال دیتی ہے ۔

ایک ہی کردار کی زبانی گزرے ہوئے واقعات بیان کرانے کا طریق نہ صرف منتشر اور طویل سوانح کو جمع اور مختصر کرنے میں مدد دیتا ہے بلکہ کہانی کے عمل کا ایک جزو بن جاتا ہے ۔ کہانی کی دنیا میں سمت معین کرنے میں یہ طریق جو مدد دیتا ہے اس سے یہ روایت بن گئی ہے کہ ایک ناول میں حوادث ایک ہی کردار کے تاثرات اور اندازوں تک محدود کر دیے جائیں ۔ اس طرح کہانی ایک ہی زاویہ نظر سے نظر آتی ہے ۔ اس انداز کی کہانی میں ایک کردار واقعات بیان نہیں کرتا بلکہ وہ واقعات اس پر بیت جاتے ہیں اور ہر واقعہ اسی طرح نظر آتا ہے جس طرح اس کردار کو نظر آ سکتا ہے ، اس سے تناظر کی سی فطری وحدت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس طریق سے ایک کردار کے عالم کل اور ہر جگہ حاضر ہونے کا احساس کہانی کی حقیقت میں قاری کے ایمان کو ڈگمگا سکتا ہے ۔ اس مسئلے کو یوں حل کر لیا جاتا ہے کہ نقطۂ نظر ایک کردار سے دوسرے کردار کو اس طرح منتقل کر دیا جائے کہ تمام سوانحی تاریخ سمجھ میں آ جائے اور تاثر کی وحدت بھی برقرار رہے ۔

جب ناول کے کرداروں کے علاوہ کوئی کہانی کا راوی بھی ہو تو گمان ہو سکتا ہے کہ خود ناول نگار راوی ہے ۔ مگر ناول کے راوی اور ناول نگار میں کوئی تعلق نہیں سوا اس کے کہ ناول نگار کرداروں کے ساتھ اس راوی کا بھی خالق ہے ۔ جب ایسا طریق استعمال کیا جاتا ہے تو ناول نگار ناول کی مفروضیت کو قائم رکھنے کے لیے کنایۃً خود کو ناول کا راوی ظاہر کرتا ہے مگر ایسا کرنا غلط فہمی پیدا کرتا ہے ۔ یہ طریق اس دور کی یادگار ہے جب کہانی کہنے کے بجائے لکھی جانے لگی ۔ اس طریق سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ناول زندگی کے واقعات کی رپٹ یا محض جھوٹ موٹ کا کھیل ہے ۔

ناول کے واقعات فی‌الواقعی ہوتے ہیں جن کا علم صرف فی‌الواقعی لوگوں کو ہوتا ہے ۔ ناول کے عالم کل اور ہر جگہ حاضر رہنے والے راوی کا وجود بھی فی‌الواقعی ہے ۔ کہانی

اگر ادب ہے اور ضمیر متکلم کے ذریعے سے بھی بیان ہو تو بھی 'میں' ناول کا ایک کردار ہے اور بس۔ اگر ناول کا ہر واقعہ مصنف کی اپنی ہی یادوں سے ماخوذ ہو ، ہر کردار کسی زندہ آدمی کی تصویر ہو تب بھی ان واقعات اور کرداروں کی حیثیت ناول میں فرضی ہی ہوگی کیونکہ محض نقل نہیں کرتا ، تخلیق کرتا ہے۔

ناول اور شاعری میں صرف طریقوں اور ان کے اثرات کا فرق ہے ؛ یہ دونوں ادبی صورتیں شاعرانہ شائبے کو قائم کرتی ہیں ، ایک فی الواقعی سیرت تخلیق کرتی ہیں جس میں ہر حادثہ ، ہر واقعہ ، ایک تجربہ ہے۔ یہ شائبہ الفاظ کی مدد سے قائم کیا جاتا ہے چاہے الفاظ کی ترتیب بحور و اوزان کے مطابق اور قافیہ و ردیف کے لوازمات کے ساتھ ہو یا روز مرہ کے نثری فقروں کی سی ہو۔

ناول کے اوصاف و خواص زندگی کے ہر پہلو سے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ناول شخصیت کی نشو و نما کے گرد اس طرح گھومتا ہے کہ گمان ہونے لگتا ہے اس میں کرداروں کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ مگر ناول کے جاندار ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کرداروں کے علاوہ ایک پورے عالم کا ، ایک محسوس کی ہوئی ، سمجھی ہوئی تاریخ کا سانچہ تخلیق کیا جائے۔ ادب اور دوسرے فنون میں تقسیمات سب سے اہم نہیں بلکہ اس کے برعکس دنیا کے شاہکاروں کی شوکت و سطوت کا مافوق الفطری دن نہ تو سمجھ بوجھ کے کوندوں سے ہے ، نہ دل کی گہرائیوں کے رازوں کی آشنائی کے سبب اور نہ کردار نگاری کی وجہ سے ہے۔ بلکہ فی اجسام کی مضمر اور واضح ساخت کے باہمی رشتوں کی بے نظمی اور امتزاج سے ایک ارتقا پذیر نظام خلق کر لینے سے ہے۔ اسی لیے ناول میں ضروری نہیں کہ حرکت کی سمت سیاق و سباق ہو ، کائنات اسی قسم کی حرکت میں محیط نہیں (ایک حرکت وہ بھی ہے جو پھول کے کھلنے سے وجود میں آتی ہے ، خوشبو کی ہجرت جیسے جنم دیتی ہے ، جس حرکت کا حیطۂ عمل مکان کے علاوہ زمان بھی ہے ، زمان و مکان سے ماورا بھی)۔ یہ اسی دم ممکن ہے جب ناول استعارہ بن جائے ان ذروں کا جو کائنات کی حرکت کا سبب ہیں ، ان ستاروں کا جن کے درمیان سائنسدانوں کی نگاہیں ، ان کی عقل سرگردان ہے ، ان قوتوں کا جو انسان کے دل و دماغ میں منتشر ہوتی رہتی ہیں ، ان ساختوں کا جن میں انسان کو اپنے خواب جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ یہ کام علم بنا ممکن نہیں۔

ہمارے یہاں علم اور شاعری کو ضدین سمجھا گیا ہے مگر اس بیسویں صدی میں علم کو سائنس کا حاصل سمجھا جاتا ہے۔ ایک سائنسدان کی طرح شاعر ایسے حقائق دکھاتا ہے جن کا پہلے یا تو شعور نہ تھا یا جن کا انسانوں کے لیے وجود نہ تھا۔ اس زمانے میں شاعروں کے لئے شاعری محال ہوگئی ہے مگر سائنس دانوں کے لیے ارزاں ہوگئی ہے ' سائنس کے نئے انکشافات اتنے عجیب ہیں کہ ان کو بیان کرنے کے لیے سائنس دانوں کو استعارے کا سہارا لینا پڑا ہے اور جس طرح وہ زبان کا استعمال کرنے پر مجبور ہیں اس طرح زبان اپنے معنی میں یوں جذب ہو جاتی ہے کہ معنی کے علاوہ کچھ نہیں رہتا بلکہ معنی بھی معنی نہیں رہتے کیونکہ جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس کو صرف الفاظ کی خاص ترتیب اور آہنگ ہی اجاگر کرسکتا ہے — الفاظ و معانی میں یہ رشتہ نہیں ہوتا ؛ ہر معنی کو مختلف الفاظ کی مختلف ترتیبوں سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ سائنس دانوں کو جو کچھ دکھانا ہوتا ہے وہ یوں بیان نہیں کیا جاسکتا بلکہ مفہوم کے لئے ، طبق در طبق مربوط مناظر کو ایک خاص ترتیب کی

آوازوں کی لے سے ھی ذھن انسان میں جگایا جاسکتا ھے - ھزاروں سال کے بعد آج پھر شاعر اور سائنس دان کے حقائق ایک دوسرے کے مماثل ھوگئے ھیں - زندگی اور کائنات کی وحدت میں جو کھلبلی آگئی تھی وہ آج نئے حقائق کی خصوصیت اور زبان کے اختصاصی اوصاف کے ملاپ سے بنا چاہتی ھے - انسان آج پھر نظام فطرت کو بھرپور نظر سے دیکھ سکتا ھے ، اپنی نفسیاتی کیفیتوں کے عوامل کو فطرت کے عوامل سے ھم آھنگ کر سکتا ھے ، اپنے معاشرے کے عوامل سے پیدا ھونے والی قوتوں کو اس طرح استعمال کرنا سیکھ سکتا ھے جس طرح فطرت کے مظاھر میں قوتوں کا استعمال ھوتا ھے : تخریب و تعمیر کی آویزش کا حاصل ھمیشہ تخلیق ھوتی ھے - فطرت کے مظاھر میں حرکت کے اصول کو سمجھ کر وہ اپنے معاشرے میں ، اپنے اندر اپنی نفسیاتی کیفیتوں کی حرکت کے اصول کو سمجھ کر ، ان میں سے رفتاروں اور تناسبوں کو تجرید کرکے انھیں الفاظ کے استعاری استعمال میں سمو کر نئے نئے لسانی اجسام کی تخلیق پر قادر ھوسکتا ھے -

نئی سائنس کے انکشافات سے پہلے انسان ، لہذا فن کار فطرت کو اندھا ، انسان سے بے پروا تصور کرتا تھا - اسی لئے اس کی دنیا سمٹ سمٹا کر یا تو معاشرے کے عوامل کے اندر گھر گئی یا اس سے بھی تنگ ھوئی تو خود انسان کے نفسیاتی عوامل کی رفتار میں گم ھوگئی - ایسے ماحول میں جو رفتاریں ، جو تناسب اخذ ھوسکتے تھے ان کو بنیاد قرار دے کر ان سے جو شانے تجرید کیے گئے اور ان کے لیے جب لسانی ، تصویری ، محسوس جسم تخلیق کیے گئے تو فن کار نے اس تخلیقی تگ و دو میں ایسے مناظر حیات کو جنم دیا جن کے افاق اندھی گلیوں میں جا کر جذب ھوئے تھے - انسان نے ان مناظر حیات کو فطرتیت ، کبھی واقعیت نگاری ، حقیقت نگاری ، کبھی اشتراکی حقیقت نگاری ، کبھی رمزیت ، کبھی کچھ اور نام دیے - مگر جب ھر بار ان مناظر سے گزر کر وہ اندھی گلی میں داخل ھوتا تو گھبرا کر ، جھنجھلا کر ، لوٹ آتا اور نئے منظر کی تلاش میں نکل پڑتا - - اس کے لیے تخلیق کی راھیں اندھی گلیوں میں جا کر ختم ھوتی رھیں -

آج اگر فن کار کو تخلیق کرنا ھے تو اسے اپنے آپ کو ، اپنے معاشرے کو نظام فطرت کے تناسبوں اور رفتاروں کے ساتھ ھم آھنگ کرنا ھوگا - جس طرح فطرت نے درجہ بہ درجہ ، طبق بہ طبق ، جمادات ، نباتات ، حیوانات ، آدم کو جنم دیا اس طرح آج فن کار کو طول طویل عمل پیہم سے تناسبوں اور رفتاروں سے فضائے یاد کے نت نئے عالمین کو جنم دینا ھوگا - ان عالمین کی حرکت دم بہ دم سے وجود میں آنے والی قوتوں کے لیے نت نئے قسم کے اجسام تخلیق کرنے ھوں گے — اب تو فن کار اور خالق وھی کہلائے گا جو عالم بھی ھوگا عامل بھی ، جو اپنی نفسیاتی کیفیات کو معاشری عوامل کی راہ سے فطرت کے نظام سے ھم آھنگ بھی کرسکے اور اس سے آزاد بھی رھے اور اس آزادی کے خلاقانہ استعمال سے فطرت کے عوامل کو اپنے تخیل کا سانچہ بنا سکے — یہی اس کے لیے تخلیق کے ھنر کی معراج قرار پائے گی -

آج تک تخلیق کا ھنر شائبی عالمین سے متعلق رھا ھے مگر یہ ھنر اپنی فطرت میں ایسا قطعاً نہیں ھے کہ اس کا عرصۂ حیات شائبی عالمین میں محدود رھے - سائنس اور علمی ترقی کی فراوانی نے یہ ممکن بنا دیا ھے کہ غیر شائبی نظام بھی اس حیطۂ اختیار میں چلے جائیں — معاشری زندگی کا فن بن جانا ممکن ھوگیا ھے -

پاکستان کے لوگوں کی اکثریت کے لیے ماضی کی کوئی واضح صورت نہیں ، ان کا ماضی

بے قوت ہے ، ان پر بوجھ نہیں ، اس کا عمل ان کو کسی خاص راہ ، کسی خاص سمت پر چلنے پر مجبور نہیں کرتا ؛ ان کے حال میں کوئی ایسا نظام وجود میں نہیں آیا جو انہیں کسی خاص راہ پر چلنے کے لیے مجبور کرے ؛ ایسے ماضی و حال کے پیش نظر ان کا کوئی معین مستقبل نہیں ؛ وہ اپنے ماضی سے ، اپنے حال سے ، اپنے مستقبل سے آزاد ہیں ۔ اپنا حال ، اپنا مستقبل اور اپنا ماضی خود بنا سکتے ہیں ۔ وہ جس عہد میں ، کرۂ ارض کے جس نقطے پر کھڑے ہیں ، وہاں سے تاریکی اور روشنی یکساں فاصلے پر ہے ؛ وہ چاہیں تو تاریکیوں میں جذب ہو جائیں ، چاہیں تو روشنیوں کو اپنے آپ میں جذب کرلیں ۔

لے دے کے ان کے ملک کے زمین و آسماں ، زمین و آسماں کے درمیان فضاؤں میں پھیلتے ہوئے ، جذب ہوتے ہوئے رنگ ، زمین سے جنم لینے والے پھل پھول ، آسمانوں سے نازل ہونے والی نعمتیں اور عذاب ہی ان کا ماضی بھی ہیں ، حال بھی اور مستقبل بھی ۔

یورپ اور ایشیا کے جن حصوں میں معاشرتی انقلاب آئے وہ اتنی تیزی سے آئے کہ ان ممالک کے سماجی نظام فضائے باد کے لیے اس کے اثرات کا احاطہ کرنا اور ان سے پیدا ہونے والی معاشرتی قوتوں کا صحیح استعمال کرنا محال تھا ۔ اس ملک میں عالمی سیاست ، علمی اور سائنسی بے بہرہ وری کی وجہ سے معاشرتی تبدیلیوں کی رفتار اتنی تیز ہو ہی نہیں سکتی کہ یہاں سماجی نظام فضائے یاد ان کا احاطہ نہ کرسکے۔ اس کے علاوہ اس ملک کے لوگ ان تمام تجربوں کے وارث بن سکتے ہیں جو یورپ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں سماجی اور سائنسی علوم میں مناظر کی تبدیلیوں سے وجود میں آئے ہیں ۔ یہاں جو زبان بنے گی وہ بہت سی زبانوں سے ، بہت سی تہذیبوں سے ، بہت سے مناظر حیات ، بہت سی روایتوں سے متعلق ہوگی ۔ لہذا ان سب کا تجربی سرمایہ اس کی قومی زبان میں جذب ہوگا ۔

اب تک اس ملک میں معاشرہ فطرت سے بے زار نہیں ، اس معاشرے پر فطرت کے عوامل کے تاثرات بہت گہرے ہیں ، اس کی زبانوں کا ، اس کے ادبوں کا ، داخلیت پسندی کے گہرے رجحانات کے باوجود ، فطرت سے نہایت گہرا تعلق ہے ۔ اس کے ادب میں استعارے کی راہ سے ، کم از کم شاعری میں ، انسان کی داخلی حالتوں کا فطرت کے مظاہر کی خارجی حالتوں سے گہرا تعلق رہا ہے اور ابھی تک قائم ہے ۔ لہذا اگر پاکستانی قوم فطرت کے درمیان فطرت کا سا معاشرہ بنا سکے تو یہ معاشری تخلیق کے ہنر کی معراج ہوگی ۔

الف لیلہ ــــ ایک تعارف

مظفر علی سید

بیسویں صدی اور الف لیلہ کی بات۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ برا حشر دیکھ کے اردو کے زبان دان ایک نئی ضرب المثل اختراع نہ کرلیں۔ یوں ظاہری اعتبار سے دیکھا جائے تو ہے بھی انمل بے جوڑ سی بات۔ پھر پڑھنے سننے والوں کو لکھنے والے سے یہ پوچھنے کا حق پہنچتا ہے کہ ایسی بے وقت کی راگنی الاپنے کی کیا ضرورت تھی؟

آج کل بھلا ایک ہزار ایک راتیں کس کے پاس ہیں کہ بیٹھا کہانیاں سنتا رہے۔ آج اگر کسی نے ایک آدھ افسانہ پڑھ لیا، آدھا پورا ناول ختم کر لیا تو بڑا تیر مارا۔ ان دنوں نہ تو کوئی الف لیلوی شہزادہ دیکھنے میں آتا ہے، نہ ہی لوگ اپنی بیگموں سے بے در بے تین سالہ تک بس کہانیاں سننے کی سکت رکھتے ہیں بلکہ عورت کی مکاری اور بے وفائی کے بارے میں بھی کوئی خواہ مخواہ کا درد سر مول نہیں لیتا۔ پھر الف لیلہ کا نعرہ بلند کرنے سے کیا غرض و غایت ہوسکتی ہے؟

مگر ایک سطح پر الف لیلہ کی بات کرنے کی گنجائش اب بھی ہے۔ اپنے یہاں ادب القدماء کا جو تصور مقبول ہے اس کے ضمن ایک الف لیلہ کیا، ہزار الف لیلاؤں کی باتیں بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ یعنی کوئی چاہے تو الف لیلہ کی عالمگیر مقبولیت پر جس قدر چاہے روشنی ڈال سکتا ہے یا اس کے مآخذ و منابع کی ایک طویل فہرست شائع کرکے ایک آدھ سند کا حامل ہوسکتا ہے۔ جب ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ یورپی ادب نے الف لیلہ کو کس اعلیٰ مسند پہ جگہ دی ہے، اس کے کس قدر تراجم، ماخوذ و مختار ایڈیشن، منظوم قصے کہانیاں پچھلی ڈھائی تین صدیوں میں نکل چکے ہیں تو ہمیں قرار واقعی مسرت ہوتی ہے اور ہم فخریہ کہنے لگتے ہیں کہ یورپ کا ادب الف لیلہ پہ مبنی ہے۔ یعنی جب ہم دوسروں کو اپنی کسی چیز کی تعریف کرتے سنتے ہیں، تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے اور ہم ان کی تعریفوں سے حسب مراد نتیجے بھی نکال لیتے ہیں۔

جو لوگ ساری دنیا کے ادب کو ایک وحدت کی حیثیت دیتے ہیں اور ادبی مزاج، فنی کمالات، ذہنی لرزشوں کو تحریکوں میں بانٹ کر ان کی حدیں اور وسعتیں معین کرتے ہیں ان کی نظر میں الف لیلہ ادب عالم کا ایک بڑا ہی عظیم الشان کارنامہ ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے مشرق و مغرب کے درمیان اسے ایک پل کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ ایک طرف الف لیلہ میں ایران، بابل، شام، ہندوستان بلکہ چین تک کے تہذیبی عناصر اور تخیلی ذریعے سے فائدہ اٹھایا گیا ہے تو دوسری طرف یونان، مصر اور المغرب کی قدیم داستانوں کے خاکے بھی الف لیلہ میں پہچانے جاسکتے ہیں۔ سندباد کے سفر نامے میں اوڈیسی کا سا رنگ روپ نمایاں کیا گیا ہے، جانوروں کی حکایات جو بطور تمثیل کہیں کہیں سنائی جاتی ہیں بدھ مت کی جاتک کہانیوں اور پنچ تنتر سے میل کھاتی ہیں۔ حسیناؤں، وزیر زادیوں، شہزادیوں کی خفیہ زندگی چین اور جاپان کی درباری زندگی سے بے حد گہری مشابہت رکھتی ہے۔ بابل کی تہذیب اور سریانی وراثت ایک ایسے بغداد اور دمشق کی صورت میں جلوہ گر ہے جو اموی یا عباسی بادشاہوں کے زمانے سے بھی قدیم خصوصیات لئے ہوئے ہے۔ مصر و المغرب کے مسلمانوں کی زندگی، ان کا طور حیات اور ان کے بازاروں منڈیوں کی رونقیں ایک ہزار ایک راتوں کے پردے میں دھڑکتی نظر آتی ہیں۔

ہم کوزپشت مغنی سے طرابلس، قاہرہ، دمشق، بغداد کہیں بھی دو چار ہوسکتے

تھے اور خود بھی ویسے حادثات سے گزر سکتے تھے جو یہودی طبیب ، شاہی سٹور کیپر ، عیسائی عبادت گزار سے اس کہانی میں پیش آئے ۔ ہم الف لیلہ کے حجام سے مل کر یقیناً بہت خوش ہوتے بلکہ کبھی تو کسی کی فصد کھلوانے کے لیے یا بال کٹواتے ہوئے چٹپٹی کہانیاں سننے کے لیے اس کی ضرورت آج بھی پیش آ جاتی ہے بشرطیکہ ہم زندگی میں کسی بھرپور کردار سے ملنے کی ہمت رکھتے ہوں اور اس کے نتائج و عواقب کو خندہ پیشانی سے قبول کرسکتے ہوں ۔ ہم الف لیلہ میں سندباد جہازی کی کہانی سندباد حمّال کی زبانی سننے کی بجائے اس کی ہر شام کی دعوت میں شریک ہونا پسند کرتے ۔ آج اگر کوئی آدمی امریکہ میں کسی فضائی حادثے سے بھی بچ کر آئے تو ہمیں دس منٹ کے لئے حیران کا متوقع ، مسرور یا مغموم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ۔

شاید الف لیلہ کی یہی ایک خصوصیت ہو جس کی بنا پر فرانسیسی مترجم گالان کی سربراہی میں ترجموں کا ایک جہاز یورپ کی ہر بندرگاہ سے بغداد کو ہر شام بھیجا جا سکتا ہے اور ایک ہزار ایک جہازوں کے پہنچنے کے بعد بھی شاید یہ دخیرہ ختم نہ ہو ۔ الف لیلہ کے مآخذ ، داستانوں کے اصلی یا جعلی ہونے کے بارے میں ، اس کی معنویت اور فنی اہمیت پہ بھی اچھا خاصا کتب خانہ تیار ہوسکتا ہے ۔ یونیورسٹی لائبریری لاہور کے سر شہاب الدین کولیکشن میں ایک الماری دیکھ کر کوئی آٹھ سال پہلے میں حیران ہو گیا تھا ۔ برٹش میوزیم ، کتاب خانہ ملی فرانس ، جرمن یا امریکی لائبریریوں کے کمرے دیکھنے کا موقع ملے تو شاید چکرا کے گر پڑوں ۔ یہ تو خیر پڑھنے اور سوچنے کی بجائے ڈرنے اور بھاگنے کی باتیں ہیں ۔ آج کوئی انگریزی میں لیں ، لین ، برٹن یا پووس ماتھر کا ترجمہ دیکھ لے ، نہیں تو بچوں کے لئے مختصر ، کانٹے چھٹے ہوئے ، نئے طور سے لکھے ہوئے ایڈیشنوں سے دل بہلا لے ، ایک جلد میں (خاص طور پر ماڈرن لائبریری ایڈیشن) منتخب کہانیاں پڑھ لے ، پروفیسر آربری یا داؤد کی ترجمہ کی ہوئی چار چار پانچ پانچ کہانیاں دیکھ جائے یا اردو میں عبدالکریم ، سرشار یا منصور احمد کی الف لیلہ پڑھ لے تو یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک زقند میں دنیا بدل گئی ہے جہاں دکھ ، درد ، تھکن ، بیزاری کا تذکرہ تو ہے مگر اس کا احساس آخر تک برقرار نہیں رہتا ، خواہ کوئی کہانی کہیں سے پڑھنا شروع کر دیں یا کسی کہانی پہ ختم کر دیں ۔

زندگی کے مصائب سے پہلو تہی نہ برتنے کے باوجود مسرت و بہجت کا یہ دائمی احساس الف لیلہ سے متاثرہ داستانوں اور کہانیوں میں نہیں ملتا ۔ بوکاچو کی ' دہ شب ' میں لذت کا جو پہلو پیش منظر میں ہے پس منظر میں طاعون کو بھی بھولنے نہیں دیتا بلکہ یہ گریز پائی اسی وجہ سے ہے ۔ ڈون کوئزوٹے میں ' قیدی کی کہانی' سرتاپا الف لیلوی داستان ہے جس میں مسلمان کی جگہ عیسائی اور عیسائی کی جگہ مسلمان ہے مگر اس ظاہری مزاحیہ داستان کا سب سے اہم پہلو طربیہ نہیں حزنیہ ہے ۔ گلیور کے پہلے دو سفر نامے سندباد جہازی کے ایک ذیلی سفر سے کچھ نہ کچھ مناسبت ضرور رکھتے ہیں مگر یہاں معنویت سیاسی ہے اور طنز کا وار بہت گہرا ہے ۔ بچوں میں مقبول ہونے کے باوجود یہ ادبی کارنامہ اپنی طنزیہ اہمیت سے الگ نہیں کیا جاسکتا ۔ کولرج کا قدیم جہازی سندباد جہازی کے تیسرے سفر سے نکلا ہے مگر اس کا درد و کرب الف لیلہ کی کسی داستان میں نہیں ۔ کنٹربری ٹیلز میں البتہ الف لیلہ سے ملتی جلتی ایک طمانیت اور سرور کا احساس ہوتا ہے اگرچہ وہاں بھی Chaucer's Chuckle یا چاسر کے مخصوص 'خندہ درآستیں' سے چھٹکارا نہیں مل سکتا ۔ کیٹس کی 'سینٹ ایگنیز ایو' میں الف لیلہ کے اثرات ایم ، آر ، رڈلے کی بڑی زور دار نشان دہی کے بعد راز کی بات نہیں رہے مگر غور سے دیکھیں تو یہاں کی گوناگوں فضا میں بغدادی اثر پہ کچھ نہ کچھ کمی یا اضافہ ملے گا ۔ رنگ ، خوشبو اور ذائقے کی یہ دنیا جنت گرسنہ کا نقشہ معلوم ہوتا ہے جو اطمینان بخشنے کی جگہ

بھوک کو جگانے کا کام کرتا ہے۔

یہی عالم ہمارے یہاں طلسم ہوشربا کا ہے۔ الف لیلہ ایک ہی زقند میں ہمیں ایک دوسرے عالم میں تو لے جاتی ہے مگر اس عالم میں بھی ایک منطقی تسلسل ہے، ایک حقیقت ہے۔ اس کے برعکس طلسم ہوشربا کی دنیا پراپیگنڈے اور خوف کی دنیا ہے، عمر عیار کی فتوحات اور لشکر افراسیاب کی پے در پے شکستیں، ملکہ اور شہزادیوں کی آسان شیفتگی اور فوراً کلمہ پڑھ کے دائرۂ ازدواج میں پروئے جانا اور پھر حرم کی آبادی بڑھانا غرور و تمکنت کو ہوا تو دے سکتی ہیں مگر سچی طمانیت نہیں پیدا کر سکتیں۔ اسی طرح چہار درویش کے خواجہ سگ پرست کا قصہ ہے جو الف لیلہ سے براہ راست علاقہ تو رکھتا ہے مگر مزاجاً کسی اور دنیا کا باسی ہے۔ کبڑے مغنی والا حجام بھی چھ بھائیوں کی کہانیاں سناتا ہے مگر اس میں کہیں بھی درد و کرب کا احساس نہیں ہوتا خواہ وہ درزی کی عشقیہ کہانی ہی کیوں نہ ہو یا اندھے بھائی کے لٹنے کا قصہ ہی کیوں نہ ہو۔

الف لیلہ کی بنیادی کہانی میں سلطان شاہ زمان اور شہریار کی بے اطمینانی اور مایوسی سے بات شروع ہوتی ہے۔ دونوں طمانیت، سکون قلب اور وفاداری کی تلاش میں اس قدر تھک چکے ہیں کہ زن کشی، بربادی اور ظلم پہ اتر آئے ہیں۔ وزیر زادی شہرزاد کا اپنے شہر، ملک اور قوم کو بچانے، بادشاہ کو اطمینان بخشنے کے لئے اپنے سر بوجھ لینا، مصائب کو جھیلنے اور ان کا علاج کرنے کی زوردار خواہش پہ مبنی ہے۔ اس طرح ایک ہزار ایک راتیں کہانیاں کہنے میں گزار کر وہ صرف یہ بات ثابت نہیں کرنا چاہتی کہ دیکھو میں نے تین بچے جنے ہیں اور کوئی ہرجائی پنا نہیں کیا، تمہارے سامنے، تمہاری آنکھوں کانوں کے پاس رہی ہوں مگر کسی حبشی، کسی رہرو، کسی وزیرزادے، کسی امیرزادے سے ملوّث نہیں ہوئی۔ وہ تو کہانیوں کے کردار پیش کر کے یہ بتانا چاہتی ہے کہ انسان میں ہر طرح کی گنجائشیں ہیں: چاہے تو گناہ کی دلدل میں دھنس جائے، چاہے تو دامن تر کئے بغیر دریا سے نکل آئے۔ جہاں بزازوں، درزیوں کو لوٹنے والی خادمائیں اور گرہستنیں، ماماؤں کے ذریعے رہ گیروں کو گھیرنے والی وزیرزادیاں اور حبشی نواز ملکائیں ہوتی ہیں وہاں دنیا آسما شہزادیاں، باوفا بیگمیں اور انیس الجلیس کی سی کنیزیں بھی ہوتی ہیں۔ اسی طرح مرد بھی دنیا میں ہر طرح کا مل جاتا ہے: کم ظرف، دل پھینک، مجسس، اوباش، زر سکار۔ بڑا بڑا صاحب دانش، دانشمند حطمی ہو سکتا ہے مگر ایک سوداگر زادہ عشق صادق کے مقام پہ پہنچ سکتا ہے۔

الف لیلہ کا یہ پیش کلامیہ اپنے چوگرد ڈھانچے میں ایک پوری دنیا کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی میں ساری الف لیلہ کا راز ہے۔ ان کہانیوں میں چھپے ہوئے فلسفیانہ خیالات، اخلاقی نتائج، دو تین صدیوں کی اسلامی تاریخ، علم المعاشرت، سیاست، انسانی فطرت کا مطالعہ سبھی رازہائے سربستہ کا سراغ اسی پیش کلامیے میں مل جاتا ہے۔ بلکہ الف لیلہ کی ساخت، اس کی فنی ہیئت کا ڈھیلا ڈھالا پن اور اس کے باوجود مقصد پہ شعوری گرفت یہیں منعکس ہو جاتی ہے۔

مگر اس سے بھی پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ الف لیلہ، طلسم ہوشربا یا داستان امیر حمزہ، بوستان خیال کی سی محیرالعقول مافوق الفطرت داستانوں کا ایک نا مختتم سلسلہ نہیں ہے۔ عام طور سے الف لیلہ کے بارے میں دو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں جن میں ایک تو خود کو حقیقت پسند کہنے والے افسانہ نگاروں کی پیدا کردہ ہے یعنی اس قدیم کارنامۂ ادب میں مافوق الفطرت داستانیں اور ناممکن العمل واقعات و حادثات کی بھرمار ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ الف لیلہ کو پڑھنے والا کوئی بھی صاحب دماغ ایسی بات نہیں کرسکتا۔

اس میں حسب معمول قسم کی سطحی باتیں تو یقیناً نہیں ہیں اور نہ ہی حقیقت کا مفہوم الف لیلہ میں یہ ہے کہ ان باتوں کو افسانہ بنایا جائے جو ہر ایک کے نوک زبان ہیں۔ ایک حد تک غیر معمولی حادثات و اتفاقات کو اس میں بار ملتا ہے مگر وہ بھی یکایک بغیر کسی وجہ کے پیش نہیں آتے۔ مثلاً اس کی سب سے مشہور کہانی سندباد جہازی کو لے لیجئے: سندباد کا کئی مرتبہ بحری سفر پہ جانا اور ہر بار کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہونا بحری ہواؤں اور دخانی جہازوں سے پہلے کی بات ہے۔ جزیروں میں انواع و اقسام کی مخلوقات سے ملنا کون سی عجیب بات ہے؟ ساحلی افریقہ میں رہنے والا کوئی بھی خانہ نسیں آدمی ابن بطوطہ یا ابن جبیر کا سفر نامہ پڑھے تو یہی تاثر اس کا بھی ہوگا۔ اور یہاں تو ساری بحث بار اور معنویت کی ہے، تفاصیل کو محدب شیشے سے دیکھنے والے جس دن اچھی کہانی لکھنے لگیں گے یہ باتیں خود بخود اُن کی سمجھ میں آ جائیں گی۔

پھر جنوں بھوتوں کی کہانیاں الف لیلہ میں کتنی ہیں؟ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو فیصدی۔ جانوروں کے تکلم کی باتیں دنیا کے کون سے ادب میں نہیں؟ جانور تو ہمیشہ سے تمثیلی کہانیوں میں استعمال ہوتے رہے ہیں اور پھر جانوروں کی کہانیاں بھی الف لیلہ میں بہت ہی کم ہیں۔ اس کا اصل موضوع تو مرد اور عورت کی ذات ہے، شہروں، محلوں، اور گلی کوچوں کی دنیا ہے۔ صرف زمانہ شاہی کا ہے اور شاہی زمانے کے ادب کا جمہوری دور کے ادب سے موازنہ کر کے دیکھ لیجئے، شاہی زمانے میں بھی جمہوری قدریں اور تقاضے نہ ملیں تو گلہ کیجئے۔ آخر سندباد جہازی، علی بابا یا علاؤالدین کہاں کے بادشاہ ہیں؟ بلکہ اس مجموعۂ قصص میں تو ہارون الرشید یا کوئی اور بادشاہ مرکز توجہ بھی نہیں۔ شاید سب سے زیادہ سوداگروں اور ہمرو روں کی کہانیاں نکلیں۔ عام آدمی بشرطیکہ اس کے پاؤں میں چکر ہو، اس کی آنکھوں میں چمک ہو اور دل میں بصیرت، دنیا کے ادب میں الف لیلہ سے پہلے اس زور کے ساتھ نہیں آیا۔

الف لیلہ کی ترتیب و تعمیر کا جو زمانہ ہے اس میں ایک طرف تو مسلمانوں کی پھیلتی ہوئی سلطنت کا نقشہ ہے اور دوسری طرف بڑھتی ہوئی تجارت، اور بین الاقوامی درآمد برآمد کی فضا ہے۔ اسی لیے سوداگر، سوداگر زادے، سوداگر زادیاں اس میں بہت کثرت سے جلوہ گر ہیں۔ مگر اس وجہ سے الف لیلہ کو ایک تجارتی ادب پارہ سمجھنا غلط ہوگا۔ تجارت میں باہمی میل جول، سفر حضر اور کارنامے کا پہلو اس زمانے میں یقیناً نمایاں ہوگا اور الف لیلہ نے تو تجارت کو بھی رومان بنا کے رکھ دیا ہے۔ الف لیلہ کی بیشتر کہانیوں میں لوگ دور دراز کے سفر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، بیرونی اقوام سے خلط ملط ہوتے ہیں، خطروں اور حادثوں سے دو چار ہوتے ہیں مگر اپنے مقصد کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ڈون کوئزوٹے کو ہسپانوی ایمپائر کا خاکہ کہا گیا ہے، بالکل انہیں معنوں میں الف لیلہ کو مسلمان ایمپائر کا مرقع کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس مرقعے میں شاہوں اور وزیروں کی قد آدم تصویریں شامل کرنے کی بجائے داستان کہنے والوں نے عام آدمی کی زندگی، اس کی محنت مشقت اور اس کی اندوختہ خوشحالی کے قصے سنائے ہیں۔

غیر معمولی حادثات کے بیان پہ برہمی بھی بجا نہیں۔ قصے کہانی کی تنقید میں Possible اور Probable کی تمیز موجود ہے۔ کبھی نا ممکن حادثہ بھی ہو جاتا ہے خواہ ہمیں اس میں اسباب و علل کا سلسلہ نظر نہ آئے، کبھی ہر ممکن بات وقوع پذیر نہیں ہوتی بلکہ علامات و کوائف کی دنیا میں قصے کہانی کی طرح معقولیت کے ساتھ واقعات گذرتے ہیں۔ کہانی لکھنے والے کا بنیادی کام یہ ہے کہ نا ممکن کو بھی ممکن العمل ہوتا دکھائے تو اس کے ساتھ اسباب و علل کا ایک سلسلہ ہو۔ غیر معمولی حادثات کسی غیر معمولی صورت حال میں پیش آئیں اور یہ نہ ہو کہ حقیقت پسندی کا دعویٰ رکھنے کے باوجود حسب معمول قسم کی باتیں کرتے کرتے گاڑی

چلانے کے لئے ایک آدھ بے تکا حادثہ دکھانا پڑ جائے ۔ الف لیلہ میں اس قسم کی احتیاطیں قدم قدم پہ ملحوظ رکھی گئی ہیں ۔

دوسری بڑی غلط فہمی ہالی وڈ کی فلموں سے پیدا ہوئی ہے ۔ شہرزاد ، عرب کی راتیں اور بغداد کا چور قسم کی فلمیں بنا کر الف لیلہ کی اپنی دلچسپی چھیننے کی کوشش آج سے کچھ عرصہ پہلے کامیاب ہوتی نظر آتی تھی ۔ مگر اب ذرا پیچھے کی طرف ایک نظر ڈالیں تو ان میں اور الف لیلہ میں ایک بڑا فرق نظر آتا ہے ۔ ایک تو وہی تہذیب کا فرق ہے ۔ الف لیلہ کا تاجر دور دراز کے جزیروں میں جاتا ہے ، عجیب الخلقت انسان ، جانور اور پرندے ، غریب النوع اشیاء دیکھتا تھا اور وہیں سے دولت کما کے لاتا تھا ۔ آج ایک امریکی تاجر ہالی وڈ میں بیٹھ کر وہیں کے سکرین پلے لکھنے والوں سے ایک نئی قسم کی الف لیلہ سائی پہ بنوا کے فلماتا ہے اور بغداد و دمشق تک دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا اور نہ بھی ہو جائے تو وہاں دو چار آدمیوں کو ڈاڑھیاں لگوا کر ، ہزار دو ہزار عورتوں کا جلوس، لمبی لمبی کاٹ دار دوشا کوں میں اور خاص خاص موقعوں پر مختصر ترین لباس میں دکھا کر سمجھتا ہے کہ الف لیلہ یہی ہے ۔

یہی نقشہ آج کل الف لیلوی مزاج سمجھا جاتا ہے ۔ اس میں نہ تو کرداروں کی تعمیر پہ کوئی توجہ کی جاتی ہے نہ کہانی کا تسلسل قائم رکھا جاتا ہے اور اس وجہ سے الف لیلہ کا لہجہ اور مفہوم باقی نہیں رہتا ۔ ایسی ہی فلموں کو بنیاد بنا کے الف لیلہ کی مخالفت کی جاتی ہے اور جدید الف لیلائیں اور بغداد کی راتیں لکھی جاتی ہیں ۔

آر ۔ ایل ۔ سٹیونسن کی جدید الف لیلہ اگرچہ اس سطح کی چیز بھی نہیں مگر آج کی فلمیں اور الف لیلہ کے بارے میں مروّج تصورات اسی کو سر چشمہ بناتے ہیں ۔ اس میں ایک تو مافوق الفطرت کہانیاں زیادہ ہیں دوسرے مدنی زندگی اور تہذیب کے بارے میں جو نقطۂ نظر الف لیلہ کا ہے وہ یا اس کا کوئی نیا اور مناسب بدل اس میں دکھائی نہیں دیتا ۔ یہ خصوصیت ایڈگرایلن پو کی ’ ایک ہزار دوسری رات ‘ میں البتہ بڑے زور کے ساتھ آئی ہے ۔

ایران میں ہزار و یک حکایت ، ہزار و یک خندہ اور ہزار و یک قصہ قسم کی کتابیں از سر نو لکھی گئی ہیں ۔ غالباً مقبول عام کہانیوں سے ان کتابوں کا خمیر اٹھا ہے مگر یہ مقبولیت حال کی مقبولیت ہے اور عوام بھی آج کے عوام ہیں ۔ ان کی یکسانیت اور ناقابل معافی قسم کی عدم تہذیب بھی انہیں جعلی یا جدید الف لیلاؤں کے زمرے میں لے آتی ہے ۔ اگرچہ ڈاکٹر احتشام زادہ کی ہزار و یک خندہ دوسری کتابوں سے کم غیر شائستہ ہے پھر بھی اس میں وہ بات آ جاتی ہے جو ہمارے یہاں میراثیوں کے قصوں میں بڑی دھوم دھام سے موجود ہے ۔ عورت کے بارے میں یہ کہانیاں کچھ اس طرح کا نقطۂ نظر پیش کرتی ہیں کہ الف لیلہ کی چند کہانیوں پہ ساری عمارت کھڑی نظر آئے اور وہ بھی اپنی اصلی پہلوداریوں ، تہ داریوں کے بغیر ۔ اسی موضوع پر البتہ فرانسیسی ناولسٹ بالزاک کی Droll Stories یا عجیب و غریب کہانیاں اپنا ایک لطف رکھتی ہیں جو اگرچہ جارحانہ تلذذ کے ضمن میں آتا ہے مگر اس میں کم سے کم نفسیات کی جراحی تو ہے ، ہومیو پیتھی سے تو کام نہیں چلتا ۔ پھر بالزاک کی کہانیوں میں تھوڑا تھوڑا تنوع ہوتے ہوئے پوری دنیا کا نہ سہی تو فرانس کا نقشہ تو بن ہی جاتا ہے ۔

یہ تو ہوئی انداز کی بات ۔ یہیں سے مفہوم کا شاخسانہ پھوٹتا ہے ۔ مروج الذہب مسعودی کے ایک مشہور اقتباس میں الف لیلہ قسم کی داستانوں کو فضول اور لایعنی کہا گیا ہے اور عربی میں ایسی داستانوں کے لئے ’خرافات‘ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے مروّج عربی معنے اردو سے مختلف نہیں ہیں ۔ مگر یہ ادب کو مولویانہ زاویے سے دیکھنے کا طریقہ ہے ۔ قصہ کہانی جھوٹ ہوتا ہے یا سچ ، یہ تو اس وقت معلوم ہو سکتا ہے جب آپ کو کسی کی بات

کے معنے معلوم ہوں ۔ ایک آدمی آپ کو آکر ایک قصہ سنائے جس میں کسی پیر تسمہ پا کا ذکر ہو تو آپ ہمہ ہوش و حواس اس سے یہ نہیں پوچھ سکتے کہ یہ قصہ جھوٹا ہے یا سچا ۔ اگر آپ کی مراد یہ ہے کہ انسان کی تاریخ میں کیا بعینہ ایسا حادثہ کسی خاص شخص کے ساتھ پیش آیا ہے تو آپ یقین جانئیے کہ کسی کے ساتھ پیش نہیں آیا ۔ اور اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص شخص کے ساتھ چونکہ اب تک ایسا حادثہ پیش نہیں آیا ، اس لیے قصہ جھوٹا ہے ، تو یقین جانئیے کہ آپ ادب سے تو کیا زندگی سے بھی کچھ نہیں سیکھ سکتے ۔ جو لوگ ادب اور زندگی دونوں کے لئے پیرتسمہ پا بنے ہوئے ہیں وہ بھلا الف لیلہ کو سچی کہانیاں کیسے کہہ سکتے ہیں؟

اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہوں کہ شہزادہ نورالدین کا سن پیدائش اور سن وفات کیا تھا ؟ تو آپ سب سے پہلے حضرت آدم کے اس تیرہ خاکدان پہ تشریف لانے کا قبل مسیح سن نکالئیے ، انشاء اللہ اس کے بعد دوسری تحقیقات بھی پوری ہو جائیں گی ۔ سوال یہ نہیں ہے کہ شہزادہ نورالدین کون تھا؟ اور کب تھا؟ بلکہ یہ کہ وہ کیا تھا؟ ۔ عامیانہ قسم کے تشکیک پرستوں کی سمجھ میں یہ بات بڑی مشکل سے آئے گی کہ الف لیلہ قسم کے مجموعوں میں تقریباً ہر کردار کوئی نہ کوئی معنے رکھتا ہے اور یہ معنے جاننا یا محسوس کرنا ہر پڑھنے والے کا پہلا کام ہے ۔ عامیانہ قسم کے تشکیک پرستوں سے تو وہ سیدھے سادے پڑھنے والے ہی اچھے ہیں جو کہانی کی معنویت بے شک سمجھیں تو نہیں مگر پڑھتے ہوئے اسے محسوس کرلیں ۔

آخری بات الف لیلہ کی ساخت کے بارے میں ۔ سب سے پہلے تو یہ کہ الف لیلہ اس صورت میں نہیں لکھی گئی جس میں یہ ہمارے سامنے ہے ۔ سمرقند ، بغداد ، دمشق اور قاہرہ کے نقشے ایک ہی ہاتھ کے کھینچے ہوئے نہیں ہیں ۔ اس باغ کی آبیاری اور شجرکاری میں دو تین صدیوں کی تہذیب نے حصہ لیا ہے ۔ اموی ، عباسی ، فاطمی عہدوں کے نقوش اس تصنیف پہ بہت گہرے ہیں ۔ پھر بھی الف لیلہ ، طلسم ہوشربا یا داستان امیر حمزہ کی طرح ایک جنگل نہیں ہے بلکہ ایک بوستان ہے جس میں خالی جگہ دیکھ کر بدیسی میووں اور پھولوں کے درخت ، بیلیں اور بوٹے لگائے گئے ہیں ۔ اس کی بنیاد تو یقیناً عباسی عہد میں پڑی ہے مگر اس کی آدھی سے کچھ کم کہانیاں زمانۂ مابعد کا اضافہ ہیں ۔

اس کے باوجود الف لیلہ میں یکتائی ہے ۔ اس کی دنیا ایک ہے جس میں جہازران ، سوداگر ، جزیروں کے باسی ، عربی بولنے والے ، مسلمان حاکم ، حرم رکھنے والے ، کنیزیں ، اور حبشی غلام —— ایک آب و ہوا ، ایک نظام نفسیات کے ماتحت چلتے پھرتے ہیں ۔ اگر چاسر کی کینٹربری ٹیلز کو یا ڈان کیریزوٹے کو ناول کہا جا سکتا ہے تو اس سے بھی پہلے الف لیلہ کو ناول کی زبردست ابتدائی کوشش کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ اس ناول کا انداز یقیناً Episodic ہوگا مگر ایک رات دوسری رات سے اس طرح پیوست ہوتی چلی جاتی ہے کہ ظاہری رابطہ نہ ہونے کے باوجود ایک باطنی تعلق دونوں میں نظر آتا ہے اور یہ کہانیوں کی یکسانیت کی وجہ سے نہیں ۔ الف لیلہ کے چمنستان میں تو اس طرح کا پھول اور پھل اگا ہے کہ ہر ایک کا رنگ ، بو باس اور ذائقہ الگ ہے اور اگر ایک کہانی دوسرے کی رشتہ دار معلوم ہوتی ہے تو بس اسی طرح کہ جانوروں ، انسان ، پھولوں اور پودوں کے بھی خاندان ہوتے ہیں اور اس کے باوجود ان میں ایک کو دوسرے سے ممیز کرنے کی صاف و کافی وجوہات ہوتی ہیں ۔

رواو

محمد حسن عسکری

جو لوگ ہمیں پسند آتے ہیں اُن کی خوبیاں تو آسانی سے بیان ہو جاتی ہیں۔ بعض دفعہ عشق کا نام بھی لب لعل و خط زنگاری ہوتا ہے۔ لیکن ایک محبت ایسی بھی ہے جس کے بارے میں آدمی بس اتنا ہی کہہ سکتا ہے -- خود بخود دل میں ایک شخص سمایا جاتا۔ بلکہ اگر زیادہ کاوش میں پڑے تو یہ بھی کہہ دیتا ہے --- سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ۔ یہ تو دنیا کے سارے شاعر بتاتے آئے ہیں، کہ ہمیں اپنے محبوب سے کتنی محبت ہے، مگر محبوب کیا ہے، اُس کا حال بس پانچ شاعروں نے سنایا ہے۔ زیادہ تر لوگ تو در کعبہ تک آئے کہہ کے آگے بڑھ گئے ہیں۔ کیونکہ محبوب کو دیکھنے کے لئے آدمی کو نشو و نما پا کر خود اپنی نظر کی بلندی تک پہنچنا پڑتا ہے۔ محبوب کو پانے سے پہلے اپنے آپ کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ اس کے لئے ایک عمر چاہئے۔

رواو کے ساتھ میرا معاملہ کچھ ایسا ہو گیا ہے۔ مختلف مصوروں سے مجھے مختلف قسم کا لگاؤ رہا ہے۔ کہیں موضوع نے گرویدہ کیا ہے، کہیں ہیئت نے -- اور کہیں زمانے کے فیشن نے۔ غالب کا شعر ہے، اس لیے اچھا ہے والے اصول کو بھی میں نے کبھی حقیر نہیں سمجھا۔ لیکن رواو میرے لیے ایک واردات ہے، ایک حادثہ ہے --- جس کا پتہ ہمیشہ بعد میں چلتا ہے اور جس کا مطلب بعض اوقات کبھی سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ بتانا تو مشکل کام ہے کہ آدمی کے کون سے تجربے نے کون سے دوسرے تجربے کو منور کیا، اور کن تجربات کو ممکن بنایا۔ مگر آسانی کی خاطر میں کہا کرتا ہوں کہ میں ادب کے ذریعے مصوری تک پہنچا۔ لیکن رواو کے سلسلے میں میرا تجربہ بالکل اُلٹا ہے۔ اُس نے میرے لئے بعض ادبی تجربات کی راہیں کھولیں۔ اگر میں اُس کی تصویروں سے واقف نہ ہوتا تو رمبو کی شاعری میرے لئے وہ چیز نہ بنتی جو آج ہے۔ شعر و شاعری تو الگ رہی، محض زندہ رہنے کے لیے نہ جانے رواو سے میں نے کتنی تقویت حاصل کی ہے۔ ایسے آدمی کے متعلق 'علمی' مضمون لکھنے سے بات نہیں بنتی۔ کسی اور قسم کا مضمون لکھنے کی ابھی مجھ میں صلاحیت پیدا نہیں ہوئی۔

پھر دوسرا سوال میرے دل میں یہ آتا ہے کہ مجھے رواو پر مضمون لکھنے کا حق بھی پہنچتا ہے یا نہیں۔ آج کل اُس کی اہمیت تسلیم کر لی گئی ہے، بیسویں صدی کے سب سے بڑے مصوروں میں اُس کا شمار ہونے لگا ہے۔ لیکن اُس کے مداح اُس کی 'نظر' سے ڈرے ہیں۔ اُس کی تصویروں پر ریشمی غلاف ڈال رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے رواو بڑا عظیم مصور ہے، کیونکہ وہ طنز سے آگے نکل گیا اور المیہ تک جا پہنچا۔ بجا ہے۔ لیکن رواو کی طنز کو خارج کر دیجئے تو المیہ کدھر چلا جاتا ہے؟ کوئی کہتا ہے سبحان اللہ، رواو نے کیا روحانی ترقی کی ہے۔ مکمل عیسوی سکون حاصل کرلیا۔ مگر رواو کے یہاں سکون ہیجان سے الگ کب ہے، اور اُس ہیجان کے بغیر رواو کے سکون میں معنی کیا رہیں گے؟ اس کے بغیر المیہ کیسے پیدا ہوگا؟ خود رواو نے اپنی ایک تصویر کے نیچے اپنا ہی ایک مصرع لکھا ہے ---

"ڈوبتے ہوئے آدمی نے کہا، کل کا دن حسین ہوگا"۔

یہ سکون ڈوبتے ہوئے آدمی کا سکون ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ڈوبنا شرط ہے۔ لیکن رواو کے تازہ ترین مداح ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں کہ ڈوبنا کچھ نہیں، جو کچھ ہے سکون ہے۔ اوپر سے یہ مداح عیسائیت کے مفسر اور مبلغ بھی ہیں۔ یہ لوگ رواو کے ساتھ بھی یہی سلوک کر رہے ہیں اور خود حضرت عیسیٰ کے ساتھ بھی۔ اُنہیں حضرت عیسیٰ کی محبت

یاد ہے ، آن کا عفو اور ترحم یاد ہے ۔ مگر عیسیٰ کے درد و کرب سے ڈر لگتا ہے ، عیسیٰ کے عتاب و غضب سے گھبراہٹ ہوتی ہے ۔ انہیں وہ مسیح تو یاد ہے جس نے گناہ گاروں کو بخش دیا تھا ، لیکن وہ مسیح یاد نہیں رہا جس نے کہا تھا کہ میں دنیا میں امن لے کر نہیں آیا میری وجہ سے بیٹا باپ سے الگ ہو جائے گا ، اور بیٹی ماں سے -- جس نے تاجروں کو معبد سے نکال دیا تھا ، جس نے رومی گورنر کو صداقت کا مطلب بتانے سے انکار کر دیا تھا ۔ یہ عیسائی مسیح کی صلیب کو آسمانی نور کے پیچھے چھپانا چاہتے ہیں ، کیونکہ آج کل یہ صلیب زبردستی ، جنگ ، اور ایٹم بم کی ہے ۔ بیسویں صدی کے ٹامس اکوائناس یعنی ماری تاں اس صلیب کو نہیں پہچاننا چاہتے ، کیونکہ اسے پہچان لینے کے بعد فلسفیانہ سکون برقرار نہیں رہتا ۔ لیکن رواو اپنی تصویروں کے ذریعے ، اپنے الفاظ کے ذریعے بار بار یہی کہتا ہے کہ مسیح کو دنیا میں روز سولی پر چڑھایا جاتا ہے ، مسیح کی روز تضحیک کی جاتی ہے ، میں اس پیغام کو رواو کی عظمت سے الگ نہیں کر سکتا ۔ اسی پیغمبری سے رواو کی فن کاری پیدا ہوئی ہے ۔ رواو کی سیدھی سادی لائنیں اسی سیدھے سادے پیغام کی مجسم شکل ہیں ۔ رواو کہتا ہے کہ میں اس زمانے کا آدمی نہیں ، میری روح تو ازمنۂ متوسط کی ہے ۔ اور ازمنۂ متوسط وہ زمانہ ہے کہ جب فن اور اخلاقیات الگ الگ چیزیں نہیں تھیں ۔ فن اخلاقیات کی خدمت پر فخر کرتا تھا ، اور اخلاقیات فن کو ایک آسمانی قوت سمجھتی تھی ۔ لیکن اسپنڈر صاحبان کہتے ہیں کہ یہ اقدار از کار رفتہ ہیں ، اور صنعتی دور کی تہذیب میں کام نہیں دے سکتیں ۔ آسمانی سکون کی ضرورت البتہ پڑتی ہے ! لیکن رواو سے میں نے سب سے بڑی بات یہ سیکھی ہے کہ آسمانی سکون انسانی ہیجان سے ہی بنتا ہے ۔ رواو کے مداح آس کے سکون پر جتنا زور دے رہے ہیں ، آس کا ہیجان میرے لئے اتنا ہی گراں قدر بنتا جا رہا ہے ۔ لیکن آس کی تعریف کرنے کا مجھے حق بھی پہنچتا ہے یا نہیں ، یہ شک میرے دل میں اس وجہ سے پیدا ہوا کہ میں نے ظلم ، بے انصافی اور ریاکاری سے اتنی شدید نفرت نہیں کی جتنی رواو نے کی ہے ۔ میں نے رواو کے ہیجان کا ایسا تجربہ حاصل نہیں کیا کہ اسے جاننے کا دعویٰ کر سکوں ۔ رواو کے سکون کی تو میں بھی داد دے سکتا ہوں ، مگر آس کے درد کی تاب میں نہیں لا سکا ۔ اس لئے رواو کے متعلق لکھتے ہوئے میں بس مضمون نویسی ہی کر سکوں گا ، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ۔

رواو کی پیغمبری کا ذکر میں نے جس طرح کیا ہے آس سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں آس کی تصویروں کو پمفلٹ سمجھتا ہوں ، اور آنہیں دیکھنے کے بجائے پڑھتا ہوں ۔ لیکن میں نے جان بوجھ کر آس کی 'ادبیت' کو آبھارا ہے ۔ کیونکہ رواو خود بھی جان بوجھ کر اپنی ' ادبیت ' پر زور دیتا ہے ۔ Miserere سلسلے کی تصویروں کے لئے آس نے عبارتیں خود لکھی ہیں ۔ رواو بیسویں صدی کا سب سے دلیر مصور ہے ۔ وہ کسی نظریے ، کسی فارمولے کا قیدی نہیں بنا ۔ مگر ساتھ ہی کسی اسلوب سے ڈرا بھی نہیں ۔ انیسویں صدی کی ' تشریحانہ ' مصوری موضوع پر بہت زور دیتی تھی ۔ لوگ تصویر میں کہانی کا عنصر چاہتے تھے ۔ ۱۹۰۳ء میں رواو نے بیانیہ مصوری کے خلاف بغاوت کی ، اور تصویر کو قائم بالذات بنا دیا ۔ اس معاملے میں وہ سیزان ، پکاسو اور ماتیس کا ساتھ دے رہا تھا ، اور تصویر کو ادب سے آزادی دلا رہا تھا ۔ لیکن آس نے یہ پابندی بھی گوارا نہیں کی ، اور بغاوت کے خلاف بھی بغاوت کر ڈالی ۔ یعنی داستان گوئی کو نہ سہی ، موضوع کو پھر تصویر کے لئے اہم بنا دیا ۔ سو اب آس کی تصویریں ایک مستقل وجود رکھتی ہیں جس کا انحصار کسی خارجی عنصر پر نہیں ہوتا ۔ آس کے یہاں فن اپنی خالص شکل میں نظر آتا ہے ۔ اور وہ ہر بات اپنی تصویر کے ذریعے کہتا ہے ۔ لیکن وہ ' ادبی ' معنویت سے ڈرتا بھی نہیں ۔ آس کی تصویریں موضوع کا



ہم اپنے آپ کو ہم بادشاہ سمجھتے ہیں   عمل : رُواو



یسوع مسیح　　　　　　　　　　عمل : رُواو

’ ادب ‘ کو اپنے اندر اس طرح جذب کر لیتی ہیں کہ خارج اور داخل ، بیرونی اور اندرونی کا فرق مٹ جاتا ہے ۔ اس نے خود کہا ہے کہ تصویر ایک فوارہ ہے جو جاگی ہوئی روح کے اندر سے پھوٹتا ہے ۔ یعنی اس کی تصویروں میں موضوع ، خیال ، جذبہ ، اسلوب اظہار یہ سب چیزیں ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں رہتیں ، بلکہ سب عناصر اسی فوارے میں گھل مل کر ایک ہو جاتے ہیں ۔ رواو نے ایک طرف تو اپنے فن میں کسی قسم کی آلائش نہیں آنے دی ، اور دوسری طرف موضوع اور خیال یا پیغام کو اہمیت دے کر اپنے فن کو ایک نئی وسعت بخشی ۔ یہ جرأت اس زمانے میں رواو کے سوا اور کوئی نہیں کر سکا ۔ شاید پکاسو بھی نہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا انداز نظر شروع سے مذہبی تھا ، اور وہ مذہبی فن کو از سر نو زندہ کرنا چاہتا تھا ۔ چنانچہ جس زمانے میں مصور عکاسی کے اصول کو چھوڑ رہے تھے ، اس نے یہ اصول دوبارہ قبول کیا ۔ اس سے رواو نے کام کیا لیا ہے ، یہ ہم آگے چل کے دیکھیں گے ۔

روح تو خیر روح ٹھہری ، رواو کا اسلوب اور اس کی تفصیلات تک اس کے مذہب اور اس کے اخلاقی نظام سے نکلی ہیں ۔ پہلی ہی نظر میں جو چیز ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ کہ اس کی تصویروں میں ایک انچ جگہ بھی ایسی نہیں ہوتی جسے خالی کہہ سکیں ۔ خصوصاً مسخروں والی تصویروں میں ۔ پکاسو اپنے مسخروں کے گرد بہت سی جگہ خالی چھوڑتا ہے ، رواو کے مسخرے پوری تصویر کو بھر دیتے ہیں ۔ پکاسو کی کائنات بیسویں صدی کی کائنات ہے ۔ پکاسو کا انسان نہیں جانتا کہ کائنات میں میرا مقام کیا ہے ۔ اس کا مقابلہ ایک خلا سے ہے جو اس کی امید ، اس کی مایوسی ، اس کے شک اور اس کے استفسار سے پیدا کی ہے ۔ رواو کی کائنات از منۂ متوسط کی کائنات ہے ۔ اس میں خلا کا وجود نہیں ۔ اس کا ذرا سا کونا بھی اخلاقی اور روحانی معنویت سے خالی نہیں ۔ اس میں ہر جگہ یا تو خدا موجود ہے یا انسان ، بلکہ خدا اور انسان مل کر اس کائنات پر چھائے ہوئے ہیں ۔ رواو کی دنیا میں ابہام کی کوئی جگہ نہیں ۔ یہاں وجود ہی وجود ہے ، عدم سرے سے غائب ہے ۔ اس کائنات کے ذرے ذرے میں انسان کا درد بسا گیا ہے ، اور انسانی کرب نے خلا کو نیست و نابود کر دیا ہے ۔ انسان اگر کسی کے مقابلے پر کھڑا ہوتا ہے تو خدا کے سامنے یا اپنے سامنے ۔ یہ کائنات گونگی نہیں ہے بلکہ صور محشر کی آواز میں بولتی ہے ۔ یہاں انسان کبھی تنہا نہیں ہوتا ۔ خدا کی رحمت یا اپنے کرب سے کبھی آزاد نہیں ہوتا ۔ رواو نے بعض اوقات چاہے انسان کو جہنم کے شعلوں میں جا ڈالا ہو ، مگر اس نے انسان کی تنہائی ختم کر دی ہے ۔ انسانی زندگی کے ایک ایک لمحے کو با معنی بنا دیا ہے ۔ انسان اور زمان و مکان کا یہ تصور بیسویں صدی کے کسی اور مصور میں نہیں ملتا ۔ اس اعتبار سے صنعتی تہذیب کی جیسی نفی رواو نے کی ہے ویسی اور کوئی مصور نہیں کر سکا ۔

اس کی تصویروں کا واضح اور موٹا حاشیہ بھی تصویر کا جزو لاینفک ہوتا ہے ۔ مجھے تو اور کوئی مصور یاد نہیں آتا جس نے حاشیے کو اتنی گویائی عطا کر دی ہو ۔ رواو انسانی کائنات کی پہنائی پر اتنا زور نہیں دیتا جتنا اس کی گہرائی پر ۔ اس کے یہاں تجربے کا ہر لمحہ پوری کائنات کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے ۔ چنانچہ تصویر کا حاشیہ پہلے تو یہ ارتکاز پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے ۔ ہماری نظر کو یہ حاشیہ بھٹکنے نہیں دیتا ، بلکہ اسے محصور کر کے بار بار تصویر کے اندر کی طرف لے جاتا ہے ۔ شروع میں تو اس رکاوٹ کی وجہ سے ہمیں گھٹن محسوس ہوتی ہے ، لیکن جب ہم تصویر میں ڈوبنے لگتے ہیں تو معنی کی دنیا وسیع ہوتی چلی جاتی ہے ۔ محدود اور لا محدود کا یہ امتزاج اسی حاشیے کی بدولت پیدا ہوتا ہے ۔

یہ حاشیہ دراصل اخلاقی اور روحانی علاقوں نے تیار کیا ہے ۔ رواو کی کائنات محض ایک بے معنی پھیلاؤ نہیں ، بلکہ ایک اخلاقی نظام ہے جہاں ہر چیز ایک اخلاقی وجود رکھتی

ہے — اخلاقی اقدار کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ [میں نے صرف اخلاقی اس وجہ سے کہا کہ رواو کے لیے اخلاقیات، مابعد الطبیعات اور روحانیات الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔] رواو انسان کو اس اخلاقی نظام کے اندر دیکھتا ہے۔ اُس کے لیے انسان اسی لیے انسان ہے کہ وہ اس اخلاقی نظام کا حصہ ہے۔ اُس کے لیے انسان کی تعریف ہی یہ ہے کہ انسان ایک اخلاقی اور روحانی وجود ہے۔ نقاد کہتے ہیں کہ رواو صرف طنز نہیں کرتا بلکہ اپنے کرداروں کا المیہ دکھاتا ہے۔ یہ اسی لیے کہ جن لوگوں نے اپنے آپ کو مسخ کر لیا ہے وہ بھی اخلاقی وجود رکھتے ہیں، اور کائنات کے اخلاقی نظام سے باہر نہیں ہیں۔ یہ نظام ایسے لوگوں کو بھی ایک ایسی معنویت بخش دیتا ہے جس کے وہ اہل نہیں معلوم ہوتے۔ یہی ان لوگوں کا المیہ ہے، اور شاید اُس اخلاقی نظام کا بھی جس سے یہ لوگ آزاد نہیں ہو سکتے۔ رواو کا حاشیہ انسان کی اسی مجبوری اور اسی اختیار کی ترجمانی کرتا ہے۔ رواو کے کرداروں کے لیے کبھی تو یہ حاشیہ ایک شکنجہ بن جاتا ہے اور کبھی ماں کی گود۔ چاہے انہیں بھینچ ڈالے، مگر انہیں معدوم ہو کے راکھ بن جانے سے بچا لیتا ہے۔ رواو کے حاشیے کا پیغام یہ ہے کہ انسانی کائنات میں واضح اور ٹھوس حدیں موجود ہیں، انہیں کی بدولت انسانی زندگی ایک شکل اختیار کرتی ہے، اور انہیں حدوں کو قبول کر کے آدمی لا محدود بن سکتا ہے۔

رواو نے اپنا ایک امتیازی اسلوب ایجاد کیا ہے۔ وہ لکیریں تو کم سے کم استعمال کرتا ہے، لیکن یہ ہوتی ہیں اتنی گہری اور موٹی کہ یوں لگتا ہے جیسے شکلیں اُبھر کے تصویر سے باہر نکلی چلی آ رہی ہوں۔ اس چیز کو شدت احساس اور شدت اظہار کا نام دیا گیا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ازمنۂ متوسطہ کی دینیات ہے۔ آدمی کو ٹھوس اور با معنی وجود اخلاقیات سے حاصل ہوتا ہے، اور اخلاقیات کے بغیر اُس کے خد و خال دھندلے پڑنے لگتے ہیں۔ رواو کی تصویروں میں یہ دینیات ہی ہیئت کا تعین کرتی ہے۔ اُس کے لیے انسان بہت ہی ٹھوس چیز ہے، کیونکہ وہ ہر قسم کے انسان میں بہت ہی ٹھوس اخلاقی معنویت دیکھتا ہے۔ اُس کے یہاں انسان دھواں بن کر نہیں اُڑنے پاتا، یہ موٹی لکیریں انسان کو اخلاقی معنویت کے دائرے سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتیں۔ یہ معنویت انسان کے لئے ایک قید خانہ بھی ہے، اور وہ سانچہ بھی جس میں اُس کی ہستی ڈھلی ہے۔ رواو اس سانچے پر اتنا زور اس لیے صرف کرتا ہے کہ ہم اس سے آنکھ بچا کے نہ بھاگ نکلیں۔ اسی لیے یہ شکلیں اپنے چوکھٹے سے نکل نکل کر ہماری طرف لپکتی ہیں، ہماری اخلاقی بے حسی اور بے اعتنائی پر شبخون مارتی ہیں۔ رواو کی یہ موٹی موٹی لکیریں خود ہماری روح کو اپنے شکنجے میں کس لیتی ہیں، اور خود ہماری ہستی کو ایک نئی ہیئت دینا شروع کر دیتی ہیں۔

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ رواو نے اپنی تصویروں کو محکمۂ احتساب بنا کے رکھ دیا ہے۔ کسی چیز کی اخلاقی تعریف متعین کرنے کے معنی یہ نہیں کہ ہم نے اُس کے لیے ایک سزا تجویز کر دی، اور ہمارے اندر محبت یا ہمدردی بالکل ختم ہوگئی۔ یہ ازمنۂ متوسط کے ذہن کا کرشمہ ہے کہ وہ انسانوں کے افعال کی اخلاقی حیثیت متعین کرنے کے ساتھ ساتھ انسانوں سے محبت بھی برقرار رکھ سکتا ہے۔ ڈانٹے نے پاؤلو اور فرانچسکا کو اُن کے گناہ کے سبب جہنم میں جگہ دی ہے، لیکن اُن کے انجام پر اُس کا دل خون کے آنسو رویا ہے۔ یہ عیسوی انکسار ہے جو رواو میں بھی موجود ہے۔ وہ اپنی موٹی موٹی لکیروں سے ہر آدمی کے گناہ کا نام تو ضرور لکھ دیتا ہے، لیکن اُس کی ہستی کے المیہ پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ حساب کوڑی کوڑی کا، اور بخشش لاکھوں کی۔ رواو کی پیغمبری نے اُس کی انسانی محبت کو ختم نہیں کیا، بلکہ اُس میں ایک نئی آویزش اور ایک نیا سکون پیدا کر دیا ہے جو

رومانی انداز کی انسان دوستی سے بالکل الگ چیز ہے۔ رواو کی محبت اپنے اندر ایک ڈرامائی کشمکش اور ہیجان رکھتی ہے۔ اُس کی تصویروں کے بغیر اس محبت میں وہ ٹھنڈک نہیں آ سکتی تھی جو دھڑکتے ہوئے شعلوں کو ایک دم سے گلزار بنا دیتی ہے۔

رواو کی تصویروں کی ایک اور امتیازی خصوصیت وہ ٹکنیک ہے جو اُس نے ازمنۂ متوسط کی رنگین کھڑکیوں سے بنی ہوئی گوتھک گرجاؤں سے حاصل کی ہے۔ یعنی اکثر اُس کی شکلیں ٹکڑوں میں منقسم ہوتی ہیں، اور ایسی لگتی ہیں جیسے ٹکڑے جوڑ جوڑ کے بنائی گئی ہوں۔ یہ صرف نقالی نہیں۔ رواو نے اس انداز میں مطالب کی ایک دنیا بھر دی ہے۔ رواو کی ہر بات میں ایک جدلیاتی تضاد چھپا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں ایک معنی تو یہ نکلتے ہیں کہ انسان چند ٹکڑوں کا مجموعہ ہے، ایک کٹھ پتلی ہے جسے چند قوتیں حرکت میں لاتی ہیں۔ لیکن یہی جبر اختیار بھی بن سکتا ہے، بشرطیکہ انسان ایک اخلاقی اور روحانی نظام کو قبول کر لے۔ لہٰذا دوسرے معنی یہ ہوئے کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بھی انسان کی ہستی ایک وحدت ہی رہتی ہے جسے کسی قسم کا تجزیہ بھی برباد نہیں کر سکتا۔ اس ٹکنیک کے ذریعے رواو نے انسان کے انتشار اور اُس کی وحدت کو یک جان کر دیا ہے۔ اور انسانی ہستی کے دو رخ ایک ساتھ دکھا دئے ہیں۔ خصوصاً وہ حضرت عیسیٰ یا کسی ولی کی تصویر اس انداز میں بناتا ہے جو اپنی تصویر میں انسانیت کے سارے دکھ درد اور انسانی حوصلے کی ساری عظمتیں سمیٹ لیتا ہے۔ رواو ان تصویروں میں وہ انسانی روح پیش کرتا ہے جس میں زمین اور آسمان کی ساری وسعتیں بھی غائب ہو کر آ سکیں۔ یہ محض تصویریں نہیں بلکہ انسانی عظمت کی یادگاریں ہیں۔

پھر اس ٹکنیک میں ایک خالص فنی قسم کی بھی معنویت ہے۔ یہ ٹکڑے بناتے ہوئے جب رواو رنگ کے چھوٹے چھوٹے رقبوں کو اپنی سیاہ موٹی لکیروں سے گھیر دیتا ہے تو رنگوں کی قوت اور بھی مرتکز ہو جاتی ہے۔ رنگ مقید ہونے کے بعد اور بھی چمک اٹھتے ہیں، بلکہ بعض جگہ تو سلگ اٹھتے ہیں۔ خصوصاً جب لال رنگ کالے گھیرے میں آ جاتا ہے تو اس تضاد سے ایک آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے۔ جذبے کی یہ شدت اور بیان کی یہ صحت بیسویں صدی کے شاید ہی کسی اور مصور کو ملی ہو۔ رواو نے پیغمبروں کا جذباتی تلاطم اور کاریگروں کا اطمینان ایک ساتھ پایا ہے۔ اُس کے جذبات ایسے خالص اور بے میل ہیں کہ وہ کاریگروں والی کرتب بازی سے بھی نہیں گھبراتا۔ شدید سے شدید جذبے کا اظہار کرتے ہوئے بھی چھوٹے چھوٹے فنی تجربے کرتا رہتا ہے۔ اُس کے لیے کاریگری اور پیغمبری الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ وہ ہے ہی در اصل ازمنۂ متوسط کا آدمی۔ اُس عہد کی روایت نے رواو کی شکل میں دوبارہ جنم لیا ہے۔

اسی لیے رواو کے فن کو مذہبی اور غیر مذہبی دو حصوں میں بانٹنا غلط ہے۔ اُس کا فن ہمیشہ مذہبی رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے جدید مصوروں کے کسی گروہ کے ساتھ منسلک نہیں کیا جا سکتا۔ نہ تو وہ محض واقعیت پسند ہے نہ محض علامتی نہ محض اظہاری۔ نئے اسالیب کی ایجاد یا ان کا استعمال رواو کے لیے آخری مقصد کبھی نہیں بنا۔ اُس کی غرض و غایت تو یہ رہی ہے کہ اسالیب کے ذریعے انسان کی روحانی زندگی کو منور کیا جائے۔ ۱۹۰۳ء میں اُس نے داستان گوئی اور روایتی قسم کی کلاسیکیت تو چھوڑ دی تھی، لیکن اپنے ہم عصروں کی طرح یہ کوشش کبھی نہیں کی کہ تصویر میں کوئی واضح نفسیاتی یا اخلاقی یا روحانی معنویت نہ آنے پائے۔ اُس نے روحانی معنویت سے آزاد کبھی نہیں ہونا چاہا۔ بلکہ رواو کے اسلوب کا ارتقا زیادہ سے زیادہ معنویت کی جانب ہوا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اُس کا فن بھی ترقی کرتا رہا ہے۔ اُس کی فنی جد و جہد یہ رہی ہے کہ اپنی تصویر کو ہر اُس تفصیل

سے آزاد کرانے حس کے بغیر کام چل سکتا ہے ، بلکہ حس کے نہ ہونے سے معنویت اور زیادہ ابھرتی ہے ۔ چنانچہ اُس کا اسلوب بتدریج خالص تر ہوتا چلا گیا ہے ، اور اس میں صرف وہ عناصر باقی رہ گئے ہیں جو ایک جوہری نوعیت رکھتے ہیں ۔ یوں کہنا چاہئے کہ رواو کسی خیال یا جذبے کو بیان نہیں کرتا ، بلکہ اُس کی طرف چند اشارے کرتا ہے ۔ لیکن اس انداز کو محض اشاریت کہنا غلط ہوگا ۔ اُس کی تصویر میں تہ در تہ معنی جتنے چاہئے نکالتے چلے جائیں ، مگر ابہام ذرا نہیں ہوتا ۔ اُس کے اشارے اپنے اندر ایک واضح اور قطعی بیان کا زور رکھتے ہیں ۔ محض عقیدے کے بل پر کوئی آدمی بڑا فن کار تو نہیں بن سکتا ۔ لیکن اگر آدمی میں فنی صلاحیت موجود ہو تو گہرے عقیدے کے فیضان سے حوالوں کا ایک نظام دستیاب ہو جاتا ہے ۔ رواو کو اپنے ہم عصروں پر یہ ایک بڑی فوقیت حاصل ہے ۔ اس کے دو چار سیدھے سادے اشارے اتنا کچھ کہہ جاتے ہیں جو دوسرے لوگ اتنی آسانی سے نہیں کہہ سکتے ۔ چنانچہ ایک طرف تو اس کے عقاید نے رواو کو اپنے اسالیب کی تعمیر اور تشکیل میں مدد دی ہے ، دوسری طرف رواو اپنے اسالیب کو اپنے عقائد کے قریب سے قریب لایا ہے ، یہاں تک کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے میں مل ہو کر رہ گئی ہیں ۔

اسی طرح اُس کے جذبات اور تجربات کی نشو و نما میں بھی اُس کے مذہبی عقائد کا حصہ رہا ہے ۔ جس زمانے میں وہ طوائفوں اور مسخروں کی المناک تصویریں یا ججوں اور وکیلوں وغیرہ کے طنزیہ خاکے بنا رہا تھا اُس زمانے میں بھی رواو کا فن مذہبی تھا ۔ اُس نے حسن کے روایتی تصور کو خیر باد کہہ دیا اور چہروں کو زیادہ سے زیادہ مسخ کر کے پیش کیا تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو اوروں نے نہ کی ہو ۔ ممکن ہے بد صورتی کو اس حد تک روا رکھنے کی اتنی ہمت کسی اور مصور نے نہ کی ہو ۔ مگر اصل چیز یہ ہے کہ رواو نے ایسے موضوعات اور ایسے اسالیب کو استعمال کس طرح کیا اور معنویت کس قسم کی پیدا کی ۔ طوائفوں اور ایکٹروں کی زندگی کو اس زمانے میں عام طور سے مصوروں نے دو طرح استعمال کیا ہے ۔ یا تو انسانی زندگی کی بد صورتی ، گندگی اور بے کیفی کو ابھارنے کے لیے ، یا معنویت سے بے نیاز ہو کر خالص جمالیاتی تسکین کے لیے ۔ لیکن رواو نے ایسے موضوعات میں اس قسم کی دلچسپیاں نہیں ڈھونڈیں ۔ اُس نے تو ان چیزوں میں اور ہی طرح کے معنے دیکھے ہیں ۔ رواو کے یہاں بے ہنگم طوائفیں حسن اور بد صورتی کا تقابل نہیں پیش کرتیں بلکہ ازلی گناہ کی علامت بن جاتی ہیں ۔ رواو صرف ایک بد صورت اور گندا جسم نہیں دکھاتا ، بلکہ روح کے مقابلے میں جسم کی بد صورتی اور گندگی نمایاں کرتا ہے ۔ ان کے جسموں سے جہنم کے شعلے بھڑکتے ہوئے نکلتے ہیں — جسم خود ایک جہنم بن جاتا ہے جس میں انسان کی روح پڑی سلگ رہی ہے ۔ جسم اس کے اندر اتنی کراہت اور نفرت پیدا کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے رواو انسانی وجود کے خلاف ہی بغاوت کر رہا ہے ۔ جسم کے خوف کا اظہار بھی کوئی ایسی شدت اور قہاری کے ساتھ نہیں کر سکا جیسا رواو نے کیا ہے ۔

ایک لحاظ سے ہم رواو کو ازلی گناہ کا مصور تو کہہ سکتے ہیں ۔ لیکن صرف اس شدید راہبانہ رویے کے بل پر وہ اتنا عظیم مصور نہیں بن سکتا تھا ۔ رواو کا مذہب اُسے جسم سے نفرت کرنا تو ضرور سکھاتا ہے ، لیکن یہ بھی بتاتا ہے کہ مسیح نے انسان کی شکل میں جنم لیا تھا ۔ چنانچہ وہی جسم جس سے نفرت پیدا ہوئی تھی پرستش کے لائق بن جاتا ہے ۔ یہی انسانی ہستیاں جو ازلی گناہ کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں خدا کے رحم و کرم کی مستحق بھی ہیں ۔ لہذا رواو ان لوگوں کو جو ازلی گناہ کی علامت بن گئے تھے ایک اور نظر سے بھی دیکھتا ہے ۔ اُس کا عقیدہ ہے کہ مسیح کو دنیا قیامت کے دن تک بار بار صلیب پر چڑھاتی رہے گی ۔ ان دنیا کے ستائے ہوئے لوگوں کی شکل میں رواو کو مسیح مصلوب نظر آتا

ہے ، اور وہ ان گندے اور بد صورت انسانوں کے سامنے اپنا سر عقیدت جھکا دیتا ہے - جسم ایک جہنم سہی ، مگر وہ انسان کی روح کو فنا نہیں کرسکتا - اس لیے رواو انسانوں سے محبت کرتا ہے — ایسے انسانوں سے بھی جنہیں بظاہر محبت کا حق نہیں پہنچتا - انسانی روح کا المیہ اور رزمیہ اُسے اُن لوگوں میں ملا ہے جنہیں دنیا نے اپنی بارگاہ سے نکال دیا ہو - رواو کی کائنات میں ایسے لوگوں کو ولیوں کا رتبہ حاصل ہے - انسان کی ہستی سے یہ شدید نفرت اور یہ شدید محبت شاعری میں بس ویوں کو ملی ہے اور مصوری میں رواو کو - ایسی نظر جو بیک وقت انسان کے دو رخ دیکھ سکے ، اور نفرت کو عقیدت میں بدل کے رکھ دے ، ایسی نظر شاید رواو کے حصے میں ویوں سے بھی زیادہ آئی ہے -

وہ جسم سے خوف اور نفرت میں ہی پھنس کر نہیں رہ گیا ، اس سے بہت آگے نکل گیا ہے - اس وجہ سے کہ رواو انسانی روح کو کبھی نہیں بھولتا - وہ ظاہر کو نہایت غور سے دیکھتا ہے ، لیکن صرف اس لیے کہ اندرونی معنویت تک پہنچ سکے - وہ ہمیشہ بس یہی ایک چیز ڈھونڈتا ہے - ممکن ہے اس تفتیش کا آغاز کراہیت اور نفرت سے ہؤا ہو ، لیکن جب اُسے اندرونی معنویت مل جاتی ہے تو یہ نفرت ایک دم سے محبت اور عقیدت کے جذبے میں تبدیل ہو جاتی ہے - رواو کا کمال یہی ہے کہ اُس کی نظر تو بڑی بے رحم ہے ، مگر دل رحم کے جذبے سے بھرپور ہے - سخت گیری اور نرمی ، احتساب اور ہمدردی کا یہ امتزاج بس رواو کا ہی حصہ ہے -

رواو کے یہاں خاص طور سے مسخروں کی تصویریں قابل غور ہیں - پکاسو کے مسخرے بھی المیہ رنگ رکھتے ہیں ، لیکن اس لیے کہ کائنات میں ان کی کوئی جگہ متعین نہیں معلوم ہوتی - وہ بالکل کھوئے کھوئے نظر آتے ہیں - رواو کے مسخروں کا المیہ ایک اور ہی وجہ سے پیدا ہوتا ہے - یہاں کشمکش یہ ہوتی ہے کہ ان کی ہستی معنویت سے خالی ہے یا اعلیٰ ترین معنویت کی حامل ، یہ لوگ محض مسخرے ہیں یا خدا - رواو نے اپنی ان تصویروں میں Ecce homo کا عیسوی رمز پیدا کر دیا ہے - آپ کو وہ روایت یاد ہوگی کہ یہودی تو حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھانا چاہتے تھے ، لیکن رومی گورنر انہیں بے ضرر اور مجنون سمجھتا تھا - چنانچہ اُس نے حضرت عیسیٰ کو اپنے سپاہیوں کی تحویل میں دے دیا - رومی سپاہیوں نے اُنہیں کانٹوں کا تاج پہنایا ، اور مذاق ہی مذاق میں اُن کی رسم تاج پوشی ادا کر ڈالی - رومی گورنر نے حضرت عیسیٰ کی یہ گت بنے دیکھی تو اسے ہنسی بھی آئی اور ترس بھی آیا - چنانچہ وہ اُنہیں یہودیوں کے سامنے لایا ، اور کہا کہ "لو ، اس آدمی کو دیکھو"- اُس کا مطلب تو یہ تھا کہ اس فاترالعقل کو کیوں ستاتے ہو - مگر اس جملے میں رمز کی بات یہ ہے کہ 'آدمی' تو وہی ایک ہے ، لیکن دیکھنے والے کی نظر کے مطابق اُس کی معنویت اور قدر و قیمت بدلتی جاتی ہے - اس ذرا سے جملے میں انسانی تقدیر کا پورا تضاد اور پورا المیہ موجود ہے — آدمی مسخرا بھی ہوسکتا ہے اور پیغمبر بھی - یہ رمز رواو کے ذہن پر مسلط ہے ، اور وہ بار بار اسی کی طرف آتا ہے - کبھی تو وہ مسخروں کی شکل میں حضرت عیسیٰ کی مشابہت پیدا کرتا ہے ، اور کبھی حضرت عیسیٰ کی وہ صورت پیش کرتا ہے جو رومی سپاہیوں کو نظر آئی ہوگی - یعنی رواو کا بنیادی اور مرکزی موضوع ہے حضرت عیسیٰ کی ہستی کا رمز - یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ انسانی تقدیر کا مسئلہ - چونکہ یہ مسئلہ ایک تضاد سے پیدا ہؤا ہے ، اس لیے رواو قدم قدم پر اس تضاد کو نمایاں کرتا چلتا ہے - ایسے نقادوں کے قول کے مطابق آسانی سکون جتنا چاہئے حاصل ہو گیا ہو ، لیکن یہ جدلیاتی کشمکش ہی اُس کے فن کی جان ہے - Miserere سلسلے کی تصویروں کے آخر میں جہاں اُس نے اُمید کا سورج طلوع ہوتا دکھایا ہے وہاں بھی ہم یہ فیصلہ نہیں کرسکتے کہ

یہ صبح ازل ہے یا روز محشر۔ رواو کو اس سورج میں خواہ کچھ بھی دکھائی دیتا ہو، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض لوگوں کو صبح ازل بھی روز محشر ہی معلوم ہوگی۔ چنانچہ رواو نے اس سورج کو دو طرح کی نظر سے دیکھا ہے۔ اس کی عظمت یہی ہے کہ انسان کے تضاد کا احساس اسے ایک نئی وحدت کی تخلیق سے نہیں روک سکتا، اور نئی وحدت کی تخلیق کرتے ہوئے وہ اس تضاد سے آنکھ چرانے کی کوشش نہیں کرتا۔

لیکن فلسفہ طرازی میں پڑ کر ہمیں رواو کی سماجی تنقید کو نہیں بھولنا چاہئے۔ بعض نقادوں نے رواو کے فن کی وجہ عظمت اس بات میں سمجھی ہے کہ وہ طنز سے آگے نکل آیا۔ لیکن یہ بات تو ہر بڑے طنز نگار کے متعلق کہی جاسکتی ہے۔ ایک رواو ہی کیا، مولئیر اور سوئفٹ کا بھی یہی حال ہے۔ بہر نوع اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی ہمیں رواو کے طنزیہ غصے کو ایک فروعی چیز نہیں سمجھنا چاہئے۔ اگر اس میں ایسا غصہ نہ ہوتا تو اس کا سکون بھی جھوٹا ہوتا۔

صلح کل وہ کیا سراپا جو نہ ہو شان جہاد
زندگی کو یوں نہ کر اے دوست صرف رسمیات

رواو کا غصہ اس کی عیسائیت کا لازمی جزو، اور اس کی رحم دلی کا دوسرا رخ ہے۔ اس غصے کا شکار سب سے زیادہ جج، وکیل اور وہ شریف لوگ ہوئے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ہمارے لیے جنت میں جگہ محفوظ ہے۔ ان لوگوں کے حق میں رواو بڑا سنگ دل واقع ہوا ہے۔ یہ تصویریں اس نے رنگ سے نہیں بلکہ کیچڑ اور آگ سے بنائی ہیں۔ اور اپنی اخلاقی نفرت کے سارے ذخیرے ان پر صرف کر دئے ہیں۔ بے انصافی، ظلم، لالچ، خود پرستی، ریاکاری کے خلاف یہ آتشیں احتجاج در اصل انسان سے رواو کی محبت کا مظہر ہے۔ اس کی راہبانہ ذہنیت اسے مجبور کرتی ہے کہ جس دنیا میں انسانی محبت نہ ہو اسے کسی قیمت پر بھی قبول نہ کرے۔ رواو کا نظام اقدار کیا ہے یہ اس نے Miserere والی تصویروں کے عنوانات میں تفصیل سے بتا دیا ہے۔ ایک طرف تو رواو کو احساس ہے کہ انسان کے لیے جینا ویسے ہی مشکل کام ہے، دوسری طرف وہ دیکھتا ہے کہ آدمی آدمی کے لیے بھیڑیا بن گیا ہے۔ انسان کی زندگی ایک مسلسل اذیت ہے، ہم زنجیروں میں قید ہیں، لیکن پھر بھی اپنے آپ کو ' بادشاہ ' سمجھتے ہیں۔ خصوصاً وہ لوگ جو با اقتدار ہیں یا مہذب کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں نے محبت اور انکسار اپنے دل سے نکال پھینکا ہے، خود درستی کے نشے میں سرشار ہیں، ہر ایک نے کوئی نہ کوئی نقلی چہرہ اوڑھ رکھا ہے — دیانت داری کا، عقلمندی کا، راست بازی کا، شرافت اور تہذیب کا۔ لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے عمل سے مسیح کی تضحیک کر رہے ہیں، اور انہیں اذیت پہنچا رہے ہیں۔ مسیح کی آخری پناہ گاہ غریبوں اور بے آسرا لوگوں کا دل ہے۔ یہی وہ اندھے ہیں جو آنکھ والوں کو راستہ بتا سکتے ہیں۔ بلکہ حضرت عیسیٰ انہیں لوگوں کی شکل میں ہمارے درمیان موجود ہیں، اور ہمیں محبت کا پیغام دے رہے ہیں۔ وہ اپنی اس شکل میں روز ابد تک دکھ جھیلتے رہیں گے، لیکن انہیں کے زخم انسانیت کے درد کا علاج ہیں۔ اسی لیے رواو کے یہاں ہمیں حضرت عیسیٰ کی دو طرح کی تصویریں ملتی ہیں۔ شروع کی تصویروں میں تو ان کی حیثیت مظلوم کی ہے — اس مظلوم کی جس پر دنیا ستم کر رہی ہو۔ آخر کی تصویروں میں یہ دکھ خود حضرت عیسیٰ کی قوت ارادی کا نتیجہ بن جاتا ہے، کیونکہ دکھ سہہ کر انہیں دنیا سے نفرت کو مٹانا ہے۔ مگر ان تصویروں میں بھی دنیا کے بھیڑیے پن کے خلاف رواو کا احتجاج ختم نہیں ہوتا۔ البتہ اب وہ محبت کے معنی واضح کرنے لگا ہے۔ یعنی حضرت عیسیٰ کی نفرت اور غصے کو نظر انداز کئے

بغیر اُس نے سطح کی معنویت میں اور گہرائی پیدا کی ہے ۔ اُس نے طنز کو چھوڑا نہیں ، بلکہ محبت میں سمو دیا ہے ۔ کیونکہ ان دونوں کو جو چیز اُس میں ملاتی ہے وہ انسانی کرب ہے ۔ وہ خود کہتا ہے کہ میرا ایمان تو انسانی کرب پر ہے ۔ اُس کے اندر جو بھی نشو و نما ہوئی ہے اور جتنے بھی انقلاب آئے ہیں وہ سب اسی جیتے جاگتے کرب کی بدولت ۔ اور اسی کرب نے اُس کے فن کو زندہ رکھا ہے ۔ اگر وہ خالی تکنیک پر قناعت کر کے بیٹھ جائے تو اس کا فن بھی مر جائے ۔

اب تک ہم نے دیکھا کہ رواو کے یہاں مذہب کا رنگ بہت نمایاں ہے ۔ لیکن یہ ایسی چیز ہے جس پر رواو کو ذرا بھی شرم نہیں آتی ۔ ازمنہ متوسطہ کے فن کاروں کی طرح اُس کے نزدیک بھی تبلیغ فن کا ایک مقدس فریضہ ہے ۔ وہ فن کے ذریعے اپنے دین کی خدمت کرنے کا قائل ہے ۔ مگر وہ فن کے معاملے میں بھی اتنا ہی مخلص ہے جتنا دین کے معاملے میں ۔ وہ جو بھی کہتا ہے اپنے اسلوب کے ذریعے ۔ اُس نے فن برائے فن اور فن برائے زندگی کا فرق مٹا دیا ہے ۔ اُس کی تصویروں کے معاملے میں یہ بحث ہی مہمل بن جاتی ہے ۔ بیسویں صدی کی مصوری میں اگر کوئی خالص تزئین مبلغ ہے تو رواو ، اور خالص تزئین کی کار ہے تو رواو ۔

آپ اس حقیقت کو سمجھنا چاہیں تو اُس کے بنائے ہوئے مناظر دیکھیے ۔ یہاں اُس کے محبوب ترین موضوع ہیں خزاں کا موسم اور جاڑے کا موسم ۔ رواو نے جس کثافت سیاری اور سادگی کے ساتھ منظر کشی کی ہے اُس کی مثال جدید مصوری ہی میں ملے گی ، یورپ میں نہیں ۔ دوسری طرف معنویت کا یہ عالم ہے کہ رواو کا بنایا ہوا منظر انسان کا سارا دکھ اور سارا کرب اپنے اندر جذب کر لیتا ہے ۔ یہ منظر منظر نہیں رہتا ، بلکہ انسان کی روح بن جاتا ہے ۔ غرض جو چیز کسی اور کے یہاں حماقت ہو کے رہ جاتی وہ رواو کے یہاں تعزل میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔

لیکن یہ تغزل ڈرامے کی شان رکھتا ہے ۔ رواو چیزوں کو جیسے دیکھتا ، اُن کے اندر جو کشمکش اور ہیجان ہے اُسے دیکھتا ہے ۔ اُسے ہر چیز میں اجتماع ضدین نظر آتا ہے ۔ یہی اجتماع ضدین رواو کے فن کی جان ہے ۔ غصہ اور نرم دلی ، نفرت اور محبت ، تلخی اور شیرینی ، حیوانیت اور معصومیت ، ہیجان اور سکون ، احتساب اور انکسار ، حزن اور آنسو ، مایوسی اور اُمید ، جلال اور جمال ، جسم اور روح ، طنز اور وجدانیت ، پیغمبری اور فن کاری — ان سب چیزوں کے اتصال کا نام رواو ہے ؛ اور ان میں سے ہر چیز اُس کے فن کا لازمی جزو ہے ۔ اس کے فن کی زندگی اسی تضاد کے دم سے قائم ہے ۔ اسی اجتماع ضدین نے رواو کے فن کو ایک چھلاوا بنا دیا ہے ، کبھی کچھ نظر آتا ہے کبھی کچھ ۔ اور اگر اپنے تعصبات دور کر کے دیکھا جائے تو سب کچھ ایک ساتھ نظر آتا ہے ۔ انسانی وجود کے معمے کو بیسویں صدی کے کسی اور فن کار نے اس جرأت اور اس ہمہ گیری کے ساتھ پیش نہیں کیا ۔ انسانی تقدیر کا سوال کسی اور نے اس بے جگری کے ساتھ نہیں اُٹھایا ۔ پیغمبری اور فن کاری دونوں کا حق کسی اور نے یوں ایک ساتھ ادا نہیں کیا ۔

اور میرے نزدیک اُس کی عظمت یہ ہے کہ مذہبی مصور ہونے کے باوجود اُس کی تصویروں میں تہذیبی آزادی کی انجمن کی رکنیت کے آثار کہیں بھی نظر نہیں آتے — حالانکہ ماری تاں صاحب اُس کے نام سے ممبری کی فیس جمع کر چکے ہیں ۔

سفـــر

برگیڈیر گلزار احمد
اشفـاق احمد
شنیق الرحمان
قدرت اللہ شہاب
نـاصر کاظمی
انتظار حسین
شیخ صلاح الدین
حنیف رامے



بیا سحر — عمل : فرناندو کاسترو پاچیکو

دوسری عالمی جنگ کا ایک سفر — بریگیڈیئر گلزار احمد

کراچی کا شہر کچھ ہمیشہ سے ہی یوں بے تعلق اور غیر دلچسپ شہر نہ تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کی بندرگاہ ہوتے ہوئے لوگ اپنائیت کی ایک گہری وابستگی کے ساتھ کراچی کو اپنا شہر کہتے تھے۔ میں بھی انہیں لوگوں میں سے تھا۔ کراچی کا اس وقت یہ عالم نہ تھا کہ ایک دنیا اس میں آباد ہو مگر اس کی مٹی سے کسی کو بھی محبت نہ ہو۔

۱۹۴۱ء میں جب دوسری عالمی جنگ کا محاذ مشرق وسطیٰ کی طرف اٹھنے لگا تو فوجوں کے وہاں جانے کی ضرورت پڑی۔ فوجوں کے ساتھ غیر فوجی عملہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ میں نے فوجی ہوتے ہوئے عربی زبان میں مترجم کی سند حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ جب عراق میں ناصریہ کے مقام پر پہلا سرکاری مترجم گولی کا نشانہ بن گیا تو مجھے فوجی زندگی سے علیحدہ کر کے ترجمان کے خالصتاً غیر فوجی کام کے لیے فوراً عراق کے لیے چنا گیا، گو مجھے صرف اتنا حکم ملا کہ کراچی پہنچنا ہے۔ حفاظتی قوانین کے تحت جو احکام مجھ تک پہنچے ان میں صرف کراچی کے 'مرکز نقل و حرکت' (Movement Control) کے ہیڈ کوارٹرز میں رپورٹ کرنے کو کہا گیا تھا۔ یہ احکام پا کر میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جانتا تھا کہ کراچی سے میری یہ 'تجدید محبت' عارضی ہوگی۔ ایک دن یا زیادہ سے زیادہ دس چار دن۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کراچی کے ریل اسٹیشن، ٹرانزٹ کیمپ اور بندرگاہ کے علاوہ کچھ دیکھ ہی نہ سکوں۔ مگر ان مقامات کے ساتھ بھی تو میری ان گنت یادیں وابستہ تھیں۔ عجیب ترین بات یہ تھی کہ وہ یادیں بھی پہلی عالمی جنگ سے متعلق تھیں۔ کہیں یہ خیال نہ پیدا ہو کہ میں نے پہلی عالمی جنگ میں بھی حصہ لیا تھا۔ میری مراد صرف اتنی ہے کہ فوجی خاندان سے متعلق ہونے کی وجہ سے ہمارے بے شمار عزیز و رشتہ دار اس ریل اسٹیشن، اس ٹرانزٹ کیمپ اور اس بندرگاہ سے سمندر پار جاتے اور واپس آتے تھے۔ اور میں اپنے والد مرحوم کے ساتھ ان کی پذیرائی کے لیے ان مقامات پر اکثر آیا جایا کرتا تھا۔ اب دوسری عالمی جنگ زوروں پر تھی اور اب دوسری دفعہ انہیں قدموں کے نقوش پر چل رہی تھی جو پہلی دفعہ چھوڑے تھے۔ کوہستان نمک سے دور دراز کے اجنبی صحراؤں اور میدانوں اور وادیوں تک۔

انہیں خیالات میں کراچی صدر اسٹیشن آ گیا۔ اسٹیشن کی شکل و شباہت میں کوئی تبدیلی نہیں واقع ہوئی تھی۔ بلکہ آج بھی صدر کا اسٹیشن ویسا ہی ہے جیسا ۱۹۱۴ء میں ہوا کرتا تھا۔ ایک پتھر یا اینٹ کا اضافہ بھی تو نہیں ہوا۔ میں اس کے ایک ایک پتھر کو پہچانتا ہوں۔ وہاں سے ٹیکسی لے کر نقل و حرکت کے ہیڈ کوارٹرز میں پہنچا۔ انہوں نے ٹرانزٹ کیمپ جانے کو کہا مگر پھر یہ دیکھ کر کہ میرا تعلق بلوچ رجمنٹ سے ہے، اجازت دے دی کہ رجمنٹ کے مقامی میس (Mess) میں انتظار کے دن گزاروں۔ میس میں کئی پرانے ساتھی مل گئے جن کے ساتھ دو دن، رات گئے تک محفل سازی اور داستان طرازی کا بازار گرم رہا۔ پرانے واقعات اور سہانی یادوں کی قندیلیں روشن کی گئیں۔ گزشتہ سال ڈیڑھ سال جو علیحدہ علیحدہ گزرا تھا اس زمانے کے تجربات و مشاہدات کے رنگا رنگ پیوند جوڑے گئے۔ تیسرے دن یہ لوگ پریڈ پر گئے ہوئے تھے کہ مجھے بندرگاہ پر طلب کر لیا گیا۔ پہنچا تو کہا گیا کہ جہاز تیار ہے سوار ہو جاؤ۔ چنانچہ دوستوں کو خدا حافظ کہے بغیر سفر پر روانہ

ہو گیا ۔ یہ میرا پہلا بحری سفر تھا ۔

جہاز گو تجارتی قسم کا تھا مگر فوجی اغراض میں استعمال کیا جا رہا تھا ۔ مسافر بھی فوجی تھے اور سامان بھی فوجی نوعیت کا ۔ یہ کوئی آٹھ ہزار ٹن کا جہاز ہوگا ۔ بعد میں تو بہت بڑے بڑے جہاز بھی دیکھنے میں آئے مگر اُس وقت یہ جہاز بھی میری نظر میں بہت بڑا تھا جس میں ہزاروں ٹن سامان ، سینکڑوں لوری کی پوری موٹریں اور ہزاروں مسافر سما جائیں ۔ ایک زرعی ملک کے باشندے کے لیے بھلا کیا وہ کوئی چھوٹا جہاز ہو سکتا تھا ؟ افسروں کے کمرے جو عام طور پر پہلے اور دوسرے درجے کے مسافروں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں بڑے صاف ستھرے تھے ۔ کھانے کا کمرہ عمدہ ہوٹلوں کی طرح سجا ہؤا تھا ۔ نشست گاہ بھی خوب تھی ۔ کمروں سے بالائی تختے پر نشست گاہ میں جانے کے لیے جو سیڑھیاں تھیں ان پر بڑھیا قالین بچھے ہوئے تھے ۔ ابھی جنگ شروع ہوئے ڈیڑھ برس ہی تو ہؤا تھا ۔ ابھی متمدن انسان کی نفاست پسندی زنگ آلود نہیں ہوئی تھی ۔

میرے کمرے میں دو ہم سفر اور بھی تھے ۔ دونوں انگریز ۔ اس قوم کا معمول ہے کہ جب تک رسمی طور پر تعارف نہ ہو جائے غیر تو غیر یہ اپنی قوم کے فرد سے بھی ہم کلام نہیں ہوتے ۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اپنا اپنا سامان جمانے ، سجانے میں مصروف ہوگئے ۔ اس سے فارغ ہوئے تو جہاز کا جغرافیہ جاننے کے لیے نکل پڑے ۔ جہاں جہاں جانے کی اجازت تھی ایک ایک حصے کو خوب گھوم پھر کے دیکھا ۔ جس طرف مسافروں کا گزر ممنوع تھا ادھر سے لوٹ آئے مگر یہ خیال ضرور پیدا ہوتا کہ خدا معلوم یہاں کون سی شے تھی جس کو ۔ کہنا تھا جس کے پاس جانا ممنوع ہے ۔ بار بار اپنے کمرے کی طرف آتے اور پھر نکل کھڑے ہوتے ۔ نشست گاہ میں پہنچتے مگر بیٹھتے ہی پھر اٹھ کھڑے ہوتے ۔ ساتھ ہی دارالمطالعہ تھا ۔ وہاں کتابوں کی الماریوں پر ایک نظر ڈالی مگر ابھی ذہن کتاب کو لے کر بیٹھ جانے کے لیے تیار نہ تھا ۔ اس کمرے میں دوسری طرف رسائل و جرائد رکھے تھے ۔ ان پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے اور پھر تختۂ جہاز کی طرف چل پڑتے ۔ گودی میں کسی کی طرف چہل پہل تھی ۔ ٹین کی چھت والی بارکوں سے نکل نکل کر لوگ ابھی جہاز کی جانب آ رہے تھے ۔ آگے آگے خود اور پیچھے قلی سامان اٹھائے ہوئے جو سیڑھی کے دہانے سے لوٹ جاتے تو مسافر اپنے سامان سے خود گتھم گتھا ہو جاتے ۔ پاس ہی جر ثقیل بوجھل سامان کو بڑے بڑے جالوں میں لپیٹ ، سمیٹ کر جہاز میں لاد رہے تھے ۔ پہلے جال زمین پر بچھا کر اس میں سامان بھرا جاتا ۔ پھر جر ثقیل کے رسے تن جاتے اور جال لپٹنا شروع ہو جاتا ۔ اتنے میں ایک خفیف سے جھٹکے کے ساتھ سامان سمیت جال بلند ہوتے ہوتے عرشۂ جہاز سے بھی اوپر نکل جاتا ۔ پھر جر ثقیل چلانے والا سامان کو گھما کر ' مخزن جہاز ' (Hold) کے عین اوپر لے جاتا پھر جال اور سامان اس کمرہ میں غائب ہونے لگتا ۔ تھوڑی دیر کے بعد خالی جال اوپر کو لوٹ آتا ۔ اور پھر وہی عمل جاری ہو جاتا ۔ مجھ سے نہ رہا گیا ۔ میں مخزن کی طرف چل کھڑا ہؤا کہ دیکھوں آخر یہ کتنی بڑی جگہ ہے جہاں سامان کے اتنے بڑے بڑے تودے بار بار غائب ہو جاتے ہیں ۔ دیکھا تو ایک بہت بڑا غار سا نظر آیا جس کی تہہ میں بڑے بڑے صندوق اور کھوکھے اور نہ معلوم کیا کیا کچھ بکھرا پڑا تھا ۔ نیچے کچھ مزدور اس سامان کو قرینے سے لگا رہے تھے ۔ جال سامان سے بھرا ہؤا ایک بار پھر اس غار نما مخزن کے اوپر پہنچا ۔ میں سمجھا کہ میرے سر سے ٹکرائے گا مگر اس نے اپنا راستہ قائم رکھا ۔ رسے پیچھے کو کھسکتے گئے اور جب سامان مخزن کی تہہ کے قریب پہنچا تو جال کے دو کونوں کو ڈھیل دے دی گئی ، سامان کھڑ کھڑا کر تہہ پر انڈیل دیا اور رسہ پھر اوپر کھینچ لیا گیا ۔ کتنا تھکا دینے والا نظارہ تھا یہ ۔ مگر پھر بھی آنکھیں اس جال اور اس کے

آهنی رسوں کی حرکت کو خشکی سے جہاز تک تعاقب کرتیں اور منتظر رهیں کہ وہ کب مخزن سے باهر نکلیں اور ایک بار ان کا یہ عمل دهرایا جائے۔ عین اسی طرح جس طرح ڈول کنوئیں میں ڈال کر بار بار پانی نکالا جاتا ہے یا رهٹ چلتا رهتا ہے اور آدمی بے خیالی میں اسے دیکھتا رهتا ہے۔ بعد میں جہاز کی دوسری جانب گیا تو وهاں کراچی کی بندرگاہ کا اندرونی منظر کچھ کم دلچسپ نہ تھا۔ جن جہازوں کو رصیف پر جگہ نہیں ملی تھی وہ بندرگاہ (Harbour) کے بیچوں بیچ لنگر انداز تھے۔ کہیں کہیں کوئی مسافر یا جہاز کے عملہ کے آدمی تختۂ جہاز کے آهنی جنگلے کے ساتھ کہنیاں ٹیک کر کھڑے هو جاتے اور ذرا سا جھک کر اردگرد کے جہازوں کی طرف دیکھتے۔ لنگر انداز جہازوں کا عملہ کشتیوں میں بیٹھ کر شہر کی سیر کو چلا جاتا ہے۔ جو چند نفوس جہاز پر کام کاج کے لیے رہ جاتے هیں ان کے لیے یہ وقت نہایت گراں بار هو جاتا ہے۔ جب وہ یوں ساحل کی طرف تھوڑی دیر کے لیے بے توجہی سے دیکھتے تو لامحالہ انہیں اکتاهٹ شروع هو جاتی اور وہ بیزاری کی حالت میں جماهی لیتے هوئے اندرون جہاز پلٹ جاتے۔

سامنے منوڑا تھا۔ سطح سمندر سے ابھری هوئی چند چٹانوں پر مشتمل جزیرہ جس پر انگریزی عہد سے قبل قلعہ هؤا کرتا تھا۔ میں کتنی هی بار بچپن میں یہ جزیرہ دیکھنے کے لیے گیا تھا۔ کبھی گھر والوں کی معیت میں اور کبھی دوستوں کے همراہ۔ جونہی دوستوں کا خیال آیا تو ۱۹۲۱ء کا وہ واقعہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا جب کلاس ماسٹر مقبول الٰہی صاحب کے ساتھ منوڑہ کا روشنی مینار دیکھنے گئے تھے۔ کیماڑی کے بندرگاہ پر پہنچے تو بادبانی کشتیاں دیکھ کر حیرت هوتی تھی۔ کشتی روانہ هوئی تو بادبان کھول دئے گئے۔ هوا نے کشتی کی رفتار کو تیز کر دیا تھا مگر اس وقت یہ سب کچھ هم سب کے لیے ایک معمہ تھا۔ کشتی بان کا لڑکا جو هماری عمر کا تھا وہ جب بادبان باندھنے کے لیے مستول پر چڑھتا تھا تو اس کے اس کرتب کو هم نے کس مرعوب نگاهی سے دیکھا تھا۔ روشنی مینار کے اوپر جب پہنچے تھے تو اس کے کل پرزوں اور بیش قیمت شیشے کو کس حیرانی سے دیکھا تھا۔ ایک ایک کر کے سبھی دوست آنکھوں کے سامنے آگئے۔ عبداللہ کاکا۔ احمد بخش۔ محمد بخش۔ عبدالستار۔ شیر بهادر اور سب سے عزیز دوست مقبول حسین۔ مگر وہ تو اب یورپ میں کسی جرمن سپر کیمپ میں هوگا۔ بندرگاہ پر پژمردگی و ماندگی چھا چکی تھی۔ میں پلٹ کر جہاز کے اندر چلا گیا اور خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔

دوپہر کے بعد کمانڈار جہاز کی طرف سے بلاوا آیا۔ اسے سفر کے دوران میں جہاز پر ایڈجوٹنٹ کی ضرورت تھی۔ اس کام کے لیے اس نے ایک انگریز کپتان کو چنا اور چونکہ خود کمانڈار کے علاوہ میں هی دوسرا سینیئر تھا، مجھے نائب کمانڈار کے فرائض سونپے۔ یہ فرائض کیا تھے۔ اس کے متعلق واضح طور پر نہ مجھے معلوم تھا اور نہ هی اس نے مجھے بتانے کی کوشش کی۔ اصل مقصد صرف اتنا تھا کہ اگر وہ موجود نہ هو تو تمام عساکر کی کمان میں سنبھال لوں۔ کمانڈار جہاز کو جہاز کی نقل و حرکت، اس کی رفتار یا اس کے کام کاج سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ کام جہاز کے کپتان کا تھا۔ مسافر عساکر هی صرف اس کے احکام کے تحت تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد هر افسر کو اپنی اپنی بچاؤ پیٹی (Life Belt) لانے کی هدایت کی گئی۔ جہاز کے ایک نوجوان افسر نے همیں ان کے استعمال کے طریقے سے آگاہ کیا اور حکم ملا کہ کمرے سے باهر بچاؤ پیٹی هر وقت مسافر کے ساتھ رهے گی۔ اب دوسری حفاظتی تدبیروں کے متعلق احکام صادر کئے گئے۔ جہاز پر هر شخص کے لئے حادثاتی مقام (Emergency Station) مقرر کیا گیا۔ هر پارٹی کا ایک کمانڈار اور ایک نائب کمانڈار مقرر کیا گیا۔ احکام پہنچانے کے طریقے کی وضاحت کی گئی۔ مشق کے طور پر دو تین بار هر ایک اپنے اپنے

حادثاتی مقام پر کھڑا کیا گیا اور جس جس کشتی یا حفاظتی تختے پر بیٹھ نکلنے کے لئے پارٹیاں بانٹی گئی تھیں ان کا تعین کیا گیا۔ آخر میں اندھیرا قائم رکھنے کی مفصل ہدایات دی گئیں۔ یعنی پہلی ہی شب سے سونے سے پہلے بحری روشندان (Port Holes) بند کئے جانے ضروری تھے۔ یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ شام کے بعد ایک افسر چکر لگا کر دیکھا کرے گا کہ سب اوٹ بند ہیں یا نہیں۔ شام کے بعد تختۂ جہاز پر سگریٹ پینے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ جو دروازے باہر کی طرف کھلتے تھے وہ دوہرے تھے۔ اندر آتے وقت یا باہر نکلتے وقت ہدایت کی گئی کہ ایک دروازہ کھول لینے کے بعد دوسرا دروازہ اس وقت تک نہ کھولا جائے جب تک پہلا دروازہ پوری طرح بند نہ کر دیا جائے تاکہ اندر کی روشنی باہر کی جانب نظر نہ آئے۔ یہ ہدایات کچھ اس سنجیدگی اور پر از خدشات لہجے میں دی گئی تھیں کہ دشمن کی موجودگی کا احساس ہونے لگا۔ شام سے پہلے ہی یہ تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اس لیے شام کا کھانا جلد ہی ختم کیا اور پھر جا کر سو رہے۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو جہاز ہچکولے کھا رہا تھا۔ تھوڑی دیر تو ذہن نے اس نئی حالت کو قبول نہ کیا۔ سوچا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور میں کہاں ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ گزشتہ ایام کے واقعات آنکھوں کے سامنے آنے شروع ہوئے۔ سکندرآباد سے روانگی۔ لاہور۔ اور خیال آیا کہ نہ معلوم گھر والوں کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ اتنی مہلت بھی نہیں ملی تھی کہ بیوی بچوں کو گھر تک پہنچا سکتا۔ انہیں لاہور سے گاڑی پر بٹھا دیا تھا۔ ملازم ان کے ساتھ تھا مگر وہ چترال کا درانی کوہستان نمک کے راستوں کو کیا جانے۔ نہ معلوم وہ کہیں راستہ بھول جائیں۔ لاہور کے بعد دو الحاقی سٹیشنوں پر انہیں گاڑی بدلنی تھی۔ یہ خدشات دیر تک ذہن پر سوار رہے اور میں بھول گیا کہ کہاں ہوں۔ جب تفکرات بڑھ جاتے ہیں تو ذہنی حالت ایک ایسے نقطے پر پہنچتی ہے جہاں انسان انہیں زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتا اور پھر ان سے فرار اختیار کرتا ہے۔ میں نے بھی وہی نتیجہ کیا۔ کروٹ بدلی۔ سر کو جھنجھوڑا کہ یہ مخدوش قسم کے خیالات اس میں سے نکل کر بکھر جائیں اور جس گاڑی پر انہیں سوار کیا تھا اسے چھوڑ کر کراچی کی گاڑی کو ذہن میں جگہ دی۔ بہت جلد میں کراچی پہنچ چکا تھا اور آناً فاناً جہاز پر تھا۔ اب محسوس ہوا کہ جہاز حرکت میں ہے۔

اٹھا۔ اٹھ کر سرہانے کی بوتل سے پانی نکال کر منہ ہاتھ دھونے کے لیے نل کی طرف گیا۔ مگر جب نلکی کی تو پانی کے کھاری پن کو کام و دہن نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

وردی پہن کر اوپر آئے۔ ناشتہ تیار تھا۔ جنگ کے دوران میں اہالیان ملک کے لیے خورد و نوش کا سامان اکثر کم مقدار میں دستیاب ہوتا ہے، البتہ افواج کے لیے ہر شے کی فراوانی ہوتی ہے۔ جہاز پر تو خشکی کے مقابلے میں بھی ہر شے زیادہ مقدار میں مہیا کی جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سمندر کی صاف اور تازہ ہوا میں بھوک زیادہ لگتی ہے اور ہر شخص معمول سے زیادہ خوراک کھاتا ہے۔ ناشتے کے بعد تختہ جہاز پر آئے۔ نہایت لطیف ہوا چل رہی تھی اور سمندر ساکن تھا۔ ہوا کی وجہ سے ہلکی ہلکی سی لہریں سطح آب پر ظاہر ہو رہی تھیں مگر ان کی حرکت اس قدر خفیف سی تھی کہ ایک لہر دوسری سے ٹکراتی نہ تھی بلکہ جیسے پانی کی ایک شکن دوسری شکن کو ہلکا سا ہچکولہ دے رہی ہو اور وہ ذرا سی کھسک کر ایک اور لہر کو تھوڑا سا ہلا دے۔ اور یوں ہزاروں لاکھوں شکنیں سطح آب پر نمودار ہو رہی تھیں۔ پانی کا گہرا نیلا رنگ آسمان کے صاف شفاف مگر ہلکے نیلے رنگ کو مات کر رہا تھا۔ آسمان پر روشنی کی وجہ سے کہیں کہیں سفیدی کے آثار تھے مگر نیچے تاحدنظر گہرا نیلا رنگ پھیلا ہوا تھا۔ دور افق پر یہ نیلاہٹ سیاہی میں تبدیل ہو

رہی تھی۔ مچھلیاں کبھی کبھی ذرا سی دیر کے لیے اپنی ناک پانی سے باہر نکالتیں اور جہاز کی طرف توجہ کیے بغیر پھر غوطہ لگا جاتیں۔ کبھی کبھی اُڑن مچھلی پانی سے یک لخت نمودار ہوتی، ہوا میں پانچ دس گز کی جست لگاتی اور پھر پانی میں گم ہو جاتی۔ ایک بار پانچ چھ بڑی بڑی مچھلیاں جن کا حجم ڈیڑھ فٹ کے برابر ہوگا صف کی صورت میں نمودار ہوئیں اور جہاز کے متوازی اچھلتی کودتی اور غوطہ لگاتی ہوئی بڑھنے لگیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جہاز کے ساتھ رفتار کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ ان کی رفتار کچھ اس قدر تیز تھی کہ کافی دیر وہ اس مقابلے میں رہیں ان کی صف میں خم نہ آیا۔ پھر جس طرح ظاہر ہوئی تھیں اسی طرح یکایک غائب ہو گئیں۔ آبی پرندے بھی کبھی کبھی نظر آجاتے۔ مگر گویا ابھی ہم خشکی کے قریب ہی تھے ورنہ وہ یوں ہمارے ساتھ ساتھ نہ آتے۔ اس دن کے بعد یہ پرندے پھر ظاہر نہ ہوئے۔

اچھی طرح یاد نہیں مگر میرا خیال ہے کہ سفر میں دوسرا یا تیسرا دن تھا کہ سمندر کی سطح غیر ہموار ہونا شروع ہوئی۔ دوپہر تک ہوا بھی تیز ہو گئی اور لہریں اس طرح ایک دوسری سے ٹکرانے لگیں جیسے ان کے ہاں بھی جنگ چھڑ گئی ہو۔ جوں جوں لہروں کی آمد تیز ہوتی گئی، جہاز کی جانبی حرکت بھی تیز ہوتی گئی۔ سہ پہر کے وقت تو تختۂ جہاز پر توازن قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ اب بہت کم ایسے تھے جو اپنے کمرے سے باہر نظر آتے ہوں۔ پہلے روز کھانے کے کمرے میں میزوں اور کرسیوں کو فرش کے ساتھ کنڈوں سے جکڑا دیکھ کر میں حیران ہوا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ ان کنڈوں کا بھی کوئی مقصد تھا۔ جانبی حرکت کے بعد جب جہاز کا اگلا حصہ یک لخت کسی بلند لہر سے نیچے گرتا تو ایسے معلوم ہوتا کہ دل سینے کی تہہ میں جا پڑا ہے۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو طبیعت پر جبر کر کے اپنی حالت کو درست رکھوں گا۔ دو ایک بار سر چکرایا مگر میں نے کمرے میں جانے سے اپنے آپ کو روکے رکھا۔

اکیلے نشست گاہ میں بیٹھنا بھی طبیعت پر گراں گزرتا تھا اس لیے میں نے لائبریری کا رخ کیا۔ پہلے روز ایک ناول اٹھا کر لے گیا تھا۔ آج لائبریری کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ سیر و سیاحت پر اچھا خاصا مواد موجود تھا۔ جنگ سے پہلے اس جہاز کی آمد و رفت عام طور پر مشرق بعید کے ساحلی علاقوں تک محدود تھی۔ اس لیے مشرق بعید پر سیاحت کا ذخیرہ سب سے زیادہ تھا۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں جو کتابیں انگریزی زبان میں برما، ملایا، جزائر شرق الہند، ہند چینی اور چین و جاپان پر چھپ چکی تھیں ان میں سے اکثر وہاں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ مشرق بعید کی یورپی آبادی کی زندگی سے متعلق ناولوں اور افسانوں کے مجموعے خاصی تعداد میں تھے۔ اس قوم کا خاصہ رہا ہے کہ یہ اپنے وطن کے ان باشندوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرتے رہے ہیں جو دور دراز ممالک میں اپنے وطن کی زندگی کسی حالت میں بھی بسر کرتے رہے ہوں۔ تاجر، ڈاکٹر، سیاح، ملاح، ربڑ کے کاشت کار، افیون کے ٹھیکیدار اور تبلیغی مشن کے افراد، غرضیکہ اس افسانوی زندگی میں سبھی قسم کے لوگ شامل تھے۔ کتابوں کے اس نایاب مجموعے میں ان ممالک سے متعلق تاریخی عنصر بھی موجود تھا مگر اس میں مستند کتب بہت کم نظر آتی تھیں۔ عام طور پر جو لوگ ان لائبریریوں سے استفادہ کرتے ہیں ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ زیادہ سنجیدہ ادب یا مستند کتب کا مطالعہ کریں۔ انہیں ایسی کتب کی تلاش ہوتی ہے جن میں ہلکے پھلکے پیرائے میں ان ممالک کی زندگی اور ان کے حالات درج ہوں تاکہ یہ اپنے عارضی قیام کے دوران میں اپنی روایات کو تسلیم شدہ روایات اور خطوط پر قائم رکھ سکیں۔ کتابوں کی الماریاں کھلی رہتی تھیں۔ جو چاہتا اپنی پسند کی کتاب نکال لیتا، اسے جہاں چاہتا لے جاتا اور پڑھ لینے کے بعد لائبریری

میں واپس کر دیتا - اس کا ایک نتیجہ یہ ہوگیا تھا کہ کتابیں اپنی اپنی جگہ پر شاذ و نادر ہی رکھی جاتی تھیں اور اگر کسی خاص کتاب کی جستجو ہوتی تو اس کا ملنا مشکل ہو جاتا - میں نے جہاز کے عملے کے ایک افسر سے پوچھا کہ اس طرح آپ کی کتابیں ضائع نہیں ہوتیں تو وہ کہنے لگا کہ جنگ سے پہلے عام طور پر ہر سفر میں دو چار کتابیں ضائع ہو جاتی تھیں - خوانندوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی اس لیے ایک مستقل لائبریرین ملازم رکھنا فائدہ مند نہ تھا - جب سے جنگ شروع ہوئی تھی اس کا کہنا تھا کہ کتابیں پہلے سے بہت کم ضائع ہوتی تھیں - میں نے پوچھا "اس لیے کہ فوجی لوگ کتابیں کم پڑھتے ہیں -" مسکرا کر کہنے لگا "شاید" اور پھر "یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ آپ لوگ کتاب لوٹا دینے کا خیال رکھتے ہیں -"

اس سفر کے دوران میں ، میں نے اس چھوٹی سی لائبریری سے خوب استفادہ کیا اور مشرف بعید پر بعض ایسی کتابیں بھی نظر سے گزریں جن کے دیکھنے کی توقع مجھے ہرگز نہ ہو سکتی تھی -

ہمیں ابھی تک یہ معلوم نہ تھا کہ ہمارا عزم کہاں کا ہے --- البتہ مجھے یقین تھا کہ افسر جب میس میں یا تختۂ جہاز پر بیٹھے ہوتے تو یہی موضوع زیر بحث رہتا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں - البتہ مجھے یقین تھا کہ عرب ممالک کا رخ ہے اس لیے کہ مجھے اپنی پلٹن سے جدا کرنے کا صرف ایک ہی سبب ہوسکتا تھا اور وہ یہ کہ 'اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی' کے مصداق میں عربی جاننے کی وجہ سے سمندر پار بھیجا جا رہا ہوں - لہٰذا میرا کام کسی عرب ملک ہی میں ہوسکتا تھا - عرب ممالک میں مصر اور عراق ہی ایسے دو ممالک تھے جہاں برطانوی اور ہندوستانی فوجیں موجود تھیں - میں نے جب یہ استدلال اپنے ساتھیوں کے سامنے پیش کیا تو وہ میری اس دلیل سے خاطر ہوگئے - اس وقت ہندوستان کی فوجیں ملایا میں بھی موجود تھیں اور گو ابھی وہاں جنگ کا آغاز نہیں ہؤا تھا مگر وہاں کے لیے کافی کمک ضرور روانہ کی جا رہی تھی - ملایا سے آمدہ اطلاعات سے مظہر تھا کہ وہاں فوجیں ابھی ایام نہایت عیش و نشاط کے ماحول میں گزار رہی ہیں - اس کے برعکس مغرب یعنی مصر و عراق میں ابھی جنگ کے شعلے مدھم نہیں پڑے تھے اور مزید برآں وہاں سے آمدہ اطلاعات کے مطابق وہاں کی آب و ہوا اور زندگی میں کوئی شے بھی جاذب نہ تھی -

یہ عقدہ بھی پانچویں دن حل ہوگیا - سامنے بھورے سے رنگ کی دھندلی سی ابھر نمودار ہوئی جو غیر محسوس طور پر بڑھتی گئی - قریب آنے پر بے برگ و گیاہ قسم کی سرزمین نظر آئی - تھوڑی ہی دیر بعد آبنائے ہرمز کی چٹانیں ہمارے بائیں جانب تھیں اور ہم خلیج فارس میں داخل ہوچکے تھے - خلیج فارس کی گرمی بحیرۂ عرب سے بھی زیادہ تھی - تیز ہوا کی وجہ سے اگر کمروں سے نکل کر باہر تختۂ جہاز پر آ کھڑے ہوتے تو گرمی سے نجات ضرور ملتی مگر یوں بے مقصد اور بے کار کھڑے رہنے کی بھی حد ہوتی ہے - کمروں کے اندر پنکھے ضرور تھے مگر کراچی کی طرح جس طرف سے پنکھے کی ہوا آ رہی ہوتی بدن کا وہ پہلو یا حصہ تو آرام میں رہتا ، باقی ماندہ جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا اور بدن کا رواں رواں زندگی کے خلاف بغاوت بپا کر دینے پر آمادہ ہو جاتا مگر اس زندگی سے یوں چھٹکارا حاصل نہیں ہو سکتا کہ جس وقت چاہا نجات حاصل کر لی اور جب چاہا زندہ ہو گئے -

ساتویں دن صبح جب تختۂ جہاز پر پہنچے تو سامنے کھجوروں کے جھنڈ لہرا رہے تھے - پانی کا رنگ بھی گدلا سا تھا - دریائے شطالعرب کا پانی - سرزمین ترکی ، شام کے شمالی حصوں اور عراق عرب کی مٹی اس میں شامل تھی - گزشتہ پانچ ہزار سال میں اس مٹی نے کرۂ زمین کے اس حصے کا نقشہ ہی بدل ڈالا ہے - جب آر میں کلدانی تہذیب عروج پر تھی ، اس وقت یہ

مقام جسے اب فاؤ کہتے ہیں دریائے شطالعرب کا دہانا نہ تھا بلکہ دہانے سے ایک سو تیس میل جنوب کی جانب سمندر میں ایک ناقابل تعین مقام تھا ۔ آج پانچ ہزار سال کے بعد یوں بہہ کر آئی ہوئی مٹی نے درمیانی فاصلے کو خشکی میں تبدیل کر دیا ہے ۔ آر جو کلدانیوں کے وقت میں بندرگاہ کے بالکل قریب تھا آج صرف برباد ہی نہیں بلکہ سمندر سے اتنی زیادہ مسافت پر ہے کہ اس کے ساحل سمندر کے قریب ہونے کا گمان بھی نہیں ہو سکتا ۔ یہ درمیانی علاقہ ابھی پوری طرح پر نہیں ہؤا ۔ اب بھی کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے نالے رہ گئے ہیں جن میں سمندر کا پانی دور تک اندرون ملک چلا جاتا ہے ۔ پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں ان نالوں کا الحاق بصرہ کے ساتھ تھا جو فاؤ سے اسی میل کے فاصلے پر ہے ۔ یہ نالے جب نہروں کے ساتھ ملتے تھے اور یوں ان نہروں میں بھی سمندر کا پانی پہنچ جاتا تھا ۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان نہروں میں مچھر پیدا نہیں ہوتے تھے ۔ چونکہ سمندر کے کھارے پانی سے باغوں کو نقصان پہنچ رہا تھا اس لیے پہلی عالمی جنگ کے بعد ان نہروں اور نالوں کا الحاق توڑ دیا گیا تھا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ بصرہ میں ملیریا کے مچھروں نے بسیرا کر لیا اور ۱۹۴۰ میں حملہ کی فوجوں کا کافی اتلاف ملیریا کی وجہ سے ہؤا ۔ اس امر کو ۱۹۴۰ کے اواخر میں ایک معروف پاکستانی ڈاکٹر نے معلوم کیا ۔ ان کا شمار آج کل ملیریا کے خاص ماہرین بین الاقوامی ماہروں میں ہوتا ہے ۔

شطالعرب کے دونوں کناروں پر کھجوروں کے درخت قطار اندر قطار نہایت خوشنما منظر پیش کر رہے تھے ۔ بلند و بالا ، انفرادی شان اور سرا نے چوٹی کے پتوں کے ، برگ و بار سے مبرا درخت اس سرزمین کی نسل کی بے نیازی کا نمونہ پیش کر رہے تھے ۔ یہ درخت بہترین پھل کا حامل ہے مگر جو ہمت کر کے اس کی چوٹی تک پہنچ سکے وہی اس سے مستفیض ہو سکتا ہے ۔ عین اسی طرح جس طرح آج صحرا کی تہہ سے دولت کے انبار نکالے جا رہے ہیں مگر اس کے لئے بھی علم و ہنر اور ہمت و استقلال کی ضرورت پڑتی ہے ۔ صحرا کی یہ دولت عین دریا کے کنارے تک لائی جاتی ہے ۔ وہاں اسے صاف کیا جاتا ہے اور پٹرول بردار جہاز اس آتشیں دولت کو دنیا کے کونے کونے تک لے جاتے ہیں ۔ اس کا نمونہ سامنے تھا ۔ فاؤ کے بعد ابادان تھا ۔ جہاں تیل بردار جہاز کھڑے تھے تیل ڈال رہے تھے ۔ اسی تیل کے بل بوتے پر آج کل کی تہذیب کا دار و مدار ہے ۔ مگر اس وقت ہمارا ذہن تہذیب کی طرف منتقل نہیں ہؤا تھا بلکہ تیل کی جنگی اہمیت نے ذہن میں جگہ لے لی ۔ آج کل کی جنگیں نہایت مہنگی پڑتی ہیں ۔ اس کے لیے ہزاروں جہاز ، سینکڑوں ، ہزاروں ہوائی جہاز ۔ اور لاکھوں کی تعداد میں مختلف قسم کی موٹریں ، ٹینک اور دیگر مشینیں ۔ اور پھر یہ تمام مشینیں اس وقت تک بے کار ہوتی ہیں جب تک ان کو چلانے کے لیے آب آتشیں کافی مقدار میں موجود نہ ہو ۔ اس کو مہیا کرنے کے لیے اعلیٰ درجے کی مشینوں کے علاوہ جس تکنیکی ہنر کی ضرورت ہے وہ معروف ہے ۔

آبادان کے قریب تھوڑے سے فاصلے پر دو جہاز ڈوبے ہوئے تھے ۔ ایک داہنے کنارے کے قریب اور دوسرا بائیں کنارے کے قریب ۔ جہازوں کے مستول پانی کی سطح سے اوپر نظر آ رہے تھے ۔ پہلی نگاہ میں تو سمجھ میں نہ آیا کہ ان کے اس طرح ڈوبنے کی وجہ کیا تھی ۔ نظر آ رہا تھا کہ دو جہاز ڈوبے ہوئے ہیں ۔ اگر دونوں ایک ہی جگہ ڈوبتے تو راستہ بند ہو جاتا ۔ اگر دور دور ڈوبے ہوئے ہوتے جب بھی اتفاق کو دخل ہو سکتا تھا ۔ لیکن اس قدر قریب قریب اور یوں ڈوبنے کی خاص وجہ ہونی چاہئے تھی ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہؤا یہ پہلی عالمی جنگ میں ڈبوئے گئے تھے ۔ تا کہ انگریزی افواج جو ہندوستان سے ترکوں کے خلاف بھیجی جا رہی تھیں وہ بصرہ تک پہنچنے نہ پا سکیں ۔ جس جرنیل کو یہ حکم دیا

گیا تھا کہ دو جہاز جا کر ایسی جگہ ڈبو دے جہاں دریا کا پاٹ تنگ ہو - اس نے جہازوں کو ڈبویا تو ضرور البتہ اس طرح کہ راستہ مسدود نہ ہو - کہتے ہیں کہ یہ جرنیل عراقی النسل تھا اور عربی آزادی کی خفیہ تحریک کا ممبر رکن ہونے کی وجہ سے اس نے ترکی فوج اور حکومت کے ساتھ غداری کی - ایسے ہی واقعات ترکوں کی شکست کا باعث بنے تھے - بارہا سننے میں آتا ہے کہ مسلمان قوم نے بہت سے غدار پیدا کئے ہیں - سلطان شہید کے ساتھ سر زمین ہند میں بھی ایسے ہی برتاؤ ہؤا - بنگال کی تاریخ بھی غداری کے واقعات سے خالی نہیں - دولت غرناطہ نے بھی اپنے آخری ایام میں اسی قسم کے مسلمانوں کے ہاتھوں زخم کھائے - یہ سب سچ تھا - مگر میری ذاتی رائے ہے کہ اس کے باوجود بھی مسلمان قوم میں غداروں کی موجودگی کوئی غیر معمولی بات نہیں - ہر قوم میں خاص خاص حالات میں غداروں کا وجود ہوتا ہے - جب کبھی کوئی قوم تنزل کی ایک حد سے گزر جاتی ہے اس کے بعد اس کے افراد غداری کرتے ہوئے نہیں شرماتے - اس کی وجہ یہ ہے کہ مادی اور دنیاوی کمزوریوں کا باعث ہمیشہ اخلاقی تنزل ہؤا کرتا ہے - جب اخلاقی تنزل نے پہلے ہی ملک کو مادی تنزل سے دوچار کر دیا ہو تو ملک کے برسراقتدار اشخاص اس تنزل کی رفتار کو تیز تر کرنے سے نہیں جھجکتے اور ذاتی مفاد کی تکمیل کی غرض سے ملک و ملت کو بیچنے سے نہیں کتراتے - غداری کے واقعات صرف ایسے ماحول میں رونما ہوتے ہیں جس میں مادی کمزوری کے علاوہ اخلاقی و مذہبی اقدار گر چکی ہوں اور جب مذہب محض رسومات کی پوٹ بن کر رہ جائے - مذہب و ملت اور ان کے مفاد یا ان سے متعلق افراد کی ذمہ داریاں کوئی ایسی چیز تو نہیں جو چاند ستاروں کی طرح چمک کر جسم انسان کو اپنی طرف مائل کرلیں - قومی ملی اور ملکی فرائض تو قلب کی کیفیت پر منحصر ہوتے ہیں - جب قلب بے سوز ہو ، جب روح مردہ ہو چکی ہو ، جب خالق العالمین کی طرف کبھی کسی نے توجہ ہی نہ کی ہو ، جب اللہ کی ربوبیت پر اعتماد نہ ہو تو یہ اشرف المخلوقات دیکھنے میں تو اشرف المخلوقات ہی ہوتا ہے مگر اس کا قلب سیاہ ، عمل حیلہ ساز کے اشاروں پر کچھ اس انداز سے چلتا ہے کہ وہ اپنے ہر قبیح عمل کو مستحسن ہی سمجھتا ہے اور اس کے جواز میں ہزاروں بہانے پیش کرتا رہتا ہے - یہ حالت نہ کسی خاص قوم سے مخصوص کی جا سکتی ہے اور نہ ہی کسی خاص ملک سے بلکہ یہ حالت ہر جگہ ، ہر مقام اور ہر وقت پر رونما ہو سکتی ہے - شرط صرف یہ ہے کہ سالہا سال اور صدیوں کی بے توجہی ، زرپرستی ، تن پروری اور خود غرضی نے مادی اور روحانی حالت کو کمزور کر دیا ہو - ایسی حالت میں جب وہاں کے افراد کے سامنے سیم و زر کا لالچ پیش کیا جاتا ہے تو وہ حفظ خودی اور اپنی اہلیت و حقوق کا پردہ سامنے رکھ کر ملک و قوم کے مفاد کی جڑوں پر غیروں کی کلہاڑی چلانے سے دریغ نہیں کرتے -

آبادان کے بعد محامرہ سے گزرے - سابق شیخ محامرہ شیخ خزال کا محل لب دریا واقع ہے - ایک طرف دریا ہے اور دونوں طرف سے نہریں گزر رہی ہیں - تینوں طرف نہایت وسیع باغات ہیں - دولت کی فراوانی ہر شے پیدا کرلیتی ہے مگر جب تک اخلاقی اقدار اور خود داری و غیرت موجود نہ ہو اس وقت انسان اپنے حقیقی مقام تک نہیں پہنچ سکتا - شیخ محامرہ کی اولاد آج اپنی ریاست سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور یہ لوگ معمولی زمینداروں سے زیادہ حیثیت کے مالک نہیں - یہی شیخ ستر اسی میل لانبی چوڑی ریاست کا مالک تھا مگر ملت اسلام کے مفاد کبھی اس کے دل میں بیدار نہ ہوئے تھے - اس نے جو عہد نامے بیرونی سلطنتوں سے کئے وہ اب اس کاغذ سے بھی ارزاں سمجھے گئے ہیں جن پر وہ لکھے گئے تھے - بعد میں مجھے اس محل میں ٹھہرنے کا موقع ملا - چھت کی اینٹوں پر انگلستان کے بادشاہوں ، وزیروں اور نوابوں کی تصویریں منقش تھیں - مگر جب ضرورت پڑی تو ان تصویروں والے شہنشاہوں کی

حکومت نے شیخ خزال کو بچانے کی ذرہ بھر بھی کوشش نہ کی اور اس کی ریاست کا وجود بھی مٹ گیا - عین اسی طرح جس طرح اس نے اپنے زمانے میں اپنی پڑوسی اسلامی سلطنتوں کے مٹانے کے منصوبوں میں شرکت کی تھی -

دریا کے دونوں طرف نہریں نکالی گئیں ہیں - چونکہ دریا اس جگہ بہت گہرا ہے اس لیے دریا پر بلد وغیرہ لگانا مشکل ہے - یونہی دریا کے کنارے کھود کر دریا کے عمودی رخ پر نہریں کھود لی گئیں ہیں - شطالعرب مد و جذر کا دریا ہے - اور یہ اثر بصرہ سے کئی میل اوپر تک چلا جاتا ہے - بصرہ کے مقام میں مد کی اونچائی چھ فٹ سے زائد ہے اور دریا کے دھانے پر ، یعنی فاؤ کے مقام پر اٹھارہ فٹ کے قریب ہے - بصرہ سے اوپر کے مقامات تک مد کے اوقات پر ان نہروں میں پانی بھر جاتا ہے اور باغات کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں - ہر شب و روز میں دو بار بغیر کسی محنت کے آبپاشی ہو جاتی ہے - مالک کو صرف نہریں کھودنی پڑتی ہیں اور درخت لگانے ہوتے ہیں ، آبپاشی کی ضرورت نہیں پڑتی - دریا کے کنارے سے لے کر دو تین میل تک باغات ہیں - اس کے بعد صحرا ہے - ملک کی آبادی اتنی گھٹ گئی ہے کہ زیادہ سرزمین کو سیراب کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی - علاوہ ازیں دونوں ملکوں میں اتنی صدیوں سے بد امنی رہی ہے کہ زراعت اور صنعت کی طرف توجہ دینے پر بہت کم لوگ تیار ہوتے ہیں - طوائف‌الملوکی کا خاصہ ہے کہ لوگ قبائلی زندگی کو شہری اور دیہاتی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں اور طوائف‌الملوکی میں آبپاشی جیسے کام کی طرف توجہ دینے کے لیے نہ تو کوئی اجتماعی ادارہ تیار ہوتا ہے اور نہ ہی افراد کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے -

محامرہ سے گزرے تو دس گیارہ بجے کا وقت ہو گا - اب گرمی زیادہ ہو چلی تھی اور ہوا بند تھی - تختۂ جہاز پر ٹھہرنا باعث تکلیف ضرور تھا مگر دریا کے کناروں کی طرف دیکھنے کا شوق اس زحمت کو بھی گوارا کرنے پر مجبور کر رہا تھا - محامرہ کے بعد زمینداروں کی دیہی کوٹھیوں کی تعداد بڑھ رہی تھی - صاف شفاف ، سیمنٹ کے سفیدی شدہ مکانات اور ان کے ارد گرد کھجور ، انار اور انگور کے باغات اس گرمی کے باوجود بھلے معلوم ہو رہے تھے - کہیں کہیں کوئی مکین مکان کے برآمدہ میں کھڑے ہو کر گزرتے ہوئے جہاز کی طرف دیکھتا مگر اجنبی فوج کو ہاتھ ہلا کر اھلاً و سہلاً کہنے والا کوئی نہ تھا - ہماری داھنی طرف ایران تھا اور بائیں طرف عراق - مگر ہر دو ممالک میں ہماری حیثیت حملہ آور فوجوں کی تھی اس لیے خوش آمدید کی توقع ہی نہ تھی - عام طور پر مکانوں کے پاس سے نہریں آ کر گزرتیں اور بعض مکانوں کے صحن چمن سے سیڑھیاں دریا یا نہر تک اترتیں جہاں چھوٹی سی کشتی یا دخانی لانچ رسوں سے بندھی ہوتی - مالک مکان کی شاموں کی تفریح کا ثبوت -

دوپہر کے قریب بصرہ کے مضافات میں پہنچے - سب سے پہلے کھجور کے مخزن تھے - کھجوروں کی فصل کے ایام میں ان مخازن کی رونق بڑھ جاتی ہے - یہاں پر کھجوریں ٹوکروں اور صندوقوں میں بند کی جاتی ہیں - ہر مخزن کے پاس ہی دریا کے کنارے چھوٹی سی رصف بنی ہوتی ہے جہاں سے ان صندوقوں کو کشتیوں میں لاد کر جہازوں تک پہنچا دیا جاتا ہے - اعلیٰ قسم کی کھجوروں میں سے گٹھلیاں نکال کر ان میں بادام بھر دئے جاتے ہیں - عراق کی کھجور دنیا بھر میں معروف ہے - جتنی غذائیت کھجور میں ہے اتنی کسی اور پھل میں نہیں - بدن کو طاقت بخشنے کے علاوہ اس میں لذت بھی موجود ہے اور بدن کی خاص خاص کمزوریوں کا علاج بھی - شکر کی افراط اور ایک دو اور خصوصیات کی وجہ سے اس میں جراثیم زندہ نہیں رہ سکتے - ایک بار تجربے کے طور پر کھجوروں کے ایک ڈبے میں پیچش کے جراثیم ڈالے گئے اور اسے بند کر کے مصر روانہ کیا گیا - پندرہ دن کے بعد جب ان کھجوروں کا کیمیائی تجزیہ کیا گیا تو جراثیم مر چکے تھے - مگر کھجور کی یہ خاصیت صرف سال بھر تک قائم رہتی

ہے ۔ قدرت کا اصول ہے کہ نئے فصل تک ہی پہلی فصل کی خاص خصوصیات قائم رہتی ہیں ۔ اس کے بعد اس میں جرائم کے حملوں کی روک تھام کی خصوصیات ختم ہونا شروع ہو جاتی ہیں ۔ یہی حال اکثر جڑی بوٹیوں کا ہے جنہیں ہم روزمرہ دوا کے طور پر استعمال کرتے ہیں مگر بہت کم حکیم اور ڈاکٹر ہیں جو مریضوں کو دوا دیتے وقت اس دوا کی عمر کی طرف توجہ کرتے ہیں ۔ مخاذن کے بعد چند روساء کے بنگلے ہیں اور پھر عشار کی نو آبادی ہے ۔ اس کے سامنے مشرقی کنارے پر تنومہ ہے جس کے جنوب کے دونوں کنارے عراق میں شامل ہیں ۔ یہاں سے جہازوں کی رصیفیں شروع ہو جاتی ہیں ۔ جنگ کا آغاز تھا ۔ رصیفوں کی تعداد سامان کی تیز درآمد کی حامل نہ ہو سکتی تھی ۔ اس لیے کئی جہازوں کو منجدھار میں لنگر انداز ہونا پڑا تھا ۔ ہمارا جہاز عشار سے گزر کر معقل پہنچا ۔ یہ بصرہ کی اصل بندرگاہ ہے ، اس سے شمال کی جانب ہوائی کشتیاں اترا کرتی تھیں ۔ اسی آبی فرودگاہ کے سامنے بصرہ کا عالیشان ہوٹل ہے ۔

معقل میں پہنچے تو دوپہر ڈھل چکی تھی ۔ گرمی زوروں پر تھی ۔ شط العرب یوں تو دریا ہی ہے مگر پون میل کا پاٹ اور اتنی گہرائی جس میں بارہ چودہ ہزار ٹن کے جہاز آ جا سکتے ہیں ۔ پانی اور آسمان کے سورج کی گرمی کے باعث ہوا بخارات سے لبریز ہو جاتی ہے ۔ نس نس سے پسینہ شروع ہو جاتا ہے ۔ اور جب تک پنکھا نہ چلایا جائے کمرے میں بیٹھا نہیں جاتا ۔ باہر تختۂ جہاز پر گرمی اس سے بھی زیادہ تھی مگر نئے ملک اور نئے شہر میں پہنچے تھے اس لیے اندر کون بیٹھ سکتا تھا ۔

جونہی جہاز رصیف کے ساتھ لگ گیا اور سیڑھی لگا دی گئی فوج کے شعبۂ نقل و حرکت (Movement Control) کے چند افسر جہاز پر آ گئے ۔ مقامی سب ایریا کے سٹاف کپتان بھی ان کے ساتھ تھے ۔ ان صاحب سے بچپن کے تعلقات تھے بلکہ دو تین پشتوں کے خاندانی تعلقات تھے ۔ ان کی وجہ سے میں نے شعبۂ نقل و حرکت کے افسروں کے سوالات کی طرف چنداں توجہ نہ دی ۔ بعد میں البتہ ایک ہی میس میں رہنے کی وجہ سے ان کے ساتھ بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں ۔ یہ بھی براعظم ہند و پاکستان کی نیم و ربع انگریزی برادری سے متعلق تھے ۔ ان کا کام جہازوں کی سواریوں کی پذیرائی کے علاوہ صرف اتنا تھا کہ بصرہ کی مستغرب آبادی اور بالخصوص آسوری ، ارمنی اور یہودی آبادی کے گھروں میں جائیں ، فوج سے جو سستی شراب ملتی تھی اس کی سربند بوتلیں ان کے گھروں میں پہنچائیں اور اس کے بل بوتے پر عیاشی کی زندگی بسر کریں ۔ یہ طبقہ وہی زندگی وہاں بسر کر رہا تھا جو زندگی برطانوی فوج ہندوستان میں ان کے گھروں میں بسر کیا کرتی تھی ۔ میرے دوست نے مجھ سے شام کے وقت ملنے کا اقرار کیا اور مجھے اپنے جائے رہائش لے جانے والے ٹرک کے حوالے کیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئے ۔ میں نے دریافت کیا کہ آخر مجھے یہاں کیا کام کاج ہو گا ۔ کہنے لگے ''معلوم نہیں'' انہیں اس کی اطلاع ہو بھی نہ سکتی تھی ۔ نقل و حرکت والوں نے چند کاغذات دئے تھے وہ ابھی جائے رہائش پر پہنچ کر دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہاں کے فورس ہیڈ کوارٹر کے شعبۂ استخبارات میں مجھے دوسرے دن حاضری دینی ہے ۔

ٹرک ایک دو سڑکوں سے گھوم پھر کر ایک بڑی سی عمارت کے صحن میں جا کر کھڑا ہوا ۔ اترنے پر معلوم ہوا کہ یہ مقامی ہائی سکول ہے جس کو فوجی افسروں کی رہائش کے لیے حاصل کر لیا گیا ہے ۔ میرے علاوہ دو چار افسر اور بھی تھے جو پہلے سے وہاں فروکش تھے ۔ چونکہ سبھی انگریز یا نیم انگریز تھے اس لیے جلد گھل مل جانے کی کوئی امید نہ تھی ۔ نئے ملک اور نئے ماحول میں پہنچ گئے تھے مگر آثار کچھ اچھے نظر نہ آتے تھے ۔

میس آدھے میل کے فاصلے پر تھا ۔ جون کا مہینہ اور بصرہ کی گرمی ، دوپہر کے وقت

خاک و گرد کی انتہا ہوتی تھی۔ مکھیاں یوں بھی شاید بصرہ میں اچھی خاصی تعداد میں ہوتی ہوں گی، لیکن اب فوجوں کے پہنچنے سے اور بھی بڑھ گئی تھیں۔ آندھی اور اس کی وجہ سے جو ریت اڑ رہی ہوتی اس کی تو کوئی انتہا نہ تھی۔ جب کھانے پر بیٹھتے تو آناً فاناً طشتری ریت سے بھر جاتی۔ کہیں کہیں کوئی اجل رسیدہ مکھی یا مچھر بھی شوربے میں بھی تیرتا ہوا نظر آ جاتا۔ اچھی خاصی بھوک نہ معلوم کہاں گم ہو جاتی اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں سگریٹ کے شربت کا گلاس پی کر جائے رہائش کو لوٹ آتے۔ دو چار روز کے بعد خیال ہوا کہ اور نہیں تو شام کا کھانا تو شہر میں کھا لیا جائے اور 'اونچی دکان پھیکے پکوان' قسم کے میس سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ جب اس خیال سے عشار پہنچے تو وہاں بھی کوئی دکان پسند نہ آئی۔ البتہ بصرہ کے اس حصے کو غور سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ عشار قہوہ خانوں سے پر ہے۔ سہ پہر سے کثیر تاجران قہوہ خانوں میں بیٹھ جاتے ہیں اور کڑوے قہوے کے فنجان انڈیلتے رہتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر راہ رو یوں محسوس کرتا ہے جیسے دنیا میں انہیں کوئی کاروبار نہیں۔ سڑک کنارے کی گول میزوں کے گرد چار چار اور پانچ پانچ کی ٹولیاں بیٹھی ہوتی ہیں۔ سوائے ایک دو کے جن کی پیٹھ سڑک کی جانب ہوتی ہے باقی سب کے سب راہ چلنے والوں کی طرف پتھرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ نگاہ ایک ہی نقطے پر مرکوز ہوتی ہے۔ ہر وہ شے جو اس نقطے سے گزرے وہ ان کے حلقۂ نظر میں آ جاتی ہے ورنہ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز خلا میں دیکھتے رہتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ ایک پردے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ان کے حواس بیدار ہوتے ہیں اور قہوے کے دو چار فنجانوں کے بعد وہ لاکھوں نہیں تو ہزاروں کا بیوپار ضرور کر چکے ہوتے ہیں۔ وہ ہاں ہاں، ہوں، واللہ، باللہ یا اللہ عینی، نوری تسلسل اور مکرر چند تکراروں کے بعد خرید و فروخت کے سلسلے کو انجام تک پہنچا لیتے ہیں۔ کھجوریں، نکلنے سے پہلے ہی نہ معلوم کتنی بار بک جاتی ہیں۔ درآمدی سامان ابھی جہازوں میں لد نہیں پاتا کہ دو چار تاجروں کو نفع بھی دے جاتا ہے۔ دو چار بار ان قہوہ خانوں کے سامنے سے گزر جانے کے بعد خواہش پیدا ہوتی ہے کہ انسان اس کے کسی کونے میں بیٹھ کر ان کے مکینوں کے چہروں کا جائزہ لیتا رہے

بصرہ کا اصل شہر عشار سے ایک میل کے فاصلے پر ہو گا۔ وہاں بھی گئے۔ وہاں زیادہ تر رہائشی مکان ہیں۔ البتہ یہاں بھی بازار ہے اور اس میں عشار کی طرح کے قہوے خانے خاصی تعداد میں ہیں۔ کسی زمانے میں بصرہ کا محل وقوع اس جگہ تھا جہاں اب زبیر کا شہر ہے جو اب دریا سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ ایک زمانہ تھا جب شط العرب اس کی دیواروں کو اپنی لہروں سے تھپکاتا ہوا گزر جاتا تھا۔ یہاں حضرت علی کرم اللہ کی مسجد کے کھنڈرات بھی سیاح کو دکھائے جاتے ہیں۔ ان ہی کو بعض سندباد جہازی کے دیوان کا نام دیتے ہیں۔ بصرہ کے بڑے تاجر جو نجد کے باشندے بتائے جاتے ہیں زبیر میں ہی رہتے ہیں اور یہاں کا بیوپار بیشتر انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ زبیر کے ارد گرد برطانوی فوجوں نے پہلے پہل جب اپنے خیمے نصب کئے تو لوگ رات کو سوئے رہتے اور پاس سے ان کے خیمے غائب ہو جاتے۔ آخر لوگوں نے خیموں کے اندر سونا شروع کیا۔ پھر بھی بارہا ایسا ہوا کہ برطانوی اور ہندوستانی سپاہی سوئے ہوئے ہیں اور اوپر سے خیمہ غائب ہو گیا ہے۔ ایک دن تو بدوؤں نے غضب ہی کر دیا۔ چھ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے آئے خیمے کی ایک ایک طناب ہاتھ میں پکڑی اور جس سرعت سے آئے تھے اسی سے واپس چلے گئے اور خیمہ بھی گھسٹتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے چلا گیا اور سپاہی دیکھتے رہ گئے۔ ایسی حرکات کے دوران میں کئی مارے بھی جاتے تھے، مگر ان کاموں میں موت تو ہوتی ہی ہے۔ یوں بھی اس سے

کیسے قرار نصیب ہؤا ہے اور پھر گولی کی موت ان گنت تکلیفوں سے بچاتی بھی تو ہے ، اور پھر ہم جسموں میں سالہا سال اس کا تذکرہ بھی رہتا ہے ۔

پہلی بار جب بصرہ دیکھ کر عشار پہنچے تو دیکھا کہ ایک جگہ سڑک کے کنارے قناتیں لگی ہیں اور اندر سے موسیقی کے دھیمے دھیمے سر بلند ہو رہے ہیں ۔ دروازے پر لکھا تھا 'ملعی الشرق' کچھ سمجھ میں نہ آیا ۔ البتہ شرق کا لفظ بذات خود اس قابل تھا کہ اس کی جانب رجوع کیا جائے ۔ اس زمانے میں مغرب کی ہر بات ہمیں بری لگتی تھی ۔ صبح شام اس اصول میں مجبوراً رہنے کی وجہ سے اب اس سے نفرت ہوتی جارہی تھی ۔ جب کبھی اس سے بچ نکلنے کی صورت پیدا ہوجاتی تو اس سے ضرور فائدہ اٹھایا جاتا ۔ اب یہ مشرق قسم کی کوئی شے تھی اور اس کا موسیقی سے تعلق تھا ، پھر اس کی طرف کیوں نہ توجہ دی جاتی ۔ البتہ ایک بات مانع نظر آرہی تھی ۔ وہاں حدود باہر (Out of Bounds) کا تختہ آویزاں تھا ۔ فوج کی زندگی بھی عجیب زندگی ہوتی ہے ۔ جب انسان کچھ عرصہ اس کا عادی ہو جائے تو ' ہر چہ باداباد ' اور دیکھا جائے گا کی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ ہم نے بھی ' دیدہ بادیدہ ' کہہ کے قدم ' ملعی الشرق ' کے اندر رکھا ۔ قناتوں سے دو چار قدم ہی اندر ہوئے ہوں گے کہ پاؤں تلے ہری ہری دبیز گھاس کا فرش تھا جیسے بڑھیا قسم کے قالین بچھے ہوں ۔ کھلے میدان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سنگ مرمر کی میزوں کے گرد کرسیاں بچھی تھیں ۔ سامنے کی قناتوں کے ساتھ چھوٹا سا سیمنٹ کا چبوترا تھا ۔ اس پر سازندے بیٹھے ساز بجا رہے تھے ۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک سازندہ دھیمی لے میں ایک آدھ مصرع گا دیتا ۔ ابھی بہت سی کرسیاں خالی تھیں ، مہمان آنا شروع ہی ہوئے تھے ۔ میں نے بھی ایک خالی میز کی طرف رخ کیا ۔ ملازم نے بڑھ کر کرسی پیش کی اور معمول کے مطابق ' تفضل ' کے لفظ سے نوازا ۔ اس نے کچھ کہا ۔ جس میں ' شرب ' کا لفظ تھا ۔ سوائے پینے کے وہ اور کیا پوچھ سکتا تھا ۔ میں نے پانی کہا ۔ اس نے جواب دیا کیسا پانی ۔ یہ بات جب سمجھ میں آ گئی تو مجبوراً ہنس پڑا ۔ اب عربی میں سادہ کیسے کہوں یا پھر لیموں پانی کیسے مانگوں ۔ آخر جب یہ مرحلہ بھی طے ہو چکا تو میں نے لفظ 'ملعی' پر غور کیا ۔ سامنے سازندوں کو دیکھا خیال آیا کہ لہو و لعب قسم کی کوئی شے ہونی چاہئیے ۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ یہ عقدہ خود بخود حل ہو گیا ۔

چبوترے سے چند گز کے فاصلے پر جو قنات لگی ہوئی تھی ، اس کے پیچھے ایک خفیہ دف ہاتھ میں لیے نمودار ہوئی اور سیدھی چبوترے کی طرف بڑھی ۔ چبوترے کے بیچوں بیچ پہنچ کر اس نے مجمع کو ' مساءالخیر ' کہا اور پھر دھیمے سروں میں گانے لگی ۔ کچھ تو لوگ کم تھے اور کچھ اس کی آواز میں جاذبیت کم تھی ۔ وہ محفل کو جگانے میں کامیاب نہ ہو سکی ۔ جو لوگ موجود تھے وہ پی بلا رہے تھے اور اس کی طرف چنداں توجہ نہیں دے رہے تھے ۔ اگرچہ وہ بدصورت نہیں تھی لیکن اس کا بدن اکہرا تھا جو بذات خود مشرق وسطیٰ میں بے توجہی کا باعث ہے ۔ ملازم جب قریب آیا تو پوچھنے پر معلوم ہوا کہ نام عفیفہ ہے اور ' فی فی ' کہہ کے پکاری جاتی ہے ۔ اس نے چند منٹ گا کر اور رقص کی نا کام کوشش کرنے کے بعد مجرا کیا اور رخصت ہوئی ۔ اس کے بعد ایک اور خفیہ آئی ۔ اس کی طرف قدرے زیادہ توجہ ہوئی مگر محفل ابھی سرد تھی ۔ اس دوران میں میرے دو ساتھی بھی اندر جھانکنے کے بعد مجھے دیکھ کر میرے ساتھ شامل ہو چکے تھے ۔ انہوں نے آتے ہی حدود باہر کا سوال اٹھایا مگر کہنہ مشق ساتھی کی غلط روی ان کے لیے باعث تسکین تھی اور اب وہ بھی عربی غنا و رقص کے تماشائی بن گئے ۔ پاس ہی تین چار عراقی بیٹھے تھے ۔ ان میں سے ایک نے خادم کے ہاتھ سگرٹ کی ڈبیہ روانہ کی ۔ میرے ساتھی کچھ خائف سے ہو گئے کہ جان نہ پہچان ، نہ

معلوم اس کا انجام کیا ہو ۔ آخر میرے اصرار پر انہوں نے سگرٹ لے لیے ۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے انہیں اپنی میز پر آنے کا پیغام بھیجا ۔ اس پر ان میں سے ایک صاحب اٹھ کر آئے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہمیں اپنی میز پر آنے کو کہا ۔ ساتھ ہی اس بات پر زور دیا کہ ہم ان کے ملک میں مہمان تھے اس لیے وہ ہماری میزبانی کو قبول نہیں کر سکتے تھے ۔ جب ہم ان کے پاس جا بیٹھے تو معلوم ہؤا کہ ایک صاحب وہاں کی پلٹن کے کماندار ہیں اور جو صاحب انگریزی جانتے تھے وہ ان کے تحت کمپنی کماندار ہیں ۔ ان کے دوسرے دو ساتھیوں میں سے ایک صاحب پولس کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور دوسرے وہاں کے بہت بڑے زمیندار ۔ اب ہمارے لیے 'ملعی' کی باتیں دریافت کرنے میں آسانی ہو گئی ۔ ابتدائی گفتگو کی وجہ سے ہم نے چبوترے کی طرف سے توجہ ہٹا رکھی تھی ۔ یک لخت تالیوں کے شور نے ہماری توجہ اس طرف کرائی ۔ کیا دیکھتے ہیں کہ مشرق حسن کا ایک مرقع چبوترے کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ سرخ و سپید رنگ ، قد رعنا اور سیاہ تا بہ کمر زلفیں ۔ زلفوں کی سیاہی بڑی بڑی شوخ آنکھوں میں بھی جھلک رہی تھی ۔ ایک ہاتھ میں چینی پنکھا اور دوسرے سے لبادے کے دامن کو تھامے یہ حسینۂ بصرہ چبوترے پر آئی ۔ محفل کو جھک کر مساءالخیر کیا اور پھر ـــــ مصر کی معروف مغنیہ ام کلثوم کا گایا ہؤا گانا شروع کیا ۔ آواز میں بلا کا سوز تھا ۔ محفل خواب تک خوابیدہ سی نظر آ رہی تھی آناً فاناً جاگ اٹھی ۔ اب مے و جام سامعین کے ذہن سے فراموش ہو چکے تھے ۔ اس نے ایک غزل ختم کی تو دوسری شروع کر دی ۔ یہ غزل بھی سامعین کی دلپسند معلوم ہوتی تھی ۔ خوب داد ملی ۔ داد دینے کا طریقہ یہ ہے کہ مغنیہ کو شراب کے جام پیش کئے جاتے ہیں ۔ وہ انہیں جکھ کر لوٹا دیتی ہے ۔ بعض منچلے تو سر بند بوتلیں بھیج دیتے ، جن کے کاگ حسینہ کے قدموں میں اڑائے جاتے ۔ وہ انہیں بھی چکھ کر لوٹا دیتی ۔ اس طرح شراب کی جو فروخت ہوتی اس کی قیمت کا دو تہائی حصہ مغنیہ کو کمیشن کے طور پر ملتا ہے ۔

یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا ۔ ہمیں اپنے معسکر واپس لوٹنا تھا ، نصف شب سے پہلے ہی ٹیکسی منگوائی اور واپس ہوئے ۔ بصرہ چھوٹی سی جگہ ہے مگر مشرق وسطی کے باقی شہروں کی طرح اسے بھی مشرق و مغرب کے الحاقی مقام کا درجہ دیا جا سکتا ہے ۔ مشرقی اور مغربی دونوں لباس ساتھ ساتھ استعمال ہوتے نظر آتے ہیں ۔ زبان میں فارسی کی آمیزش ہے اور نشست و برخواست کے آداب پر بھی عجمی رنگ نمایاں ہے ۔ اب اس عرب و عجم کے مرقع میں مغربی رنگ کی دھاریاں بھی نظر آ رہی ہیں ۔ اس کا انجام کیا ہو گا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا ۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ پہلی عالمی جنگ کے بعد مغرب کی اندھی تقلید کی جو رو چل نکلی تھی وہ اب رک چکی ہے اور 'شراب خانہ ساز' کی طرح دوسری خانہ ساز اشیاء کی مانگ بھی بڑھ رہی ہے ۔

عرش منور

اشفاق احمد

دونوں موٹی عورتیں مزے سے خراٹے لے رہی تھیں۔ کپوسین پادری نے ایک آنکھ کھول کر میری طرف دیکھا اور اپنی وزنی تسبیح کی صلیب پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "سردی ہے" میں نے مسکرا کر سر کے اشارے سے جواب دیا "بڑی مزیدار ٹھنڈی ہوا ہے پادری جی۔ ہم پردیسی ہو تم کیا جانو نسیم سحری کیسے کیسے ہیں۔" پادری نے آنکھیں موندے ایک لمبی سی جمائی لی اور سونے کی ناکام کوشش میں اس کا ترجمہ "جگ جگ لونڈے" کی سی آواز نکالتا چھوٹے سے فولادی پسٹن کی طرح اوپر نیچے تیزی سے ہلا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا -- بلاؤں کی بستی میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ وہ دن جب یاد آتے ہیں کلیجہ منہ کو آتا ہے -- انجن سے دھکیلا ہوا ایک بڑا سا کوئلہ آنکلا اور میں نے سر اندر کر لیا۔ جوان موٹی عورت نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کنگھی بنا کر سوتے میں یوں تن کر انگڑائی لی کہ اس کی بانہوں کی محراب اور سامان رکھنے والے خیمے تک پہنچ گئی۔ سوئے ہوئے پادری کی ٹانگ ہلنے لگی -- بوٹ میرا جھکے وے۔ رومال میرا مہکے وے۔ رومال میرا مہکے وے --- دل کے ٹوٹے کو میں نے اپنی پیٹی کو درست کرتے ہوئے کہا "کھڑکی بند کر دیں!"

میں نے بیچارگی کے عالم میں کھڑکی کی طرف دیکھا تو جوان موٹی عورت نے کالی بھونرا سی آنکھیں کھول کر کہا "کھڑکی بند نہ کرنا۔ پردہ البتہ کھینچ لو۔"

میں نے تعمیل ارشاد میں کتھئی سبز رنگ کا موم جامہ فوراً کھینچ کر عورت کی طرف مسکرا کے دیکھا مگر وہ خراٹے لے رہی تھی اور پادری خارپشت کی سی تھوتھنی نکالے جوں جوں بوٹ چبا رہا تھا۔

ہوا کی تیزی سے موم جامے کی لمبائی کے اضلاع کمان سی بنے ہوئے تھے اور ان کے لطیف خم سے میرے وطن کی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ چھوٹا سا ڈبہ، مبہم سا بلب آٹھ سواریاں --- طول جمع عرض ضرب دو ضرب بلندی -- ٹھنڈی ہوا کتنی زیادہ نہیں، کتنی بھرپور تھی۔ اس قدر روح پرور! کمان کے خم سے ایک اور دھکیلا ہوا کوئلہ نظر آیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا ... .. سوچنے لگا ...... کہ .. . .

پلیٹ فارم پر کوئی سبز بتی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ کوردوبا! کوردوبا!!

میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ اٹیچی کیس سنبھالا، تھیلا بغل میں دبایا اور دروازے کی طرف لپکا۔

"خوش ودی! خوش بخی!" موٹی مائی نے کہا۔

"شکریہ" میں نے جواب دیا۔

"چین کی راتیں مزے کے دن" جوان موٹی عورت نے کہا۔

"شکریہ!"

"نیک نصیحت" پادری صاحب نے دعا دی۔

پھر دعاؤں اور شب بخیر کہناؤں کا ایک سلسلہ چل نکلا اور میں تیزی سے شکریہ شکریہ پکارتا۔ ٹرنک گٹھڑیاں پھلانگتا پلیٹ فارم پر اتر آیا۔

صبح کاذب کا سماں۔ سنسان پلیٹ فارم پر کوئی چالیس واٹ کا ایک ہی بلب۔ اور کتابوں کے بند سٹال پر ٹانگیں لٹکائے سٹیشن کا مختصر سا عملہ ان دو قلیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جنہوں نے ادھر آدھر سے میرے بازو تھام رکھے تھے اور مجھے اپنی اپنی طرف گھسیٹ رہے تھے اور تیسرا آرام سے میرا اٹیچی اور تھیلا ہاتھ میں لٹکائے بڑی دور چلا جا رہا تھا۔ میں انہیں سر اور ہاتھوں حتیٰ کہ ٹانگوں کے اشاروں سے سمجھا رہا تھا کہ میں ہسپانوی

نہیں جانتا مگر وہ مجھے کشاں کشاں اس تیسرے قلی کی طرف لیے جا رہے تھے جو اب لطروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ جب وہ دونوں سے نیورا! سے نیورا!! کے نعرے لگاتے گرم گفتاری پر اتر آئے تو میرے بازوؤں نے ان کی گرفت کو قدرے نرم پایا۔ پیشتر اس کے کہ میں خود ہمت کرتا وہ ہاتھا پائی پر اتر آئے اور میرے بازو چھوڑ دیئے۔ موقع غنیمت جان کر میں تیسرے کے پیچھے بھاگا اور اس سے جا کر وہ تھیلا لے لیا جس میں پاسپورٹ اور سرکار ہسپانیہ کے چند نہایت ہی اہم حکمنامے تھے۔

قلی کے مشورے سے بابو صاحب کو ایک پسیتا محنتانہ دے کر اٹیچی کیس کلوک روم میں رکھوایا اور خود سٹیشن کے عین سامنے گراسی پلاٹ سے گزر کر اس اکلوتے ریستوراں میں جا بیٹھا جس کی بتیاں روشن تھیں۔

یہ کچھ ایسا سیلون ، آئینوں اور رنگ برنگی تصویروں والا ریستوراں نہ تھا جیسے گوالمنڈی کا بھاٹی دروازے کے باہر موجود ہیں۔ بلکہ ایک وسیع دالان تھا جس کے ایک کونے میں جس کا کونٹر تھا دوسرے میں لکڑی کے تین کمن اور باقی کے کشادہ فرش پر لکڑی کی گول اور چوکور تپائیاں اور ٹین کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک تپائی کے گرد پانچ چھ مزدور جمع تھے اور چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک موسیقار گٹار پر دھنیں بجا رہا تھا۔ کونے سے ایک کرسی کھینچ کر میں اس گول تپائی کے قریب بیٹھ گیا جس پر دودھ کافی اور چینی کی گاڑھی سی تہ چڑھی ہوئی تھی اور اس میں کل شام کی دو صحت مند مکھیوں کی لاشیں پھنسی ہوئی تھیں۔ میں نے شرلک ہومز کی طرح اس تپائی کا جائزہ لیا ––– ایک شرابی قلی اس پر کافی پی کر گیا تھا ––– باہر گراسی پلاٹ کے پیچھے قرطبہ کا سٹیشن صبح کاذب کی ناکافی روشنی میں فلمی ڈزولو سے بر آمد ہو رہا تھا ––– مجھے یوں لگا جیسے میں واپس گاؤں پہنچ گیا ہوں۔ چھوٹی پٹڑی کی گاڑی کا مختصر سا سٹیشن سسنم کے بڑوں میں چھپا ہوا میری طرف جھانک رہا ہے۔ کمیٹی کے نل کے پاس مرونڈے خطائیاں بیچنے والا بڈھا اپنے سودے کو کھجور کی پنکھی جھل رہا ہے اور ٹھنڈو سوڈا واٹر کا مریل لڑکا پھٹی ہوئی نیکر پہنے گولی والی بوتلوں کو بھورے رنگ کے گندے برتن سے دھو رہا ہے۔ سٹیشن کے پچھواڑے روئی کی گانٹھیں باندھنے والے پریس سے بہت دور نہر کا بنگلہ ہے جہاں گراموفون کی طرح چابی گھمانے والا ٹیلیفون لگا ہے ، برآمدے میں سفید پگڑیاں باندھے پٹسال نویس اپنے رجسٹر بھر رہے ہیں اور نہر کے اس پار قصبے کا قبرستان ہے جہاں میرا دادا دفن ہے۔ میرا پڑدادا عالمگیر کی شاہی فوج میں ایک معمولی سپاہی تھا جس نے پیرانہ سالی کے باوجود تلوار چلانے اور وار روکنے میں وقت کے جیدار نوجوانوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ پنج وقتہ نمازی جو زرہ بکتر پہنے اور ہتھیار سجائے دن بھر باوضو رہتا ، آدھی رات کے بعد کمربند کھول کر تہجد گزاری میں مشغول ہو جاتا۔ اس سپاہی کے گھر اس سرہنگ زادے نے جنم لیا جو تنومند ، دراز قد اور قوی الجثہ ہونے کے باوجود ایک عاشق کا دل لے کر آیا۔ جب میر متی اپنے بیٹے کو خلوت میں عشق کرنے کی تلقین کر رہے تھے اس سرہنگ زادہ نے ان کی گفتگو سن لی تھی اور تیغ و سناں کو علم و دانش کی محبوبہ کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ ایک دن جب بیٹے سے بائیں پاؤں پر گھوم کر والد کا وار روکا نہ جا سکا تو پڑدادا نے ٹھنڈی سانس بھر کر اس نا خلف کو مکتب کے حوالے کر دیا۔ پندرہ سولہ برس بعد جب باپ کو اپنی قوت بازو اور پامردی پر بھروسہ نہ رہا تو اس نے بیٹے کے لیے ایک مناسب بر ڈھونڈا اور ہمیانی کھول کر شادی کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ جب حسن پرست اور صاحب جمال بیٹے کو اپنی اس نسبت کا علم ہوا تو وہ شادی سے اس لیے منحرف ہو گیا کہ زشت رو رفیق سے غربت کے خارزاروں میں عمر بھر اکیلے بھٹکنا کہیں بہتر ہے۔ سپاہ عالمگیر کے معرکہ آرا بڈھے سپاہی نے بیٹے کو سمجھانے کی غرض سے ساتھ لیا اور قصبے

سے دور کھیتوں میں نکل گیا ۔ گھر بسانے اور کنبت کا تصور زندہ رکھنے کے لیے ہر مرد نے جنسی بھی درخواستیں بیٹے کے حضور میں گزاریں رشد اور غزالی کے قاری نے انہیں براھین و دلائل سے باطل کر دیا ۔ سول کے جھنڈ میں چار سفیدوں کے حائکاہ بستر در تجربہ کار بڈھے سپاہی نے مکتب کے شوخ طفل کو ایک ہی داؤ میں آھو بچے کی طرح گرا لیا اور اس کی چھاتی پر سوار ہو گیا ۔ زنگ آلود پیش قبض پہلو سے نکال کر اس کے حلقوم پر رکھ دیا اور گرج کر پوچھا "قبول شادی کرے گا یا نہیں" اس نے سر ہلا کر اقرار کیا ۔ ایجاب و قبول کا سلسلہ چلا اور میری دادی عالمگیری فوج کے رزم آرا بڈھے سپاہی کی بہو بن کر اس کے گھر آ گئی ۔ کوئی چھ مہینے تک دادا اپنے باپ اور بیوی کے ساتھ ہمارے آبائی گھر میں رہے اس کے بعد الازھر کی مطبوعہ کتابوں کا ایک ڈھیر گھر پر چھوڑ کر دکن بھاگ گئے ۔ جن دنوں وہاں ڈپٹی نذیر احمد حفظ کلام پاک میں مصروف تھے دادا جان ہائی کورٹ میں وکالت کا امتحان پاس کر رہے تھے ۔ گو میرے والد اور میری دادی کو خرچ برابر پہنچ رہا تھا مگر اس بات کی توقع گاؤں بھر میں کسی کو بھی نہ تھی کہ وکیل صاحب کبھی خود بھی گھر پہنچ جائیں گے ۔

دکن میں موسیٰ ندی کی طغیانی سے جہاں اس قدر نقصان ہوا وہاں بس ایک ہی فائدہ نہیں ہوا کہ گلشن بیخار کا مسودہ منظر عام پر آ گیا بلکہ یہ بھی ہوا کہ ہمارے دادا فالج کے مرض میں مبتلا ہو کر محض اس لیے واپس گاؤں آنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کا اکلوتا بیٹا خود چل کر انہیں لینے آیا تھا ۔

ہم سب بھائی بہنے دادا کی قبر پر پودے لگانے جاتے ۔ اور نہر سے کمنڈل بھر بھر کر ان کی قبر پر پانی چھڑکتے تھے ۔ پھر ہمارا ایک چھوٹا بھائی مر گیا تو ہم نے اس کی قبر دادا کے پہلو میں بنوائی اور اس کے سرہانے گیندے کا ایک پودا لگایا ۔ جب تک ہم چھوٹے تھے اپنے دادا کی قبر پر اکثر جایا کرتے جب ذرا بڑے ہوئے تو یہ زیارت صرف تہواروں تک محدود ہو کر رہ گئی اور جب ہماری زندگیوں میں مصروفیتوں اور دلچسپیوں کے تصور نے اپنے جال بچھا لیے تو ہم نے قبرستان جانا بالکل ترک کر دیا ۔

قرطبہ کے سٹیشن سے اترتے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نہر کا ایک دہانہ ہے ، بنگلہ کے ساتھ نہر بہہ رہی ہے ۔ اس کے ساتھ قبرستان میں میرے بھائی اور دادا کی قبریں ہیں اور ان کے ساتھ اور بہت سے ایسے لوگوں کے مدفن ہیں جنہیں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ، جن سے میں بارہا ملا تھا یا جن کے متعلق میں نے اپنے والد ، اماں اور نانی سے بہت کچھ سن رکھا تھا ۔ سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے اور در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد میں آج بڑی مشکل سے اپنے گاؤں پہنچا تھا اور میرے اپنے گاؤں کے لوگ جنہوں نے ہمارے چلے جانے کے بعد ہماری ہر چیز پر قبضہ کر لیا تھا شک اور حیرت کی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں ، جیسے مجھے پہچان کر اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہوں کہ نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتا بھلا اس میں وہ جرأت کہاں کہ ہماری سرزمین پر قدم رکھ سکے ہماری مملکت کی سرحدوں کو چھو سکے!

جھڑوں اور پیوندوں کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے ہسپانوی موسیقار ابھی تک گٹار بجا رہا تھا اور مزدور اپنی اپنی کرسیوں پر رات کا خمار آنکھوں میں دبائے جھوم رہے تھے ۔ دفعتہً گٹار بجانے والے مست ملنگ نے نگاہیں میری طرف پھیریں اور اپنا ساز کرسی پر چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا میرے سامنے آ کھڑا ہوا ۔ کھردرے ہاتھوں سے دو مرتبہ تالی بجا کر اس نے کندھوں کو زور سے جھٹکا اور پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔ اس کی آواز پر دوسرے لوگ بھی کھلکھلا کر ہنس دیے ، اور میں نگاہیں نیچی کر کے جیبیں ٹٹولنے لگا ۔

اس نے ایک مرتبہ پھر کارمن خانہ بدوشوں کی طرح تالی بجائی اور ایک جھرجھری لے

کر سرِ وجد ساکت ہو گیا ۔ ریستوران کے لڑکے نے میری طرف دیکھا ۔ آگے بڑھ کر گیلے کپڑے سے میز صاف کی اور سر اور کندھے جھکا کر پوچھا "کافی سے نیور ؟"

موسیقار ایک بار پھر تڑپا اور اپنی کمر کو گرسٹ پرسے کی طرح دو بل دے کر زور سے پکارا " اولے ۔"

دور بیٹھے مزدوروں نے ایک ساتھ تالی بجائی اور پکارے کافی ! کافی !! کافی !!!

ہسپانوی موسیقار چٹکیاں بجاتا ہوا میرے گرد گھومنے لگا جیسے مگس کے گرد تار بن رہا ہو ۔ کمر لچکاتے ، کندھے سکوڑتے پھٹے بوٹ کی ایڑیاں زمین پر بجاتے اس نے تین چار چکر میرے سر کے گرد لگائے ۔ پھر رک گیا ۔

مزدور ایک ساتھ تالی بجا کر پکارے : کافی ! کافی !! کافی !!! موسیقار نے میرے سامنے اپنی ہتھیلیاں میز کے دونوں کناروں پر رکھ دیں اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا ۔ پردہ رنگ دریدہ چشم قلندر کی نگاہ میرے دل میں خسرو کی نعت بن کر چھری کی طرح اتر گئی ۔ مجھے یوں مضطرب دیکھ کر اس نے ایک مرتبہ پھر سر جھٹکا اور زور سے پکارا " اولے ۔"

مزدوروں نے قہقہہ لگا کر اور زور سے تالیاں بجائیں اور ان کی آواز گویا مسجد قرطبہ کی محراب میں قرأت بن کر گونجی ۔

موسیقار پنجوں پر پھرکا ۔ ایڑیوں پر سنبھلا اور اپنے دونوں بازو سبک سیر طائر کی طرح پھیلا کر میری طرف آمڈا ۔ مزدور اپنی اپنی جگہوں پہ کھڑے ہو کر مسکرانے لگے ۔ گدڑی پوش جیسے ساع کی محفل میں طالب صادق کی طرح تڑپنے لگا ۔ دونوں ہاتھوں سے تیز تیز چٹکیاں بجاتا حلقے لے میں ہسپانوی گیت گاتا وہ میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگا ۔

مزدور چلائے : کافی ! کافی !! کافی !!!

میں نے خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں ۔

با کوب درویش میری جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا اور صلح کل لوگوں کی مجلس کو آ کسا رہا تھا ۔

کون آیا پہن لباس کڑے تسیں پچھو نال اخلاص کڑے

جب اس کی پاٹ دار آواز عین میرے سر پر گونجنے لگی تو میں نے آنکھیں کھول کر اس طرف دیکھا ۔ وہ دونوں ہاتھوں سے مزدوروں کی طرف اشارہ کرتا اور پھر انہیں میری جانب آ کساتے ہوئے گویا کہتا :

جاگ جاگ کر نہ اسنوں آکھوں امید نہ خالی گجھڑی گھاتوں
وچھڑیا ہویا پہلی راتوں آیا کرن تلاش کڑے

جب " آیا کرن تلاش کڑے " کا نعرہ لگتا تو وہ اپنی تنی ہوئی باہوں کی سیدھی انگلیاں دلپنجوں کی طرح میری طرف تان دیتا ۔

درب کے اس بول کے پیچھے مزدور کافی کافی کی صدائیں بلند کرتے اور پھر اپنے جسموں کو چٹکیوں کی تانوں میں محصور کر لیتے ۔

درویش کو پتہ چل گیا تھا کہ یہاں میرے اب وجد دفن ہیں اور رشتہ و پیوند کی یہ کشش مجھے اپنی دور کھینچ لائی تھی ۔ آج سے چند صدیاں بیشتر واقعی میرا یہ لباس نہ تھا لیکن اب حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور اپنی ذات چھپا کر میں چوروں کی طرح اسی گھر میں سیند لگانے آیا تھا جہاں ہم سب مل کر رہا کرتے تھے ۔ میرا پڑدادا شہر کا کوتوال رہا تھا ۔ میرا دادا قرطبہ کی دانش گاہ میں رومی قانون پڑھاتا تھا اور میرا باپ سلطانی بیطار تھا ۔ بیچاری دادی سارا دن کھجوروں کا سیرہ تیار کر کے انہیں روغنی مرتبانوں میں بھرا کرتی اور

اماں زیتون کا تیل بیچنے والی ان بہودنوں سے بھاؤ چکایا کرتیں جو بات بات پر لمبی لمبی قسمیں کھاتیں اور مردنگ ایسے مرتبانوں پر اپنے سے ہاتھ رکھ کر یونہی بے معنی سی ہنسی ہنسے جاتیں ۔

میں نے اپنے کوٹ پتلون اور ٹائی کی طرف چور نگاہوں سے دیکھا ۔ قدموں میں پڑے ہوئے چرمی تھیلے کو دم سے پرے کھسکایا اور موقعے پر نکڑ پر جانے والے حور کی طرح ہسپانوی موسیقار کی طرف دیکھا ۔ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا ۔ وہ بے حد جھکنے لگا تھا اور وہ دم توڑتے لٹو کی طرح آخری چکر کاٹ رہا تھا ۔ شاید آپے حال آ گیا تھا یا آنے والا تھا ۔ یا پتہ نہیں وہ اس کیفیت سے واپس گزر رہا تھا ۔ میں نے اس خطرناک فضا میں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا ۔ آہستہ سے اپنا تھیلا اٹھایا اور چپکے سے باہر نکل آیا ۔ ریستوران کا لڑکا دروازے کے باہر تک سے تیور! سے تیورا کرتا میرے پیچھے آیا لیکن میں نے پلٹ کر دیکھا نہ اس کی بات سننے کی کوشش کی ۔

سورج کی پہلی کرنیں آسمان سے نیچے اتر آئی تھیں اور بڑی سڑک کے کنارے کھجوروں کے جھنڈ میں سے ہوتی ہوئیں زمین پر پہنچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں ۔ بڑی اور عمر رسیدہ کھجوروں کے قدموں میں جوان ہونے کی نوخیز جھاڑیاں ان کرنوں سے بری طرح الجھی ہوئی تھیں ۔

یہ سڑک خدا جانے کدھر جاتی تھی ، کدھر سے آتی تھی اور اس کے کنارے اللہ جانے کن لوگوں کے گھر تھے ۔ میں چلتا رہا چلتا رہا اور یہ امید بار بار میرے دل میں آپ سے آپ ابھرتی رہی کہ ابھی مجھے دریائے کبیر کا چوڑا چکلا پاٹ نظر آئے گا ۔ ابھی اس پر چناروں کا پل دکھائی دے گا اور ابھی مجھے وہ مینار بلند وہ جلوہ گر جس کی شفقت سے دیکھے گا جس کے قدموں میں مسجد قرطبہ اور اس کا صحن پھیلا ہوا ہے ۔

دودھ کے جستی کین لادے مجھے راستہ میں وہ گاڑی ملی جسے اعلیٰ نسل کا ایک عربی گھوڑا کھینچ رہا تھا ۔ نوجوان مٹیالے رنگ کا نوسیدہ سوٹ پہنے آنکھوں پر غلیظ فلٹ کھینچے گھوڑے کو قدم قدم چلا رہا تھا اور اس کے پیچھے ایک کسان لڑکی ہاتھ میں سبزی کی ٹوکری اٹھائے چلی آ رہی تھی ۔ میں لمحہ بھر کو ٹھٹھکا اور دختر دہقان کے کپ پر کان لگا دئے ۔ لڑکی کے ہونٹ بند تھے ، آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھلی تھیں ۔ سکرٹ پر چکنائی کے داغ تھے اور سفید پنڈلیوں پر وہ ارغوانی نشان تھے جو پھلواڑی میں تازہ سبزیاں توڑتے ہوئے آپ سے آپ ابھر آتے ہیں ۔ میں نے کہا ، یہ ضرور کسی بڑے گھر کی خادمہ ہے ۔ اگر دختر دہقان ہوتی تو گنگناتی ہوئی جاتی اور نوجوان کی جیکٹ فیلٹ اس کی آنکھوں پر یوں نہ کھینچی ہوتی !

دور سڑک کے اگلے موڑ پر دریائے کنہار کی مست رو لہروں پر سورج کی کرنیں بے تابانہ ناچ رہی تھیں ۔ دریا کی چمکتی ہوئی سطح دیکھ کر میرے دل میں ایک ہی خوف خرگوش کی طرح ادھر ادھر سر ٹکرانے لگا کہ اگر میں کنارے تک پہنچتا پہنچتا مر گیا تو کیا ہو گا! بالکل ایسے ہی ایک مرتبہ پہلے بھی یہی خیال میری جان کا لاگو ہو گا تھا جب میں تاج محل کی بیرونی ڈیوڑھی میں داخل ہوا تھا ۔ اس دن تو جان بچ گئی تھی لیکن اب کے آثار کچھ اچھے دکھائی نہ دیتے تھے — میں نے جیب سے پیپرمنٹ کی ایک گولی نکال کر منہ میں ڈالی آنکھیں بند کیں اور سڑک کے کنارے سورج کی طرف منہ کر کے دو تین لمبی لمبی سانسیں لیں ۔ دل کی دھڑکن جو پہلے بیچ میں ایک دو غوطے مار گئی تھی پھر استوار ہو گئی اور میں دریا کی جانب چل دیا ۔

سڑک کی سطح سے نیچے کوئی پندرہ بیس فٹ گہرے نشیب میں کسانوں کے چند کچے کوٹھے تھے جن پر لہریا ٹین کی چھتیں پڑی ہوئی تھیں ۔ سورج کی روشنی میں ایک دوسری سے ملی

ہوئی جو جھیں دور سے بل کھاتا ہؤا دریا دکھائی دیتی تھیں - آب روانِ کبیر !

سان دالمو سڑک پر ایک معمولی سے ' دانسی‌اون ' میں میں نے ایک چھوٹا سا کمرہ لیا - ٹھنڈے پانی سے حجامت بنائی - لوہے کے تسلے میں ایلومینیم کے جگ سے سر کی دھول اور کانوں کی ریت صاف کی - دانت صاف کر کے پیپرمنٹ کی ایک اور گولی منہ میں ڈالی اور تھیلا بستر پر چھوڑ کر نیچے مالکہ کے پاس پہنچ گیا - ضابطے کے مطابق تھانہ بھیجے جانے والے ' مقصدِ سیر و تفریح ' کے دو فارم بھرے اور پاسپورٹ مالکہ کے حوالے کر کے سٹیشن سے اپنا اٹاچی کیس لینے چل دیا -

صبح کے واقعہ سے ذہن پر ایک عجب کیفیت طاری ہو گئی تھی - میں ہسپانیہ کی سیر کرتا یونہی اس تاریخی مقام پر آ پہنچا تھا - اس علاقہ کے کھنڈرات یا اس سرزمین کے تاریخی پس منظر سے مجھے کوئی قلبی یا روحانی تعلق نہ تھا - صحیح تعلیم نے ایسی بالغ نظر عطا کر دی تھی جو ہر چیز کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنے کی کوشش کرتی تھی - یورپ میں دو سالہ قیام خاص طور پر مفید ثابت ہؤا اور میں مذہب و مسلک کے فضول جھگڑوں سے اور بھی آزاد ہو گیا - انسانیت کے وسیع سمندر میں مذاہب کے چھوٹے جزیرے ترقی کے بڑے بڑے جہازوں کی راہ میں رکاوٹ تھے اور میرے والدین کا مذہب ایسا تھا جو سب سے زیادہ تنگ نظر، تکلیف دہ اور درازدست نظر آتا تھا - اطالیہ میں جب میرے آزاد خیال اور وسیع المشرب ہردیسی دوست اس مذہب پر نکتہ چینی کرتے تو میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتا اور اس کی جزئیات پر تفصیل سے بحث کرتا - مگر آج صبح اس علاقے کی فضا نے پتہ نہیں مجھ پر کیا جادو کیا کہ سٹیشن پر اترتے ہی بیشتر مجھے اس خطہ کی زمین آسمان نظر آنے لگی -

سیدھی انگلی پر چابیوں کی زنجیر گھماتے میں اسٹیشن کی جانب چلا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا عربوں کی تہذیب اور تمدن سے مجھے کیا واسطہ - طارق نے کشتیاں جلا دیں تو اچھا کیا - محبت اور جنگ میں سب کچھ روا ہے ! لیکن یہ کہ ہم ان لوگوں کو اپنے سمجھ کر ان پر بڑے بڑے جہاری ناول لکھنے لگ جائیں یا ان کی کھجوروں کے مرثیے پڑھنے لگیں .. ... اور پھر ..... پھر...... مگر یہ کہاں کی عقلمندی ہے! کہاں کا جذبہ ہے! بس ایک بات تھی سو ہو ہؤا گئی - نہ انہوں نے سوچ سمجھ کر ہمارے لئے کچھ کیا نہ ہم ...... نہ ہم ...... بلکہ اُلٹا ہمیں نقصان پہنچا - یہ بھی صبح مجھے کیا ہو گیا تھا جو اس بھک منگے مراثی کے سامنے تصورات کی دنیا بسا کر خواہ مخواہ جذباتی ہؤا - ناشتہ کئے بغیر بھاگ کھڑا ہؤا اور دریائے کبیر کو آبِ حیوان سمجھ کر سراب کی طرف لپکتا رہا -

رسل ، ہکسلے ، جینز ، مارکس ، فرائیڈ کی صد سالہ کاوشوں کے قصے اور ان کی تعلیمات کی کہانیاں میری مدد کو آگے بڑھیں اور میری راہ آسان ہونے لگی - میں نے کہا میاں تم خود مڈل پاس کرنے کے بعد سے لے کر اب تک پاپولر مکینکس اور پاپولر سائینس پڑھتے رہے ہو - فزکس نے جہاں ہاں کر دی ہے وہاں ہاں رہی ہے اور جہاں نہ کر دی ہے نہ رہی ہے - اب کون بھلا مانس مولوی یعقوب کے ان دلائل کو سنے جائے گا کہ یہ اتنا بڑا کارخانہ یہ اتنا وسیع و عریض نظامِ کائنات ، یہ چاند ، سورج ، ستارے ، سیارے آخر انہیں بنانے والا بھی تو کوئی ہے نا -

ایف اے کے بعد ہم سب مولوی جی کی اس دلیل پر ہنس پڑا کرتے تھے۔

" اچھا جی ! تو پھر مولوی صاحب ؟ "

" بس وہی خدا ہے !" مولوی یعقوب نے جواب دیا -

" اور اسی نے نبی بھیجے کہ جاؤ اور جا کر ـــ"

مولوی صاحب طیش میں آ کر مکا دکھاتے اور چلا کر کہتے " فقرہ ختم کیا تو نا ک

توڑ دوں گا ۔"

ہم سب کھی کھی کرکے ہنس پڑے ۔

اسحاق نے کہا " قربان جاؤں آپ کے حسن نے ٹوٹی پنسل سے پھٹے ہوئے کاغذ پر لکھ دیا مائع اپنی سطح ہموار رکھتے ہیں ۔"

مولوی صاحب غصے سے دیوانے ہو کر اپنی بدھنی جھٹکاتے اور چیخ کر کہتے " دیکھ تیرا باپ پانی کدھر سے اپنی سطح ہموار رکھتا ہے " بدھنی کی ٹونٹی سے پانی کے چھینٹے کچھ زمین پر کچھ ہمارے کپڑوں پر گرنے لگتے اور ہم اور زور زور سے ہنستے !

ہمہ ، بال بیرنگ ۔ ویلو ۔ کھوٹ ۔ موتو سیال سر نے اسے بیہودہ دل سے کہا : " برخوردار کیوں دیوانہ ہؤا ہے قرطبہ میں تو بس جھگڑے کا کام ہوتا تھا اور وہ بھی ایسا کہ وی نلنٹ نہ بنیے بلکہ مشکیزے پیدا ہوئے تھے ۔ دل نے جواب دیا ۔ چلو سرخ شراب پئیں مگر اس شرط پر کہ کوئی قرطبن ساتھ ہو ۔" میں نے کہا بات ہوئی نا !

اور چابی کی تحریر میری انگلی پر مومنٹم کے ساتھ خود بخود کھلتی اور بند ہوتی رہی !

اورینٹل کالج لاہور کی جانب سے چڑھائی چڑھتے ہوئے جنگڑ محلے کا جو علاقہ آتا ہے اس میں بائیں ہاتھ کو پہلے شاید دو تین ٹھٹھیروں کی دکانیں ہیں ان کے آگے کچھ گرے پڑے کوٹھے اور ٹوٹے پھوٹے چبوترے ہیں ۔ بالکل ایک ایسی جگہ پر شکستہ دیواروں ، اینٹوں سلوں اور بوسیدہ بلیوں میں گھری ہوئی زمین سے کوئی فٹ بھر اونچی کرسی پر بھوسے اور سر کنڈوں کے دھوئیں سے ہوئے چھپر تلے قرطبہ کی لڑکی پکوان پکا رہی تھی ۔ چند اینٹیں جوڑ کر اس نے عارضی چولہا بنایا ہؤا تھا ۔ اس پہ لوہے کی کڑاھی دھری تھی ۔ زیتون کا کچھ تیل اس میں کڑکڑا رہا تھا باقی کا آس سفید بوتل میں پڑا تھا جس کا منہ پھٹے کے کاگ سے بند کیا ہؤا تھا ۔ لڑکی گندھے ہوئے آٹے کو سگرٹ کے ڈبے میں ڈال کر زور سے دباتی نیچے ہنست پہلو سوئیں برآمد ہوتیں جیسے وہ اپنی ویسی ہی انگلی سے توڑ کر دونوں سرے جوڑ کر اور ایک کوٹلا سا بنا کر تیل میں چھوڑ دیتی ۔ میں بوٹی موومنم میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا ۔

یہ لڑکی مشکل سے پندرہ سولہ برس کی ہو گی مگر کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے اس کے چہرے پر جوان عورتوں کی سی سنجیدگی نمایاں تھی ۔ چہرہ بیضوی تھا ، ماتھا فراخ ، بھویں لمبی اور جھکی ہوئی ، آنکھوں کے نیچے بڑے سہانے ہیں ۔ اس نے سفید ٹول کی نصف آستینوں والی قمیص پہن رکھی تھی اور ملیشیا کے سکرٹ پر سرائی برساتی کا کپڑا ڈالے بڑے انہاک سے کوئلے تل رہی تھی ۔ اس کے گلے میں سمندری سیپ سے تراشی ہوئی ایک صلیب آویزاں تھی اور قمیص کے کالر پر پیتل کا ایک چھوٹا سا سیخ پا گھوڑا لگا ہؤا تھا ۔

میں چھپر کی ایک بلی سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ سے بولا " سنیوریتا !"

اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں اور کالی سیاہ آنکھوں سے تکتے ہوئے ہسپانوی میں پوچھا " کیا ہے ؟ "

میں نے چابیوں کی زنجیر ٹانگ کے سواری جھلاتے ہوئے بڑی مسمسی شکل بنا کر اطالوی میں پوچھا " کیا کر رہی ہو ؟"

وہ مسکرانے لگی اور سر ہلا کر بولی " میں تمہاری بولی نہیں سمجھتی ۔" اس فقرے سے میں بارسلونا اور میڈرڈ میں بخوبی واقف ہو گیا تھا اور اب مجھے کچھ ایسی کوفت نہ ہوتی تھی ۔ مگر اس لڑکی نے یہ اعلان کر کے کہ وہ میری عرض مدعا نہیں سمجھتی مجھے آزردہ کر دیا ۔ میں ایک اینٹ کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور اطالوی کے ہر لفظ کے پیچھے ایس اور سین کی کٹی ہوئی آواز چپکا کر ہاتھوں اور آنکھوں کے اشارے سے اسے سمجھانے لگا کہ میں ہسپانوی

زبان ٹھیک سے نہیں بول سکتا ۔ اس نے کڑاھی سے چھلنی بھر کر کوکلے باہر نکالے، حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولی " تم ھسپانوی نہیں ہو ؟"

میں نے اپنے سینہ پر دو مرتبہ آھستہ سے ھاتھ بجا کر جواب دیا "ھوں تو میں ھسپانوی لیکن اپنی بولی نہیں جانتا ۔"

اس کا ھاتھ رکا ، منہ کھلا ، آنکھیں پھٹی رہ گئیں !

میں نے سر جھکا کر عاجزی سے کہا " سچ عرض کرتا ھوں میں اسی ملک کا باشندہ ھوں ۔"

لڑکی نے قدرے تامل سے پوچھا " اطالوی ھو !"

میں نے کہا " سوئے اتفاق سے آدھر جا نکلا تھا ورنہ دراصل میرا ملک یہی ہے ۔"
اس نے کاندھے ہلاتے ھوئے آٹے کے تسلے کی طرف منہ پھیرتے ھوئے آھستہ سے کہا " خدا جانے کون ھو ۔"

جب اس نے لمبی ھست پہلو سوئیں کو کاٹ کاٹ کر انگلی اور انگوٹھے کی گتھا کالی حصوں سے اس کے چھ سات کوکلے تیار کر لیے تو سب کچھ جانتے ھوئے میری طرف یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ھو " ابھی تک تم نہیں بیٹھے ھو !"

میں نے اینٹ چولھے کے قریب کھینچ کر پھونس اور چولھے کی طرف اشارہ کرتے ھوئے آنکھوں ھی آنکھوں سے پوچھا " ایندھن جھونکتا جاؤں ؟" اس نے سر ھلا کر انکار کر دیا ۔

میں نے جیب سے ایک سکہ نکال کر ویسے ھی پوچھا " ایک پستے کے کتنے ؟"

اس نے جواب میں کچھ کہا سو میں نے میڈرڈ اور بارسلونا سے سیکھے ھوئے فقرے کو اس کے قدموں میں ڈال کر کہا " میں تمہاری بات نہیں سمجھا ۔"

اس نے دائیں ھاتھ کی پانچوں انگلیاں کھول کر بائیں ھاتھ کی سیدھی انگلی آن سے ملا دی ۔ گوری قرطبی کا حل دروں ایسا چھوٹا سا ھاتھ آٹے کے ملغوبے میں ڈوب ڈوب کر بہت ھی ملائم ھو گیا تھا ۔ ابھی جب اس نے تسلے کے کنارے پر کلائی سے لے کر آخری پوروں تک ھاتھ کھینچا تھا تو بہت سا چون ھتھیلی کی طرف پوروں کر کے آسے عنابی بنا گیا تھا اور ھارٹ لائن ابھی ابھری نظر آنے لگی تھی کہ دوسری لکیریں اس کے سامنے ماند پڑ گئی تھیں ۔ ھتھیلی کے کناروں اور انگلیوں کی درمیانی دراڑوں پر آٹے اور سیرے کی سوکھی ھوئی حدوں نے سارے ھاتھ کو عجیب سا پیارا بنا دیا تھا ۔ میں نے جلدی سے دیکھا اس کی ھتھیلی پر سمندری سفر کی لکیر بھی موجود تھی ۔ آسے دیکھ کر میرے کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑ گئی ۔ میں نے جلدی سے سر ھلا کر کہا " ٹھیک ھے ۔" اور سکہ چولھے کے پاس رکھ دیا ۔ لڑکی نے تسلے کے پاس پڑے سبز سرکنڈوں کی ایک پتلی سی سینک آٹھائی اور اس میں چھ کوکلے پرو کر مجھے دے دئے ۔ میں نے ان سے ایک اتار کر کھایا تو اس میں مالپوئے کا سا مزہ تھا ۔ چھوٹے بچے کی طرح مزے سے سر ھلاتے ھوئے میں نے قرطبی سے پوچھا " یہ کیوں کر بنے ھیں ؟"

اس کی ناک کے اوپر ماتھے کی ایک چھوٹی سی سلوٹ سوالیہ نشان بن کر ابھری مگر جلد ھی وہ میرا مطلب سمجھ گئی ۔ اس نے تسلے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا " یہ ؟"

میں نے کہا " ھاں ھاں یہی "

لڑکی نے برساتی اپنے گھٹنوں پر کھینچ کر کہا " آٹا ھوتا ھے نا — آٹا ! "

میں نے کہا " ھاں ۔"

" بس وہ آٹا اور ...... ملا کر پانی میں گھول کر بناتے ھیں ۔"

" ...... یہ کیا " میں نے پوچھا ۔ کوئی نیا سا ھسپانوی لفظ تھا ۔ لمحہ بھر کے لیے وہ

سوچ میں پڑ گئی - پھر اس نے ہاتھ مل کر بتیاں اتاریں اور چولہے میں ایندھن جھونکنے والی بانس کی سونٹی زمین سے اٹھا کر یوں منہ سے لگا لی ، جیسے رادھا کرشن کی بانسری چھین کر پھونکنے لگی ہو - سفید سفید دانتوں کی لڑی میں اس نے بانس کی ڈوری کا ایک کنارہ ہولے سے پکڑا اور دوں مصنوعی سا جھٹکا دیا جیسے ڈوری چھیلنے لگی ہو -

" اوہو گنا ! گنا ! ! — " میں چلایا -

" گنا ! " وہ میری طرف دیکھ کر ہنس پڑی - اور میں نے فوراً رومال بدل کر اسے نچوڑنے کے انداز میں بل دیا جیسے گنا پیلا جا رہا ہو - لڑکی نے میری سمجھ کی داد دیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور چولہے کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے اس پر رس کے کڑاہے چڑھے ہوں -

" گڑ گڑ ! " میں پھر چلایا -

" گر ! " اس نے حیرت سے آنکھیں نچائیں -

" ہاں ہاں کامل پیڑہ مع گڑ " میں نے اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے کہا -

اس دوران میں میں نے چھ کوکلے کھا چکا تھا - اور میرے ہاتھ میں صرف درکنڈے کی سینک باقی رہ گئی تھی -

لڑکی کو کڑاہی کی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر میں نے ایک دستانہ جیب سے اور نکالا اور آگے بڑھا کر کہا " چھ اور -"

اس نے میرے ہاتھ سے دستانہ اور سینک دونوں لے لیے تو میں نے بانس کی سونٹی سے آہستہ آہستہ چولہے میں پھونس جھونکنا شروع کر دیا -

لڑکی نے مجھے بھری ہوئی سینک واپس دیتے ہوئے کہا " تم ہسپانوی تو نہیں ہو -"

میں نے گرم گرم کوکلا منہ سے نکال کر کہا " خدا کی قسم میں ہسپانوی ہی ہوں -"

اس نے آٹے کی ٹی ڈبے میں ڈالتے ہوئے پوچھا " مشرق مغرب شمال جنوب ، کون سے علاقے کے ؟ "

میں اس کی یہ بات سن کر ایک بار پھر آزردہ ہو گیا اور بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا " میں مور ہوں اور میرے باپ دادا اسی علاقے کے رہنے والے تھے - ہم ہلاکو اور چنگیز کی طرح یہاں نہیں آئے تھے بلکہ نئی دنیاں بسانے اور خوبصورت باغ لگانے آئے تھے -"

اس نے ڈبہ واپس تسلے کے پاس رکھ دیا اور گھور گھور کر میری طرف دیکھنے لگی پھر میری طرف انگلی تان کر بولی " مسلمان ؟ "

میں نے شکست خوردہ سپاہی کی طرح سر جھکا کر کہا " ہاں -"

لڑکی کی آنکھیں الاؤ کی طرح دہکنے لگیں - اس نے زمین پر تھوک کر کہا " ہونہہ مسلمان ! مورا ! "

رسل ، ہکسلے ، جیمز جینز کا سارا علم مجھے عین وقت پر دھوکا دے گیا اور میں نے اثاثہ لٹے مسافر کی طرح سر جھکا کر کہا " ہم اتنے برے نہیں ، اس قدر ذلیل نہیں ...... ایسے کمینے ...... "

مگر اس نے میری بات بیچ میں ہی کاٹ دی - شاید وہ جلدی جلدی گالیاں دے رہی تھی اور اسے نئے نئے کوسنے آسانی سے سوجھتے نہیں تھے -

اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر میں نے ایک مرتبہ کہنا بھی چاہا کہ میں مذہب وذہب میں کچھ ایسا اعتقاد نہیں رکھتا میں تو صرف آزادی ، انسان دوستی اور رواداری کا قائل ہوں - بال بیرنگ ، ویلو اور فوٹو سیل بنانے والوں کو پیغمبروں پر

ترجیح دیتا ہوں لیکن پتہ نہیں مجھے کیا ہوا کہ میری زبان گنگ ہو کر رہ گئی ۔

ایک مسلمان گھرانے میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ گزار کر بروٹ ہو جانے کی وجہ سے دیانند کسی اور سبب سے میں اس کو یہ بات کہہ نہ سکا اور سر جھکا کر ہر بات تسلیم کرتا چلا گیا ۔ اس بوچھاڑ میں وہ ایک مرتبہ رکی اور قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئی بولی " اٹھو ، میری دکان خالی کر دو" میں نے مظلوموں کی طرح اس کی طرف دیکھا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر بڑی لجاجت سے کہا " سینوریتا ! مجھے معاف کر دیجئے ۔"

وہ سر کو جھٹکا دے کر درشت آواز میں بولی " مور اور یہ لجاجت " میں نے پھر نظریں جھکا لیں اور جواب میں آہستہ سے کہا " ہم سبھی تو ایسے نہ تھے ۔ آپس میں لڑے بھی مگر زمانہ پر ہمدرد تو نہ ڈرتے تھے ۔ آپ امیر عبدالرحمان کو نہیں جانتیں انہوں نے اسی شہر میں ایک برج بنوایا تھا اور اپنے آبائی ملک سے کھجور کا پودا منگوا کر یہاں بویا تھا ۔ برج کے بالائی حصے پر کھڑے ہو کر وہ پودے کو پروان چڑھتے دیکھا کرتے ۔ اپنے وطن کی یاد میں شعر کہتے ۔ زریاب مغنی سے عود پر نغمے سنتے اور علم و ادب اور فنون لطیفہ کے پرستاروں کو منہ مانگی مرادیں دیتے ۔ انہی بادشاہوں میں الحکم ثانی بھی تو تھے جنہوں نے دنیا کے ہر گوشے میں اپنے گماشتے محض اس لئے بھیج رکھے تھے کہ جہاں بھی کوئی نئی کتاب لکھی جائے .... "

اس نے چڑ کر کہا " میں کسی کو نہیں جانتی ۔ مور سب کے سب قصائی تھے اور تو سانپ کا بچہ سپولیا ہے ۔"

میں نے کہا " یوں نہ کہو ، مجھے دکھ ہوتا ہے ۔ تم بھی تو ہمارا ہی خون ہو اور رسمہ و سواد کے ان جھگڑوں سے کوئی نیوٹن ، کیوری اور آئن سٹائن جیسا بھی پیدا نہ ہو سکا ۔"

دختر قرطبہ نے بھنک کر کہا " بکواس مت کرو ۔"

میں خاموش ہو گیا تو اس نے تازہ پلے ہوئے کوکلوں کو مٹی کے روغنی پیالے میں ڈال کر مسالے کے ملغوبے کو دائیں ہاتھ سے گوندھنا شروع کر دیا ۔ تھوڑی دیر بعد سر گھما کر میری طرف دیکھا اور قدرے نرمی سے پوچھا " کہاں ٹھہرے ہو؟" میں نے داس کی سوئی سے چونچے میں دھونس جھونکتے ہوئے جواب دیا " بانو پانسی اون میں "۔

پوچھنے لگی " یہاں کیا کرنے آئے ہو ؟"

میں نے کہا " اپنوں سے ملنے کی تمنا کھینچ لائی ہے ۔"

لڑکی نے آٹا گوندھنا بند کر دیا اور ماتھے پر سلوٹ ڈال کر بولی " یہاں تمہارا کون ہے ؟ اور تم کہاں سے اسے ملنے آئے ہو ؟"

میں نے سر جھکائے ، دھونس جھونکتے ، ہولے سے کہا " یہاں ہمارے شاہ عنایت رہتے ہیں ۔ تم انہیں نہیں جانتی ہو مجھے بھی ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا لیکن وہ ہیں یہیں اسی بستی میں اسی حرم پاک میں کہیں چھپے ہوئے — تمہیں پتہ نہیں !

عرش منور ملیاں بانگاں سنیاں تخت لہور
شاہ عنایت کنڈیاں پایاں لک چھپ کھچدا ڈور"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور سامنے سڑک صاف کرنے والے ایک دیو ہیکل آدمی کو فیردی ناندو ! فیردی ناندو ! کہہ کر پکارتے ہوئے اونچی آواز میں چلائی " ذرا اسے دیکھنا ۔ پتہ نہیں کونسی بولی بول رہا ہے اور کہتا ہے میں مور ہوں ... مور ۔"

ہنستے ہنستے اس نے گھٹنوں میں سر دبا لیا ۔ فیردی ناندو جھاڑو چھوڑ کر چھپر کے پاس آ گیا اور گرج کر بولا " کون ہو تم " میں نے اپنا تھیلا اٹھایا ۔ کانپتی ہوئی ٹانگوں سے

آٹھا اور چلنے لگا تو فریڈی نانڈو نے لڑکی سے پوچھا "یہ کون ہے؟"

اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر ہنسی سے بے جان ہوتے ہوئے دو تین مرتبہ اثبات میں سر ہلایا اور پھر کچھ فرش پر لیٹ گئی۔ فریڈی نانڈو نے غور سے اس کی پتلیاں دیکھیں پھر ایک آنکھ میچ کر لحوں کی طرح میری طرف دیکھا اور اپنے زور کا قہقہہ لگایا کہ حوض کے پاس کاغذ کی پھنبیریاں لیے جاتے ہوئے دو لڑکے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر فریڈی نانڈو کی طرف دیکھنے لگے۔

میں کسی بات کا جواب دیے بغیر چھپر کے نیچے حوض سے آیا اور سٹیشن کے۔ اپنے شہر کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا گیا۔

قرطبہ کی پتھروں کی قدیم سڑک کارٹوں کے پہیوں اور گھوڑوں کے سموں سے جگہ جگہ سے دب گئی تھی اور پتھروں کے گول گول کنارے سورج کی کرنوں میں بلور کی طرح چمک رہے تھے۔

اگلے موڑ پر تانگہ کی ایک چھوٹی سی دکان کے سامنے تین سکوڑی کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں دو نہایت ہی خوبصورت چمڑے کی ڈوریں تھیں۔ دوسرے کے گلے میں مہراب کی چھاگل لٹک رہی تھی اور تیسرا بازو پر کپڑا ڈالے دستہ اپنے کرمچ بوٹ کی نوک پر بجا رہا تھا۔ میں نے ان کے قریب جا کر اطالوی میں پوچھا "مسجد کہاں ہے؟"

چھاگل والے نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ ڈوروں والے نے عرب مہربانوں کی طرح محبت سے میرا کندھا تھپک کر پوچھا "لامسکیتا؟" میں نے سر کے اشارے سے ہاں کہا تو اس نے سامنے بازو پھیلا کر کہا "سیدھے چلے جاؤ، اگلا چوک چھوڑ کر اس سے اگلے موڑ پر بائیں ہاتھ کو مڑ جانا۔"

میں نے اپنی کلائی پر گھڑی دکھاتے ہوئے پوچھا "کتنی دیر لگے گی؟"

تو چھاگل والے نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر کہا "یہی کوئی دس منٹ۔"

بندوق والا بدستور اپنی ٹو پر دستہ بجاتا رہا۔

میں سپاہیوں کی ہدایات کے مطابق جلدی جلدی آگے بڑھنے لگا۔ دھوپ کافی تیز ہو چلی تھی اور چلنے کی وجہ سے کچھ گرمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس وقت قرطبہ دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے اندلس کے سارے شہروں میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ آبادی تقریباً دس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ شہر میں اسی ہزار چار سو دکانیں، سات سو مسجدیں، نو سو حمام اور ساڑھے چار ہزار گودام تھے۔ یہ خوبصورت اور متمدن شہر وادی الکبیر کے کنارے آباد تھا۔ ساری سڑکیں شہر کی تھیں اور گرمیوں میں ان پر چھتے تن جاتے تھے تاکہ آمد و رفت میں آسانی رہے۔ لیکن ان سڑکوں پر کم از کم شہر کے اندرونی کوچوں پر اب بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی تاکہ لوگوں کو چلنے پھرنے میں آسانی ہو، یہ سوچ کر اور اسی ان ہونی بات کو اپنے پہلو میں جگہ دے کر مجھے اور بھی گرمی لگنی شروع ہو گئی!

بڑا چوک گزر کر اور اگلے موڑ پر بائیں ہاتھ کو مڑ کر تنگ گلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک لمبی سی گلی میں چلتے چلتے میں ایک پنساری کی دوکان پر ٹھٹکا اور باہر سودا لیتی ہوئی ایک بڑھیا سے پوچھا "لامزکیتا؟" اس نے سودے کی تھیلی پر رسی لپیٹتے ہوئے ہاتھ سے آگے کو اشارہ کیا اور میں پھر روانہ ہو گیا۔ اس سنسان گلی میں پرانی وضع کے پانچ چھ چھوٹے گھر گزرنے کے بعد مجھے ایک نوجوان لڑکا دکھائی دیا جو گلی کے بیچوں بیچ آدھی آستینوں کی قمیص اور نیلی پتلون پہنے کھڑا تھا اور دونوں باہیں اوپر کو اٹھا رکھی تھیں۔ چھوٹے سے گھر کے نیچی چھت والے بالا خانے کی کھڑکی میں ایک صحت مند لڑکی پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور ادھ کٹے ترنج کو چھلکے سمیت دانتوں سے توڑ توڑ کر کھا رہی تھی جب

اس کے منہ میں بیج آجاتا تو کلے پھلا کر سرخ سرخ ہونٹوں کو حلوان کی منہ بند تھیلی کی طرح سکوڑتی اور ' پھش ' کر کے ہوائی بندوق لڑکے کی طرف داغ دیتی ۔ لڑکا اپنے جسم پر چہرہ تک جکنے کے بعد سنا ہؤا بیج زمین سے اٹھاتا اور اپنے منہ میں ڈال لیتا - - میں تو یہاں محض اس لیے رک گیا تھا کہ مجھے مسجد کا راستہ پوچھنا تھا — جب ان کے کھیل میں ثانیہ بھر کا انٹروال بھی نہ ہؤا تو میں پوچھے بنا آگے بڑھ گیا ۔

زرد اور خاکستری رنگ کے پتھروں کی جس دیوار پر جا کر یہ گلی ختم ہوتی تھی وہ مسجد قرطبہ کی فصیل تھی ۔ گلی کے دہانے پر پہنچ کر میں نے دیوار کے ساتھ ساتھ نگاہ دوڑائی تو میری آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا اور مجھ پر کچھ ویسی رقت سی طاری ہو گئی جو نانی ماں پر فلمی طرز کی نعتیں سن کر طاری ہوجایا کرتی تھی ۔ میں نے ایک جھرجھری لی ، سانس ٹھنڈے اور ایک منجھے ہوئے ٹورسٹ کی طرح اپنے آپ سے انگریزی میں کہا " تو یہ ہے مسلمانوں کا وہ عبادت کدہ جس کی تعمیر انہوں نے آٹھویں صدی میں شروع کی تھی ۔ اچھی خاصی عالیشان عمارت ہے ! " مگر یہ فقرہ مجھے ٹھیک سے سہارا نہ دے سکا اور میں یہ دیکھ کر دکھی ہو گیا کہ اس عمارت کی اچھی طرح نگہداشت کیوں نہیں ہوتی ۔ اس کی شکست و ریخت پر کوئی توجہ کیوں نہیں دیتا ۔ سیڑھیاں کیوں ٹوٹ گئی ہیں ۔ کنگرے کیسے ڈھے گئے ہیں ۔ ڈاٹوں کے پتھر اندر کو کیوں جھک گئے ہیں ۔ کرسی کے اوپر دیوار کو شورہ چاٹ رہا ہے تو دنیا کے کسی عبدالرحمان کو خبر کیوں نہیں ہوتی؟ — لاحول ولاقوۃ میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا ابھی انسان کو اپنے جذبات کی تادیب کے لیے کتنے سالوں کتنی صدیوں کی ضرورت ہے ۔ مذہب کا جنازہ نکل چکا ۔ دھرم کی نردیں پٹ چکیں ۔ وقت کے تقاضے بدل گئے لیکن میں پڑھ لکھ کر بھی رجعت پسند ہی رہا ، لاحول ولاقوۃ —

المینار پر حضرت عیسیٰ کا مجسمہ چمک رہا تھا ۔ میں نے نصرانی تحمل کے ساتھ اس کی طرف دیکھا ، اس سے نیچے کانسی کے بڑے بڑے گھنٹے لٹک رہے تھے اور ان کی لٹھ کے ساتھ فولادی رسے کا سرا ربٹ کیا ہؤا دکھائی دے رہا تھا ۔ پتھر کے دو پرنالوں کے سوا باقی سب ٹوٹے ہوئے تھے اور ان کے موکھوں میں زنگ آلود ٹین ٹیڑھا ترچھا کر کے پھنسایا ہؤا تھا ۔

مسلسل بارشوں سے کنگرے اور منڈیریں سیاہ ہوچکی تھیں اور ادھر آدھر پھپھوندی کی دبیز تہیں دیوار سے چپک رہی تھیں ۔ میں حوصلہ کر کے آگے بڑھا اور اونچی دیوار کے قدموں میں کھڑے ہو کر ' لامز لیتا ' پر اپنے دونوں ہاتھ یوں رکھ دیے جیسے جوگیا بانا پہنے کھیٹ نے ماروی کو پکار پکار کر شاہ عمر کے حرم پر ساتھا رکھ دیا تھا ۔ ماروی قید تھی شاہ عمر جابر تھا اور حرم کی دیواریں بہت ہی اونچی تھیں ۔ میں نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا ان پر بھورے رنگ کے مہین مہین ذرے چمٹ گئے تھے ۔ دیکھتے دیکھتے یہ ذرے گالوں تک پہنچے ، پلکوں سے لگے اور پھر ماتھے پر چمٹ کر رہ گئے — جب کبھی حیدرآباد میں میرا دادا بیمار پڑا ہوگا اس نے ضرور اسی طرح تیمم کر کے نماز ادا کی ہوگی — میں نے جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کیا اور بڑے چوبی دروازے سے اندر صحن میں داخل ہوگیا ۔

چھوٹے قد کی دو موٹی عورتیں لیموں کے ایک سایہ دار پیڑ تلے بیٹھی گپیں ہانک رہی تھیں ۔ ایک کے سامنے پرانے کپڑوں کی گٹھڑی رکھی تھی اور دوسری کی گود میں میلی کچیلی بڑی تقطیع کی بائیبل ۔ اندر گرجے میں عبادت گزارنے کے بعد یہ چند منٹ سستانے یہاں بیٹھی ہوں گی اور پھر اڑوس پڑوس کی کہانیاں انہیں کہیں سے کہیں لے اڑی ہوں گی ۔ سامنے باب النخیل کے پاس سرو کی دور افتادہ چھاؤں میں مسجد قرطبہ کا یا یوں سمجھیے گرجے کا محافظ کرسی ڈالے اخبار دیکھ رہا تھا ۔ میں نے صحن میں پہنچ کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی ، لیموں کے پیڑ یتیم خانے کے مدرسہ میں حمد کہنے والے بچوں کی طرح کھڑے تھے ۔ سرو کا درخت بہت بلند

تھا لیکن اس کی بلندی میں ایک طرح کی دست بستگی مضمر تھی جیسے وہ ہاتھ باندھ کر آسمان سے کچھ کہنا چاہتا ہو ۔ کھجور کا تنا خمیدہ تھا اور اس کی چھدری ڈالیاں جگہ جگہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین کی جانب جھول گئی تھیں اور ان میں آب و نم کا نشان تک نہ تھا ۔

میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا محافظ کی طرف بڑھا اور اس کے پاس جا کر رک گیا ۔ اس نے عینک اتار کر میری طرف دیکھا اور انگریزی میں پوچھا ’’ فرمائیے! میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟‘‘

میں نے منفعل بچے کی طرح تھپلا جھلا کر کہا ’’ میں مسجد دیکھنی چاہتا ہوں اور اگر اجازت ملے ....‘‘

لیکن اس نے میرا فقرہ بیچ ہی میں کاٹ دیا اور اخبار کی تہہ لگاتے ہوئے بولا ’’ مسجد اس وقت بند ہے شام کے چار بجے کھلے گی اس وقت آئیے گا ۔‘‘

میں نے کہا ’’ مسجد کے بھی کوئی اوقات ہوتے ہیں! یہ تو خدا کا گھر ہے ۔ اسے تو ہمیشہ کھلے رہنا چاہئے ۔‘‘

محافظ ہنس پڑا اور ران پر اخبار کا پٹاخہ بجا کر بولا ’’ کبھی مسجد بھی خدا کا گھر ہوتی ہے!‘‘

میں سہم گیا اور باب النخیل کے اوپر ورجن میری اور بچے کی رلیف کی طرف اشارہ کر کے بولا ’’ یہ جو ہیں یہاں!‘‘

محافظ ایک مرتبہ پھر مسکرایا اور رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگا ’’ یہ تو عمارت کی ناپاکی دور کرنے اور پلید روحوں کو بھگانے کے لیے لگائی گئی ہے ۔ ورنہ ان کا ٹھکانہ تو ہمارے دلوں میں ہے ۔‘‘

جان کتنی عزیز ہوتی ہے اور پھر پردیس میں مرنے کو تو کسی کا بھی جی نہیں چاہتا ، میں نے بے معنی طریق پر سرہلایا اور موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا ’’ آپ یہاں کے محافظ ہیں؟‘‘

اس نے گھٹنے پر سے تین مرتبہ پھسل جانے والی پنڈلی کو کھجایا اور کہا ’’ ہاں! میں بھی ایک محافظ ہوں اور دوسروں کی طرح یہاں کا گائیڈ بھی ہوں ۔‘‘

میں نے کہا ’’ پھر تو آپ کے پاس چابیاں بھی ہوں گی ۔ کھول کر دکھا ہی کیوں نہ دیجئے ۔‘‘

گائیڈ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا ’’ حکم نہیں ۔‘‘

میں نے کہا ’’یہ حکم بھی عجیب مصیبت ہوتے ہیں مانو تو مرو نہ مانو تو سولی چڑھو ۔‘‘

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہولے سے کہا ’’ کچھ نہ پوچھو — جو لمحہ خیریت سے گزر جائے وہی اچھا ۔‘‘

میں نے شہ پا کر آہستہ سے پوچھا ’’ یہ درخت اسی وقت کے ہیں یا بعد میں لگائے گئے ہیں ۔‘‘

گائیڈ نے ’ توبہ کرو جی ‘ کے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا ’’ اب تک رہ سکتے تھے وہ درخت! بعد میں کاشت کئے گئے ہیں لیکن اسی انداز میں اور اسی ترتیب سے ۔ مثلاً اس صحن کو ’ صحن نارنج ‘ کہتے ہیں ۔ یہاں موروں کے زمانے میں لیموں اور سنگترے کے پودے ہوا کرتے تھے ۔ ارد گرد سرو کے پیڑ تھے اور درمیان میں کھجور کے درخت ، کھجور مسلمانوں کا متبرک درخت ہے نا اس لیے ہم نے بھی بڑی محنت سے ان درختوں کو پالا ہے ۔‘‘

میں نے کہا ’’ تم لوگوں نے خواہ مخواہ اتنی مشقت کیوں کی ۔ رہنے دیتے ۔‘‘

’’ ٹورسٹ پسند کرتے ہیں ‘‘ گائیڈ نے تجارتی راز کھولا ۔

’’ کوئی مسلمان ٹورسٹ بھی آتا ہے ؟‘‘ میں نے پوچھا ۔

"کبھی کبھار آ ہی نکلتا ہے" گائیڈ نے لاپرواہی سے کہا "زیادہ تر ملا کش ہوتے ہیں۔"

"وہی جو یہاں سے بھاگ گئے تھے" میں نے کہا۔

"ہاں وہی، جنہیں یہاں سے نکال دیا گیا تھا" اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا "ذرا دروازہ نہیں کھول دیتے میں ایک منٹ میں اندر جا کر سب کچھ دیکھ لوں گا۔"

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر بڑے دھیمے لہجہ میں کہا "کہہ جو دیا یہ حکم نہیں۔"

میں اس کے پاس ہری ہری گھاس پر بیٹھ گیا اور سامنے اس مینار کی طرف دیکھنے لگا جس پر حضرت عیسیٰ کا بت ہاتھ میں آہنی عصا لئے چاروں طرف دیکھتا رہتا ہے کہ اس معبد پر کوئی آفت تو نہیں آ رہی۔

وہ پھر اخبار پڑھنے لگ گیا تو مجھے اس کی بے توجہی پر بڑا غصہ آیا مگر بے بس ہو کر بھی کام نکلتا نظر نہ آتا تھا۔ میں نے آرام سے پوچھا "اسے اتنے صحن میں وہ لوگ کیا کرتے تھے۔"

اس نے اخبار سے نگاہ ہٹائی اور کچھ استادوں کا کچھ گائیڈوں کا لہجہ اپناتے ہوئے کہا "یہاں وہ مؤذن کی آواز پر آہستہ آہستہ جمع ہوتے تھے اور عبادت کدے میں داخل ہونے سے پیشتر ہاتھ پاؤں دھوتے تھے۔ اس وقت یہاں بہت ہی خوبصورت حوض بنے ہوئے تھے جن کے کنارے پر جوتے اتار کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے تھے اور ہاتھ منہ دھونے کی رسم ادا کرتے تھے۔ پھر وہ مسجد کے اندر فوجی انداز میں قطاریں باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور مکہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے۔ آج کا پادری امام کہلاتا تھا جو سفید چوغہ اور سر پر سبز عمامہ پہن کر قرآن سے کچھ حصے پڑھتا تھا اور اس کے پیچھے کھڑے ہونے والے اس کے حکم کے مطابق حرکت کرتے تھے۔ در اصل یہ عبادت نہ تھی فوجی درس تھی اور ان لوگوں میں بڑا اتفاق تھا۔ عبادت کے بعد وہ لوگ پھر اسی صحن میں آ جاتے اور مختلف گروہوں میں بٹ کر فلسفہ، قانون اور علم الانسان پر مباحثے شروع کر دیتے۔ علم کی بنیادیں یونان میں رکھی گئیں وہ روما کے فورم میں پروان چڑھا اور قرطبہ کے صحن میں تکمیل کو پہنچا، اور سچی بات تو یہ ہے کہ موجودہ دنیا نے سائنس میں جتنی ترقی کی ہے وہ سب ہمارے ہسپانیہ کی بدولت ہے۔"
اس نے مسجد کی دیوار پر حسرت کی ایک نظر ڈالی اور اخبار کا کونہ پھاڑ کر چبانے لگا۔

میں نے ذرا آگے بڑھ کر خوش ہو کے پوچھا "تو گویا مور اچھے تھے اور انہوں نے..."

"اچھے برے کا سوال نہیں" اس نے مجھے سمجھانے کی غرض سے کہا "انہوں نے انسانیت پر جو احسان کئے ہیں دنیا کی، خاص طور پر یورپ کی کوئی قوم اس سے انکار نہیں کر سکتی۔" میں خوشی کے مارے دیوانہ ہو گیا اور ایک دم سرو قد اٹھ کھڑا ہوا۔ جی چاہا گائیڈ سے لپٹ کر اس کا منہ چوم لوں مگر ہمت نہ پڑی۔ جب وہ میری طرف برابر دیکھے گیا تو میں نے بائیں ہاتھ سے چھاتی بجا کر اور سر اونچا کر کے کہا "میں بھی مور ہوں!"

"کیا؟" اس کے ہاتھ سے اخبار گرتے گرتے بچا۔

"میں نے کہا میں بھی مور ہوں۔"

"یعنی تم مسلمان ہو" اس نے پوچھا۔

"ہاں" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "یہ دیکھو... دیکھو یہ میرا شناختی کارڈ ہے.... روم یونیورسٹی کا شناختی کارڈ — دیکھو میرا خاندانی نام 'احمد' ہے — احمد موروں کا نام بھی ہوا کرتا ہے نا۔"

اس نے کارڈ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ ساری عبارت کو غور سے پڑھا اور پھر دوستانہ لہجے میں پوچھا " تم کہاں ٹھہرے ہو ؟"

" پاسیو دانسی اون میں " میں نے مختصر سا جواب دیا۔

" ہوں " اس نے کارڈ واپس لوٹا دیا اور اخبار سے اپنی گردن کے پاس ہوا کرنے لگا --- مجھے یہی کرنا پڑے گا نہ بتاؤ۔ میں نے سمجھ لیا کہ طرح ٹال کر کہا " اب یہ دروازہ کھول دو۔"

گائیڈ نے کہا " میرے پیارے بھائی مسجد چار بجے سے پہلے نہیں کھل سکتی۔ میں حکم کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

میں نے کہا " اچھا میں چار بجے ہی آ جاؤں گا لیکن اب ذرا جھری میں سے جھانک کر اندر تو دیکھ لوں کہ سیاہ و سفید ٹکڑوں کی یہ لمبی محرابیں کیسی لگتی ہیں۔"

اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا " اندر اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا " اس وقت میں اندر کا اندھیرا دیکھ کر ہی مطمئن ہو جاؤں گا۔ جھری میں سے ٹھنڈا ٹھنڈا سیلا سیلا اندھیرا میری آنکھوں کو ٹکرائے گا جیسے اندر سے مسجد کی مخصوص بو لیے کئی سو سال کی سانس لیے ہوئے ..."

اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا " اگر تم کوشش کرو گے تو میں تمہیں دروازے سے کوچ کر یہاں صحن کی روش پر دھکیل دوں گا ؟" وہ سینہ پھلا کر اکڑا ہو گیا جیسے چیلنج دے رہا ہو کہ " آگے بڑھ کے تو دیکھو۔"

میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے قدرے زور سے کہا " اچھا میں چار بجے ہی آ جاؤں گا --- اس وقت تو تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

" ہاں اگر میں ڈیوٹی پر نہ ہوا تو مجھے اعتراض نہ ہو گا۔"

پھر اس کا یہ فقرہ میری سمجھ میں آ گیا اور ٹوپی اور بیگ اٹھا کر بے بس چوروں کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا صحن سے باہر نکل گیا۔

مسجد کے شمالی طرز کے ایک چھوٹے دروازے سے گزر کر دریائے کبیر کا وہ حصہ ایک دم آنکھوں کے سامنے آ گیا جہاں [illegible] کایا کرتی تھیں۔ اس شکستہ پل پر جسی طرز کا ایک بوڑھا آدمی بڑے سرے اپنی [illegible] کے جال تھا نیچے محرابوں میں سے ہوتا ہوا دریائے کبیر کا گدلا گدلا پانی رواں تھا۔ پانی کے کم ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی ریتلی مردہ کچھوؤں کی طرح پڑی تھیں اور ان پر کئی سڑے سڑے ڈنڈے اور جھاڑ جھنکاڑ کے اجڑے ہوئے کھونٹے پڑے تھے۔ مسجد کے عین پیچھے اونچے اونچے نرسلوں کے آس پاس سؤر چر رہے تھے اور اپنی غلیظ دموں کو ہلا ہلا کر دائرے نیم دائرے اور سوالیہ نشان بنا رہے تھے۔ چار پانچ سؤر ایک سؤرنی کو نرسلوں سے کوڑے کے ڈھیر تک اور ڈھیر سے نرسلوں تک بھگائے پھر رہے تھے۔ چونکہ مسجد کے دروازے بند ہیں، میں نے سوچا، اسی لیے دریائے وادی الکبیر کا منظر گھناؤنا ہو گیا ہے جونہی مسجد کے باب کھلیں گے دریا میں گانے والی دہقان لڑکیاں آپ سے آپ اس کے کناروں پر جمع ہو جائیں گی ---

صبح سے اب تک چلتا رہا تھا! تھک گیا تھا۔ جیسے دیکھنے آیا تھا اس کے دروازے بند تھے، جہاں گیت سننے کی آرزو لے گئی تھی وہاں غلیظ صورتیں ہیبتناک آوازیں نکال رہی تھیں۔ سوچا چل کر پہلے سٹیشن سے اپنی ٹکٹ لے لوں۔ اس کے بعد دانسی اون میں آرام کروں اور پھر چار بجے کپڑے بدل کر مسجد دیکھنے آؤں۔ جس طرح شبنم کے نزول سے کلیوں کے منہ دھل جاتے ہیں اور سبزہ نکھرتا ہے، اسی طرح چار بجے کے بعد قرطبہ میں جمال و جلال کے مظاہر آپ سے آپ جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ چار تو بجنے دو ---

اندر داخل ہو گیا ۔ چھتری اپنی جگہ پر جمی اور پوتلی پھر گھومنے لگی ۔

پورے پانچ بجے بگل بجا ۔ تماشا گاہ کا بڑا دروازہ کھلا اور دو گھڑ سوار اندر اکھاڑے میں داخل ہوئے ۔ گھوڑوں کو ایک ساتھ قدم قدم چلاتے وہ صدر کی نشست کے سامنے آ کر رکے اور صدر سے سانڈوں کے طویلے کی چابیاں طلب کیں ۔ صدر نے چابیوں کا گچھا ہوا میں اچھالا اور ایک گھڑ سوار نے اپنی ٹوپی آگے بڑھا کر چابیاں اس میں دبوچ لیں ۔ دونوں واپس چلے گئے ۔ پھر ایک مرتبہ پھر بگل بجا اور ’’بابا دور‘‘ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اکھاڑے میں داخل ہوئے ۔ ان کے دونوں جانب قاتلین اور امدادی گروہ کے چست و چالاک نوجوان تھے ۔ سرخ و سنہرے زری لباس میں ملبوس بابا دور اپنی سیاہ ٹوپیاں اٹھا اٹھا کر عوام کو سلام کر رہے تھے اور ہم جواب میں بڑے زور سے تالیاں پیٹ رہے تھے ۔

بگل پھر بجا ۔ یہ مختصر سا جلوس اکھاڑے سے واپس گیا ہوگا کہ بگل کی آواز پر سانڈ کے طویلے کا پھاٹک کھولا اور پیچھے سے کالا سیاہ دل بادل سانڈ بجلی کی طرح اکھاڑے میں داخل ہوا ۔ اس نے پہلے تو [illegible] کے سامنے اکھاڑے کے چست و چالاک نوجوان اپنے اپنے سرخ و زرد [illegible] لئے لکڑی کی مضبوط اوٹوں کی اوٹ میں دبک گئے ۔ سانڈ نے اگلے کھر سے اکھاڑے کی ریتلی مٹی کو کھودا پھر اپنی تھوتھنی گھٹنوں کے پاس لا کر ایک جھٹکے کے ساتھ نوکیلے سینگوں سے مٹی کو جھٹکا اور تماشائیوں کی طرف دیکھنے لگا ۔ ایک نوجوان بڑی صفائی سے ٹٹی کی آڑ سے برآمد ہوا ، جوانی کے آگے لبادہ ہوا اور ایک مہمل آواز نکالی ۔ سانڈ بگولے کی مانند اس کی طرف لپکا ۔ اس نے لبادے کو گھٹنوں پر رکھے ہوئے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو بھینچ کر اور بلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا ۔ نوجوان دائیں پاؤں پر گھوما اور سانڈ ہوا میں سر کے پہلو سے رانوں کو چھوتا ہوا دور نکل گیا ۔ دوسری ٹٹی کی آڑ سے ایک اور جوان نکلا ۔ ادھر اس نے جھٹکے سے لبادہ جھٹکا ہی تھا کہ سانڈ پہاڑی سے لڑھکتے ہوئے ایک بے ڈھب پتھر کی تیزی سے اس پر آ چڑھا ۔ پیدا جانے اس نے کیا حرکت کی کہ سانڈ تو آگے نکل گیا لیکن وہ اس کی جھپٹوں سے چاروں شانے چت زمین پر گرا ۔ دل کے لوٹنے سے پیشتر دوسرے ساتھی نے اس کی اوٹ سے سرخ لبادہ ہلایا اور سانڈ نے آگے بڑھ کر لکڑی کے جنگلے میں اس زور سے ٹکر ماری جیسے کوئی فولادی گولہ آ کر لگا ہو ۔ سرخ جھنڈی دکھانے والا دو تختوں کے درمیان چھپ کر بچا ۔

سانڈ کی ہر یورش پر تماشائی اپنی نشستوں سے نیم جاں اٹھ اٹھ آتے اور بے اختیار ’’اولے ! ‘‘ پکارتے ۔ انجیلا کا برا حال تھا ۔ کبھی دانت بھینچتی ، کبھی آنکھیں میچتی ، کبھی بے معنی ہنستی اور کبھی میری طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرتی ۔

کوئی دس منٹ تک یہ کھیل جاری رہا ۔ اس کے بعد دو گھڑ سوار نیزے لیے اکھاڑے میں داخل ہوئے ۔ ان کے گھوڑے مریل سے تھے اور ان پر گھٹنوں تک کوئی پانچ چھ انچ موٹی موٹی سونج کی ٹاٹ جھول کی طرح لٹک رہی تھی ۔ سواروں نے اپنی رانوں تک موٹے دل والی لکڑی کا ایک جوتا چڑھا رکھا تھا اور سر پر سولا ہیٹ کی وضع کے ملاحوں کے ٹوپ اوڑھے ہوئے تھے ۔ جونہی یہ اندر آ کر اکھاڑے کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہوئے سانڈ ان کی طرف لپکا اور سر کو پورے زور سے گھما کر گھوڑے پر وار کیا ۔ مونج کے دبیز ٹاٹ سے سینگوں کی انیاں دور گھوڑے کے جسم تک نہ پہنچ سکیں اور ٹوپی والے تلنگے نے موقع غنیمت جان کر سانڈ کی کوہان میں اپنا نیزہ گاڑ دیا ۔ سانڈ اس زخم کی تاب نہ لا کر تلملایا ، گھوڑے کو چھوڑ کر اور سر پھیرا کر زبان سے زخم چاٹنے کی کوشش کی مگر تھوتھنی کوہان تک نہ پہنچ سکی ۔ پھر سانڈ اس خیال سے کہ اپنے زخم کا بدلہ دوسرے سوار سے لے سکے وہ دوسرے گھوڑے کی طرف لپکا مگر وہاں بھی اس کے ساتھ یہی سلوک ہوا اور پہلے زخم

میں ایک نیزہ اور لگنے کی وجہ سے کھال کی چربی بھی دکھائی دینے لگی۔

بگل بجا، گھوڑے واپس چلے گئے اور چست و چالاک نوجوان اپنے اپنے لبادے لے کر پھر زخمی سانڈ کے ساتھ کھیلنے لگے۔ لیکن اب سانڈ میں وہ پہلی سی تندی اور تیزی نہ رہی تھی۔ حملہ کرتا ضرور تھا لیکن لبادہ جھٹکنے والے کے پہلو سے گزر کر اپنے زخم کو چاٹنے کی کوشش کرتا اور ایک دو چکر لگا جاتا۔

بگل پھر بجا اور چھریرے بدن کے تین اور جوان لڑکے ہاتھوں میں کاغذ لپٹی ہوئی لوہے کی سلاخیں لے کر اندر اکھاڑے میں کود آئے۔ یہ سلاخیں رنگ برنگے چمکیلے کاغذوں سے منڈھی ہوئی تھیں اور ان کی نوکیں ڈھلتے سورج کی روشنی میں شیشے کی ٹکڑوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اکھاڑے کے بیچوں بیچ دونوں سلاخوں کو فضا میں بلند کئے لڑکے نے سانڈ کو للکارا اور سانڈ اس ادھر پھرتے آدمی کو دیکھ کر نتھنوں سے دھواں چھوڑتا پوری رفتار سے اس کی طرف دوڑا۔ سانڈ کو خود سے کوئی چھ فٹ کے فاصلے پر دیکھ کر لڑکا پنجوں کے بل اچھلا اور الٹ میں دیو لڑنے والوں کی طرح ہوا میں اپنی کمر کو ایک جھٹکا دیا۔ اور دونوں سلاخیں سانڈ کی زخمی کوہان میں کھونپ دیں۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ سانڈ اس کی رانوں میں سینگ دے کر لڑکے کو باہر گیلری کی طرف اچھال دے گا مگر یہ جانے اس نے کہاں سے سر اس میں ٹھوکری کی تھی، دونوں ملی ہوئی ٹانگوں کو مچھلی کے دھڑ کی طرح لہرایا اور سانڈ کی پچھلی ٹانگوں کے پاس آ کودا۔ سانڈ دیوانہ وار اکھاڑے میں گھوم رہا تھا اور اس کی کوہان میں گھسی ہوئی آہنی سلاخوں کی جھنڈیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ اس نے دو تین مرتبہ پھر پھونکیں سے اس بلا کو نکالنے کی کوشش کی مگر فربہ گردن میں ایسی لچک نہ پیدا ہو سکی۔ جھنڈیاں گڑنے سے سانڈ پھر تند ہو گیا تھا اور آگے بڑھ کر اکھاڑے کے ہر آدمی پر حملہ کر رہا تھا اور ہر آدمی اپنے اپنے لبادے سے اسے جھانسے دے رہا تھا۔ خون کی روانی اور پسینے کی یورش سے سانڈ کے کندھے اور گردن پوری طرح بھیگ چکے تھے اور ان پر اس کے سموں کی دھول خاکستری تہ بن کر جمتی جا رہی تھی۔ جب تینوں لڑکے باری باری اپنی جھنڈیاں گاڑ چکے تو سانڈ کو کھلانے والے اکھاڑے کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے اور ماتادور اندر داخل ہوا۔ اس کا لباس سب سے خوبصورت خالص رسم کا تھا۔ سر پر سیاہ رنگ کی ٹوپی تھی اور پنڈلیوں پر گھٹنوں سے نیچے اس نے سنہری کی ڈوروں کے پائنچے کے ربن سے باندھے ہوئے تھے۔ پاؤں میں سادی کی نائی والی گرگابی تھی اور کندھوں پر آج کل کی لڑکیوں کا پہناوا سلے رنگ کی ادر پسی کوٹی تھی جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ماتادور نے دونوں پنجے جوڑ کر ایڑیاں اٹھائیں، اصیل مرغے کی طرح چھاتی پھلائی اور سرخ لبادے کو ہوا میں یوں لہرایا جیسے ماہی گیر دریا میں جال پھینکتے ہیں۔ جب پھیروں میں بندھا ہوا سانڈ غصے اور کرب سے اس پر جھپٹا اور ماتادور نے جسم کی ہلکی سی جنبش سے اسے اپنے پہلو سے صاف گزار دیا۔ ہم سب نے 'اولے' کے ساتھ تالیاں بھی بجائیں اور ماتادور نے سر جھکا کر ہمارا شکریہ ادا کیا — ایزابیلا نے ایک چیخ مار کر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ سانڈ جو چند قدم پر رک کر پھر حملہ کرنے کے لیے ماتادور کی طرف لپک چکا تھا صرف ایزابیلا کو دکھائی دیا تھا ہم تو مزے سے ماتادور کو سلام کرتے دیکھ رہے تھے۔ اس بے توجہی میں سانڈ کا ایک سینگ ماتادور کے کولہے پر لگا اور وہ اپنی ایڑی پر لٹو کی طرح گھوم گیا مگر گرا نہیں۔ میں نے ایزابیلا کا کندھا تھپکا اور آہستہ سے کہا " سینور ماتادور صحیح سالم ہے تم دیکھو تو سہی " اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں تو ماتادور سانڈ کو حکم پھیریاں دے رہا تھا۔ بل اب اس کے بالکل قریب سے حملے کر رہا تھا اور وہ ہر مرتبہ اسے اپنے پہلو سے

گزارتے ہوئے کبھی اس کی گردن سہلا دیتا کبھی اس کے سینگوں پر ہاتھ لگا دیتا ۔ تماشائی خوشی سے دیوانے ہو کر اُس کی ہمت اور فن کی داد دے رہے تھے ۔ جب لوگ اس کھیل سے محظوظ ہو چکے تو ماتا دور نے اوپر بالکونی میں صدر کی طرف دیکھا اور تیغ آزمائی کی اجازت چاہی ۔ اذن مل گیا تو ماتا دور نے سرخ لبادے کے نیچے سے ایک چمکدار دو دھاری تلوار نکالی اور سانڈ کے عین سامنے کھڑا ہو گیا ۔ سانڈ نے اپنے دونوں اگلے کھر ایک ساتھ زمین پر مارے تو ماتادور نے ذرا ترچھے ہو کر آہنی تیروں کے عین درمیان پوری قوت کے ساتھ چمکتی ہوئی فولادی تلوار اس کی کوہان میں اتار دی جو اس کے کندھوں کی ہڈیوں میں سے ہوتی ہوئی دل میں اتر گئی ۔ سانڈ نے ایک کربناک آواز نکالی اور اس کے نتھنوں سے خون کا فوارہ بہہ نکلا ۔ زبان باہر لٹک گئی اور گوبر سے اس کی دم اور پچھلی دونوں ٹانگیں لتھڑ گئیں ۔ وہ تھوتھنی کے بل زمین پرگرا اور ہنسنے کے بل سیپی مٹی پر تڑپا ۔ تلوار دستے تک اس کے جسم میں دھنس گئی اور زندگی ، طاقت اور حرکت سے بھرپور جسم دیکھتے دیکھتے مٹی کا تودا ہو کر رہ گیا ۔ ہم نے منہ میں حلق تک انگلیاں گھسیڑ کر سیٹیاں بجائیں ، نعرے بلند کئے ، تالیاں پیٹیں، لیکن یہ سارا منظر دیکھ کر ایزابیلا دکھی سی ہو گئی اور گھٹنوں میں کانوں تک سر دبا کر سا کت ہو گئی ۔ لوگ اپنی ٹوپیاں ، کوٹ ، شراب کی چھاگلیں اندر اکھاڑے میں پھینک رہے تھے ۔ عورتیں اپنے جوڑوں سے پھول اتار اتار کر ماتادور پر گلپاشی کر رہی تھیں اور ایزابیلا ویسے ہی بے حس و حرکت گٹھڑی بنی ہوئی تھی ۔

جب گھنگھرو چھنکاتی تین خچریں سانڈ کی خون پسینے اور گوبر میں لتھڑی ہوئی لاش کھینچنے کے لیے اکھاڑے میں لائی گئیں تو میں نے آہستہ سے ایزابیلا کی کمر پر ہاتھ رکھا اور ہولے سے کہا ”دیکھو بہادر سانڈ کا جنازہ گھسٹنے لگا ہے“ اس نے نیم خوابی کے عالم میں سر اوپر اٹھایا اور بولی ” چلو چلیں ۔“

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا ۔ اس نے اپنا چھوٹا سا رومال پرس میں بند کیا اور پھر کہا ” چلو چلیں ۔“

میں نے اس کا کندھا دباتے ہوئے کہا ” مگر ابھی تو پانچ بل اور باقی ہیں ۔“

اس نے سیٹ سے اٹھتے ہوئے جواب دیا ” نہیں ! ہم جا رہے ہیں ۔“

میں اس کے فیصلے میں کوئی ترمیم نہ کر سکا اور چپ چاپ اٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔ تھیلا اٹھایا اور اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک دہقانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تماشائیوں کے پاؤں میں راہ تلاش کرنے لگا ۔ کچھ لوگوں نے جن میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی ہماری طرف نفرت اور طنز سے نگاہ کی اور بزدل ، پھوسڑ ، بے دلے کے الفاظ دھر کر سرگوشی کرنے لگے ۔ میں آگے آگے راہ بناتا جا رہا تھا اور ایزابیلا میرے پیچھے لوگوں کے پاؤں روندتی ہوئی چلی آتی تھی ۔

عمارت سے باہر نکل کر ہم کافی دور تک ایک دوسرے سے بات کئے بغیر چلتے رہے ۔ میرا خیال ہے جس سڑک پر ہم چل رہے تھے یہ اسی بڑی سڑک میں جا کر ملتی تھی جہاں آج صبح چلتے چلتے میں نے ٹین کی چھتوں کو دور سے دریائے کبیر سمجھا تھا ۔

ایک بڑے سے گھنے درخت تلے چند میز کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی تھیں اور درخت کے تنے کے ساتھ لکڑی کا ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ بنا ہوا تھا ۔ ادھیڑ عمر کی ایک عورت اپنے اکلوتے گاہک کے لیے کافی تیار کر رہی تھی اور اس کا گاہک میز پر سر رکھے سو رہا تھا ۔ چوبی قہوہ خانے کی عین پشت پر ہم دو کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے اور اپنے اپنے تھیلے میز پر ڈال دیے ۔ ادھیڑ عمر کی عورت آئی اور آرڈر لے کر چلی گئی ۔

ایزابیلا نے درخت کی ڈالیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ” جس طرح عیسیٰ مسیح

ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سولی پر چڑھ گیا تھا اسی طرح سانڈ ہسپانیہ سے ہر بلا دور رکھنے کے لیے اپنا خون بہاتا ہے اور جب ہمارے ملک پر کوئی بہت ہی بڑی آفت آنے والی ہوتی ہے تو اکھاڑے میں کسی ماتادور کا خون بہتا ہے اور وہ اپنی قربانی سے ہم سب کی جانیں بچاتا ہے ۔"

اس وقت دراصل نہ وہ مجھ سے بات کر رہی تھی نہ درخت کی ڈالیوں سے بلکہ وہ اپنے آپ کو سمجھا رہی تھی اپنے آپ کو یقین دلا رہی تھی کہ قربانی سے سب کچھ ہو سکتا ہے اور قربانی میں خون ضرور بہتا ہے ۔

میں نے بڑے خلوص سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پشت دست کو تھپتھپاتے ہوئے بولا " ایزابیلا تم ایک دم اس طرح مغموم کیوں ہو گئی ہو ۔"

اس نے شاید میری بات سنی نہیں اور اپنے آپ سے کہنے لگی " قرطبہ کے اسی اکھاڑے میں پالما کا بھورے رنگ کے وحشی بل سے مقابلہ تھا اور اس بل کی حصلتوں سے اصطبل کے نگہبانوں میں سے کوئی بھی واقف نہ تھا ۔ ان دنوں پالما میری وجہ سے بہت ہی پریشان رہتا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ اکھاڑے میں اس کی یہ کم سدگی کہیں اس کی موت کی وجہ نہ بن جائے ۔ لیکن میری احتیاط سے کیا ہو سکتا تھا بھلا ۔ کچھ ایسی طاقتیں بھی ہیں جن کی طرف سے اگر منظوری کا پروانہ نہ آئے تو انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا ۔ تم ان طاقتوں کو مانتے ہو نا؟" اس نے پوچھا ۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو ایزابیلا میرے ہاتھ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی " قائی اسما کے دن بلا کی تیز ہوا چل رہی تھی اور لڑکوں کے سرخ سولمبے ان کے گرد لپٹ لپٹ جاتے تھے ۔ میں گیلری میں پالما کے ساتھ لگی منہ ہی منہ میں دعائیں مانگ رہی تھی اور وہ مجھے تسلیاں دے رہا تھا ۔ جب بھورا بل اندر اکھاڑے میں داخل ہوا کسی کو ٹٹی کی اوٹ سے نکل کر مولیتا جھٹکنے کی ہمت ہی نہ ہوئی ۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے اور نتھنوں سے دھوئیں کے بھپکے نکل رہے تھے ۔ وہ اگلے اور پچھلے کھروں سے جمی ہوئی مٹی اکھاڑ رہا تھا اور ہوا کی تیزی سے سارے اکھاڑے پر ایک بگولا سا ناچنے لگا تھا ۔ اس بگولے کے بیچ وہ دیوانگی کی حالت میں ناچتا ہوا بڑے زور سے ڈکرا رہا تھا اور پالما کے مددگار لکڑی کے تختوں کے پیچھے دبکے ہوئے تھے ۔ خدا جانے پوسادا کو کیا سوجھی ہمت کر کے میدان میں آ گیا اور مولیتا کو تیزی سے جھٹک کر بل کی طرف بڑھا ۔ لیکن اس دن ہوا اس قدر تیز تھی کہ سانڈ کی موٹی گچھے دار دم بھی بار بار اس کی کمر پر آ گری تھی پھر مولیتا کی کیا بساط تھی جو قابو میں رہتا ۔ تیزی میں جو اڑا تو پوسادا کے چہرے اور کندھوں سے لپٹ گیا ۔ اس نے سانڈ کی جانب پر اپنا پہلو بدلا لیکن پھر بھی اس کی چھپٹ میں آ گیا اور زمین پر دور تک لڑھکنیاں کھاتا گیا ۔ پالما نے جلدی سے آگے بڑھ کر لکڑی کی دیوار سے اپنا مولیتا اندر لٹکایا اور باہر کھڑے کھڑے سانڈ کو للکارا ۔ میں اس کے بازو سے چمٹی ہوئی تھی اور سانڈ آگے بڑھ بڑھ کر دیوار کو ٹکریں مار رہا تھا ۔ دیوار پر اس کی ٹکر لگنے سے میں اور پالما گر پڑ پیچھے تماشائیوں کی طرف لڑھک جاتے ۔ اس دوران میں مددگار دستہ پوسادا کو اکھاڑے سے اٹھا کر لے گیا ۔ جب اکھاڑہ صاف ہو گیا اور بل پھر اسی طرح کھروں سے خاک اڑانے لگا تو پالما نے آنکھ بچا کر اپنا مولیتا میرے سر پر پھینکا اور خود آہنی تیر اٹھا کر بجلی کی طرح اندر اکھاڑے میں کود گیا ۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں مایوس ہو کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی ۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن لوگ کہتے ہیں کہ جس صفائی سے پالما نے چھ کے چھ تیر سانڈ کی کوہان میں پروئے ہیں ویسے کوئی ہیلی کوپٹر میں بیٹھ کر بھی نہیں گاڑ سکتا ـــ پتہ ہے یہ سب میری دعاؤں کا نتیجہ تھا ۔ جب پالما مولیتا لینے کے لیے باہر نکلا تو وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہایا ہوا تھا ۔ میں سرخ نارنجی مولیتا سینے سے

اگلے ہی لمحے وہ بھی زمین پر بیٹھی تھی ۔ پالما نے کپڑا میرے ہاتھ سے کھینچا تو میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پاس کھڑے ہوئے خدمت گار کو پانی لانے کے لیے کہا ۔ ایک تماشائی نے شراب سے بھری ہوئی چھاگل میرے پاؤں میں پھینک دی ۔ میں نے تسمہ کھولا اور سوا نیما کے دامن پر ساری چھاگل انڈیل دی ۔ پھر مٹی کی مٹھیاں بھر بھر کر دامن پر ڈالیں ، انگوری شراب کے کیچڑ سے دامن بھر گیا اور مولیتا کا نچلا حصہ کافی بھاری ہو گیا ۔ پالما نے مجھے بوسہ دیا ، سلامتی کا نشان بنایا اور اکھاڑے میں کود گیا ۔ اب کے میں بیٹھی نہیں بلکہ بڑے حوصلے کے ساتھ چوبی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی رہی ۔ تند ہوا مولیتا کو اڑاتی تھی مگر دامن بوجھل ہونے کے باعث وہ اتنا اونچا نہ اڑ سکتا تھا کہ پالما کے کندھوں پر لپٹ جاتا ۔ اس نے وحشی بیل کو دو ایسے جھانسے دیے کہ صدر اور اس کے ساتھی بھی چیخ چیخ کر داد دینے لگے ۔ بیل کو اپنی طرف بلا کر وہ اس خوبصورتی سے مولیتا اپنی کمر کے گرد لپیٹتا کہ ایسا لگتا کہ کوئی رقاصہ لہنگا اڑاتی ہوئی رقص کرتی دکھائی دیتی ۔ بیل اس کے پہلو سے گھسٹتا ہوا گزر جاتا ۔ تماشائی 'اولے ' پکارتے اور میں خوشی سے آنکھیں بند کر لیتی ۔

بگل کی آواز پر پالما نے دونوں ہاتھ پھیلا کر صدر سے تلوار گھونپنے کی اجازت طلب کی ۔ ابھی صدر نے اشارہ بھی نہ کیا تھا کہ بیل رسی کاٹ کر اس پر ٹوٹ پڑا اور تھوتھنی زمین سے لگا کر پالما کے پہلو میں اس زور سے ٹکر ماری کہ وہ ہوا میں دس بارہ فٹ اوپر اچھل گیا اور پھر جو گرا تو اٹھ نہ سکا ۔ اس کے شاگرد اوٹ سے نکل کر بیل کو جھانسے دینے لگے اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا ۔ پالما نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کا سر پھر زمین پر گر گیا ۔"

" مر گیا ؟" میں نے سانس روک کر پوچھا ۔

" تمہارے منہ میں خاک " ایزابیلا نے ہاتھ کھینچ کر کہا ۔

" خدا نہ کرے پالما کو کبھی بھی کچھ ہو !" ایزابیلا کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے ۔

" پھر کیا ہوا ؟" میں نے بے تابی سے پوچھا ۔

" میں لکڑی کی دیوار سے لگی پوری طاقت کے ساتھ چلائی اٹھو پالما ۔ اٹھو — تمہیں اس بیل کو ختم کرنا ہے ۔ تمہارے سوا کوئی اسے مار نہ سکے گا ۔ اٹھو پالما — اٹھو — تمہیں میں کہتی ہوں اٹھو — میری آواز سن کر پالما یوں اٹھ کھڑا ہوا جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ تھا ۔ جب اس نے اپنے دونوں قدم زمین پر جما کر تلوار ہوا میں لہرائی تو اس کی ران پر خون کی ایک سرخ دھار بہہ نکلی ۔ وہ لنگڑاتا ہوا بیل کی طرف بڑھا اور بھوکے درندے کی طرح تلوار سونت کر اس پر پل پڑا ۔ بازو کی ایک ماہرانہ حرکت سے تلوار پورا چمڑا کاٹتی ہوئی بیل کے اندر دھنس گئی ۔ بیل نے اچھلنے کی کوشش کی مگر اچھل نہ سکا ۔ پالما نے ایک طرف ہٹنے کی کوشش کی مگر ہٹ نہ سکا اور قاتل و مقتول دونوں پہلو بہ پہلو خون سے رنگی ہوئی زمین پر لیٹ گئے ۔

" پھر ؟" میں نے بے چینی سے پوچھا ۔

" پھر !" ایزابیلا نے بڑے تحمل سے کہا " پالما نے میڈرڈ کی ایک ڈاکٹر سے شادی کر لی اور قرطبہ چھوڑ کر میڈرڈ میں آباد ہو گیا ۔"

" اور تم ...... تم ......" میں نے رکتے ہوئے کہا " تم پالما سے نہ مل سکیں ۔"

" نہیں" ایزابیلا نے ناخن سے میز کو کھرچتے ہوئے کہا "پھر پالما مجھ سے ملا ہی نہیں اور میں میڈرڈ کے پلازا میں کبھی بل فائٹ دیکھنے گئی ہی نہیں ۔ میری ممی نے کہا محبت کے سلسلے میں ہم سے کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور ہو جاتی ہے جبھی تو ہم کسی کے دل کے سنگھاسن پر جگہ نہیں پا سکتیں ۔ میرے پیدا ہونے میں تین ماہ باقی تھے کہ میرا باپ

میری ماں کو چھوڑ کر ایک فرانسیسی عورت کے ساتھ پیرانیز کے پہاڑوں کے اس طرف جا کر آباد ہو گیا اور لوٹ کر نہ آیا۔"

میں نے ازابیلا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور اس نے اپنا گال میرے بازو پر رکھ دیا۔ میں نے کہا "محبت کے میدان میں کسی بھی کھلاڑی کا بس نہیں چلتا۔ جب اوپر سے ایک پروانہ مہر لگ کر آ جاتا ہے تو کھیل کا نتیجہ خود بخود ہو جاتا ہے اور یہ ضروری نہیں ہوتا کہ فیصلہ اسی کے حق میں ہو جس نے زیادہ محنت کی ہو۔"
ازابیلا نے جیسے نیند میں ڈوبے ہوئے پوچھا "مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

میں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں تمہیں کیا بتاؤں مجھے بس اسی قدر معلوم ہے کہ :

جن عشق دریا دی حدوں بہر وگے ہی تردے نیں ماں والڑیاں
لئی دوھجیاں لنگھ لنگھ دار آماں تے ڈنے موئیاں سر ان واڑیاں
اک سوہنیاں دے متھے بھاگ ناہیں باہروں لال دے اندروں کالڑیاں
دار ورسدے جا کرم کرنے عہد واسطان دے سبھے لاڑیاں

ازابیلا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور مجھ سے اس کا مطلب پوچھنے لگی۔ میں نے بمشکل تمام اس کا مفہوم سمجھایا تو شاعر کا پورا نام اور اس کی زندگی کے حالات پوچھنے لگی۔ میں نے بتایا کہ جو درجہ عیسائیوں کی نظر میں آسیسی کے سانت فرانسسکو کا ہے وہی غلام فرید کا ہمارے یہاں ہے۔ ازابیلا نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "ہمارے یہاں سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"ہمارے یہاں" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "ہمارے صوفیوں کے یہاں، ہمارے مسلمانوں کے یہاں۔"

ازابیلا کو ایک ثانیہ کے لیے دھکا سا لگا پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور آنکھیں گھماتے ہوئے بولی "سچ مچ تم شکل سے صوفی ہی دکھائی دیتے ہو۔"

"شکل ہی سے نہیں" میں نے حوصلہ کر کے کہا "دل سے بھی ہوں۔"

"نہیں" وہ زور سے چیخی۔

"سچ" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"میری قسم کھاؤ" ازابیلا نے دردناک آواز میں کہا۔

"تمہاری قسم!"

اس نے اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ کر زور سے میرے کندھوں پر ماریں اور اپنا سر میری چھاتی پر رکھ دیا اور ہولے ہولے کراہنے لگی "نہیں — ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم مسلمان نہیں ہو — تمہاری باتوں میں اتنی مٹھاس ہے، تمہاری گرفت میں اتنا خلوص ہے، تمہاری آنکھوں میں ایسی محبت جھلک رہی ہے کہ تم مسلمان ہو ہی نہیں سکتے — صوفی بھلا ہی نہیں سکتے—"
پھر اس نے میری گردن کے گرد بازو ڈال کر اپنے آپ سے کہا "کہیں نہ کہیں ضرور مجھ سے کوئی چوک ہوئی ہے ورنہ تم مسلمان نہ ہوتے۔"

ہوا سے اس کے بالوں کی تاریں میرے چہرے پر لگیں تو میں نے گرفت مضبوط کر کے کہا "میں تو مذہب وذہب میں ذرا بھی اعتقاد نہیں رکھتا۔ خواہ مخواہ خون بہانے کے لیے پناہیں بنا رکھی ہیں۔ میرے ماں باپ البتہ مسلمان ہیں۔"

"اور دادا دادی؟" اس نے ہولے سے پوچھا۔

"وہ بھی مسلمان تھے" میں نے خفیف ہو کر کہا۔

" تو پھر تم یہاں کیا لینے آئے ہو ؟ " ایزابیلا نے بڑی نرمی سے پوچھا -

" تم سے ملنے - اپنے رشتہ داروں سے ملنے ، اپنے عزیزوں . . . . . "

ایزابیلا پھر سنبھل گئی اور بات کاٹ کر بولی " ہم سے کیوں ؟ "

میں نے کہا " اس لیے کہ تم ہمارے ہی تو ہو — ہم ہی سے تو ہو — ہمیں تو ہو ! "

وہ ٹکٹکی میری طرف دیکھے جاتی تھی اور میں عین اسی کے انداز میں کہہ رہا تھا " اگر تم یہاں نہ ہوتے ، اگر یہ مسجد اس جگہ نہ ہوتی - اور اگر تم اپنے آپ کو ہسپانوی کے بجائے فخر سے اندلسی نہ کہلواتے تو پھر میں یہاں کیوں آتا بھلا ! ایزابیلا نے ایک طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا " تو یہ مسجد تمہاری ہے ؟ "

میں نے کہا " ہم دونوں کی ہے - اس لیے کہ ہم ایک ہیں - "

ایزابیلا نے پوچھا " تو قرطبہ میں تم صرف یہ مسجد دیکھنے آئے ہو - "

میں نے کہا " میں خود نہیں آیا - بلوایا گیا ہوں - یہاں ہمارے شاہ عنایت صاحب رہتے ہیں اور مچھلی پکڑنے والوں کی طرح ہمارے دلوں پر کنڈیاں ڈال کر بیٹھے ہیں جس کو چاہتے ہیں کھینچ کر پاس بلا لیتے ہیں اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا -

ایزابیلا حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگی اور پھر میز سے اپنا پرس اٹھا کر اپنے آپ سے بولی " کہیں نہ کہیں پھر غلطی ہوئی ہے - "

وہ اٹھ کر چل دی تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا اور بل‌فائٹ کے پلازا سے لے کر یہاں تک ہم جس خاموشی کے ساتھ آ بیٹھے آئے تھے ویسے ہی واپس چلتے رہے - بڑی سڑک پر اس نے رک کر پوچھا " سینما چلو گے ؟ "

میں نے انکساری کے ساتھ کہا " سخت تھکا ہؤا ہوں اور گذشتہ رات بھر کے رت جگے سے میری آنکھیں مچی جا رہی ہیں - پھر صبح سویرے مجھے مسجد دیکھنے بھی جانا ہے - آج نہیں ، کل چلیں گے - "

ایزابیلا نے اطمینان سے کہا " جیسے تمہاری مرضی - لیکن میں تو فلم دیکھ کر گھر آؤں گی - تم سونا چاہتے ہو تو سیدھے یہیں سے گھر چلے جاؤ - راستہ معلوم ہے نا ؟ "

میں نے کہا " ہاں یہاں سے تو آسان ہی ہے - "

ایزابیلا مسکرائی اور مجھے چوراہے کے بیچ چھوڑ کر دوسری طرف مڑ گئی -

اس رات مجھے بس اسی قدر یاد ہے کہ پانسی‌اون پہنچ کر میں نے ایک رکابی شوربہ پیا - دانت صاف کئے اور بستر کے ساتھ لگتے ہی گہری نیند سو گیا - شاید میں دن چڑھے تک یک اسی طرح جوانی کی نیند سویا رہتا اگر پانسی‌اون کی مالکہ مجھے جھنجھوڑ کر جگا نہ دیتی - میں نے آنکھیں ملتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور بچوں کی طرح منہ سے مچاکے مارتے ہوئے تکیہ کے نیچے سے ٹٹول کر سگرٹ کی ڈبیا نکالی - میں نے ابھی سگرٹ سلگایا ہی تھا اور دیاسلائی کی روشنی میں گھڑی دیکھ رہا تھا کہ ترشی ہوئی مونچھوں والا ایک لمبا تڑنگا جوان میرے کمرے میں داخل ہؤا - اس نے مسکرا کر مجھے خالص اندلسی انداز میں صبح بخیر کیا اور کرسی کھینچ کر میرے پاس بیٹھ گیا - جب اس نے میرے کمرے میں اس طرح داخل ہونے پر معذرت طلب کی تو مجھے پتہ چلا کہ وہ ضرورت کے مطابق تھوڑی بہت انگریزی بول سکتا ہے - میں نے سگرٹ پیش کی اس نے شکریہ کے ساتھ لوٹا دی اور پائپ نکال کر پینے لگا - بجھی ہوئی دیاسلائی کان میں پھیر کر بولا :

" سینور اب غرناطہ جائیں گے ؟ "

میں نے کہا " ہاں ! لیکن ابھی میں چند دن آپ کے قرطبہ میں اور قیام کروں گا کیونکہ مجھے مسجد اور مدینۃ الزہراء کی سیر کرنا ہے - "

اُس نے بڑی شائستگی سے جواب دیا ” مجھے افسوس ہے سینور کہ آپ یہاں قیام نہ کر سکیں گے ۔“

ایک لمحہ کے لیے مجھے یوں لگا جیسے کمرے کی بتی بجھ گئی ہو ۔

اُس نے مسکرا کر مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا ” غرناطہ والی لاری چلنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو اس میں سوار کرا کے آؤں !“

” کس نے آپ کو ایسا احمقانہ حکم دیا ہے “ میں نے چیخ کر پوچھا ۔

” محکمہ نے “ اُس نے اپنے کوٹ کا کالر الٹا اور اس کے نیچے مجھے ہسپانیہ کا سرکاری نشان پیتل کے بیضوی ٹکڑے پر کھدا دکھائی دیا ۔

اُس نے اپنے پائپ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا ” مجھے بے حد افسوس ہے کہ ہم آپ کی میزبانی نہ کر سکے ۔ حکم کے آگے کس کا بس چلتا ہے بھلا ۔“

” اور اگر میں آپ کا حکم نہ مانوں تو “ میں نے پوچھا

” پھر آپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور میرا خیال ہے کہ آپ . اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور مالکہ کو آواز دے کر پوچھا ” کافی تیار ہو گئی کیا ؟ “

باورچی خانے سے مالکہ کی آواز سنائی دی اور وہ ناشتہ کی ٹرے لے کر میرے کمرے میں پہنچ گئی ۔ کافی پیتے ہوئے میں نے یونہی اپنی نبض پر انگلی رکھی تو مجھے ایسا لگا جیسے زندگی ، حرکت اور اُمنگوں سے بھرپور تنومند مانند کو تیروں اور تلواروں سے ٹھنڈا کر کے جست و خیال کے نوجوان ابھی ابھی کہیں گھوڑوں پر واپس چلے گئے ہوں اور اب گھنگرو جھنکاتی خنجر اُس کی لاش گھسیٹنے آئی ہو ---- میں سفر کی تیاری کچھ اس خلوص اور دیانت داری سے کر رہا تھا جیسے میں نے ہی سی آئی ڈی کے اس ملازم کو اپنے نکالے کے احکامات دیے ہوں ۔ یوں لگ رہا تھا جیسے قرطبہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہو اس میں کھنڈر والی ایک چھوٹی سی مسجد کے مٹتے ہوئے سے آثار ہوں یہاں ایک برساتی نالہ سا بہتا ہو اور پیرس یا روم کی طرح کی یہاں کوئی قابل دید چیز موجود نہ ہو ۔

ٹائی باندھ چکی تو میں پانسیاؤں کا بل ادا کر کے چلنے کے لیے تیار ہو گیا ۔ اہل کار نے آگے بڑھ کر میرا تھیلا پکڑ لیا اور دروازے کا پٹ کھول کر کھڑا ہو گیا ۔

” خوش بختی! خوش وقتی ! خیریت کا سفر “ مالکہ نے دعا دی ۔

” خوش بختی ، خوش وقتی ، سلامتی اور سکون “ میں نے جواب میں کہا اور اُلٹا پلٹا کر دیکھے بغیر اہل کار کے ساتھ پانسیاؤں کے دروازے سے باہر نکل گیا ۔

جب ڈرائیور نے لاری کا سلف دبایا تو میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا ۔ پورے چوبیس گھنٹے پیشتر بالکل اسی وقت صبح کاذب کا سماں تھا اور ہماری گاڑی قرطبہ کے سٹیشن پر آ کر لگی تھی ۔ عین اسی وقت ہمارے ڈبے کے پادری اور دونوں عورتوں نے مجھے دعا دی تھی ۔ ایک قلی میرا سامان لے کر چلتا بنا تھا ۔ باقی کے دو میرے بازو تھام کر زور آزمائی کرنے لگے تھے اور قرطبہ کے سٹیشن پر مختصر سی طاقت کے چھوٹے سے بلب کا فلامنٹ ٹمٹما تمتما کر عاجز آ گیا تھا ---- جب ہماری لاری بڑی سڑک پر چڑھنے کے لیے مڑی تو فرڈی ناندو چھپر کے پاس جھاڑو دے رہا تھا اور کوکلے تلنے والی لڑکی ابھی نہ آئی تھی ۔ میں نے بڑی سڑک کے دونوں کناروں پر کھجوروں کی ڈالیوں میں سے صبح کاذب کی دلکشی دیکھنے کو نظریں جمائیں تو جامع قرطبہ کے کلیسا سے گجر کی پکار بلند ہوئی ۔ مسجد کے منار بلند میں کانسی کا ڈولتا ہوا گھڑیال جب ہماری لاری کی طرف منہ کرتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے اپنی طرف بلا رہا ہو ۔ اور جب آہنی رسہ کی کھینچ اُس کا منہ دوسری طرف موڑ دیتی تو ایسے لگتا جیسے گاؤں والے کسی ٹیلے پر چڑھ کر قافلے والوں کو الوداع کہہ رہے ہوں ۔

سورج طلوع ہونے سے ذرا پہلے قرمزی رنگ کی روشنی آسمان کے مشرق کنارے پر پھیلنے لگی تھی اور عرش مور سے بانگ کی آواز بلند ہونے لگی تھی -

لاری پہاڑی راستوں پر بل کھاتی ہوئی قرطبہ سے دور ہو رہی تھی -- کسی پادری کی مانند آدمی رسہ میں کھینچ رہا تھا بلکہ شاہ عنایت نے بلھے شاہ کو اپنے حضور سے دھتکار کر پھر ڈھیر کھینچنا شروع کر دی تھی - عشق کے سلسلے میں پھر کسی سے کہیں کوئی غلطی ہو گئی تھی -

دو دریا

(۱)

شفیق الرحمٰن

قاہرہ پہنچ کر میں نے اپنے دوست کو ٹیلیفون کیا۔ اُس نے نعرہ لگایا ۔ ۔ ۔ "کہاں ہو؟" میں نے بتایا کہ المصر میں ہوں یا کہ القاہرہ میں۔ بولا، بس پانچ منٹ میں پہنچتا ہوں۔ چنانچہ ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ گیا۔ آتے ہی بغل گیری کی اہم رسم انجام دے کر پوچھنے لگا — "کیا دیکھو گے؟"

یہ سوال بالکل اسی طرح کیا گیا جیسے جنگلوں میں رہنے والے مہاتما دس جنمے کی تپسیا سے خوش ہو کر پوچھا کرتے ہیں کہ بول بچہ کیا مانگتا ہے؟

میں نے سوال کو مدنظر رکھتے ہوئے جواب دیا — "یوں تو دنیا کی دنیا سب کچھ ہے لیکن جب اس شہر میں آیا حالات کو سازگار پایا۔ چلتے ممکن نہیں پھرا ن۔ ہر مرتبہ قاہرہ سے مجھے شکایت ہے میں نے قاہرہ نہیں دیکھا۔"

"تو یوں کرو کہ کوٹ اور ٹائی اتار کر سر کے بال پریشان کر لو، چہرے سے خوشی کا اظہار دور کر دو، چلتے وقت ہر راہ گیر سے ٹکراؤ، ہر لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکراؤ۔ لوگ تمہیں اجنبی نہیں سمجھیں گے۔"

میں نے ان ہدایات پر عمل کیا۔ نتائج نہایت تسلی بخش تھے۔

ہم فاروق کے عابدین محل میں داخل ہوئے تو قرون وسطیٰ کے کسی فرانسیسی بادشاہ کا گھر معلوم ہوتا تھا یا کسی اطالوی شہزادے کا محل۔ عالی شان عمارتیں، سنگ مرمر کے بت، خوش نما فوارے اور فوارے۔ ہر روش کا مجسمہ بجلی کی روشنی میں چمک رہا تھا، فوارے رنگین روشنی میں جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ ابھی ہم تماشا دیکھ رہے تھے کہ ایک ویٹر آیا اور ہمیں تالاب کے کنارے لے گیا جہاں ایک میز پر میرے دوست کا نام لکھا ہوا تھا۔

اُس نے گھڑی دیکھی — "ابھی نیل کی سیر کا وقت نہیں ہوا۔"

"کوئی خاص وقت ہوتا ہے؟"

"چاند ابھی نیچے ہے، کچھ دیر کے بعد اس کی کرنیں پرچھائیں ڈالیں گی۔ کرنوں کا زاویہ صحیح ہو لے پھر نیل کی سیر ہوگی۔"

تب مجھے اس بات کا انکشاف ہوا کہ میرا دوست آرٹسٹ بھی ہے۔

ہم کھانوں کی فہرست کا مطالعہ کرنے لگے۔ "کباب اور کوفتے تو ہمارے ہاں بھی ہوتے ہیں۔ مگر دیکھو یہ — اس میں نسوانیت ہے، جیسے خانم —"

"کھانے کی چیز ہے — دیکھی —"

فہرست کے آخر میں لکھا تھا "— سمیعہ جمال —"

"یہ کون سا کھانا ہے؟"

"یہ واقعی لڑکی ہے۔ مشہور رقاصہ۔ تم نے نام تو سنا ہوگا۔ آج رات اس کا ناچ ہے۔"

"کیسے بجے؟"

"کھانا ختم ہو لے پھر۔ کھاتے وقت ہم ادھر اُدھر نہیں دیکھا کرتے، ایک وقت ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔ تم نے کوفتے نہیں لیے۔"

"یہ تو کباب ہیں۔"

"کباب تو وہ ہیں —" اُس نے تکوں کی طرف اشارہ کیا۔

تالاب کے چاروں طرف لوگ بڑے انہماک سے کھانا کھا رہے تھے، دور سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بہت سے سائنس دان خورد بینوں پر جھکے ہوئے ہوں۔ سامنے آرکسٹرا رمسکی کراسکو کی مشہور دھن 'شہرزادی' بجا رہا تھا، یہ نغمے کا وہ حصہ تھا جہاں

شہزادی بڑھتے ہوئے طوفان کا قصہ سناتی ہے۔

"یہ دھن ہماری ہے، شہزادی ہماری تھی لیکن نغمہ نگار یورپین ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔" وہ بولا۔

"افسوس تو مجھے بھی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ مشرق کو سمجھنے کے لیے ہمیں مغرب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ دوسرے علوم تو ایک طرف رہے خود ہمارے علوم وہ ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہماری موسیقی جس پر ہم بری طرح سے فریفتہ ہیں سکھائی جاتی ہے پڑھائی نہیں جاتی۔ کسی نے اسے لکھا اور چھاپا نہیں۔"

"ایسا کیوں ہے؟"

"پتا نہیں۔ شاید اس لیے کہ ہمارے علوم و فنون سینہ بسینہ چلے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فن کار کا بیٹا ہمیشہ فن کار نہیں ہوتا، نہ یہ ضروری کہ طباعت ورثے میں ملے۔ لہٰذا بہت کچھ ضائع ہوتا رہا ہے۔"

دھن ختم ہوچکی تو میں نے پوچھا —— "سمیعہ کمال کب آئے گی؟"

"ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔ تھوڑے سے کوفتے لو۔"

چنانچہ میں نے چند کباب سامنے رکھ لیے۔

چاند ڈھل چکا تھا اور لوگ جمائیاں لے رہے تھے۔ دفعتاً ہل چل مچی جیسے رات کو سٹیشن پر ٹرین آنے سے پہلے ہوتا ہے۔ آرکیسٹرا تبدیل ہو رہا تھا، لمبے لمبے چغوں والے مصری آ رہے تھے، ان کے ہاتھوں میں پرانی وضع کے ساز تھے۔ بیٹھتے ہی انہوں نے ایک الف لیلوی دھن چھیڑی، حاضرین چوکنے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

سمیعہ کمال کیا آئی طوفان آ گیا۔ زلزلہ آ گیا۔

ساز تھرائے اور ناچ شروع ہوا۔ اس کی انگلیوں میں مجیرے تھے جنہیں وہ بڑی فیاضی سے استعمال کر رہی تھی۔ جو تھوڑا سا لباس اس نے پہن رکھا تھا وہ ملتان کی گرمیوں کے لیے تو مناسب ہوسکتا تھا لیکن قاہرہ کی خنک رات کے لیے ہرگز موزوں نہ تھا۔

مشرق وسطیٰ کا یہ رقص میں نے بارہا دیکھا تھا اس میں آرٹ کم ہے اور تھرکنا زیادہ۔ جنبش اس قدر تیز کہ نگاہیں ساتھ نہیں دے سکتیں۔ بالکل جیسے کھلونے کو چابی بھر کر چھوڑ دیا جائے۔ پہلے وہ آرکسٹرا کے قریب ناچتی رہی پھر میزوں کا رخ کیا۔ راستے میں ستون آیا تو اس کے گرد تین چار چکر لگا دیے۔ ایک کرسی سے کسی کا بچہ اٹھا کر ہوا میں اچھال دیا۔ بچہ یا تو عادی تھا اور پہلے اچھالا جا چکا تھا یا بالکل سہما ہوا تھا۔ وہ رویا نہیں۔ ناچتے ناچتے وہ پانی کے اتنے قریب آ جاتی کہ لگتا تھا اب گری۔ لیکن اس کا پاؤں ایک دفعہ بھی نہیں پھسلا، نہ اس پر کشش ثقل کا اثر ہوا۔ پہلی میز، دوسری، تیسری —— ہماری باری آئی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مجیرے بجے، بازو تھرکے اور سمیعہ زور سے ناچی۔ اس کا چہرہ اتنا قریب تھا کہ ہماری ناکوں کے درمیان کل چھ انچ کا فاصلہ ہوگا۔ مجیرے گویا کانوں کے اندر بج رہے تھے۔ اس نے ایک آنکھ ذرا سی کھولی اور مسکرائی۔

"تم بھی مسکراؤ ——" میرے دوست نے سرگوشی کی۔

میں فوراً مسکرانے لگا، ایک دفعہ تو میں نے بھی آنکھیں بند کرکے دکھائیں۔

سمیعہ نے کندھے مٹکائے، کمر کو دو تین بل دیے اور چہرہ اوپر کو اٹھا دیا۔ اس کا جسم یوں لرز رہا تھا جیسے آندھی میں بید مجنوں۔

"واللہ ——!" ساتھ کی میز سے کسی نے نعرہ لگایا۔

سرد ہوا کے جھونکوں سے اس کی زلفیں لہرا رہی تھیں، سازندوں نے یک لخت ایک

نغمہ چھیڑا اور مل کر گانے لگے -

" یہ کیا گا رہے ہیں؟ "

"بالکل سہل سا گانا ہے— بے معنی اور لغو — یہ فلمی گیت ہے - تم باتیں مت کرو - بس اس کی طرف دیکھتے رہو —" میرے دوست نے پھر سرگوشی کی -

سمیعہ نے آنکھیں کھول دیں ، پھر بند کر لیں - اب وہ دل کھول کر تھرک رہی تھی ، اس کے بازو مچل رہے تھے - وہ مسکراہٹ نہایت پراسرار ہو گئی تھی -

جب وہ اگلی میز پر گئی تو میرے دوست نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور خوشی سے چہک کر بولا — " ہماری بڑی عزت افزائی ہوئی ہے - اتنی دیر یہ کسی میز پر نہیں ٹھہری — "

بقیہ چند میزوں کو اس نے چار پانچ منٹوں میں بھگتا دیا اور واپس سازندوں کے پاس چلی گئی -

" کیا خیال ہے ؟ " میرے دوست نے پوچھا -

" کس کے متعلق؟ "

" سمیعہ کمال —"

" ہمارے ہاں کمال کو جمال پڑھتے ہیں — "

" نہیں ، اس کا رقص کیسا ہے — ؟ "

" طبی نکتہ نظر سے ایسا رقص صحت کے لیے نہایت مفید ہے - اس سے کمر کے پٹھوں کی خوب ورزش ہو جاتی ہے ، بھوک کھل کر لگتی ہے اور متواتر اچھل کود سے جگر بھی بیدار رہتا ہے —"

" ہائے ، تم سمجھتے نہیں - طبی رائے کون لے رہا ہے - فنی زاویے سے بتاؤ —"

" فن کے متعلق یہ ہے کہ اگر ایسا ناچ اہرام سے برآمد کی ہوئی ممی کے سامنے کیا جائے تو ممی چھلانگ مار کر اٹھ کھڑی ہو -"

" کیا بتائیں اس علاقے کا رقص ہی ایسا ہے - مگر پبلک تو چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے ، حاضرین میں سے کئی ایک کے ہاتھ میں تسبیح بھی ہوتی ہے جسے وہ بڑے سکون سے پھیرتے رہتے ہیں -"

" پبلک عادی ہو چکی ہے - پبلک اکثر عادی ہو جایا کرتی ہے -"

قمقمے بجھا دیے گئے ، ساز مدھم پڑ گئے ، سمیعہ نے ایک ہلکا سا لبادہ اوڑھ لیا - ایک اور طرح کا رقص شروع ہوا - دیکھتے دیکھتے سب کچھ بدل گیا ، موسیقی کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ وہ ہلکورے لے رہی تھی ، وہ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کھیل رہی تھی ، اب وہ بادلوں کے ساتھ فضاؤں میں تیر رہی تھی -

سنگ مرمر کے بت ، سرو کے درخت ، دھیمی موسیقی اور چاندنی - یہ رقص نہایت پرسکون تھا -

لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہ رہ سکی - دفعتاً سمیعہ کو دورہ سا آٹھا ، اس نے لبادہ ایک طرف پھینک دیا ، سازندوں نے بھی گیئر بدلا اور وہی دھما چوکڑی پھر شروع ہو گئی -

فاروق کے محل میں حسن تھا ، خمار تھا ، چنچل پن ، چھیڑ چھاڑ ، راگ رنگ سبھی کچھ تھا - فقط فاروق نہیں تھا -

ہم باہر نکلے تو میرے دوست نے چاند کا دوبارہ معائنہ کیا — " ابھی وقت نہیں ہوا ، چلو مینا چلتے ہیں —"

جنگ کے دنوں میں اہرام کے پاس مینا کیمپ تھا اور مینا ہاؤس ہوٹل - ہوٹل اب بھی ہے -

میں نے اہرام کو بارہا دیکھا تھا ، غروب آفتاب کے وقت ، چلچلاتی دھوپ میں ،

علی الصبح ، چاندنی میں ۔ چاندنی میں اہرام کو دیکھ کر جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں وہ کسی اور عمارت کو دیکھنے سے نہیں ہوتے ۔ اہرام خوش نما نہیں ہیں ، نہ یہ پرہیبت و سنگلاخ ہیں ، انہیں عظیم و نازک بھی نہیں کہا جا سکتا ۔ پتھروں کے یہ مخروطی ڈھیر بے حد سادہ سے ہیں جیسے ریاضی کے کسی طالب علم نے تکون بناتے ہوئے چند خطوط کھینچ دیے ہوں ۔ اس کے باوجود ان میں انوکھا پن ہے ، ان سے عظمت ہویدا ہے ۔ یہ تمثیلیں ہی ہیں ۔ ان ہی کی نسل ہے ، یہ انسانی تاریخ کا اولین اور اہم ترین باب ہیں ۔

یونان کے عہد زریں سے صدیوں پہلے جب دنیا کے باشندے جھونپڑیوں اور جنگلوں میں رہتے تھے تب مصر کے بادشاہوں کے دل میں لافانی بننے کی خواہش پیدا ہوئی ، مشینوں کی مدد کے بغیر سینکڑوں میل دور پہاڑوں سے انسان نے پتھر کاٹے ، نیل میں کشتیاں چلیں ، پتھر آئے اور انہیں بڑی نفاست سے جما دیا گیا ۔ بیس برس لگے ۔ لیکن انتظار ختم ہوا اور آخر جنگل میدان میں انسان نے پہاڑ کھڑا کر دیا ۔ اس کے بعد پانچ ہزار سال تک انسان نے اتنا زبردست تعمیری کارنامہ انجام نہیں دیا ۔ پورے پانچ ہزار سال گزرنے پر امریکہ میں مشینوں سے بولڈر ڈیم بنا جسے خوفو کے ہرم سے بڑا ہونے کا فخر نصیب ہوا ۔

اہرام نے فرعونوں کا مد و جزر دیکھا ہے ، تہذیبیں پھیلیں اور مٹ گئیں ، قومیں ابھریں اور تباہ ہو گئیں ۔ سکندر اعظم ، سیزر ، عمرو بن العاص ، نپولین — فاتح یکے بعد دیگرے آئے اور چلے گئے لیکن اہرام سینۂ زمین پر جوں کے توں کھڑے ہیں ۔

چاروں طرف خاموشی تھی دور قاہرہ کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں ، نیچے میدانوں میں دھند سی پھیلی ہوئی تھی ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس دھند کے پیچھے لاکھوں انسان کام کر رہے ہیں ۔ بڑے بڑے پتھر دریا سے کھینچ کر لائے جا رہے ہیں ، پتھروں کو تراشا جا رہا ہے ، اس لیے کہ فرعون کا مقبرہ تیار ہو جائے اور اسے اطمینان ہو جائے کہ وہ لافانی بن جائے گا ۔

چاندنی میں اہرام کے پتھر چمکتے ہیں تو دیکھنے والا بھول جاتا ہے کہ ان پتھروں میں خون اور پسینہ جذب ہے ، ان سے وہ ہوائیں کھیلی ہیں جو آہوں اور سسکیوں سے بوجھل تھیں ۔ فرعونوں کے نام سب جانتے ہیں ، ان کی عظمت و جبروت کے تذکرے عام ہیں لیکن ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کے نام کوئی نہیں جانتا جو اس کارنامے کے اصل بانی تھے ۔

" یہ وقت نیل کی سیر کا ہے — " میرے دوست نے فیصلہ سنایا ۔ " نیل کی رات! — ایسی رنگین اور پر فسوں رات کہیں نہیں ہوتی — آؤ — "

جب ہم نیل کے کنارے کنارے جا رہے تھے تو چاند دوسرے کنارے درختوں کی قطار کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا ، کھجوروں کی چوٹیاں چاند کو چھوتیں پھر وقفہ آجاتا اور چاند رہ جاتا اور نیل کی شفاف سطح ۔ ڈھلتی ہوئی رات کے ساتھ تاروں کی چمک تیز ہوتی جا رہی تھی ۔

" ایسی ہی رات میں فرعون کی لڑکی کو حضرت موسیٰ کا پنگھوڑا نیل میں تیرتا ہوا ملا تھا ، انہیں تاروں کی چھاؤں تلے سکندر اعظم مسحور ہو کر رہ گیا ۔ یہی چاند تھا اور یہی دریا جب قلوپطرہ کے بجرے یہاں تیرتے تھے ۔ عرب حدی خوانوں کے نغمے یہاں گونجا کیے — یہ تارے میرے ہیں ، یہ چاند میرا ہے ، یہ دریا میرا ہے — " اس نے میری طرف دیکھا ۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا ۔

ہوا چل رہی تھی لیکن دریا میں ایک لہر بھی نہیں تھی ، پانی کی سطح آئینے کی طرح چمک رہی تھی جیسے دریا بہتے بہتے رک گیا ہو ۔

" نیل ہی مصر ہے ۔ اجنبی ہنستے ہیں کہ مصریوں کا مزاج نیل کی طرح ہے ، جیسے نیل میں یک لخت اتار چڑھاؤ آتے ہیں بالکل ویسے ہی ہماری طبیعت ہے ۔ ابھی خاموش ہیں ،

ابھی بھڑک اٹھے ، بن گئے پھر پارہ چڑھ گیا ، بلا وجہ جوش آ گیا ۔۔"

رنگ برنگی روشنیوں کا عکس پانی میں پڑ رہا تھا ۔ جدید ہالیں ملے رات کو انگریزی حروف پانی میں جمع کرتے ۔ اب ہر جگہ عربی حروف تھے ۔ ہوٹل نہ تھے فندق بن گئے تھے ۔ چڑیا گھر حدیقة الحیوانات تھا ۔ میں اب ایسے نہیں ، No waiting کی جگہ ممنوع الانتظار لکھا تھا ۔ یہاں تک کہ عبدالکریم اینڈ سنز کی جگہ عبد الکریم و اولادہ نے لے لی تھی ۔

"میں تمہیں عید کارڈ بھیجتا ہوں اور تم ہمیشہ نوروز کی مبارک باد دیتے ہو ۔ یہ نوروز کیا ہوتا ہے ؟" میں نے پوچھا ۔

"تمہارے ہاں نوروز نہیں ہوتا ؟"

"ایک نوروز جان گزرے ہیں ، بابے ہوٹل ساقی تھے ۔"

"اچھا ! یہ تو دلچسپ بات ہے ۔ عربی فارسی اور اردو میں لاتعداد الفاظ مشترک ہیں ۔"

"مگر ہر جگہ معنے مختلف ہیں ۔ حمام کسی جگہ پرندہ ہے ، دوسری جگہ غسل خانہ ۔ تمہارے ہاں محکمۂ اطلاعات ملکی معاملات پر نظر رکھتا ہے ، ہمارے ہاں اطلاع دیتی رہتی ہے ۔ تاریخ ہند میں مشہور خاتون ملکہ ثانی کا ذکر ہے ۔ ایران میں خصم دشمن ہوتا ہے اور ہمارے ہاں خاوند ۔"

"یہ تو ایک ہی بات ہوئی ۔ ویسے تمہارے ہاں عید ہوتی ہے ہمارے ہاں نوروز ۔"

"تو پھر یہ جشن وفاءالنیل کیا چیز ہے ؟"

"فرعونوں کے زمانے میں ہر سال طغیانی آنے پر نیل کی سالگرہ منائی جاتی تھی ۔ ایک خوبصورت حسینہ کو زندہ ہی دریا میں پھینک دیتے تھے ۔ رسم تو بند ہو چکی ہے لیکن تہوار منایا جاتا ہے ۔"

"یوں تو ہر فرعونے را موسیٰ -- لیکن حضرت موسیٰ والا فرعون کون سا تھا ؟"

"شاید رعمسیس دوئم کا بیٹا --"

"یعنی رعمسیس سوئم --"

"پتا نہیں ۔ ویسے فرعونوں میں سے ہی کوئی تھا --"

"فرعون کی خفگی کی بے شمار وجوہات بتائی جاتی ہیں ۔ اصل وجہ کیا تھی ؟"

"شاید یہ کہ ایام طفولیت میں حضرت موسیٰ نے اس کی داڑھی کھینچ لی تھی --"

"لیکن فرعون کی داڑھی تھی تو عجیب ہوتی تھی ۔ چہرہ صاف مونچھیں ندارد اور ایک لمبی سی رسے جیسی داڑھی لٹکی ہوئی ہے ۔"

"یہ داڑھی مصنوعی ہوتی تھی ۔ اس میں موتی پروئے جاتے تھے ۔ اس زمانے میں داڑھی دانائی کا نشان سمجھی جاتی تھی ۔"

"مصنوعی داڑھی سے اصلی دانائی آنی مشکل ہے ۔ ایسی چیز نظر آ جائے تو ہر بچہ کھینچنے کی کوشش کرے گا ۔ غلطی فرعون کی تھی کہ بچے کے قریب گیا ۔"

چاند چھپ چکا تھا اب تارے تھے اور نیل ۔ جتنے آسمان پر تھے اتنے ہی دریا میں جھلملا رہے تھے ۔ درختوں کے جھنڈ جب چاپ کھڑے تھے ، فضا میں خنکی تھی اور ایک نامعلوم سی خوشبو جو ہمیشہ دریا سے منسوب ہوتی ہے ۔

"آج تم کچھ نہیں دیکھ سکے ---"

"میں نے تو سارا مصر دیکھ لیا ۔ اہرام ، نیل ، سمیعہ کمال --- فقط قلوبطرہ کا ذکر رہ گیا ہے ---" میں نے کہا ۔

"قلوبطرہ پر ابھی ریسرچ ہوئی ہے ، محققین کہتے ہیں کہ جب سیزر یہاں آیا تو بالکل بوڑھا تھا ، سر پر جو چند بال تھے وہ سفید تھے ، اُدھر انطونی بے حد موٹا تھا ۔ اس کے

گول مٹول چہرے پر ہر وقت احمقانہ مسکراہٹ رہتی تھی اور جوڑی سی گھنی داڑھی ۔ قلوپطرہ بھی اتنی نوخیز نہیں تھی جتنی کہ شاعر کہتے ہیں ، وہ اچھی خاصی پختہ عورت تھی ۔ چونکہ نصف یونانی تھی اور نصف مصری اس لیے اُس کا رنگ مسکی تھا ۔ لہٰذا رومان وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔۔ ''

'' ان دنوں ریسرچ کا مقصد ہی یہ رہ گیا ہے کہ کسی اچھی بھلی روایت یا حکایت کا تیا پانچا کر دیا جائے ۔ ان دنوں محققین یہ ثابت کرنے کی کوشش میں ہیں کہ شیکسپیئر تھا ہی نہیں ۔ ایسی باتوں پر یقین نہ کرو ۔ میرے خیال میں قلوپطرہ بڑی اچھی لڑکی تھی ، حسین ، انٹلکچوئل اور ہمس مکھ ۔ اگر رومن بار بار یہاں آکر اُدھم نہ مچاتے تو وہ زیادہ خوش رہتی ۔۔۔''

'' مگر اتنی مشہور نہ ہوتی ۔۔۔''

'' اُس کی شہرت تمہارے اور میرے لیے ہے ، اُس بے چاری کو اپنی زندگی میں تو کوئی فائدہ نہ پہنچا ۔۔ ''

'' شہرت مرنے کے بعد ہی ہؤا کرتی ہے ''

ہم ایک پتھر پر بیٹھ گئے ، وہ پانی میں ہاتھ ڈال کر چھینٹے اُڑانے لگا ۔

'' ہاتھ باہر نکال لو ۔ جانتے نہیں کہ نیل کا پانی جلد سے چھو جائے تو ایک خطرناک بیماری لاحق ہوسکتی ہے ، اس پانی میں بلہارزیا ہوتا ہے ۔۔۔''

'' سارے ملک میں لے دے کر ایک ہی دریا ہے اُسی کا پانی خطرناک ہے ، بے چارے فلاحین صدیوں سے اس بیماری میں مبتلا ہیں ۔۔۔'' اُس نے ہاتھ باہر نکال لیا ۔

یہ دبلے پتلے محنتی کسان جنہیں فلاحین کہا جاتا ہے ہزاروں برس سے مصر کی زمین میں ہل چلاتے رہے ہیں ۔ قاہرہ ، سکندریہ ، پورٹ سعید ، مصر کے کسی شہر سے ایک آدھ میل باہر نکلتے ہی منظر یک لخت بدل جاتا ہے ۔ مٹی کے مکان ، کھجوروں کے جھنڈ ، ریت کے ٹیلے ، نیلی عباؤں والے کسان نظر آنے لگتے ہیں ، زمانہ صدیوں پیچھے چلا جاتا ہے ۔

جنگ کے زمانے میں جب پہلی بار مصر کے گاؤں دیکھے تو سب کچھ مانوس سا معلوم ہؤا ۔ دریا میں بادبانوں والی کشتیاں تیر رہی تھیں ، کناروں پر پانی بھرنے والیوں کے ہجوم تھے ، کسان ڈول اور رسے سے فصلوں کے لیے پانی نکال رہے تھے ۔ ہمیں دیکھ کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے ۔ اُن دنوں کسی گاؤں میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا ۔ میرے انگریز ساتھی بار بار کہتے کہ واپس چلو ۔ ٹام بولا ۔۔۔ '' دیکھتے نہیں ، ان کا رویہ روز بدلتا ہے ، ہم جرمنوں کو دھکیلتے ہیں تو ہماری آؤ بھگت ہوتی ہے ، جب جرمن آگے بڑھتے ہیں تو ہماری موٹروں پر پبلک اینٹیں پھینکتی ہے ۔ ان کا کچھ پتا نہیں ۔۔۔''

میں نے اُسے بتایا کہ پبلک کا کوئی قصور نہیں ، جب غیر ملکی باہر سے آ کر آپس میں لڑ رہے ہوں تو پبلک کی پوزیشن عجیب سی ہو جاتی ہے ۔۔

موٹے تازے گورے چٹے شہریوں کے مقابلے میں فلاحین تندرست دکھائی نہیں دے رہے تھے ۔ بخاروں ، بلہارزیا اور ککروں کے مریض ، اُن کے سانولے چہروں پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور ایک گہری تھکاوٹ اور اداسی مسلط تھی لیکن اس کے باوجود وہ مسکرا رہے تھے ۔۔۔ وہ مسکراہٹ جو حزن سے کہیں زیادہ مایوس کن ہوتی ہے ۔

میں نے اپنے گاؤں کی باتیں بتائیں کہ نہر میں پانی آتا ہے اور ہم ہل چلا کر کپاس اور گیہوں اُگاتے ہیں ، سبزیاں بوتے ہیں ، گنے کے رس سے شکر بناتے ہیں ۔ گائیڈ نے ترجمہ کیا تو بہت سی آنکھوں نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہتی ہوں ۔۔۔تم تو ہمارے دوست ہو ۔ بیٹھنے کے لیے زمین پر چادر بچھا دی گئی ، ایک کسان کھجوریں لے آیا ۔ اس تحفے کے

حقیر ہونے کا انہیں احساس تھا ، جب انہوں نے اس کا اظہار کیا تو میں نے یقین دلایا کہ یہ تحفہ ہرگز حقیر نہیں ، گھاس کے بنے اور جنگلی پھول بھی تحفتاً دیے جاتے ہیں اور ہیرے جواہرات بھی ۔ اصلی چیز تو وہ جذبہ ہے جس کے تحت پیش کش کی جاتی ہے ۔ انجیل میں آیا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ یروشلم آئے تو معتقدوں نے جو غریب تھے ، کھجور کی ٹہنیاں ہلا ہلا کر اُن کا استقبال کیا ۔ اور یہ کھجوریں ہی تو ہیں جن پر اُن غریبوں کا گزارا تھا جنہوں نے براعظموں کے بڑے بڑے حصے فتح کئے تھے ۔

یہ مصر کے اصلی باشندے تھے جنہوں نے اہرام بنائے ، کشتیاں چلائیں ، اناج اگایا اور جنگیں لڑیں ۔ پانچ ہزار سال پہلے انہیں کی بدولت مصر دنیا کا سب سے مہذب ملک تھا ۔

اگلے روز میرے دوست نے پھر کسی میزبان کی طرح پوچھا — کیا دیکھو گے ؟ یعنی دوسری خواہش بیان کرو ۔

میں نے میوزیم دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا ۔ لڑائی کے دنوں میں اسے بند کر دیا گیا تھا ، اس میں ممیاں تھیں اور فرعون طوطن خامن کے مقبرے سے برآمد شدہ قیمتی چیزیں ۔

ہم میوزیم دیکھنے گئے تو ہمارے ساتھ ایک مصری لڑکی بھی تھی جس کا نام زائدہ تھا ۔ وہ یونیورسٹی میں تاریخ کی سکالر تھی (شاید اسے سکالر شپ بھی ملتا تھا) ۔

"اسے اس لیے ساتھ لایا ہوں کہ میں تاریخ جغرافیہ سے بالکل بے بہرہ ہوں —" اس نے سرگوشی کی (میرے دوست کو سرگوشیوں کی شروع سے عادت ہے) ۔

"تم بڑے خوش قسمت ہو —"

میوزیم میں داخل ہونے سے پہلے زائدہ نے بڑے عالمانہ انداز میں کہا — "جب تک کسی ملک کے جغرافیائی حالات کا علم نہ ہو تاریخ کا مطالعہ بے سود ہے ۔ غالباً آپ مصر اور نیل کے متعلق کچھ نہ کچھ تو جانتے ہی ہوں گے —"

میں نے فر فر سبق سنا دیا — "کپلنگ مرحوم نے کہا تھا کہ مصر کے ملک کو ملک نہیں کہا جاسکتا یہ تو ایک لمبا کھلا ہوا ہرا بھرا بازار ہے — کپلنگ نے سچ کہا تھا ۔ مصر میں بارش بہت کم ہوتی ہے بلکہ ہوتی ہی نہیں ۔ ملک کا اٹھائیسواں حصہ قابل کاشت ہے وہ بھی نیل کی بدولت کیونکہ اگر نیل نہ ہوتا تو مصر صحرا ہوتا ۔ دنیا کا سب سے مشہور دریا نیل سیدھا سادا دریا ہرگز نہیں ۔ اپنے دہانے سے چار ہزار میل دور جھیل وکٹوریا سے نکلتا ہے ، شور مچاتے ہوئے نیل کو بحرالغزال کہا جاتا ہے ۔ ایک جھاگ اڑاتی ہوئی پہاڑی ندی بحرالجبل اس سے ملتی ہے تو بحرالابیض یعنی سفید نیل ظہور میں آتا ہے جو خرطوم تک سفید رہتا ہے کیونکہ وہاں نیلا نیل یعنی بحرالازرق اس کا انتظار کرتا ہے ۔ جب دونوں ملتے ہیں تو اصلی نیل بنتا ہے ۔ چونکہ نیل بننے کے لیے کافی مسافت طے کرنی پڑتی ہے اس لیے مصر کے میدانوں میں بہنے کے لیے اسے صرف پانچ سو میل ملتے ہیں ۔ قاہرہ سے آگے دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے جو ایک دوسرے سے دور ہوتی جاتی ہیں حتیٰ کہ جب بحیرۂ روم میں گرتی ہیں تو ان کے درمیان ڈیڑھ سو میل کا فاصلہ ہوتا ہے ۔ نیل کو کھجور کے درخت سے تشبیہہ دی گئی ہے جس کی جڑیں سمندر میں ہوں اور شاخیں پہاڑوں میں ۔ میری حقیر رائے میں یہ کھجور سے ہرگز نہیں ملتا اور نہ کھجور اس سے ملتی ہے ۔ اگر زبردستی اس تشبیہہ کو صحیح مان لیا جائے تو پھر یہ کھجور کافی ٹیڑھی ترچھی ہوگی ، لہٰذا کھجور نہیں کچھ اور چیز ہوگی ۔ نیل نے مصر کی جغرافیائی پوزیشن خراب کر رکھی ہے ، یعنی نقشے پر مصر کا بالائی حصہ زیریں نیل کہلاتا ہے اور نچلا حصہ بالائی مصر ۔ یہ اس لیے کہ مصر اتنا اہم نہیں

جیتا کہ نیل - طلباء کی سہولت کے لیے اسے درست کر دینا چاہئیے ورنہ پھر نیل کو الٹی سمت میں بہنا چاہئیے - گرمیوں میں حبشہ میں مون سون آتی ہیں تو یکایک نیل میں سیلاب آجاتا ہے - آج دریا حاشیوں سے بہہ رہا ہے تو کل اس کی سطح بیس فٹ اونچی ہو جائے گی اور عرضاً تیس میل تک سرخی مائل پانی پھیل جائے گا اور ہر جگہ نیل ہی نیل ہوگا - ہمارے ہاں کسان بارش کے انتظار میں عمودی رخ میں آسمان کی طرف دیکھتے ہیں لیکن مصریوں کی نگاہیں افقی سمت میں ہوتی ہیں کہ طغیانی کب آتی ہے اور ہمارا دریا زرخیز مٹی کب لاتا ہے - ہمارے ہاں تیز مغرب کی طرف سفر کرکے بڑھتے ہیں لیکن مصر میں مشرق کی طرف - سکندر اعظم نے یہاں سکندریہ آباد کیا تھا جو اب بہت بڑا شہر ہے - ہمارے ہاں بھی اس نے ایک سکندریہ آباد کیا جو زمانے کی گردش سے چھوٹا ہوتا چلا گیا اور اب آج سرہند کی شکل میں ... کے کنارے پایا جاتا ہے —"

"تم نے حیوانات و جمادات کا ذکر نہیں کیا —" میرا دوست بولا -

"وادیٔ نیل میں اونٹ اور گدھے افراط سے ملتے ہیں - اونٹ تو خیر معمولی ہیں لیکن گدھے معمولی ، صحت مند اور مسرور نظر آتے ہیں - ایسے تندرست و توانا گدھے میں نے اور کہیں نہیں دیکھے - قاہرہ میں سڑک کا سپاہی جب شاندار امریکن کاروں کو گزار چکتا ہے تو دوسری طرف اشارہ کرتا ہے کہ اب وہ گدھے گزر جائیں جن پر سوٹ اور ہیٹ پہنے ہوئے حضرات بیٹھے ہیں - فرعونوں کے مقبروں سے جو کتبے ملے ہیں اُن میں اونٹ کا ذکر نہیں ہے - معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اونٹ عربوں نے رائج کیا تھا —"

"بس بس کافی ہے —" نائمہ بولی "پہلے اندر چلیں —"

اب تاریخ کا سبق شروع ہوا - نائمہ نے ایک کتاب کے صفحے الٹے اور کہنے لگی :—

"اس سے پہلے کہ آثار قدیمہ کا ذکر کیا جائے اہرام اور ابوالہول کے متعلق جاننا ضروری ہے - خوفو کے ہرم کی بنیاد تیرہ ایکڑ میں پھیلی ہوئی ہے - اس کی تعمیر میں اڑھائی اڑھائی ٹن کے تئیس لاکھ پتھر استعمال ہوئے - اگر یہ سب پتھر خط استوا کے ساتھ ساتھ ایک قطار میں رکھ دئے جائیں تو دو تہائی دنیا کو محیط کرلیں - ہرم کی چوٹی گھس گھس کر تیس فٹ کم ہو چکی ہے تو بھی یہ ساڑھے چار سو فٹ بلند ہے - ایک لاکھ انسانوں نے بیس برس تک محنت کی تب یہ مکمل ہوا —"

"بیس برس تک کھیتی باڑی بند رہی ہوگی ؟" میں نے پوچھا -

"نہیں ، خوفو فلاحین سے فقط تین مہینے کام لیتا تھا - جب نیل میں طغیانی آتی تھی تب -"

"بڑا اچھا فرعون تھا - فلاحین سیلاب کے دنوں میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہوں گے اُن کی ضیافت طبع کے لیے خوفو نے اچھا مشغلہ بہم پہنچایا —"

"خوفو کے ہرم کے بعد خفرے نے اپنا ہرم ایک اونچے سے ٹیلے پر بنوایا اس طرح کہ اُس کا ہرم جو کہ خوفو کے ہرم سے چھوٹا ہے بڑا دکھائی دیتا ہے —"

"اس طرح خفرے نے بیس تیس فٹ بھی بچا لیا اور اُس کی ناک بھی اونچی رہی —" میں نے لقمہ دیا -

"تیسرا ہرم منکرے کا ہے - ویسے نیل کے کنارے چھوٹے بڑے سب ملا کر کل ستر اہرام ہیں —"

"تو ہر فرعون کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ممی بن کر ہرم میں دفن ہو تو جیون سپھل ہو جائے - یعنی لافانی بننے کے لیے فانی جسم کی حفاظت بے حد ضروری تھی - ہر فرعون اسی چکر میں رہتا ہوگا کہ جوانی ہی میں اپنے ہاتھوں اپنا مقبرہ تیار کرلے - ہرم مکمل ہونے پر شاید چیف انجینئر دست بستہ عرض کرتا ہوگا کہ حضور مقبرہ تیار ہے حسب

منشا استعمال کیا جا سکتا ہے —"

ثانیہ کے چہرے پر خفگی کے آثار نمودار ہو چلے تھے اور میرے دوست کی باچھیں کھلی جا رہی تھی۔

"اہرام فن تعمیر کے شاہکار سمجھے گئے ہیں، آج تک کوئی معلوم نہ کر سکا کہ یہ کیونکر بنائے گئے —"

"اور کچھ لوگ انہیں نرے پتھروں کے ڈھیر سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہر شخص ہرم بنا سکتا ہے۔ پتھروں کی تہیں اس طرح جمائی جائیں کہ ہر تہ پہلی سے طولاً عرضاً ذرا چھوٹی ہو تو لازمی طور پر ایک مخروطی عمارت بن جائے گی جس کے گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا —"

"کون ہیں وہ لوگ؟"

"میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں نے تو یونہی سنی سنائی کہی ہے۔ لیکن فرعونوں کے بعد جو فاتحین آئے انہوں نے بار بار انہیں ملبے کے ڈھیر سمجھا اور نئی عمارتوں کے لیے ان کے پتھر استعمال کئے —"

"آپ نے اور کیا سنا ہے؟"

"یہی کہ پرانے مصری خوفو اور خفرے سے بے حد خفا تھے کہ انہوں نے زبردستی اپنے اہرام بنوائے اور رعایا کو مدتوں عذاب میں گرفتار رکھا۔ تب ان دونوں کا نام لینا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ خفرے کا لڑکا منکرے ذرا رحم دل نکلا اور رعایا کی بہبودی کی طرف متوجہ ہوا چنانچہ اس کا ہرم اپنے ابا کے ہرم سے نصف رہا۔ منکرے کا لڑکا بہت سرپھرا تھا۔ لوگوں نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا کہ فرعون ہو کر اپنی اچھی طرح پیش آتا ہے۔ اس غریب کا کوئی ہرم نہ بن سکا۔ ویسے مضبوط اور بڑے بڑے کہلاتے ہیں اہرام وہی ہیں جو پہلے بادشاہوں نے ذاتی نگرانی میں بنوائے۔ بعد میں جیسا کہ دستور ہے معیار گرتا گیا، یہاں تک کہ بعد کے اہرام میں کئی ایسے ہیں جن میں باہر ذرا سا پتھر لگایا ہے ورنہ اندر ریت اور مٹی ہے — یہ اہرام ضرور ٹھیکیداروں سے بنوائے گئے ہوں گے۔ اور عرض یہ ہے کہ فرعون نہ میرے کچھ لگتے تھے نہ آپ کے — بھلا آپ خفا کیوں ہوتی ہیں —؟"

"بھئی لڑو مت —" میرا دوست بولا۔

"ان دنوں فرعونوں کو بڑی لفٹ مل رہی ہے۔ سنا ہے ایک فرعون کا بہت بڑا مجسمہ صحرا سے اٹھا کر ریلوے سٹیشن کے سامنے نصب کیا جا رہا ہے۔ بات کیا ہے —؟"

"یہ نیا رجحان ہے —" میرے دوست نے بتایا۔ "شروع شروع میں مصریوں نے کہا کہ ہم ان قوموں کی اولاد ہیں جو موجودہ ایران سے آئی تھیں۔ رومنوں سے کہا کہ یونانی النسل ہیں۔ جب فرانسیسی آئے تو انہیں بتایا کہ دراصل ہمارے بزرگ عرب تھے۔ انگریزوں سے کہا کہ ہمیں تقریباً فرانسیسی سمجھو۔ لہذا یا تو فرعونوں کے زمانے میں ہماری اپنی حکومت تھی یا اب ہے، ورنہ یہاں ہمیشہ غیر ملکی حکمران رہے۔ محمد علی بھی تو البانیہ کا سوداگر تھا۔ اب مصریوں کو محسوس ہو رہا ہے کہ دراصل فرعون ہی ان کے اصلی بزرگ تھے۔ دیکھا جائے تو فرعونوں کی وجہ سے کافی آمدنی ہو جاتی ہے۔ دور دور سے سیاح آتے ہیں —"

"پرانے زمانے کی طرف لوٹ جانے کی خواہش اتنی عجیب بھی نہیں۔ ان دنوں مشرق میں یہ خواہش عام ہے۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ یہاں کہیں قدیم رسم الخط رائج نہ ہو جائے۔ چڑیا، سانپ، الو، سورج، دریا وغیرہ کو پڑھنا مشکل ہو جائے گا —"

ثانیہ نے منہ پھیر رکھا تھا۔

"یہ بتائیے کہ کہ آپ تاریخ اسی طرح پڑھتی ہیں؟" میں نے اسے چھیڑا۔

"تو اور کس طرح سے بنتے ہیں ؟"

"آپ تو جغرافیہ بھی ساتھ ملا لیتی ہیں ۔ ناک ، لمبائی ، چوڑائی ، بلندی ، یہ سب کچھ جغرافیے میں ہوتا ہے ۔ تاریخ کو کسی اور زاویے سے لینا چاہیئے ۔ اس میں طرح طرح کے موڑ آتے ہیں ۔ اب مثلاً مجھ سے کہا جائے کہ آنسہ ثانیہ کا جغرافیہ بیان کرو تو میں کہوں گا کہ ان کا قد پانچ فٹ چھ انچ ہے ۔ وزن تقریباً ساڑھے آٹھ سٹون ہوگا ، چونی شکل ، چونی ناک ، انگریزی بولتی ہے ، مونالیزا کی پرستار ہیں ۔ لیکن تاریخ بیان کی جائے تو پھر ثانیہ کی بڑی بڑی آنکھوں کا ذکر ہوگا جو مصر میں نہیں ہوتیں ، بالوں کی سنہری جھلک کا حوالہ بھی دیا جائے گا اور یہ کہ اس کا نام ثانیہ نہیں آسیہ ہونا چاہیئے ۔ یہ بھی کہا جائے گا کہ ثانیہ بے مثال ہے ۔ اور بھی بہت سی باتوں کا ذکر ہوگا ۔"

وہ مسکرانے لگی ۔ "آنکھوں کا یہ رنگ ایک بزرگ خاتون سے ملا جو یورپ سے آئی تھیں ، بالوں کی رنگت آرمینیا سے ساتھ لائی تھیں ۔ آپ کے ہاں بھی تو لوگ مغربی عورتوں سے شادیاں کرتے ہوں گے ۔"

"ہاں کبھی کبھی کر لیتے ہیں ۔۔۔"

"کیوں ، کبھی کبھی کیوں ؟"

"اس لیے کہ مغربی عورتوں کو گرمیوں میں پہاڑوں پر بھیجنے کی بڑی مصیبت رہتی ہے ۔ ادھر سب کے سب یہی کہتے ہیں کہ لڑکا ولایت سے میم بھگا لایا ہے ۔ میم خواہ ہوائی جہاز سے آئی ہو یا سمندری راستے سے ، مگر بھگانے کا حوالہ عمر بھر دیا جاتا ہے ۔ ساتھ ساتھ یہ امید ظاہر کی جاتی ہے کہ انشاء اللہ میم کسی دن ضرور بھاگ جائے گی دیکھ لینا ۔ فائدہ ہے تو ایک ۔ کہ بیوی کے رشتہ داروں سے نجات مل جاتی ہے ۔۔۔"

"تاریخ کی باتیں کرو ۔ میوزیم کا وہ آدمی ہمیں گھور رہا ہے ۔ اور تم نے ابوالہول کے متعلق کچھ نہیں بتایا ۔۔۔" میرے دوست نے کہا ۔

ثانیہ نے پھر منہ پھیر لیا ۔

"ہاں تو ابوالہول کے متعلق تم کیا جاننا چاہتے ہو ۔ وضاحت سے بیان کرو ۔۔۔"

"سنا ہے کہ جب عرب مصر آئے اور اہرام کے پاس ایک عجیب الخلقت شبیہہ دیکھی جس کی سرخ آنکھیں بری طرح چمک رہی تھیں تو ان کے دل میں ہول اٹھا ۔ فوراً ابوالہول نام تجویز ہوا جو غالباً فی البدیہہ تھا ۔ خوفو کے ہرم کی تعمیر ختم ہوئی تو ایک طرف پتھر کا ملا سا ٹیلہ رہ گیا جسے دیکھ کر آرٹسٹ ناک بھوں چڑھاتے کہ منظر کو تباہ کر دیا ہے ۔ خفرع اپنے ہرم کے سلسلے میں وہاں آیا اور یہ باتیں سنیں تو بہت خفا ہوا ۔ اس نے متعلقہ آرٹسٹ پکڑے اور انہیں حکم دیا کہ ٹیلے کو تراش کر ہمارا بت بناؤ ۔ پرانا بادشاہ تھا اور پھر فرعون ۔ خد و خال تراشتے وقت سنجیدگی اور رعب کا خاص خیال رکھا گیا اور بڑا ڈراؤنا چہرہ بنایا گیا ۔ آرٹسٹوں کو کبھی خفا نہیں کرنا چاہیئے ، ویسے بھی بادشاہت اور مسکراہٹ دو الگ الگ چیزیں ہیں ۔ چہرہ جو کہ چودہ فٹ چوڑا ہے انسانی ہے لیکن دھڑ کسی شیر کے جسم سے مشابہ ہو کر بنایا گیا ہے ۔ ایک مرتبہ یہ ریت میں دب گیا تھا لوگوں نے پھر کھود کر نکال لیا ۔ اتنی لمبی چوڑی چیز زیادہ دیر تک دبی نہیں رہ سکتی ۔ یونانی ، رومن ، عرب ، فرانسیسی ، ترک ۔۔ جو بھی یہاں آیا اسے دیکھ کر متعجب ہوا سوائے انگریزوں کے جو اس کی تصویریں پہلے سے دیکھ چکے تھے ۔ نپولین تو گھنٹوں کھڑا اسے تکتا رہتا تھا ، اسی کے زمانے میں توپ کے گولوں سے اس کی ناک توڑ دی گئی ۔ مملوک کہتے تھے کہ فرانسیسیوں نے توڑی ہے ، فرانسیسی کہتے تھے کہ مملوک چاند ماری کر رہے تھے ہم تو قریب بھی نہیں گئے ۔ بہر حال جس نے بھی توڑی اچھا نہیں کیا ۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ

رشک یا حسد ہو کیونکہ برسوں پہلے رومن بادشاہ کیلی گلہ نے ارادہ کیا تھا کہ مصر جا کر ابوالہول کے چہرے کے نقوش بدلوا کر اپنی شبیہہ بنوائے ، خوش قسمتی سے لوگوں نے اسے روم ہی میں مار دیا ۔ ابوالہول کی خاموشی ضرب المثل بن چکی ہے ۔ اکثر سننے میں آتا ہے کہ فلاں شخص ابوالہول کی طرح خاموش طبیعت ہے ۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ سب بت خاموش رہتے ہیں کیونکہ وہ بول نہیں سکتے ۔"

"شاباش" میرے دوست نے میرا کندھا تھپتھپایا ۔

"آپ ریسرچ کر رہے ہوں گے ؟ لوگوں سے دور کا کام کر رہے ہیں" نادیہ نے پوچھا ۔

"جی نہیں ۔ میں ریسرچ نہیں کر رہا ۔"

"تاریخ کے متعلق آپ کے نظریے عجیب سے ہیں ..."

"اس کی ذمہ دار تاریخی ہستیاں ہیں ۔ میں بے قصور ہوں ۔"

میں نے اپنے دوست سے التجا کی کہ اب میرا تعارف کرا دو ۔ اس نے تعارف کرایا اور نادیہ کو پتا چلا کہ میں مورخ نہیں ہوں ، معمولی سا سیاح ہوں تو بہت خوش ہوئی ۔ شاید اس لیے کہ وہ خود مورخ تھی اور ریسرچ کر رہی تھی ۔

"اب میں کلاس لوں گا" میرے دوست نے فیصلہ کیا "آؤ میرے ساتھ ۔"

قدیم مصری تصویر کشی اور بت تراشی زیادہ تر مقبروں کے توسط سے میوزیم تک پہنچی ہے ۔ تصویروں میں زندگی سے زیادہ موت کی عکاسی کی گئی ہے ۔ ان کا مذہب انہیں صحیح موت کے لیے تیار کرنا تھا تاکہ اگلی زندگی نہایت شاندار ہو (خواہ پہلی زندگی کیسی ہی بری گزرے) یہ فلسفہ کچھ زیادہ غیر مانوس نہیں معلوم ہوتا کیونکہ دنیا کے کچھ حصوں میں اب تک اس پر عمل کیا جاتا ہے ۔

تصویروں میں ہر شخص کا سائز اس کے مرتبے کے مطابق ہے ، ایک ہی تصویر میں فرعون تین ہاتھ لمبا ہے ، وزیر ایک ہاتھ ، سپاہی دونیم چھ انچ اور عوام ایک ایک انچ کے ہیں ۔ اس کا یہ فائدہ ہے کہ گروپ کے نیچے نام اور عہدے لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی ۔

میوزیم میں بے شمار پٹیوں میں لپٹی ہوئی ممیاں ہیں ، سونے کے تابوت ہیں ، بڑے بڑے بت ، قیمتی زیورات اور پرانا لٹریچر بھی ہے جو پرندوں اور جانوروں کی تصویروں کے ذریعے سے آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر لیا گیا تھا ۔

ہیروڈوٹس نے اپنی کتاب میں ممی بنانے کے چند آسان اور زود فہم طریقے بیان کیے تھے ۔ یوں لگتا ہے جیسے انہیں پڑھ کر ہر شخص ممی بنا سکتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کام کافی مشکل ہوتا ہوگا ۔ کتاب میں ممی کی تین قسمیں بھی درج ہیں — بڑے آدمیوں کی ، متوسط طبقے کی اور غریبوں کی ۔

جتنی لاگت آتی تھی اتنے ہی ذوق و شوق سے ممی بنائی جاتی تھی اور اسی کے مطابق گارنٹی دی جاتی تھی ۔ مثلاً مہنگی ممی کے ساتھ سرٹیفکیٹ ملتا ہوگا کہ شرطیہ دو ہزار سے تین ہزار سال تک چلے گی ورنہ دام واپس ۔

زیادہ داموں میں تابوت پر مرحوم کی بڑی دیدہ زیب رنگین شبیہہ بنائی جاتی تھی ، اوسط درجے کے تابوت پر اصلی شکل ہوتی تھی اور سستے تابوت یا تو سادہ ہوتے تھے یا ان پر کارٹون سا بنا دیتے تھے ۔

مصریوں کو کچھ ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ جب انسان نہ ملتے تو جانوروں کو پکڑ کر ممیاں بنا ڈالتے چنانچہ میوزیم میں بلیوں ، کتوں ، مگرمچھوں اور پرندوں کی بھی ممیاں ہیں — یہ سراسر زیادتی ہے !

کہا جاتا ہے کہ یہ دیوتا تھے ۔ ہر فرعون کے ساتھ دیوتا ملتے رہتے تھے ۔ اگر ایک

نے سانپ اور گیدڑ دیوتا چنے ہیں تو دوسرے نے طوطے اور لومڑی کو نامزد کیا اور تیسرے نے مگرمچھ اور بھیڑیے کو ۔ حتیٰ کہ ایک ایک کر کے سارے جانور اور پرندے ختم ہوگئے ۔ تب انہیں خدا کی موجودگی کا خیال آیا ہوگا ۔

اگر کوئی سیاح مصر میں انتقال کر جاتا تو اہل مصر چندہ کرکے اس کی ممی بنوا دیتے کہ کہیں مرحوم اس اعزاز سے محروم نہ رہ جائے ۔ اُن دنوں مصر میں سیاح بہت کم جاتے ہوں گے ۔

ممی بناتے وقت دماغ ، دل جگر ، وغیرہ نکال دیے جاتے تھے ، ماہرین کا خیال تھا کہ اگلی زندگی میں ان کی ضرورت نہیں ہوگی ۔

ممی کو دفن کرتے وقت رقم ، زیورات ، فرنیچر — سب ضروریات زندگی ساتھ دفن کی جاتی تھیں تاکہ اگلی زندگی میں کام آسکیں ۔ ادھر چور منتظر رہتے کہ ان چیزوں کو اسی زندگی میں استعمال کرلیں ۔ لہٰذا ملک دو فریقوں میں بٹا ہؤا تھا ، ایک فریق ممی بنانے میں مصروف رہتا تھا ، دوسرا ممی چرانے میں ۔

فرعون بادشاہ بھی ہوتا تھا اور مذہبی پیشوا بھی ، اس لیے کہ مذہب کے نام پر لوگ سب کچھ مان لیتے ہیں ۔ فرعونوں کو روایات کا بڑا خیال تھا اسی سلسلے میں انہیں کئی کئی رشتہ دار خواتین سے شادی کرنی پڑتی تھی تاکہ اپنی زندگی میں تخت کے دعوےداروں سے واسطہ نہ پڑے ۔ بارہا ایسا ہؤا کہ کنبے میں جتنی بن بیاہی خواتین تھیں تاج پوشی کے بعد فرعون کو ان سب سے شادی کرنی پڑی ۔ تبھی وہ اپنا زیادہ وقت شکار کھیلنے اور اہرام بنانے میں صرف کرتے تھے ۔

اپنا مقبرہ بنا کر اور ملکی حالات درست کرکے فرعون دوسرے ملکوں کی جانب متوجہ ہوتا (یعنی اُن پر حملہ کرتا) ططمس سوئم نے ایشیاء پر سترہ حملے کئے تاکہ بہت سے ملکوں کے زیادہ سے زیادہ باشندے مارکر بین‌الاقوامی شہرت حاصل کرسکے ۔ اس کا یہ نظریہ بالکل ماڈرن تھا ۔ (ممیوں کا ایکس‌رے کیا گیا تو معلوم ہؤا کہ فرعونوں کو تپ دق اور کئی دیگر ماڈرن بیماریاں بھی تھیں) ۔

۱۵۰۰ء قبل از مسیح تک تو اہرام بنتے اور لٹتے رہے پھر ایک مرد عاقل ططمس اول نے اپنے لیے نیا راستہ چنا ۔ اس نے سوچا کہ لاکھوں فلاحین سے مقبرہ بنوا کر یہ توقع رکھنا کہ ممی اور خزانے کا راز محفوظ رہے گا سراسر بےوقوفی ہے ۔ اس نے تھیبز کے پہاڑوں میں غار کھدوا کر مقبرہ تیار کرایا اور 'بادشاہوں کی وادی' کی بنیاد رکھی ۔ اس کے بعد تقریباً پچاس بادشاہوں نے فرعون موصوف کے نقش‌قدم پر چل کر اپنے آپ کو اسی وادی میں دفن کرایا ۔

ططمس اول کی یہ تھیوری تھی کہ اہرام چوروں کو دور سے نظر آجاتے ہیں ۔ غار میں دفن ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ چوروں کو کم از کم ڈھونڈنا تو پڑے گا ۔ لیکن چوروں کو بھی کافی پریکٹس ہوچکی تھی انہوں نے بیشتر مقبرے ڈھونڈ نکالے ، بس اتنا لحاظ کیا کہ ممیاں چھوڑ جاتے تھے ۔ جب تک ملک کی حالت اچھی رہی بادشاہوں کے لیے بڑے وسیع اور بڑھیا زمین دوز مقبرے تیار ہوتے رہے لیکن جب محکمۂ مالیات نے معزوری ظاہر کی تو ایک ایک مقبرے میں نو نو بادشاہ دفن کئے گئے — ہر چیز کی حد ہوتی ہے !

میوزیم میں طوطن‌خامن کے مقبرے سے نکلی ہوئی بیش قیمت اشیاء رکھی ہیں ۔ یہ فرعون اپنے وقت میں زیادہ مشہور نہ تھا ، تیس برس سے اس کی شہرت دنیا بھر میں پھیل چکی ہے اس لیے کہ فقط اسی کا مقبرہ صحیح حالت میں ملا ہے باقی سب کے مدفن لٹ چکے تھے ۔

— تابوت ، رتھ ، کرسیاں ، صندوق — سب سونے کے بنے ہوئے ۔ اتنا سونا میں نے پہلے کہیں نہیں دیکھا ۔ کارٹر نے اس کا مقبرہ دریافت کیا ۔ کھودتے کھودتے وہ آخری دروازے

تک پہنچا ، جب دروازہ کھولا تو فرش پر سوکھا ہوا الوداعی ہار پڑا تھا جسے فرعون کے عزیز و اقارب چھوڑ گئے تھے۔ ایک کونے میں بجھا ہوا چراغ رکھا تھا جس کی لو نے دیوار کا ایک حصہ سیاہ کر دیا تھا ، اس سیاہی پر ان انگلیوں کے نشان بالکل واضح تھے جنھوں نے جلتے وقت چراغ گل کیا ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی چراغ بجھا ہے دروازہ کھولنے پر اتنے طویل عرصے کے بعد روشنی کی کرنیں اس ظلمت کدے میں داخل ہوئیں ۔ کارٹر اور اس کے ساتھی اس ہوا میں سانس لے رہے تھے جو ہزاروں سال پرانی تھی ، جس میں فرعون کو دفن کرنے والے سانس لے چکے تھے ۔ کارٹر کو محسوس ہوا کہ اسے گہرے استغراق میں مخل ہو کر اس نے بڑی گستاخی کی ہے ۔

"یہ دیکھو کیا لکھا ہے ؟" میرا دوست چونک پڑا ۔

قدیم مصری رسم الخط میں لکھی ہوئی عبارت کا ترجمہ یوں تھا ---

کبھی مے خانے میں شراب مت پیو ۔ اگر پی تو تم سا بے وقوف کوئی نہ ہوگا ۔ تم الٹی سیدھی ہانکوگے اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے گا کہ کیا کہہ رہے ہو ۔ دوسرے سنیں گے اور ہنسیں گے ، جگہ جگہ ان باتوں کا چرچا ہوگا ۔ جب دھت ہو کر گروگے تو باقی ایک آدھ ہڈی تڑوا بیٹھو گے ۔ دوسرے تمہیں اٹھا بھی نہیں سکیں گے کیونکہ وہ خود مدھوش ہوں گے ۔

"دیکھا ! حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے بھی لوگ جانتے تھے کہ شراب خوری بری ہے ---" ثانیہ خوش ہو کر بولی ۔

"اس نصیحت سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ شراب ہمیشہ گھر پر پیو ، مے خانے سے دور رہو ---" میرے دوست نے جواب دیا ۔

ایک طرف بڑے بڑے خُم رکھے تھے جنھیں قدیم مصری غم غلط کرنے کے سلسلے میں استعمال کر چکے تھے ۔

"یہ تو بہت بڑے ہیں --" میں نے اپنے دوست کہا "یا تو وہ آدمی سخت تھے یا شراب ہلکی ہوتی ہوگی ورنہ اسے خم میں و ہسکی ڈالی جائے تو ایک ہی سے انسان لٹ جائے ۔"

"شاید وہ بھی اب جانے ہوں گے ۔ زمانہ بدل گیا ہے ، انسان نہیں بدلا -- اسے پڑھو ایک پرانی نظم ہے --"

پانچ ہزار سال پہلے کی اس نظم میں ایک شخص خودکشی سے پہلے اپنی روح سے تکرار کر رہا ہے ---

میں کیا کروں ؟ کہاں جاؤں ؟
واقف کار سب لفنگے نکلے
دوستوں کے دل محبت سے خالی ہیں
میں کس سے کہوں ؟ کیسے کہوں ؟
جو شریف تھے وہ تباہ ہوچکے
رذیل پھل پھول رہے ہیں
کیسا زمانہ آگیا ہے ؟
پچھلی باتوں سے سبق نہیں سیکھتے
بھلے برے کی تمیز نہیں رہی
بلا مطلب کوئی کسی سے بھلائی نہیں کرتا ---

"یہ نظم میں اپنے نام سے شائع کرادوں تو لوگ سمجھیں گے کہ میں نے زمانۂ حاضرہ

کا صحیح جائزہ لیا ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ نہ انسان بدلا ہے نہ اُس کی فطرت ـــ" اُس نے ایک اور عبارت دکھائی جس میں یہ کہاوت لکھی تھی :

ہماری کامیابی کی وجہ دیوتا ہوتے ہیں
ناکامیوں کی وجہ خود ہم ہیں

واقعی یہ سب کچھ پانچ ہزار سال پرانا نہیں معلوم ہو رہا تھا ۔ اس زمانے میں لوگوں کو پتھروں کے متعلق بھی تو یہی خوش فہمی تھی کہ کچھ ہو جائے تو پیر نے کیا ہے ورنہ خود اس قابل نہ تھے ۔

ایک جگہ تصویروں کے ذریعے بتایا ہوا تھا کہ غیر ملکی جنگ میں ہاتھی استعمال کرتے تھے (مصریوں کے پاس اس سائز کا کوئی جانور نہیں تھا) رعمسیس دوئم کو بڑا غصہ آیا ، اور شام پر حملہ کرنے گیا تو اپنا پرائیویٹ شیر ساتھ لے گیا جسے دیکھ کر شامی اتنے ڈرے کہ فرعون کو نرغے میں لے کر بھی کوئی اُس کے قریب نہیں پھٹکا ۔ فتح کا سہرا شیر کے سر رہا ۔

اگلے کمرے میں ملکہ حطشپسط کے کارناموں کا ذکر تھا ۔ جب یہ خاتون تخت پر بیٹھی تو اُس نے بطور ملکہ حکومت کرنی چاہی لیکن لوگوں نے بالکل نوٹس نہیں لیا کیونکہ پہلی مرتبہ کسی خاتون نے تاج پہنا تھا ۔ ملکہ نے پہلے تو ضبط سے کام لیا پھر تنگ آ کر مصنوعی داڑھی لگائی اور اعلان کر دیا کہ یوں ہے تو یوں ہی سہی ، اگر دنیا صرف مردوں کے لیے ہے تو آج سے میں بھی مرد ہوں ، آئندہ مجھے فرعون کہہ کر مخاطب کیا جائے ۔ رعایا اتنی مرعوب ہوئی کہ جب تک ملکہ نے داڑھی لگائی سب فرمانبردار رہے (رعایا داڑھی کی اتنی عادی ہوچکی تھی) ۔

آداب ضیافت کا ذکر بھی تھا کہ سب سے پہلے مہمانوں کو غسل کرایا جاتا تھا ۔ اس غسل میں پانی کی جگہ تیل استعمال کیا جاتا تھا یعنی سارے جسم کی اچھی طرح سے مالش کی جاتی تھی ۔ اس کے بعد چکنے چپڑے مہمانوں کو ایک لکڑی کی چھوٹی سی ممی دکھائی جاتی تھی اور مشورہ دیا جاتا تھا کہ ابھی وقت ہے کھا پی لو ورنہ ایک دن یہ حالت ہوگی ۔

شدید مالش اور ممی دیکھنے کے بعد جتنی بھوک رہ جاتی ہوگی وہ ظاہر ہے ۔

اہرام کی عظمت کا صحیح اندازہ زمین سے نہیں لگایا جاسکتا ۔ خوفو کے ہرم کی چوٹی سے میں نے نیچے دیکھا تو یوں لگا جیسے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں ۔ نوک دار چوٹی بالکل سپاٹ ہے ، اوپر اچھا خاصا میدان بنا ہوا ہے ۔

یہ چڑھائی بڑی کٹھن ہے ، کھانے کی میز جتنے بڑے پتھروں کی ایک سو سینتیس سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں ۔

میں نے دوربین سے نیل کو دیکھا ـــ ریت کے سمندر میں اس افق سے اُس افق تک ایک سبز لکیر کھنچی ہوئی ہے ۔ ایک طرف ممفس اور سقرہ کے اہرام ہیں ، پھر فسطاط نظر آتا ہے جہاں فاتح مصر عمرو بن العاص کی مسجد اور مزار ہے ۔ بائیں کو ہٹ کر قاہرہ شروع ہو جاتا ہے ۔ ایک ٹیلے پر سلطان صلاح الدین ایوبی کا قلعہ ہے اور محمد علی کی مسجد (جو ۱۸۵۰ء میں مکمل ہوئی یہ سنہ طلباء کو ہمیشہ یاد رہتا ہے) وہیں چاہ یوسف ہے جہاں روایت کے مطابق حضرت یوسف کو قید کیا گیا تھا ۔ قریب ہی زلیخا کے روایتی محل کے نشانات ہیں ۔ پرانے شہر میں بے شمار تاریخی مسجدیں ہیں جنہیں جامع کہا جاتا ہے ۔ جامعہ ابن طولون ہزار سال پرانی مسجد ہے اور جامعہ ازہر ہزار سال پرانی یونیورسٹی ۔ مملوک کے مقبروں کے

پیاز نما گنبد نظر آتے ہیں ، جب مملوک نے دیکھا کہ مقبروں پر لوگ کم آتے ہیں تو انہوں نے مقبرے اور مسجدوں کو ملا کر تعمیر کیا تاکہ لوگ آتے جاتے رہیں ۔ آگے الجزیرہ کا خوش نما علاقہ ہے ۔ اکثر جزیرے سمندر میں ہوتے ہیں یہ نیل میں ہے یا یوں کہ دونوں طرف دریا کی دو شاخیں بہتی ہیں ۔ پھر نیا شہر آتا ہے جس میں بڑے بڑے ہوٹل ہیں ، مجسمے ہیں اور ڈربوں جیسے فلیٹ ۔

دن میں شہر اور دریا دونوں مٹیالے سے نظر آتے ہیں جیسے گرد سے اٹے ہوئے ہوں ، یہ اندھیرا ہے اور بجلی کے قمقمے جو رات کے وقت قاہرہ اور نیل کو اس قدر حسین سا دیتے ہیں ۔

داہنی طرف نیچے ابوالہول اتنا ذرا سا نظر آتا ہے کہ نظر ہی نہیں آتا ۔ بالکل نیچے ٹیلے پر میرا دوست دوربین لگائے شاید مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ ساتھ ثانیہ کھڑی کتاب پڑھ رہی ہے ۔ (تاریخ پر کوئی کتاب ہوگی) ۔

گائیڈ جو مجھے کھینچ کر اوپر لایا تھا بڑی بے صبری سے بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا کہ میں جلدی سے نیچے اتر جاؤں تو وہ نئی سواریاں اوپر لائے ۔ پہلے تو وہ الصبر ! کہنے سے مان گیا لیکن بعد میں اس کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی گئی ۔ آخر ہم اترنے لگے ہرم سے نیچے اترنا ایسا ہے جیسے تقریباً ڈیڑھ سو دیواروں سے کودنا ۔

میں ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا کہ ثانیہ نے حرم کے اندر جانے کا مشورہ دیا ۔ ذرا سی دیر میں ہم تنگ و تاریک پیچیدہ راستے میں کمر دوہری کئے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے ۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ٹمٹماتی ہوئی روشنی آئی ورنہ گائیڈ کی ٹارچ کی روشنی تھی اور اندھیرا ۔ سستانا یا سیدھا ہونا ناممکن تھا کیونکہ سر قریب قریب گھٹنوں سے چھو رہا تھا ۔ کافی دیر کی چڑھائی کے بعد یہ مژدۂ جانفزا ملا کہ فرعون کا مدفن قریب ہے ۔ آخری حملے میں یہ مہم بھی سر ہوگئی ۔ ہم سیاہ پتھروں کے ایک کمرے میں پہنچے جس میں ایک طرف پتھر کا ٹب سا بنا ہوا تھا ، اسی جگہ کبھی فرعون کا تابوت رکھا گیا تھا ۔

کمر سیدھی ہونے میں تقریباً پندرہ منٹ لگے ۔

اوپر نیچے داہنے بائیں بڑے بڑے وزنی پتھر تھے ۔ اندر آنے اور باہر نکلنے کا فقط وہی تنگ و دشوار گزار راستہ تھا ۔ اگر وہاں بجلی کی روشنی نہ ہوتی تو مکمل تاریکی چھا جاتی ۔ ثانیہ گھبرا سی گئی ۔

" اس وقت ہم لاکھوں ٹن کے پتھروں کے بیچ میں پھنسے ہوئے ہیں ۔۔ " میں نے اسے خوشخبری سنائی ۔

" مجھے کچھ ڈر سا لگ رہا ہے ۔۔ "

" اور ہر پتھر اڑھائی ٹن کا ہے ۔۔ "

" ایسی باتیں مت کیجئے ۔۔۔ "

" اگر بجلی فیل ہو جائے یا کوئی پتھر گر کر راستہ روک دے ۔۔۔ "

" بھئی لڑکی کو ڈراؤ مت ۔۔۔ دراصل میں بھی ڈرا ہوا ہوں ۔ تمہیں کچھ نہیں ہو رہا ؟ "

" اس وقت کچھ نہیں ہو رہا ، کیونکہ میں پہلے ڈر چکا ہوں ۔۔۔ "

" کب ؟ کہاں ؟ "

" سکاٹ لینڈ کی کوئلے کی کانوں میں ۔۔۔ تب ہم سطح زمین کے نیچے تھے ، اب اوپر ہیں ۔۔۔ "

بمشکل باہر نکلے ۔ کچھ دیر کے بعد ہم مینا ہاؤس ہوٹل کے ایک آراستہ و پیراستہ کمرے میں بیٹھے پسینہ سکھا رہے تھے ۔ ہمارے ساتھ دو یورپین نما آدمی بھی تھے جو میرے دوست کے دوست تھے ۔ وہ فر فر عربی بول رہے تھے اور غٹ غٹ شراب پی رہے تھے ۔

" میں تو انہیں یورپین سمجھا تھا —"
" نہیں یہ مصری ہیں بلکہ حاجی ہیں —"
" تعارف کراتے وقت تو حاجی ہونے کا ذکر نہیں ہؤا —"
" تو کیا اس کا ذکر ہؤا کرتا ہے ؟ " میرے دوست نے بڑے تعجب سے پوچھا ۔
میں نے جواب نہیں دیا کیونکہ مجھے وہ قوال بری طرح یاد آ رہے تھے جو لہک لہک کر گاتے ہیں :—

حج پہ جلے ہو
ضرور کوئی بات ہے

واپسی پر ثانیہ نے بتایا کہ وہ وادئ نیل پر Thesis لکھ رہی ہے ۔ کافی مشکل کام ہے ۔
" اتنا مشکل بھی نہیں ۔ لکھ دو کہ نیل اور نیل کے کنارے ویسے ہی ہیں فقط دریا اہرام سے ذرا ہٹ کر بہنے لگا ہے اور اس پر بند باندھے جا رہے ہیں جن کا ذکر اخبارات میں اکثر ہوتا رہا ہے ۔ زمانہ بدل گیا ہے ، انسان نہیں بدلا ، فلاحین نہیں بدلے ۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے تہمد باندھے تھے اب لمبا سا چغہ پہنتے ہیں —"
" تاریخ پر جو مواد میں نے اتنے عرصے میں اکٹھا کیا تھا ، جو نظریے اتنی مشکلوں کے بعد قائم کئے تھے وہ آپ نے بالکل درھم برھم کر دیے ہیں ۔ انہیں دوبارہ ترتیب دینے اور سب کچھ درست کرنے میں کم از کم دو مہینے لگیں گے —"
" صرف دو مہینے —؟ "
" شاید تین چار مہینے لگ جائیں —"
" اچھا یہ بتاؤ کہ تم مصر کی ثانیہ ہو یا یورپ کی سونیا ؟ "
" دونوں —" میرا دوست ھنسا " یہی تو مصیبت ہے ۔ "
ہوٹل میں تار ملا ۔ سکندریہ سے ٹام نے بھیجا تھا — " کل شام کو پہنچ رہا ہوں— "
ٹام سکاٹ لینڈ کا تھا اور ہوائی جہازوں کی ایک کمپنی میں نوکر تھا ۔ ہماری دوستی ہوٹلوں ، بازاروں یا محفلوں کی دوستی نہ تھی جو تعارف کی محتاج ہوتی ہے ، جسے برقرار رکھنے کے لیے بار بار ملنا ضروری ہے ۔ یہ خیموں ، خندقوں اور صحراؤں کی دوستی تھی — جہاں خوف بھی بانٹنا پڑتا ہے اور فکر بھی ۔ اس کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں ۔ مہینے ، برس گزر جائیں لیکن ملنے پر وھی پرانا احساس رفاقت عود کر آتا ہے ۔
پہلے سے موٹا اور قدرے گنجا ٹام چلایا — " او مشرق کے چار بیویوں والے مہاراجہ ! "
" او سکاٹ لینڈ کے الّو پڑھ کنجوس ! کیا حال ہے تیرا ؟ "
نیل کے کنارے اُس کیفے کی روشنیاں چمک رہی تھیں جہاں ہم نے بہت سی شامیں اکٹھے گزاری تھیں ۔ بالکنی کا وہ مخصوص کونا ، وھی میز ، تین کرسیاں ، بہتے ہوئے دریا کا دلکش نظارہ ، دوسرے کنارے پر کھجور کے پانچ درخت —
ملازم تیسری کرسی ہٹانے لگا تو ٹام نے منع کر دیا —
" یہ اولمپیا کی کرسی ہے — "
" کہاں ہے وہ ؟ کبھی ملی ؟ "
" میری طرح اُس کی بھی شادی ہوچکی ہے ، ایک دفعہ بیروت میں دور سے دیکھا تھا —"
ہم دونوں اپنی پرانی جگہوں پر بیٹھے تھے ۔ ٹام نے دریا کی طرف پیٹھ کر رکھی تھی ۔
" یاد ہے ۔ وہ اصرار کیا کرتی تھی کہ میں اسی کرسی پر بیٹھوں ۔ کہتی —" تم دریا کو مت دیکھو بس میری طرف دیکھتے رہو —" ٹام بولا ۔
" مردوں کی طرح باتیں کرو — یہ کیا لڑکیوں کے قصے لے بیٹھے ہو —" میں نے اُسے ڈانٹا ۔

”یاد ہے یہ نشان، جب مجھے گولی لگی اور تم نے چیر پھاڑ کی تھی ۔ تمہارے علاج کے باوجود اب تک زندہ ہوں ---“

”میں نے کوشش تو بہت کی لیکن سکاٹ لینڈ کے باشندے بڑے سخت جان ہوتے ہیں ہمیشہ بچ جاتے ہیں ---“

”پتا ہے سیپرڈ ہوٹل جل چکا ہے، اب وہاں میدان ہے ۔ وہ دن بھی کیسے تھے جب کچھ بھی پاس نہ تھا، جب ہمیں کوئی نہیں جانتا تھا، ہمیشہ مفلس رہا کرتے، تنخواہ دس بارہ دنوں میں ختم ہو جاتی پھر ڈابی سے قرض لینا پڑتا ---“

ڈابی ٹام کا ہم وطن تھا ۔ اپنی منگیتر کو انگوٹھی پہنا کر محاذ پر آیا تھا، بڑا منحوس تھا ۔ جنگ کے بعد اڈنبرا میں اس سے ملاقات ہوئی تو میں حیران رہ گیا ۔ دبلے پتلے ڈابی کی بیوی بے حد موٹی تھی ۔ میں نے اسے چھیڑا کہ شادی سے پہلے اس نے بڑے جتن کئے ہوں گے ایسی پلی ہوئی لڑکی سے منگنی ٹوٹ جانے کی ممکن ساری کوششیں رائیگاں گئی ہوں گی اور وہ موٹی انگلی میں پھنسی ہوئی انگوٹھی نہ اتار سکا ہوگا ۔ آخر سکاٹسمین تھا، انگوٹھی پر پانچ پاؤنڈ خرچ کر چکا تھا، مجبوراً شادی کرنی پڑی ۔

”ڈابی اور میں پیرس میں اکٹھے تھے ۔ فرانس میں دو برس رہ کر میں نے یہاں تبادلہ کرا لیا ۔ شاید یہ نیل کا فسوں ہے جو بار بار کھینچ لاتا ہے ۔ کسی جگہ میں اتنی کشش نہیں جتنی فرعونوں کے اس دریا میں ہے ۔ میں پہلے سے کافی بدل گیا ہوں --- کیوں --- ؟“

”ہاں --- لیکن یہ تبدیلی فطری ہے ۔ ہم سب لمحہ بہ لمحہ بدل رہے ہیں ۔ ہر گزرا ہوا دن، ہر نیا تجربہ، ہر وہ انسان جو زندگی کی شاہراہ پر ہمیں ملتا ہے ہم پر اثر ڈالتا ہے ۔ تم تو ہو بھی ایسی جگہ جہاں طرح طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہوگا ---“

”مجھے لوگوں سے نفرت ہوگئی ہے ۔ ہوائی جہاز آتا ہے، نہایت بے ہنگم ہونق لوگ اترتے ہیں --- خود غرض، جلد باز، خود پرست لوگ --- ہر ایک اپنے آپ کو سب سے اہم سمجھتا ہے ۔ شرارتی نامعقول بچے، بنی ٹھنی ادھیڑ عمر کی عورتیں، موٹے تازے ہانپتے ہوئے مرد ۔ یا تو انہیں کہیں پہنچنے کی جلدی ہے یا مسرت کی تلاش ہے ۔ کیسی مسرت، کون سی مسرت؟ یہ نہیں جانتے بس کم سے کم عرصے میں زیادہ سے زیادہ مسرت کے متلاشی ہیں ۔ شور، بدکلامی، طنزیہ گفتگو --- دھکیلتے، کھانستے، جمائیاں لیتے ہوئے ہجوم ۔ جہاں دیکھو وہاں لوگ موجود ہیں ۔ پہلے شکاریوں کو جانوروں کی تلاش میں دور دور جانا پڑتا تھا لیکن اب جہاں جاؤ انسان موجود ہیں ۔ دنیا کی آبادی کتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے ۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ دو ہزار برس کے بعد کرۂ ارض پر کھڑے ہونے کی جگہ نہیں ہوگی، نہ اناج کا ایک دانہ ہوگا ---“

”تمہیں کسی خاص طبقے یا قوم سے نفرت ہے؟“ میں نے پوچھا ۔

”مجھے سب سے نفرت ہے، سوائے تمہارے ---“

”تو گویا تمہیں کسی سے نفرت نہیں ---“

”نہیں --- میں انسانوں سے بیزار ہو گیا ہوں بلکہ حیوانوں کی مجھے زیادہ پروا ہے جو کم از کم خاموش تو رہتے ہیں، تنگ تو نہیں کرتے ---“

”نہ میں ماہر نفسیات ہوں نہ بنی نوع انسان کا عاشق ۔ لیکن سنتے یہی ہیں کہ جس چیز سے جتنی شدید نفرت ہو اس سے اتنی ہی محبت بھی ہو سکتی ہے ۔ کچھ اچھا نہ لگے تو بے رخی برتو، مگر شدید نفرت بڑی خطرناک ہوتی ہے ۔ شاید کسی دن تم بڑے انسان دوست بن جاؤ ۔ رہ گئے حیوان --- تو ذرا افریقہ کے جنگلوں میں جا کر دیکھو، حیوان تمہیں ایک دن نہ رہنے دیں --- میاں خوش رہا کرو ۔ خواہ مخواہ نفرت کرنے کا سب سے بڑا نقصان

یہ ہے کہ اس سے خود اپنی عمر کم ہو جاتی ہے ۔ یاد ہے صحرا کا وہ کیمپ جہاں چند مہینے تنہائی میں گزرے ، جہاں نہ دشمن نظر آتا تھا نہ دوست ۔ ہفتوں کے بعد کوئی دور سے گزرتا تو کتنی خوشی ہوتی تھی ، ایک دوسرے کو بلا بلا کر دکھاتے — وہ آدمی جا رہا ہے ۔ تم ہی تو دعا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ جنگ ختم ہو لے پھر ہمیشہ خوش رہا کریں گے —"

" ہاں یاد ہے —"

" تمہارے پاس سب کچھ ہے ۔ دنیا میں کروڑوں انسان ایسے بھی ہیں جو نفرت کرنے کی توفیق نہیں رکھتے ۔ اگر چاہیں تو بھی نفرت نہیں کر سکتے —"

" مجھے پتا ہے —"

" ہمارے ملک کی ایک حسینہ بھی اسی دور سے گزری تھی ، اس کی شادی غلط شخص سے ہو گئی تو — (میں نے پنجابی نظم کا ترجمہ سنایا)

بزرگ کی درگاہ پر حسینہ نے یوں عرض کی
میں مٹھائی چڑھاؤں اگر میرے خاوند کا انتقال ہو جائے
کاش کہ دو چار پڑوسنیں بھی سر گباش ہوں
اور باقیوں کو بخار چڑھ جائے
وہ دکان پھنک جائے جہاں روشنی رہتی ہے
وہ کتا مرے جو رات بھر بھونکتا ہے
سب کے سب کہیں دفع ہوں
گلیاں سنسان ہو جائیں
اور ان میں میرا محبوب ٹہلا کرے

" — چنانچہ تم پہلے انسان نہیں ہو جس نے ایسے جذبات محسوس کیے ہوں ۔ لیکن وہ تو محبت میں ناکام رہی ۔ تمہاری شادی تو مرضی کے مطابق ہوئی تھی ۔ تمہارا محبوب دریا نیل بھی یہیں ہے ، موسیقی کی تانیں بھی وہی ہیں ، جوانی بھی ہے ، کیا نہیں رہا ؟"

ٹام چپ ہو گیا — اس نے جیب سے ایک آویزہ نکالا جس میں بڑا سا سفید موتی دمک رہا تھا ۔ میں نے اسے پہچان لیا ۔ ہمارا ایک دوست خلیج فارس کے ایک جزیرے میں کچھ عرصہ رہ کر آیا تو اس کے پاس موتیوں کی پوٹلی تھی ۔ یہ موتی اس نے غوطہ خوروں سے حاصل کیے تھے ۔ ادھر وہ قاہرہ پہنچا ادھر جیسے شہر بھر کو پتا چل گیا ۔ عجیب عجیب لوگ اس کے پاس آئے اور اسے پراسرار جگہوں میں لے جاتے ۔ گلیوں میں اس کا تعاقب کیا جاتا ، جو لڑکی ملتی وہ فوراً پوچھتی ، موتی کہاں ہیں ۔ دو چار مرتبہ اسے زد و کوب بھی کیا گیا ۔ موتی ختم ہونے کو آئے تو ہم نے زبردستی اس سے دو چھین لیے ، ان کے آویزے بنے اور اولیپیا کو دے گئے ۔

— اچھا تو یہ اولیپیا تھی ۔

" میں نے تو سنا تھا کہ انگریز کبھی عاشق نہیں ہوتے اگر غلطی سے کبھی ہونے لگیں تو اپنے آپ سے بحث کر کے سارا معاملہ منسوخ کر دیتے ہیں —"

ٹام خاموشی سے اس آویزے کو دیکھ رہا تھا ۔

" تمہیں وہ چھٹی کے دن یاد ہیں جو ہم نخلستانوں میں گزارا کرتے ، صحرا کے ان دیکھے راستوں اور سرسبز خطوں میں کتنی جاذبیت تھی ۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی پیلی پیلی دھوپ ، نور میں ڈوبی ہوئی وادیاں ، دریا کے کناروں کا ملائم لہلہاتا ہوا سبزہ ، چمکتا ہوا نیلا آسمان اور حسین پراسرار دنیا ، جب ویرانے نغموں سے گونج اٹھتے ، ایک ایک ذرے میں

زندگی سانس لیتی تھی ۔ زندگی کہاں نہیں تھی — سورج سے لے کر زمین تک ، دریا سے صحرا تک ، اس افق سے اُس افق تک ۔ ہر شے میں کتنی تازگی تھی ۔ کتنا نکھار تھا — ایسے دن پھر کبھی نہ آئیں گے ۔ وہ راتیں کبھی نہ آئیں گی جب آسمان کے تارے چمکتے چمکتے نیچے آ جاتے تھے ۔ اور وہ لڑکی کیسی تھی — کتنی پیاری ، من موہنی ، معصوم اور صابر ۔ کسی بات کا برا نہ مانتی تھی ، میں لڑتا جھگڑتا ، برا بھلا کہتا ، وہ خاموش بیٹھی مسکراتی رہتی ۔ کہا کرتی کہ محبت کرنے والوں کے ایک دوسرے پر بڑے حقوق ہوتے ہیں ۔ جب آئندہ ملاقات کا وقت طے ہوئے لگتا تو ہمیشہ کہتی — اگر تم دیر سے آئے تو میں انتظار کروں گی ۔ اگر نہ آسکے تو خفا نہ ہوں گی ۔ کبھی اُس نے گلہ نہ کیا ، شکایت کا ایک لفظ اُس کے ہونٹوں پر نہ آیا ۔ اُن دنوں نہ جانے مجھے کیا ہوگیا تھا بار بار یہی سوچتا کہ یہ اجنبی ہے ، عمر بھر مصر میں رہی ہے ، اس میں یونانی اور لاطینی خون کی آمیزش ہے ۔ وطن لے جاؤں تو دوست مذاق اُڑائیں گے ، سوسائٹی اسے قبول نہیں کرے گی ۔ میں نے ہمیشہ اُسے اپنے سے کمتر سمجھا ، اُس سے سدا جھوٹ بولا لیکن وہ ہر بات کا یقین کر لیتی تھی ۔ اُس کی توجہ اور پیار سے میں گھبرانے لگا ، پیچھا چھڑانے کے لیے بہانے تلاش کیے کہ بہت جلد میرا تبادلہ ہونے والا ہے ، مجھے پہلے ایک مہینے کے لیے کہیں اور بھیجا جائے گا پھر یونان ۔ میں نے اصرار کیا کہ تم مجھ سے پہلے یونان پہنچ جاؤ ۔ میں عنقریب آ ملوں گا ۔ کوئی اور ہوتی تو فوراً تاڑ جاتی لیکن وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلی گئی ۔ جدا ہوتے وقت نہ وہ روئی نہ اداس ہوئی ، بس مستقبل کی باتیں کرتی رہی ۔ جیسے اُسے مجھ پر مکمل اعتبار ہو —''

'' مجھے یاد ہے ۔ چلتے وقت اُس نے تمہیں یہ آویزہ دیا تھا —''

'' آویزہ ہاتھ میں تھا کر بولی — ہمارے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ دو آویزے بچھڑ جائیں تو ایک نہ ایک دن ضرور ملتے ہیں — اُس پگلی کو کیا خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات ہے ، پھر کبھی نہ ملیں گے —''

'' اس کے بعد کیا ہوا ؟ ''

'' میں گھر پہنچا ، وہاں کئی لڑکیاں منتظر تھیں ، ایک سے تھوڑی سی واقفیت تھی ۔ اُس نے محبت کا دعویٰ کیا اور اُن خطوط کا حوالہ دیا جن میں وہ موسم کا حال مجھے لکھا کرتی تھی ۔ جنگ کے بعد لڑکے واپس گئے تو کٹے ہوئے پتنگوں کی طرح جس کے ہاتھ میں ڈور آئی اُس نے دبوچ لیا ۔ اور پھر جیسا کہ تم جانتے ہو ہمارے ہاں نہ کسی ایک لڑکی کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ کسی ایک لڑکے کا ۔ کچھ دنوں تو بغیر بادبان و لنگر کی کشتی کی طرح ادھر اُدھر بھٹکتا رہا پھر اُسی لڑکی سے منگنی کر لی ۔ منگنی کی شام کو ایک پرانی ہم جماعت کہیں سے آ نکلی ، اُس نے ضد کی کہ کہیں باہر لے چلو ۔ شہر میں اُس کے ساتھ جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ کہیں منگیتر نہ دیکھ لے چنانچہ اُسے چند میل دور سمندر کے کنارے لے گیا ۔ جب ہم چٹانوں پر بیٹھے پرانی باتیں دہرا رہے تھے تو سامنے سے ایک جوڑا گزرا لڑکی کو میں نے فوراً پہچان لیا — یہ میری منگیتر تھی جس کی انگلی میں میری پہنائی ہوئی انگوٹھی تھی ۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ چہلیں کر رہی تھی — مجھے اُس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن میں نے کر لی —''

ٹام نے کرسی کا رخ دریا کی طرف کر لیا اور باہر تکنے لگا !

'' جب رومن بادشاہ ہیڈرین نے اپنے پیارے دوست انطی نوس کی لاش ایک گہرے غار میں دفن کی تو الوداع کہنے کے لیے اکیلا رہ گیا ۔ غار کی تاریکی ، تنہائی اور بے جان جسم کی موجودگی نے ہیڈرین پر ایسا اثر کیا کہ وہ ہول سے تھر تھر کانپنے لگا اور جلدی سے باہر نکلا ۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا اور روشنی دکھائی دی تو ایک عجیب سی مسرت

محسوس ہوئی، اُس نے شکر ادا کیا کہ وہ زندہ ہے۔ یہ واقعہ مصر میں ہؤا تھا، انطی نوس بھی نیل میں ڈوب گیا تھا۔ یہ مردہ یادیں ہیں، انھیں بھلا دو۔ ان پر زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔''

'' اگر وہ مر جاتی تو آہستہ آہستہ مجھے صبر آ جاتا۔ لیکن وہ زندہ ہے۔ اب بھی اُس کے چہرے پر معصومیت ہے، وہ دلکش مسکراہٹ، آنکھوں کا سحر، ہونٹوں کی دلآویزی — کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ بیروت میں اُسے دور سے دیکھا تھا —''

'' یہ آویزہ دریا میں پھینک دو۔ یہ سب نیل کا جادو تھا، یہیں شروع ہؤا یہیں ختم ہو جائے گا —''

'' نہیں یہ آویزہ تو ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا —''

'' تو کم از کم لوگوں سے نفرت تو نہ کیا کرو۔ پہلے زمانے میں نامراد عاشق یا تو جنگلوں اور ویرانوں میں نکل جاتے تھے یا آہیں بھر کر، چپکے چپکے رو کر خاموش ہو جاتے تھے۔ تم عجیب دہشت پسند عاشق ہو۔ دیکھتے نہیں یہ دل کا اندھیرا ہے ورنہ سب کچھ جوں کا توں ہے۔ سورج اُسی طرح چمکتا ہے، پھول اُسی طرح کھلتے ہیں۔ لوگ جان بوجھ کر محبت کے چکر میں پھنسے ہیں۔ اس دریا کے کنارے آج شاید میں اور تم دو انسان اُداس ہیں ورنہ سب مسکرا رہے ہیں، قہقہے لگا رہے ہیں —''

'' اگر کسی محبت کرنے والی لڑکی سے شادی ہو جاتی تو شاید میں پچھلی یادیں بھلا دیتا لیکن وہ مردوں کی طرح اکڑ کر چلنے والی، بات بات پر بحث کرنے والی — میری بیوی — بالکل اجنبی ہے۔ میں چھٹی پر وطن جاتا ہوں تو اُس سے ملاقات ہوتی ہے۔ گھر میں ہم اس طرح رہتے ہیں جیسے ہوٹل میں مسافر۔ گرمیوں میں انگریز بیویوں کے غول کے غول اٹلی جاتے ہیں، وہاں موٹے موٹے بانونی اطالوی لفنگے گائڈوں کا بہروپ بھرے منتظر رہتے ہیں۔ وہ ان عورتوں کو لیے لیے پھرتے ہیں، ان کے حسن و جمال کے جھوٹے قصیدے پڑھتے ہیں، گانا سناتے ہیں — میری بیوی بھی بار بار اٹلی جاتی ہے —''

مجھے یاد آ گیا، ایک مرتبہ میں نیپلز کے مشہور نائٹ کلب میں اپنے اطالوی دوست کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میرا دوست یکایک چونکا ہو کر ایک پلے ہوئے پستہ قد اطالوی کو گھورنے لگا جو سیاہ لباس پہنے ایک لمبی تڑنگی عورت کے ساتھ ناچ رہا تھا۔

'' پہچانا اس مردود کو — یہ ہمارا باورچی رومیو ہے۔ ایسے بڑھیا کپڑے پہن کر یہاں ناچ رہا ہے، ضرور چوری کی ہوگی'' میرے دوست نے جھلا کر رومیو کو بلایا — واقعی یہ باورچی ہی تھا۔ باز پرس کی تو رومیو نے جیب سے بٹوہ نکال کر دکھایا جو نوٹوں سے بھرا ہؤا تھا۔

'' یہ کہاں سے اُڑائے؟'' میرے دوست نے پوچھا۔

''سینوریتا انگلیز —'' اُس نے لمبی تڑنگی انگریز عورت کی طرف اشارہ کیا اور مسکرانے لگا۔

ٹام خاموش بیٹھا کھوئی کھوئی نگاہوں سے دریا کو دیکھ رہا تھا۔

'' تم واقعی بدل گئے ہو۔ میرے کہے کا خیال نہ کرنا۔ نصیحت کرنا دنیا کا آسان ترین کام ہے، میں اب تک نصیحتیں کر رہا تھا۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو پتا نہیں کیا کرتا۔ Spinoza نے ایک مثال دی تھی کہ اگر ایک اینٹ کو ہوا میں پھینک دیا جائے اور متحرک اینٹ سے پوچھا جائے کہ کیا کر رہی ہو؟ تو وہ یہی کہے گی کہ میں اپنی مرضی سے جا رہی ہوں۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ ہم جو کچھ بھی ہیں جس حال میں ہیں اس کی وجہ وہ واقعات اور حالات ہیں جن پر ہمارا قابو نہیں، جن کی رو ہمیں بہائے لیے جا رہی ہے۔ ہم پر طرح طرح کے دباؤ ہیں۔ ہم مجبور ہیں۔ اور پھر زندگی کا کوئی خاص فارمولا تو ہے

نہیں ، کبھی سب کچھ درست ہو جاتا ہے کبھی نہیں ہوتا ۔ خوشبو کا ہلکا سا جھونکا ، کسی رنگ کی جھلک ، کوئی نغمہ — یہ بڑے ظالم ہوسکتے ہیں ، بھولی ہوئی یادیں دفعتاً تازہ ہو جاتی ہیں — کبھی یہ نہایت خوشگوار ہوتی ہیں اور کبھی از حد کرب ناک ۔ اور پھر پرانی محبت کی یادیں — العالمین کا میدان جنگ اب قبرستان ہے جہاں ہر سال دنیا کے مختلف حصوں سے عورتیں اور لڑکیاں آتی ہیں اور مٹھی بھر خاک ساتھ لے جاتی ہیں — وہ خاک جس میں محبوبوں اور پیاروں کا خون بہا تھا ۔

ہوائی جہاز اڑنے لگا ۔ میں نے جھانک کر نیچے دیکھا ، تاحد نگاہ چمکتی ہوئی ریت تھی یا مٹیالی چٹانیں ۔ شمالاً جنوباً ایک گہری سبز لکیر کھنچی ہوئی چلی گئی تھی ۔ بیچ میں روپہلا تار تھا اور دونوں طرف ہریالی کا حاشیہ ۔ جہاں دریا سیدھا بہتا وہاں یہ حاشیہ بھی سیدھا چلتا ، جہاں دریا مڑتا وہاں یہ بھی مڑ جاتا ۔

کسی جگہ زندگی اور ویرانی کا امتزاج اتنا نمایاں نہیں جتنا کہ اس ملک میں ہے ۔ جہاں جہاں سے نیل گزرتا ہے وہاں زندگی ہے گہما گہمی ہے ۔ جو حصے اس سے دور ہیں وہاں تپتے ہوئے سورج کی شعاعیں ہر چیز کو جھلس دیتی ہیں ، ریت کے ٹیلے ہیں ، باد سموم ہے اور وحشت ناک خاموشی ۔ یہی وہ ملک ہے جہاں ریگستان اور سبزے کے درمیان یوں خط کھینچا جا سکتا ہے کہ ایک قدم ہریالی پر ہو اور دوسرا ریت پر ۔

ٹرین کی کھڑکی سے ایک دریا نظر آیا جو مڑ کر پہاڑیوں میں چھپ گیا ، آگے چل کر پھر سامنے آ گیا ، کچھ دور ساتھ دے کر پھر مڑ گیا ۔

'' یہ کون سا دریا ہے ؟ '' میں نے ہم سفروں سے پوچھا ۔

'' ڈوناؤ —'' جرمنی لہجے میں جواب ملا ۔

'' اسٹروس —'' یونانی بولا ۔

'' ڈونارنا — '' ایک طرف سے آواز آئی ۔

مجھے فوراً یاد آ گیا کہ میں مشہور بین الاقوامی ٹرین — اورینٹ ایکسپریس — میں ہوں اور یہ مشہور بین الاقوامی دریا ڈینیوب تھا۔ کسی کا ڈونا کسی کا ڈوناؤ اور سب کا بلیو ڈینیوب ۔

جرمنی کے سرسبز و شاداب جنگل بلیک فارسٹ سے دو چھوٹی چھوٹی ندیاں نکلتی ہیں ۔ بویریا کے ملک میں ان سے ایک اور ندی ملتی ہے جو نوخیز ڈینیوب کو رائن سے ملاتی ہے ۔ ڈینیوب پیچ کھاتا ہؤا آگے بڑھتا ہے ۔ جرمن شہر آلم اس کے کناروں پر آباد ہے جہاں آئن سٹائن پیدا ہؤا ۔ یہیں ڈیڑھ سو سال پہلے انسان نے پرندے کی طرح اڑنے کی پہلی کوشش کی تھی ۔ ایک درزی نے کپڑے کے پر سئے اور اونچے مینار سے چھلانگ لگا دی ، سیدھا ڈینیوب میں گیا اور اللہ کو پیارا ہؤا ۔ جہاں دریا جرمنی کو چھوڑ کر آسٹریا میں داخل ہوتا ہے وہاں پاسو ہے جو دنیا کے سات حسین ترین شہروں میں سے ایک مانا گیا ہے ۔ یہاں کیمرے یا مصوری کے سامان کے بغیر آ جاؤ تو لوگ خفا ہو جاتے ہیں اور بدمذاق سمجھتے ہیں ۔ آسٹریا میں شہتوت اور زیتون کے درختوں ، انگور کی بیلوں اور اونچی پہاڑیوں میں سے گزرتا ہؤا ڈینیوب آخر وی آنا کو چھوتا ہے جس نے اسے اتنا مشہور کیا ہے ۔ آگے چل کر چیکوسلوواکیہ اور ہنگری کی سرحد بناتا ہے پھر مڑ کر بوہیمیا کے ہرے بھرے مرغزاروں سے ہوتا ہؤا دو شہروں بوڈا اور پسٹ کے بیچ میں سے اس طرح گزرتا ہے کہ دونوں مل کر بوڈا پسٹ بن جاتے ہیں ۔ ہنگری میں جگہ جگہ شاخوں میں بٹتا ہے ، یہ شاخیں دوبارہ ملتی ہیں تو نہایت خوشنما جزیرے بنتے ہیں ۔ پھر یوگوسلاویہ کی سرحد آتی ہے اور بلگراڈ ۔ وہاں سے ایک بہت بڑا دریا ساتھ ملا کر مشرقی سمت میں مڑ جاتا ہے اور یوگوسلاویہ اور رومانیہ کی سرحد کے ساتھ ساتھ بہتا ہے ۔ رومانیہ میں داخل ہوتے وقت اسے مشہور 'آہنی دروازوں' سے گزرنا پڑتا ہے ۔ کار پیتھین پہاڑوں کی سنگلاخ چٹانوں میں اتنا بڑا دریا سمٹ کر تند و تیز ندی بن جاتا ہے اور ساٹھ میل تک بڑی تیزی سے جاتا ہے ۔ یہ نام ترکوں کا دیا ہؤا ہے کیونکہ یہاں پہنچ کر جہاز اکثر ڈوب جایا کرتے تھے ۔

پہاڑ ختم ہوتے ہیں تو ایک نئی سرحد آتی ہے ۔ ایک طرف رومانیہ دوسری طرف بلغاریہ ۔ آہستہ آہستہ منزل قریب آ جاتی ہے ، پونے دو ہزار میل کے طویل سفر کے بعد شاید تھک کر بالکل لیٹ جاتا ہے اور اس کا پانی دور دور تک پھیل جاتا ہے ۔ سارے علاقے کو دلدل میں تبدیل کر کے غلطی سے ایک ایسے سمندر میں جا پہنچتا ہے جو ہر طرف سے بند ہے سوائے باسفورس کی طرف کے (اسے بھی تقریباً بند ہی سمجھنا چاہئے) ۔

شاید ہی اتنے موڑ پیچ کسی اور دریا میں ہوں ۔ اتنے ملکوں کی سرحدیں بنانے کا کام بھی کسی اور دریا کے حصے میں نہیں آیا ۔ ان سب ملکوں کی تقریباً چار سو ندیاں ڈینیوب سے آ آ کر ملتی ہیں ، یہاں تک کہ ایک نہر کے ذریعے یہ بحیرۂ اسود کو بحر شمالی سے ملا دیتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسے دریا کو قابو میں لانا کس قدر مشکل ہوگا ۔ جہازرانی کے سلسلے میں

برسوں کانفرنسیں ہوتی رہیں ، ملک ایک دوسرے پر شبہ کرتے ، خوب جھگڑتے ۔ آخر روسیوں نے آہنی پردہ ڈال کر قصہ تمام کیا ۔

اس کا طویل سفر بڑا دلچسپ ہے ، کہیں میلوں تک تنہائی ہے تو کہیں رونق ہی رونق ، کہیں اونچی اونچی برفانی چوٹیاں ، کہیں دور دور تک کنول کے پھول ، گلاب اور لالہ کے تختے اور ان کی مہک ۔ کہیں چیڑ کے گھنے جنگل ، شاہ بلوط اور سفیدے کے درختوں کے جھرمٹ ، انگور کی بیلیں ، سبزے اور خود رو پھولوں سے ڈھنی ہوئی پہاڑیاں ، ہرے بھرے کھیت — پھر خشک پتھریلی چٹانیں اور آخر میں میلوں پھیلی ہوئی خطرناک دلدل ۔

یہ دریا بلقان کی سب ریاستوں کی نمائندگی کرتا ہے سوائے یونان اور ترکی کے ۔ لیکن کسی زمانے میں یہ سارا جزیرہ نما ترکوں کا تھا ، مدتوں یہ ان کا دریا رہا ہے ۔

بلقان کی سیاست ہمیشہ سے مذاق بنی رہی ، اسے یورپ کا باروود خانہ کہا جاتا تھا ۔ اس علاقے میں طرح طرح کے لوگ رہتے ہیں جن کے لباس مختلف ہیں ، زبان ، مذہب ، طرز بود و باش ، عقیدے سب مختلف ہیں ۔ اگر یہ اپنے اپنے ملکوں میں رہتے تو کوئی بات بھی تھی ، مصیبت یہ ہے کہ رومانیہ والے بلغاریہ میں رہتے ہیں اور بلغاریہ والے ترکی میں (ویسے سلاف ہر جگہ مل جاتے ہیں) ہر گروہ اپنے آپ کو چودھری سمجھتا ہے اور فخریہ کہتا ہے کہ ہم کسی اور جگہ سے آئے تھے ۔ البانیہ والے کہتے ہیں کہ ہم ایرین لوگوں کی اولاد ہیں جو تین ہزار برس قبل از مسیح آئے تھے (پتہ نہیں کہاں سے) ۔ رومانیہ والوں کا دعویٰ ہے کہ وہ روم سے آئے تھے حالانکہ نام سے یوں لگتا ہے جیسے یہ کوئی رومانی قسم کی قوم ہوگی ۔ (ادھر ہنگری کا نام سن کر بھوک اُٹھ جاتی ہے) ۔

میرے خیال میں گنے گنائے لوگ تو ادھر ادھر آ جا سکتے ہیں لیکن قومیں کبھی ملک نہیں بدلتیں جب تک کوئی خاص وجہ نہ ہو ۔ یہ سب ایک ہی قبیلے کے افراد معلوم ہوتے ہیں ، لیبل مختلف لگا دیے گئے ہیں — بوہیمیا ، اوتھینیا ، سلووکیہ ، سلیشیا ۔ (ان میں یہ خوبی ہے کہ اپنے نام کے ساتھ پرانے وطن کا ذکر نہیں کرتے ، جیسے بہت سے لوگ غزنوی ، بغدادی ، قندھاری وغیرہ کہلاتے ہیں) ۔

مذہبی فرقے بھی بے شمار ہیں ، رومن کیتھولک ، آرمینین کیتھولک ، سادے کیتھولک ، مسلمان ، پروٹسٹنٹ ، یہودی ۔

ڈینیوب سے جتنے قتل ، سازشیں ، جرائم ، اور فسادات وابستہ رہے ہیں اتنے شاید ہی کسی دوسرے دریا سے رہے ہوں ۔ اس دریا کے کناروں نے بڑی رسہ کشی دیکھی ہے اس طرف والے دریا عبور کرکے اس طرف جا پہنچتے ، پھر وہ انہیں دھکیلتے دھکیلتے اتنی دور لے جاتے کہ خود کہیں اور چلے جاتے یا اگر واپس پہنچتے تو اتنے عرصے میں ملک کا نام بدل چکا ہوتا ، آج رومانیہ ہنگری پر حملہ کر رہا ہے تو کل بلغاریہ یوگوسلاویہ پر ۔ پھر سیمی فائینلز ہوتے ۔ آخیر میں فریقین کو برابر برابر چھڑا دیا جاتا اور چند عہد نامے ظہور میں آتے ۔ دو تین برسوں میں لوگ تازہ دم ہوکر پھر تیار ہو جاتے ، کوئی کسی کو قتل کر دیتا اور یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا ۔ جب ٹورنمنٹ سے جی بھر جاتا تو سب بادشاہ اکٹھے ہو کر کانفرنس کرتے ، کبھی ایک ایک ملک کے دو دو حصے کر دیے جاتے تو کبھی تین کے دو بنا دیے جاتے ۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے موریویا اور بوہیمیا کو سرے سے غایب کر دیا گیا ، مقدونیہ کو یوگوسلاویہ میں شامل کر دیا گیا ، ادھر آسٹریا میں چیکوسلوواکیہ کو جمع کرکے پھر تفریق کر دیا ۔ جنگ عظیم کے بعد سربیہ اور رومانیہ بڑھا دیے گئے ، بلغاریہ گھٹتا چلا گیا ۔

وہ پہیلی یاد آ جاتی ہے کہ دریا کو عبور کرنا ہے ، ایک طرف شیر ، بکری اور پھول ہیں ۔ پہلے بکری دریا کے پار جائے گی کیونکہ شیر پھولوں کو کچھ نہیں کہے گا ۔ دوسری

دفعہ نمبر جائے گا اور بکری واپس آجائے گی ، تیسری دفعہ بھول جائیں گے ، چوتھی دفعہ بکری
--- وغیرہ وغیرہ ۔

وی آنا کی گلیوں میں ٹہلتے ہوئے ' کیفے موزارٹ ' کا بورڈ نظر آیا تو مجھے زلبرسین یاد
آگیا جو لندن میں نفسیات کا مطالعہ کرنے آیا تھا ۔ رخصت ہوتے وقت اُس سے وعدہ کیا تھا
کہ وی آنا کا چکر لگا تو اُس سے ضرور ملوں گا ۔

" کیفے موزارٹ کے آس پاس جو سب سے عجیب مکان ہو وہاں میرا پتہ پوچھ لینا ---"
میں نے سب سے عجیب و غریب مکان تلاش کیا جس میں گنبد بھی تھے ، گرجے کی
وضع کی نوکدار چھت تھی اور دو تین یونانی ستون بھی تھے ، لیکن وہاں زلبرسین نہیں تھا ۔
دوسرے اور تیسرے عجیب و غریب مکان میں بھی نہیں ملا آخر ڈاک خانے والوں سے پوچھا
تو ایک سیدھے سادے فلیٹ میں سوتا ہوا ملا ۔ میں نے تلاش کا ذکر کیا تو ہنسنے لگا ---
" جو مکان تم نے دیکھے وہ وی آنا کے لیے عجیب ہرگز نہیں ہیں ۔ یہ ہوائی فلیٹ بالکل نئے
ہیں اور عجیب و غریب ہیں ---"

زلبرسین چالیس بیالیس برس کا پلا ہوا نوجوان تھا اُس کا پورا نام کافی مشکل تھا اس
لیے لندن میں اُسے دلبر کہا کرتے ۔ برسوں سے نفسیات کا طالب علم رہ چکا تھا اور روز بروز
گنجا ہوتا جا رہا تھا ۔ اُس کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ کہیں شادی ہو جائے لیکن ہر
مرتبہ کچھ نہ کچھ ہو جاتا اور دلبر کنوارہ رہ جاتا ۔

" کچھ ہوا ؟"

" نہیں --- کچھ نہیں ہوا --- " اُس نے آہ سرد بھر کر کہا ۔

گیارہ بجے ناشتہ کیا جو کافی اور کیکوں پر مشتمل تھا ، پھر وہ ایک بجے تک حجامت
بناتا رہا ۔ دو بجے کپڑے پہن کر تیار ہوا ۔ لنچ کے لیے گئے ، کھانا اڑھائی بجے شروع ہو
کر چار بجے ختم ہوا ، آدھ پون گھنٹہ آوارگی میں گزر گیا ، پانچ بجے ایک کیفے میں جا بیٹھے
جہاں لاتعداد آدمی کافی کے بہانے ہماری طرح بیٹھے انگلیاں چٹخا رہے تھے ۔ شام ہو چکی تو اُس
نے پہلی مرتبہ گھڑی دیکھی اور انگڑائی لے کر بولا --- " چلو کہیں چلیں ---"

" کہاں ---؟"

" آج تم سے بدلہ لینا ہے ۔ یاد ہے پیرس کی وہ شام ؟"

پیرس میں دلبر اور میں ایک ہوٹل میں ٹھہرے ۔ شام کو میں زبردستی اُسے ایسے
محلے میں لے گیا جو بوہیمین طبقے کی پناہ گاہ ہے ۔ جیب کترے ، چور ، اُچکے ، ایک سے ایک
عجیب کردار وہاں رہتا ۔ مجھے یہ علاقہ دیکھنے کا بڑا شوق تھا ، میں نے دلبر کو اُکسایا " پر رونق
جگہوں اور سجے ہوئے چہروں کو تو سب دیکھتے ہیں ، زندگی کا یہ پہلو بھی دیکھنا چاہیے ---"

" میں فلموں میں دیکھ چکا ہوں ۔ مجھے معاف کرو --- " اُس نے ہاتھ جوڑ دیے لیکن میں
زبردستی اُسے لے گیا ۔ ایک فرانسیسی نے بوہیمین آداب پر مختصر سا لیکچر دیا اور بتایا کہ
اپنی گھڑی ، بٹوہ ، پاسپورٹ ہوٹل میں رکھوا دینا ، دو تین سو فرانک سے زیادہ نقدی مت لے
جانا ، گلے میں رنگین رومال باندھ کر اور سگرٹ منہ میں دبا کر اندر داخل ہونا ، وہاں خواہ
کچھ بھی ہو رہا ہو کسی کی طرف ہرگز مت دیکھنا ، کوئی لڑکی بیٹھی ہوئی نظر آ جائے اُسے
بازو سے پکڑ کر کھینچنا اور رقص کرنے لگنا ۔ بیس پچیس منٹ خیریت سے گزر جائیں تو پھر
ایک طرف بیٹھ جانا لیکن خبردار جو کسی سے کوئی سوال پوچھا ہے تو ۔

ٹیکسی والے نے ہمیں ایک اندھیری سی گلی میں اتار کر ایک طرف اشارہ کیا اور

غایب ہوگیا ۔ وہاں ایک زینہ تھا جو نیچے کسی تہہ خانے میں جاتا تھا ۔ دیاسلائی جلا کر ہم سیڑھیاں اترنے لگے ۔ سازوں کی گھٹی گھٹی صدائیں آ رہی تھیں ۔ دروازہ کھٹکھٹایا ، چھوٹی سی کھڑکی کھلی ۔ ایک چہرہ جھانکنے لگا ۔ میں نے سگرٹ کا کش لے کر دھواں کھڑکی پر چھوڑ دیا ۔ دروازہ کھل گیا ۔ اندر رقص ہو رہا تھا ۔ مدھم سی روشنی تھی اور دھواں ہی دھواں ۔ بے حد ہیجان خیز موسیقی ہو رہی تھی ، لوگ ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے ناچ رہے تھے ۔ کئی تو ایک دوسرے کا سہارا لیے سرینا سو رہے تھے ۔ نصیحت پر عمل کرتے ہوئے میں نے ایک اونگھتی ہوئی لڑکی کو بازو سے پکڑ کر زور سے کھینچا اور دلبر کے اوپر ڈال دیا ، وہ دونوں ناچنے لگے ۔ چہروں کی طرف دیکھنے کی ممانعت تھی لہٰذا اسے نے کسی رنگین لباس کو پکڑنا چاہا لیکن وہ کوئی داڑھی والا آرٹسٹ نکلا ۔ دور کسی لڑکی کی پشت نظر آ رہی تھی آسے پکڑ کر رقص سروع کیا ، ایک دم سگرٹ کا دھواں ذرا کم تھا وہاں اس کا چہرہ نظر آیا ۔ اس چہرے سے کم از کم پچاس بہاریں دیکھی ہوں گی ، اس پر کوئی آرٹسٹ کافی وقت صرف کر چکا تھا ۔ مصنوعی بھویں ، مصنوعی پلکیں ، مصنوعی تل ، اصل خد و خال ندارد تھے ۔ آدھ گھنٹہ خیریت سے گزر چکا تو ہم نے حاضرین کا جائزہ لیا ۔ ہر شخص کا لباس نرالا تھا ۔ جن چہروں پر داڑھی نہیں تھی آن کی ہفتے سے حجامت نہیں ہوئی تھی ۔ عقاب کی سی نگاہیں ، کلائیوں پر دستاں لپٹی ہوئیں ، شوخ رنگ کی قمیصیں — عورتوں کے لباس بے حد چست تھے جیسے پارسل مضبوطی سے پیک کیے ہوئے ہوں ، بکھری ہوئی زلفیں ، خوابیدہ آنکھیں اور تیز خوشبو کی لپٹیں ۔

” اجنبی ہو ؟ غالباً پہلی مرتبہ یہاں آئے ہو --“ ساتھ بیٹھے ہوئے بوڑھے نے پوچھا ۔

میں نے سر ہلا دیا ۔

” تمھیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا ۔ اس برادری میں اجنبیوں کو پسند نہیں کیا جاتا ۔ ویسے دفتروں میں لوگ کاروبار کے بہانے ایک دوسرے کو لوٹتے ہیں یہ بیچارے سادے آدمی دوسروں کی جیب کترلیتے ہیں یا کسی کو پکڑ کر آس کی پونجی رکھوا لیتے ہیں ۔ بات ایک ہی ہے ۔ یہاں پہلی بار آنا بڑا خطرناک ہے --“

” کبھی نہ کسی دن تو پہل کرنی ہی پڑتی ہے — تم بھی تو کبھی پہلی مرتبہ آئے ہو گے --“

” اگر انہیں پتہ چل جائے تو ---؟“

” تو ہم بھی تیار ہیں ۔ تین چار کو تو لے لیں گے ---“

بوڑھا ہنسنے لگا ۔ ” تمھیں اپنی محبوبہ سے ملاؤں ۔ “

آس نے اشارہ کیا ۔ پختہ عمر کی ایک فربہ اندام عورت جھومتی جھامتی آئی ، کسی زمانے میں بڑی حسین ہوگی ۔ ہمارے کندھوں پر زور سے دھپ لگا کر چلی گئی ۔ میں نے دلبر کو جھنجوڑا کہ کچھ تو کہو ۔

” تمھاری بیوی بہت خوش مزاج معلوم ہوتی ہے --“ وہ ڈرتے ڈرتے بولا ۔

” یہ بیوی نہیں محبوبہ ہے ۔ ہم دس برس سے اکٹھے رہے ہیں لیکن شادی نہیں کی ---“

” کیوں ---؟“ دلبر ہدایات بھول چکا تھا ۔

” ہمیں انسان کے بنائے ہوئے تمام قوانین سے نفرت ہے ۔ گرجے میں شادی ، دفتر میں ملازمت ، کھوکھلی مصنوعی سوسائٹی --- دوستی کی آڑ میں ایک دوسرے کو دھوکا دینا ، ایک دوسرے کی بیویوں کے پیچھے بھاگنا --- یہ سب قوانین ہمارے جیسے انسانوں نے ہی تو بنائے ہیں ۔ ایک آدمی کبھی دوسرے کو دھوکا نہیں دیتا ، کسی اور آدمی کی عورت کی طرف آنکھ تک نہیں اٹھاتا ۔ یہاں زیادہ عورتیں ایسی ہیں جو شادی کی جھنجھٹ میں پھنسے بغیر مردوں کے ساتھ رہتی ہیں اور بہت خوش ہیں ۔ تم ہماری بنائی ہوئی تصویروں اور مجسموں سے

ڈرائنگ روم سجا کر اپنے آپ کو آرٹ کا عاشق ظاہر کرتے ہو لیکن دل ہی دل میں ہم لوگوں سے نفرت کرتے ہو —"

" آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی —" دلبر نے بوڑھے سے ہاتھ ملایا اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہؤا - بمشکل اسے بٹھایا -

دوسرے کونے میں دو مرد ایک دوسرے کو دھادھم پیٹ رہے تھے خوب لڑائی ہو رہی تھی -

" یہ کیوں لڑ رہے ہیں ؟ " دلبر پھر سوال پوچھ بیٹھا -

" لڑائی یا تو دولت پر ہوتی ہے یا عورت پر - یہاں سب قلاش ہیں اس لیے ایک حسینہ کے لیے لڑ رہے ہیں —"

حسینہ بڑے مزے سے تماشا دیکھ رہی تھی ، بلکہ مسکرا رہی تھی - باقی لوگ مگن ناچ رہے تھے -

" مہذب لوگ عورت کے لیے لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو طعنے دیتے ہیں ، جلی کٹی باتیں ، چغلیاں ، کمینی حرکتیں — سب کچھ کرتے ہیں - لیکن مرد اس طرح فیصلہ کیا کرتے ہیں -"

"خدا کے لیے یہاں سے چلو —" دلبر نے میرے کان میں کہا -

" تم ضرور اخبار پڑھتے ہو گے ؟ " بوڑھے نے پوچھا -

" ہاں —" دلبر نے جیسے اقبال جرم کیا -

" تبھی تمھارے ماتھے پر سلوٹیں ہیں - جاپان میں کیا ہو رہا ہے ، جنوبی امریکہ میں کیا ہونے والا ہے ، مجھے خبروں کی اتنی سی بھی پروا نہیں ، میرا چہرہ دیکھو —"

اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں ، ماتھے پر دمک تھی اور چہرے پر وہ تازگی تھی جو بچوں کے چہرے پر ہوتی ہے -

" جو پیدا ہؤا ہے اسے فقط ایک زندگی ملی ہے —" اس نے دلبر کے کندھے پر اتنے زور سے دھپ رسید کیا کہ وہ گرتا گرتا بچا — " ناحق غم لگا رکھے ہیں تم نے —" بوڑھے کے قہقہے میں طوفانوں کی تندی تھی -

باہر نکلے تو دلبر تھر تھر کانپ رہا تھا -

وی آنا کے کیفے میں بیٹھا ہؤا دلبر بولا — " آج تمھیں ایسی جگہ پھنساؤں کہ نکل نہ سکو —"

" چلو —"

دلبر نے وی آنا کے مشہور جنگل کا رخ کیا - جہاں شہر ختم ہوتا ہے وہاں سے یہ ہرا بھرا حسین جنگل شروع ہو جاتا ہے ، پہاڑیوں اور وادیوں کو ڈھانپتا ہؤا مغرب کی طرف الپس سے جا ملتا ہے - گرمی ہو یا سردی یہاں کے باشندوں کو اپنے گھروں سے زیادہ یہ جنگل عزیز ہے ، ان کا بیشتر وقت یہیں گزرتا ہے - گرمیوں میں جب گلیوں میں خاک اڑتی ہے تو سبزے کے فرش پر پارٹیاں ہوتی ہیں ، سردیوں میں لوگ برف پر پھسلتے ہیں اور ٹانگیں تڑاتے ہیں -

" اوپر والی سڑک سے چلیں یا نچلی سڑک سے —؟"

" کیا فرق ہے —؟"

" نچلے راستے میں قمارخانہ آتا ہے —"

" آج تمہاری باری ہے - میرے لیے دونوں راستے برابر ہیں ـــ"

ڈوبتے ہوئے سورج کی شعاعوں سے اُبھری ہوئی برجیوں اور میناروں پر سنہری جلاء پھر گئی ، شفق پھولی ، بادل جگمگا اٹھے اور سب کچھ گلابی ہو گیا - دریا کی سطح آئینے کی طرح چمکنے لگی -

" دوسرے ملکوں میں طرح طرح کے دریا ہیں ، ایک سے ایک حسین اور خوشنما ، لیکن ساری دنیا میں ڈینیوب فقط ایک ہی ہے ـــ"

" یہ تو دو ہیں - ایک اُس طرف بھی تو ہے ـــ"

" وہ اصلی دریا ہے ـــ یہ ڈینیوب کی نہر ہے ـــ"

ہم ایسے خطے سے گزر رہے تھے جہاں چاروں طرف انگور کی بیلیں تھیں ، باغات تھے اور چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے مکان - ایک جگہ بڑی چہل پہل تھی ، رنگ برنگے قمقمے روشن تھے ، جھنڈیاں لہرا رہی تھیں -

" یہی ہے وہ جگہ ـــ" دلبر بولا -

باغوں اور کھیتوں سے گھری ہوئی یہ جگہ تھیٹر بھی تھی ، رقص گاہ بھی اور میخانہ بھی - یہاں آس پاس کے کھیتوں سے اکھٹے کیے ہوئے انگوروں کی شراب فروخت ہوتی تھی اور زندہ ناچ و گانے کا انتظام بھی تھا - ہم اندر گئے - جس طرف نظر جاتی تھی لڑکیاں ہی لڑکیاں نظر آتی تھیں - اُن کے لباس بڑے دلچسپ تھے ، نیلی پتلونیں ، لمبے فراک ، ـــ کسی کی دو چوٹیاں تھیں ، کسی کے بال اتنے چھوٹے تھے جیسے کسی مرد نے ابھی ابھی حجامت بنوائی ہو ، کئی ایک نے بالوں کا سورج مکھی بنا کر دم سی لٹکا رکھی تھی -

" انتظار کس کا ہے ـــ ؟ "

" بڑا اچھا سوال ہے" دلبر چہک کر بولا " غالباً یہ سب بھی یہی سوچ رہے ہوں گے کہ انتظار کس کا ہے - ویسے میں ایک بت طناز کا منتظر ہوں -"

وہ باہر جانا چاہتا تھا اس لیے مجھے لڑکیوں کے جھرمٹ میں چھوڑ گیا ، وہ سوال پوچھنے لگیں ، میں نے ہاتھوں اور سر کے اشارے سے معذوری ظاہر کی کہ میں نہیں سمجھا - پہلے تو وہ حیران ہوئیں کہ اتنی آسان اور عام فہم زبان نہیں سمجھتا ، پھر خفا ہونے لگیں ـــ

" وانی فلہن سانی سخ ! " ایک طرف سے آواز آئی ـــ

میں نے نفی میں سر ہلایا -

(زور سے) " اخفریو مِحسانی کپتن زلیرن ـــ"

میں نے پھر سر ہلایا -

(چلا کر) " ہیبنٹی امریکانخ زیگارٹین ؟ "

شاید یہ سوال امریکہ کے متعلق تھا ، اس میں سگرٹ کا بھی ذکر آتا تھا -

(چیخ کر) " آخ ڈونک ، اشٹونک ، آخ فڑونک ـــ" کچھ ایسی آواز آئی -

" نائین ـــ نائین ـــ انگلیز ـــ" میں نے تنگ آ کر کہا -

دلبر مجھے ایک طرف لے گیا ـــ " تمہیں کتنی دفعہ سمجھایا ہے کہ عورتوں سے بحث مت کیا کرو - انگلیز وغیرہ کو چھوڑو - یہ ظاہر کرو کہ تمہیں دنیا کی کوئی زبان نہیں آتی - گفتگو میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے ـــ"

" کچھ پتا بھی تو چلے کہ کہہ کیا رہی ہیں ـــ"

" اس کی ضرورت کیا ہے - ہر جگہ لڑکیاں اجنبیوں کو پہلے تو چھیڑتی ہیں کہ جھینپ رہا ہے ، گھبرایا ہوا سا ہے ، کہاں سے آ پھنسا - پھر آہستہ آہستہ تعریفیں شروع ہو جاتی ہیں کہ کندھے ایسے ہیں ، بال ویسے ہیں - یہی ہوتا ہے - ہم سے تو اجنبی اچھے ہیں ـــ"

ایک لڑکی پیانو بجانے لگی - اُس کے گلے میں چمکیلا لاکٹ تھا، سنہری زلفیں نیلے رومال میں بندھی ہوئی تھیں - ایک مسخرا سا آدمی وائلن بجانے لگا اور لوگ ناچنے لگے -

یہ نغمہ بڑا دلکش تھا - پیانو دفعتاً بند ہو جاتا اور وہ گانے لگتی - میں لاکٹ کی جنبش کو دیکھ رہا تھا - نغمہ ختم ہؤا تو دلبر نے میرا بازو تھام لیا — '' ہائے ہائے یہ کیا غضب کیا - ایک حسینہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر محبت بھرا گیت گائے اور تم خاموشی سے سگریٹ پیا کرو - میں ہوتا تو پتا نہیں کیا کرتا —''

'' گانے کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آتا —''

'' یہاں سب گیت محبت سے بھرے ہوتے ہیں ، جن نگاہوں سے وہ دیکھ رہی تھی وہ نگاہیں کافی نہیں کیا؟ آنکھیں روح کی عکاسی کرتی ہیں - تنہا یہ بھی تو نگاہوں ہی سے ہر کیفیت کا اظہار کرتی ہے —''

'' مجھے تو مسکراتے بھی ہیں - یہ تو نہیں مسکرائی —''

'' اُف ! تم سا ناسکرا کوئی نہ ہوگا ، میرے لیے کوئی گیت نہیں گاتی پھر بھی میں اُن کے پیچھے لگا رہتا ہوں —''

'' تمھارا کیا ہے ، تم تو بوہیمین ہو —''

'' میں بوہیمین ہرگز نہیں ہوں - ان دنوں بوہیمیا میں سخت سنجیدہ اور بیزار لوگ رہتے ہیں —''

'' یہ بتاؤ کہ وہ بت طناز کب آئے گا ؟''

'' وہ تو میری محبوبہ ہے ، تم کیوں انتظار کر رہے ہو - یہ لڑکیاں کیسی ہیں ؟''

'' پتا نہیں - عجیب سا ہجوم ہے ، کسی کے بال سیاہ ہیں ، کسی کے سرخ تو کسی کے سنہرے ، اسی طرح آنکھیں بھوری ہیں ، سبز ہیں ، سیاہ ہیں - نہ خدو خال ملتے ہیں ، نہ قد - دو لڑکیاں ایک دوسری سے نہیں ملتیں - ایک شہر کی معلوم ہی نہیں ہوتیں —''

'' ہماری موسیقی نہیں سنی ؟ ٹھیٹھ مغربی دھنیں بھی ہیں ، بلقان کی بھی ، بحیرۂ روم اور ایشیا کی تانیں بھی سنائی دیتی ہیں - اس وقت تمھارے سامنے ڈینیوب کی تاریخ کھلی ہوئی ہے - جتنی قومیں یہاں مخلوط ہوئی ہیں اتنی کہیں نہیں ہوئیں —''

دلبر نے انگور کی شراب کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا - ایک کونے میں شراب کا پیپا رکھا ہؤا تھا ، لڑکے لڑکیاں نسلے کے تسلے چڑھا رہے تھے -

دلبر کی محبوبہ آئی - چھوٹے قد کی موٹی تازی لڑکی ، بڑی تیز طرار - اُسے دیکھتے ہی دلبر نے بھاگ کر اُس کا ہاتھ چوم لیا - مجھ سے تعارف کرایا -

'' اسے انگریزی نہیں آتی ترجمہ کرنا پڑے گا - جلدی سے اس کا ہاتھ چوم لو —''

'' ہرگز نہیں چوموں گا - بہتر ہوگا کہ یہ اپنا ہاتھ چوم لے اور میں اپنا ہاتھ —''

'' اچھا ہونٹوں تک سر لے جانا ، یونہی ٹھوڑی سے چھو لینا — ضد مت کرو یہ بڑی غصیل ہے —''

میں نے اُس کی اُنگلیاں ٹھوڑی سے چھو کر چھوڑ دیں -

'' تمھیں ہاتھ چومنے سے کیوں نفرت ہے - یہ تو شولری کی رسم ہے —''

'' نہایت فضول رسم ہے ، خصوصاً طبی نقطۂ نگاہ سے - تمھارے شہر میں تو لوگ ہر ایرے غیرے کا ہاتھ چوم لیتے ہیں - دیکھا نہیں آج بس میں دو مردوں نے کئی عورتوں کے ہاتھ چومے لیکن اُٹھ کر جگہ نہیں دی ، بیٹھے رہے —''

'' اچھا بتاؤ یہ کیسی ہے ؟''

”یہ تمہاری منگیتر ہے نا ؟“
”ہاں ۔“
”تو پھر رائے مت پوچھو ۔ میں صرف یہ مشورہ دوں گا کہ دوسری لڑکیوں سے چہلیں کرنی چھوڑ دو —“

”وہ تو مشکل ہے ۔ کیا کروں ؟ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ ۔ ایک دانشور کا قول ہے کہ عورت سائے کی طرح ہے اگر تعاقب کروگے تو آگے آگے بھاگے گی اگر دور ہٹوگے تو پیچھے پیچھے آئے گی ۔ اس پر عمل کر کے دیکھا ، کچھ نہ ہوا ۔ بغاوت کرو تو دور رہو۔ وہ مسلسل ناک بھوں چڑھاتی رہی ۔ پھر امریکن کتابیں پڑھیں جن میں محبوبہ کو خوش کرنے کی ترکیبیں لکھی تھیں ، بڑی تعریفیں خوشامدیں کیں لیکن لڑکیاں بدظن ہوگئیں کہ ہرجائی ہے ، ہر ایک سے یہی کہتا ہوگا ۔ پھر جرمن مشاہیر کے کہنے پر عمل کیا ، محبوب کے سامنے برتن توڑے ، بلیوں کتوں اور بچوں کو پیٹ کر دکھایا ، نوکروں سے لڑا ۔ لڑکی سمجھی کہ چڑچڑا اور بدمزاج ہے ۔ مشاہیر کے مشوروں نے میرا کیریر تباہ کر دیا ہے ۔ سوچتا ہوں کہ شادی کا خیال ہی چھوڑ دوں —“

”سینٹ پال نے وعظ کرتے ہوئے کہا تھا کہ کڑھنے اور جلنے سے تو بہتر ہے کہ انسان شادی کر لے —“

”وہ سب درست ہے ۔ دوں تو نطشے نے کہا ہے کہ اگر عظمت کا فقدان ہو تو مصنوعی طور پر عظمت پیدا کر کے دکھاؤ — اس لڑکی سے منگنی ہوئے چھ سات مہینے گزر چکے ہیں ، بہتیری عظمت دکھاتا ہوں لیکن اس کے نخرے ہی نہیں ختم ہوتے ۔“

”طویل منگنی میں یہی خرابی ہے کہ اس طرح فریقین کو سوچنے کا موقع مل جاتا ہے ۔ تم نیوٹرل گیئر میں کیوں نہیں رہتے — ؟“

”کیسے رہوں؟ نفسیات کا مطالعہ جو کر چکا ہوں ۔ یہ بتاؤ کہ یہ اتنی موٹی کیوں ہے؟“

”ماہرین کے بیان کے مطابق عورتیں جب غمگین ہوتی ہیں تو خوب مٹھائیاں اور کیک کھاتی ہیں ۔ شاید یہ بیچاری افسردہ رہی ہے —“

لڑکی نے ہماری طرف گھور کر دیکھا اور اپنی زبان میں دلبر سے کچھ پوچھا ۔

”یہ تاڑ گئی ہے کہ اس کا ذکر ہو رہا ہے ۔ لفظ فرائڈ کے متعلق پوچھتی تھی میں نے کہہ دیا فرائیڈ کا ذکر ہو رہا تھا ۔ تمہیں پتہ تو ہے نا کہ فرائیڈ اسی شہر کا رہنے والا تھا ۔ نفسیات کی اہمیت پر تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتی ہے —“

”کہہ دو کہ نفسیات کو خواہ مخواہ سر پر چڑھا لیا ہے ۔ بچہ انگوٹھا چوستے تو اس میں جنس کارفرما ہے ۔ چھینکو ، کھانسو ، جوتے اتارو — ہر حرکت میں جنس کا ہاتھ ہے ۔ اگلے وقتوں میں کیسے ہی لوگ کامیاب زندگیاں گزار گئے کسی کو جسمیات اور نفسیات کا علم بھی نہ تھا ۔ لیکن اب ہر شخص غیر معمولی ہے ، زبردستی ذہنی الجھنیں پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ ماہرین نفسیات ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو سلام کر کے پوچھتے ہیں — آپ تو ٹھیک معلوم ہوتے ہیں ۔ میں کیسا ہوں ؟ کسی کو خواب سناتے ڈر لگتا ہے کہ کہیں اس نے فرائیڈ نہ پڑھ رکھا ہو —“

دلبر نے ترجمہ کیا تو وہ بے حد خفا ہوئی ۔

”یہ ڈاکٹروں پر تنقید کر رہی ہے کہ وہ بھی تو ٹوکتے رہتے ہیں ، یہ مت چکھو ، یوں مت کھاؤ ، یہ نہ پیو ، یہ مت کرو وہ مت کرو ۔“

”اسے بتاؤ یہ تنقید بے ربط ہے ۔ وی آنا تو نفسیات اور طب دونوں کا سرچشمہ رہا ہے —“

دلبر نے اپنی منگیتر کی طرف داری کرتے ہوئے وی آنا کے اس ڈاکٹر کا قصہ سنایا

جس نے مے خانے کے مالک کو شراب کا پیپا ٹھوکتے دیکھ کر وجہ پوچھی ۔ اُس نے سمجھایا کہ اس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ پیپے میں شراب کتنی ہے اور کس حالت میں ہے ۔ چنانچہ ڈاکٹر نے اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے انسانی سینے کو انگلیوں سے ٹھوکنے بجانے کا طریقہ رائج کیا جو آج بھی طبی معائنے اور تشخیص کا ایک اہم حصہ ہے —"

"لیکن وی آنا کے ڈاکٹر کو خیال آیا تو کہاں — شراب خانے میں !"

"یہ پوچھتی ہے کہ ابھی تم نے کیا کہا ہے —"

"کہہ دو آئن سٹائین کا ذکر کیا ہے جو ڈینیوب کے کنارے پیدا ہوا تھا —"

"پوچھتی ہے تمہیں آئن سٹائین کی تھیوری آتی ہے ؟"

"ہاں آتی ہے ۔"

"کہتی ہے کہ بتاؤ کیا ہے ؟"

"کہہ دو کہ تھیوری بہت آسان ہے ۔ شدید جاڑے میں سڑک پر آدھ گھنٹے تک محبوب کا انتظار کیا جائے ، پھر وہی آدھ گھنٹہ محبوب کی رفاقت میں گزارا جائے ۔ پہلے تیس منٹ بے حد طویل معلوم ہوں گے ، بعد میں وہی تیس منٹ چند منٹوں میں گزر جائیں گے —"

وہ مسکرانے لگی ۔

"آج یہ کئی مہینوں کے بعد مسکرائی ہے ۔ پوچھتی ہے کہ تمہارے ہاں محبوب کتنا انتظار کراتے ہیں —"

"کہہ دو کہ انتظار ختم ہونے میں نہیں آتا ۔ آئن سٹائین کی تھیوری وہاں بالکل بے کار ہے —"

"کہتی ہے اپنے ہاں کی کچھ اور باتیں بتاؤ —"

"کہو کہ وطن سب کو عزیز ہے ، جیسے تمہیں آسٹریا سے محبت ہے ۔ ہمارے ایک عظیم فلاسفر کا قول ہے کہ جو مرا چھجو دے چبارے — اوہ نہ بلخ نہ بخارے —"

پنجابی سے انگریزی میں ترجمہ ہوا پھر ایک اور ترجمہ ۔ جسے دوبارہ انگریزی میں منتقل کیا گیا ۔

"کہتی ہے تمہاری معلومات ناقص ہیں ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بلخ اور بخارا ان دنوں آہنی پردے کے پیچھے ہیں —"

"دلبر اسے شراب پلاؤ —" وہ فوراً دو جگ بھر لایا ، ایک لڑکی کو پلایا دوسرا غٹ غٹ خود چڑھا گیا ۔

"اگر دوسروں کا تماشہ دیکھنا ہو تو خود مت پیا کرو —" میں نے اُسے بتایا لیکن وہ تقریباً تقریباً آوٹ ہو چکا تھا کیونکہ ساز خاموش تھے اور وہ والز ناچ رہا تھا ۔

"والز کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ؟" اُس نے سوال کیا ۔

"فرائڈ نے تو تنگ کیا ہی تھا ستراس نے بھی کسر نہیں چھوڑی ۔ والز کے بہانے دنیا کو وہ چکر دیے ہیں کہ گھما گھما کر رکھ دیا ۔ فی والز ایک شخص کم از کم پچاس ساٹھ مرتبہ گھومتا ہے —"

"میرے پیارے وطن کی موسیقی — میرے عزیز ڈینیوب کی موسیقی — لوگ ہم پر ہنستے ہیں کہ جس طرح ڈینیوب میں پیچ ہیں اُسی طرح بلقان کی سیاست پیچیدہ رہی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ڈینیوب نیلا نہیں ہے گدلا ہے —"

"تم بھی اُن پر ہنسا کرو کہ بحرالکاہل ، کاہل نہیں ہے بڑا تند و تیز سمندر ہے ، اطالوی سنگتراشوں کے بنائے ہوئے بت چھ چھ فٹ اونچے ہیں حالانکہ اُن کی نسل ہمیشہ سے پستہ قد رہی ہے ۔ کرکٹ انگلستان میں شروع ہوا جہاں موسم کا یہ حال ہے کہ ایک میچ

اچھی طرح نہیں کھیلا جاتا — یہ ہسنے کی بڑی ایک ہی رہی ، سکاٹ لینڈ والوں کی کنجوسی کے لطیفے خود سکاٹ مزے لے لے کر سناتے ہیں ، بعد میں کہتے ہیں کہ دوسرے ہم پر ہنستے ہیں — ''

'' انگریزوں میں خود اپنے آوپر ہنسنے کی صلاحیت ہے ۔ ہم برا مان جاتے ہیں ، ذرا سی بات پر سیاست دان ، وکیل، ڈاکٹر ڈوئل لڑنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ اگر دیکھا جائے تو ڈینیوب اب ہمارا کہاں رہا ہے ، ذرا دور سرحد پر آہنی پردہ پڑ چکا ہے ۔ یہ شاندار ماضی بھی بڑی بیہودہ چیز ہے ۔ کسی قوم کا ماضی شاندار نہیں ہونا چاہیے ورنہ حال اور مستقبل کو بھی لے بیٹھتا ہے —''

دلبر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ میں نے فوراً موضوع بدلا —

'' والز ناچ ناچ کر تو آسٹریا والوں کو خوب چست اور پھرتیلا ہونا چاہیے —''

'' لیکن والز کے بعد بھوک خوب لگتی ہے ، انسان زیادہ کھا جاتا ہے ۔ آخر مٹاپے میں کیا خرابی ہے — ؟ موٹے آدمی تو صلح پسند ہوتے ہیں ، لڑنے سے احتراز کرتے ہیں کیونکہ بھاگ نہیں سکتے —''

'' کہتے ہیں کہ مٹاپا محبت کا دشمن ہے ۔ مشہور مورخ گبن اس قدر موٹا تھا کہ جب محبوبہ کے سامنے شادی کی درخواست کی اور گھٹنے کے بل جھکا تو وہیں رہ گیا ۔ محبوبہ نے بڑی مشکل سے کھینچ کر اسے اٹھایا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شادی نہ ہو سکی —''

'' یہ لڑکی کہاں گئی — ؟ '' اس نے چونک کر پوچھا ۔

لڑکی جا چکی تھی ۔

'' آج اس نے کئی مرتبہ گستاخی کی اور میں خاموش رہا ، ڈانٹنا چاہیے تھا — '' دلبر آؤٹ ہو چکا تھا اب وہ اسی بات پر کڑھ رہا تھا کہ ڈانٹا کیوں نہیں —

'' فارسی کی ایک کہاوت ہے کہ وہ مکہ جو لڑائی کے بعد یاد آئے اپنے منہ پر مارنا چاہیے —''

اب دلبر اپنے منہ پر مکہ مارنا چاہتا تھا ۔

'' بھئی تم گھر جاؤ —''

باہر نکلتے وقت وہ آئینے میں اپنے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا ۔

'' کیا کر رہے ہو ؟ ''

'' پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ چہرہ کس کا ہے —''

بمشکل اسے ٹیکسی میں سوار کرایا ۔

'' تم نہیں آؤ گے ؟''

'' نہیں میں ابھی سیر کروں گا —''

'' اچھا تو جلدی سو جانا — ابھی جا کر سو جاؤ —''

نچلی سڑک سے گزرتے ہوئے دفعتاً قمارخانہ یاد آ گیا ۔ مانٹی کارلو کے بعد قمارخانہ دیکھے ہوئے کافی دن گزر چکے تھے ۔ کزینو میں بالکل کمرۂ امتحان والی خاموشی طاری تھی، کبھی کبھی سرگوشیاں ہونے لگتیں تو لوگ فوراً مڑ کر دیکھتے کہ یہ کون نقل کر رہا ہے ۔

گھومتی ہوئی سوئی رکتی اور سناٹا چھا جاتا ، چہرے زرد پڑ جاتے ۔

اب لوگ کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہے تھے کہ میاں تانک جھانک چھوڑو آرام سے جوا کھیلو ورنہ راستہ لو ۔

میں نے بیرے سے سگرٹ مانگے ، وہ امریکن سگرٹوں کا پیکٹ اٹھا لایا ، میں نے کہا انگلش لاؤ ، اس نے سر ہلا دیا کہ نہیں ہیں ۔

" اتنے دنوں کے بعد انگریزی سن کر بڑی خوشی ہوئی ۔"

میرے سامنے چالیس پینتالیس کی تندرست و توانا عورت بیٹھی مسکرا رہی تھی ۔ سیاہ بال، گلے میں ہیروں کا بیش قیمت ہار، ہاتھ میں وہسکی سے بھرا ہؤا گلاس ۔ گلابی چہرے سے جیسے خون ٹپک رہا تھا ۔

" کھیل نہیں رہے ؟"

" نہیں ۔"

" کھیلو گے ؟"

" میں جوا نہیں کھیلتا ۔"

" اچھا تو پھر میری طرف سے ساڑھے تین سو شلنگ کسی رنگ پر لگا دو ۔"

میں نے انکار کیا ۔ اس نے بڑے ملائم لہجے میں کہا ۔ " میں وہمی ہوں اور شگونوں کی معتقد ہوں ، یہی تم سے کہہ رہی ہوں ۔ تم خود مت کھیلو بس کوئی سا رنگ چن کر یہ ٹکیاں اس پر رکھ دو ۔"

وہ اصرار کرنے لگی اور گول ٹکیاں میرے ہاتھ میں تھما دیں ۔ میں نے اس کی طرف دیکھا ۔ سبز آنکھیں ، زرد فراک ، سیاہ بال ، سرخ ہونٹ ، سفید ہیرے — ان سب رنگوں میں سرخی سب سے نمایاں تھی ۔ میں نے ٹکیاں سرخ رنگ پر رکھ دیں اور ساڑھے تین سو شلنگ دگنے ہو گئے ۔

" ایک دفعہ اور —" اس نے اصرار کیا ۔ پھر سرخ رنگ جیتا اور پھر جیت گیا ۔ جلدی سے سب کچھ سمیٹ کر اس کے سامنے رکھا اور کرسی پر بیٹھ گیا ۔

" بس ایک دفعہ اور — آخری مرتبہ —" اس نے پھر ٹکیاں مجھے زبردستی دے دیں ۔

" رنگ بدل لو —"

" میں نے صرف آدھی ٹکیاں سبز رنگ پر لگائیں ۔" اور ہار کر بقیہ ٹکیاں اس کے حوالے کیں حساب تقریباً برابر ہی رہا ۔

" جوئے سے بہت ڈرتے ہو —" وہ ہنسنے لگی ۔ اس کے سامنے پانچ خالی گلاس رکھے تھے اور راکھ دانی سگرٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی تھی ۔

بیرہ بل لایا، اس نے بٹوے سے سفری چیکوں کا بنڈل نکالا اور دس پاؤنڈ کا چیک تھالی میں رکھ دیا ۔ وہ واپس آ گیا — " شلنگ دیجئے ۔ ہمیں سفری چیک لینے کی اجازت نہیں ہے ۔"

میں نے مشورہ دیا کہ ٹکیاں واپس کر کے شلنگ لے لو لیکن وہ ضد کرنے لگی ۔ بیرہ مینجر کو لے آیا ۔

" یہ پاؤنڈ ہیں اور آسٹریا کی کرنسی سے کہیں بہتر ہیں ۔"

مینجر نے سر ہلا دیا — " یہ چیک صرف بینک والے ہی لے سکتے ہیں ۔"

اس نے مینجر کو ڈانٹنا شروع کر دیا ، لوگ اکٹھے ہو گئے ، سارا ہجوم مجھے بری طرح گھور رہا تھا کیونکہ میں اس کے ساتھ تھا ۔

جوا بند ہو گیا اور سب میز کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے ۔ میں نے جیب سے بٹوہ نکالا ۔ اس نے ہاتھ تھام لیا — " بالکل نہیں ! پہلے میں نے تم سے بات کی تھی ۔"

مینجر چلا رہا تھا ، وہ چیخ رہی تھی ، لوگ غیظ و غضب سے مجھے گھور رہے تھے ۔ آخر میں مینجر کو ایک طرف لے گیا ، اسے سمجھایا کہ امیر عورت ہے بل کے ادا نہ ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔ اس سے ہوٹل کا نام پوچھ کر مینجر سے فون پر باتیں کر لو —

اُس نے فون کیا اور بل واپس لے لیا ۔

" وی آنا کیسے آئے ؟"

" یونہی ڈینیوب دیکھنے چلا آیا تھا —"

" پہلے میں سمجھی کہ تم آرٹسٹ ہو اور یہاں کچھ سیکھنے آئے ہو گے لیکن نہ تو تمھارے بال لمبے ہیں نہ کندھے جھکے ہوئے ہیں ۔ تم آرٹسٹ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ تم کون ہو؟"

" پتہ نہیں میں کون ہوں ؟"

"میں بھی نہیں جانتی کہ میں کون ہوں اور کیا چاہتی ہوں۔ مجھے بھی کوئی نہیں سمجھتا۔"

" اگر ہم کوشش کریں تو ہمیں کوئی نہیں سمجھ سکتا —"

" اب کیا پروگرام ہے ؟"

" ڈینیوب کی سیر کروں گا ۔"

" اس وقت ؟ بہت خوب ۔ چلو میں بھی چلتی ہوں —"

ہم باہر نکل آئے ۔

" یہ کیسی عجیب سی بو آ رہی ہے ؟"

" یہ تازہ ہوا ہے —" میں نے آہستے بتایا ۔

وہ اپنے متعلق باتیں کرنے لگی کہ آسٹریلیا سے دنیا کی سیر پر نکلی ہے ، اب تک اٹھارہ ملک دیکھے ہیں ۔ آسٹریلیا میں جائداد ہے اور بے شمار بھیڑیں جن کی اُون دساور کو بھیجی جاتی ہے ۔ خاوند امریکہ میں ہے اور مکہ بازی کے مقابلوں کا مہتمم ہے ۔ " وہ شرابی ہے ، جواری ہے ۔ ہالی وڈ کی ایکسٹرا لڑکیوں میں خاص دلچسپی لیتا ہے مجھے اُس پر ذرا بھروسا نہیں ۔ کبھی تو محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے اُس سے محبت ہے کبھی یوں لگتا ہے جیسے اُس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی ، بڑا ناقابل اعتماد شخص ہے ۔ شادی کو پانچ برس ہو چکے ہیں لیکن وہ مجھے بالکل نہیں سمجھتا ۔ میں اُس کے ساتھ پانچ ہفتے سے زیادہ نہیں رہی ۔ شادی میں سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ آئے دن ایسے مرد ملتے ہیں جو اپنے خاوند سے کہیں بہتر ہوتے ہیں ۔ اُس کی تصویر دکھاؤں ؟"

ایک قمقمے کے نیچے اُس نے تصویریں دکھائیں —

" یہ میرا خاوند ہے —"

" اور یہ شاید آپ کی لڑکپن کی تصویر ہے —" تصویر میں بیس بائیس سال کی حسین لڑکی ہنس رہی تھی ۔

" یہ میری لڑکی ہے —"

" کہاں ہے ؟"

" یہاں نہیں ہے —" اُس نے تصویر ہاتھ سے چھین لی ۔

" لیکن آپ کی شادی کو تو فقط پانچ برس ہوئے ہیں —"

" پہلے خاوند کی لڑکی ہے — یہ رہا پہلا خاوند —"

" اور جو یہ مونچھوں والا آپ کے ساتھ کھڑا ہے ، یہ کون ہے ؟"

" یہ اس سے پہلا خاوند تھا —" اُس نے جھنجھلا کر تصویریں بٹوے میں رکھ لیں ۔

ہم دریا کے کنارے بینچ پر بیٹھ گئے ۔

" مغرب میں طلاق کس قدر عام ہو گئی ہے —"

" لیکن آسٹریلیا تو مشرق میں ہے —"

" تم تو بات بات پر وکیلوں کی طرح جرح کرتے ہو —"

" اچھا اب ہاں میں ہاں ملاؤں گا ۔"

" تمہارے خیال میں طلاق کی اصل وجہ کیا ہے ؟"

" شادی ۔"

اس نے مصنوعی آہ بھری ۔ " تم سوچتے ہوگے یہ سگرٹ بہت پیتی ہے ۔"

واقعی میں یہی سوچ رہا تھا ۔

" سگرٹ نوشی کے نقصانات پر رسالوں کتابوں میں اتنا کچھ پڑھا ہے کہ تنگ آ کر پڑھنا چھوڑ دیا ہے ۔" اس نے گھڑی دیکھی ۔

" اتنے بڑے شہر میں اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتے ؟ گھر یاد نہیں آتا ؟"

" نہیں ۔"

" یاد کیوں نہیں آتا ؟"

" بہت اچھا ! ۔ آتا ہے ۔"

" کتنے عجیب ہو ، دوسروں سے بالکل مختلف ۔ اچھا بتاؤ کہ اگر چوڑی یا انگوٹھی دریا میں گر پڑے تو کیا کرو گے ؟"

" کل صبح کسی غوطہ خور کا انتظام کرادوں گا ۔"

" اگر میں نوعمر ہوتی تو میرے لیے فوراً پانی میں کود جاتے ۔ آہ ! محبت فقط نوعمروں کے لیے ہے ۔ رومان کی وہی عمر ہوتی ہے ۔"

۔ اچھا تو یہ رومان تھا ۔

" جب میں سوسائٹی میں داخل ہوئی تو تہلکہ مچ گیا تھا ۔ میرے سینڈل سے شیمپین پی گئی تھی ۔"

یورپ میں یہ فقرہ میں نے کئی بار سنا تھا ۔ مانا کہ سینڈل صاف ہوگا ، جراب بھی پہن رکھی ہو گی لیکن اس سے شیمپین وہی پی سکتا ہے جو ایک بوتل پہلے چڑھا چکا ہو ۔

" آپ کو موسیقی سے دلچسپی ہے ؟" میں نے موضوع بدلنے کے لیے پوچھا ۔

" فقط جاز کی گتیں پسند ہیں جن میں جان ہوتی ہے ، جنہیں سن کر رواں رواں پھڑ کنے لگتا ہے ۔ کلاسیکی موسیقی سے سخت نفرت ہے ۔ یا تو کوئی بوڑھا گھنٹوں وائلن یا پیانو بجاتا رہتا ہے اور سننے والے اونگتے رہتے ہیں یا پھر اوپرا میں لوگ دل کھول کر چنگھاڑتے ہیں ، کبھی عمر رسیدہ کتا بری طرح روتا ہے کبھی مرغیاں سی چلاتی ہیں ، کان بہرے ہو جاتے ہیں ۔"

کلاسیکی موسیقی کی اتنی شاندار تفسیر سن کر میں نے اسے بتایا کہ میں مٹن والڈ میں پچھتر برس کے بوڑھے جوہان سے ملا تھا جو جرمنی بھر میں وائلن سازی کا استاد مانا گیا ہے ۔ اس کے کہنے کے مطابق اچھا وائلن بنانے میں مجموعی طور پر چار سو گھنٹے صرف ہوتے ہیں لیکن پندرہ بیس برس انتظار کرنا پڑتا ہے ۔ سر ٹھیک کرنے کے لیے کسی بڑے ماہر کی ضرورت ہوتی ہے ۔ بڑھیا وائلن ہزار سے لے کر دس ہزار ڈالر تک کے بکتے ہیں ۔

" مجھے وائلن سے چڑ ہے ۔ اس کے گز میں گھوڑے کی دم کے بال ہوتے ہیں اور تار بلی کے پوست سے بنتے ہیں ۔ عجب تماشا ہے ، گھوڑے کے بال بلی کے پوست سے رگڑے جاتیں تو انسانوں پر غشی کا عالم طاری ہو جائے ۔ بڑے افسوس کا مقام ہے ۔"

اس نے پھر گھڑی دیکھ کر آہ بھری ۔

" تم کس چیز کی تلاش میں ہو ؟ "

" مجھے تو کسی کی تلاش نہیں ۔"

" میں صداقت کی تلاش میں ہوں ۔"

" یعنی ۔؟"

" صداقت ۔ یعنی سچائی ڈھونڈنے نکلی ہوں ۔"

" میں سمجھا نہیں ـ"

" معمولی سی بات ہو تو سمجھاؤں بھی ـ مثلا یہی کہ دنیا کبھی سیدھی بھی ہو گی ، اگر ہوئی تو کیونکر ہو گی ؟ "

" ہزاروں سال سے دنیا اسی طرح رہی ہے ـ بڑے بڑے پیغمبر ، مفکر اور مصلح آئے لیکن دنیا سیدھی نہ ہوئی ـ"

" ہائے یہی تو صداقت ہے ، تم اپنا پروگرام بدلو اور میرے ساتھ اٹلی چلو ـ"

" میں نے بتایا کہ اٹلی کئی بار جا چکا ہوں ـ اُس کے اصرار پر میں نے انکار کر دیا ـ

" تم نے میری شام خراب کر دی ـ"

" ابھی تو صرف ڈھائی بجے ہیں ـ " اس دفعہ میں نے گھڑی دیکھی ـ

ٹیکسی میں بیٹھتے وقت اُس نے سگرٹ سلگائی ـ

" تو پھر کل ـ؟"

" کل پتا نہیں کہاں ہوں گے ـ"

" در اصل تم جوئے سے ڈرتے ہو ـ"

وی آنا کے تین تحفے ہیں ـ ڈینیوب ، ہاپس برگوں کا کنبہ اور والز ـ

یہ شہر کسی زمانے میں یورپ کی سب سے بڑی سلطنت کا دارالخلافہ تھا ـ دارالخلافہ تو اب بھی ہے لیکن سلطنت نہیں رہی ـ

رومنوں نے حسب معمول یہاں چھاؤنی قائم کی (رومن ہر جگہ پہنچ جاتے تھے) جب یہاں اُن کے بادشاہ مارکس آری لیئس کا انتقال ہؤا تو رومن کچھ بد ظن سے ہو گئے اور بادشاہوں نے دورے پر آنا چھوڑ دیا ـ پھر اُن کے دوست ہن آئے (جنہوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ یورپ میں جہاں رومن جائیں گے ہم بھی جائیں گے اور اُن کے کیے کرائے پر پانی پھیر کر لوٹیں گے) صلیبی جنگوں میں وی آنا کو بڑی آمدنی ہوئی ، یورپ کی سب فوجیں ڈینیوب کے ذریعے سے لڑائی پر جاتی تھیں ـ لیکن یہ نری آمد ہی آمد تھی رفت ندارد تھی ـ بقول ایک مؤرخ کے اگر دس آدمی یورپ سے صلیبی جنگوں پر گئے تو فقط ایک زندہ لوٹا ـ بعد میں رش کم ہو گیا تو آسٹریا والوں نے رچرڈ شیر دل کو پکڑ لیا جو صلاح الدین ایوبی سے صلح کر کے واپس انگلستان جا رہا تھا ـ رچرڈ بھیس بدلے ڈینیوب کے کنارے ایک گاؤں میں شراب پی رہا تھا کہ گرفتار کر لیا گیا ـ غالباً آسٹریا والے خفا تھے کہ صلح کیوں کر لی اب آمدنی ختم ہو جائے گی ـ پہلے تو یہ بہانہ رہا کہ بھیس بدل رکھا تھا ہمیں کیا پتا کہ یہ کون ہے ـ جب غلط فہمی کا ازالہ ہو چکا تو کہا گیا کہ کاغذات اوپر بھیجے ہیں احکامات آئیں گے تو کچھ ہوگا ـ اسی طرح سال گزر گیا ، آخر انگلستان کی پبلک نے چندہ اکٹھا کر کے آسٹریا بھجوایا تب رچرڈ کو چھوڑا گیا ـ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر نہ کبھی رچرڈ نے بھیس بدلا اور نہ صلیبی جنگ لڑی ـ

ہاپس برگ کنبے کا وی آنا کو صدیوں سے انتظار تھا ، یہ لوگ آئے ہی ایسے جمے کہ سات سو برس تک رہے ـ زمانے کے دستور کے مطابق کچھ حضرات تو انہیں بے حد ذہین ، قابل اور دلیر بادشاہ قرار دیتے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ پاگل تھے ـ ویسے ان کی تعداد چوبیس تھی اور عہد حکومت فی ہاپس برگ چوبیس برس تھا ـ فرڈی ننڈ نے ایسی پالیسی کی بنیاد ڈالی جس پر لوگ اب تک عمل کرتے ہیں ـ اُس نے بھرے دربار میں کہا ـ حضرات لڑائیوں سے ملک فتح کرنے بہت مشکل ہیں ، شادی ایسی جگہ کیجیے جہاں سے ملک اور

دولت دونوں ملیں —— بسم اللہ اس نے خود کی اور ایسی بیوی لایا جو بوھیمیا اور ھنگری جہیز میں لائی ۔ پھر برگنڈی اور ھسپانیہ ملے ۔ آھستہ آھستہ شادیوں کے بہانے پولینڈ، چیکوسلوواکیہ اور اٹلی بھی لے لیے گئے ۔ لیکن کسی کی ترقی اور خوشحالی دنیا کو ایک آنکھ نہیں بھاتی ، بے شمار حاسد اور نقال پیدا ھو جاتے ھیں ۔ چنانچہ اغیار یونہی پیچھے پڑ گئے اور آسٹریا کی عظیم سلطنت کو زک پہنچانے کے بہانے تلاش کرنے لگے ۔ جب وی آنا میں میریا تھیریسا تخت پر بیٹھی تو پڑوسی فریڈرک اعظم خواہ مخواہ خفا ھو گیا کہ اب ایک چھوکری حکومت کرے گی ، ھم مر گئے ھیں کیا ؟ چنانچہ خفا ھوتے ھی اس نے سلیشیا کا علاقہ ھتھیا لیا ۔ دوسرے پڑوسی بھی دیکھا دیکھی پیچھے لگ لیے اور دنگا فساد شروع ھو گیا ۔ رھی سہی کسر نیپولین نے پوری کر دی ، پہلے آسٹریا والوں کو شکست دی پھر ان ھی کی شہزادی کے لیے پیغام بھجوا دیا ۔ وہ پرانا شاھی خاندان سوچ میں پڑ گیا کہ اللہ تیری شان ، نیپولین کے معمولی سے خاندان کی یہ مجال ۔ ویسے نیپولین کی سراسر زیادتی تھی ، شہزادیوں سے شادی کر کے بھی کوئی بادشاہ بنا ھے ۔ چونکہ نیپولین کی شہرت عروج پر تھی اس لیے ھاپس برگ رضا مند ھو گئے ۔ جب اسے جلاوطن کر کے البا بھیجا گیا تو داماد کی اس درگت پر بجائے افسوس کرنے کے بغلیں بجائی گئیں ، فوراً وی آنا میں کانگرس منعقد کی گئی کہ نیپولین نے جو کچھ فتح کیا ھے وہ متعلقین کو واپس مل جائے ۔ حقدار تو الاٹمنٹ کے سلسلے میں جھگڑ ھی رھے تھے بہت سے فرضی دعوے بھی آ گئے اور خوب ھڑبونگ مچی ۔ کانگرس نے اتنی طوالت پکڑی کہ نیپولین کو مجبوراً البا سے فرار ھو کر فرانس پہنچنا پڑا ، کانگرس ختم ھو گئی ، سارے بادشاہ سرپٹ اپنے اپنے ملکوں کو بھاگے ۔ واٹرلو میں نیپولین کو اصلی شکست ھوئی تو عہدنامہ وی آنا کے مطابق ستائے ھوئے ھاپس برگوں کو بہت سا علاقہ لوٹا دیا گیا ۔

اب بسمارک آیا ، اس نے اپیل کی کہ جرمن بھائیو اٹھو اور متحد ھو جاؤ (یعنی کسی طرح آسٹریا کی طاقت توڑ دو) ۔ ھاپس برگوں سے بھی لوگ اکتانے جا رھے تھے کہ کیسا خاندان ھے ختم ھونے میں نہیں آتا ، جب دیکھو ایک نہ ایک ھاپس برگ حکومت کر رھا ھوتا ھے ۔ ویسے بھی پبلک تنوع چاھتی ھے ۔ ایک دن بسمارک فوج لے کر آیا ، آسٹریا کو شکست ھوئی اور اسے جرمن برادری سے خارج کر کے حقہ پانی بند کر دیا گیا ۔

اس کے ساتھ ھی آسٹریا نے عہد عسکریت ختم کیا ، عظمت جا چکی تھی لیکن عظیم ماضی کا نشہ ھنوز باقی تھا ۔ تھئیٹر ، اوپرا اور رقص کا سنہرا زمانہ شروع ھؤا ۔ جھلملاتی روشنیوں میں رات بھر رقص ھوتے ۔ لوگ کام کاج چھوڑ کر ساری رات جاگتے دن بھر سوتے ، —— اور پبلک خوش ھو گئی ۔

جنگ عظیم شروع ھوئی تو آسٹریا والے چونکے کہ یہ کیا ھو رھا ھے —— لیکن بہت دیر ھو چکی تھی ، بہت کچھ چھن چکا تھا یہاں تک کہ ملک کی ایک بندرگاہ تک نہیں تھی ۔ جب ھٹلر آیا تو لوگ ایک دوسرے سے اس قدر بیزار تھے کہ لڑے ضرور ، حملہ آوروں سے نہیں — بلکہ آپس میں بلکہ کچھ پارٹیوں نے ھٹلر کے سپاھیوں کو ھار پہنائے ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ملک کچھ عرصے کے لیے چار حصوں میں تقسیم ھو گیا ۔ چار سپاھی (روسی ، انگریز ، فرانسیسی اور امریکن) ایک جیپ میں بیٹھ کر گشت پر نکلتے تو وی آنا کے بچے انہیں بڑے شوق سے دیکھتے ۔ آسٹریا اب آزاد ھو چکا ھے اور آھستہ آھستہ اپنے قدموں پر کھڑا ھو رھا ھے ۔ باشندے اپنے بھولے ھوئے مقولے کو دھرانے لگے ھیں — جھک جاؤ مگر گرو مت —

(کئی ملکوں میں — گر جاؤ مگر جھکو مت — پر بڑی سرگرمی سے عمل کیا جاتا ھے)

ساڑھے پانچ بجے ھوں گے جب میں ڈینیوب کی سیر سے واپس لوٹا ، شہر میں دودھ والے اور اخبار فروش ادھر ادھر پھر رھے تھے ، سچ مچ صبح ھو چکی تھی ۔ ھوٹل کے چوکیدار نے

جائی لے کر صبح بخیر کہا اور مسکرانے لگا ۔ شاید سوچ رہا ہوگا کہ اگر شام کا بھولا صبح واپس آ جائے تو اسے کچھ نہیں کہنا چاہیے ۔

ناشتے کے بعد دس بجے دلبر کو کچی نیند سے اُٹھایا ۔ مجھے پہچانتے ہی اس نے نعرہ لگایا ۔۔ ” دیکھا میری نصیحت پر عمل کرنے کا نتیجہ ۔۔ رات بھر کے آرام کے بعد تم بڑے چست دکھائی دے رہے ہو ۔۔“

میں نے اسے بتایا کہ میں فقط پرسوں رات سو دا تھا ۔

” بھلا اتنی رات گئے سیر کی کیا ضرورت تھی ، ڈینیوب کہیں بھاگ چلا تھا ؟“

” یہ موڈ کی بات ہے ، تم ان باتوں کو نہیں جانتے ۔ جیسے زندگی کے تین حصے ہوتے ہیں ، اسی طرح دنیا کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ، وہ جگہیں جنہیں ہم لڑکپن میں دیکھتے ہیں ، وہ مقامات جن کی سیر جوانی میں کی جاتی ہے اور پھر جوانی کے بعد کی دنیا جو بالکل ایک سی ہوتی ہے ۔۔“

” پہیلیاں مت بجھاؤ ۔۔ صاف صاف کہو ۔۔“

” اب مثلاً زاہرمیں عرف دلبر کی وہ عمر آ پہنچی ہے جب رات کو گیارہ بجے تک سو جانا چاہیے ۔ کیسا ہی نظارہ ہو کیسا ہی سماں ہو اگر دلبر کے سر میں درد ہے تو اسے سب کچھ زہر دکھائی دے گا ۔۔“

” درد ہمیشہ درد ہوتا ہے جوانی میں ہو یا بڑھاپے میں ۔۔“

” جوانی میں درد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔۔“

” تم لندن میں بھی مجھے بڑھاپا یاد دلایا کرتے تھے حالانکہ انگریز مجھے لڑکا سمجھتے تھے ۔۔ چاہے کچھ کہو میں ہرگز بوڑھا نہیں ہو رہا ہوں ۔۔“

باہر نکلتے ہی میں نے دلبر سے کہا کہ کسی جوان سے میوزیم کا راستہ پوچھو ۔۔ ایک نوجوان نے راستہ یوں بتایا ۔۔ ” سدھے چلے جائیے ، ایک سینما آئے گا وہاں سے داھنی طرف مڑ جائیے جہاں لڑکیوں کا ہوسٹل ہے وہاں سے بائیں طرف ، آگے بار آئے گی پھر تھیٹر ۔۔ میوزیم بالکل سامنے ہوگا ۔۔“

” اب کسی بوڑھے سے پوچھو ۔۔“

بوڑھے نے کہا ۔۔ ” اگلے چوک پر جو گرجا ہے وہاں سے دھنی طرف مڑ جائیے ، جہاں قبرستان ہے وہاں سے پھر دھنی طرف ، اس کے آگے ایک اور گرجا ہے ۔۔ بائیں طرف ہسپتال آئے گا وہاں سے میوزیم دھنی طرف ہے ۔۔“

” دیکھا ؟ جوانی اور بڑھاپے کا فرق ۔۔“

” تم مجھے چھیڑ رہے ہو ۔۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں جوان ہوں ۔۔“

وہ دن ہم نے وی آنا دیکھنے میں گزارا ۔۔

یہ شہر کبھی یورپ کا قلب تھا ، پیرس کی طرح اس میں بھی نسوانیت ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں مشرق اور مغرب ملتے ہیں ۔ بلگراڈ والوں کا بھی یہی دعویٰ ہے ، ادھر بحیرۂ روم کے اکثر شہر اسی پر خوش ہیں ۔ یوں تو اہل مشرق مغرب سے بیزار ہیں اور وہ ان سے لیکن جہاں دونوں مل رہے ہوں وہاں متعلقین پھولے نہیں سماتے ۔

ویسے وی آنا میں کچھ کچھ مشرقیت پائی جاتی ہے ۔ ٹرینیں اکثر لیٹ ہوتی ہیں ، دکانوں کے کھلنے اور بند ہونے کے کوئی خاص اوقات نہیں ، سال بھر تعطیلات کی بھرمار رہتی ہے ، صبح سے شام تک لوگ کافی پیتے ہیں اور گپیں ہانکتے ہیں ۔ تیتر اور ہرن کے سوپیں ہیں ۔ گفتگو ہمیشہ پر ادب ہوتی ہے ۔ ہر داڑھی والے کو پروفیسر کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے اور موٹے اور گنجے شخص کو ڈائریکٹر (ایسے آدمی یہاں بے شمار ملتے ہیں) ۔ ذرا سی بات پر

ایکسلنسی کا خطاب مل جاتا ہے - جس کے بارے میں کوئی شبہ ہو اُسے ڈاکٹر کہہ کر بلایا جاتا ہے - جب تک کوئی گنجا نہ ہو جائے یا سارے بال سفید نہ ہو جائیں اُسے ناتجربہ کار سمجھا جاتا ہے ، ایسے شخص کو کوئی ذمہ دار عہدہ نہیں سونپا جاتا -

کافی ہاؤس بے شمار ہیں اور مشرق کے قہوہ خانوں سے ملتے ہیں - یعنی ہر وقت بیکار آدمیوں کا ہجوم رہتا ہے - ہجوم ہمیشہ انٹلکچوئل قسم کا ہوتا ہے جو حکومت پر تنقید کرتا رہتا ہے - قنوطیت کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی سے پوچھا جائے کہ کیا حال ہے ؟ تو جواب ملے گا -- " شکریہ ! کافی خستہ حالت ہے —"

شور بھی اتنا ہی مچتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کافی ختم کرکے کچھ دیر بیٹھے رہو تو کوئی برا نہیں مانتا یعنی بیرے خفا ہو کر نہیں گھورتے - اخبار رسالے بھی مفت پڑھے جاسکتے ہیں ، ٹیلیفون استعمال کرو تو کچھ دینا نہیں پڑتا -

عمارتیں کسی خاص طرز تعمیر سے متاثر ہوکر نہیں بنائی گئیں تقریباً سارے سٹائل یہاں مل جاتے ہیں — شاید یہی بات باعث کشش ہے -

پرانے شہر میں تنگ اور پیچیدہ گلیاں اب تک ہیں ، یہ فلم سازوں کی گلیاں ہیں ، جب بھی باہر سے کوئی فلم بنانے آتا ہے تو اس حصے کو چنتا ہے - غالباً لوگ سیدھی سڑکوں سے تنگ آ چکے ہیں اور دوبارہ مڑی تڑی گلیوں کی طرف بھاگتے ہیں -

جو فصیل پرانے شہر کو محیط کرتی تھی اُس نے شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کو مدتوں قابو میں رکھا آخر جواب دے گئی - پبلک کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا - پرانی فصیل ڈھائی گئی تو اہل شہر یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ فصیل کی جگہ دو میل لمبی سرکلر روڈ خود بخود بن گئی تھی (عمدہ سرکلر روڈ بنانے کا یہ طریقہ کسی کے ذہن میں نہیں آیا تھا) - اس سڑک پر شہر کی ساری مشہور عمارتیں ہیں - پارلیمان — اس کے سامنے ٹاؤن ہال ہے --- ایک طرف یونیورسٹی ہے - پھر اوپرا ہاؤس ، اکادمی اور ہابس برگوں کا مشہور محل ہوف برگ -

شام کو ہم سب سے پرانے گرجے کی چوٹی سے شہر کو دیکھ رہے تھے - دلبر مجھے سبق یاد کرا رہا تھا کہ دن میں جو کچھ دیکھا ہے اُسے بھول نہ جاؤں -

دور ڈینیوب سر سبز پہاڑوں کو چھو رہا تھا — دریا تک جگہ جگہ سبزے کے خوش نما قطعوں اور پھولوں نے رنگیں قالین بچھا رکھے تھے - سامنے ڈینیوب کی نہر تھی جو اچھا خاصا دریا تھی - شروع شروع میں یا تو شہر بسانے والوں سے غلطی ہوئی یا لوگ سیلاب سے ڈر گئے چنانچہ دریا شہر سے ذرا ہٹ کر نکل جاتا ہے - بعد میں لوگوں نے شور مچایا کہ دریا اتنی دور ہے کہ ہم اس سے مستفیض نہیں ہوسکتے ، حکومت عوام کی بہبودی کا خیال نہیں رکھتی - وغیرہ وغیرہ - ان دنوں خوش حالی کا دور تھا لہذا دریا سے نہر کاٹ کر شہر میں سے گزاری گئی اور واپس دریا سے ملا دی گئی -

لوگوں نے پھر بھی شور مچایا ہوگا کہ یہ تو مصنوعی دریا ہے ہمیں تو اصلی ڈینیوب چاہیے — کیونکہ حکومت نے اُنہیں ٹھنڈا پانی پلانے کے لیے بہت بڑا زمین دوز حوض بنوا دیا تھا - نہر اور دریا کے درمیان جو خوش نما خطہ تھا اُس میں جلدی جلدی ایک پارک بنایا گیا کہ کہیں لوگ کوئی سوسائٹی بنا کر قرضے پر مکان نہ بنانے شروع کردیں (یہ مکان بنانے کا ایکٹ کافی پرانا معلوم ہوتا ہے) دو ہزار ایکڑ یعنی اسی مربعوں کے اس پارک کا نام پراتر ہے - کبھی یہاں بادشاہوں کے ہرن رہتے تھے اب انسان چوکڑیاں بھرتے ہیں -

وہ میوزم بھی نظر آ رہا تھا جہاں شارلین اور ہارون الرشید کی تلواریں رکھی ہیں - وہ آلے بھی دیکھے جاسکتے ہیں جن سے پرانے زمانے میں قیدیوں کو جسمانی اذیت پہنچائی جاتی تھی - لیکن دلبر کا خیال تھا کہ جن طریقوں سے نازی شدید ذہنی ایذا پہنچایا کرتے اُن کے

سامنے یہ آئے کچھ بھی نہ تھے - شاید نازی ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ابھی روحانیت کی جگہ مادیت نے نہیں لی -

" وہ ہنگری کی سرحد ہے اور وہاں سے چیکوسلوواکیہ سروع ہوتا ہے ، دونوں ملک کبھی ہمارے تھے اب ان پر آہنی پردہ پڑ گیا ہے --"

" درا دوربیں دینا --"

" اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہو --"

" پردہ تو نظر نہیں آتا --"

" ایسے پردے نظر نہیں آیا کرتے ۔ اُس طرف دور برشٹگیڈن ہے ، جہاں بادلوں میں سے اُبھرا ہؤا ، پہاڑ کی چوٹی پر ' عقاب کا گھونسلہ ' تھا - اس میں عقاب کے بجائے ہٹلر رہتا تھا - نازیوں نے اسی گھونسلے میں دنیا کو فتح کرنے کے منصوبے باندھے ، اس چوٹی سے ہمارا ہم وطن ہٹلر اپنے ملک آسٹریا کو دیکھ کر دانت پیستا ۔ اُسے اس ملک سے سخت نفرت تھی کیونکہ ہم نے اُس کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور یہاں اُسے لگاتار ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا ، جب یہاں سے جرمنی گیا تو اُنہوں نے خوش آمدید کہا کیونکہ وہ لیڈر کی تلاش میں تھے- اُس کونے میں موزارٹ کا مکان ہے ، وہ موزارٹ جس نے چھ برس کی عمر میں بادشاہوں کے سامنے پیانو بجایا -- اس طرف موزارٹ کے شاگرد بیتھووں کا گھر ہے - وہ شاہی محل ہے جس میں وی آنا کے مشہور رقص ہوتے تھے ، سب سے اچھا نقاب پوشوں کا رقص تھا جو دراصل شادی شدہ لوگوں کا ناچ تھا - میاں بیوی گھر کی بے کیف فضا اور ایک دوسرے سے تنگ آ جاتے تو اس رقص میں جاتے ، رقص گاہ میں داخل ہوتے وقت سیاہ نقاب سے چہرہ چھپا لیا جاتا ، رات بھر نہ کوئی کسی کو پہچان سکتا نہ پہچاننے کی کوشش کرتا --"

" ایسے رقص کا فائدہ -- ؟ "

" فائدہ یہ تھا کہ سکینڈل نہیں اُڑتے تھے ، جو کچھ ہوتا اُسے نقاب پوش کرتے ، نہ ڈیوک فلاں کو ذمہ وار ٹھہرایا جاتا نہ کاؤنٹس فلاں کو - بڑی اچھی رسم تھی لیکن اب تو متعلقہ خواتین و حضرات خود چاہتے ہیں کہ اخباروں رسالوں میں اُن کی غلط لوگوں کے ساتھ تصویریں چھپیں اور افواہیں اڑیں کیونکہ اس سے پبلسٹی ہوتی ہے -- افسوس کہ پرانی رسمیں مفقود ہوتی جا رہی ہیں --"

" دو پرانی رسمیں تو اب تک عام ہیں - رومن اپنے قیدیوں کو آزاد کرتے وقت اُن کے سر پر ایک خاص قسم کی بیل کا تاج پہنا کر شہر میں پھراتے تھے تا کہ سب دیکھ لیں - بیل کا نام بیچلیرس تھا - اسی سے لفظ بیچلر نکلا ہے یعنی آزاد - پرانے ٹیوٹن لوگوں کا دستور تھا کہ شادی کے بعد تیس دنوں تک شہد کی شراب (ھنی وائن) خوب پی جاتی تھی - ھنوں کے سردار اٹیلا نے شادی کی اور اتنی شراب پی کہ اُس کا انتقال ہوگیا -- ھنی مون اسی سے نکلا ہے --"

" پہلے یہ شہر معمولی سا تھا ، پھر ترکوں نے دو بار محاصرہ کیا - وی آنا نے یورپ کے عیسائیوں سے اپیل کی کہ بھائیو ہمیں بچاؤ - چنانچہ اُن کی مدد کی بدولت دونوں مرتبہ ترکوں کو ناکام جانا پڑا - اس کے بعد اصلی تعمیری کام شروع ہؤا - عالیشان عمارتیں بنائی گئیں ، محل ، تھیٹر ، پل ، یہاں تک کہ گرجے تک تعمیر کیے گئے --"

" میرے خیال میں پہلی مرتبہ لوگوں کو اپنے شہر کی اہمیت کا احساس ہؤا ہوگا کہ ترک اتنی دور سے آتے ہیں تو ہمارے شہر میں ضرور کوئی خصوصیت ہوگی --"

" ترکوں کے محاصرے کے کئی لطیفے مشہور ہیں ، کہا جاتا ہے کہ یلغار سے پہلے اُن کے کمانڈر نے کہلا بھیجا کہ کل دوپہر کا کھانا میں وی آنا میں کھاؤں گا - چوبیس گھنٹے

کی لڑائی کا نتیجہ کچھ نہ نکلا اور مقامی کمانڈر نے پیغام بھیجا کہ آپ کا لنچ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔۔۔"

" ہم ناکام رہے تو یار لوگ ایسے لطیفے اکثر اڑا دیتے ہیں ، اگر جیت جاتے تو یہ لطیفے ترک سناتے - جیسے آسٹریا پر جرمن فقرے کسا کرتے تھے ۔۔۔"

" جرمنوں نے تو ہمارے گرجے تک جلا دیے ، جس گرجے کی چوٹی پر ہم بیٹھے ہیں اسے پٹرول سے بھگو کر پسپا ہوتے وقت گولے مار کر آگ لگا دی - لڑائی کے دنوں میں ہم نے بہت دعائیں مانگیں لیکن کچھ نہ ہؤا - رقص گاہوں اور قہوہ خانوں میں ضایع کیا ہؤا وقت گرجوں میں جھکنے سے واپس نہیں آ سکتا ۔۔۔"

" لیکن پہلے تو عبادت گاہوں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا ۔۔۔" میں نے اُسے جنوبی جرمنی کے ایک شہر کا واقعہ سنایا - دشمن نے کافی عرصے سے محاصرہ کر رکھا تھا ، غذا ختم ہوگئی اڑے کی سکت نہ رہی تو حاکم شہر نے ایک عجیب و غریب حرکت کی - شہر کی سب عورتوں اور بچوں کو گرجے میں جمع کیا اور آدھی رات کو حکم دیا کہ خواتین آپ خوب چیخیں مار مار کر روئیں اور بچوں کو بھی رلائیں - محاصرین نے جو ایسے وقت گرجے سے یہ بھیانک آوازیں سنیں تو ڈر گئے کہ آسمانی قہر نازل ہونے والا ہے ، فوراً واپس لوٹ گئے ۔۔۔"

" وہ دن اور تھے اب کوئی لحاظ نہیں کرتا - دشمن تو پھر دشمن ہے ، اپنوں کو گرجوں کی پروا نہیں - ملک کی صحیح حالت کا اندازہ لگانا ہو تو گرجے میں چلے جاؤ ، اگر گنے گنائے آدمی ملیں تو سمجھ لو کہ خیریت ہے اگر ہجوم نظر آئے تو پھر یا تو جنگ قریب ہے ، سیلاب یا قحط آنے والا ہے یا وبا پھیلی ہوئی ہوگی - عام طور پر گرجے میں جو پہلے پہنچتا ہے وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھتا ہے تاکہ اونگھ سکے ، دیر سے آنے والوں کو آگے بیٹھ کر تقریر سننی پڑتی ہے - شاید اس لیے کہ ان دنوں ہم نئی نئی دریافتوں کے عادی ہو چکے ہیں اور مذہب پرانا ہوگیا ہے یا اس لیے کہ مذہبی پیشوا ہمیشہ مفکروں اور فلاسفروں کی مخالفت کرتے آئے ہیں ۔۔۔"

" لیکن مفکر باز تو نہیں آئے - یاد ہے گلیلیو کا قصہ - جب اُس نے اعلان کیا کہ زمین گھومتی ہے تو پادری لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئے ، اُسے بے حد ذلیل و خوار کیا ، پھر گرفتار کرکے زد و کوب کیا اور مجبور کیا کہ سب کے سامنے توبہ کرے - چنانچہ بھرے مجمعے میں گلیلیو نے توبہ کی اور دعا مانگی کہ خدایا اپنی غلط بیانی پر شرمندہ ہوں ، مجھ سے بڑا قصور ہؤا میرے حال پر رحم فرما اور معاف کر ۔۔۔ لیکن زمین گھومتی ضرور ہے ۔۔"

" اُس بے چارے نے تو خلوص سے کہا ہوگا ، بعد میں تو مذہب کا مذاق اڑانا فیشن بن گیا ، ایک مشہور فرانسیسی فلاسفر کا آخری وقت آیا تو اُسے کہا گیا کہ اب تو دعا مانگ لو - اُس نے دعا مانگی کہ اے خدا ۔۔ اگر واقعی خدا کہیں ہے ۔۔ میری روح کو بخش دے ۔۔ اگر روح واقعی ہوتی ہے تو ۔۔"

" فرانسیسیوں کی بات اور ہے ، ایک فرانسیسی پوپ شدید طور پر علیل ہؤا تو ڈاکٹر کو بلایا گیا - جب پوپ نے دیکھا کہ ڈاکٹر ٹیکہ لگانا چاہتا ہے تو اُس نے سوئی پکڑلی اور حاضرین سے کہا " حضرات! ۔۔۔ میں قدرتی موت مرنا چاہتا ہوں ۔۔۔"

" یہ تو اس نے سچ کہا تھا ، دلبر خوش ہو کر بولا " اُس کی جگہ میں ہوتا تو یہی کہتا ۔۔۔ لیکن ایسی باتیں گرجے میں نہیں کرنی چاہئیں ۔۔۔"

" یعنی گرجے کے اوپر نہیں کرنی چاہئیں ۔۔۔"

"بالکل ! چلو یہاں سے چلیں ۔۔۔"

ہم لنز جا رہے تھے ، ڈرائیور تھوڑی دور چل کر بس روک کر تقریر کرتا ۔۔۔ " اس

میدان میں آسٹریا نے فرانسیسیوں کے دانت کھٹے کر دیے — ان پہاڑیوں پر جرمنوں کو مار مار کو بھگا دیا — اس جنگل میں ہنگری والوں کو شکست فاش دی ۔ جگہ جگہ آسٹریا والوں کے کارنامے بیان کرتا اور وہ مقام دکھاتا جہاں انھیں فتح ہوئی تھی ۔

سامنے بیٹھا ہوا امریکن بے چین سا ہو رہا تھا ۔ ڈرائیور نے اس مرتبہ بس روکی تو امریکن سے نہ رہا گیا ۔ — " تو آسٹریا والوں کو ایک ایک میل پر فتح نصیب ہوئی؟" اس نے پوچھا ۔

" جی ہاں —"

" آج تک کسی سے نہیں ہارے ۔"

" نہیں —"

" کسی سے تو ہارے ہوں گے ۔ تاریخ پڑھا کرو ۔"

" میں دوبارہ کہتا ہوں کہ آسٹریا والے کسی سے نہیں ہارے اور جب تک میں یہ بس چلاتا رہوں گا وہ کسی سے نہیں ہاریں گے —" ڈرائیور نے نعرہ لگا کر مسافروں کی طرف فاتحانہ انداز سے دیکھا ۔

" بیچارہ حب الوطن معلوم ہوتا ہے —" امریکن بولا ۔

ہم ڈینیوب کے کنارے جا رہے تھے ۔

دلبر مجھے بتا رہا تھا کہ " یہ شاہی سڑک ہے ، اسی راستے سے پرانے بادشاہ ہر سال یوپریا جایا کرتے ، راستے میں نہ کوئی سرائے تھی نہ قیام گاہ ۔ بس محل تھے یا قلعے جن میں امراء بادشاہ اور اس کے رفقاء کی خاطر تواضع کیا کرتے ۔ امراء کو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا شوق تھا اس لیے بڑا سخت مقابلہ ہوتا —"

" یقیناً بادشاہ سال بھر اس سفر کا بے صبری سے انتظار کرتا ہوگا —"

واپسی سٹیمر سے ہوئی ۔ دلبر لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا اور میں پریوں کی کہانیوں والے قلعوں کو جن کے نوک دار مینارے درختوں سے ابھر کر بادلوں میں چھپ جاتے ۔ پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا ۔ جلدی سے ایک نیا موڑ آتا اس کے بعد لدی پھندی حسین وادی ، انگور کی بیلیں ، سرسبز پہاڑیوں پر درختوں کے حاشیے اور کوئی خوبصورت سا محل ۔ لاؤڈ سپیکر پر متواتر والز سنائی دے رہے تھے ۔

" یہ بتاؤ کہ جن دنوں ستراس والز پر والز لکھ رہا تھا ، اس کے ہم عصر براھمز اور برکنر حمد و ثنا میں کیوں مشغول تھے ۔ انھوں نے قدرت اور قدرت کے نظاروں پر نغمے کیوں لکھے ، انھیں شوخی اور چنچل پن پسند نہ تھا ؟"

" ستراس وی آنا میں رہتا تھا اور یہ دونوں شہر سے دور تھے ۔ یہ والز اس شہر نے لکھوائے ، وی آنا کے حسن و جمال اور رنگینیوں کا اندازہ ستراس کی موسیقی سے کیا جا سکتا ہے —"

دلبر پھر لڑکیوں کو دیکھنے لگا ۔

دو موڑ گزر چکے تو میں نے آواز دی ۔

" ایں —!" اس نے چونک کر کہا ۔

" باز نہ آنا ۔ گھورتے رہنا لڑکیوں کو ۔ پھر منگیتر کی شکایتیں کرتے ہو —"

" اس وقت وہ یہاں کہاں ہے —" وہ پھر محو ہو گیا ۔

وی آنا پہنچے تو اس نے بتایا — " ان لڑکیوں کو کیزانووا بار میں مدعو کیا ہے ۔"

یورپ میں جہاں کہیں آوٹ پٹانگ حرکتیں ہونے کا امکان ہو — مثلاً قمار خانے ، مے خانے ، وہ ناچ گھر جہاں ترقی پسند رقص ہوتے ہوں ، الغرض جہاں بھی خرمستیاں ہوتی ہوں اس جگہ کو غریب کیزانووا کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ بد اچھا بد نام برا ۔

" یہ تو کئی ہیں ۔ ان سب کا کیا کرو گے ؟" میں نے پوچھا ۔

" تم یہاں کی لڑکیوں کو نہیں جانتے۔ ان سب میں سے بہ مشکل ایک یا دو پہنچیں گی ، باقی ماندہ بھول جائیں گی یا ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی یا انہیں کسی اور سے کیا ہوا وعدہ یاد آ جائے گا ۔"

" ریوڑ کو بلاؤ گے تو یہی ہوگا ۔ فقط منگیتر کو بلایا کرو ۔"

" وہ بحث بہت کرتی ہے ۔ شکر ہے کہ آج وہ سالز برگ گئی ہوئی ہے ۔"

گیارہ بجے کے قریب کیزانووا بار میں دلبر آؤٹ ہو گیا ، اسے ٹیکسی میں سوار کر کے میں باہر نکلا ، شہر میں رونق تھی لیکن مضافات میں سڑکیں سنسان ہوتی جا رہی تھیں ، کبھی کوئی موٹر گزر جاتی یا اکا دکا آدمی مل جاتا ورنہ مکمل خاموشی تھی ۔ پہاڑیوں پر دھند اتر رہی تھی ، ایک بادل سا نیچے آتا اور آسمان کے تارے دھندلے ہو جاتے ، پھر سب کچھ صاف ہو جاتا ۔

آہستہ آہستہ دھند گہری ہو کر اونچے درختوں کی چوٹیوں پر رک گئی ۔ پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی اوپر جا رہی تھی ، ایک جگہ میدان آیا ، میں نے نیچے دیکھا تو وہاں ڈینیوب بہہ رہا تھا ۔ دور شہر کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں ۔ یورپ کے شہروں پر رات کو جب ہلکی سی دھند چھا جاتی ہے تو زمین کی روشنیوں سے آسمان پر اجلا سا گنبد بن جاتا ہے ۔

ایک بوند گری، پھر دوسری ، ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی ۔ جنگل میں جھینگر بولنے لگے ، بارش کی آمد پر جھاڑیوں اور درختوں کی مخلوق جاگ اٹھی ۔ بوندوں کی دھیمی سی صدا ، پتوں اور ٹہنیوں سے گزرتی ہوئی ہوا کی آواز — جیسے سمفنی سے پہلے آرکسٹرا کے ساز ہم آہنگ کیے جا رہے ہوں ۔ اور پھر وی آنا کے عظیم نغمہ نگاروں کی دھنیں کانوں میں گونجنے لگیں ۔

بجلی چمکی اور لمحے بھر کے لیے شہر آنکھوں کے سامنے آ گیا ، رات کی تاریکی میں لپٹا ہوا یہ شہر ، دنیا اس شہر کی ممنون ہے ، موسیقار یہاں زیارت کے لیے آتے ہیں ، ان کے اور موسیقی کے مداحوں کے لیے وی آنا اور قرب و جوار کا چپہ چپہ مقدس ہے، جہاں ان عظیم فن کاروں کے قدم چھوئے تھے ۔ ان ہی پہاڑیوں میں ، اسی دریا کے کنارے ، اسی ماحول میں انہوں نے ایسے نغمے تخلیق کیے جو تب تک زندہ رہیں گے جب تک انسان زندہ ہے ۔

انہیں زندگی سے کچھ بھی نہیں ملا ، ان کی تخلیقات اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے تھیں ۔ وہ کون سا جذبہ تھا ؟ ماحول کی ظلمت سے وہ کون سی کرن پھوٹی جس نے روح کے نہاں خانوں کو نور سے بھر دیا ۔ ان دھنوں کو عالی شان تھیٹروں میں سنا جائے یا جھونپڑیوں اور ویرانوں میں ، انسان کچھ دیر کے لیے بھول جاتا ہے کہ وہ ان کروڑوں مجبور اور غمگین انسانوں میں سے ایک ہے جنہیں اس کرّے پر زندگی کے چالیس پچاس سال گزارنے کے لیے بھیجا گیا ہے ۔ احساس غم چلا جاتا ہے اور دل نوزائیدہ امیدوں اور امنگوں سے معمور ہو جاتا ہے ۔ دل سے نکلا ہوا پیغام ہمیشہ دل میں اترتا ہے ، یہ موسیقی ملکوں اور قوموں کی قید سے آزاد ہے ۔

ان چند فن کاروں نے کتنے انسانوں کو مسرتیں بخشی ہیں ، لیکن یہ خود جب تک جئے گمنام رہے ۔ دنیا میں بے شمار ہستیوں نے فوری شہرت حاصل کی ہے — چنگیز نے انسانی سروں کے مینار بنوا کر ، سیزر بورجیا نے اپنی ضیافتوں میں ہزاروں بے گناہوں کو زہر دے کر، ایک ارسطریوطس نے آرٹیمیس کا شہرہ آفاق مندر جلا دیا، جو آرٹ کا شاہکار تھا ۔ اس سے وجہ پوچھی گئی تو بولا — " میں شہرت کا طالب تھا ، اب تک مجھے کوئی نہیں جانتا تھا اب رہتی دنیا تک میرے تذکرے ہوا کریں گے ۔"

ان میں سے بیشتر نغمہ نگاروں نے غربت میں دن کاٹے ، کچھ جوانی میں مر گئے۔ براھمز ،

هیڈن — جوانا مرگ شوبرٹ اور موزارٹ اور محزون و ملول بیتھوون جوآخری دنوں میں مکمل بہرے پن کی وجہ سے دنیا میں تن تنہا رہ گیا لیکن اپنے دکھ درد کے باوجود نغمے لکھتا رہا ۔

شہر کی روشنیاں چھپ چکی تھیں ، بجلی چمکتی تو حد افق پر ایک لمحے کے لیے شہر کوند جاتا ، پھر تاریکی چھا جاتی ۔

نیچے ڈینیوب بہہ رہا تھا — نیلا ڈینیوب — اسی والز نے میرا تعارف مغربی موسیقی سے کرایا تھا ۔ کئی سال پہلے تپتے ہوئے ریگستان میں میں نے پہلی بار یہ دھن سنی یہ نغمہ زمین سے آسمان تک پھیل گیا ، ویرانے میں بہار آ گئی ، نیلگوں لہریں ابھرنے لگیں ، کناروں پر سبزہ لہلہانے لگا ، غنچے چٹکے ، پھول مہکے ، تتلیاں آگئیں اور سب کچھ رنگین ہوگیا ۔

اب یہ ڈینیوب میرے قدموں تلے بہہ رہا تھا ۔ اور اتنا ہی پرفسوں اور حسین معلوم ہو رہا تھا جتنا برسوں پہلے نغمہ سن کر محسوس ہؤا تھا ۔

میں نے اسے جرمنی میں دیکھا تھا ایک پتلی سی ندی کے روپ میں ، پھر بلگراڈ میں دیکھا ، جہاں سفید پہاڑ کے اجلے محل کے سامنے اس نے نیلے رنگ کی جھیل بنا رکھی تھی ۔ ہوائی جہاز سے اسے کئی جگہ دیکھا — چٹانوں میں ، کنجوں میں ، جنگلوں میں ، آبادیوں کے ساتھ ساتھ — بل کھاتا ہؤا — کہیں قوس کی صورت کہیں لہریے کی شکل —

اور اس وقت یہ اپنے مخصوص شہر وی آنا کو چھو رہا تھا ۔

علی الصبح دلبر مجھے سٹیشن پر چھوڑنے آیا ۔ وادیاں ، جنگل ، عمارتیں ، سب دھندلے دکھائی دے رہے تھے ، دریا پر دھند چھائی ہوئی تھی ۔

دلبر خاموش تھا شاید وہ سوچ رہا تھا کہ ڈینیوب کے کناروں پر کیا کچھ نہیں ہے ، خوش نما نظارے ، گزشتہ عظمت کی یادگاریں ، حسن ، خوشبوئیں ، موسیقی ، — لیکن ان سب کے باوجود ایک عجیب سی مایوسی مسلط ہے ۔

صبح شام دریا سے جو دھند پھیلتی ہے یہ علاقے جیسے اس دھند میں ملفوف رہتے ہیں نہ یہاں زمانۂ حاضرہ کی ایجادیں ہیں نہ وہ حوصلے اور ولولے جو صرف مغربی قوموں کا حصہ ہیں ۔

" کبھی یہ دھند چھنٹے گی ؟ " اس نے بے خبری میں پوچھا —

ٹرین میں سامان رکھواتے ہوئے اس نے چیزیں گنیں — " یہ تمہارا صندوق ہے ، یہ کیمرہ ، برساتی ، دوربین — اور اس پیکٹ کو دوپہر کو کھولنا — اس میں تمہارا لنچ ہے —"

" وی آنا کا لنچ ہے ٹھنڈا ہو جائے گا —" میں نے کہا ۔

وہ ہنسنے لگا ۔

" اچھا اب کب اور کہاں ملو گے — ؟ "

" کسی دریا یا سمندر کے کنارے سڑک پر مل جائیں گے —"

" دوست تم یاد آؤ گے —" اس نے میرا بازو دبایا ۔

ٹرین چل دی اور آہستہ آہستہ دلبر کا چہرہ اوجھل ہوگیا ۔

(زیر طبع کتاب « چار دریا » میں سے)

تو ابھی رہ گزر میں ہے .... قدرت اللہ شہاب

سعودی عرب کا نام سن کر امریکن ایکسپریس کا منیجر کچھ سوچ میں پڑ گیا ۔

ہالینڈ کے دارالخلافہ 'دی ہیگ' میں سفری انتظامات کرنے والے جتنے ادارے تھے ان میں امریکن ایکسپریس کا کام سب سے زیادہ وسیع اور قابل اعتماد سمجھا جاتا تھا ۔ یہاں ہر وقت ایسے سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا تھا جو کم سے کم وقت میں لمبے سے لمبا سفر کرنے کے خواہش مند تھے ۔ یہ سفر عموماً دنیا کی جانی پہچانی شاہراہوں پر ہوتے تھے اور ان سیاحتوں کے سنگ ہائے میل نیویارک ، لندن، پیرس ، جنیوا ، روم جیسے شہروں میں ہؤا کرتے تھے ۔ اس قسم کا سفر کس قدر طویل اور کس قدر پیچیدہ ہی کیوں نہ ہو ، امریکن ایکسپریس کے بحری ، بری اور ہوائی شعبوں کے ماہرین دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ساری تفصیلات تیار کر دیتے تھے---- ریل اور جہاز کے ٹکٹ ، چلنے اور ٹھہرنے کے اوقات نامے ، ہوٹلوں کے پتے اور کرائے ، ملازموں کو بخشش دینے کے آداب ، قابل دید مقامات کی تفصیلیں ، رقص گاہوں اور نائٹ کلبوں کے ٹیلیفون نمبر .....

امریکن ایکسپریس کے ہال میں پہنچ کر سب سے پہلے میرا سامنا انکوائری آفس کی ایک لڑکی سے ہؤا ۔ اس نے خالص ڈچ انداز میں اپنی گردن کو لوچ دے کر امریکن لہجے میں میرا استقبال کیا "گڈمارننگ ، سر ۔ کیا میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتی ہوں ؟"

"شکریہ ۔" میں نے کہا " میں سعودی عرب جانا چاہتا ہوں ۔ اس سفر کے متعلق مجھے آپ کے کس شعبہ سے معلومات حاصل ہو سکیں گی ؟"

" ساعودی عربے ی آ .... سا عو عو عودی عبربے ی ... ی... یا ... یا ..."

لڑکی نے کئی بار زیر لب گنگنایا ، اور پھر اپنے ڈچ شانوں کو امریکن انداز میں سکیڑ کر میری طرف یوں حیرت سے دیکھنے لگی جیسے میں نے اس سے چاند کی سیاحت کے بارے میں کوئی سوال پوچھ لیا ہے !

کچھ دیر اور گنگنانے اور کندھوں کو نیم بیضوی جنبش دینے کے بعد آخر وہ مجھے اپنے ہوائی شعبے کے ماہر کے پاس لے گئی ۔ سعودی عرب کا نام سن کر ہوائی شعبے کے ماہر نے بھی مجھے کن انکھیوں سے گھورا ، پھر نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ مجھے بحری شعبے کے حوالے کر دیا ۔ بحری شعبے والے نے مجھے بری محکمہ میں بھیج دیا ۔ اور بری شعبے کا ماہر کچھ دیر اپنا سر کھجلانے کے بعد مجھے اپنے منیجر کے پاس لے گیا ۔

سعودی عرب کا نام سن کر منیجر بھی کچھ سوچ میں پڑ گیا ۔ پہلے اس نے اپنے میز کی دراز سے اٹلس نکال کر مشرق وسطیٰ کے نقشوں کا مطالعہ کیا ۔ پھر اٹھ کر سامنے والی دیوار پر لٹکے ہوئے چارٹ کا جائزہ لینے لگا جس میں ساری دنیا کے بحری ، بری اور ہوائی راستوں کے مفصل خاکے بنے ہوئے تھے ۔ میں نے اس نقشے میں جدہ ، مکہ ، مدینہ پر انگلی رکھ کے منیجر سے کہا ، کہ اگر میں ان تین شہروں میں سے کسی ایک جگہ بھی پہنچ جاؤں تو میرا مقصد پورا ہو جائے گا ۔

منیجر نے اپنی سرخ جھنڈیوں والے پن اٹھا کر ان مقامات پر نشان دہی کے طور پر لگا دیے ۔

دنیا بھر میں مشرق سے مغرب ، شمال سے جنوب تک ہر قسم کے سفری راستوں کے بے شمار جال بچھے ہوئے ہیں ۔ لیکن یہ شاہراہیں بغداد اور بصرہ ، دمشق اور بیروت ، قاہرہ اور پورٹ سے ہوتی ہوئی آگے یا پیچھے ، دائیں یا بائیں نکل جاتی ہیں ۔ ان کے درمیان حجاز کی مقدس سر زمین ایک غیر مرئی جزیرے کی طرح الگ تھلگ پڑی رہ جاتی ہے ۔ مکہ معظمہ اور

مدینہ منورہ کے نام مسلمانوں کے دلوں پر تو بے شک خوب نقش ہیں ، لیکن کسی بین الاقوامی سفری گائیڈ میں ابھی تک ان کا ذکر نہیں آتا -- حالانکہ ہر سال دنیا کے ہر کونے سے لاکھوں مسلمان قافلہ در قافلہ اس ارض مقدس کا سفر اختیار کرتے ہیں -- پیدل ، اونٹوں پر ، موٹروں پر ، ریلوں پر ، کشتیوں میں ، ہوائی جہازوں کے ذریعے سے ۔ .... روئے زمین پر اور کوئی ایسا مقام نہیں ہے جہاں اتنی رنگوں اور قومیتوں کے انسان بیک وقت اس کثیر تعداد میں جمع ہوتے ہوں ۔

" مجھے اپنی لاعلمی پر ندامت ہے ۔" امریکن ایکسپریس کے منیجر نے نقشوں کا سرسری جائزہ ختم کر کے کہا " لیکن اگر آپ مجھے دو روز کا وقت دیں تو شاید میں آپ کو اس سفر کے متعلق کوئی مفید مشورہ دے سکوں ۔"

دو روز کے بعد جب میں دوبارہ امریکن ایکسپریس کے دفتر گیا تو منیجر کے سامنے بہت سے سفری گائیڈوں کا انبار لگا ہوا تھا ۔ ایک سفید کاغذ پر نیلی اور سرخ پنسل سے سعودی عرب اور اس کے اہم شہروں کا خاکہ بنا ہوا تھا ۔ منیجر نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے متعلق کچھ دلچسپ اقتباسات بھی نقل کر رکھے تھے ۔ لیکن اس ساری کاوش کا عملی نتیجہ فقط اس قدر تھا کہ یورپ کا یہ وسیع اور ماہر سفری ادارہ مجھے یہ بتانے سے قاصر تھا کہ میں قاہرہ یا بیروت یا بغداد سے جدہ یا مکہ یا مدینہ کس طرح پہنچ سکتا ہوں ۔

" اس سلسلے میں ہماری معلومات بہت ناقص ہیں ۔" منیجر نے معذرت کے انداز میں کہا " ہاں ، حج کے زمانے میں کئی حکومتیں اپنے اپنے حاجیوں کے لیے ہوائی جہازوں ، سمندری جہازوں اور خشکی کے قافلوں کا خاص انتظام کرتی ہیں ۔ یہ انتظامات ہر جگہ سرکاری طور پر ہوتے ہیں ، ہمیں ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی ۔"

برسبیل تذکرہ منیجر صاحب نے مشفقانہ طور پر مجھے ایک اور مشورہ بھی دیا ۔ انھوں نے اپنے بک شیلف سے ایک خستہ جلد والی کتاب نکال کر مجھے دکھائی ۔ یہ ایک ڈچ پروفیسر کی کتاب ' زیارت مکہ ' تھی جو ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی تھی ۔ پروفیسر صاحب عربی زبان کے بلند پایہ عالم تھے اور پندرہ برس تک لائیڈن یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کے صدر رہ چکے تھے۔ انہیں بے حد شوق تھا کہ وہ خود عربوں کے درمیان رہ سہہ کے عربی زبان سیکھیں ۔ چنانچہ وہ جدہ میں ڈچ قونصل کے ہاں ملازم ہو گئے اور بھیس بدل کر چوری چھپے مکہ معظمہ میں داخل ہو گئے ۔ یہاں پر کوئی ساڑھے پانچ ماہ وہ عبدالغفار کے فرضی نام سے رہے ، اور واپسی پر انھوں نے اپنی کتاب ' زیارت مکہ ' تصنیف کی ۔

" میں پچھلے دو روز سے اس دلچسپ کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوں ۔" منیجر نے کتاب کے بوسیدہ اوراق الٹ پلٹ کر کہا " میں سمجھتا ہوں کہ اس سفر میں ہر قدم پر آپ کی جان اور صحت کو سخت خطرات ہیں ۔ اگر آپ میری مانیں تو سعودی عرب جانے کا ارادہ بدل ڈالیں ۔ حسن اتفاق سے میرے پاس کیپری کی ایک بکنگ خالی ہے ۔ کیپری سے تو آپ خوب واقف ہوں گے ؟ نیلے نیلے بحیرۂ روم کے درمیان وہ خوشنما جزیرہ جہاں چمکیلی دھوپ ہے ، خوبصورت سیرگاہیں ہیں ، اطالیہ کے انگوروں کی بہترین شراب ہے ، مصر کا سابق شاہ فاروق ہے ۔ دراصل کیپری آج کل ساری دنیا کے سیاحوں کا مکہ ہے ۔ اگر آپ زندگی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو میری رائے میں کیپری ضرور جائیے ۔"

میں نے ہنس کر آپ سے یہ شعر سنایا :

اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی   میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں !

" یہ آپ کی اپنی زبان ہے ؟" منیجر نے پوچھا ۔

میں نے اُسے انگریزی میں اس شعر کا مفہوم سمجھایا ۔

منیجر کسی قدر مایوسی سے سر ہلانے لگا " مشرق آخر مشرق ہے ۔ ہم مغرب والے آپ کو کبھی نہیں سمجھ سکتے ۔"

مجھے منیجر کی مایوسی پر کچھ کچھ افسوس ہونے لگا ۔ اس غریب نے میرے لیے دو تین روز کافی محنت کی تھی ۔ سعودی عرب کے 'متعلق' اس کی معلومات میں قدرے خوشگوار اضافہ کرنے کی غرض سے میں نے اُسے بتایا کہ جان اور مال اور صحت کے خطرات کے علاوہ اس ملک میں تیل کے چشمے بھی ہیں ، اور آج کل ان چشموں کا ٹھیکہ ایک امریکن کمپنی کے پاس ہے ۔

لیکن منیجر بدستور مایوسی سے اپنا سر ہلاتا رہا " مشرق میں جہاں کہیں تیل نکلتا ہے وہاں ایک نہ ایک روز کوئی 'مصدق' بھی پیدا ہو کے رہتا ہے ۔ ہم مغرب والوں کا زمانہ لد گیا ۔ اب مشرق کی باری ہے ۔ انڈونیشیا میں سوکارنو ، عطا اور شہریار ، ہندوستان میں گاندھی ، پاکستان میں جناح ، مصر میں نجیب اور ناصر ...."

اگر کوئی پڑھا لکھا ڈچ مشرق اور مغرب کی سیاست پر غور کرنے اتر آئے تو وہ زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہوجاتا ہے ! منیجر کے سارے آثار بتا رہے تھے کہ اب اُسے بھی یہی دورہ پڑنے والا ہے ۔ مجھے یقین تھا کہ منیجر سارا دن مجھے اپنے پاس اسی کمرے میں بٹھائے رکھے گا ، پنیر اور ڈبل روٹی کا لنچ کھلائے گا ، ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد کافی پلائے گا ، شام کے پانچ بجے جب دفتر بند ہوگا تو مجھے اپنے ساتھ قریب کے کسی ریستوران میں لے جائے گا پھر نہ معلوم رات کے کس وقت تک گفتگو کا یہ لامتناہی سلسلہ جاری رہے ۔ جب موضوع مشرق اور مغرب ہو تو کسی ڈچ کے لیے اس کا مطلب محض انڈونیشیا اور ہالینڈ ہوتا ہے ! ہالینڈ نے انڈونیشیا میں کیا کیا خوبیاں اور کیا کیا خرابیاں پیدا کیں ؟ ہالینڈ اور انڈونیشیا کے تعلقات کب بگڑے ؟ کیوں بگڑے ؟ کس نے بگاڑے ....

لیکن خوش قسمتی سے یہ آئی ہوئی بلا انکوائری گرل کی برکت سے ٹل گئی ۔ اُس نے اندر آ کر درجن ڈیڑھ درجن لوگوں کی فہرست منیجر کے سامنے رکھ دی جو کسی نہ کسی سلسلے میں آج ہی اُس سے ملاقات کرنے والے تھے ۔ موقع غنیمت جان کر میں منیجر اور انکوائری گرل دونوں کا شکریہ ادا کرتا ہوا وہاں سے نکل بھاگا ۔

جس مشکل کو لے کر میں امریکن ایکسپریس کے دفتر میں داخل ہوا تھا وہ مشکل بدستور ایک سوالیہ نشان کی طرح میرے سامنے موجود تھی ۔ ساری دنیا کے ہوائی اور سمندری اور خشکی کے راستوں پر ایک بھی ایسا ذریعہ نظر نہ آتا تھا جو مجھے حجاز پہنچا سکتا ۔ اپنی اس مجبوری کے سامنے مجھے رہ رہ کے مراکش کا وہ بلند ہمت نوجوان یاد آتا تھا جو شادی کے فوراً بعد اپنی دلہن کو لے کر حج پر روانہ ہوگیا تھا ۔ منزل بہ منزل ، پا پیادہ چلتے چلتے جب یہ میاں بیوی مدینہ منورہ پہنچے تو ان کی گود میں تین بچے تھے !

اس سفر کے متعلق بیروت ، دمشق اور بغداد سے بھی سفری ایجنسیوں اور سفارت خانوں کی وساطت سے جو خبریں موصول ہوئیں وہ بے حد مایوس کن تھیں ۔ ہاں قاہرہ سے اُمید کی ایک مدھم سی کرن ضرور جھلملائی ۔ مصر کی انقلابی حکومت نے یہ انتظام کیا تھا کہ حج سے پہلے تین چار ہفتوں میں ہر دوسرے روز بحری اور ہوائی جہاز مصر سے حجاز جایا کریں گے۔ یہ جہاز مصری حاجیوں کے لیے مخصوص تھے ۔ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ ان جہازوں میں کسی پاکستانی مسافر کے لئے بھی جگہ نکل سکے گی یا نہیں ۔ بہر حال یہ خبر اس لحاظ سے اطمینان بخش تھی کہ آخر ایک راہ تو ایسی نظر آئی جس کے لیے انسان کچھ دوڑ دھوپ کر سکتا ہے ۔ باقی سب راہیں یا تو مسدود تھیں یا اُن پر خاموشی اور لاعلمی کے گہرے

کھرائے چھائے ہوئے تھے۔

جب میں نے مصر والی خبر اپنے ایک لبنانی دوست مصطفیٰ الفخری کو سنائی تو اُس نے مایوسی سے سر ہلایا "تم جا کر کوشش کر دیکھو۔ مجھے تو ہرگز اُمید نہیں کہ تمہیں کامیابی ہو۔"

پھر امریکن ایکسپریس کے منیجر کی طرح مصطفیٰ الفخری نے بھی مجھے ایک مفید مشورہ دیا "اگر قاہرہ پہنچ کر بھی تم ناکام رہو تو سیدھے بیروت چلے آنا۔ وہاں میرے بہت سے دوست احباب ہیں۔ وہ تمہیں خوب سیر کرا دیں گے۔ بیروت مشرق وسطیٰ کا پیرس ہے۔ وہاں کے نائٹ کلب یورپ کی نشاط گاہوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آج کل سمیعہ جمال بھی وہاں آئی ہوئی ہے۔ وہ مصر کے سابق شاہ فاروق کی محبوب رقاصہ تھی۔"

مصر کے سابق شاہ فاروق کے ساتھ اب مجھے ایک قسم کی ذاتی رنجش پیدا ہونے لگی تھی۔ حجاز کے لیے میں جو راستہ بھی نکالتا تھا، اس پر وہ الف لیلیٰ کے جادوگر بادشاہوں کی طرح کسی نہ کسی صورت میں نمودار ہو کے رہتا تھا۔ کیپری میں وہ خود بہ نفس نفیس موجود تھا۔ بیروت میں اُس کی محبوب رقاصہ تھی ....

پیرس پہنچ کر خیال آیا، چلو پاکستان اور سعودی عرب کے سفارت خانوں سے سفر حج کے متعلق کوئی ہدایات یا اطلاعات ہی حاصل کرتا چلوں۔ لیکن پیرس کی زندگی جن ٹیڑھے ترچھے خطوط پر چلتی ہے اُس نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا۔ فرانسیسی باشندوں کی بات تو دوسری ہے، لیکن پیرس میں رہنے والے باہر کے لوگ عموماً گیارہ بجے کے قریب سو کر اُٹھتے ہیں۔ بارہ بجے تک ناشتے سے فارغ ہو کر دفتر جاتے ہیں۔ ڈیڑھ بجے سے لنچ کا وقفہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد قیلولہ حفظانِ صحت کے عین مطابق ہے۔ تین ساڑھے تین بجے دفتر پھر کھلتے ہیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ باقی رہے سہے اوقات لازماً عصر کی نماز کے ساتھ ٹکرانے ہوں گے۔ چنانچہ مجھے کسی اسلامی مملکت کے سفارت خانہ تک جانے کی ہمت نہ ہو سکی۔

لیکن یہ کمی نیپلز پہنچ کر پوری ہو گئی۔ نیپلز میں مجھے حج اور اسلام کے متعلق کچھ ایسے راز معلوم ہوئے جو اربابِ بصیرت کے لیے بے حد سبق آموز ہیں۔

نیپلز کے ہوٹل 'ٹرسینس' کے ڈائننگ روم میں ایک مشکل یہ پیش آئی کہ جو ملازمہ میری میز پر مامور تھی وہ انگریزی زبان سے قطعی ناآشنا تھی۔ کھانے کا مینو اطالوی زبان میں چھپا ہوا تھا اور میری سمجھ سے بالکل بالا تھا۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ کھانے کے انتخاب کے متعلق کسی طرح ملازمہ پر اپنا مفہوم واضح کر سکوں لیکن وہ ہر بار اپنی گردن مٹکا کر اور شانے سکیڑ کر مسکرا دیتی تھی۔ میری کس مپرسی بھانپ کر قریب والی میز سے ایک نوجوان اُٹھ کر آیا اور نہایت شستہ انگریزی میں بولا "کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

"شکریہ۔" میں نے کہا "میں ملازمہ کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ وہ میرے لیے گوشت یا شراب نہ لائے۔ اگر مچھلی یا انڈے موجود ہوں تو وہ لے آئے لیکن وہ سؤر کی چربی میں تلے ہوئے نہ ہوں۔"

ملازمہ آرڈر لے کر چلی گئی تو نوجوان نے مجھ سے پوچھا "کیا آپ ہندوستان کے رہنے والے ہیں؟"

"جی نہیں، میں پاکستانی ہوں۔"

"الحمدللہ۔" نوجوان نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "میں شام کا رہنے والا ہوں۔ آئیے آپ ہماری میز پر آ جائیے۔ میں آپ کو اپنی منگیتر سے ملاؤں گا۔ ہم دونوں کو پاکستان سے بڑی دلچسپی ہے۔"

اپنی میز پر پہنچ کر وہ شامی نوجوان خالص مغربی انداز سے تعارف کی رسوم ادا کرنے میں مشغول ہوگیا '' میرا نام رشید مومن ہے ۔ یہ میری منگیتر نزھیہ ہے ۔ ہم دونوں دمشق کے رہنے والے ہیں ۔ روم میں فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔ آج کل نیپلز آئے ہوئے ہیں تاکہ پومپیائی کے کھنڈروں کا مطالعہ کر سکیں ۔''

پھر اس نے نزھیہ سے میرا تعارف کرایا '' آپ پاکستانی ہیں ۔ الحمدللہ ۔ ہمیں پاکستان سے بڑی محبت ہے ۔ ہے نا نزھیہ ؟ آپ گوشت نہیں کھاتے ۔ شراب نہیں پیتے ۔ انڈوں اور مچھلی سے بھی بھاگتے ہیں ، اگر وہ چربی میں تلے ہوئے ہوں تو ۔ غالباً سگرٹوں سے بھی پرہیز ہوگا ۔ معلوم نہیں نزھیہ ایسے لوگ یورپ آ کر کیا کرتے ہیں ؟ '' رشید مومن نے ھنس کر کہا ۔

'' معلوم ہوتا ہے آپ میں کوئی کمزوری نہیں ہے ۔'' نزھیہ نے اخلاقاً کہا ۔

'' جی ہاں ۔'' میں نے مذاقاً جواب دیا '' چھوٹی موٹی کمزوری تو کوئی نہیں ! ''

رشید مومن نے زور کا قہقہہ لگایا ۔ نزھیہ کچھ جھینپ سی گئی ۔

'' واللہ نزھیہ ، جب تم شرماتی ہو تو تمہارے گال اس شراب کی طرح عنابی ہو جاتے ہیں ۔'' رشید مومن نے ریڈ وائن کا گلاس اٹھا کر کہا ۔ پھر انہوں نے اپنے اپنے جام بلند کئے اور بڑی گرم جوشی کے ساتھ پاکستان کا جام صحت پیا ۔

جواباً میں نے پانی کا گلاس اٹھایا اور کہا '' آپ دونوں کی محبت کا جام صحت ! میری دعا ہے کہ آپ کی محبت اس پانی کی طرح پاکیزہ اور اس شراب کی طرح تند رہے !''

کچھ دیر اسی قسم کی پر لطف باتیں ہوتی رہیں ۔ رشید مومن کی باتوں میں نہایت سلجھا ہوا مزاح تھا ۔ نزھیہ کا معصوم خلوص بڑا دلآویز تھا ۔ رفتہ رفتہ گفتگو کا رخ میرے سفر حجاز کی طرف پھر گیا ۔ اگرچہ اس وقت تک رشید مومن اور نزھیہ سرخ اطالوی شراب کی تین بوتلیں ختم کرچکے تھے اور ان کی آنکھوں میں سرور کی لطیف سی غنودگی بھی اتر آئی تھی لیکن حجاز کا ذکر سن کر وہ دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے ۔

'' آپ حجاز جا رہے ہیں ؟ آپ بڑے خوش نصیب ہیں ۔ واللہ آپ بہت ھی خوش نصیب ہیں ۔'' نزھیہ نے نہایت جوش سے کہا ۔ اب اس کی آنکھوں میں عقیدت کی ایسی چمک ، ایسا کیف جھلک آیا تھا جو سرخ اطالوی شراب کے نشے سے کہیں زیادہ گہرا اور خوش نما تھا ۔

'' آپ نزھیہ کی باتوں میں نہ آئیں ۔'' رشید مومن نے کسی قدر درشتی سے کہا '' سب جوان لڑکیاں وہمی اور زود اعتقاد ہوتی ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ حجاز پہنچ کر آپ بہت پشیمان ہوں گے ۔''

'' خدا کے لیے رشید ایسی باتیں نہ کرو ۔'' نزھیہ نے احتجاج کیا ۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی '' اگر تم ایسی باتیں کرو گے تو میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گی ۔ واللہ کبھی معاف نہ کروں گی ۔''

'' میرا تجربہ ہے کہ نزھیہ کا غصہ ہمیشہ عارضی ہوتا ہے !'' رشید مومن نے بے پروائی سے کہا '' میرا انسانی فرض ہے کہ میں اس کی وقتی خفگی گوارا کرلوں ، لیکن حجاز کے متعلق آپ کو کسی قسم کی گمراہی میں مبتلا نہ رہنے دوں ۔''

اپنے اس فرض منصبی کی ادائی میں رشید مومن نے حجاز اور حج پر ایک فصیح و بلیغ تقریر کا آغاز کیا ۔ ۔۔۔۔ حجاز رہزنوں ، مکھیوں ، مچھروں اور غلاظت کی سر زمین ہے ۔ حج ایک بین الاقوامی بلیک مارکیٹ ہے جس میں سونا اور کھجوریں اور مذھبی عقائد برسر عام نیلام ہوتے ہیں ۔ توہم پرستی کے زہریلے جراثیم اس فضا میں پرورش پاتے ہیں ۔ وہاں کے باشندے درندگی اور سخت گیری کا مجسمہ ہیں ۔ حاجیوں کے ساتھ وہ کتوں سے بھی برا برتاؤ کرتے ہیں ۔ صفائی کا کہیں بھی کوئی انتظام نہیں ۔ سڑکوں پر ، گلی کوچوں میں ، مکانوں

اور دکانوں کے سامنے ، مسجدوں کے وضو خانوں میں دن رات پیشاب اور پاخانہ ہوتا ہے ۔ عورتیں اور مرد بے حیائی سے برسر عام حوائج ضروری سے فارغ ہوتے ہیں ۔ نہانا تو برطرف ، ہاتھ منہ تک دھونے کے لیے پانی نہیں ملتا ۔ ہر سال لاکھوں انسانوں کی غلاظت رس رس کر آس پاس کے کنوؤں میں جمع ہوتی رہتی ہے ، اور یہ غلیظ پانی مسلمان بڑے شوق سے پیتے ہیں ، اپنے چہروں پر ملتے ہیں ، اور بوتلوں اور کپوں میں بھر کے تبرکاً اپنے ساتھ لے جاتے ہیں ۔ جب آپ احرام باندھ لیں گے تو آپ پر یہ فرض عائد ہوجائے گا کہ اپنے بدن کی ساری گندگی کو بڑھ چڑھ کے نمایاں کریں ۔ بال کاٹنا ، شیو کرنا ، ناخن تراشنا گناہ ہے ۔ دانتوں پر برش کرنے کی ممانعت ہے ۔ میل کچیل دور کرنے کی نیت سے نہانا بھی خلاف شرع ہے ۔ پھر اس کثیف اور غلیظ ہیئت کذائی میں یکایک مجبور کیا جائے گا کہ آپ سر کے بال منڈا ڈالیں ۔ اس عمل کے بعد جو مضحکہ خیز صورتیں برآمد ہوتی ہیں ، انہیں اچھا مسلمان تسلیم کیا جاتا ہے ۔ ان کے اجسام پسینے اور میل کی بدبو سے متعفن ہوتے ہیں ، لیکن ان کی روحیں پاک ہو جاتی ہیں ۔ لاحول ولا قوۃ ۔ اگر یہ اسلام ہے ، تو........

رشید مومن بڑے جوش و خروش سے اسلام پر تبصرہ کرتا رہا اور نزہیہ اس کے سامنے ایک زخم خوردہ ناگن کی طرح بیٹھی بل کھاتی رہی ۔ وہ بار بار اپنے گلاس کو غصے سے چھلکاتی تھی ۔ کبھی بوتلیں اٹھا اٹھا کر زور سے میز پر مارتی تھی ۔ کبھی نیپکن کو اپنی کلائی کے گرد یوں بھینچ کر لپیٹتی تھی کہ اس کی مرمریں باہوں میں خون کی رگیں ابھر کر بڑی حدت کے ساتھ کپکپانے لگتی تھیں ۔ نزہیہ کی آنکھوں سے ڈر لگتا تھا کہ شاید ابھی ان سے آگ کے شعلے لپک پڑیں گے ۔ اس کے چہرے کے آثار بتا رہے تھے کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اس کے دہن سے زہر کے فوارے پھوٹ بہیں گے ۔ ہماری میز پر ایک تلخ سا تناؤ چھا رہا تھا ۔ گفتگو کا رخ بدلنے کے لیے میں نے آرکسٹرا کی تعریف شروع کر دی ، جو رمبا ڈانس کی سریلی دھنیں بجا رہا تھا ۔

” بے شک آرکسٹرا بڑی حسین موسیقی بجا رہا ہے ۔“ رشید مومن نے گویا چونک کر کہا ” تم دونوں یہاں بیٹھ کر خدا اور رسول کی باتیں کرو ۔ میں اس اطالوی لڑکی کے ساتھ ناچنا چاہتا ہوں جو بیچاری بہت دیر سے تنہا بیٹھی ہے ۔“

رشید مومن نہایت بھدے پن سے اٹھا ، اور لڑکھڑاتا ہوا ایک دوسری میز پر چلا گیا جہاں ایک خوبصورت اور آراستہ لڑکی لائم جوس سے جی بہلا رہی تھی ۔ اس نے رشید مومن کو ہاتھوں ہاتھ لیا ، اور کچھ دیر بعد لائم جوس چھوڑ کر وہ شمپین پینے میں مشغول ہوگئے ۔

رشید مومن بڑے انہماک سے اس لڑکی کے ساتھ ڈانس کرتا رہا ، اور نزہیہ اپنی کرسی پر بت بنی بیٹھی رہی ۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب حسرت ، ایک عمیق غصہ ، ایک شدید انتقام چھلک رہا تھا ۔ وہ بار بار کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے ہونٹ کپکپا کر ، کچکچا کر رہ جاتے تھے ۔

رمبا ۔ والز ۔ کوئک سٹیپ ۔ سامبا.........ایک کے بعد دوسرا ڈانس ہوتا رہا ۔ اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے نزہیہ کے پاؤں شراب ، موسیقی اور نغمے کی ترنگ میں بڑی المناکی سے لڑکھڑاتے رہے ۔ آدھی رات گئے جب ہوٹل ٹرمینس کا بال روم بند ہونے لگا تو رشید مومن اطالوی لڑکی کے بازو میں بازو ڈالے ہمارے پاس آیا ۔ وہ دونوں نشے میں چور تھے ۔

” یہ کیا واہیاتی ہے ۔“ رشید ناراض ہونے لگا ” ابھی رات شروع بھی نہیں ہوئی اور یہ کم بخت ہوٹل والے ڈانس بند کر رہے ہیں ۔ چلو ہم سب کاسینو چلیں ۔ وہ صبح تک کھلا رہتا ہے ۔“

" میں بہت تھک گئی ہوں ۔" نزھیہ نے بیزاری سے کہا " تم خوشی سے جاؤ ۔"

" بہت اچھا ۔ سب بخیر ۔ مجھے امید ہے کہ ہمارا پاکستانی بھائی بدستور تمہارا دل بہلاتا رہے گا ۔ خدا کی قسم پاکستانی بڑے اچھے لوگ ہیں ۔ شراب نہیں پیتے ۔ سؤر نہیں کھاتے ۔ گرمیوں میں حج پر جاتے ہیں ، اور نزھیہ جیسی خوبصورت لڑکیوں کا جی بہلاتے ہیں ۔ . ھا ھا ھا ... ھا ھا ھا ...... " رشید مومن پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا ، جھومتا ، لڑکھڑاتا ہوا اطالوی لڑکی کے ساتھ باہر چلا گیا ۔

کچھ دیر بعد نزھیہ میز پر کہنیاں ٹکائے دم بخود بیٹھی رہی ۔ اس کا سر اس کی ہتھیلیوں پہ ٹکا تھا ۔ مجھے یہ فکر دامنگیر تھی کہ اگر اب اس نے رونا شروع کر دیا تو میں کیا کروں گا ؟ ہر لحہ مجھے ڈر تھا کہ میز پر پڑے ہوئے مینو کارڈ پر اچانک ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگیں گے ۔ میں دل ہی دل میں وہ الفاظ اور فقرے تلاش کر رہا تھا جو ایسے نازک موقعوں پر لڑکیوں کی دل جوئی کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں ۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ نزھیہ نے مجھے اس آزمائش سے بال بال بچا لیا ۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اپنی ہتھیلیوں سے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں بے حد خشک تھیں ۔ سوکھی ہوئی لکڑیوں کی طرح جو چنگاری دیکھتے ہی بے اختیار شعلے اگلنے لگتی ہیں ۔ اس کا چہرہ تھکن آلود تھا ۔ اس نے نیم غنودگی کے عالم میں کہا " آئیں ہم بھی کسی دوسرے نائٹ کلب میں چل کے بیٹھیں ۔ یہاں مجھے سخت وحشت ہو رہی ہے ۔"

" آپ بہت تھک گئی ہیں ۔" میں نے کہا " آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں تو زیادہ بہتر ہو گا ۔"

" نہیں ۔ میں اپنے کمرے میں ہرگز نہ جاؤں گی ۔ اگر اس وقت میں اکیلی رہ گئی تو رو رو کر میرا برا حال ہوجائے گا ۔"

آپ اکیلی نہ ہوں گی ۔" میں نے کہا " جب تک آپ کو نیند نہ آجائے میں آپ کے پاس بیٹھوں گا ۔"

نزھیہ کچھ دیر سوچتی رہی ۔ پھر بولی " ہمارے ملک میں ایک کہاوت ہے کہ اگر مرد اور عورت کسی جگہ اکیلے رہ جائیں ، تو ان کے ساتھ تیسرا ساتھی شیطان شامل ہو جاتا ہے ۔"

" شیطان کے ساتھ میرے بھی دیرینہ مراسم ہیں ۔" میں نے مذاق کیا " لیکن اب ہم دونوں نے ایک دوسرے سے باعزت سمجھوتہ کرلیا ہے !"

نزھیہ ھنسنے لگی ۔

اوپر جانے کے لیے جب ہم لفٹ میں سوار ہوئے تو نزھیہ کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر لفٹ والے عجب انداز سے مسکرایا ۔

" آپ کی شب خوش بسر ہو ۔" لفٹ والے نے ہمیں اتار کر دعا دی ۔

" شکریہ ۔" میں نے اسے ایک سو لیرا کا ٹپ دیا ۔

" اب اگر میں ساری عمر ایک فرشتہ بن کے رہوں ۔" نزھیہ اپنے کمرے میں پہنچ کر کہنے لگی " پھر بھی لفٹ والے کی نظر میں وہی رہوں گی جو اس نے مجھے اس وقت سمجھا ہے ۔"

" کوئی بات نہیں ۔" میں نے کہا " انسان غلط فہمیوں کا پتلا ہی تو ہے ۔"

" ہمارے ملک میں اسے گناہ بے لذت کہتے ہیں ۔" نزھیہ کہنے لگی " گناہ کا شبہہ گناہ سے بھی بدتر ہوتا ہے ۔ بری بات ہو جائے تو وہ ماضی کا ایک واقعہ بن جاتا ہے ۔ مستقبل کو اس واقعے سے بچانا انسان کے اپنے اختیار میں ہے ۔ لیکن بری بات کا شبہہ خون میں ملے

ہوئے زہر کی طرح ہمیشہ جاری رہتا ہے۔"

نزہیہ نے بستر سے کمبل اٹھا کر اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور صوفے کی بڑی کرسی پر تکیہ لگا کے نیم دراز ہو گئی۔ "یہ کچھ عجیب بات ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی فریب سے آلودہ ہوتا ہے۔ کبھی ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں کبھی دوسرے ہمارے متعلق دھوکا کھانے لگتے ہیں۔"

نزہیہ اب اچھے موڈ میں تھی۔ اس نے سگرٹ سلگا کر اپنا سگرٹ لائٹر مجھے دیا جس پر نہایت خوبصورتی سے لاالہ‌الااللہ‌محمدرسول‌اللہ نقش کیا ہوا تھا۔

"امریکن کمپنیاں یہ لائٹر خاص طور پر اسلامی ممالک کے لیے بنا کر بھیجتی ہیں۔" نزہیہ ہنسنے لگی "پہلے کلمہ طیبہ سے ایمان کی شمع روشن ہوتی تھی اب اس کی مدد سے سگرٹ سلگائے جاتے ہیں!"

"وہ امفٹ دوائے مجھے جو جی چاہے سمجھے۔" نزہیہ پھر سنجیدہ ہو گئی "لیکن دمشق میں میری بزرگ ماں کسی اور ہی خیال میں مسرور ہو گی۔ شاید اس وقت وہ میرے لیے دعا مانگ رہی ہو۔ شاید وہ سوچ رہی ہو کہ میں اب بھی اسی پابندی سے نماز اور قرآن پڑھتی ہوں جس طرح اپنے گھر میں پڑھا کرتی تھی۔"

نزہیہ نے کروٹ لے کر اپنا اٹیچی کیس کھولا جو صوفے کے قریب ایک تپائی پر پڑا تھا اور اس میں سے ریشمی غلاف میں لپٹا ہوا چھوٹی تقطیع کا قرآن مجید نکالا۔

"جب میں یورپ آ رہی تھی تو میری ماں نے مجھے یہ تحفہ دیا تھا۔ سال بھر سے میں نے اسے ایک بار بھی کھول کر نہیں دیکھا۔ لیکن میں جہاں کہیں جاتی ہوں اسے اپنے ساتھ ضرور رکھتی ہوں۔"

"یہ بھی آپ کی عین سعادت مندی ہے!" میں نے کہا۔

"مجھے کچھ وہم سا ہو گیا ہے کہ اگر قرآن شریف کی یہ جلد مجھ سے جدا ہو گئی تو شاید میری پیاری ماں کو کچھ ہو جائے گا۔"

"ساری دنیا کی الہامی کتابوں میں قرآن مجید بڑا مظلوم صحیفہ ہے۔" میں نے طنزاً کہا "کچھ لوگ اسے تعویذ بنا کر گلے میں یا بازوؤں پر باندھتے ہیں۔ بعض لوگ پاکٹ سائز کے قرآن جیبوں میں رکھتے ہیں۔ یوں بھی ہر اسلامی گھرانے میں ایک دو قرآن خوبصورت غلافوں میں ضرور رکھے جاتے ہیں۔ خواہ وہ طاق نسیاں کی زینت ہی کیوں نہ ہوں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جس گھر میں یہ کتاب نہ ہو، وہاں اللہ کی برکت نازل نہیں ہوتی!"

اب نزہیہ کا موڈ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور مجھے تسبیحوں کے قصے سنانے لگی کہ کس طرح مصر اور شام کے لوگ فیشن کے طور پر اپنے ہاتھ میں تسبیح رکھتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں دنیا، دوسرے میں دین ....

کچھ دیر کے بعد جب میں رخصت ہونے لگا، تو نزہیہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ پھر اس نے ہچکچاتے ہچکچاتے کہا آپ میرے لیے ایک تکلیف گوارا فرمائیں گے؟"

"بسر و چشم۔" میں نے کہا۔

نزہیہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی "جب آپ خانۂ کعبہ کا طواف کریں تو وہاں فقط ایک بار میرا نام لے دیں۔"

"یہ تو بہت معمولی فرمائش ہے۔" میں نے کہا "وہاں پر میں آپ کے لیے دعا بھی ضرور مانگوں گا۔"

"آپ ایک بار بس میرا نام ہی لے دیں۔ اس سے زیادہ مجھے کوئی اور حق بھی تو نہیں۔" نزہیہ نے اس نمی کو چھپانے کی ناکام سی کوشش کی جو معاً اس کی خوبصورت آنکھوں

میں اُتر آئی تھی -

"میں ضرور آپ کا نام لوں گا - ایک بار نہیں کئی بار - اور جب روضۂ اقدس پر حاضر ہوں گا تو آپ کا سلام بھی ضرور عرض کروں گا -"

روضۂ اقدس کے نام پر نزھیہ نے جلدی سے اپنے گلے کا ریشمی اسکارف اُتار کر اُس سے سر ڈھانپ لیا - وہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہی ، کچھ کہنا چاہا لیکن ھچکچا کر خاموش ہوگئی -

لفٹ بوائے لفٹ سے ٹیک لگائے اُونگھ رہا تھا - مجھے دیکھ کر اُس نے اپنی ٹوپی درست کی اور کن انکھیوں سے گھور کر مسکرایا - میں نے پھر آسے ایک سو لیرا کا ٹپ دیا -

کچھ دیر بعد جب رشید مومن واپس آئے گا تو شاید اس لفٹ بوائے کو ایک بار پھر کن انکھیوں سے گھور کر مسکرانے کی حاجت پیش آئے گی !

اور میں آج تک یہی سوچتا ھوں کہ اگر میں ساری عمر بھی خانہ کعبہ کا طواف کرتا رھوں تو شاید مجھے احساس کی وہ معراج نصیب نہ ھوگی جو نزھیہ کے مقدر میں لکھی ھوئی ھے -نزھیہ جو ریڈوائن پی کر بھی رشید مومن سے روٹھ جاتی ھے کیونکہ وہ حج کے متعلق بے سر و پا باتیں کرتا ھے - نزھیہ جو اب قرآن نہیں پڑھتی لیکن اپنی ماں کا تحفہ ھمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ھے - نزھیہ جس کے نزدیک خدا کے گھر پر اُس کا صرف اتنا حق ھے کہ ایک اجنبی فقط ایک بار اُس کا نام وھاں لے دے - نزھیہ جو روضۂ اقدس کے ذکر پر اپنے اسکارف سے اپنا سر ڈھانپ لیتی ھے - نزھیہ جو اپنا سلام وھاں پیش کرنے سے بری طرح ھچکچاتی ھے ....

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر　　روز محشر عذر ھائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر　　از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر !

رفتار کا بدن

ناصر کاظمی ✿ شیخ صلاح الدین
انتظار حسین ✿ حنیف رامے

ناصر : شیخ صاحب ! ایک مرتبہ آپ نے ریل گاڑی کے بارے میں کچھ باتیں کی تھیں ۔ میرے ذہن میں یہ باتیں ڈوبتی ابھرتی رہی ہیں ۔ اس دن آپ نے ریل گاڑی کے متعلق ایک عجیب فقرہ کہا تھا ——

شیخ : وہ فقرہ کیا تھا اب تو ذہن سے اتر گیا ہے مگر اتنا احساس ہے کہ ریل گاڑی کے بارے میں ضرور کوئی بات ہوئی تھی ۔ میں نے پہلی بار ریل دیکھی اسی وقت سے ذہن میں ایک ایسی کھڑکی کھل گئی ہے کہ جب بھی نظر اس کھڑکی کی چوکھٹ سے پار ہوتی ہے ایک نیا منظر نظر آتا ہے ۔ بچپن میں ریل گاڑی کسی پرانے قصے کی جادو کی کل معلوم ہوتی تھی مگر یہ احساس ہمیشہ رہا کہ اس کی حیثیت قصے کہانیوں سے کچھ زیادہ ہے ۔ اب بھی رات کے سناٹے میں ریل کی کوک سنائی دیتی ہے تو ذہن میں ایسے ہیولے اٹھتے ہیں جو کسی راز کو سمجھنے اور اس سمجھ کو استعمال کرنے کی دعوت دیتے ہیں ۔ دن ہو یا رات ، کسی ویران جگہ سے ریل گاڑی کا گزرنا ایسا حادثہ ہے جس کی اہمیت کا احساس کسی نہ کسی سطح پر ، جانوروں سے لے کر انسانوں تک ، سب کو ہوتا ہے مگر حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ سوچنے والے انسانوں نے اس کے متعلق اپنی سوچ کا اظہار کم کم ہی کیا ہے ، زیادہ سے زیادہ کسی فلمی ہدایت کار نے ریل کی رفتار کی کمی بیشی سے جذبات کی رفتار کی تلمیح پیش کرنے کی کوشش کی ہو تو ہو ۔ یہ ایجاد انسانی تخلیقات میں اتنی بڑی ہے کہ اس کا اندازہ کرنے کی جرأت کم ہی ہوتی ہے ۔ یہ کاٹھ اور لوہے کی پتلی نہ صرف مکانی منزلوں کو قریب کرتی ہے بلکہ سائنسی دور میں انسان کے تحیر ، بے بسی ، اور بے منزل ہونے کا اسم بن گئی ہے ۔

ناصر : میری عمر اس وقت تقریباً چار برس کی ہو گی ۔ ان دنوں ہم نوشہرہ میں رہتے تھے اور ریل گاڑی ہمارے گھر کے پیچھے سے گزرتی تھی ۔ سارا دن گاڑیاں گزرتی رہتیں لیکن شام ہوتی تو میں نانا کے ساتھ جنگلے کے پاس جا کھڑا ہوتا اور ریل گاڑی کا اس وقت تک انتظار کرتا جب تک اسے دیکھ نہ لیتا ۔ ایک دن نانا کو انبالے سے تار آئی اور وہ چلے گئے ۔ اس دن میں شام کی گاڑی نہ دیکھ سکا ۔ میں رات بھر نیند میں جاگتا رہا اور انجن ہمارے گھر کے صحن میں شنٹ کرتا رہا ۔ اس دن ' پاگل ' کا لفظ باجی سے میں نے پہلی بار سنا ۔ اگلی دوپہر کوٹھے پر بیٹھا میں مولیوں کا پراٹھا کھا رہا تھا کہ ریل گاڑی کی آواز آئی ۔ میں نے رو پیٹ کر چارپائی دیوار سے لگائی اور دیوار پر چڑھ بیٹھا ۔ ریل گاڑی اڑی جا رہی تھی ، نانا انبالہ پہنچ چکے تھے ، پلٹ کر دیکھا تو کوا پراٹھا لیے بھاگا جاتا تھا ۔ دوپہر کی خاموشی میں ریل گاڑی سے بہتر ساتھی مجھے کبھی نہ ملا ۔ میں ہر روز دوپہر کو دیوار پر بیٹھا گھنٹوں گاڑی کا انتظار کرتا اور لوہے کے جنگلے کو دیکھتا رہتا ۔ پھر والد کا تبادلہ ڈیرہ اسماعیل خاں ہو گیا ۔ اس سفر میں بہن بھی ساتھ تھی ۔ سارا دن لالہ موسیٰ کے سٹیشن پر ہم نے نئی گاڑی کا انتظار کیا ۔ شام کو ٹکٹ لیا اور صبح چار بجے دریاخاں پہنچے ۔ سٹیشن پر صرف دو سبز بتیاں جل رہی تھیں ، سخت سردی تھی ، سامان بہت تھا اور ہم بالکل اجنبی تھے ۔ قلیوں نے سامان اتارا ، میرا سرخ کوٹ گاڑی کے نیچے گر گیا ۔ اس دن میں نے پہلی بار گاڑی کے پہیوں کو غور سے دیکھا ۔ کالے کالے پہیوں میں میرا کوٹ یوں لگ رہا تھا جیسے ذبح کیا ہوا برہ ۔ ہم کشتیوں کا پل پار کر کے ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچے تو دن چڑھا ۔ ڈیرہ اسماعیل خاں سے واپس آئے تو وہ ایک طوفانی شام تھی ۔ شہر اور سٹیشن میں بیس میل کا فاصلہ تھا اور اس علاقے میں

کشتیوں کے تقریباً آٹھ پل تھے — سندھ میں جب طغیانی آتی ہے تو اس سارے علاقے میں پانی پھیل جاتا ہے - جب ہم سٹیشن پہنچے تو سارے پل توڑ دیے گئے تھے - اس طوفان کو پار کرنے کے بعد ریل تک پہنچنا وطن پہنچنے سے کم نہ تھا -

پہاڑوں میں ریل گاڑی کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا ہے - دو میل کا فاصلہ کبھی کبھی تو آدھ گھنٹے میں طے ہوتا ہے -

جب میں اپنی جیومیٹری کی کاپی پر دائرے لگاتا تو مجھے ریل گاڑی کے پہیوں کا خیال آتا - مجھے احساس ہوتا کہ اس ایجاد کے پیچھے کتنا بڑا علم کام کر رہا ہے -

حنیف : آئیے اب ریل میں بیٹھ ہی جائیں - آپ یہاں بیٹھیں میں ذرا کھڑکی کے پاس بیٹھوں گا - ریل میں بیٹھتے ہی میں بچپن میں داخل ہو جاتا ہوں — بچپن، جب ہر چیز عجیب اجنبی سی نظر آتی ہے، زندہ نظر آتی ہے - یہ چھوٹا سا کمرہ جو مسافروں اور سامان سے اٹا ہے مجھے بچپن کی سرزمین میں اڑانے لیے پھرتا ہے - یہ کھڑکی اس کمرے کی آنکھ ہے اور اس آنکھ میں میری آنکھ ہے - ابھی یہ وہاں تھی اب یہاں ہے - زمین و زمان چھوٹی چھوٹی منور قوسوں کی صورت میری آنکھ کی سطح پر مرتسم ہوتے جاتے ہیں - آنکھ ان قوسوں کو ذہن میں منتقل کرتی ہے اور ذہن ان قوسوں سے زنجیریں بنانے لگتا ہے - آنکھ بند ہو جاتی ہے - کبھی گاڑی آگے کو بھاگ رہی ہے اور میں پیچھے کو، تو کبھی گاڑی میرے پیچھے پیچھے ہوا میں اڑ رہی ہے، پانیوں میں، بادلوں پر، یہاں، وہاں، ہر طرف - کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ گاڑی گم ہو جاتی ہے، میں بھری کائنات میں اکیلا رہ جاتا ہوں - اتنے میں مسافروں کی ہاؤ ہو مجھے واپس کمرے میں لا بٹھاتی ہے - میں اپنے کرتے کا وسیع دامن گھٹنوں پر ہموار کرتا ہوں اور کھڑکی سے نظر آتی ہوئی جگنو چمکیوں اور کمرے سے اٹھتی ہوئی رنگ رنگ کی باسوں اور آوازوں کو اس پھیلے ہوئے دامن پر ڈھیر کر دیتا ہوں اور ان سے ایک گھر بنانے لگتا ہوں - جہاں اس گھر میں کسی طرح کے اینٹ گارے کی کمی محسوس ہوئی میری آنکھ جھٹ کھڑکی سے کودی اور باہر پھیلے ہوئے اندھیرے / اجالے سے ٹوکریاں بھر بھر کے مجھے پکڑانے لگی - ریل میں بیٹھے ہوں اور کھڑکی کھلی ہو تو گھر بنانا کیا، شہر آباد کیے جا سکتے ہیں - آج میرے ساتھ آپ بھی شامل ہو جائیں - آج ہم ایک نیا شہر بنائیں گے -

انتظار : بھئی حنیف میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر گھر بنانے سے تو رہا - در اصل ریل گاڑی میری زندگی میں ذرا دیر سے داخل ہوئی - جب میں ریل کا تصور کرتا ہوں تو بچپن کا ایک دور مجھے ختم ہوتا نظر آتا ہے - سٹیشن ہمارے محلے سے بہت دور تھا - آبادی سے بالکل باہر - اور سفر کرنے کا اپنا معاملہ یہ تھا کہ ڈبیائی سے چلتے تو پاس ہی ایک گاؤں تھا دان پور، وہاں چلے جاتے - ڈبیائی سے دان پور کے سارے سفر میرے ذہن میں اب تک تازہ ہیں - ہم اکے میں بیٹھے اور یوں روانہ ہوتے کہ کسی دوسرے ملک کا سفر کر رہے ہیں - یہ دو ڈھائی میل کا سفر مہینوں اور سالوں میں طے ہوتا نظر آتا - اکا کبھی بہت تیزی سے دوڑنے لگتا پھر رک کے کھڑا ہو جاتا، پھر آہستہ آہستہ چلتا پھر تیز دوڑنے لگ جاتا — ریل میں سفر میں نے پہلی مرتبہ اس وقت کیا جب ڈبیائی کو چھوڑا - ریل کے ساتھ اپنے بچپن کا ایک زمانہ ختم اور اپنے دیس سے ایک دوسری زمین کو ہجرت کا آغاز ہوتا ہے - ہاپڑ میں جس مکان میں جا کے رہے وہاں ریل گاڑی بالکل سامنے سے گزرتی تھی - سارے سارے دن میں اپنے خاندان کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ پٹری پہ گھومتا رہتا اور اجلے اجلے سرمئی پتھروں کو پٹری سے چنتا اور بڑے شوق سے گھر لے آتا لیکن گھر آ کر میری سمجھ میں

نہ آتا کہ ان کا کیا بتاؤں ! ہاں اس پٹری سے پرے ایک اور پٹری تھی - پٹری تو نہیں بلکہ اس کے آثار سے باقی تھے - سنتے ہیں کہ پہلے گاڑی اس پٹری سے گزرا کرتی تھی - اس اجڑی پٹری کو دیکھ کر مجھ پر کچھ ایسا اثر ہوتا جیسے کسی پرانے تاریخی کھنڈر کو دیکھ کر ہوتا ہے - سواری گاڑی دن میں کئی بار گھر کے سامنے سے گزرتی - پہیوں اور سیٹی کا شور کان میں پڑا اور ہم باہر آئے - سواری گاڑی تیزی سے نظر آتی اور تیزی سے اوجھل ہو جاتی لیکن مال گاڑی کا عجب عالم تھا - اونگھتی رینگتی ہوئی آتی اور ٹھیک ہمارے دروازے کے سامنے کھڑی ہو جاتی - انجن بار بار سیٹی دیتا ، حرکت پیدا ہوتی اور پھر خاموشی ہو جاتی - کبھی کبھی تو یہ مال گاڑی صبح کو آتی اور دوپہر تک یونہی کھڑی رہتی اور مجھے یوں لگتا کہ کوئی اکیلا مسافر ہے ، شہر میں داخل ہونا چاہتا ہے ، لیکن شہر کے پاسبان اسے اندر نہیں آنے دیتے - سواری گاڑی سے زیادہ یہ مال گاڑی اپنے دل کو کھینچتی تھی - مگر سواری گاڑی ہو یا مال گاڑی اکا پھر اکا ہے - ہابڑ میں اکے نہیں چلتے تھے - اس لحاظ سے یہ سفر میری زندگی میں ایک حد کی حیثیت رکھتا ہے - وہ زمانہ جب اکوں میں چلا کرتے تھے اور کھلے کھیت اور گھنے باغ کبھی اپنی طرف بڑھتے اور کبھی اپنی طرف کھینچتے نظر آتے تھے ، وہ زمانہ ڈبائی کے سفر کے ساتھ ختم ہو گیا - اب ہابڑ تھا اور رتھ ٹاٹر ٹانگے اور ریل گاڑی -

شیخ : اکے میں سے جو کچھ بھی دیکھا جاسکتا ہے اس کی ایک اپنی حیثیت ہے - وہ الگ اور منفرد ہوتے ہوئے بھی زندگی کا ایک ایسا منظر پیش کرتا ہے جہاں انسان کی تمام صلاحیتیں بیدار نہیں ہوتیں - انسان اپنے اندر سوتے ہوئے بھی اس منظر کو دیکھ سکتا ہے ، محسوس کر سکتا ہے - مگر اس منظر پر چھا جانے کی نہ تو اسے ضرورت پیش آتی ہے نہ خواہش - یہ خواہش تو اسی وقت پیش آئے گی جب سفر میں رفتار تیز ہو - ریل اسی احساس کے لیے تخلیق کی گئی تھی - حنیف والی کھڑکی میں بیٹھنے ہی باہر کی سرزمین ، آسمان اور ان دونوں کے درمیان ہر چیز اپنے مقام سے کود کر نگاہ کے سامنے آتی ہے اور ناچتی ہوئی غائب ہوجانے کی کوشش کرتی ہے - بھاگتی ہوئی اشیا اور مناظر کو قابو کرنے کے لیے انسان کو اپنے تمام احساسات ، سوچ کے طریقوں کو نیند سے جگانا پڑتا ہے - اور جب انسان ہر سطح پر بالکل بیدار ہوجاتا ہے تو اسے ہر چیز اجنبی اور عجیب نظر آتی ہے اور وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنے اندر اجنبی کی حیثیت سے داخل ہو جائے - یہی ایک احساس ہے جو اس دور میں ہر انسان کو ریل گاڑی کی کھڑکی میں بیٹھ کر ہو سکتا ہے - یہ الگ بات کہ یہ احساس کھڑکی میں بیٹھنے والے کی زندگی میں کیا کچھ کرتا ہے - اکے ، تانگے ، اور لاری میں بیٹھ کر چیزیں حرکت کرتی ہوئی تو محسوس ہوتی ہیں لیکن ان کی حرکت ایسی ہوتی ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کو آسانی سے قابو میں لایا جاسکتا ہے اور جب بات آسان ہی ہو تو کون جاگتا ہے اور انسان اگر جاگتا نہیں تو پتھر ہے ، گھاس ہے ، پھوس ہے -

انتظار : شیخ صاحب ! مجھے آپ کی ریل گاڑی پہ اصل اعتراض یہی ہے کہ آدمی اس میں بیٹھ کر فطرت پہ چھا جانے کی کوشش کرتا ہے - گاڑی میں سفر کرتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ ہم فطرت پہ چڑھائی کرنے جا رہے ہیں - اکے کے سفر میں فطرت سے ملاپ رہتا ہے اور زمین سے قرب — تصویریں آہستہ آہستہ ابھرتی ہیں اور معدوم ہوتی چلی جاتی ہیں - زمین کا رنگ دھیرے دھیرے بدلتا ہے - روشنیاں اور سائے اپنے کھال میں سے ہر آن ایک نیا منظر نظروں کے سامنے لاتے ہیں اور پھر زمین کا نشیب و فراز - ریل کے سفر سے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ کوئی فلم تیزی سے چل رہی ہے اور یہ کہ ہم سیدھے چل رہے ہیں ، نہ کوئی موڑ آتا ہے نہ بلندی اور پستی ، کہ منظر کھلتے ہیں - اگر آپ کو فطرت سے لڑائی ہی مقصود ہے

اور رفتار جو چیزوں اور مناظر کے رنگ کو ابھرنے سے پہلے دبا دیتی ہے اس کے آپ رسیا ہیں تو بے شک ریل گاڑی میں بیٹھیے مگر میں تو فطرت کی ہم سفری کا قائل ہوں اور اس کو اپنے ساتھ ملا کر کسی نئی اقلیم میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔

حنیف : زمین سے قرب کی اتنی ہی خواہش ہے تو یہ بھی دیکھا ہوتا کہ ریل کی پٹری زمین ہی کے سینے پر بچھی ہے۔ ریل میں بیٹھے ہوئے اگر تمہیں یہ احساس ہے کہ آپ سیدھی لکیر میں چل رہے ہیں تو کبھی کھڑکی سے جھانکا ہوتا تاکہ زمین کے سینے پر لہراتے ہوئے اس نقرئی ہار کے پیچ و خم تم پر آشکارا ہوئے ہوتے۔ زمین کے ساتھ ساتھ تم نیچے بھی اترتے اور اوپر بھی اٹھتے۔ تمہیں نئے سے نئے آفاق دکھائی دیتے جن میں سدا نئے مناظر ملتے۔ اکا اور فطرت کی ہم سفری، یہ تو اس مرشد کی کہانی ہے جو تصور شیخ کی منزل سے آگے مرید کی رہنمائی نہیں کرتا، اسے اپنے تک محدود کر لیتا ہے۔ ریل گاڑی سب کچھ دکھاتی ہے اور پھر آپ کو خدا کی سلطنت میں کھلا چھوڑ دیتی ہے۔ اس سلطنت کے رنگ روپ چھوٹے چھوٹے سنگ ریزوں کی صورت میں آپ کے پاس اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ہر سنگ ریزے کا رنگ جدا ہے۔ کوئی چھوٹا ہے۔ کوئی بڑا ہے۔ ایک رنگ دوسرے میں گھلتا ہے، دوسرا تیسرے میں — یہ جمالیات تو اپنے یہاں کے رومانی مصوروں کے ساتھ ہی پرانی ہوگئی۔ اب تو ہر چیز کی اپنی حیثیت بھی ہے، وہ اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور اسے دوسری مکمل چیزوں کے ساتھ مل کر کسی نئی سطح پر ایک مکمل چیز بننا ہے۔ یہ تکمیل اکے کے سفر میں نہیں ریل ہی کے سفر میں ممکن ہے جہاں ہر منظر اپنی وحدت میں مکمل نظر آتا ہے۔ دا مسافر کے لیے لازم ہوتا ہے کہ ہر منظر کی وحدت تک بہ یک نظر پہنچ جائے۔

ناصر : کس قدر غلط ہے اکے اور ریل گاڑی کا مقابلہ اور کس قدر دلچسپ ہے گھوڑے کے مقابلے میں ریل گاڑی کی وقعت اور اہمیت۔ جب ریل نہیں تھی تو اکوں اور گاڑیوں کا سفر خاصا بور تھا۔ اس لیے ریل کی ضرورت تھی۔ اب کوئی لمبا سفر کرنا ہوتا ہے تو ٹکٹ لیا، ریل گاڑی میں بیٹھے اور چل دیے۔ مقصد منزل پر پہنچنا ہے نہ کہ مشاہدہ یا تجربہ۔ اور اب تو ریل گاڑیاں زیادہ تر رات کو ہی چلتی ہیں یا مصروف لوگ سفر پر رات ہی کو نکلتے ہیں۔ رات اندھیری ہوئی تو خیر سمرن جپتے رہے: گھر دور، چکی بھاری گھر دور، چکی بھاری۔ ذرا چاندنا ہؤا تو ایک آدھ درخت کا ٹھنٹھ نظر پڑ گیا۔ میاں آج کل اتنی فرصت کہاں کہ ریل گاڑی میں فطرت کا مشاہدہ کرنے نکلیں۔ گھوڑے چھن گئے، اب تو ہم خود سفر کرتے ہیں، خوشبو کی طرح اڑے پھرتے ہیں، گھوڑوں کو ریل گاڑی کے ساتھ نہیں دوڑاتے۔

شیخ : گھوڑے پر بیٹھا ہؤا انسان رفتار میں، ہوا میں اصول میں، قید، بیل گاڑی میں خوابیدہ —— لیکن ریل میں وہ آزاد بھی ہے بیدار بھی۔ ریل گاڑی زمین سے قریب بھی ہے، زمین سے دور بھی ہے۔ اسی لیے وہ انسان کا اسم بھی ہے کہ زمین سے آگا ہے اور عرش کی باتیں سن لیتا ہے۔

فطرت سے جنگ کی اگر خواہش ہوتی، دھرتی سے فرار چاہتا تو ہوا باز ہوتا — دھرتی سے دور، انسان سے دور، معاشرے سے دور — لیکن میں تو جسم کی صحراؤں میں سوئے ہوئے انسان کو جاگتا ہؤا دیکھنا چاہتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ فطرت کو بھی جگانا چاہتا ہوں۔ ریل گاڑی میں انسانی معاشرہ، انسانی مسائل، انسان کا شعور، انسان کا دکھ، فطرت کے رنگ، ہوا کی آواز، انسان کا ذہن، انسان کا تخیل —— سب ایک ساتھ سفر کرتے ہیں۔ ان کی کوئی خاص منزل معین نہیں ہوتی۔ اور کھڑکی میں بیٹھا ہؤا انسان انہیں بہ یک وقت

دیکھنے ، محسوس کرنے اور ان سب کے متعلق سوچنے پر مجبور۔

انتظار : سفر کا مقصد تو منزل پہ پہنچنا ہی ہوتا ہے لیکن وہ ہمیشہ سے مشاہدہ بھی رہا ہے ، مشاہدے کا ذریعہ بھی رہا ہے اور تجربہ بھی ۔ اس سے پہلے جب ریل گاڑی نہیں تھی اور لوگ رتھوں اور اکوں میں سفر کرتے تھے تو شاید اُس وقت یہ بات زیادہ صحیح تھی ۔ مسافروں کو جو رنج اُس سفر میں ہوتے تھے اب گاڑی کے سفر میں کہاں ہوتے ہیں — دن کا سفر مشاہدہ ہوتا تھا اور رات کا سفر تجربہ ۔ ہر سفر ایک جوکھم ہوتا تھا ، تاریکی میں ایک چھلانگ ۔ تاریکی کی چھلانگ سے اور یوں رنج راہ کھینچنے کے بعد موتی نکالنے والے موتی بھی نکالتے تھے اور اُن کا کچھ بناتے بھی تھے ۔ ناصر! تم نے شاید اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ ہمارا پچھلا ادب بالخصوص افسانوی ادب سفر ہی کے تجربے سے چلتا ہے ۔ اب رہا ریل گاڑی کے سفر کا معاملہ تو جیسا کہ تم نے کہا ریل کا سفر بے شک کچھ منزل پہ پہنچنے ہی کا معاملہ نظر آتا ہے ۔ شیخ صاحب کی رائے ہے کہ وہ تخیل کو بھی رستہ دکھاتا ہے اور معاشرے کا شعور بھی پیدا کرتا ہے ......

شیخ : رائے نہیں ، ایمان ہے ۔

انتظار : اچھا! آپ کا ایمان ہی سہی مگر ہم نے تو گاڑی میں یہ دیکھا ہے کہ مسافر وہ دھما چوکڑی مچاتے ہیں ، کوئی بچہ رو رہا ہے ، کوئی ماں دہائی دے رہی ہے ، کسی کو اپنے سامان کی فکر ہے ۔ غرض وہ شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ۔ اور تخیل کو راہ تو کیا سوجھے گی ، دھن تک مختل ہو جاتا ہے ۔

(شیخ : ایک عامی کا ذہن ، آرٹسٹ کا نہیں ۔)

حنیف : یہ تو یہی ہؤا جیسے چائے خانوں میں بیٹھے ہوئے ادیب کہتے رہتے ہیں کہ صاحب! ماحول اچھا نہیں ہے ، جم کے کام ہی نہیں ہو سکتا ۔ لیکن آپ کو ایسے لوگ بھی یاد ہوں گے جنھوں نے اسی شور شرابے میں رہتے ہوئے تخلیقی کام کیا ہے ۔ خود تمھارا نظیر ہی ہے ۔ یہی شور شرابا فنکار کو مجبور کرتا ہے کہ جب اُس کے دائرۂ محسوسات کی سرحد ختم ہو جائے تو تخیل کی کارفرمائی شروع ہو ۔ فنکار اور معاشرے میں یہی تعلق ہے کہ فنکار معاشرے میں رہتے ہوئے بھی معاشرے سے جدا ہے ۔

ناصر : ”میں ہوں“ کا احساس بھی اجتماع ہی سے پیدا ہوتا ہے ۔ اور اجتماع کے تمام شعبوں اور اُن کے مشاہدوں اور تجربوں کی تفاصیل کو فنکار ایک مرکز پہ لا کھڑا کرتا ہے ۔ یہ وہ اجمال ہے جس سے ہر تفصیل تراوش کرتی ہے ۔

حنیف : اگر اسی کو فن کہتے ہیں کہ فنکار ادھر اُدھر سے چیزیں اکٹھی کرتا پھرے تو وہ ایڈیٹر تو ہے فنکار نہیں ۔ فنکار تو وہ اُس وقت کہلا سکے گا جب وہ ان سب تفاصیل میں ایک اپنا رنگ بھی شامل کرے ۔ جبھی اُسے یہ حق ہوگا کہ وہ کہہ سکے ”میں ہوں ۔“

انتظار : تو کیا بھڑوں کے چھتے کو فن کہیں گے؟ — بھڑیں بھی محض ایڈیٹر تو نہیں ہوتیں ۔ وہ چھتے میں اپنا رنگ بھی شامل کرتی ہیں ۔ لیکن مجھے بھڑوں کے چھتے کو دیکھ کر ہمیشہ یہ احساس ہؤا کہ یہ فن نہیں بلکہ کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے ۔

ناصر : یہ بھڑیں فنکار نہیں مگر جو چھتہ یہ بناتی ہیں ویسا فن شاید تمھیں کہیں نہ ملے ۔ بھڑوں کا نشیمن خود ایک فن پارہ ہے ۔

انتظار : بھڑیں موسمی فنکار ہوتی ہیں ۔ جب وہ چھتہ بناتی ہیں تو بلے شک بڑی بھوری اور براق کا احساس پیدا ہوتا ہے ۔ لیکن اُس چھتے کی عمر کتنی ہوتی ہے؟ موسم بدلا اور بھڑوں کی گرمی اور تیزی غائب ۔ ایک ڈنک دو ڈنک بن جاتے ہیں اور حالت یہ ہوتی ہے کہ کواڑوں کے پیچھے دراڑوں میں ، سوراخوں میں منہ چھپاتی پھرتی ہیں ۔ بچپن میں ہمارا یہ بھی ایک کھیل تھا کہ ان دو ڈنکوں والی بوڑھی بھڑوں کو پکڑتے اور اُن کی کمر میں تاگا باندھتے اور گلیوں میں پتنگ کی طرح اڑاتے پھرتے ۔

ناصر : میرے بھائی ! ہمیشہ ایک سا موسم نہیں رھتا ۔ اور بارش ہر روز نہیں ہوتی ۔ بھڑیں اگر سال بھر چھتے بنائیں تو جبھی تم اُنھیں فنکار مانو گے ؟ فنکار تو میں نے اُنھیں از راہ جوانمردی کہہ دیا ۔ وہ فنکار نہ سہی لیکن اُن کے مزاج میں اس ذات کی ایک چاشنی ضرور نظر آتی ہے ۔ پہیلی سنو گے !

کالے منہ پر پیلا ٹیکہ بن مارے وہ روئے

یہ بھڑ کا باپ ہے ۔ تم اسے تاگا باندھ کر نہیں اڑا سکتے ۔

حنیف : جب بھڑوں نے پہلا چھتہ بنایا تھا تو وہ فن پارہ تھا ۔ بھڑوں کو چھتہ بہت پسند آیا اور وہ اب تک ویسے ہی چھتے بناتی چلی آرہی ہیں ۔ ایسے ہی جیسے مصور اور ادیب لوگ تصویریں بناتے ہیں اور افسانے لکھتے ہیں ۔ ان تصویروں اور ان افسانوں سے جب ہمارا واسطہ پڑتا ہے تو ہمارے محسوسات کی کارفرمائی کی رفتار میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی ۔ وہ عبارت ، تصویر یا افسانہ جو ہمیں اپنی جگہ سے اونچا نہ اٹھا دے فن پارہ کہلانے کا حقدار نہیں ہے ۔ بھڑیں جب کسی نئے ڈھنگ کا ، پہلے چھتے سے بہتر چھتہ بنائیں گی تو میں ضرور اُس چھتے کو سجدہ کروں گا ۔

انتظار : توگویا بھڑیں فنکار نہیں ہیں ، بھڑوں کی نانی اماں فنکار تھیں ۔ ہماری نانی اماں ہمیں کہانیاں سنایا کرتی تھیں لیکن وہ افسانہ نگار نہ تھیں ۔ ہاں وہ نانی اماں ضرور افسانہ نگار ہوگی جس نے پہلی مرتبہ اپنے ننھے نواسے کو چڑے چڑیا کی کہانی سنائی تھی ۔ عورتیں ہمیشہ سے نقال رھی ہیں ۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ جو بھی نانی اماں آئی اُس نے اپنی نواسے کو اُسی انداز میں اُسی ڈھنگ کی کہانیاں سنانی شروع کر دیں ۔ کہانیاں سنانے کا ایک سانچہ بن گیا ۔ الفاظ ڈالے اور کہانی نکال لی ۔

ناصر : ویسے اُن کے لفظوں میں جان نہیں ہوتی تھی حجم ضرور ہوتا تھا ۔ میں نے تو لفظوں اور حرفوں کی قوسوں میں جان بھی محسوس کی ہے اور اُن کے پیچ و خم کی فریاد بھی سنی ہے ۔ یہ حرف 'ب' خیمے کا اسم تھا ۔ خیر یہ تو لمبا قصہ ہے ، ایک شعر سن لو :

اُٹھاتا ہوں جب طاق سے میر صاحب کا دیوان
ورق بولتے ہیں کہ لفظوں کی قوسوں میں جان ہے

انتظار : ہماری نانی اماں کے لفظوں میں تو جان نہیں ہوتی تھی مگر لہجے میں گرمی ضرور ہوتی تھی ۔ وہ آج کل کی نانی اماؤں سے اس صورت میں ضرور بہتر تھیں کہ اِن کے یہاں تو لفظ ہی مردہ نہیں ، لہجہ بھی مردہ ہے ۔

حنیف : آج کل کی نانی امائیں اکے کی مسافر ہیں ۔ روایت پرستی اکے کے مسافر کا مقدر ہے ۔ ہوا باز کا مقدر تجربہ ہے ۔ لیکن ریل گاڑی کا مسافر روایت اور تجربے کا سنگھم ہے ۔ وہ

یہ یک وقت موجود بھی ہے اور غائب بھی ۔ وہ نہ تو معاشرے میں گم ہے اور نہ معاشرے سے بالکل کٹا ہؤا ہے ۔ معاشرے میں رہتے ہوئے وہ تنہا ہے ۔

ناصر: یہیں سے فرد کی تخلیقی تنہائی شروع ہوتی ہے ۔ جو ہرن زخمی ہو جاتا ہے وہ ڈار سے جلدی ہی بچھڑنے کی کوشش کرتا ہے ۔ ایک آدھ میل تو وہ گرمی میں ڈار کے ساتھ بھاگتا ہے لیکن پھر کسی اکیلے غار یا بنی میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے ۔ یہی اکیلا ہرن سب ہرنوں سے زیادہ اجتماعی شعور رکھتا ہے ۔

انتظار: یہاں مجھے ' فسانۂ عجائب ' کی وہ کہانی یاد آئی جس میں رستہ بھولے ہوئے شہزادے چکواچکوی کا شکار کرتے ہیں اور اُن کا گوشت کھا لیتے ہیں ۔ بڑا شہزادہ شہر کی طرف جاتا ہے جہاں ایک ہجوم جمع ہے اور ایک ہاتھی اپنی سونڈ میں ایک ہار لیے ہوئے ہے ۔ یہ ہار اس شہزادے کے گلے میں پڑتا ہے اور اُسے تخت مل جاتا ہے ۔ یہ ہوئی اجتماع کی بات ۔ دوسرا شہزادہ تنہا رہ جاتا ہے اور بھٹک کر ایک مالن کے یہاں رہ پڑتا ہے ۔ اُس نے چکوی کا گوشت کھایا ہے جس کی تاثیر سے روز صبح کو وہ ایک لعل اُگلتا ہے ۔ یہ شہزادہ جو ہجوم سے الگ ، وطن سے دور ، خاندان سے کٹ کر الگ ایک کونے میں پڑا ہے اور روز ایک لعل اُگلتا ہے مجھے اُس تنہائی کا اسم نظر آتا ہے جو تخلیقی عمل کو جنم دیتی ہے ۔

حنیف: فرد کی اسی تنہائی سے فن کا آغاز ہوتا ہے ۔ جو کچھ اُس نے اجتماع میں رہتے ہوئے محسوس کیا تھا اُسے وہ اپنے تخیل کی مدد سے اپنے ذہن میں دوبارہ جنم دیتا ہے اور ان چھوٹی چھوٹی یادوں کے ذخیرے سے نئے نئے رشتے قائم کرتا ہے ۔ ایک بات اور ہے : شیخ صاحب نے کہا تھا کہ ریل گاڑی انسان کا اسم ہے ۔ لیکن یہ اسم صرف اُس وقت کارفرما ہوتا ہے جب ریل کی کھڑکی کھلی ہو ۔ ریل کے بند ڈبے میں اگر ریل کی رفتار یکساں رہے تو کوئی بھی ایسا تجربہ نہیں ہو سکتا جس سے ہمیں یہ ثابت ہو جائے کہ ریل گاڑی چل رہی ہے ۔ ریل میں حرکت اُسی وقت محسوس ہو گی جب ریل کی رفتار بدلتی ہے یا کھڑکی کھلی ہو ۔ مسافر جو بے شک ریل میں بیٹھے ہوں اگر اُنھوں نے کھڑکیاں بند کر رکھی ہیں تو وہ محض مادی اجسام ہیں ، اُنھیں کسی تخلیقی عمل کا یارا نہیں ۔

انتظار: ہمارے ہاں ادب کا ایک پورا دور ایسا گزر چکا ہے جو یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ شاعر اور افسانہ نگار دریچے بند کیے ڈبے کے اندر بیٹھے ہیں اور مسافروں کے شور ہی کو سفر کا پورا تجربہ تصور کر رہے ہیں ۔ گاڑی پٹری بدلے ، سٹیشن آئیں اور گزر جائیں یا گاڑی رک جائے ، اس کا اُنھیں مطلق احساس نہیں ۔ یوں کہیں کہیں ایک خواہش نظر آتی ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کو ساتھ لے کر دریچے کے قریب بیٹھیں یا وہ اسی خیال میں مگن ہو لیتے ہیں کہ اور کچھ نہیں تو ذہن ہی میں دریچہ کھل گیا ہے ۔ لیکن یہ محض ایک وقتی خواہش ہے کوئی پائیدار لگن نہیں ۔

حنیف: وہ دریچے کے قریب بھی جا بیٹھیں تو فرق نہیں پڑتا ۔ اُن کے دریچوں پر بھی اندھے شیشے چڑھے ہوئے ہیں ۔

شیخ: یہ دریچے حرکت نہیں کرتے بلکہ نظر بھی حرکت نہیں کرتی ۔ دیکھنے والا بھی ساکت ہے ۔ ایک ساکت دنیا تو انھیں نظر آ سکتی ہے لیکن چلتی پھرتی دنیا کا نظر آنا ان کے لیے ناممکن ہے ۔

انتظار: میر کے یہاں کمرے کا دریچہ بند ہے لیکن ذہن اور تخیل کے دریچے کھلے ہیں ۔

اس لیے وہاں پٹری بدلنے کا احساس بھی موجود ہے اور جا بجا نئے منظر بھی آنکھوں کے سامنے آئے ہیں۔

شیخ: دریچے کے بغیر کمرہ اُس معاشرے کی طرح ہے جس میں اپنے آپ سے ماورا دیکھنے کی کوئی راہ نہیں۔ اور فرد اور فنکار معاشرے میں گھٹ کے مر جانے پہ مجبور ہیں اور اُن کی زبان سے نکلی ہوئی چیخ کمرے کے شور میں گم۔

انتظار: ہمارے نقادوں نے کوئسلر کے حوالے سے ترگنیف کے بارے میں اس روایت کو بار بار بڑی شد و مد سے دہرایا ہے کہ وہ کہا کرتا تھا، میں لکھتے وقت دریچہ کھلا رکھتا ہوں اور پیر گرم پانی کی بالٹی میں ڈالے رکھتا ہوں۔ اور اس روایت کو بنیاد بنا کر میر کے بند دریچے پر لعنت ملامت بھی خاصی کی گئی ہے۔ ہمارے لکھنے والوں میں سے بہت سوں نے اس کا مطلب یہ بھی سمجھا کہ آندھی بھی چل رہی ہو تو دریچے کے پٹ بالکل کھلے رکھو، خواہ اس سے کاغذ ہی کیوں نہ اُڑ جائیں۔ اس انداز سے سوچنے والے ادیبوں کے ساتھ یہی گزری ہے کہ دریچہ یا تو گندی اور اندھی گلی کی طرف کھلا یا آندھی ایسی چلی کہ کاغذوں کے ساتھ کام کی بات بھی غائب ہوگئی۔ ترگنیف دریچہ کھلا رکھتا تھا لیکن ہوا کا رخ بھی دیکھ لیتا تھا اور یہ بھی امتیاز رکھتا تھا کہ دریچے کے باہر جو کچھ دکھائی دے اُس میں سے کیا لینا چاہیے۔

ناصر: حنیف! تم کہہ رہے تھے کہ دریچہ ریل گاڑی کی آنکھ ہے۔ میر صاحب نے بھی یہی بات یوں کہہ رکھی ہے۔

رخنۂ دیوار ہے یا دیدۂ نظارگی

کمرے کا دریچہ وہ اس لیے بند کر دیتا تھا کہ اُسے بلبل کا شور ناگوار تھا۔ یہ بلبل محض بلبل نہیں کچھ اور بھی ہے۔ میر صاحب جب بھی مرغان چمن کا شور سنتے بے دماغی کر کے باغ سے اُٹھ کر چلے جاتے۔ اُنھیں اپنے کمرے ہی میں طرفہ طرفہ کار دل نظر آتے اور در و دیوار کا رنگ دیگر ہو جاتا۔

حنیف: جن لوگوں کے یہاں دریچہ نہیں ہے اُن کے یہاں وقت کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اُن کے یہاں محض تفاصیل ہوتی ہیں۔ ان تفاصیل سے وہ کوئی وحدت نہیں تخلیق کرتے۔ اُن کے یہاں وقت صرف گزرتا ہے اُس کی کوئی ہیئت نہیں ہوتی۔ وہ لمحوں ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اُنھوں نے یہ نہیں محسوس کیا کہ کوئی لمحہ ساکت نہیں ہوتا، اس میں تبدیلی اور حرکت ہوتی ہے، ہر لمحے سے پہلے بھی ایک لمحہ تھا اور اس کے بعد بھی ایک لمحہ ہوگا، یہ سارے لمحے مل کر ایک جسم اختیار کریں گے۔ یہ بات ویسی ہی ہے جیسے کوئی عامی نغمے پر سردھن رہا ہوتا ہے اور اُس کی توجہ محض آواز کے اُتار چڑھاؤ ہی تک محدود ہوتی ہے لیکن پورے نغمے میں مدھم اور پنچم سروں اور سرتیوں کا کیا مقام ہے، پورے نغمے کی کیا شکل بنتی ہے، اس اُسے سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

انتظار: لمحہ لمحوں سے پیدا ہوتا ہے اور لمحوں کو جنم دیتا ہے۔ لمحے کو گرفت کر لیا تو وقت کا احساس بھی پیدا ہو جائے گا۔ لیکن لمحے اور لمحاتی کیفیت میں فرق ہے۔ ہمارے یہاں ایسے افسانے اور نظمیں تو بے شک مل جائیں گی جو لمحاتی کیفیت پیش کرتی ہیں، لمحے کی دلہن کے درشن کہیں نہیں ہوتے۔

ناصر : وقت کے چکر میں لاکھوں لمحے اُڑتے پھرتے ہیں ۔ اگر دھاندلی میں ایک لمحے کو چٹکی میں پکڑ بھی لیں تو کیا کائنات گرفت میں آ جائے گی ؟

انتظار : کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دیوار کے کسی سوراخ میں سے سانپ کی بس ذرا سی دم دکھائی دیتی رہتی ہے ۔ باقی پورا سانپ دیوار کی اندھیری میں گم ہوتا ہے ۔ ہوشیار سپیرا دم چٹکی میں پکڑ لیتا ہے سانپ دم چھڑانے کے لیے دم کو ڈھیل دیتا ہے اور سپیرے کا پورا ہاتھ دم پر جم جاتا ہے ۔ یوں دھیرے دھیرے گردن تک پورا سانپ باہر آ جاتا ہے ۔ پھر اُس کا منہ اُس کی گرفت میں ہوتا ہے ۔ یہ منہ وقت ہے اور وہ پھیلتی ہوئی دم اور دھڑ لمحوں کی زنجیر تھی ۔ اس لمحوں کی زنجیر کے سہارے وقت کا ناگ مٹھی میں آتا ہے ۔

شیخ : سانپ کو قابو میں لانے کا خیال آدم کو نہ آیا اور اُسے جنت سے زمین پر آنا پڑا ۔ سانپ کی بات اس نے حیرانی سے سنی کیونکہ سانپ اس کی آن جانی خواہشات کا اسم تھا ۔ آدم وقت سے ماورا تھا مگر اب وقت کے تابع ہوگیا ۔ آن جانی خواہشات شعور تک پہنچیں اور آدم جسم کی پہنائیوں اور تنہائیوں میں کھوگیا ۔

حنیف : سانپ وشنو جی کا ایک روپ ہے ۔ وہ زمین کا بادشاہ ہے ۔ وہ زمین پر اور زمین کے اندر اور پانیوں میں رہتا ہے ۔ جب زمین پر انسان پیدا ہو گئے تو وشنو جی نے سانپ کو زمین کی سطح سے نکل جانے کا حکم دیا اور سمندر کی حدود میں محدود کر دیا ۔ زمین اور انسان کے ساتھ ساتھ وقت کی بھی مختلف منزلیں سامنے آئیں ۔ جب جہانوں کا خاتمہ ہوتا ہے اور نیا جگ چکر چلاتا ہے تو وشنو جی پانیوں پر سانپ کے جسم پر بیٹھے حرکت کرتے ہیں ۔ جوں جوں انسان اس منظر میں داخل ہوتا ہے وشنوجی کو جہانوں کی نگہبانی کے لیے ایک ایسی سواری کی ضرورت پیش آتی ہے جو بہ یک وقت زمین کے اندر ، پانیوں میں اور ہوا میں سفر کر سکے ۔ اب سانپ وقت کا اسم نہیں رہتا ۔ اب وقت کے اسم کے لیے محض زمینی منظر تک محدود ہونا ناممکن ہے ۔ اب تو وقت کے تصور میں زمین اور آسمان ، دونوں سموئے جانے لازم ہیں ——

کرشن جی بھی وشنو ہی کے اوتار ہیں ۔ ایک مرتبہ سانپ نے اپنی حدود سے نکل کر زمین کا رخ کیا اور انسانوں کو تنگ کرنا شروع کیا تو کرشن جی نے پانیوں میں کود کر سانپ راجا سے جنگ کی اور اُسے واپس سمندروں میں بھگا دیا ۔

انتظار : سانپ زمین کا بادشاہ ہے ۔ زمین تو اُس کی دنیا ہے ۔ جہاں قدم مٹی کو چھوتے ہیں وہاں سے حواس کی اقلیم شروع ہوتی ہے ۔ حواس کی اقلیم گزرتے وقت کے تابع ہے ۔ آدم نے سانپ کا کہا مانا ۔ شعور تو اُس کا بیدار ہوگیا مگر حواس گزرتے وقت کے محکوم بن گئے ۔ سانپ بنی آدم کے خون میں اترگیا ۔ اُس وقت سے اب تک سانپ اور اولاد آدم میں جنگ چلی آتی ہے ۔ جو ہارا اُس نے ضحاک کی طرح اپنے وجود کو ایک دوزخ بنا لیا ۔ جو جیتا اُس کی مٹھی میں آ کر سانپ عصائے کلیمی بن گیا ۔ گزرتا وقت تخریب پسند ہے ۔ جب یہ تخریب خود اپنے اُوپر لوٹتی ہے اور سانپ اپنے آپ کو کھانا شروع کرتا ہے تو پھر وہ زمان کا اسم بن جاتا ہے ، اُس وسعت کا جسے پانچویں وسعت کہا جاتا ہے ۔ گزرتے وقت کی ہڈیوں پہ زمان کی سلطنت کی تعمیر ہوتی ہے ۔

حنیف : جس سانپ کو کرشن جی نے سمندروں میں بھگا دیا تھا وہ گزرتے وقت کا اسم تھا اور جس سواری پر وشنو جی سوار ہو کر جہانوں کی نگہبانی کرتے ہیں وہ زمان کا اسم ہے ۔ نطشے کا فوق‌البشر وہ شاہین ہے جس کے پنجوں میں سانپ لپٹا ہوا ہے اور وہ آفاق کے سفر پہ

روانہ ہے ۔ اب اس اسم میں زمینی اور آسمانی صلاحیتیں اکٹھی ہو گئی ہیں ۔ سانپ زمین کا بادشاہ اور شاہین آسمانوں کا ۔

اگر آدمی کو انسان بننا ہے اور انسان سے ' ہیرو ' تو اسے سانپ سے نپٹنا ہی پڑتا ہے ۔ ہرقلیس نے اژدہے کے سر کاٹے تو اسے ہیرو کا مرتبہ ملا ۔ اپنے یہاں بھی اکثر کہانیوں کے شہزادے جب اژدھوں سے دو چار ہوتے ہیں اور ان پر فتح پاتے ہیں تو انھیں گوہر مقصود ملتا ہے ۔

ناصر : کہتے ہیں سانپ پلنگ پر نہیں چڑھ سکتا ۔ ہاں اگر کوئی جوتیوں سمیت پلنگ پر بیٹھنے لگے تو سانپ اس پلنگ پر نہ صرف چڑھ سکتا ہے بلکہ وہاں کسی کو نہیں سونے دیتا ۔ انتظار نے سانپ اور اولاد آدم کی ازلی دشمنی کا ذکر چھیڑا ہے ۔ لیکن ایک جگہ اسی سانپ کو میں نے انسان کا مطیع بھی دیکھا ہے ۔ حضرت موسیٰ کا واقعہ تو تم نے بیان کر دیا۔ حضرت علی نے بھی تو جھولے میں پڑے پڑے کلہٗ اژدر کر چیر دیا تھا ۔ ایک اور بات جو حضرت علی کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دفعہ آپ مسجد کے چبوترے پہ بیٹھے تھے ۔ لوگ آپ کے گرد جمع تھے کہ ایک اژدھا آیا اور آپ کے کان میں کچھ کہہ کر چلا گیا ۔ لوگوں نے حضرت علی سے استفسار کیا تو انھوں نے کہا کہ آج سانپوں کا راجہ مر گیا ہے اور یہ اژدھا اُن کی خلافت کے متعلق مجھ سے مشورے کے لیے آیا تھا ۔ یہاں سانپ جو وقت کا اسم ہے انسان سے مشورہ کرتا ہے ۔

انتظار : سانپ اور جوتی کا رشتہ آدم کے وقت سے چلا آتا ہے ، جب اللہ میاں آدم اور حوا پہ ناراض ہوئے تو انھوں نے یہ سزا دی کہ عورت سانپ کو جوتی سے کچلے گی اور سانپ آدمی کی ایڑی پہ حملہ کرے گا ۔

حنیف : یوں کیوں نہیں سمجھتے کہ سانپ زمین کا مالک تھا ، جب اُس نے خدا کی نافرمانی کی اور آدم کو بہکایا تو اُس سے یہ بادشاہی چھن لی گئی اور زمین پر انسان کو مسلط کر دیا گیا ۔ سانپ اپنی کھوئی ہوئی بادشاہی حاصل کرنے کے لیے آج تک کوشش کر رہا ہے اور جب بھی اُسے موقع ملتا ہے وہ انسان کو ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ جب انسان پلنگ پر چڑھتا ہے تو جوتیاں زمین پہ ہوتی ہیں ۔ سانپ جوتیوں میں آ بیٹھتا ہے ۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جوتیاں جھاڑ کر پہنا کرو ۔

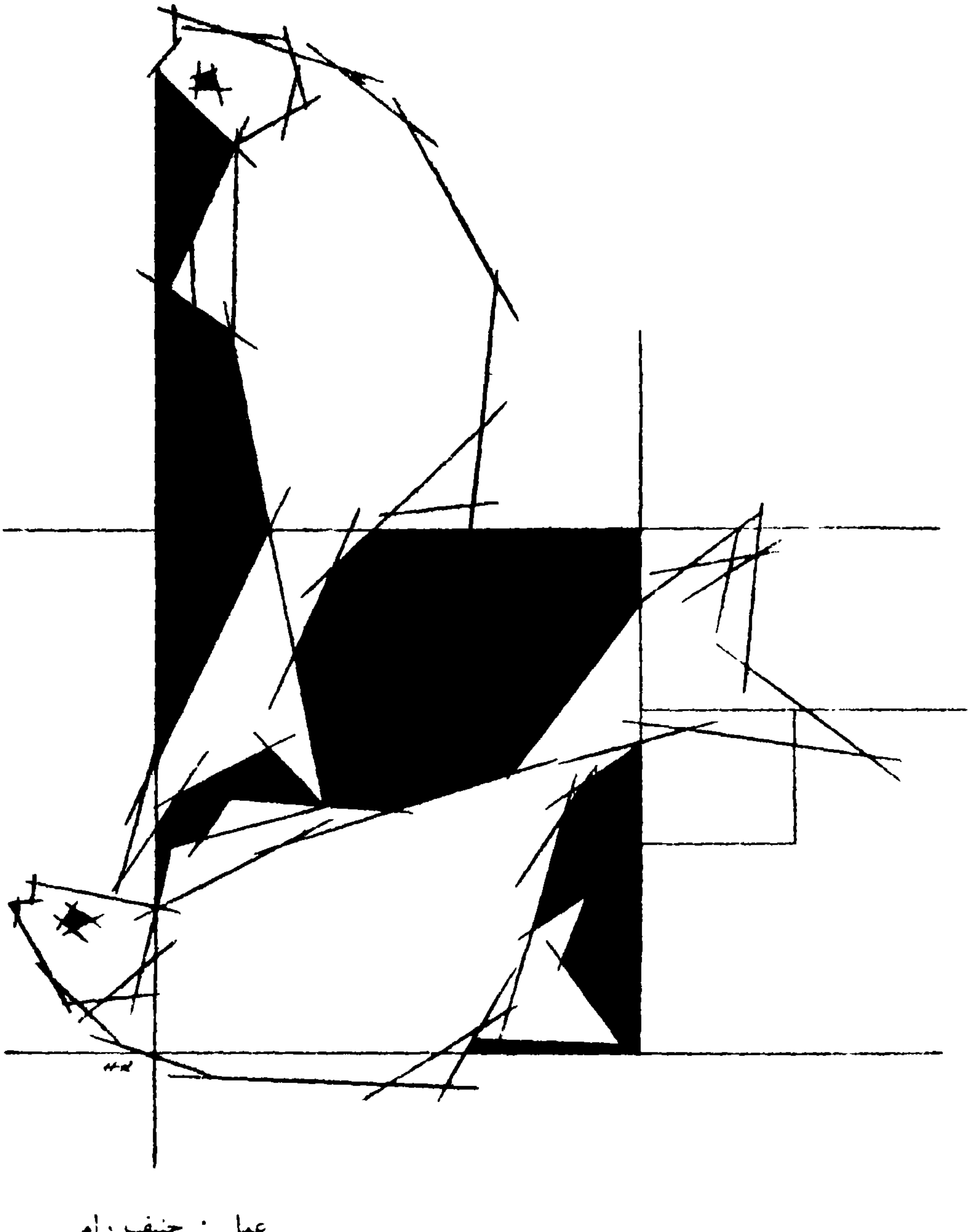
انتظار : انسان زمین کی حکومت کسی حال میں بھی چھوڑنا نہیں چاہتا ۔ وہ جب چارپائی پر چڑھتا ہے تو جوتی کو اپنا نائب بنا کر زمین پر چھوڑ جاتا ہے ۔ انسان کے جو اعضا زمین اور انسان میں رشتہ پیدا کرتے ہیں سب سے زیادہ پیر سانپ کو ان سے ہوتا ہے ۔ جبھی تو وہ ایڑی پہ حملہ کرتا ہے اور شاید اسی لیے وہ جوتی کے اندر بیٹھ کر کاٹتا ہے ۔ اپنی بڑی بوڑھیوں سے یہ بھی سنا ہے کہ جوتی پہ جوتی سوار ہو تو آدمی سفر کرتا ہے ۔ جوتی پہ جوتی کی سواری سفر کا اسم ہے اور جوتی سانپ کے سر کو کچلتی ہے ۔ سفر گزرتے وقت پہ ظفر پانے کا وسیلہ ہے ۔

شیخ : جب وقت نہ تھا تو آدمی مادے میں گم ، بے خبر اور بے علم تھا ۔ سانپ نے اس کے اندر آن جانی آرزوؤں کو جنم دیا اور وقت سے آشنا کیا۔ مادہ اور وقت انسان کو ہر قدم پر گھیرے رہتے ہیں ۔ اور اگر آدمی انسانیت کی طرف روانہ ہے تو وقت اور مادہ دونوں ایک بار پھر اس کے شعور سے غائب ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی اولیت کی طرف لوٹتا بھی ہے اور اس سے دور بھی ہوتا ہے ۔ ہمارے دور میں آدمی کو مادہ اور وقت پھر گھیرے ہوئے ہیں مگر سانپ کہاں سے آئے ! سانپ تو دھرتی کی گپھاؤں میں سو رہا ہے ۔ اب اس دھرتی پر سانپ کی جگہ سانپ

کی جگہ ریل گاڑی نے لے لی ہے اور انسان اس پر وشنو کی طرح سواری کرتا ہے ۔ محض اس لیے کہ وہ انسان بن سکتا ہے ۔ انسان بننے کے لیے وشنو سماں گیان اور دھیان کی ضرورت لازم ہے ۔ لیکن وشنو کا گیان اور دھیان انسان کے بس میں اس وقت تک نہیں جب تک کہ وہ صناع نہیں ہے ۔ صناع اپنے گرد و پیش کے جہاں کو سمیٹ کر اپنے اپنے اندر بسا لیتا ہے اور اپنے تخیل کو اپنے اندر سے باھر نکالتا ہے اور عدم کے اندھیرے میں بار بار جھانکتا ہے اور تخیل جب عدم پر محیط ہو جاتا ہے تو پھر ایک نئے جہاں کا اندر سے باھر وجود قائم ہونے لگتا ہے ۔ یہی وہ سماں ہے جب آدمی پریشان ہو جاتا ہے مگر صناع کے لیے عدم اسی طرح لازم ہے جس طرح وجود ۔ وہ عدم اور وجود دونوں کو بہ یک وقت دیکھ سکتا ہے اور خلق کرتا ہے جو ایک جہاں کو عدم کی راہ دکھاتا ہے اور دوسرے کو جنم دیتا ہے ۔ اور یہی صناع جب ریل گاڑی کی کھڑکی میں بیٹھتا ہے تو ماحول سے ، فضا سے کٹے ہوئے مناظر کو اپنے اندر آتارتا چلا جاتا ہے ۔ ریل گاڑی کی کھڑکی سے وقت اور کٹتی ہوئی زمین ، دونوں پر آنکھ رکھتی ہے ۔ یہاں سے ہر شے ، ہر منظر ، ہر آواز ، ہر رنگ ، ہر لمحہ اپنی طہارت کا روپ دھارے صناع کے ذہن تک پہنچتا ہے ۔ اور ایسا ہونا اس لیے ممکن ہے کہ صناع اور انسان کی فضائے یاد کی نوعیت میں ایک خاصیتی فرق ہے اور یہ فرق انسان اور صناع کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج ہے ۔ صناع کی فضائے یاد ایک بہت بڑا نظام اجرام ہے جہاں زمانی اور مکانی حادثات اپنے ماحول سے کٹ کر چھوٹے بڑے سیاروں کی صورت میں اپنے اپنے مقام پر قائم ہو جاتے ہیں اور یہ نظام جب صناع کی فضائے یاد سے نکل کر ایک بار پھر مکاں اور زماں میں داخل ہو جاتا ہے تو ایک ہمہ گیر اور عالم گیر حادثے کی صورت اختیار کرتا ہے ۔ اور اس حادثے میں سماج یا خود صناع کی موت ہو جانا بعید از قیاس نہیں ۔ اس کے برعکس عام انسان کا ذہن ایک ہوٹل ہے جہاں حادثے مسافروں کی طرح آتے ہیں ، کچھ عرصہ قیام کرتے ہیں ، پھر اپنا پتا دیے بغیر کہیں اور چلے جاتے ہیں۔

بے ترتیب

کلیم الدین احمد
حنیف رامے
نصیر انور
سید رضی ترمذی
مجنوں گورکھپوری



عمل : حنیف رامے

ترتیب

آزاد نظم

کلیم الدین احمد

انگریزی میں شاعروں کا ایک گروپ تھا جو امیجسٹ کے نام سے مشہور ہے ۔ ان شاعروں کا خیال تھا کہ ان کے عہد کی شاعری کھوکھلی اور مبہم سی چیز ہوگئی ہے جس میں کھوکھلے جذبات کی کھوکھلی نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ وہ نئی قسم کی شاعری کے خواہاں تھے جس میں یہ خامیاں نہ ہوں ۔ اپنی نظموں میں وہ دو چیزوں کا خاص طور سے التزام رکھتے تھے ۔ ایک تو یہ کہ کھوکھلے جذبات کے عوض کوئی ٹھوس قسم کا تصور یا پیکر ، ٹھوس قسم کی تصویر یا تمثال ہو جو صاف صاف دکھائی دے ۔ دوسری چیز یہ تھی کہ بنے بنائے بندوں کے عوض (جن میں وزن اور قافیے مل کر ایک خاص سانچہ بناتے اور اسی سانچے کی نظم میں تکرار ہوتی) وہ چاہتے کہ تجربہ اپنے سانچے آپ بنائے اور یہ سانچے ایک بند سے دوسرے بند میں تجربہ کے زیر و بم کے ساتھ بدلتے رہیں ۔ اور اسی تجربے کے دباؤ سے بدلتے ہوئے سانچے کو آزاد نظم کہتے ہیں ۔

اس گروپ کے شاعروں کا کہنا تھا کہ روایتی شعراء بنے بنائے سانچے استعمال کرتے تھے ۔ ان سانچوں میں چار ، چھ ، آٹھ ازیں قبیل مصرعے ہوتے ، قافیوں کی ایک خاص ترتیب ہوتی ، مصرعے چھوٹے بڑے بھی ہوتے مثلاً پہلے مصرع میں چار ارکان ہوتے تو دوسرے میں تین رکن ہوتے لیکن یہ سانچہ بن جانے کے بعد اسی کی تکرار ہوتی ۔ نظم میں جتنے بھی بند (اسٹینزاز) ہوتے وہ ایک ڈھنگ کے ۔ اسی وجہ سے ایک دشواری ہوتی ۔ تجربہ کو ایک چشمہ سمجھئے ۔ اس چشمہ کا پانی ایک طرح نہیں بہتا ۔ کبھی تیزی سے بہتا ہے تو کبھی آہستہ ۔ کبھی یہ ایسا نرم سیر ہوتا ہے کہ جیسے ' تصویر آب ' ہو ، کبھی ہلکی ہلکی لہریں ہوتی ہیں تو کبھی یہ لہریں بلند ہوجاتی ہیں ۔ اور کبھی بھنور کی کیفیت ہوتی ہے ۔ کبھی ہلکے ہلکے بلبلے بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں تو کبھی جھاگ نظر آتی ہے ۔ کبھی دھیمی دھیمی سرسراہٹ کی آواز آتی ہے تو کبھی آواز کی لے تیز ہوجاتی ہے ۔ غرض کہنا یہ ہے کہ تجربے میں ان گنت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور ان تبدیلیوں کو بنے بنائے سانچے میں واضح کرنا ممکن نہیں ۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ ہر تجربہ اپنا سانچہ آپ بناتا ہے اور آزاد نظم میں تجربے کی ان گنت ہونے والی تبدیلیوں کو دکھایا جاسکتا ہے ۔ اس میں بنے بنائے سانچے کو توڑ مروڑ نہیں کرنا ہوتا ہے ، تجربے کے دباؤ سے سانچہ بدلتا رہتا ہے اور ہلکی سے ہلکی تبدیلی سانچے میں دکھائی دیتی ہے ۔

یہ کہنا درست نہیں کہ روایتی بندوں میں تجربے کی ہونے والی ان گنت تبدیلیاں واضح نہیں ہوتیں یا نہیں ہوسکتی ہیں ۔ ایک ڈن کو لیجئے جو کافی پیچیدہ قسم کے بند استعمال کرتا ہے لیکن اس کی نظموں میں تجربوں کا زیروبم ، جذبات کا آتار چڑھاؤ ، آواز کی نرمی یا بلندی ، حرکت کی تیزی یا سستی ، غرض ہلکی ہلکی تبدیلیاں جو برابر ہوتی رہتی ہیں ایسی واضح نظر آتی ہیں کہ آزاد نظم میں بھی تجربوں اور فورم میں اس سے زیادہ کامل ربط ممکن نہیں ۔ روایتی قسم کے بندوں میں اس قسم کا کامل ربط مشکل ضرور ہے ، آزاد نظم میں کچھ آسانی ہوتی ہے ۔

آزاد نظم سے متعلق بہت سی ایسی باتیں کہی جاتی ہیں جن کا آزاد نظم سے کوئی خاص تعلق نہیں : " جدید نفسیات کے ماہروں نے ذہن لاشعور کو ناپنے کے لیے آزاد تسلسل کا طریقہ ایجاد کیا ہے ۔ کسی شخص سے مخاطب ہو کر ایک فہرست میں سے منتخب الفاظ یا

فقرے بولے جاتے ہیں اور اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ ہر سوال کا جواب اُن الفاظ یا الفاظ کے مجموعے سے دے جو سب سے پہلے اس کے ذہن میں آئیں ۔ ان جوابات سے اس مرد کی زیر نفسی کیفیت کے متعلق نتائج مرتب کئے جاتے ہیں ۔ شعر کی بھی ایک حد تک یہی کیفیت ہے ۔ شاعر کے دل میں ایک خیال اُٹھتا ہے ۔ پھر اُس کا ذہن لاشعور اس خیال سے وابستہ دوسرے خیالوں اور تصویروں کو کھینچ لاتا ہے اور انھیں شعر کی صورت میں منتقل کردیتا ہے .. یہ تصویریں اتنی برق رفتاری سے ذہن لاشعور سے کھنچی چلی جاتی ہیں کہ ان میں پوری طور پر کسی تسلسل کا اندازہ نہیں ہوسکتا ۔"

شعر کی یہ کیفیت نہیں ۔ اس قول میں صحت بس اسی قدر ہے کہ شاعر کے دل میں جو خیال اُٹھتا ہے وہ اُس خیال سے وابستہ دوسرے خیالوں اور تصویروں کو کھینچ لاتا ہے ۔ یہ حالات ، یہ تصویریں شعوری بھی ہو سکتی ہیں اور تحت الشعور سے بھی اُبھر سکتی ہیں ۔ لیکن یہ چیزیں شعوری ہوں یا تحت الشعور سے اُبھریں ، یہ شعور کی زد میں آتی ہیں اور شاعر ان سے شعوری طور پر کام لیتا ہے اور اپنے فنی کارنامے کی تکمیل کرتا ہے ۔ اگر ان خیالوں اور تصویروں میں ایسی برق رفتاری ہو کہ ان میں تسلسل باقی نہ رہے تو یہ فنی خامی ہوگی ۔ یہ کہنا کہ یہ تصویریں تحت الشعور یا لاشعور سے بہت برق رفتاری سے اُبھری ہیں ، فنی خامی کا جواز نہیں ہو سکتا ۔ پھر یہ برق رفتاری تو دوسری صنفوں میں بھی مل سکتی ہے آزاد نظم اس کی مخصوص جولاں گاہ نہیں ۔ لاشعور کی طرح جنسیات کی بھی بات اُٹھائی جاتی ہے ۔ میراجی کہتے ہیں :۔

" بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کا محض جنسی پہلو ہی میری توجہ کا واحد مرکز ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ۔ جنسی فعل اور اُس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتا ہوں ۔ اور جنس کے گرد جو آسودگی تہذیب و تمدن نے جمع کر رکھی ہے وہ مجھے ناگوار گزرتی ہے ۔ اس لیے رد عمل کے طور پر میں دنیا کی ہر بات کو جنس کے اس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور ۔ جو میرا آدرش ہے ۔"

یہ کوئی نئی بات نہیں ۔ ڈی ۔ ایچ ۔ لارنس بھی دنیا کی ہر بات کو جنس کے تصور کے آئینہ میں دیکھتا ہے ۔ میراجی کی توجہ کا واحد مرکز زندگی کا محض جنسی پہلو ہو یا نہ ہو اس بات سے سردست مجھے کوئی سروکار نہیں ۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ لاشعور کی طرح زندگی کا جنسی پہلو بھی آزاد نظم کی ملکیت نہیں ۔ یہ زندگی کا جنسی پہلو تو ادب میں دوسری جگہوں میں بھی ملتا ہے اس لیے آزاد نظم میں زندگی کے جنسی پہلو کا ہونا غیر متعلق سی بات ہے ۔ یہ ہو بھی سکتا ہے اور نہ بھی ہو سکتا ہے اور اس کے ہونے نہ ہونے سے آزاد نظم کی ٹکنیک ، اس کی اچھائی یا برائی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ۔

ایک اور بات جو آزاد نظم سے متعلق کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ آزاد نظمیں کسی حد تک مبہم اور ناقابل فہم ہوتی ہیں ۔ "... راشد کا محاورہ بھی ذاتی اور نفسیاتی ہے ۔ اُس کا جذباتی تسلسل ہم آہنگ اور آزاد ہے اور وہ منطقی ماحول جو وہ اپنی نظموں میں پیدا کرتا ہے ، اکثر پڑھنے والوں کے لیے مبہم ہے ۔" اور میراجی کہتے ہیں :۔

" بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں صرف مبہم بات کہنے کا عادی ہوں ، لیکن ذرا سا تفکر انھیں سمجھا سکتا ہے کہ بہت سی اور باتوں کی طرح ابہام بھی ایک اضافی تصور ہے اور پھر زندگی بھی تو ایک دھندلکا ہے ، ایک بھول بھلیاں ، ایک پہیلی ۔ اسے بوجھ نہ سکے تو ہم زندہ نہیں مردہ ہیں ۔ مختلف انسانوں میں بصیرت کے مختلف درجے ہیں ۔ اور بصارت کے مختلف طریقے انھیں حاصل ہیں ۔ ان سے کام لینا ہی زندگی کا نام ہے ۔"

خیر یہ سب تو محض باتیں ہی باتیں ہیں ۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ نظموں کا مبہم اور ناقابل فہم ہونا ، محاورے کا ذاتی اور نفسیاتی ہونا ، بصیرت اور بصارت کے مختلف درجوں اور طریقوں کا ہونا ۔ یہ اور اس قسم کی چیزیں آزاد نظم کی جاگیر نہیں ۔ پابند نظمیں بھی مبہم اور ناقابل فہم ہوتی ہیں ۔ براؤننگ کو لیجئے ۔ بلیک کی ' پروفیٹک ' نظموں کو لیجئے ۔ پھر نثر میں یہ سب چیزیں ہو سکتی ہیں ۔ جیمس جوائس کی نثر میں جس حد تک یہ سب باتیں ملتی ہیں اس حد تک ایلیٹ اور پاؤنڈ کی نظموں میں بھی نہیں ملیں ۔ بات یہ ہے کہ اردو میں تقلید تو فطرت ثانی ہو گئی ہے ۔ ایلیٹ ، پاؤنڈ وغیرہ کی نظمیں مبہم ہیں پھر اردو نظمیں کیسے مبہم نہ ہوں ؟ آزاد نظم مبہم بھی ہو سکتی ہے اور بلور کی طرح صاف و شفاف بھی اور مبہم ہونا آزاد نظم کی خصوصیت نہیں ۔

میں نے اوپر کی سطروں میں جو باتیں کہی ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ ذرا میدان صاف ہو جائے اور غیر متعلق باتیں بیچ میں نہ آنے پائیں ۔ آزاد نظم کا جواز وہی ہے جو پابند نظم کا ہے ۔ یعنی تجربے کا شاعر نے جس طرح بیان کیا ہے وہ کسی دوسری صورت میں ممکن نہ تھا ۔ جو سانچے اس نے بنائے ہیں وہ کسی اندرونی ضرورت کا نتیجہ ہیں ، جو تبدیلیاں سانچے میں دکھائی دیتی ہیں وہ تجزیے کے دباؤ کی وجہ سے ہیں ، اتفاقی نہیں ، تجربے اور فورم میں ربط کامل ہے ۔ لیکن اردو میں جو آزاد نظمیں لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں ان میں یہ باتیں نہیں ملتی ہیں ۔ زیادہ سے زیادہ آزاد نظمیں قصداً لکھی جاتی ہیں اس لیے کہ اس قسم کی نظموں میں آسانیاں زیادہ ہیں ۔ نالہ پابند نے نہیں ہوتا ، فریاد کی کوئی لے نہیں ہوتی ۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی ۔ راشد کی نظم ' دریچے کے قریب ' کو لیجئے جو اس قسم کی نظموں میں اچھی شمار کی جاتی ہے :—

جاگ اے شمع شبستان وصال
مخمل خواب کے اس فرش طربناک سے جاگ !
لذت شب سے ترا جسم ابھی چور سہی ۔
آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ کس پیار سے انوار سحر چومتے ہیں
مسجد شہر کے میناروں کو
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے !

سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول مے رنگ جنوں خیز آنکھیں !
اسی مینار کو دیکھ
صبح کے نور سے شاداب سہی
اسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بے کار خدا کے مانند
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملائے حزیں
ایک عفریت — اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں

ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی !

دیکھ بازار میں لوگوں کا ھجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں
جیسے جنات بیابانوں میں
مشعلیں لے کے سرشام نکل آتے ھیں !
ان میں ھر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دلہن سی بنی بیٹھی ھے
ٹمٹماتی ھوئی ننھی سی خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے
ان میں مفلس بھی ھیں ، بیمار بھی ھیں
زیر افلاک مگر ظلم سہے جاتے ھیں !

ایک بوڑھا سا تھکا ماندہ سا رھوار ھوں میں !
بھوک کا شاھسوار
سخت گیر اور تنومند بھی ھے
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ھر شب عیش گزر جانے پر
بہر جمع خس و خاشاک نکل جاتا ھوں -
چرخ گرداں ھے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ھوں
بے بسی میری ذرا دیکھ کہ میں
مسجد شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ھوں
جب انہیں عالم رخصت میں شفق چومتی ھے !

آزاد نظم میں اس بات کا آسانی سے التزام ھوسکتا ھے کہ باتوں میں تسلسل ھو ، سطریں ایک دوسرے سے جسپاں ھوتی جائیں ، غیر متعلق باتیں نہ آنے پائیں ، خانہ پری نہ ھو ، الفاظ کی ترتیب فطری ھو ، لب و لہجہ گفتگو کا ھو - اب اس نظم کو پڑھئیے - پہلی سطر میں لب و لہجہ وھی ھے ، لفظوں کا چناؤ بھی وھی ھے جو روایتی اردو شاعری میں ملتا ھے :-

جاگ اے شمع شبستان وصال
محمل خواب کے اس فرش طربناک سے جاگ

پھر اس کا میل چوتھی سطر کے بے تکلف لہجے سے اچھا نہیں معلوم ھوتا - یہ بات بھی ظاھر ھے کہ دوسری سطر میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ھے - جاگنا تو محمل خواب کے فرش طربناک ھی سے ھوسکتا ھے - اور یہ محمل خواب کے فرش طربناک میں آورد کی نشانی ھے - پھر تیسری سطر جملۂ معترضہ سی معلوم ھوتی ھے - اس کی چنداں ضرورت نہ تھی -

سب باتیں کہی نہیں جاتیں - اسی طرح اپنے برسوں کی تمنا کے خیال کو بھی چھپائے رکھنا چاہئے تھا - اس سے نظم کے ارتقا میں رکاوٹ ہوتی ہے - پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 'آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب ' کہنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا - اور شمع شبستان وصال مخمل خواب کے فرش طربناک سے نہیں جاگتی اس سے پھر کہنا ہوتا ہے : سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا کھول مے رنگ جنوں‌خیز آنکھیں ! یا شاید شبستان وصال دریچے کے قریب آ جاتی ہے لیکن آنکھیں نہیں کھولتی اور آنکھیں شاید سٹ گئی ہیں جو انہیں سیمگوں ہاتھوں سے کھولنا پڑتا ہے - اور پہلے اس نے مسجد شہر کے میناروں کو نہیں دیکھا تھا اس لیے دوبارہ کہنا ہوتا ہے کہ 'اسی' مینار کو دیکھ — اس یا اسی ؟ — جس کو پہلے انوار سحر پیار سے چومتے تھے اور جو اب صبح کے نور سے شاداب ہے - لیکن اصل غرض مینار سے نہیں بلکہ اس ملائے حزیں (ایک عفریت — اداس) سے ہے جو کسی تاریک نہاں خانے میں اپنے بے کار خدا کے مانند اونگھتا ہے -

لیکن ملائے حزیں تو کسی تاریک نہاں خانے میں چھپا بیٹھا ہے - آپ کیسے دیکھا جائے ؟ — اس لیے بازار میں لوگوں کے ہجوم کو دکھایا جاتا ہے اور 'ہجوم' کافی نہیں اس لیے یہ ہجوم 'بے پناہ سیل' کے مانند بھی ہے اور بیابانوں میں جنات کے مانند بھی - ایک تشبیہ شاید کافی نہ تھی - پھر سیل بے پناہ اور بیابانی جنات میں کوئی لگاؤ نہیں — سیل بے پناہ تو آپ نے دیکھا بھی ہوگا لیکن بیابانوں میں جنات کو سرشام مشعلیں لے کر نکلتے ہوئے شاید نہیں دیکھا ہوگا - تشبیہ کی غرض یہ ہے کہ معنی واضح ہو جائے - لوگوں کا ہجوم تو اکثر دیکھنے میں آتا ہے لیکن جنات کا ہجوم دیکھنے میں نہیں آتا - جزئیات بھی چسپاں نہیں ہوتیں ، یہ لوگوں کا ہجوم صبح کو ہے (انوار سحر چومتے ہیں) جنات سرشام نکلتے ہیں - پھر جنات مشعلیں لے کر نکلتے ہیں لوگوں کے ہجوم کے ہاتھوں میں مشعلیں نہیں - ہجوم بازار میں ہے جنات بیابانوں میں - اور ہجوم بے پناہ سیل کے مانند رواں ہے - معلوم نہیں جنات کیسے رواں ہیں - بات یہ ہے کہ سیل بے پناہ اور جنات جملۂ معترضہ ہیں - کہنا یہ ہے کہ ان میں ہر شخص کے سینے میں خودی کی قندیل ٹمٹماتی ہے - اور یہ خودی قندیل بھی ہے اور دلہن بھی — قندیل ٹمٹماتی ہے ، دلہن ٹمٹماتی نہیں - قندیل شعلۂ جوالہ بن سکتی ہے ، دلہن نہیں بن سکتی - دو استعارے خلط ملط ہو گئے ہیں -

لوگوں کے ہجوم سے نظر اپنی طرف لوٹتی ہے - بھوک کا شاہسوار سخت گیر اور تنومند بھی (یہ شاہسوار کہاں ہے ؟) اور بے چارا شاعر بوڑھا سا تھکا ماندہ سا رہوار ہے - 'بوڑھا سا' ، بوڑھا نہیں — 'تھکا ماندہ سا' ، تھکا ماندہ نہیں - جو ہر شب عیش گزر جانے پر بہر جمع خس و خاشاک نکل جاتا ہے اور شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہے اور پھر مسجد شہر کے میناروں کو اسی دریچے سے جھانکتا ہے - فرق یہ ہے کہ اب ان میناروں کو انوار سحر نہیں چومتے ، 'عالم رخصت' میں ، شفق چومتی ہے -

راشد کچھ کہنا چاہتے ہیں - لیکن یہ باتیں دوسری طرح سے بھی کہی جاسکتی تھیں - اس قسم کی باتیں وہ اپنی ایک دوسری نظم 'انسان' میں کہہ چکے ہیں :—

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں ، جاہلوں ، مردوں کی بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں !

ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی
بنا لی اے خدا اپنے لیے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جرأت تدبیر بھی تو نے
یہ داد اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بے زبانی کی !

ظاہر ہے کہ ' دریچے کے قریب ' میں کوئی نئی بات نہیں کہی گئی ہے . ہاں کہنے کا ڈھنگ نیا ہے ، نیا سانچہ بنایا گیا ہے ۔ لیکن اس سانچے میں فن کاری کا حسن نہیں ۔ اس میں بہت سے فروعات ہیں جن کی کوئی ضرورت نہیں ۔ دیکھئے :—

آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب
دیکھ ! کس پیار سے انوار سحر چومتے ہیں
مسجد شہر کے میناروں کو
انہی میناروں کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
آو سکھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہؤا ملائے حزیں
بین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی !
دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
ان میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ٹمٹاتی ہوئی روشن ہے خودی کی قندیل
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے ان میں سے کوئی شعلۂ جوالہ بنے
ان میں مفلس بھی ہیں بیمار بھی ہیں ۔
زیر افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شب عیش گزر جانے پر
بہر جمع خس و خاشاک نکل جاتا ہوں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
مسجد شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انہیں عالم رخصت میں شفق چومتی ہے !

۴۲ سطروں کی جگہ اب صرف ۲۲ سطریں ہیں لیکن کوئی کام کی بات چھوٹ نہیں گئی ہے ۔ تسلسل کچھ زیادہ ہے ، نظم کچھ کم پھس پھسی ہو گئی ہے ۔ لیکن پھر بھی کوئی بڑا کارنامہ نہیں ۔ اور صرف یہی بات کہ ۲۰ سطریں نکال دینے سے تسلسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس نظم کی فنی کمزوری کی سب سے بڑی دلیل ہے اور اس حقیقت کا اٹل ثبوت ہے کہ آزاد نظم کا سانچہ بنانا بہت مشکل ہے ۔

بات یہ ہے کہ آزاد نظم میں بھی غزلیت کی لت نہیں چھوٹتی ۔ توجہ کا مرکز شعر نہیں ، پیراگراف ہو جاتا ہے اور آخر میں ٹیپ کا مصرعہ ہوتا ہے : " اپنی برسوں کی تمنا کا خیال آتا ہے " " ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی " " زیر افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں " اس کے علاوہ جزئیات کے حسن پر نظر پڑتی ہے لیکن ' فورم ' کے حسن پر نہیں ۔

مخمل خواب کا فرش طربناک ، سیمگوں ہاتھ ، بے رنگ جنوں‌خیز آنکھیں ، جناب کا بیابانوں میں مشعلیں لے کر سرشام نکل آنا ، خودی کی قندیل کا دلہن سی بنی بیٹھنا — یہ سب اپنے اپنے رنگ میں خوش رنگ ہیں لیکن ' فورم ' کی رنگینی پر پردہ ڈال دیتے ہیں ۔ یہ نہیں کہ ' فورم ' کے حسن کا خیال نہیں ۔ اول نظم میں مسجد شہر کے مینار ہیں اور نظم انہیں میناروں پر ختم ہوتی ہے ۔ دوسری نظموں میں لفظوں اور مصرعوں کی تکرار سے اسی قسم کی حسن کاری کی کوشش ہوتی ہے لیکن کامیابی کم ہوتی ہے ۔ اور وجہ یہ ہے کہ جزئیات کی اہمیت ' فورم ' کی اہمیت کو پس پشت ڈال دیتی ہے ۔

میں نے کہا ہے کہ تجربے میں ان گنت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور آزاد نظم میں ان گنت ہونے والی تبدیلیوں کو دکھایا جا سکتا ہے اس میں بنے بنائے سانچے کو توڑ مروڑ نہیں کرنا ہوتا ہے ۔ تجربے کے دباؤ سے سانچہ بدلتا رہتا ہے اور ہلکی سے ہلکی تبدیلی سانچے میں دکھائی دیتی ہے ۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ۔ اس کے لیے لطیف و نازک قوت حاسہ کی ضرورت ہے اور ٹکنیک پر پورا پورا قابو بھی ۔ اردو نظموں میں سانچہ بدلتا ہے لیکن یہ تبدیلیاں تجربے کے دباؤ کی وجہ سے نہیں ہوتی ہیں ۔ آزاد نظم کا ڈھنگ رکھنے کے لیے بڑی چھوٹی سطریں ، بڑے چھوٹے مصرعے لکھے جاتے ہیں — اگر مصرعے بڑے چھوٹے نہ ہوں تو پھر آزاد نظم کیسے ہو؟— اور کبھی یہ تبدیلیاں اتفاقی ہوتی ہیں یا اٹکل پچو ہوتی ہیں ۔ لیکن ان خارجی تبدیلیوں اور اندرونی تبدیلیوں میں کوئی لگاؤ نہیں ہوتا ۔ اس لیے یہ تبدیلیاں بہت بھدی اور ناگوار معلوم ہوتی ہیں ۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :—

(۱) تیرے رنگیں رس بھرے ہونٹوں کا لمس
اور پھر ' لمس طویل !'
جس سے ایسی زندگی کے دن مجھے آتے ہیں یاد
میں نے جو اب تک بسر کی ہی نہیں
اور اک ایسا مقام
آشنا جس کے نظاروں سے نہیں میری نگاہ !

(۲) غم کا بحر بیکراں ہے یہ جہاں
میری محبوبہ کا جسم اک ناؤ ہے
سطح شور انگیز پر اس کی رواں
ایک ساحل ، ایک انجانے جزیرے کی طرف
اس کو آہستہ لیے جاتا ہوں میں
دل میں یہ جاں‌سوز وہم
یہ کہیں غم کی چٹانوں سے نہ لگ کر ٹوٹ جائے !

(۳) اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
رقص کی یہ گردشیں
ایک مبہم آسیا کے دور ہیں
کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں
جی میں کہتا ہوں کہ ہاں
رقص‌گہ میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے

بڑی جھوٹی سطریں ہیں لیکن انکل پچو قسم کی ۔ ' اور پھر لس طویل ' میں طالب علم کی سی ذہنیت ہے ۔ ' جس سے ایسی زندگی کے دن مجھے آتے ہیں یاد ' بھدا سا مصرع ہے ۔ لفظوں کی ترتیب بھی فطری نہیں ۔ اور باقی دو سطریں :—

اور اک ایسا مقام
آشنا جس کے نظاروں سے نہیں میری نگاہ

غیر ضروری بھی ہیں اور بھدی بھی ۔ دوسری مثالوں کو لیجئے : یہ جہاں غم کا بحر بیکراں ہے (اور) میری محبوبہ کا جسم اک ناؤ ہے (جو) اس کی سطح شور انگیز پر رواں ہے ۔ اس کو ایک ساحل ، ایک انجانے جزیرے کی طرف میں آہستہ لیے جاتا ہوں (اور) دل میں یہ حال سوز وہم (ہے کہ) یہ کہیں غم کی چٹانوں سے لگ کر ٹوٹ نہ جائے ۔ نثر میں زیادہ سلاست ہے ۔ '' میری محبوبہ کا جسم اک ناؤ ہے ۔'' بہت گرا ہؤا مصرع ہے ۔ اور پوری تشبیہ میں آورد ہے ، ثقالت ہے ، بھدا پن ہے ، کھینچ تان ہے ۔ اور ' دل میں یہ جاں سوز وہم ' تو بہت ہی پھس پھسا ہے ۔ مضحک سا مصرع ہے ۔ اور اثر تو خیر نام کو بھی نہیں ۔ نظم کی یہ ناؤ ٹوٹ ہی جائے تو اچھا ہے ۔ تیسری مثال میں بھی یہی بے حسی ہے ۔ 'جی میں کہتا ہوں کہ ہاں ' — جی میں بھی کہتے ہیں برملا بھی کہتے ہیں لیکن کہنے میں اثر نہیں ۔ غم بحر بیکراں ہو یا سنگریزہ ، غم نہیں ۔ اس لیے اس میں سوز نہیں ، تڑپ نہیں — اب ایک میراجی کی نظم دیکھئے ۔ نظم کا نام ہے ' ناداں '

یہ کیسے منظر ہیں ، کیسی باتیں ہیں مجھ سے جو کہنا چاہتی ہو ؟
سرود میں نے سنے ہیں پیڑوں کی ٹہنیوں سے
لچکتے نغمے ،
فلک پہ بہتے ہیں بادلوں کے جو ننھے ٹکڑے ۔
پھسلتے نغمے ،
ہوا کے جھونکوں سے میرے کانوں نے سن رکھے ہیں
مچلتے نغمے ،
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی ۔

ہوا سے بادل کے چند ٹکڑے بہے چلے جا رہے تھے ، میں نے
انہیں جو دیکھا تو میرے دل میں جھجکتی آشا نے آہ بھر کر
کہا کہ یہ کیسی بات مجھ سے کہے چلا جا رہا ہے بادل ؟
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی ۔

مری نگاہوں نے شرم سے جھک کے دیکھا بہتی ہے ایک ندی
اور اس میں لہریں اور اس میں کچھ بلبلے سناتے ہیں ایک اچھوتا ، عجیب نغمہ
سرود میں نے سنے تھے پتوں سے ، شاخ سے ، ابر سے ، ہوا سے ،
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی ۔

میں تنگ آ کر اٹھا اور اٹھ کر چلا اسی غم کدے میں پہنچا
مجھے جو لے کر گیا تھا ندی کی پھیلی پھیلی کھلی فضا میں
مگر وہاں بھی وہی تھے بادل سیاہ تاریک چپ ہٹیلے
وہاں تھی لہریں اداس باتوں کی ، بلبلے تھے ، کسی میں کوئی

نہ تھا دھندلکا ،
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی ۔

میں دیکھ کر اُن کو پوچھتا ہی رہا کہ آخر یہ بھید کیا ہے
یہ کیسے منظر ہیں کیسی باتیں ہیں ، مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں

اس نظم میں نیا سانچہ بنانے کی عمداً کوشش کی گئی ہے ۔ اور اس سانچے میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہی ہیں ۔ پہلے پیراگراف سے دوسرا پیراگراف مختلف ہے ۔ پھر یہ بات بھی کہ جملوں کے فطری ساخت ، لفظوں کی فطری ترتیب اور وزن کے ' باھمی کھیل ' سے کام لیا گیا ہے ۔ معانی اور جملے ایک سطر سے دوسری سطر میں کھنچ آئے ہیں ۔ دوسرے پیراگراف کو لیجیے :—

ہوا سے بادل کے چند ٹکڑے بہے چلے جا رہے تھے ، میں نے
انھیں جو دیکھا تو میرے دل میں جھجکتی آشا نے آہ بھر کر
کہا کہ یہ کیسی بات مجھ سے کہے چلے جا رہا ہے بادل ؟
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی ۔

'' میں نے انھیں جو دیکھا ۔'' '' آشا نے آہ بھر کر کہا ۔'' لیکن ' میں نے ' پہلی سطر میں اور ' انھیں جو دیکھا ' دوسری سطر میں ۔ آشا دوسری سطر میں آہ بھر کر تیسری سطر میں کہتی ہے ۔ لب و لہجہ بھی گفتگو کا ہے ۔ لیکن پھر بھی کامیابی نہیں ۔ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو جملوں کی فطری ساخت ، لفظوں کی فطری ترتیب اور وزن کے ' باھمی کھیل ' سے کام لیا جاتا ہے اور دوسری طرف ' لچکتے نغمے ' ' پھسلتے نغمے ' ' مچلتے نغمے ' تصنع کی جھلک دکھلاتے ہیں ۔ پھر سطروں کی ساخت بھی اٹل نہیں ۔ مثلاً تیسرے پیراگراف کو یوں لکھیے :—

میں تنگ آ کر اٹھا اور اٹھ کر چلا ،
اُس غم کدے میں پہنچا
مجھے جو لے کر گیا تھا ندی کی پھیلی پھیلی کھلی فضا میں
مگر وھاں بھی وھی تھے بادل
سیاہ ، تاریک ، چپ ، ھٹیلے
وھاں تھیں لہریں اُداس راتوں کی ،
بلبلے تھے ،
کسی میں کوئی نہ تھا دھندلکا
مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آئی ۔
میں دیکھ کر ان کو پوچھتا ہی رہا کہ آخر یہ بھید کیا ہے
یہ کیسے منظر ہیں
کیسی باتیں ہیں
مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں ۔

اس طرح لکھنے سے معانی کچھ زیادہ واضح ہو جاتے ہیں ۔ پہلی سطر میں شاعر تنگ آ کر اٹھتا ہے اور اٹھ کر چلتا ہے اور غم کدے میں پہنچ بھی جاتا ہے ۔ اسے توڑ دینے سے یہ لطیف بات حاصل ہوتی ہے کہ چلنے اور پہنچنے میں کچھ ' دوری ' ہو جاتی ہے ، کچھ 'دیر' لگتی ہے ۔ اور یہی ہونا بھی چاہیے ۔ پھر دو چھوٹی چھوٹی سطروں کے بعد تیسری لمبی سطر پڑھنے سے ندی کی پھیلی پھیلی کھلی فضا کا احساس ہوتا ہے — اسی طرح ''سیاہ ، تاریک ،

چپ ، هلیلے " کو بادل سے الگ کر دینے سے اثر کچھ زیادہ ہوتا ہے ۔ اور بلبلوں کو الگ کرنے سے انھیں ایک لمحہ کی زندگی مل جاتی ہے ۔ اور ایک ہی سانس میں " یہ کیسے منظر ہیں ، کیسی باتیں ہیں ، مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں " کہنے کی ضرورت نہ تھی ۔

کوشش ہوتی ہے لیکن سلیقہ نہیں آتا ۔ سنیے :—

(۱) آج کی رات
میرا دل
چاہتا ہے تو بھی میرے پاس ہو
اور سوئیں ساتھ ساتھ

(۲) سفید بازو
گداز اتنے
زباں تصور میں حظ اٹھائے
اور انگلیاں بڑھ کے چھونا چاہیں مگر انھیں برق ایسی لہریں
سمٹی مٹھی کی شکل دے دیں

(۳) ترا دل دھڑکتا رہے گا
مرا دل دھڑکتا رہے گا
مگر دور دور !
زمین پر سہانے لمحے آ کے جاتے رہیں گے
یونہی دور دور !
ستارے چمکتے رہیں گے
یونہی دور دور !
ہر اک شے رہے گی
یونہی دور دور !
مگر تیری چاہت کا جذبہ ،
یہ وحشی سا نغمہ ،
رہے گا ہمیشہ
مرے دل کے اندر
مرے پاس پاس

سلیقہ کی کمی روشن ہے ۔ تکنیک خام ہے ، ذہنیت طالب علم کی ہے ۔ " اور سوئیں ساتھ ساتھ ۔" " دور دور ۔" " پاس پاس ۔" مضحک سی چیز ہو کر رہ گئی ہے ۔

میرا جی کی ایک نظم ہے " کلرک کا نغمۂ محبت ۔" پوری نظم نقل کرنے کی گنجائش نہیں ۔ اس کا آخری پیراگراف ہے :—

جب آدھا دن ڈھل جاتا ہے تو گھر سے افسر آتا ہے
اور اپنے کمرے میں مجھ کو چپراسی سے بلواتا ہے
یوں کہتا ہے ، ووں کہتا ہے لیکن بیکار ہی رہتا ہے ۔
میں اُس کی ایسی باتوں سے تھک جاتا ہوں
پل بھر کے لیے اپنے کمرے کو فائل لینے آتا ہوں ،
اور دل میں آگ سلگتی ہے : میں بھی جو کوئی افسر ہوتا

اس شہر کی دھول اور گلیوں سے کچھ دور مرا پھر گھر ہوتا
اور تو ہوتی !
لیکن میں تو اک منشی ہوں تو اونچے گھر کی رانی ہے
یہ میری پریم کہانی ہے اور دھرتی سے بھی پرانی ہے !

اس میں نیا پن ہے ، عصر حاضر کی جھلک ہے --- کلرک کا نغمۂ محبت ہے ۔ حقیقت طرازی بھی ہے --- افسر ، چپراسی ، فائل کا ذکر ہے تکنیک کی حسن کاری بھی ہے --- ' تھک جاتا ہوں، تھک جاتا ہوں' ، ' اور تو ہوتی! ' --- کلرک کا نفسیاتی تجزیہ بھی ہے --- '' اور دل میں آگ سلگتی ہے ۔'' لیکن نظم کچھ یوں ہی سی ہے ۔ مجھے معلوم نہیں کہ میراجی ایلیٹ کی مشہور نظم ' دی لو سونگ اوف ایلفر ڈپروفروک ' سے واقف ہیں یا نہیں ۔ اگر واقفیت کے بعد یہ نظم لکھی ہے تو یہ تو مبتذل سی نقالی ہے ۔ بہر حال ان دونوں نظموں کا مقابلہ کرنے سے اچھی اور بری شاعری ، بلندی اور پستی --- اور کیسی پستی ! --- کا حال معلوم ہوگا ۔

میراجی کی تکنیک کی ناکامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر و بیشتر شاید میراجی کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں ۔ تکنیک تجربوں کی کامیاب ترجمانی کا ایک ذریعہ ہے ۔ اگر تجربے صاف نہ ہوں تو تکنیک ان کی ترجمانی بھی نہیں کر سکتی ۔ میراجی نے کہا ہے کہ ''بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں صرف مکھم کہنے کا عادی ہوں ۔'' اور وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں! '' اکثریت کی نظمیں الگ ہیں میری نظمیں الگ ہیں ۔ اور چونکہ زندگی کا اصول ہے کہ دنیا کی ہر بات ہر شخص کے لیے نہیں ہوتی ، اس لئے یوں سمجھیے کہ میری نظمیں بھی صرف ان ہی لوگوں کے لیے ہیں جو انہیں سمجھنے کے اہل ہوں یا سمجھنا چاہتے ہوں اور اس کے لیے کوشش کرتے ہوں ۔'' کسی نظم کا سمجھ میں نہ آنا ، اس کا مبہم ہونا اس کی اچھائی کی دلیل نہیں ۔ سمجھ میں نہ آنے کی بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں ۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کا دماغ تیز رفتار ہوتا ہے اور پڑھنے والا پیچھے چھوٹ جاتا ہے ، اسی تیز رفتاری کی وجہ سے وہ ایک بات سے دوسری بات تک پہنچ جاتا ہے اور بیچ میں جو دوری ہوتی ہے اسے ایک جست میں طے کرتا ہے ۔ پڑھنے والا اس جست و خیز کا عادی نہیں ہوتا ۔ موجودہ زمانہ میں ایک خاص وجہ یہ ہے کہ زندگی بہت پیچیدہ ہو گئی ہے ، تجربے بھی بہت پیچیدہ ہوگئے ہیں ۔ شاعر وسیع النظر ہوتا ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ پیچیدہ باتوں کو کم سے کم لفظوں میں کہہ دے اس لیے وہ اشاروں سے کام لیتا ہے ۔ پڑھنے والوں میں یہ وسعت نظر نہیں ہوتی ۔ وہ ان اشاروں کی تہ کو نہیں پہنچ پاتے ۔ مجھے کہنے دیجیے کہ میراجی کی نظموں میں ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں --- ان کا دماغ تیز رفتار نہیں ، ان کے تجربوں میں کوئی خاص پیچیدگی نہیں اور ان کی نظروں میں کوئی خاص وسعت بھی نہیں ۔ سمجھ میں نہ آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ شاعر صاف طور پر سوچ نہیں سکتا ۔ اس لیے اس کی باتیں مبہم ہوتی ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے خیالات کی ترجمانی کی قدرت نہیں ہوتی ۔ سوچتا تو ہے لیکن باتیں صفائی سے نہیں کر پاتا ۔ ان ہی دونوں وجہوں سے میراجی کی نظمیں مبہم سی ہوگئی ہیں ۔ ان کی نظموں میں خیال نہیں ، خیال کا دھندلکا ہے ، جذبات کا دھواں ہے ، لفظوں کا پھیلا ہؤا کہرا ہے ۔ اسی وجہ سے تکنیک ہے، کوئی شان نہیں ، کوئی بانکپن نہیں ۔ باتیں کچھ ایسی گہری نہیں ، پیچیدہ نہیں ، انوکھی نہیں کہ سمجھ میں نہ آئیں ۔ لیکن ہم سمجھنا کیوں چاہیں ، کوشش کیوں کریں جب اس کوشش کا ماحصل کچھ بھی نہیں ۔

'' اکثریت کی نظمیں الگ ہیں ، میری نظمیں الگ ہیں'' --- ترقی پسند نظمیں اکثریت

کی نظمیں ھیں ۔ ترقی پسند شعراء بھی آزاد نظم سے کام لیتے ھیں ۔ ان کی نظمیں صرف انھیں لوگوں کے لیے نہیں جو انھیں سمجھنے کے اھل ھوں ، یا سمجھنا چاھتے ھوں اور اس کے لیے کوشش کرنے ھوں ۔ وہ تو اس لیے لکھتے ھیں کہ اُن کی باتیں آسانی سے عوام کی سمجھ میں آ جائیں ۔ ان باتوں میں کوئی نیا پن نہیں ، چند جانی ھوئی باتوں کی تکرار ھوتی ھے اس لیے سمجھنے کے لیے کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ھوتی ۔ اور وہ آزاد نظم کی طرف شاید اس لیے جھکتے ھیں کہ وہ سمجھتے ھیں کہ اس ' فورم ' میں وہ اپنی باتیں آسانی سے عوام تک پہنچا سکتے ھیں اور اُن کے جذبات کو بھڑکا سکتے ھیں ۔ یعنی آزاد نظم سے بھی وہ وھی کام لیتے ھیں جو دوسری نظموں اور غزلوں سے ۔ مضامین اسی قسم کے ھیں جن کی ترقی پسند شاعر سے اُمید رکھی جاتی ھے ۔ خطابت ھے ۔ ' دھکتی ھوئی تقریریں ' ھیں شاعری نہیں ۔ یہ چین کا سیلاب ھے :—

اب یہ سیلاب بڑھتا چلا جائے گا
چین کی سر زمیں سے ملایا تلک
اور ملایا سے برما تلک
اور برما سے ھندوستان
اور ھندوستان سے فلسطین و یونان و اسپین تک
اب یہ طوفان چڑھتا چلا جائے گا
چین کے سرکشو ، چین کے باغیو ، مرحبا
اور آگے بڑھو ، اور آگے بڑھو
وار پر وار کرتے چلو ......

یہ دھکتی ھوئی تقریر ھے نظم نہیں ، اس میں گرج ھے شاعری نہیں ۔ یہی گرج ھر جگہ ھے :—

شریف بہنو ، غیور ماؤ
تمہارے بھائی
تمہارے بیٹے
تمہاری فریاد سن رھے ھیں
ملوں سے ، کھیتوں سے ، اور کانوں سے تم کو آواز دے رھے ھیں
وہ دیکھو اُن کے جوان سینوں میں
عدل اور انصاف کی جوالا بھڑک رھی ھے ۔

علی سردار جعفری تو ترقی پسندی سے مجبور ھیں ۔ اُن کی آزاد نظموں میں بھی ' ترقی پسند ' مضامین کا سیلاب ھے ۔ مجھے ان مضامین سے سر دست بحث نہیں ، تکنیک سے بحث ھے لیکن ترقی پسند شعراء کو تکنیک کی حسن کاری کا زیادہ خیال نہیں اور اگر کچھ خیال ھے تو بس انھی چیزوں کا ، انھی ترکیبوں کا جن سے وہ عوام کے جذبات کو بھڑکانے میں کام یاب ھوسکیں ۔ " اور آگے بڑھو ، اور آگے بڑھو —"

وہ مغربی شعراء سے سیکھتے ھیں ۔ کہتے ھیں :—

اور میں گا رھا ھوں
اور میرے ساتھ پبلو نرودا ، چلی کا جوان سال شاعر ھے پیرس کا آتش نفس آراگوں ھے
سوویت یونین کا جوالا مکھی مایا کا وسکی ھے
لورکا ، والٹ وھٹ مین ،

گورکی اور پشکن
دانتے اور ہومر
سب ہم آواز ہیں

ایلیٹ کا ذکر تو ممکن نہ تھا ۔ ' بورژوا ' اور ' رجعت پسند ' شاعر کا نام کیسے لیا جائے اور پھر اس سے کچھ سیکھنا تو گناہ ہے ۔ تعجب ہے کہ پابلو نرودا ، آراگون ، لورکا اور مایا کاوسکی سے کچھ کیوں نہیں سیکھتے ۔ اگر ترقی پسندی اردو میں ایک پابلو نرودا ہی پیدا کرتی تو بڑی بات ہوتی اور پھر ہومر اور دانتے کیسے کھنچ آئے ۔ معلوم نہیں دانتے کی روح کیا کہتی ہوگی ۔ دانتے کی تکنیک کی حسن کاری اور تکمیل تو کسی دوسری دنیا کی چیز ہے ، ترقی پسندی کی پرواز سے بہت دور ۔ علی سردار جعفری ایلیٹ کا نام نہ لیں لیکن ایلیٹ سے واقف ضرور ہیں ۔ اگر وہ اس طرح توجہ کریں تو وہ ایلیٹ سے تکنیک کی حسن کاری سیکھ سکتے ہیں ۔ لیکن وہ اس طرف توجہ کیسے کریں ۔ حسن کاری اور ترقی پسندی میں ایک طرح کا بیر ہے ۔

" آزاد نظم سے کم آزاد کوئی نظم نہیں " — اردو شعراء اس حقیقت سے بے خبر ہیں ۔ آزاد نظم آزاد بھی ہے اور پابند بھی ۔ اردو میں اس کی آزادی سے ناجائز مصرف لیا جاتا ہے اور اس کی پابندیوں کی خبر بھی نہیں ہوتی ۔ میں نے کہا ہے :—

" تجربے کو ایک چشمہ سمجھیے ۔ اس چشمے کا پانی ایک طرح سے نہیں بہتا ۔ کبھی تیزی سے بہتا ہے تو کبھی آہستہ ۔ کبھی یہ ایسا ' نرم سیر ' ہوتا ہے کہ جیسے ' تصویر آب ' ہو ، کبھی ہلکی ہلکی لہریں ہوتی ہیں ، تو کبھی یہ لہریں بلند ہو جاتی ہیں ، اور کبھی بھنور کی کیفیت ہوتی ہے ۔ کبھی ہلکے ہلکے بلبلے بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں تو کبھی جھاگ نظر آتی ہے ۔ کبھی دھیمی دھیمی سرسراہٹ کی آواز آتی ہے تو کبھی آواز کی لے تیز ہو جاتی ہے ۔"
آزاد نظم میں سخت پابندی سے اس بوقلمونی کو برتا جاتا ہے ۔ اردو میں اس سخت پابندی کا احساس نہیں ملتا ۔

سعادت حسن منٹو

حنیف رامے

سعادت حسن منٹو عصر حاضر کے ہیرو تھے ۔ ساری دنیا اُنھیں اپنے ہی گرد گھومتی دکھائی دیتی تھی ۔ اُن کی داستان ارادے کی داستان ہے — اُسی ارادہ و انا کی داستان جس نے گزشتہ نصف صدی میں دنیا کو دو مرتبہ جنگ کی بھٹی میں جھونکا ۔

انسانی تعلقات اور تہذیب کی بقا و نمو میں دو عنصر لازم و ملزوم ہیں : اطاعت اور حکومت — حکم ماننا اور حکم دینا ۔ دوستی اسی صورت میں قائم ہوسکتی ہے کہ سچ بولیں ، اور سچ کی گنجائش جبھی نکلتی ہے کہ دونوں میں سے جس وقت جو سچا ہو دوسرا اُس کی اطاعت کرے ۔ جو افراد اس اصول کو اپنی فضائے تعلقات کی روح نہیں بناتے ، اپنے اپنی سانسوں میں نہیں اُتارتے اُن کی زندگی میں واقفیت کا طویل و عریض جال تو آپ کو ضرور نظر آسکتا ہے ، دوستی و ہم سفری کا سفینۂ بے ساحل اُنھیں میسر نہیں آتا ۔ یہی حال قوموں کا ہے ۔ جو قومیں محض ارادہ و انا کے بل بوتے پر زندہ رہنا چاہتی ہیں ، جن کے لیے قوت کا حصول و اظہار ہی زندگی کی قدر واحد ہے ، جو حکومت کرنا چاہتی ہیں ، اطاعت کی صلاحیت سے یکسر محروم ہیں ، یا اس صلاحیت کے استعمال کو باعث ننگ سمجھتی ہیں ، پیش روی سے کم پر راضی نہیں ہوتیں ، ہم قدمی سے جی چراتی ہیں — اُن کے مقدر میں اندھیرے ہی اندھیرے لکھے ہیں ، موت لکھی ہے ۔ جینے کے لیے جینے دینا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا خود جینا ۔

سعادت حسن منٹو کی زندگی بھی اطاعت سے خالی ہے ۔ دوستی ، محبت ، تکریم ، راز داری — اُن کے یہاں ہر مال بکاؤ ہے ، کسی قدر کی کوئی قدر نہیں ۔ اگر اُن کی اطاعت نہیں کرسکتے تو آپ کو اُن کے دربار سے نکل جانا ہوگا ۔ اگر اُن کے ہمراہ ہیں تو آپ صرف مصاحب کی حیثیت کے مستحق سمجھے جائیں گے ، آپ کی تضحیک کی جائے گی ، آپ کی قیمت پر کسی دوسرے کو کام کر دینے پر اکسایا جائے گا ، لیکن دیکھا دیکھی دوسرے نے بھی آپ پر آوازہ کس دیا تو بات بالکل دوسری ہے — اپنے مصاحب کی بے عزتی کا حق خود اُنھیں تو حاصل ہے ، کسی دوسرے کو نہیں — اس موقع پر وہ آپ کی خاطر کسی سے بھی لڑائی مول لے سکتے ہیں ۔ آپ بیکار ہیں تو نوکری دلا دیں گے ، نوکری مل جائے گی تو خود ہی کسی دن سیڑھی کھینچ لیں گے — سب کچھ وہ ہیں ، کوئی دوسرا کچھ بھی نہیں ۔

نشاۂ ثانیہ کے بعد انسان کے جذبۂ اختیار کو ہماری اس گزشتہ نصف صدی میں دوبارہ پھلنے کا موقع ملا ۔ عامیوں کی بغاوت کے اس دور میں ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ سیاہ و سفید کا مالک ہے ، اُسے ہر حق حاصل ہے اور اپنی ذات کے سوا وہ کسی کے لیے ذمہ دار نہیں ۔ ہر شخص اپنی انا کا علم بلند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ساری دنیا اُس کے گرد جمع ہوجائے ۔ وہ سب کچھ اپنی راہ میں بچھا ہوا دیکھنا چاہتا ہے ۔ سعادت حسن منٹو کی انا اتنی ہی بڑی ہے جتنی لینن یا محمد علی جناح کی ۔ فرق محض اتنا ہے کہ لینن اور جناح اپنے آہنی عزم کے باوجود جھکنا بھی جانتے تھے : اشتراکی روس کے معاشی و سیاسی نظام میں تقاضائے وقت کے مطابق تبدیلیاں ضروری تھیں ، لینن اور اُس کے ساتھی ان تبدیلیوں کے آگے رکاوٹ نہ بنے ۔ جناح کو پورا پاکستان نہ ملا تو اُنھوں نے جو زیادہ سے زیادہ مل سکا اُسے قبول کر لیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہی اور صرف وہی حصول پاکستان کے اہل ہیں ، اگر اُنھوں نے یہ موقع اپنی انا پر قربان کردیا تو ہندی مسلمانوں کی آزادی میں صدیوں کا

التوا ناگزیر ہے اور آن کی قوم میں فی الحال ایسا کوئی نہیں جو التوا کی صدیوں کو برسوں میں بدل دے ، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آن کی گھڑیاں اب گنی چنی ھیں ، اور وقت گزر رھا ہے ۔ لیکن سعادت حسن منٹو کا ھیرو تو نپولین تھا اور آن کا پسندیدہ شاعر غالب ۔ آنھوں نے آنا کی پرورش ھی کو زندگی کا مقصد جانا ۔ ھر قدر اور ھر موقع آنھوں نے آنا کی بھینٹ چڑھا دیا ۔ اور جب سب کچھ ختم ھوگیا تو ھارے ھوئے جواری کی طرح آخری داؤں کے طور پر اپنے آپ کو اپنی آنا کے حوالے کردیا — ” اگر میں خود زندہ رہ سکتا ھوں تو خود مر بھی تو سکتا ھوں ، کوئی کون ھوتا ہے کہ مجھے مارے — “ منٹو صاحب یہ بھول گئے : آنھوں نے آنا کی جو حکومت قائم کر رکھی ہے اس میں آن کی اپنی حیثیت محض اطاعت گزار کی ھو کر رہ گئی ہے ، جس اطاعت سے وہ ساری عمر بھاگتے رہے ھیں آسی کے پھندے میں آخر کو آ پھنسے ھیں اور جس بے ھوشی و بے خبری سے وہ ھمیشہ گریزاں رہے ھیں آسی کے شکار ھوگئے ھیں ، آنا کی جس سولی پر آنھوں نے زندگی کی ھر نعمت کو لٹکایا تھا ، خود بھی آسی پر لٹک گئے ھیں

کسی سے بچنے کا راستہ یہی ہے کہ اس کا سامنا کر لیا جائے ۔ منٹو صاحب اطاعت اور خود فراموشی سے بچنا چاھتے تھے (شراب آنھیں کہیں زیادہ بیدار کردیتی تھی) لیکن آنھوں نے آن کا سامنا کرنا پسند نہ کیا اس لیے اپنی آنا کی سیڑھی کا رخ زمین سے آسمان کی طرف نہ رکھا ۔ اس طرح جہاں آنھیں قوت کا احساس ھوتا وھاں اپنی کم مایگی کا احساس بھی ھوتا ۔ آنھوں نے اپنی سیڑھی زمین سے زمین کے قلب کی طرف لٹکا دی اور نیچے ھی نیچے آترتے چلے گئے تاکہ ھر شے کو آوپر سے دیکھیں ، آسے اپنے سے کم تر سمجھیں ۔ زمین کے بارے میں آنھیں اتنی ھی معلومات تھیں جتنی سانپ کو ھوتی ھیں ۔ وہ آدمیوں کو سونگھ لیتے تھے ، اور آوازوں کو دیکھ لیتے تھے ۔ وہ اپنے عصر کے بڑے ' آدمی ' تو بن گئے ، اپنے عصر کے مزاج کا نمائندہ تو بن گئے لیکن انسانیت کا بے کراں راستہ آنھوں نے اپنے آوپر حرام کو لیا ۔ آنھوں نے جسم محض کو کل اھمیت دے دی اور حکمت و تخیل کو ' گھر نکالا ' دے دیا ۔ وہ ماضی اور حال کے اسیر ھوگئے ، مستقبل سے آنھیں کوئی علاقہ نہ رھا ۔ آن کی تحریروں میں حواس پوری سدت سے کار فرما ھیں ، مشاھدے کا راستہ تمام حواس مل جل کر طے کرتے ھیں لیکن وہ اپنے اس مشاھدے کو فضائے امکان میں کسی پردے پر منعکس نہ کرسکے کیونکہ تفاصیل نے کبھی آن کا پیچھا نہ چھوڑا اور تجربات و وارداب کی قلب ھیئت مشکل ھو گئی ۔ نتیجہ یہ کہ آن کی زندگی میں جتنی دلچسپی آن کے افسانوں میں لی گئی موت کے بعد ھرگز نہ لی جائے گی کیونکہ حواس حال و ماضی کی نبضیں تو ٹٹول سکے ھیں مستقبل پر کمند نہیں ڈال سکتے ۔

حواس خون کے تابع ھوتے ھیں ۔ خون میں صداقت ہے لیکن دھوپ اور چاندنی میں بھی تو صداقت ہے ۔ منٹو صاحب نے اپنے آپ کو حواس تک محدود کرلیا کہ اس طرح وہ اپنے ھم عصروں میں دیو کی حیثیت رکھیں گے ، وہ جانتے تھے کہ آن کے ارد گرد بونے بستے ھیں جنھیں حواس پر بھی اختیار نہیں ۔ حکمت و تخیل کا راستہ اپنے آوپر حرام کرلیا کہ اس طرح وہ عالمین میں بونے کی حیثیت رکھیں گے ، وہ یہ بھول گئے کہ جو شخص دیو سے بونے اور بونے سے دیو میں قلب ھیئت کر سکتا ہے وہ آن لوگوں کے مقابلے میں صاحب اختیار ہے جو محض بونے یا محض دیو ھوکر رہ گئے ھیں ۔ منٹو صاحب کی آنا کا حکم تھا کہ وہ شے پر محیط ھو جائیں ۔ منٹو صاحب نے ھر شے پر محیط ھونے کے لیے صرف حواس سے کام لیا ۔ نتیجہ یہ

کہ اُن کے یہاں حرکت تو پیدا ہو گئی لیکن اس حرکت میں آہنگ نہ پیدا ہوسکا ۔ آہنگ تو جبھی پیدا ہوتا کہ گرم جولاں ' میں ' کے ساتھ ساتھ ' یہ ' — ' وہ ' — ' تو ' کو بھی موجود محسوس کیا جاتا ۔ آنکھیں تو خود اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتیں ، اس مقصد کے لیے انھیں آئینے کی ضرورت پیش آتی ہے یا پھر کسی دوسرے کی آنکھوں کی ۔ منٹو صاحب کو نہ تو اپنے وجود کا سایہ نظر آیا نہ وہ کچھ نظر آیا جس کا اُن سے کوئی حسیاتی تعلق نہ تھا — انھیں چند افسانہ نگاروں کے صرف وہی افسانے پسند رہے جن کی اصلاح انھوں نے کی تھی حالانکہ ان صاحبوں نے بعد میں کہیں بہتر افسانے لکھے ۔

اگر عصرحاضر ایک دیو ہے تو سعادت حسن منٹو وہ پرندہ ہیں جس میں اس دیو کی جان ہے ۔ سعادت حسن منٹو کی وفات کے ساتھ ہمارے یہاں انا کی بادشاہی کا خاتمہ شروع ہوتا ہے ۔ سعادت حسن منٹو اس لٹی ہوئی فوج ، اس رزمیہ ، اس داستان ارادہ و آنا کے ہیرو ہیں ۔ اس داستان کو کوئی قلمبند کیوں نہیں کرتا ۔ منٹو — یہ کردار اتنا بڑا تو یقیناً ہے کہ کوئی فنکار اس کی مدد سے آنا کے شہیدوں پر کوئی بڑا ناول لکھے ۔ لیکن یہ فنکار یہ کام ضرور کرے کہ منٹو کی زندگی کی تفاصیل کے قلب ہیئت کی کوشش کرے تاکہ یہ ناول سکینڈل کے دائرے میں گھٹ کر نہ رہ جائے ۔ اگر ایسا ناول لکھا گیا تو فن کاروں کی طرف سے منٹو کی زندگی کو سب سے بڑا خراج ہوگا ۔ دوسری صورت میں جس طرح میراجی کے متعلقین نے انہیں ' طوائفا ' نہا یہی حشر اس غزال کا بھی ہوگا ۔

موجِ سراب

نصیر انور

عجیب مصیبت تھی۔

دن کو چین نہ رات کو آرام۔ متواتر آٹھ دن سے یہی حال تھا۔ میرا دایاں بازو سوج کے ٹائر بن چکا تھا۔ ایک ایسا ٹائر جو کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا اور پھر بھی پہیے پر چڑھا تھا۔ جی میں آئی نہ اس ٹائر کو اپنے کندھے سے آتار پھینکوں۔ دل میں جو بقراط تھا چپکے سے یوں کہنے لگا "— اور تم بھی بائیں بازو کے دشمن ہو!"

میں آپ ہی آپ مسکرا دیا۔

اتنے میں دروازہ کھلا۔ ہوٹل کا بیرا دستک دیے بغیر کمرے میں داخل ہوا، ایک خط دیا، تڑاخ سے دروازہ بند کیا اور چلتا بنا۔ آمد و رفت کی یہ ادا مجھے ہرگز پسند نہ تھی۔ جب کبھی وہ آتا، میں اندر ہی اندر کڑھتا اور یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ شاید یہاں کا یہی دستور ہے لیکن یہ دستور میرے لیے ایسی ذہنی کوفت کا باعث تھا جو جسمانی تکلیف سے کہیں زیادہ اذیت دہ تھی۔

میں نے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگا۔ لکھا تھا:—

۳۱۔ لکشمی مینشن،

لاہور

پیارے نصیر

پرسوں کمرشل بلڈنگ گیا۔ شیخ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اتوار کو انھیں کھانے پر بلایا۔ اتفاق سے ڈاکٹر منیر بھی آ گئے۔ بہت دیر تک محفل جمی رہی۔ آخر میں تمہارا ذکر خیر آیا۔ میں اٹھا تو دیکھا کہ تمہارا خط ڈاکیہ پھینک رہا ہے

"Think of the Devil—"

یہ کیا قصہ ہے بھئی۔ یہ آپریشن کیا باقی رہ گیا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ تم حسب عادت مذاق کر رہے ہو مگر دوبارہ خط پڑھا تو سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ ڈیرے کے پٹھان نے تمہارے جسم میں مزید جراحت کی ضرورت محسوس کی ہے اور اپنا دیسی ساخت کا پستول داغ دیا ہو — کہیں یہ مرد مجاہد چاند ماری کی مشق تو نہیں کر رہا تھا۔

تم نے خط لکھا مگر نہایت ہی مختصر اور وہ بھی شاعرانہ انداز میں۔ میری جان گولی کھانا تو بے قافیہ شاعری بھی نہیں ہو سکتا۔ ازراہ کرم فوراً تفصیلات سے آگاہ کرو۔ تمہارے خط سے صرف اتنا معلوم ہوا ہے اور وہ بھی کئی دو اور دو جوڑ کر چار بنانے سے کہ تم ڈیرے سے چند میل دور خدا معلوم کس مار پر سیر و تفریح فرما رہے تھے کہ کسی پٹھان نے اپنی سابقہ روایات کے تحت تمہارے گولی مار دی۔ تمہاری جیبوں کا بوجھ ہلکا کیا اور چلتا بنا۔ زخمی حالت میں تم شاید بنوں پہنچے۔ وہاں وحید کے ہاں تم نے دو راتیں بسر کیں (دن کو شاید تم کہیں اور تھے) اس کے بعد تم راولپنڈی پہنچے جہاں ملٹری ہسپتال میں تمہارے بازو کے زخمی حصے جدا کر دیے گئے۔

میری جان، تمہارے جسم کا کون سا حصہ ہے جو زخمی نہیں ہے — بہتر

تھا کہ سب کا سب کٹوا دیتے ۔

ڈاکٹر منیر کو میں نے خط دکھایا اور اپنی تشویش کا اظہار کیا ۔ انھوں نے مجھے تسلی دی کہ خاص بات کچھ نہیں ۔ سوائے اس کے کہ گولی لگی ہے ۔ انشااللہ چند روز میں ٹھیک ہو جائے گا ۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ دوست ڈاکٹروں کو بھول جانے کا انجام یہی ہونا ہے ۔

شیخ پرویز صاحب اس حادثے کو پاکستان کی جنگی تیاریوں پر محمول کرتے ہیں ۔

مجھے امید ہے کہ تم فوراً ہی مجھے اپنے تازہ ترین حالات سے ضرور مطلع کرو گے ۔

ججی تمھیں اکثر یاد کرتی ہے ۔ شیام والی تصویر مل گئی تھی ۔ شکریہ ۔ اچھے ہو ہوا کر تم فوراً میرے ساتھ ایک فوٹو کھچوا لو ۔ مجھے تمھارا کوئی بھروسہ نہیں ۔ معلوم نہیں ، کب توپ دم ہو جاؤ اور مجھے بغیر فوٹو کے "آفاق" میں تمھارے اوپر مضمون لکھنا پڑے ۔

صفیہ اور اقبال تمھارا حال دریافت کرتی ہیں ۔

تمھیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ شیخ سلیم کا چند روز ہوئے میو ہسپتال میں انتقال ہو گیا ۔

تمھارا سعادت

۶ ۔ اگست ۱۹۵۱

خط کی آخری سطر میرے دل و دماغ پر دھند بن کر چھا گئی ۔ آنکھوں کے سامنے کئی دھندلی تصویریں گھومنے لگیں ، یہاں تک کہ ایک تصویر اس دھند کو چیر کر میری نگاہوں کا مرکز بن گئی ۔ مڑے تڑے ہاتھ ۔ ٹیڑھی میڑھی انگلیاں ، زرد چہرہ ، بجھی بجھی آنکھیں ، زبان میں لکنت ، چال میں لغزش ، جسم میں جھول ۔

منٹو نے اسی تصویر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا "خواجہ ، شیخ سلیم سے ملو !"

شیخ سلیم نے مڑا ہوا ہاتھ آستین میں چھپاتے ہوئے کہا "خواجہ ، میں آپ سے مل چکا ہوں ۔ منٹو دی گریٹ نے صورت دکھانے سے پہلے ملاقات کرا دی تھی ۔ اب آیئے ، ایک ساتھ چلیں ۔"

"کہاں ؟"

"جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی ۔"

اس پر منٹو نے مسکراتے ہوئے کہا "خواجہ — آ جا !"

ہم تینوں تانگے پر سوار ہو گئے ، منٹو حسب معمول کوچوان کے ساتھ ٹک گیا ۔ شیخ سلیم اور میں پچھلی سیٹ پر ۔ تانگہ چلا تو شیخ سلیم نے کہا "منٹو دی گریٹ ، پہلے آب حیات کا بندوبست ہو جائے ۔"

منٹو نے پر زور لہجے میں جواب دیا "ہو گا اور ضرور ہو گا ۔" پھر مجھ سے کہنے لگا "خواجہ یہ وہ آب حیات ہے جو خواجہ خضر کو بھی نصیب نہ ہوا ۔"

شیخ سلیم اسٹیج پر نمودار ہو گیا "نصیب ہوا ، نہ ہو گا ۔"

منٹو لکھنؤ پہنچ گیا "حضت واللہ ، کیا خوب ادائیگی ہے ۔ سبحان اللہ !!"

شیخ سلیم آداب بجا لایا "حضور کی ذرہ نوازی ہے !"

یکایک قہقہے پھوٹ پڑے ۔

کوچوان نے بھی اپنے پیلے دانت باہر نکالے - راھگیروں نے پلٹ کر دیکھا ، دیکھتے رہ گئے -

راستے میں ایک دکان کے قریب تانگہ رکا تو منٹو نے شیخ سلیم سے کہا " اماں حضور، یہ رہا چشمۂ آب حیات — ذری چھاگل عنایت کیجیے -"

شیخ سلیم نے چمڑے کا ایک بیگ منٹو کے حوالے کیا - وہ تانگے سے نیچے آترا - چشمے تک پہنچا اور تھوڑی ھی دیر میں آب حیات چھاگل میں بھر لایا - وھی آب حیات جس کا ھر قطرہ منٹو اور سلیم کے خون سے زیادہ سرخ ، زیادہ حرارت آمیز اور زیادہ جاندار تھا -

تانگہ مختلف سڑکوں پر سے گزرتا ھؤا نکلسن روڈ پر ' زرتاج ھوٹل ' کے سامنے رک گیا -

' زرتاج ھوٹل ' میں شیخ سلیم کی دوسری بیوی رھتی تھی - دن کو وہ ھوٹل میں رھتا اور رات اپنے ھاں گزارتا - جب ھم اوپر پہنچے تو منٹو اور میں علیحدہ کمرے میں بیٹھے - سلیم گرتا پڑتا اپنی بیوی کے پاس پہنچا - تھوڑی ھی دیر میں واپس آ گیا اور صحرا میں بھٹکے ھوئے پیاسے کی طرح زور سے چلایا " پانی !"

میں نے جان بوجھ کر جگ کی طرف ھاتھ بڑھایا جو پانی سے بھرا تھا -

" نہیں ، یہ پانی نہیں — آب حیات چاھیے آب حیات !"

' آب حیات ' کا دور شروع ھؤا - شیخ سلیم نے گلاس میری طرف بڑھایا تو میں نے اپنی معذوری کا اظہار کیا - معدے میں گڑبڑ تھی - اس پر سلیم نے کہا " محفل کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا !"

منٹو نے کہا " پھیکا نہیں ، بلکہ رنگ میں بھنگ —!"

" یار ، کہہ جو دیا معدے میں گڑبڑ ھے !"

شیخ سلیم کو اور سوجھی " اچھا تو معدے میں جانے والی شے نہیں دیں گے —!"

منٹو نے پوچھا " کیا دیں گے ؟"

شیخ سلیم نے مجمع گیر کی آواز نکالی " وھی دیں گے ، اپنے مرشد کا عطیۂ خاص ، جوھر نباتات !"

یہ کہتے ھوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھا - دوسرے کمرے میں گیا اور فوراً ھی چلا آیا - اس نے پان کی گلوری پیش کرتے ھوئے کہا " خواجہ صاحب ، شوق فرمائیے لیکن احتیاط رھے ، پیک حلق سے آترنے نہ پائے !"

میں نے پان شوق فرمانا شروع کیا - ھدایت کے مطابق پیک حلق سے آترنے نہیں دی - یکا یک میرے ھونٹ ، تالو اور زبان سن ھو گئی - میں نے پوچھا " بھئی کیا ھے اس میں ؟"

" کوکین !"

" کوکین ؟"

" ھاں — ذرا دیر بعد پان تھوک دیجیے اور پھر جلوہ دیکھیے -"

ذرا دیر بعد میں نے پان تھوک دیا - سلیم نے سوڈے سے غرارے کرنے کو کہا - میں نے غرارے کیے تو یخ بستگی اور بڑھ گئی - سرد تمتماھٹ کا احساس ھؤا اور پھر ھر چیز برف میں لگی ھوئی معلوم ھوئی - نچلا ھونٹ دانتوں تلے دبایا تو یوں لگا جیسے کسی اور کا ھونٹ میرے دانتوں تلے آ گیا ھے - رفتہ رفتہ میں گلیشیر کی زد میں آ گیا - ساکت و جامد منٹو اور سلیم کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رھا - وہ دونوں پگھلی ھوئی آگ اپنے اندر آنڈیل رھے تھے -

یکا یک شیخ سلیم کے مڑے تڑے ھاتھ خود بخود کھل گئے - منٹو کہنے لگا " دیکھ خواجہ ، کیا کرشمہ ھے - چار پیگ پینے کے بعد شیخ سلیم کے ھاتھ ٹھیک ھو جاتے ھیں اور پھر آدمی نظر آتا ھے آدمی -"

شیخ سلیم نے جھوم کر کہا " ورنہ بندر نظر آتا ھے -"

اس پر وہ خود ہی زور سے قہقہے لگانے لگا۔ میں انہی قہقہوں کی گونج میں منٹو اور سلیم کے بارے میں کچھ سوچنے لگا۔ کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ میں نے اپنے دماغ پر زور ڈالا لیکن میں گلیشیر کی گہرائی میں دھنستا چلا گیا۔ منٹو اور سلیم نے جو الاؤ بھڑکایا تھا، وہ بھی مجھے اس زمہریر میں گرمی نہ پہنچا سکا۔ میرے تمام خیالات اندر ہی اندر منجمد ہوتے چلے گئے۔

شیخ سلیم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

جب 'ٹھنڈے گوشت' نے 'جاوید' کو ٹھنڈا کر دیا تو میں نے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ بلڈنگ کے نکڑ پر 'لٹریری کورنر' کے نام سے ایک بک سٹال کھولا۔ دائیں بائیں دو شوکیس۔ پشت پر قدآدم شیشے کی ایک الماری۔ درمیان میں کاؤنٹر۔ یہ تھا 'لٹریری کارنر۔' 'جاوید' ابھی قانون کی گرفت میں تھا اور اس پر مقدمہ جاری تھا۔

بکسٹال پر بیٹھا تھا کہ منٹو آ گیا "چلو خواجہ ایک ضروری کام ہے۔"

"کہاں چلیں گے؟"

"میں نے پٹیالہ گراؤنڈ کے قریب شیخ سلیم کو دیکھا ہے۔ اسے پکڑنا ہے۔"

"پکڑنا ہے؟"

"ہاں یار!"

"وہ تو جا بھی چکا ہو گا۔"

"تم اپنی بحث چھوڑو۔ اٹھو جلدی سے۔"

ہم دونوں پٹیالہ گراؤنڈ تک پہنچے۔ منٹو نے کہا "دیکھ لے، شیر ابھی تک ڈٹا ہے۔"

شیخ سلیم اپنی گاڑی میں چھاگل سے منہ لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سیدھے تھے۔ دیکھتے ہی، گاڑی سے باہر نکل آیا۔ ایسے بغلگیر ہوا جیسے میں بڑی مدت کے بعد کسی دور دراز ملک سے واپس آیا ہوں۔ اس قدر زور سے بھینچا کہ میری ہڈیاں تک چٹخ گئیں۔

منٹو نے چلا کر کہا "چھوڑ، یہ کیا فراڈ لگا رہا۔ چل، اب گھر چلیں۔"

سلیم مسکرا دیا "تانگہ لاؤ۔"

"یہ گاڑی جو ہے!"

"چلتی کو گاڑی کہیں مگر گاڑی کو چلتی نہیں کہہ سکتے۔"

منٹو نے چڑ کر کہا "کیا بکواس ہے۔"

"بکواس نہیں، ارشاد عالیہ ہے کہ تانگہ لاؤ۔"

"یہ گاڑی آگ لگانے کو رکھی ہے۔"

"یہ گاڑی یہیں گڑ گئی ہے۔ اسے بھی نشہ ہو گیا ہے لیکن ہاں، میں نشے میں نہیں ہوں۔"

"ہاں ہاں تم نشے میں نہیں ہو لیکن بات کیا ہے؟"

"بات یہ ہے کہ میں نشے میں نہیں ہوں۔ یہ گاڑی نشے میں ہے۔"

"کیا بکواس ہے!"

"بکواس نہیں۔ سچ کہتا ہوں، میں نشے میں نہیں ہوں۔ یہ گاڑی — یہ گاڑی نشے میں ہے۔ کہو تو سمجھا دوں۔"

"کیا ہے؟"

"اچھا تو سنو، پٹرول ختم ہوا۔ چلتی گاڑی، گاڑی بن کر رہ گئی ...."

"اپنی بکواس رہنے دے۔ سیدھی طرح بتا۔"

"سنو سنو، ہاں تو چلتی گاڑی، گاڑی بن گئی تو میں نے اس کی ٹینکی میں وسکی

ڈال دی ۔ ڈرائیور نے موٹر سٹارٹ کی تو کچھ دیر انجن پھڑ پھڑایا ۔ گاڑی ذرا سی لہرائی اور ابھی جھوم کر چلنے بھی نہیں پائی تھی کہ پھر یہیں گڑ گئی ۔ میں نشے میں نہیں ہوں ۔ یہ گاڑی نشے میں ہے ۔"

ہم تینوں بے اختیار ہنسنے لگے ۔

منٹو نے کہا " ڈرائیور کو پٹرول لینے بھیجو ۔"

" پیسے نہیں ہیں ۔"

" چیک لکھو اور کیش کرا لو ۔"

" چیک بک گھر میں پڑی ہے -- تانگہ منگواؤ ۔"

ایک خالی تانگہ پاس سے گزرا ۔ اسے روکا ۔ ڈرائیور کو وہیں چھوڑ ہم تینوں سوار ہوگئے ۔ منٹو نے سلیم سے پوچھا " کہاں چلنا ہے -- ' زر ناج ' یا گھر ؟"

" میو روڈ چلیں گے ۔"

تھوڑی ھی دیر میں ہم میو روڈ پہنچ گئے ۔ ایک پرانی سی کوٹھی میں داخل ہوئے جہاں شیخ سلیم کی پہلی بیوی رہتی تھی ۔ جس کمرے میں ہمیں بٹھایا گیا ، وہاں کی ہر چیز نشے میں دھت تھی ۔ میز لڑھک کر صوفے پر پڑا تھا ۔ دری منٹل پر ، گلدان آتشدان میں ، دیوان پر خالی بوتلیں ، چھت پر جالوں کی بیل ، دیوار پر اکھڑے ہوئے چونے نے آڑھی ترچھی لکیریں پیدا کر کے کئی عجیب و غریب صورتیں بنالی تھیں جنہیں بار بار دیکھنے سے ہر بار نئی نئی صورتیں آنکھوں کے سامنے آتی تھیں ۔

دو پیگ ٹیبل درمیان میں الٹے سیدھے پڑے تھے ۔ منٹو اور میں انہی پر بیٹھ گئے ۔ شیخ سلیم نے کونے میں دبکی ہوئی کرسی باہر گھسیٹی اور اسی پر ٹک گیا ۔ ہر چیز گرد و غبار سے اٹی پڑی تھی ۔ اس گھٹی ہوئی بساند میں منٹو مجھ سے پہلے ھی گھبرا گیا ۔ وہ تقریباً قریب قریب چیخ اٹھا " یار جلدی چیک لکھو ۔"

" ٹھہرو ، میں دوسرے کمرے سے چیک بک لے آؤں ۔"

اتنے میں شیخ سلیم کا ملازم کمرے میں داخل ہوا ۔ شیخ سلیم نے اسے دیکھا تو بڑے غضب ناک لہجے میں بولا " حرام زادے ، کام چور کہیں کے ۔ دیکھتا نہیں کمرے کا کیا حال ہے ۔ روز کہتا ہوں ، صفائی کرو ۔"

ملازم نے تن کر جواب دیا " روز تے نئیں ہنے آ کھیا جے ۔"

" بک نہ ۔ دفعہ ہو جا ، نٹھ کے چیک بک لیا ۔"

وہ کمرے سے باہر نکلا تو شیخ سلیم نے کہا " یار یہ نوکر بڑے کام چور ہوتے ہیں ۔"

اس پر منٹو نے کہا " اوئے بچو ، فراڈ لگاتے ہو ۔"

" کیسا فراڈ ؟ "

" میں سب جانتا ہوں ۔ تمہارے ہاں میں اکثر آیا ہوں اور ہمیشہ اسی کانجی ہاؤس میں بیٹھا ہوں ۔ اب فراڈ لگاتے ہو بچو ۔"

شیخ سلیم نے فلسفی بن کر جواب دیا " بترا ، اسی کانجی ہاؤس میں ساری دنیا آباد ہے ۔ اس گرد کی تہہ میں خلوص اور محبت کی چمک ہے ، ہاں — میں نشے میں نہیں ہوں جو تمہاری بات کا غصہ کروں ۔"

ملازم کمرے میں آیا اور چیک بک شیخ سلیم کے حوالے کردی ۔ سلیم نے قلم نکالا ۔ چیک پر رقم لکھی ۔ دستخط کیے اور ملازم کو یہ کہتے ہوئے دیا " کیش کروانے کے بعد سیدھا پٹیالہ گراؤنڈ تک پہنچنا ۔ گاڑی وہیں کھڑی ہے ۔ پٹرول ڈلوانا اور باقی پیسے لے کر

یہاں پہنچ جاؤ ، میں یہیں رہوں گا ۔" پھر اُس نے سرگوشی میں تاکیداً کہا " اور ہاں " زرتاج ہوٹل" بھی جانا ۔ پچاس وہیں دے آنا ، سمجھے۔"

ملازم ہدایات پلے سے باندھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا ۔

چیک بک ابھی وہیں پڑی تھی ۔ منٹو نے چیک بک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شیخ سلیم سے کہا " لکھو بھئی دو سو روپیہ ۔"

" یار ، میرے پاس سر دست دو سو نہیں ۔"

" جتنے بھی ہیں لکھ دو اور جلدی لکھو یار ، میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے ۔"

" تم تو اس کانچی ہاؤس میں آتے رہے ہو ۔ اس وقت دم کیوں گھٹنے لگا ۔"

منٹو نے مسکراتے ہوئے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارا " چلو یار ، اب لکھو بھی ۔ بنک بند ہو جائے گا ۔"

شیخ سلیم نے صرف ساٹھ روپے کا چیک لکھ کر دیا اور کہنے لگا " لو بھئی ، اس وقت یہی کچھ حاضر ہے ۔ بہت شرمندہ ہوں اور اسی لیے اب تمہارے گھر بھی نہیں آتا ۔ اللہ نے چاہا تو باقی بھی ادا کردوں گا ۔"

منٹو نے چیک وصول کرتے ہوئے کہا " تم چاہو تو سب کچھ ادا ہو جائے گا ۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوا " چل بھئی خواجہ --- اچھا بھئی سلیم ، چلتے ہیں ۔"

ہم دونوں باہر آگئے ۔ باہر آتے ہی مجھے پہلی بار ہوا کی تازگی کا بڑا لطف آیا ۔

آسٹریلیشیا بنک کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے تو شیخ سلیم کا ملازم نیچے اُترتا ہوا دکھائی دیا ۔ منٹو نے اس سے پوچھا " کیوں بھئی پیسے مل گئے ۔"

" آہو جی !"

ہم اُوپر گئے ۔ منٹو نے چیک کی پشت پر دستخط کیے ۔ چیک بنک والوں کے حوالے کیا اور ٹوکن لے کر میرے پاس آگیا ۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ۔ مجھے پان کی طلب تھی ۔ پان لینے وہاں سے باہر نکلا ۔ واپس آیا تو منٹو بڑا سیخ پا دکھائی دیا " یار خواجہ اُس فراڈ نے کباب کر دیا ہے ۔"

" کیوں ، کیا ہوا ؟"

" چیک 'ڈس اونر' ہوگیا ہے ۔ دستخط نہیں ملتے ۔ بڑا فراڈ ہے ۔ اپنے چیک پر تو ٹھیک دستخط کیے اور مجھے اوٹ پٹانگ دستخط پر ٹرخا دیا ۔"

" یہ بھی اچھی رہی ۔"

" اب تمہیں مذاق کی سوجھی ہے ۔ کمبخت نے بیڑا غرق کر دیا ہے ۔ یہ رقم میری نہیں ورنہ میں کبھی پروا نہ کرتا ۔"

" کس کی رقم ہے ؟"

" اقبال کی !"

" آپا جان کی ؟"

" ہاں اُسی سے لے کر دیے تھے لیکن یہ فراڈ ، دینے کا نام تک نہیں لیتا ۔"

اس کے بعد منٹو نے بڑے افسوس ناک لہجے میں شیخ سلیم کے فراڈ کا قصہ سنایا ۔ بات یہ تھی کہ ' ٹھنڈا گوشت ' کے مقدمے کے دوران میں منٹو اس قدر دل برداشتہ ہو گیا تھا کہ اُس نے لکھنے پڑھنے سے دور رہنے کا فیصلہ کرلیا ۔ مجسٹریٹ کے توہین آمیز رویے نے اُس کے دل میں شدید نفرت پیدا کردی ۔

" منٹو تم اپنے تئیں سمندر سے موتی نکالتے ہو لیکن تمہارے ہاتھ گندی موری میں ہوتے ہیں جہاں سے تم محض غلیظ کنکر نکالتے ہو ۔ تمہارے افسانے ادب پارے نہیں ، غلیظ کنکروں کا ڈھیر ہیں ......"

یہ تھے مجسٹریٹ کے وہ الفاظ جنھوں نے منٹو کو اپنے ماحول سے بے گانہ کر دیا اور وہ اُن لوگوں کو اپنانے لگا جنھیں علم و ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا ۔ آمدن کا معقول ذریعہ پیدا کرنے کے لیے اُس نے شیخ سلیم سے دوستی کی ۔ شیخ سلیم لاہور ریلوے اسٹیشن کا ایک ٹھیکیدار تھا ۔ کام کاج منشی اور دوسرے ملازموں کے سپرد تھا لیکن شیخ سلیم مدھوشی کے عالم میں بھی ان سب کی لگامیں اپنے ہاتھ میں رکھتا ۔ منٹو نے ابھی لگام بھی اُس کے ہاتھ میں تھما دی ۔ دونوں نے مل کر مشترکہ ٹھیکے کی تجویز پر کسی اور دھندے کے لیے ٹینڈر بھر دیا ۔ اور جب دوسروں کے مقابلے میں یہ ٹینڈر منظور ہو گیا تو اُس وقت شیخ سلیم نے ضرورت سے زیادہ ہوش مندی کا ثبوت دیا ۔ شیخ سلیم نے ٹھیکہ اپنے نام منتقل کروا لیا تھا ۔ ٹینڈر کی منظوری کا کاغذ سلیم کے ہاتھ میں تھا اور منٹو کے ہاتھ میں فقط ایک جام ۔

قصہ سنانے کے بعد منٹو کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور اُس نے مسکراتے ہوئے کہا " دیکھ لے پیارے ، کیسا کیسا فراڈ یہاں پڑا ہے ۔"

مجھے بھی ہنسی آ گئی ۔ شیخ سلیم اور منٹو کے بارے میں میرا کچھ اور ہی خیال تھا ۔ میں تو یہی سمجھتا رہا کہ منٹو نے افسانے کی خاطر شیخ سلیم سے یارانہ گانٹھا ہے اور جب وہ اس پر افسانہ لکھ چکے گا تو یہ میل ، لاپ خود بخود ختم ہو جائے گا لیکن یہاں معاملہ کچھ اور تھا ۔ میں ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ منٹو نے مجھ سے کہا " یار ، اب میں اقبال سے کیا کہوں گا ۔ میرے ہی کہنے پر اُس نے پیسے دیے تھے ۔ وہ کیا سوچے گی کہ ..."

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا " یار ، سوچنا کیا ہے ، آپا جان کو معلوم ہی ہے کہ یہ رقم شیخ سلیم نے لی ہے ۔"

" یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہی سمجھے گی کہ میں نے ہی یہ رقم خرد برد کی ہے ۔ تم نہیں جانتے ، میں لڑکپن میں اقبال سے نت نئے ہتھکنڈوں سے پیسے بٹورتا رہا ہوں ... "

منٹو لڑکپن میں کھو گیا ۔ اُس کے چہرے پر شوخ مسکراہٹ کھیلنے لگی " لڑکپن کی بات ہے ۔ ایک بار مجھے دو روپوں کی ضرورت تھی ۔ میں نے سوچا یہ دو روپے اقبال سے وصول کیے جائیں ۔ اتفاق سے اُس نے مجھے سینڈل لینے کے لیے بازار بھیجا ۔"

" تم سینڈل کے روپے کھا گئے ؟"

" سینڈل کھایا نہ سینڈل کے روپے ۔"

" تو پھر زیادہ قیمت بتا کر دو روپے وصول کیے ہوں گے ؟"

" نہیں ، ایسی وصولی مجھے کبھی پسند نہ تھی ۔ اچھا تو سنو پورا قصہ ـــ ہاں ، تو جب میں گھر کے قریب پہنچا تو میں نے ڈیوڑھی میں سینڈل پہن لیا اور ٹھپ ٹھپ کرتا گھر میں داخل ہوا ۔ اقبال کی نظر سینڈل پر پڑی تو کہنے لگی " سعادت ، اسی طرح آئے ہو بازار سے ؟" میں نے جواب دیا " اور کیا !" وہ کہنے لگی " چل ہٹ ، میں نہیں مانتی !" میں نے کہا " لو اگر میں یہی سینڈل پہنے برقع اوڑھ کر آپا سعادت کے ہاں پہنچ جاؤں تو مانو گی نا ۔" جواب ملا " میں مان ہی نہیں سکتی کہ تم ایسی حالت میں کہیں باہر جاسکتے ہو ؟" موقع پاتے ہی میں نے فوراً کہا " لو آؤ پھر ، میں دو روپے کی شرط لگاتا ہوں ۔" اُس نے شرط منظور کر لی ، اور میں نے یہ شرط جیت لی ۔"

" تو گویا تم برقع اوڑھ کر پہنچ ہی گئے ؟"

" تو اور کیا ، دو روپے جو وصول کرنے تھے ۔ لو ایک بار کیا ہوا ، میں نے اپنے ایک عزیز ، ظہیر کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ۔ اسے زمین پر لٹایا ۔ اس پر کمبل ڈال دیا اور خود گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بڑے ٹھسے سے حقہ پینے لگا ۔ ایک کش لیا اور دھواں

پھیلاتے ہوئے میں نے سب سے کہا کہ تم میں سے کوئی بھی اپنی انگلیاں کھڑی کردے - بے شک یہ انگلیاں چادر کی اوٹ میں ہوں ، ظہیر تمہاری انگلیاں گن کر بتا دے گا - اس پر اقبال نے کہا '' لیکن ایک شرط ہے کہ تم خود منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہو - ہوسکتا ہے تم اپنی بول چال میں انگلیوں کی تعداد بتادو -'' اقبال کی تائید سب نے کی - تائید کرنے والوں میں ایک نئی نویلی دلہن پیش پیش تھی - میں نے اس سے کہا '' اچھا جی ، میں ہرگز نہیں بولوں گا لیکن ایک شرط ہے - اگر ظہیر نے انگلیوں کی تعداد ٹھیک ٹھیک بتا دی تو انگوٹھی مجھے اتار کر دینی ہوگی - یہ شرط منظور کرلی گئی ......''

''... اور تم نے یہ شرط جیت لی ؟''

'' بالکل ، لیکن میں نے وہ انگوٹھی واپس کردی اور اس کے عوض اقبال سے پیسے بٹور لیے -''

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک شریر لڑکے کی طرح اپنا رعب جمانے کے لیے مجھ سے پوچھا '' بھلا بتاؤ تو سہی ، یہ شرط میں نے کیسے جیت لی ؟''

'' بھئی یہ میرا پھیری اپنے بس کا روگ نہیں -''

'' تو گویا تم نے ہیرا پھیری کی ہی نہیں ؟''

'' کی تو ہے لیکن ایسی نہیں اور اسی لیے میں نہیں سمجھ سکا کہ شرط کیسے جیت لی -''

'' تم بھی نرے بدھو ہو - سیدھی سی بات ہے - جتنی انگلیاں ہوتی تھیں ، میں حقے کے اتنے ہی کش لیتا تھا اور ظہیر حقے کی گڑ گڑ سے انگلیوں کی تعداد معلوم کرلیتا تھا — کیوں کیسی رہی ؟''

'' اچھی رہی !''

'' یار ، اسی طرح کے کئی اور قصے ہیں ... ''

یکایک اس کی نظر ہاتھ میں تھامے ہوئے ' ڈس اونر ' چیک پر پڑی - اس کے چہرے کی شوخ مسکراہٹ اداس شکنوں میں بدل گئی - سعادت انہی شکنوں میں کہیں کھوگیا - منٹو ابھر آیا اور اس نے بڑے افسوسناک لہجے میں کہا '' اور اگر اب بھی اقبال یہی سمجھ لے کہ میں نے ہی سارے پیسے خرد برد کیے ہیں تو وہ حق بجانب ہے -''

'' آپا جان ایسا سوچ ہی نہیں سکتیں - ابھی پچھلے دنوں خود شیخ سلیم نے گھر آ کر فوری ادائیگی کا وعدہ کیا تھا - آپا جان بھی تو وہیں تھیں -''

'' تو پھر وہ کیا سوچے گی کہ اس کے ملنے والے کیسے ہیں - فراڈ در فراڈ - بڑے دکھ کی بات ہے - میں اس کا بھائی ہوں اور اس کے کام نہیں آسکا - الٹا ہمیشہ وہی میری مدد کرتی ہے — اچھا یار ، چھوڑو ان باتوں کو ، آؤ کہیں اور چلیں !''

اس کے بعد کئی بار شیخ سلیم کی صورت میری آنکھوں کے سامنے آجاتی - مڑے تڑے ہاتھ جو اپنے لیے صحیح طور پر حرکت میں آجاتے - بھکی بھکی آواز جس میں دوسروں کے لیے ایسے الفاظ ہوتے جن کا کوئی مطلب نہ ہو اور اسی بھکی آواز میں اپنے لیے ہر لفظ معنی خیز ہوتا - یہی آواز کئی بار میرے کانوں میں گونجتی -

— لیکن یہی آواز ایک بار دوسرے کے لیے بھی معنی خیز ثابت ہوئی - وہ دوسرا میں ہی تھا - مجرموں کے کٹہرے میں اپنے چہرے کو مسکراہٹ کی نقاب میں چھپائے خاموش کھڑا تھا - جرمانہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا - عارف اور منٹو نے اپنا اپنا جرمانہ ادا کردیا تھا - وہ کٹہرے سے اتر کر عدالت سے باہر جاسکتے تھے لیکن میرے لیے ہتھکڑی تھی ، پولیس وین تھی ، جیل تھا - میں نے یہ سب کچھ منظور کرلیا - منٹو کو

یہ سب کچھ منظور نہیں تھا ۔ اُس کی جیب میں ایک سو روپیہ تھا ۔ مزید دو سو کے لیے اُس نے چند لوگوں سے پوچھا لیکن تین سو پورا نہ ھوسکا ۔ تمام عدالتیں برخاست ھوچکی تھیں ۔ باھر سناٹا تھا لیکن یہ عدالت ابھی تک کھلی تھی ۔ یہاں فیصلہ اُس وقت سنایا گیا جب کسی انتظام اور ضمانت کی گنجائش باقی نہ رھے ۔ منٹو کو بڑی تشویش تھی ۔ آخر اُسے ایک ترکیب سوجھی ۔ وکیل سے کہا کہ وہ عدالت سے چوبیس گھنٹے کی مہلت لے لے ۔ چنانچہ وکیل نے جب یہ مہلت طلب کی تو مجسٹریٹ نے پہلے تو ٹال دیا ۔ پھر ذرا سی قیل و قال کے بعد مہلت دے دی ۔ اب سوال ضامن کا تھا ۔ ضمانت کون دے ۔ وھاں کوئی بھی ضامن نہ تھا ۔ سپاھی آگے بڑھے ۔ ہتھکڑی کی جھنکار پیدا ھوئی ۔

یکایک ایک آواز گونجی "میں نصیر صاحب کا ضامن ھوں ۔"

شیخ سلیم نے ڈرامائی انداز میں اپنی بھرپور آواز سے سب کو چونکا دیا ۔

منٹو جانے کیوں گھبراھٹ میں عدالت سے باھر چلا گیا ۔ تھوڑی ھی دیر میں ایک اور آدمی اندر آیا ۔ شیخ سلیم کے پاس کھڑا ھو گیا اور اُس کو آھستہ آھستہ کٹہرے کے ایک طرف لے گیا ۔ وکیل نے ضمانت کے کاغذ کی خانہ پری کی تو شیخ سلیم نے اپنی جائداد دکھانے کے لیے لاھور کی کئی کوٹھیاں لکھوا دیں ۔ پھر بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اُس نے دستخط کیے ۔ اُس کا تڑا تڑا ھاتھ سدھا تھا اور یوں حرکت میں آگیا تھا کہ ضمانت نامہ 'ڈس اونر' نہ ھوسکا ۔

میں عدالت سے باھر تھا ۔ شیخ سلیم نے بے اختیار مجھے گلے سے لگا لیا ۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا تو کہنے لگا "آپ میرے یار کے یار ھیں ۔ میں نے آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کیا ۔"

وہ بے حد خوش تھا ۔ اس قدر مسرور نظر آرھا تھا کہ شاید اُسے پی کر بھی اتنا سرور کبھی حاصل نہ ھؤا ھوگا ۔ جب ھم سڑک پر آگئے تو سلیم نے منٹو سے کہا "پیارے ، اگر تم جیل چلے جاتے تو میں وھاں بھی 'آب حیات' کا بندوبست کردیتا ۔ جیل میں کیا کچھ نہیں پہنچتا ۔ جب کہو ، جس کے لیے کہو ، ھر چیز پہنچادوں گا ۔ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ منٹو دی گریٹ کی شام کبھی خراب نہ ھونے دوں گا ۔"

منٹو نے کہا "تم یاروں کے یار ھو ۔"

"مانتے ھو نا !"

"ھاں — یار سلیم ، جب تم عدالت میں ضمانت دینے کے لیے آئے اور تمہیں لڑکھڑاتے ھوئے دیکھا تو میری جان نکل گئی ۔"

شیخ سلیم نے ھنستے ھوئے پوچھا "کیوں میری جان ؟"

"تم نشے میں دھت تھے ۔ تمھیں عدالت میں دھر لیے جاتے تو بیڑا غرق ھو جاتا ۔ میں نے اسی لیے ایک آدمی اندر بھیج دیا تھا تاکہ تمہیں مجسٹریٹ سے دور ھی رکھے ۔"

شیخ سلیم جھوم اُٹھا "کچی گولیاں نہیں کھیلا ھوں ۔ ٹھاٹھ سے اندر گیا تھا اور اگر تمہیں اپنے ٹھاٹھ باٹھ کی خبر کردوں تو دنگ رہ جاؤ گے ۔"

"کیا ھے وہ ٹھاٹھ باٹھ ؟"

"سنو ۔ میں نے جتنی کوٹھیاں اپنی جائیداد میں لکھوائی ھیں ، اُن میں سے کوئی بھی میری نہیں ، کیوں کیسی رھی ؟"

منٹو بالکل ھی گھبرا گیا "یار یہ کیا ظلم کیا ھے !"

"یہ ظلم نہ کرتا تو اپنے یار پر ظلم ھوجاتا ۔"

"لیکن اس فراڈ سے تو مارے جائیں گے ۔"

سلیم مسکرا دیا ۔ منٹو کے کندھے پر ھاتھ رکھا اور ذرا طنزیہ لہجے میں بولا "ٹھنڈے

گوشت ، نے تمہاری سمجھ کو بھی ٹھنڈا کر دیا ہے ۔ منٹو دی گریٹ ، یہاں سب چلتا ہے اور وھی آگے بڑھتا ہے جو دھانسو ہو ۔"

منٹو نے اس کی کوئی پروا نہ کی کہ شیخ سلیم کیا فلسفہ چھانٹ رہا ہے ۔ اُس پر اپنی دھن سوار ہو رہی تھی ۔ اُس نے آسمان پر پھیلتی ہوئی سیاھی کو دیکھا تو اُس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک اُٹھیں " چلو یار ، جو ہؤا ، اچھا ہؤا — اب جلدی چلو ، کہیں دکان بند نہ ہو جائے ۔"

شیخ سلیم نے کہا " ٹھہرو ، خوب یاد دلایا ۔ عدالت سے باھر دروازے کے پیچھے میں آدھی بوتل چھوڑ آیا ہوں ۔ اندر جانے سے پہلے چھپادی تھی ۔ پہلے اُسے تو لے آئیں ۔"

ایک صبح آواز آئی " خواجہ — آجا ، خواجہ — آجا !! "

منٹو گلی میں کھڑا چلا رہا تھا ۔ میں نیچے اُترا ۔ مجھے دیکھ کر اُس نے پھر ایک نعرہ لگا دیا " خواجہ — آجا ۔"

وہ جب بھی آتا ۔ اسی طرح چلا چلا کر مجھے آوازیں دیا کرتا ۔ جب اُس نے پہلی بار اونچی آواز میں مجھے پکارا تو محلے کی کئی عورتوں نے کھڑکیوں میں سے جھانکنا شروع کر دیا ۔ جانے کیا آفت آئی ہے جو یوں کوئی چیخ رہا ہے لیکن اب کوئی بھی کچھ نہیں سوچتا تھا ۔ محلے والے اس آواز کو پہچان چکے تھے ۔ منٹو اپنی آمد کا اعلان کرتا ۔ لوگ سنتے اور مسکرا دیا کرتے تھے ۔

میں نے اُس سے مسکراتے ہوئے کہا " چلو یار ۔"

" میں اندر نہیں بیٹھوں گا ۔"

" تو آؤ پھر ، باھر تھڑے پر ھی بیٹھیں ۔"

" بکواس کہیں کا ۔ میں بیٹھنا ھی نہیں چاھتا ۔ تم میرے ساتھ چلو ۔"

" کیا مصیبت ہے ۔ صبح صبح آ کے جگا دیتے ہو ۔"

" نواب صاحب ، نو بج چکے ہیں اور ابھی تمہارے لیے صبح ھی ہے ۔"

" اپنی صبح دس بجے ہوتی ہے ۔ وہ سنا ہے ، ھمارے ایک درباری شاعر نے ھماری ترجمانی یوں کی ہے — بہ بجا آفتاب نکلا ہے — یہ غلط ہوگئی سحر میری "

" کیا بکواس ہے ۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ — اور ھاں ، میں بھی نمکین چائے پیوں گا لیکن باقر خانی کے ساتھ ۔"

دونوں ھنستے کھیلتے کمرے میں آگئے ۔ ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے میں باتھ روم کی طرف لپکا ۔ نہاتا کیا پیر گیلے کیے ۔ ھاتھ ٹب میں ڈبو دیے ۔ منہ پر دو چھپکے پانی کے ڈالے ، سر پہ پانی کی ھلکی سی پھوار اور تولیے سے سارے جسم کو یوں پونچھنا شروع کیا جیسے سر سے پاؤں تک تربتر ہوں ۔ غسل خانے سے باھر آیا تو یاد آیا ، دانت تو صاف ھی نہیں کیے ۔ چلو پھر سہی ۔ دل ھی دل میں یہ کہتا ہؤا کمرے میں آیا ۔ کپڑے تبدیل کیے ۔ مفلر لپیٹا جیسے آج بہت ھی ٹھنڈ ہے ۔ ٹھہرتا ٹھہرتا سیدھا منٹو کے پاس پہنچا ۔

وہ دونوں گھٹنے پیٹ سے لگائے صوفے پر لیٹا ہؤا تھا ۔ دایاں پیر مشین کے پرزے کی طرح ھل رہا تھا ۔ بائیں ھاتھ کی دو انگلیوں میں آدھا جلا ہؤا سگرٹ تھا ۔ عینک تپائی پر پڑی تھی ۔ دایاں ھاتھ سر کے نیچے رکھ کر آنکھیں بند کیے جانے وہ کیا سوچ رہا تھا کہ میں نے اُسے چونکا دیا " کیا ہو رہا ہے ۔ ؟ "

" جگالی کر رہا ہوں ۔"

" کوئی چیز نازل ہوئی ؟ "

" ہوتے ہوتے ہو ہی جائے گی ۔ یہ بتاؤ ، جانے کب نازل ہوگی ؟ "
" بس آرہی ہے ۔"
" یہ بس اور لاری میں نہیں جانتا ۔ چائے اور باقر خانی کی کہو ۔"
میں مسکرا دیا ۔
اُس نے سگرٹ کا ایک کش لیا ۔ اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔ عینک آنکھوں پر لگائی ۔ ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو اپنے ہاتھ سے پیچھے کیا اور ٹکا ٹک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " وہ آ گئی ! "
ملازم ٹرے لیے آ رہا تھا ۔ اُس نے چائے میز پر رکھی اور باہر چلا گیا ۔ منٹو نے خود ہی چائے انڈھیلنا شروع کردی ۔ چائے دانی ایک طرف رکھی ۔ چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگالی ۔ ایک گھونٹ پیا اور بے ساختہ کہنے لگا " بھئی واہ مزا آگیا ۔ زندہ باد کشمیری چائے ۔ اچھا بھئی خواجہ ، ایک بات ہے ۔"
" کون سی ؟ "
" بعض کشمیری جو سالہا سال سے پنجاب میں آباد ہیں ، نمکین چائے میں بالائی ملا کر پیتے ہیں ۔ یہ زبان کا چسکا ہے ، چائے تو نہیں لیکن یار 'پھیونی' چائے میں ڈال کر جو مزہ آتا ہے ، اُس کے کیا کہنے !"
" تو بالائی اور ' پھیونی ' منگوا دوں ؟ "
" نہیں ، میرا یہ مطلب نہیں ۔"
یہ کہتے ہوئے اُس نے باقر خانی کا ایک ٹکڑا چائے میں بھگو کر کھانا شروع کیا ۔ پھر فوراً ہی بڑی اکتاہٹ سے کہنے لگا " بڑی ' شکسُ ' ہے یار ۔ چوک فرید کے صوفی کی باقرخانی کا جواب نہیں تھا ۔"
" وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بھی تو امرتسری کی بنائی ہوئی ہے ۔"
" امرتسر والی بات نہیں ۔ اسے اب لاہور کی ہوا لگ گئی ہے ۔"
چائے پینے کے بعد ہم دونو باہر سڑک پر آگئے ۔ تانگہ موجود تھا ۔ کوچوان بڑے مزے سے ' بگلے ' کے کش لے رہا تھا ۔ میں نے منٹو سے پوچھا " تانگہ کس وقت لیا تھا ؟ "
" ابھی ابھی — تمہاری ہی طرف لے کر آ رہا ہوں ۔"
" چلنا کہاں ہے ؟ "
" شیخ سلیم کے ہاں ! "
پہلے ' زر تاج ہوٹل ' پہنچے ۔ شیخ سلیم وہاں نہیں تھا ۔ پھر میو روڈ کا رخ کیا ۔ تانگہ مزے سے جا رہا تھا ۔ اتنے میں پیچھے سے ایک اور تانگہ بڑی تیزی سے قریب آنے لگا ۔ اُس کی پچھلی سیٹ پر ریشمی نیلا برقع کسی مجسمے پر چڑھا ہوا تھا ۔ میں نے آنکھوں سے نقاب کشائی کی کوشش کی ۔ برقع کسی طرح نہ سرکا ۔ آخر میں نے منٹو سے کہا " پلٹ تیرا دھیان کدھر ہے بھئی ! "
یکایک ہوا کے ایک شوخ جھونکے نے باریک جارجٹ کے نقاب کو الٹ دیا لیکن آنکھ جھپکنے کی دیر میں چہرہ پھر نقاب پوش ہو گیا ۔ تانگہ کی رفتار تیز ہوئی اور مجسمے سمیت ہم سے آگے بڑھ گیا ۔ جانے کیا ہوا کہ نقاب کے ساتھ ساتھ مجسمہ بھی حرکت میں آگیا ۔ ہاتھوں میں جنبش پیدا ہوئی اور چہرے پر نقاب یوں رکھا کہ فقط دو آنکھیں نمایاں ہوگئیں اور ابھی ہم دیکھنے بھی نہیں پائے تھے کہ گہری نیلی بدلی ان دو چمکیلے ستاروں پر چھا گئی ۔ دیکھتے ہی دیکھتے نقاب پھر اُلٹا ۔ ہوا کے جھونکے سے یا ہاتھوں کی جنبش سے ، اس کا اندازہ نہ لگایا جاسکا ۔ اس کے بعد نقاب کا یہ الٹ پھیر برابر جاری رہا ۔

اچانک تانگے کی رفتار مدھم پڑ گئی ۔ جب ہمارا تانگہ قریب پہنچا تو منٹو نے دوسرے کوچوان سے کہا " تانگہ روک دو ۔" تانگہ رک گیا ۔ ہم دونو قریب پہنچے ۔ مجسمہ ریشمیں سرسراہٹوں میں لپٹا ہؤا تھا ۔

منٹو نے لب کشائی کی " کہیے ، کیا بات ہے ؟"

نسوانی آواز آئی " بات کچھ بھی نہیں ۔ میں تو ریڈیو اسٹیشن جا رہی ہوں ۔"

" کیا آپ وہاں گاتی ہیں ؟"

" نہیں تو ! "

" ڈراموں میں حصہ لیتی ہیں ؟ "

" جی نہیں ! "

" اناؤنسر ہیں ؟ "

" وہ کیا ہوتا ہے ؟ "

منٹو مسکرا دیا اور پھر پوچھا " تو آپ کیوں جارہی ہیں وہاں ؟ "

کچھ دیر خاموشی رہی ۔

پھر آواز آئی " جی میں نے سوچا کہ ڈراموں میں حصہ لیا کروں ۔"

" تو گویا آپ کو ڈراموں میں حصہ لینے کا شوق ہے ؟"

" شوق تو نہیں ! "

" تو پھر جانے کا مقصد ؟ "

" شوق تو ہے ، مگر ۔۔! "

" اگر مگر چھوڑیے ، یہ کہیے ، آپ گھبرا کیوں گئیں ؟ "

" جی نہیں ۔۔ بات در اصل یہ ہے کہ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے ۔ میرا باپ بے کار ہے ۔ ماں مر چکی ہے ۔ دو چھوٹی بہنیں اور ایک چھوٹا بھائی ہے ۔ کمانے والا کوئی بھی نہیں ۔ گہنا پاتا ، برتن باسن اور کپڑا لتا سب بیچ کر پیٹ بھرتے رہے ۔"

اس کی آواز بھرا گئی ۔

درد بھری آواز میں کہنے لگی " میں ہی سب سے بڑی ہوں اور اب مجھے ہی کام کرنا چاہیے ۔"

منٹو کا دل بھر آیا " آئیے ، آپ کو ریڈیو اسٹیشن لے چلیں ۔ وہاں سب اپنے دوست ہیں ۔ کام بن جائے گا ۔ چھوڑیے اس تانگے کو ۔ ہمارے ساتھ چلیے ۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے تانگے والے سے پوچھا " کیوں بھئی ، کتنے پیسے ؟ "

" ڈیڑھ روپیہ ! "

" کیسے ڈیڑھ روپیہ ۔ کہاں سے چلے تھے ؟ "

" جی ، پہلے تو کرشن نگر گئے ۔ پھر مال روڈ ، میکلوڈ روڈ ، لارنس اور اب ریڈیو اسٹیشن جارہا ہوں ۔ آپ ہی انصاف کیجیے ، ڈیڑھ روپیہ بھی کم ہے ! "

" ٹھیک ہے ۔۔ یہ لو ۔"

اس پر لڑکی نے اپنے پرس کی طرف ہاتھ بڑھایا " جی میں خود دے دیتی ہوں ۔"

" نہیں نہیں ، کوئی بات نہیں ! "

تانگے والا ڈیڑھ روپیہ لے کر چلتا بنا اور وہ لڑکی ہمارے تانگے میں میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی ۔ میں اپنے ہی آپ میں سمٹ سمٹا کر خاموش بیٹھا رہا ۔ اس نے خود ہی نقاب الٹ دی ۔ اس سے پہلے نقاب کی الٹ پھیر نے جو کشش پیدا کی تھی ، وہ آپ ہی آپ معدوم ہو کر رہ گئی ۔ اب وہ میرے پاس ، میرے سامنے بے نقاب تھی ۔ گول مٹول چہرہ ، نکھرا ہؤا رنگ ، درمیانہ جسم ، ابھرا ہؤا سینہ ، تنگ پیشانی ، چھوٹی سی تیکھی ناک

تیز تیز بھوری آنکھیں ۔ اُس نے پلکیں جھکا کر پوچھا " ڈراموں میں حصہ لینے کے لیے پارٹ زبانی یاد کیا جاتا ہے ؟ "

" ریڈیو میں ایسا نہیں ہے ۔ یہاں لکھا ہؤا پڑھنا پڑتا ہے ۔"

" پھر تو یہ بہت آسان کام ہے ۔"

" محض پڑھنا آسان ہو تو ہو ، پارٹ ادا کرنا آسان نہیں ۔"

" جی ہاں ، وہ مشق سے ٹھیک ہو جائے گا ۔"

منٹو نے پلٹ کر کہا " فی الحال ڈراموں کو چھوڑیے ۔ آپ عورتوں کے پروگرام میں کمپیر انناؤنسمنٹ کیجیے ۔"

کمپیر اناؤنسمنٹ کا مفہوم سمجھے بغیر اُس نے جواب دیا " جیسے بھی آپ کام بنوا دیں ۔ میں ضرورت مند ہوں ۔ خوب محنت کروں گی ۔"

— اور آخر ہم بھی بجائے شیخ سلیم کے ریڈیو اسٹیشن کے دفتر میں پہنچ گئے ۔ منٹو سیدھا ایک افسر کے کمرے میں داخل ہؤا ۔ افسر بڑے تپاک سے ملا " آؤ آؤ ، آج کیسے راستہ بھول گئے !"

" بھول ہی گیا ہوں — اب اس لڑکی کا آڈیشن لو ۔"

افسر نے ایک صاحب کو بلوایا اور لڑکی اُس کے ساتھ سٹوڈیو میں چلی گئی ۔

منٹو نے دائیں پاؤں کی جوتی اُتاری ۔ پیر کرسی پر رکھا اور ٹیک لگا کر مزے سے بیٹھ گیا ۔

" چائے پیو گے ؟"

" تم فقط چائے کا پوچھو گے ۔ یہ بھی کوئی پینے کی چیز ہے !"

" نہ سہی ، کوئی ٹھنڈی چیز —؟"

" موسم سرما میں — کہیں میرا نشہ تمھیں تو نہیں ہو گیا !"

قہقہہ بلند ہؤا ۔

" بھئی یہ لڑکی کون ہے ؟"

" اللہ جانے کون ہے ۔ نصیر سے پوچھ لو ۔ تانگے میں جا رہی تھی ۔ ملاقات ہو گئی ۔ کہنے لگی ، ریڈیو اسٹیشن جا رہی ہوں ، شاید وہاں کام مل جائے ۔ بچاری کا کام بن جائے تو اچھا ہے ۔"

" بھئی اس قابل ہوئی تو ضرور موقع ملے گا ۔ تمھارے کہنے کی ضرورت ہی نہیں ۔"

" یعنی میرے کہنے کی ضرورت ہی نہیں ؟"

" اور کیا —!"

" ٹھیک ہے !!"

" اچھا اور سناؤ ، کیا حال ہے ؟"

منٹو نے اپنا حال بتانے کے بجائے اُلٹا اُس کی خبر لی " جو حال پوچھتے ہو ، یاد ہے بمبئی میں تمھارا کیا حال ہؤا تھا — یاد ہے نا !"

مخاطب ، یاد آنے پر بھی یاد نہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا ۔ اُس نے ادھر اُدھر کی باتوں میں ٹالنے کی کوشش کی تو منٹو نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا " اب تمھیں کیوں یاد آنے لگا لیکن میں نے کہا ، یہ کیسے بھولو گے کہ قاتل کے ہاتھوں بچ گئے تھے ۔"

" چھوڑو یار —!"

" اچھا ، تو اب چھوڑو یار ۔ اُس وقت تو کہتے تھے کہ للہ بچاؤ اور جب میں نے بغیر پارسل کے بنفس نفیس بھیج دیا تو ایسے سٹپٹائے کہ کانوں کو ہاتھ لگا لیا تھا ۔"

افسر نہیں چاہتا کہ ایسی باتیں دفتر میں چھیڑی جائیں ۔ اُس نے اشاروں ہی اشاروں میں

منٹو پر دفتری رکھ رکھاؤ کی اهمیت واضح کی لیکن منٹو وضاحت کی پروا کیے بغیر، دیرینہ تعلقات جتانے کے لیے بڑے فاتحانہ انداز سے کہنے لگا "اب ٹالتے ہو۔ سنیے صاحب" اس نے حاضرین کو مخاطب کیا اور پھر سنانا شروع کی "وہ لمبا موٹا سکھ تھا۔ خوبصورت اور پیارا سا۔ اس پر ایک بنگالی میوزک ڈائرکٹر کی طبیعت جو آئی تو اس لڑکے نے میوزک ڈائرکٹر کی طبیعت ہمیشہ کے لیے صاف کر دی۔ پھر خود ہی تھانے میں پہنچ گیا کہ میں نے ایک شخص کو قتل کر دیا ہے۔ مقدمہ چلا تو عدالت نے اسے صاف بری کر دیا۔ جب بمبئی میں میرے یار کو 'ٹوسٹ' آئی اور اس نے مجھ سے بار بار کہا تو میں نے وہی قاتل اس کے ہاں بھیج دیا لیکن یہ قتل ہونے سے پہلے ہی فیل ہو گیا اور لڑکے کو کسی تھانے میں جانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔"

یہ کہہ کر منٹو یوں مسکرانے لگا جیسے کہہ رہا ہو "بچو، آج تو افسر ہو گیا تو کیا ہؤا۔ ہے تو وہی نا جسے ہم جانتے ہیں........" پھر کہنے لگا "برا نہ ماننا، یہ اپنا براڈ شغل ہے کہ افسری کی، پان پت، اتاری جائے........"

اتنے میں وہ صاحب کمرے میں داخل ہوئے جو آڈیشن کے لیے لڑکی کے ساتھ گئے تھے۔ کہنے لگے "وہ لڑکی تو ٹھیک طور پر پڑھ بھی نہیں سکتی۔ مکالمے کیا ادا کرے گی۔"

"پہلی بار ہے۔ گھبرا گئی ہو گی۔ اسے ریڈنگ تو کر لینے دو۔ پھر دیکھو۔"

"بہت بہتر —!"

کوئی آدھ گھنٹہ گزر گیا اور نتیجہ وہی صفر نکلا۔ وہ لڑکی کسی طرح بھی براڈ کاسٹنگ کے لیے موزوں ثابت نہ ہوئی۔

جب وہ سٹوڈیو سے باہر نکلی تو اس نے میرا ہاتھ دبایا "ٹھیک پڑھا ہے نا؟"

"یہ تو ریڈیو والے جانیں!"

"اور آپ؟"

"مجھے معلوم نہیں!!"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بڑی بیباک ہنسی تھی۔

اسے ویٹنگ روم تک لے گیا۔ وہاں بیٹھتے ہی وہ کہنے لگی "دیکھیے — ذرا بیٹھیے تو — میں آپ کو ایک چیز دکھاؤں۔"

"دکھائیے۔"

اس نے اپنا پرس کھولا۔ اس میں سے تصویریں نکالیں۔ چھ تصویریں۔ نسواری رنگ کی۔ چھ مختلف پوز۔ وہی جو چھ منٹ میں بجلی کے ذریعے اترتی ہیں۔ ہر تصویر اسی کی تھی۔ ہر تصویر ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ گھونگٹ میں۔ جوڑے والی۔ پیشانی پر بالوں کی لٹ۔ پریشان بال۔ دو چوٹیاں۔ ماتھے پر قم قم۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا تو وہ اترا کر بولی "اچھی ہیں نا؟"

میں نے بن کر کہا "بہت اچھی!!"

"یہ تصویریں آپ ہی رکھ لیں" یہ کہتے ہوئے اس نے وہ تصویریں زبردستی میری جیب میں ڈال دیں۔ عجیب الجھن تھی۔ میں فوراً وہاں سے باہر آ گیا۔ سیدھا منٹو کے پاس پہنچا اور اسے باہر نکال لایا۔

"کیوں بھئی خواجہ، آدھا دن غارت ہؤا نا؟"

"ہمارا نہیں بلکہ اس کا سارا دن غارت ہو گیا ہے!"

"کیا مطلب؟"

"یار، وہ تو پیشہ ور معلوم ہوتی ہے۔ کہانے چلی تھی کہ ہم پلے پڑ گئے۔"

"او رہنے دے اپنی استادی۔"

" یہ دیکھ لو --- اُسی کی تصویریں ہیں --- اب آؤ اس دفتر سے باہر چلیں ۔"

" چلو پھر --- وہ کہاں ہے ؟"

ویٹنگ روم میں بیٹھی ہے ۔"

منٹو اُسے لینے کے لیے ویٹنگ روم میں گیا اور تھوڑی ہی دیر میں اُسے اپنے ساتھ لے کر باہر آ گیا ۔ پھر مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگا " ہاں بھئی یہ نری گڑ بڑ ہے !"

ریڈیو اسٹیشن سے باہر آئے تو منٹو نے اُس سے پوچھا " کہاں جانا ہے آپ کو ؟"

" جہاں آپ لے چلیں !!"

منٹو چپ ہو گیا ۔ میں نے اُس سے سرگوشی میں کہا " لو بھئی کر لو تماشا ۔"

تینوں تانگے پر سوار ہو گئے ۔ راستے میں ، میں نے اُس لڑکی سے پوچھا " آپ کا کیا نام ہے ؟"

" یاسمین !"

" آپ کے والد کہاں کام کرتے تھے ؟"

" ریلوے ورکشاپ میں مستری تھے ۔"

" کب سے بیکار ہیں ؟"

" یہی کوئی دو برس سے !"

منٹو نے پوچھا " کیا نام ہے اُن کا ؟"

" مستری غلام محمد !"

" کہاں رہتی ہیں آپ ؟"

" گڑھی شاہو !"

تانگہ سیدھا انارکلی پہنچا ۔ ہم تینوں ' مکتبہ جدید ' پہنچے ۔ وہاں سے منٹو نے اپنی مطبوعات کی ایک ایک کاپی لی اور اُس کے حوالے کر دی ۔ پھر ' نیا ادارہ ' پہنچے ۔ وہاں سے بھی اپنی کتابیں وصول کر کے یاسمین کو دے دیں ۔ اسی دوران میں جانے مجھے کیا سوجھی کہ میں نے میز پر پڑے ہوئے اُس کے پرس کو کھولا ۔ چھوٹا سا گول آئینہ ۔ پف ۔ روژ ۔ لپ اسٹک ۔ کنگھی ۔ رومال ۔ پیسہ ایک بھی نہیں تھا ۔

اپنی تمام کتابیں دے کر منٹو نے اُسے تانگے پر سوار کرا دیا ۔

میں نے منٹو سے کہا " تمھاری کتابوں سے وہ تانگے کا کرایہ نہیں دے سکتی ۔"

" کیوں ، وہ ' پھانک ' ہے ؟"

" بالکل !"

تانگے والے کو ایک روپیہ دیا گیا اور وہ چلی گئی ۔

' نیا ادارہ ' میں منٹو نے جب دن بھر کی کہانی سنا دی تو جانے اُس کے دل میں کیا آئی کہ مجھ سے کہنے لگا " چلو بھئی اس لڑکی کے ہاں !"

" کہاں جائیں گے ؟"

" اس کے گھر !"

" وہ گھر تھوڑے گئی ہے !"

" تم چلو تو سہی ۔"

منٹو کے ذہن میں جو بات آ جاتی تھی ، اُسے پورا کرنے کے درپے ہو جاتا ۔ اُس نے مجھے ہی نہیں بلکہ احمد راہی کو بھی زبردستی گھسیٹ لیا ۔

ہم گڑھی شاہو پہنچے ۔ وہاں کئی لوگوں سے مستری غلام محمد کا پتہ پوچھا لیکن کہیں پتہ نہ چلا ۔ آخر ایک پرانے ہوٹل کے مالک نے بتایا " مستری غلام محمد کو مرے ہوئے دو سال گزر چکے ہیں ۔"

" اُس کا گھر بار تو ہوگا ۔"
" کوئی گھر بار نہیں ۔ اکیلا آدمی تھا اور سامنے والی کوٹھڑی میں رہتا تھا ۔

' لٹریری کورنر ' گرمی کی تاب نہ لا سکا ۔ اس پر سورج سوا نیزے پر چمکتا ۔ پتھر کا تھڑا ۔ شیشے کی دیواریں ۔ ' لٹریری کورنر ' جہنم کا ایک گوشہ بن کر رہ گیا ۔ دکان کے مالک سے کہا کہ اپنی دوکان کے اندر کا پورشن بھی دے دے ۔ سوچا تھا کہ منٹو اور میں دونوں مل کر ' مکتبۂ منٹو ' کے نام سے پبلشنگ کا کام شروع کریں گے لیکن دکاندار نے تیس ہزار روپے پگڑی کے مانگ لیے ۔ بھلا ہم ننگے سر گھومنے والے پگڑی کہاں سے لاتے ۔ گھوم گھام کر اپنی جگہ پر آ گئے ۔

کچھ عرصے بعد منٹو نے فلموں کے لیے لکھنا شروع کیا ۔ پاکستان میں اُس کا پہلا فلم ' بیلی ' تھا جو بری طرح ناکام ہوگیا ۔ اس ناکامی کا اُسے بڑا صدمہ تھا ۔ ڈائرکشن ، عکاسی اور صدا بندی کے گٹھ جوڑ نے پورے فلم کو بکواس بنا دیا تھا ۔ رسم افتتاح کے موقع پر انٹرول کے فوری بعد منٹو سینما سے غایب ہوگیا تھا ۔ اب وہ چاہتا تھا کہ اس کا کوئی ' ہٹ ٹلا ' فلم بنے ۔

بمبئی کے زمانے میں لکھی ہوئی ایک کہانی ' دوسری کوٹھی ' اُس کے پاس موجود تھی ۔ پاکستان میں ناصر خاں نے اسے فلمانا چاہا ۔ کہانی کا کچھ معاوضہ پیشگی بھی دے دیا لیکن ابھی فلم سیٹ پر نہیں پہنچا تھا کہ وہ خود ہندوستانی فلموں میں کام کرنے کے لیے سیٹ پر پہنچ گیا ۔ پھر ایک اور پروڈیوسر تک رسائی ہوئی ۔ معاملہ طے کرنے سے پہلے کہانی سنانے کی فرمائش کی گئی ۔ منٹو نے کہا مجھے کہانی یاد تو نہیں ، نصیر کو یاد ہے ، یہ آپ کو سنائے گا ۔"

منٹو کا یہ محض ایک فراڈ تھا ۔ وہ منٹو جو اکثر کہا کرتا کہ مجھے کبھی کوئی سن یاد نہیں رہتا ، اُسی منٹو کو اپنی ہر کہانی اور ہر کہانی کا سن یاد تھا کہ کس وقت لکھی گئی ۔ کہاں چھپی ، کیا تبصرے ہوئے ، کتنی داد ملی اور کتنی گالیاں کھائیں ۔ اُسے اپنی یہ فلمی کہانی الف سے ے تک یاد تھی لیکن وہ اکثر پروڈیوسروں کے سامنے خود اپنی لکھی ہوئی کہانی سنانے سے گریز کیا کرتا اور اسی لیے اُس نے یہ ذمہ داری مجھ پر تھوپ دی ۔ محفل میں پروڈیوسر ، ڈائرکٹر ، میوزک ڈائرکٹر اور دو تین آدمی اور تھے ۔

منٹو نے کہا " لو بھئی خواجہ ، سنا دو پھر !"

مناظر کی ترتیب کے ساتھ میں نے کہانی سنانا شروع کر دی ۔ شروع شروع میں ہر شخص دلچسپی لینے لگا ۔ ہر منظر انہیں سکرین پر دکھائی دینے لگا ۔ وہ کہانی سن نہیں رہے تھے بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک منظر ایسا آیا جہاں سب کے سب ایسے کھوئے کہ کوئی جمائیاں لینے لگا ۔ کوئی سر کھجانے میں مصروف ہو گیا ۔ کسی کو ٹائی کی گرہ درست کرنے کا خیال پیدا ہؤا ۔ کسی نے کان کا میل نکالنے کے لیے دیاسلائی کا تنکا گھمانا شروع کیا ۔ کسی نے مرکز کی طرف مائل پرواز ہونے کے لیے انگڑائی لی ۔

اسی انگڑائی کی زد میں ، میں اس کہانی کا یہ منظر پیش کر رہا تھا کہ ہیرو مریض ہے ۔ وہ بستر پر دراز ہے ۔ کمرے کا ایک دروازہ بند ہے ۔ وہ اُسے دیکھتا ہے ۔ پھر اُس کی آنکھیں دوسرے دروازے کو دیکھتی ہیں جو دوسرے کمرے کی طرف کھلتا ہے ۔ وہ دروازہ بھی بند ہے ۔ وہ سامنے کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے جو برآمدے کی طرف کھلتی ہے ۔ وہ کھڑکی بھی بند

ہے ۔ پھر چاروں طرف نظریں دوڑا کر وہ اپنے بستر کے نیچے ہاتھ ڈال کر کوئی چیز ٹٹولتا ہے ۔ وسکی کی ایک بوتل نکالتا ہے ۔ تپائی پر پڑے ہوئے گلاس میں انڈیلتا ہے اور پھر گلاس کو جلدی سے اپنے ہونٹوں سے لگا لیتا ہے ....

میں یہیں تک ہی پہنچا تھا کہ سننے والوں کی ساری دلچسپی تھکی ہاری انگڑائیوں میں بدل گئی ۔ منٹو نے یہ سب کچھ دیکھا تو فوراً بول پڑا " تم بھول گئے ہو ۔ اس نے ابھی گلاس ہونٹوں سے نہیں لگایا ۔"

منٹو نے کچھ اس انداز سے مجھے ٹوکا کہ باقی سب کے سب یوں اٹھ کر بیٹھ گئے جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر گہری نیند سے جگا دیا ہو ۔ سب کے سب منٹو کی طرف متوجہ ہوگئے ۔
میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ میں تو کہانی منظر نامے کے مطابق بالکل ٹھیک سنا رہا تھا اور کوئی بھی حصہ میرے ذہن سے محو نہیں ہوسکا تو پھر یہ کون سا حصہ ہے جسے میں بھول گیا ہوں اور اس منٹو کو یاد ہے جسے اپنی کوئی کہانی اور کوئی سن یاد نہیں رہتا ۔
میں ابھی کچھ سوچنے بھی نہیں پایا تھا کہ اس نے حاضرین کو یوں مخاطب کیا " ہیرو جب وسکی کا گلاس اپنے ہاتھ میں تھام لیتا ہے تو اس کی آنکھیں اس گلاس پر مرکوز ہو جاتی ہیں ۔ کیمرہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے یہاں تک کہ سلولائیڈ کے پورے فریم پر فقط اس کا ہاتھ اور گلاس نظر آتا ہے ۔ اس کلوز اپ کو نمایاں کرنے کے بعد کیمرہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہے ، یہاں تک کہ وہی گلاس کسی اور منظر میں نمایاں ہوتا ہے ۔ مریض ہیرو اب اپنے کمرے اور بستر میں دکھائی نہیں دیتا بلکہ ایک رقاصہ کے سامنے کسی آراستہ کمرے میں قالین پر بیٹھا ہے ۔ وہ جام تھامے رقاصہ سے کہتا ہے ، ' یہ جام رقص میں آرہا ہے ۔ تم بھی رقص میں آؤ تاکہ یہ چاند ستارے ، یہ اجرام فلکی یہاں تک کہ ساری کائنات رقص میں آ جائے اور دنیا پر یہ واضح ہو جائے کہ ہماری کائنات کا دار و مدار اسی رقص پر ہے ۔ اس کی ہر گردش سے کئی زمانے بدل جاتے ہیں ، تم بھی گردش میں آؤ اور اس زمانے کو بدل ڈالو ۔ رقص میں آؤ ۔ گاؤ ۔ وہ گیت گاؤ جس کی دل نواز تانوں سے دونوں جہان گونج اٹھیں ۔' اس کے بعد ساز جھنجھنا اٹھتے ہیں ۔ گھنگھروؤں کی جھنکار پیدا ہوتی ہے ۔ رقاصہ رقص میں آتی ہے ۔ پھر سریلی تان کے ساتھ گانے لگتی ہے ۔ یہ ناچ و گانا کمرے میں ہو رہا ہے لیکن جب ہیرو اپنی خمار آلود آنکھوں سے بوجھل پلکوں کی چھاؤں میں رقاصہ کو دیکھتا ہے تو اسے وہ کمرے میں ناچتی ہوئی دکھائی نہیں دیتی بلکہ کہیں خلا میں ، ابر پاروں کے ہجوم میں ، جہاں کرۂ ارض ، چاند ستارے رقص میں دکھائی دیتے ہیں ۔ ناچ ختم ہوتا ہے ۔ ہیرو رقاصہ سے کہتا ہے ، ایک جام اور ، رقاصہ اس کے گلاس میں وسکی انڈیلتی ہے ۔ وہ پیار بھری نظروں سے رقاصہ کو دیکھتا ہے ۔ پھر اس کی نگاہیں اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے جام پر رک جاتی ہیں ۔ کیمرہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے ۔ ہاتھ میں تھامے ہوئے جام کا کلوز اپ ۔ کیمرہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا ہے ۔ مریض ہیرو اپنے بستر پر بیٹھا ہے اور اس کی آنکھیں اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے گلاس کو دیکھ رہی ہیں ۔"

اس پر ایسی واہ وا ہوئی کہ سب نے پوری بلڈنگ سر پہ اٹھالی ۔ ہر ایک نے ' اوور ایکٹنگ ' کے ساتھ داد دی ۔ ڈائرکٹر نے نعرہ ہائے تحسین بلند کرتے ہوئے کہا " ونڈر فل ، ونڈر فل ، جواب نہیں ، منظر کو تبدیل کرنے کی کیا خوبصورت ترکیب بتائی ہے ۔ کیا نرالی ٹیکنیک ہے ! "

پروڈیوسر نے اپنی موجودگی کا ثبوت دیا " ہم اس سین پر روپیہ پانی کی طرح بہادیں گے ! "
میں نے منٹو کی طرف دیکھا ۔ مارے خوشی کے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا ۔ اپنی تعریف بار بار سن کے وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھا

رکھا ہے اور لاکھوں تماشائیوں کے ھجوم میں پھولوں کے ہار پہنے وہ ہر ایک کو سلام کر رہا ہے ۔

نشاط انگیز شور کے تھم جانے پر منٹو نے مجھ سے کہا " لو اب سناؤ ، پھر اس نے وہ گلاس فوراً اپنے ہونٹوں سے لگالیا ۔ "

اس محفل میں منٹو کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی ۔ اُس نے جو منظر پوری اداکاری کے ساتھ سنایا ، وہ اس کہانی میں سرے سےتھا ھی نہیں ۔ جب میں کہانی سنا رہا تھا تو وہ اس دوران میں سننے والوں کے چہروں کا جائزہ لیتا رہا اور جب اُس نے جمائی ، کھجلی ، اُکتاھٹ اور انگڑائی کے بے ڈھنگے تاثرات کو بھانپ لیا تو اُس نے فوراً کانٹا بدل دیا اور کہانی کو ایسے موڑ پر لے گیا جہاں دلچسپ بیداری پورے عروج پر پہنچ گئی اور پھر اُسی پٹڑی پر آگیا جہاں سے وہ چلا تھا اور جہاں سے مجھے اس گاڑی کو آگے لے جانا تھا ۔ اب وہ رکاوٹ دور ہوچکی تھی ۔ گاڑی اپنی پوری رفتار سے مخالف ھواؤں کو چیرتی ، سیٹیاں بجاتی اسٹیشن پر پہنچ ھی گئی ۔ پلیٹ فارم پر اُترتے ھی منٹو نے پروڈیوسر کو چیک کیا اور پروڈیوسر نے بغیر کسی حیل و حجت کے ایڈوانس چیک منٹو کے ھاتھ میں تھما دیا ۔

دوسرے ھی دن کام شروع ھوگیا ۔

منٹو کے کہنے پر میں نے منظر نامہ لکھنا شروع کیا ۔ تھوڑی دیر بعد اُس کی نظر کاغذ پر پڑی ۔ یکایک اُس نے جھلا کر کہا " او یار بیڑا غرق ھوگیا ! "

میرا خیال تھا ، شاید میری تحریر میں کہیں غلطی ہے اور وہ بھی کوئی خوفناک قسم کی ، اسی لیے تو بیڑا غرق ھوگیا ۔ میں نے اُس سے پوچھا " کیا ہؤا ! کوئی غلطی ھوگئی کیا ؟ "

" بہت بڑی غلطی ۔ تم نے اُوپر ٧٨٦ کیوں نہیں لکھا ؟ اب اس صفحے کو پھاڑ دو ، تھوڑی دیر بعد پھر لکھنا ۔"

" یار یہ ٧٨٦ لکھنا ضروری ہے کیا ؟ "

" بہت ضروری ہے ۔ میں اپنی ہر کہانی ، ہر مضمون ، ہر ڈرامہ لکھنے سے پہلے ٧٨٦ لکھتا ھوں ۔ ایک بار میں ایک کہانی کے دو صفحے لکھ چکا تھا ۔ اچانک ھی میری نظر پہلے صفحے کی پیشانی پر پڑی تو کیا دیکھتا ھوں ، ٧٨٦ نہیں لکھا ۔ میں نے وہ دونوں صفحے پھاڑ دیے اور پھر وہ کہانی لکھی ھی نہیں ۔"

مجھے ایک شرارت سوجھی ۔ میں نے اُس سے پوچھا " ٧٨٦ کا کیا مطلب ہے ؟ "

" بسم اللہ الرحمن الرحیم ! "

" وہ کیسے ؟ "

" بسم اللہ کے سارے اعداد کو جمع کرنے پر ٧٨٦ مجموعہ نکلا ہے ۔"

" ٹھیک ہے لیکن ایک بات ہے ۔"

" کون سی ؟ "

" اگر ٧٨٦ پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ بسم اللہ ٧٨٦ کی صورت میں جائز سمجھی جاتی ہے تو کل کلاں کوئی اور شخص پورے قرآن مجید کی تلاوت پاک ایک ھی لائن میں یوں ادا کرے گا ٧٨٦ — سات کھرب چھپن ارب ، چھپن کروڑ ، ننانوے لاکھ ، اٹھتر ھزار پانچ سو اڑتیس !! "

منٹو مسکرا دیا ۔ کہنے لگا " بڑے شیطان ھو تم !! "

پھر وہ خود ھی مزے میں آگیا " ھاں یار ، اس حساب سے اگر کوئی کسی سے پوچھے ، کہو بھئی تم مسلمان ھو ، اور جواب اگر ھاں میں مل جائے تو پھر اُس سے کہا جائے کلمہ

سناؤ تو وہ یوں کہہ دے سات ہزار آٹھ سو گیارہ ۔ پھر تو نماز بھی اعداد میں ادا ہونے لگے ۔ شفائے بیماراں ۵۱۲ ، خلاصئی قرض داراں ۱۸ ے میں بدل جائے !! "

من گھڑت اعداد و شمار پر ہم دونوں بے اختیار ہنستے رہے ۔

دوسری بار جب میں نے مکالے لکھنے کے لیے قلم اُٹھایا تو میں نے کاغذ کی پیشانی پر ۷۸۶ کے بجائے ' بسم اللہ الرحمن الرحیم ' لکھا ۔

منٹو نے آگے بڑھ کر دیکھا اور بسم اللہ پڑھ کر کہنے لگا " ٹھیک ہے ۔ اب لکھنا شروع کر دو ! "

منٹو نے سگرٹ سلگایا ۔ اطمینان سے ٹیک لگائی اور کسی سوچ میں پڑ گیا ۔ میں مکالمے لکھنے میں مصروف ہوگیا ۔ قریب قریب آدھا صفحہ لکھ چکا تھا کہ منٹو نے مجھے چونکا دیا " تم نے کچھ لکھا بھی یا ابھی تک سوچ رہے ہو ؟ "

" آدھا صفحہ لکھ چکا ہوں ! "

" آدھا صفحہ لکھ چکے ہو ، وہ کیسے ؟ — تمہاری تو آواز ھی نہیں آئی !! "

" آواز کی کیا ضرورت ہے ۔ ریکارڈ لگانا ہے یا مکالمہ لکھنا ہے ! "

" میری جان ، مکالمے لکھنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ تم ہر مکالمہ بول بول کر لکھو ۔ میں خود ریڈیو اور فلم کے لیے ہمیشہ اسی طرح مکالمے لکھتا رہا ہوں !! "

میں نے نہ صرف بول بول کے بلکہ پوری ایکٹنگ کے ساتھ مکالمے لکھنے شروع کیے ۔ میں بول رہا تھا " میں نے تم سے کئی بار کہا کہ یہاں مت آؤ ۔"

منٹو نے مجھے ٹوک دیا " پھر اسے ادا کرو ۔"

" میں نے تم سے کئی بار کہا کہ یہاں مت آؤ ۔"

" یہ بیچ میں رکتے کیوں ہو ۔ کون سا لفظ رکاوٹ کا باعث ہے ۔ کہاں روانی میں فرق آتا ہے ۔ کس جگہ زور کم ہو جاتا ہے ۔ اس مکالمے کو پھر ادا کرو ۔"

" میں نے تم سے کئی بار کہا — کہ —"

" — کہ — دیکھ لیا نا ، یہی رکاوٹ ہے ۔ اسے نکال دو : اب پڑھو ! "

" میں نے تم سے کئی بار کہا ، یہاں مت آؤ ۔"

" ٹھیک ہے نا ؟ "

" سوا سولہ آنے ! "

" تو لا پھر سوا سولہ آنے ! "

میں مسکرا دیا اور پھر مکالمے لکھنے ، لکھنے کہاں بلکہ بولنے اور لکھنے میں مصروف ہوگیا ۔ لیکن یہ مصروفیت زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکی ۔ وہ پروڈیوسر جو ایک سین پر روپیہ پانی کی طرح بہا دینے کے لیے تیار تھا خود ھی کہیں بہہ گیا ۔ 'دوسری کوٹھی' ہمارے مکالموں سے گونجتی رھی یہاں تک کہ ہم نے سر پہ اٹھالی اور پھر کہیں اور پہنچا دی ۔ جہاں پہنچتے ھی پیشگی کرایہ تو وصول ہو گیا لیکن کرائے دار اس میں نہ رہ سکے اور اب یہی ' دوسری کوٹھی ' ' فلم یونٹ ' کے ایک کونے میں پڑی ہوئی میز پر کاغذی صورت میں بکھری پڑی تھی ۔

' فلم یونٹ ' ایک مشہور کیمرہ مین نے کسی رئیس سے مل کر قائم کیا تھا ۔ ہم دونوں صبح آ جاتے ۔ دن بھر ' پیپرورک ' ہوتا — لیکن ، آج میرا یہاں آخری دن تھا ۔

میں کراچی جا رہا تھا ۔

منٹو نے کراچی کی ایک برطانوی فرم میں میری ملازمت کا بندوبست کر دیا تھا ۔ اس ملازمت کے لیے اُس نے بڑی کوشش کی تھی ۔ جس دن میرے نام انٹرویو کا خط آگیا تو منٹو

مجھ سے کہیں زیادہ خوش خوش نظر آنے لگا ۔ میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہنے لگا "خواجہ ، اس لکھنے لکھانے پر لعنت بھیجو ۔ پیسہ جیب میں ہو تو ہر کوئی اچھا سمجھتا ہے ورنہ اچھے سے اچھا آدمی برا اور ذلیل سمجھا جاتا ہے ..."

اچانک دروازہ کھلا ۔ ایک ایکٹرس پورے بناؤ سنگار کے ساتھ ٹھمک کر اندر آئی " منٹو بھائی ـــ"

منٹو نے بات کاٹ کر بڑی تلخی سے جواب دیا " میں منٹو ہوں ، بھائی نہیں !! "

منٹو کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور آناً فاناً بجلی کی طرح غائب ہوگئی۔

منٹو بڑ بڑایا " آلو کی پٹھی ، مجھے بھائی کہتی ہے ۔ ایک بار ایک اور لڑکی نے بھی بھائی کہا تھا اور وہ سبق دیا تھا کہ زندگی بھر یاد ھی رکھے گی ۔"

" کون لڑکی ؟ "

" تمہارے کرشن چندر کی محبوبہ ۔ سنو ، تمہیں پورا قصہ سناتا ہوں ۔"

ـــ اور وہ قصہ سنانے بیٹھ گیا ۔

میں دھلی ریڈیو میں ملازم تھا ۔ وہ لڑکی وھاں ڈراموں میں حصہ لیا کرتی تھی ۔ شکل صورت کی بس یونہی سی ہے ۔ اُس پر جوانی آئی تو کرشن چندر کی رگ عشق پھڑک اٹھی ۔ وہ چھپ چھپ کر اُس سے ملتا لیکن وہ ھر کہیں آزادی سے فٹ فلوس ہو جاتی ۔ مجھے اُس میں کوئی ایسی بات نظر نہ آئی جو کسی بھی کشش کا باعث ہوتی ہے ۔ چہرے ھی سے چھنال لگتی ۔ ایک دن میرے کمرے میں آ گئی ۔ کہنے لگی " منٹو بھائی ـــ" اُس نے آگے کیا کہا ، میں نے سنی ان سنی کر دی ۔ جسم کے سارے بال جل گئے تھے ۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اُس سے کہا " آؤ ، میرے ساتھ چلو ۔" وہ فوراً تیار ہوگئی ۔ میں اُسے اپنے ھاں لے آیا ۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا ۔ صفیہ لاھور گئی ہوئی تھی ۔ وہ جب کمرے میں بیٹھ گئی تو میں نے اُس سے کہا " سارے کپڑے اتار دو ۔" وہ نخرے بگھارنے لگی ۔ یوں انکار کر رھی تھی جیسے پہلی بار کسی کے سامنے عریاں ہو رھی ہو اور جب میں نے کڑک کر پھر کہا " جلدی اُتارو نا ۔" تو اُس نے بڑے اطمینان سے ساری کو اُتارنا شروع کیا ۔ بڑی نفاست سے تہہ کرکے اُسے تپائی پر رکھا اور اُس کے بعد بلاؤز ، انگیا ، پٹی کوٹ بھی ساری پر اُوپر نیچے رکھ دیا گیا ۔ انڈر ویئر پہلے سے غائب تھا ۔ سب کچھ اُتارنے کے بعد وہ خود بخود بستر پر لیٹ گئی ۔ میں قریب پہنچا اور بڑی حقارت سے کہا " مجھے کبھی بھائی نہ کہنا ۔ اُٹھو ، کپڑے پہن لو ـــ سن لیا خواجہ ، یہ ہے تمہارے کرشن کا قصہ ۔"

" اس میں کرشن کی کوئی بھی بات نہیں ۔"

" ہے تو سہی ۔"

" کون سی ؟ "

" اسی بات پر تو کرشن مجھ سے کھچا کھچا رہتا ہے ۔ اُس نے اپنے دل میں گرہ باندھ لی ہے ۔ شاید اُسے یہ گوارا نہیں کہ میں نے اُس کے ذلیل رومان پر تھوک دیا ـــ اور دیکھو آج ایک اور چھنال آئی تھی بھائی کہنے والی ۔"

" شکر ہے وہ کپڑے اُتروانے سے بچ گئی ۔"

وہ ھنس پڑا اور کہنے لگا " چھوڑو یار ، اب ان باتوں میں کیا دھرا ہے ـــ اچھا تو آج پھر ، تم جا رہے ہو ۔ لیکن جاؤ گے کیسے ۔ ھم نے تو ابھی تک کرائے کا بندوبست ھی نہیں کیا ۔ "

' فلم یونٹ ' کے مالک کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ نہ آیا ۔ کہیں چار بجے شام ایک صورت دکھائی دی ۔ اُس سے مانگے تو اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ۔ وہ خود اُدھار لینے آیا

ہؤا تھا ۔ ہم دونوں ' فلم یونٹ ' سے باہر نکلے ۔ یہاں وہاں چکر کاٹتے رہے اور کئی چکر لگانے کے بعد پھر اسی جگہ آن کھڑے ہوئے جہاں سے چلے تھے ۔ منٹو بڑا فکر مند تھا کہ اگر میں آج کراچی روانہ نہ ہوسکا تو بنی بنائی ملازمت ہاتھ سے نکل جائے گی ۔

یکایک اُس نے زور سے نعرہ لگایا " خواجہ — آجا ! "

" کہاں ؟ "

" شیخ سلیم کے ہاں ! "

فوراً ' زو تاج ' پہنچے ۔ پتہ چلا وہ ریلوے اسٹیشن پر ہے ۔ وہاں پہنچے تو اُس کے منشی نے بتایا ، " یہیں کہیں ہیں ۔"

کئی پلیٹ فارموں پر اُسے تلاش کیا لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہ دیا ۔ تھک ہار کر اُس کے گھر پہنچے ۔ منٹو بہت پریشان تھا ۔ میری روانگی میں فقط ڈھائی گھنٹے باقی رہ گئے تھے ۔ میرے ساتھ ساتھ منٹو کی شام بھی خراب ہو رہی تھی ۔ اُسے ابھی میرے کرائے کے علاوہ ' آب حیات ' کا بھی بندوبست کرنا تھا ۔

جب ہم شیخ سلیم کی پرانی کوٹھی کے پھاٹک کے اندر داخل ہوئے تو میں باہر ہی ٹہلنے لگا ۔ منٹو اندر چلا گیا ۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ باہر آیا ۔

اتنے میں شیخ سلیم کی آواز آئی ۔ وہ برآمدے میں کھڑا چلا رہا تھا " خواجہ خدا حافظ ، جہاں جاؤ کامیاب رہو ۔"

پھر اُس نے گلاس ہوا میں لہرایا " خواجہ کی صحت اور کامیابی کا جام ! "

منٹو کہنے لگا " یونہی فراڈ لگا رہا ہے ۔ چلو اب چلیں ۔"

میں نے دور ہی دور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے الوداع کہی ۔

باہر نکل کر منٹو سے پوچھا " کیوں ، کیا ہؤا ؟ "

وہ چپ رہا ۔

" کوئی بندوبست نہیں ہؤا ؟ "

اُس نے سر ہلا دیا ۔

" واقعی ! "

" ہاں ! "

— اور جب میں تانگے پر سوار ہؤا تو میں نے بیٹھتے ہوئے منٹو کی جیب میں دس دس کے دو سرخ نوٹ دیکھ لیے ۔ میں نے یہ سرخی اپنے اندر جذب کرلی اور اُس سے کچھ نہ کہا ۔

شیخ سلیم سے یہ میری آخری ملاقات تھی ۔

مجھے اپنے بائیں بازو کے شدید درد کا احساس تک نہ رہا تھا ۔ آنکھوں کے سامنے سلیم کی تصویر تھی ۔ مڑے تڑے ہاتھ ، ٹیڑھی میڑھی انگلیاں ، زرد چہرہ ، بجھی بجھی آنکھیں ، زبان میں لکنت ، چال میں لغزش ، جسم میں جھول — منٹو نے اسی زندہ تصویر کو مجھ سے ملایا تھا لیکن آج منٹو نے اپنے ہاتھوں میں حسن قریم کو تھام رکھا تھا اُس میں کوئی بھی تصویر نہیں تھی ۔ فقط ایک جملہ باقی رہ گیا تھا " تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ شیخ سلیم کا چند روز ہوئے انتقال ہوگیا ۔"

(زیرطبع کتاب کا ایک باب)

ڈاکٹر فاسٹس ــــ

سید رضی ترمذی

(ایک منظوم تمثیل)

ڈاکٹر فاسٹس ، یا فاؤسٹ قدیم افسانوں اور ڈراموں کا ایک کردار ہے ۔ اس لیے کہ ظلمت و نور ، یا خیر و شر کی کشمکش ، یزدان و اہرمن کی قوتیں ، اور جنگ ــــ اور خوہشات میں جکڑا ہؤا کمزور انسان ، ــــ ان کا شکار ، ہر دور اور ہر ملک میں مختلف ادیبوں اور شاعروں کا محبوب موضوع رہا ہے ۔ اور تقریباً ہر زبان کی روایات میں یہ قصہ کسی نہ کسی شکل میں شامل ملتا ہے ۔ کرسٹوفرمارلو ، گوئٹے ، لیسنگ ، بوایتو ، برلیو وغیرہم کے علاوہ نثر میں اس خیال کی تازہ ترین تشکیل طامس مین کا ناول ' ڈاکٹر فاسٹس ' ہے ۔

شیطان یا اہرمن کی ' شخصیت ' کے اتنے پہلو ہیں ، جتنے مثال کے طور پر یوں کہا جا سکتا ہے ، خود دنیا میں بسنے والے انسان ہیں ۔ اور یہ تمام پہلو ، یہ ساری ' شخصیت ' کسی ایک شخص کے تصور میں پوری کی پوری نہیں سما پاتی اور اسی لیے ہر لکھنے والے کی تحریر میں اس کا ایک الگ روپ اور شکل ، ایک الگ کردار ، ایک الگ نام ہے ۔ لیکن بنیادی بات ، مرکزی خیال وہی رہتا ہے ، خیر و شر کی کشمکش ، یزدان و اہرمن کی جنگ اور ــــ انسان !

یہاں اس سے مراد محض یہ کہنا تھا کہ میں نے اپنی اس نظم میں پلاٹ کی صرف ایک ' چاردیواری ' سی کرسٹوفرمارلو سے مستعار لی ہے ، ورنہ اس کے اندر جو کچھ ہے ، جیسا ہے ، سب میرا ہے ، ــــ یہ فاسٹس ، میفسٹوفلیس اور ہیلن مجھے اپنے خیال میں کچھ اسی طرح نظر آئے ہیں ــــ

کردار :

ڈاکٹر فاسٹس : ایک علم زدہ انسان

آواز خیر
آواز شر : خیر اورشر فاسٹس کی اپنی ہی آوازیں ہیں اگر ایک ہی آواز احساس کے یہ تینوں لہجے اور الگ الگ روپ پیش کرسکے تو وہی ان کرداروں کی اصل صورت ہوگی ۔

کاریلس : فاسٹس کا کم علم دوست جو اسے سحر و ساحری کی طرف مائل کرتا ہے ۔

میفسٹوفلیس : شیطان کا نمائندہ ۔

ہیلن : صرف ایک عورت ، جس کا نام اتفاق سے ہیلن ہے ، اس کا ' ٹرائے ' سے کوئی تعلق نہیں ۔

(۱)

[رات کی خاموشی — کسی کسی وقت درختوں کی شاخوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا کے جھونکے سنائی دیتے ہیں اور اس کے علاوہ کوئی آواز نہیں - صوتی اثرات کے بجائے صرف سازوں کی موسیقی زیادہ موزوں اور معنی سے قریب تر ہوگی مثال کے طور پر سناٹا ، رات اور تنہائی کی کیفیتیں سوھنی راگ میں موجود ہیں - اور یہ بہ خوبی سارنگی اور کلارنٹ سے ادا ہوسکتی ہیں] -

فاسٹس : (اپنے آپ سے)

تمام تر جستجو کا حاصل اگر یہی ہے
خرد کی منزل اگر یہی ہے
یہ ایک صحرائے چیست ،
منطق کی پیچ در پیچ الجھنیں
لفظ —— لفظ ،
بے روح و رنگ الفاظ کے دھندلکے ،
تو میں نے اس مکتب فلاطوں سے کچھ نہ پایا
میں باز آیا ،
کہ میں نے اس راہ کی بہت خاک چھان لی ،
میرے منہ کے نکلے ہوئے ہر اک لفظ کو زمانے نے اپنے ایوان علم میں ایک گوہر آبدار کہہ کر سجا لیا -
میری بات ، ہر بات جیسے اک مشعل فروزاں ہے
علم و حکمت کی درس گاہوں میں
" فاسٹس ؟ فاسٹس سند ہے -"
" جو فاسٹس نے کہا ہے ، جو فاسٹس کہے ، مستند ہے -"
میں فاسٹس ہوں ، میں ہی وہ فاسٹس ہوں
مگر —— مگر میری زندگی آج بھی وہی مشت خاک ہے
مشت خاک ، بے کار ، بے حقیقت !
غبار سا جیسے ایک صحرائے چار سو میں بھٹک رہا ہو ،
مری حقیقت ہے —— اک خس ناتواں کی ہستی
ہوا کا جھونکا اجل کا پیغام بن کے آئے
تو یہ کہیں بھی اماں نہ پائے
یہ زندگی ہے ؟
اس علم و دانش کا انتہائی کمال ، احساس بے بسی ہے
یہ فرصت یک نفس اذیت ہے دیکھنے کی
یہ زندگی ہے ؟
اگر یہیں تک تمام حکمت کی دسترس ہے ، تو اس سے حاصل ؟
—— طلسم وہم و گماں ہے سب کچھ !!
طلسم وہم و گماں ہے سب کچھ — تو اس غلط بیں نگاہ کے اس جہاں سے حاصل؟
—— یہ میری منزل ہے !!
علم کی انتہا
یہ اندھے خلا —— !!
یہ میں اور ہر طرف

ایک سرد ، بے روح اور خالی فضا
آواز شر :— یہاں موج رنگ و بو کا گزر نہیں
وہ سحر نہیں
جس رگ فسردہ میں غنچۂ آرزو چٹکتا ہے
تو یہاں ایک عمر سے کس اندھیرے میں اس طرح بھٹکتا ہے
آواز خیر :— فاسٹس ، آج تو کدھر آ گیا ؟
یہ لمحے کی ایک لغزش تجھے کہاں لے کے آ گئی
اب یہیں سنبھل جا
آواز شر :— نہیں نہیں — اب یہاں سے آگے نکل جا ، —
آواز خیر :— یہیں سنبھل جا ،
یہاں — اسی موڑ پر
آن اندیشے ، مہیب غاروں کے سلسلے میں
کہ میری راہوں سے آ ملے ہیں ۔
یہ آرزو — آرزوئے شر ہے
تجھے خبر ہے ؟
فاسٹس :— ازل سے یہ نیک و بد کی الجھن
مسائل خیر و شر کے چکر
قدم قدم پر کشاکش خوب و زشت کیا ہے ؟
بہشت کیا ہے ؟
اگر میں انسان ہوں تو انسان خطا کا پتلا ہے ۔
جانے کس مرحلے پر اک لغزش قدم بھٹک دے مجھے غار گمرہی میں
تو پھر یہ سب زندگی بہرحال رائیگاں ہے
آواز شر :— تو کیا تری زندگی کا حاصل یہی جہاں ہے ؟
یہی جہان فغان بے چارگی ؟
فاسٹس :— مری زندگی —!!
آواز شر :— یہی بے بسی تری زندگی نہیں
دیکھ اُس طرف
منزلیں نئی ، راستے نئے ،
ہر طرف فروزاں ہیں — جاگتے ، جگمگاتے رنگوں میں
تیری مجروح آرزو کے وہ نقش
جو تہ بہ تہ اندھیروں میں زخم بن کر سلگتے رہتے ہیں
اور کوئی دیکھتا نہیں ہے ۔
فاسٹس :— تو کیا اب آگے —
یہاں سے آگے خلا نہیں ہے ؟
آواز شر :— قدم بڑھا — اک قدم اٹھا
تیری آرزو کا جہاں ، — تری منزل درخشاں
وہ آستاں ہے —
فاسٹس :— وہ آستاں ہے ؟؟ —
آواز خیر :— ٹھہر — ذرا دیکھ فاسٹس ! —
تو کہاں ہے ؟
تو کھو گیا یہاں ؟

فاسٹس :— میں کہاں ہوں ؟؟؟
آوازخیر :— تو ظلمتوں کے دلدل کو جا رہا ہے ،
آواز شر :- - تو اپنی منزل کو جا رہا ہے
قدم اٹھا ۔
اک قدم اٹھا — اور وہ راستے جگمگا اٹھیں گے
کہ منزلیں آ کے تیرے قدموں میں لوٹ جائیں گی
ایسے درباز ہوں گے تیری نگاہ پر ۔
تیرے دل سے اندوہ نارسائی کی گرد ڈھل جائے گی
یہی سحر سامری کا کمال ہے
سحر سامری لازوال ہے ۔
آوازخیر :- دیکھ ، وقت ہے ، اب بھی لوٹ جا ۔
اس سراب کی اک لکیر سے اس طرف
عذاب الیم کی گھاٹیاں ہیں ۔
اندھے سیاہ غاروں کے سلسلے ہیں ۔
بھٹکتی روحوں کے قافلے ہیں ۔ ۔
ادھر نہ جا — دیکھ باز آ
آواز شر :- - اک قدم اٹھا -- فاسٹس ۔
ادھر ہے — ادھر ہے تیرے خیال کا مرغزار رنگیں
آوازخیر :— نہیں -- نہیں
آواز شر : ہاں —
جہاں کی ہر شے ، وہ گمشدہ منزلیں
جو ترے خیال کی سرحدوں سے اس پار ہیں
وہ کھوئے ہوئے ستارے
جنھیں زمانہ ازل سے صبحوں کی راکھ میں ڈھونڈتا ہے ۔
وہ اس طرف نہیں
آستانۂ سامری پہ تجھ کو ملیں گے
وہ آستانۂ سامری ہے —
فاسٹس :— اس خواب میں بھی کیا دلکشی ہے
یہ آرزو بھی کتنی حسین ہے
آوازخیر : - کچھ بھی نہیں ہے
آواز شر : ایک خواب ہے تیری آرزو ابھی تک
تو اس کی تکمیل ، اس کی تعبیر ، کس قدر دلفریب ہوگی ۔
وہ لمحۂ اختیار ،
جب آرزو سے تشکیل آرزو تک
پلک جھپکنے کا فاصلہ ہو
فاسٹس :— وہ ایک لمحہ ملے تو کیا ہو —
وہ ایک لمحہ ملے تو کیا ہو —
وہ ایک لمحہ —

دوسرا منظر

[صبح کا منظر ۔ فاسٹس سے اس کا ایک دوست ملنے آتا ہے]

یہ کون ہے ؟
کارنیلس ؟
کارنیلس آؤ — آؤ بیٹھو
میں رات سے اک عجیب اُلجھن میں ہوں
میں یہ سوچتا ہوں

کارنیلس : — اور میں یہ سوچتا ہوں
کہ فاسٹس ، کہ جس کے علم کی دھوم ہے زمانے میں
جس کے ذہن رسا کے چرچے ہیں
خود بھی اُلجھن میں ہے ؟
تعجب کی بات ہے

فاسٹس :- کارنیلس ،
کاش ، میرے دل میں بھی جھانک کر کوئی دیکھ سکتا ---

کارنیلس :- یہ آج کیا کہہ رہے ہو ؟
کس موڈ میں ہو ؟

فاسٹس :- ہاں ، ٹھیک کہہ رہا ہوں
کہ بے حسی کی یہ زندگی -- میری زندگی
جیسے اک ویران اُجاڑ بستی ہے
جس میں صدیوں سے ایک موسم ہو — ایک ٹھہرا ہوا زمانہ
خزاں کی بے نور ، زرد ، مردہ ہوائیں چلتی ہوں سال بھر -- اس اُجاڑ بستی میں ،
صبح سے شام تک ۔
کسی بھولی بھٹکی آہٹ کا اُس طرف سے گزر نہ ہو ،
کوئی کاسۂ دل لیے اکیلا
کسی ، پرانے کھنڈر کی دہلیز پر کھڑا ، دیکھتا رہے
سونے راستوں کو ،
میں سوچتا ہوں --

کارنیلس :— یہ سوچنا سوچنا کی رٹ اک عذاب ہے
قہر ہے جو ڈھایا ہے تم پہ اس علم نے
تمہارا یہ علم اک روگ ہے جسے تم نے خود ہی پالا ہے
اور اب سوچتے ہو -- سوچا کرو ،

فاسٹس :— یہی سوچتا ہوں
اس علم سے مجھے کیا ملا ؟
مجھے میرے علم نے کیا دیا !
تہی‌دست دل -- یہ بے برگئی نگہ ،
ہر طرف اُفق تا اُفق ، یہی ایک دشت بے‌آب ،
اور آگے خلا —

کارنیلس :— یہی انتہا ہے اس علم کی

فاسٹس :— مگر یہ تو ریت ہی ریت ہے ،
جہاں خار آرزو تک نمو نہ پائے
کوئی تو کانٹا رگوں میں ، یخ بستہ دل میں ٹوٹے —— کوئی جراحت ،
کسی تمنا کا دکھ تو ہو —

اور یہاں کہیں غم کے ایک آنسو کا نم نہیں
کیسا خشک صحرا ہے — یہ جہاں
— دیکھتے رہو — بس اسی طرح دیکھتے رہو

کارنیلس :— کچھ کہو تو سمجھوں
یہ سب تو میرے لئے پہیلی ہے
تم بڑے فلسفی ہو بھائی — مگر
میں حیران ہوں —

فاسٹس :— (بات کاٹتے ہوئے)
یہ حیرت بھی ایک نعمت ہے ،
تم نے مجھے کو مسکراتے ہوئے ، اچانک ٹھٹک کے ، پھر کھلکھلا کے ہنستے ہوئے بھی دیکھا ہے ؟
کیسی ' نعمت ' ہے — سادگی اور دل کی معصومیت !!
مگر مجھ سے ، میرے اس علم نے
یہ ' حیرت ' کی ایک لذت بھی چھین لی
جس سے ایک پل کے لیے ستارے سے جھلملاتے ہیں خوں میں
ساری زندگی جیسے جاگ اٹھتی ہے

کارنیلس :— زندگی ؟ — زندگی میں سب کچھ ہے
یہ کتابوں کا ڈھیر — الماریاں — یہ انبار
اور یہ سامنے کتابوں کی ایک دیوار —
آؤ — اٹھو — یہاں سے نکلو ،
یہ تم نے کیسا حصار سا اک بنا لیا ہے ، جہاں چھپے ہو ،
یہاں سے باہر بھی زندگی ہے ۔
اٹھو — چلو باغ تک ذرا گھوم آئیں —

فاسٹس :— لیکن سنو !
وہ تم کہہ رہے تھے —

کارنیلس :— کیا کہہ رہا تھا ؟

فاسٹس :— تم مجھ سے سامری کے کمال کا ذکر کر رہے تھے
بتا رہے تھے کہ سامری اپنے سحر سے —

کارنیلس :— ہاں

فاسٹس :— تو کیا وہ سب سچ ہے ؟
کیا یہ سچ ہے کہ سامری اپنے سحر سے
جیسے چاہتا ہے ، جہاں کی ہر شے ، ہر ایک قوت سے کام لیتا ہے ،
اس کو ناممکنات پر اختیار حاصل ہے ؟

کارنیلس :— کیا کہا ؟
سحر سامری لازوال ہے ،
میں تو ایک کم علم شخص ہوں ،
اس کی قوتیں مجھ سے کیا بیان ہو سکیں گی ، لیکن
اگر وہ چاہے تو وقت کی گردشوں کو بھی روک لے
وہ چاہے تو ایک لمحے میں ماضی و حال سب سمٹ آئیں ۔
آنے والے تمام ان دیکھے عہد آجائیں ،

وقت اُس کا ہے — زندگی کا نظام اُس کا ہے ،
اور یہ کارخانۂ صبح و شام سب اُس کے اک اشارے پہ چل رہا ہے

فاسٹس :— سنو میرے دوست ۔
یاس کے ایسے بےکراں ریگزار میں ، آج میرا دل چیخ اٹھا ہے —
لیکن یہاں کوئی راستہ نہیں ہے !!
اور تمام راہیں خلا میں دم توڑ کر
مجھے چھوڑ کر یہاں — کھو گئی ہیں
اب میں تنہا ہوں ؟ اب میں کدھر کو جاؤں گا ؟ —

کارنیلس :— (بات کاٹتے ہوئے) فاسٹس عمر بھر کی بے رہروی کے بعد ،
آج بھی اگر میری بات مانو
تو زندگی کا یہ ریگزار
اک بار پھر سیرگاہ شاداب بن کے بچھ جائے ۔
پھر لہو تے وہی بھڑکتے ہوئے جوان آبشار
اور سرخوشی کے وہ همهماتے چشمے — نئے اُفق اور نئے ستارے
جو دل میں مردہ پڑے ہیں ۔
پھر سب کے سب تمہارے ہیں — سب اُسی طرح جی اٹھیں !!

فاسٹس :- (رک رک کر کہتا ہے) کارنیلس — !! کارنیلس میں یہ چاہتا ہوں —
یہ چاہتا ہوں کہ تم — کسی روز سامری کے حضور میں لے چلو مجھے

کارنیلس :— (خوشی سے چیخ اٹھتا ہے) فاسٹس ! — میرے فاسٹس !
یہ کیا کہہ رہے ہو تم ؟ — تم نے کیا کہا ؟

فاسٹس :— کارنیلس ، لے چلو گے ؟
میں اُس کی بارگاہ کرم میں سجدہ کروں گا ۔

کارنیلس :— اٹھو ، — ابھی اٹھو !
اُس کی بارگاہ قبول ہر وقت آنے والے کی منتظر ہے ،

[بہت دور — فضاؤں میں شادیانے بجنے لگتے ہیں اور تھکی تھکی ، اونگھتی ہوئی موسیقی کے بجائے اب فضا ایسے نغموں سے بھری ہوئی محسوس ہوتی ہے جن سے دل میں ہیجان پیدا ہوتا ہے — بلند ہو کر یہ نغمے آہستہ آہستہ پس منظر میں جا کر ختم ہو جاتے ہیں]

نیا منظر

[وہی فضا جو ابتدا میں سارے پہلے منظر میں تھی ، — شادیانوں اور طربیہ نغموں سے پہلے کی ویرانی ، رات اور سناٹا —]

فاسٹس :— (اپنے آپ سے)
یہ نم شب کی فضا ،
یہ تنہائیوں کی کہر ، — اور گھٹی گھٹی تیرگی ، !
— وہ سب ایک خواب تھا ؟
کیا یہ خواب ہے ؟ —
یا میں خواب میں جاگ اٹھا ہوں ؟؟
یہ پھر وہی خلا ہے ؟ — مگر نہیں ،
کارنیلس کہہ رہا تھا — وہ کہہ رہا تھا —
میں سامری سے جا کر کہوں گا ۔

لیکن ہوا میں یہ کس کے سانس اس طرح سرسراتے ہیں ؟
کون ہے — ؟ کون ہے یہاں — ؟؟

[سامری کا نام اُس کی زبان پہ آتا ہے اور یہ لفظ ادا ہوتے ہی فضا میں آندھی اور ہوا ! اور طوفان باد و باراں کا شور — ایک کریہ قہقہہ دور سے گونجتا ہوا قریب آتا ہے —

فاسٹس : (خوف سے کانپتی ہوئی آواز)
کیا ہوا ؟ یہ طوفان کیسا برپا ہے ؟ — کیا ہوا ؟؟ —
کون ہو تم اے خوفناک مخلوق ؟ کون ہو تم ؟

میفسٹوفلیس : میں سامری کا غلام ہوں ،
اُس کا ایک ناچیز بندۂ خاکسار !
اور آپ کی غلامی پہ اب سے مامور ہوں ،
کوئی حکم ہو تو فرمائیے !
میں حاضر ہوں دست بستہ ، بجان و دل !!
اب کا کوئی حکم ؟ — کوئی خواہش ؟

فاسٹس : مگر — مگر — یہ تمہاری آنکھیں ؟
تمہاری آنکھوں سے سرخ شعلے اُبل رہے ہیں
انہیں چھپا لو — یہ اپنے پنجے نہ یوں دکھاؤ ۔
یہ شکل و صورت بدل کے آؤ ۔
(میفسٹوفلیس غایب ہو جاتا ہے)

فاسٹس :— (اطمینان کا لمبا سانس لے کر ، اپنے آپ سے)
خلا میں کیسی حسین فضا ہے !
یہی حقیقت ہے !! اور سب ایک واہمہ ہے !!
(میفسٹوفلیس دوبارہ ظاہر ہوتا ہے)
تم آ گئے !—
ہاں ، تو کیا نام ہے تمہارا ؟

میفسٹوفلیس : مجھے میفسٹوفلیس کہتے ہیں ،

فاسٹس :— کیا ؟ میفسٹوفلیس — !
یہ نام کس قدر پروقار ہے !

میفسٹوفلیس : آپ ہی کی ذرہ نوازیاں ہیں ،

فاسٹس :— مگر سنو ، تم کہاں سے آئے ہو ؟
اور رہتے کہاں ہو ؟

میفسٹوفلیس : سرکار ! ہم جہنم کے رہنے والے ہیں ۔
وہ جہنم جو سلطنت ہے عظیم سرکار ، سامری کی
جہاں وہی حکمراں ہے اور اُس کی بادشاہت ہے ۔ اُس کا سکہ رواں ہے ،
بس وہ ہمارا گھر ہے ،

فاسٹس :— تو تم یہاں کیسے آ گئے ؟

میفسٹوفلیس : سامری کا یہ حکم ہے ،
کہ ہم جس جگہ بھی ہوں
جب بھی کوئی سرکار کا پرستار ، نام لیوا
زبان پر اُس کا نام لائے ، اُسے بلائے
تو ایک پل میں وہاں پہنچ جائیں — جیسے موجود تھے وہیں ہم —

اور اُس سے پوچھیں
کہ اُس کو کس چیز کی طلب ہے
وہ جو کہے ، جو بھی مانگتا ہو ، وہی مہیا کریں
فاسٹس :- یہی سامری کی عظمت ہے
میفسٹوفلیس : اور سرکار سامری کا یہ حکم ہے
کوئی اُس کی دہلیز سے نہ مایوس ہو
کسی مرحلے پر کوئی اُدھر نہ جائے (قہقہہ لگا کر)
خدا کے بندوں کے راستے پر ،
فاسٹس :— خدا کے بندوں کے راستے سے میں لوٹ آیا ۔
وہ راہ جس میں شکست ہر رنگ --- انتہائے نگاہ ہو !
میفسٹوفلیس : اور خود حقیقت کا نقطۂ انتہا بھی اک واقعہ ہو ،
فاسٹس :— انسان اپنے دل سی لطیف شئے کو قدم قدم پر کچل کچل کر چلے ،
میفسٹوفلیس : فنا کے لیے --- (ہنستے ہوئے)
فاسٹس :— مگر حکم ہو نہ ہر زخم کو کرم ہی کہے
میفسٹوفلیس : کہ اُس کا بھرم رہے - (طنزیہ ہنسی)
فاسٹس .--- اور کبھی زبان پہ کوئی شکایت کا لفظ آئے --- تو کشتنی ،
میفسٹوفلیس : یوں بھی زندگی موت --- یوں بھی ---
فاسٹس :--- (بات کاٹتے ہوئے) تم سامری سے کہہ دو ، کہ میں اُسی کا غلام ہوں
میفسٹوفلیس : میں تو ایک ناچیز بندۂ سامری ہوں ---
آپ اس کی ایک تحریر مجھ کو دے دیں ۔
فاسٹس :— مگر میں کہہ جو چکا زبان سے ،
میفسٹوفلیس : حضور - - دستور کچھ یہی ہے ،
فاسٹس :— تو کیا لکھوں ؟
میفسٹوفلیس : بس اک عہد نامہ ،
کہ آپ کب تک عظیم سرکار سامری کے غلام بن کر رہیں گے -
اُس بارگاہ سے فیضیات ہوں گے ۔
(لکھنے کے لیے قلم اُٹھاتا ہے)
حضور --- لیکن ذرا ٹھہریے ---
یہ اپنے لہو سے لکھیے گا ، ---
بس یہی ایک بوند بھر خون چاہیے ۔
فاسٹس :— اور بھی کوئی شرط ہے — تو کہہ لو ،
میفسٹوفلیس : ذرا سی بات اور ہے !
کہ میعاد عہد نامے کی ختم ہو گی ، تو روح پھر آپ کی --- ہماری رہے گی
سرکار سامری کی ،
یہ پھر جہنم کی نذر ہو جائے گی --- بس اتنی سی بات ہے !!
فاسٹس :— کیا کہا جہنم —؟؟
میفسٹوفلیس : نہیں نہیں — آپ ڈر گئے ؟
مجھ کو دیکھ لیجیے ... میں خود جہنم میں ہوں ،
جہنم تو ہر جگہ ہے ! — حضور خود جانتے ہیں —
فاسٹس :— لیکن — وہ کیسی دنیا ہے ؟

میں ذرا سوچنے لگا تھا ؟

میفسٹوفلیس : اُدھر وھی اک بہشت نادیدہ — اُس کے موھوم خواب ،
خوابوں کے چند سائے ھیں ، — اور کیا ہے ،
خدا کے رہنے میں کیا دھرا ہے !!
یہ اُس کی دنیا ھی دیکھ لیجیے جو اس کی تخلیق کا بڑا شاھکار ہے
بھوک — جنگ — افلاس — قحط — ھر طرح کی وبا ،
ھر طرف یہ آھیں ھیں ، اور کراھیں ھیں —
دکھی روحوں کے اس قدر دلخراش نوحے ھیں —
بے اماں قافلوں کی چیخیں ھیں
ھر طرف ، ایک حشر برپا ہے زندگی میں
مگر وہ اُوپر — کسی بلندی پہ اس جہاں سے الگ ۔
یہ سب دیکھتا ہے ، بیٹھا ھوا — !
یہ سب اُس نے دیکھنے کے لیے بنایا ہے
دیکھیے — سوچیے — مجھے کوئی ایسی جلدی نہیں !!

فاسٹس :— نہیں — بس میں دیکھ آیا ھوں ،
میں یہ سب دیکھ کر یہاں آ رھا ھوں
اچھا — اگر مجھے بیس سال مل جائیں
اور اس بیس سال کی زندگی کا ھر لمحہ ، ... ایک اک لمحہ ،
میری خواھش کے رنگ میں ڈھل سکے ... میرے اختیار میں ھو ،
میں جی میں جو کچھ بھی آئے کرتا رھوں ۔ وہ ھوتا رہے ، —
جہاں جاؤں ۔ میرا ھر گام فتح کے باب کھول دے
اور یہ دل ! — مرا دل جو آج تک جیسے ایک زندان جبر میں ہے
یہ ھر طرف قہقہے لگاتا پھرے فضا میں — کھلی فضا میں ،
تو مجھ کو منظور ہے — میفسٹوفلیس ،
اس بیس سال کے بعد ، کچھ بھی ھو ،
کوئی بھی جہنم ھو ، مجھ کو منظور ہے ،

میفسٹوفلیس : یہ منظور ہے !

فاسٹس :— کہو — کیا لکھوں ؟
مرا خون چاھیے ؟ — لو ، یہ میرا بازو ہے ، خون لے لو ،
میں سامری کا غلام ھوں ، — !!

[فتح کے نعرے اور شادیانے ، رقص کی تیز دھنیں ، — اور طربناک موسیقی — ! ساری فضا میں ایک ھنگامہ برپا ھو جاتا ہے ، — ایک طوفان طرب !! ایک جشن ، یہ موسیقی کچھ دیر جاری رھتی ہے — اور پھر اس کے ' اُوپر ' فاسٹس کے قہقہے بلند ھوتے ھیں — جو بہت دور سے سنائی دیتے ھیں — یہ قہقہے قریب اور بلند ھوتے جاتے ھیں اور یہ طربیہ موسیقی پھر آھستہ آھستہ پس منظر میں چلی جاتی ہے ، — لیکن قائم رھتی ہے]

(فاسٹس کی آواز اس جشن طرب میں گونجتی ہے)

فاسٹس :— اُتار دو — زندگی کا بوسیدہ پیرھن — اب اُتار دو !!
اس پہ کتنی صدیوں کی گرد فرسودگی ، تہیں بن کے جم چکی ہے ! یہ پیرھن ہے کہ اک کفن ہے ،
یہ دھجیاں نوچ کر اُڑا دو !

فضا میں نقارے بج رہے ہیں کہ آج دل کے تمام شعلوں ، رکے ہوئے آنسوؤں کو آزادیاں ملیں گی

وہ قہقہے گونجتے ہیں ، اس جشن زندگی میں ،
یہ قہقہے گونجتے رہیں گے — !!
وہ رقص ہو — ایک رقص وحشت
کہ زندگی کی تمام ٹھٹھری ہوئی رگیں خون گرم کے آبشار بن جائیں
جسکے پتے جوان نغموں کی دھن پہ ناچیں ۔
تمام بزم جہاں مری آرزو کا عکس حسیں بنا دو ۔
(موسیقی بلند ہو کر پھر پس منظر میں چلی جاتی ہے)

فاسٹس :- (اپنے آپ سے)
اسی فضا کی ظلمت میں احساس زخم خوردہ کئی زمانوں سے چیختا تھا
وہ گمشدہ راستے ۔ بھڑکتی لوؤں کے مانند ظلمتوں کی تہوں سے جھانکے
اسی چراغاں کی جستجو میں مری تمنا پگھل پگھل کر ٹپک رہی تھی ،
— سنو ۔ میفسٹوفلیس (لہجے میں تحکم اور غرور)

م :- سرکار

ف :- تم کدھر ہو ؟

م :- غلام ہر وقت آپ کے ساتھ ساتھ رہتا ہے
آپ فرمائیے ؟ — کوئی حکم ۔ کوئی خواہش ؟ !

ف :- سنو میفسٹوفلیس !
اب یہ بساط عشرت ہٹاؤ —
ان لذتوں سے جی بھر گیا

م :- تو کیا چاہتے ہیں ؟

ف :- میں چاہتا ہوں ۔ اب کوئی اور منظر
یہ جسم کی زندگی بہت خوب ہے — مگر
کوئی اور منظر —

م :- تو شیطنت کے نگارخانے کی سیر فرمائیے
جہاں ایک ایک نقش مہیب اک کارنامۂ سامری ہے
اک ایک نقش شہکار ہے ہمارا
کہ جس سے روح حیات لرزاں ہے آج تک
آئیے ، میرے ساتھ آئیے ! آپ کو دکھاؤں

فاسٹس :- چلو میفسٹوفلیس ، ہم وہ نگارخانہ ضرور دیکھیں گے ۔
ان مناظر سے ہم کو لذت ملے گی ۔

موسیقی

[میفسٹوفلیس ، آپ ایک ایسا نگارخانہ دکھاتا ہے جہاں وہ تمام ہوس جو ابلیس کی قوتوں کی دلیل ہیں محفوظ کر لیے گئے ہیں تاکہ ہر تازہ وارد جو شیطانی گروہ میں آئے وہ شیطان کے ان کارناموں کو دیکھ کر غرور اور فخر سے گردن اٹھا سکے]

م :- یہ دیکھیے اس طرف

ف :- یہ کیا ہے ؟

م :- یہ ایک شہکار خونچکاں ہے ۔
عظیم سرکار سامری کا وہ کارنامہ ......

ف :— یہ خون ؟
م :— ہاں خون !
اولیں خون ۔ اولیں قتل ۔ اولیں کارنامۂ سامری یہی خون کے وہ قطرے ہیں جو زمیں پر گرتے ہی پہلے پہل ، یہی خون ہے جو بھائی نے اپنے بھائی کو قتل کر کے بہا دیا
جب اپنے آقا نے اولیں قہقہہ لگایا — !
(تیز موسیقی ۔ جیسے تاریخ کے ورق ماضی کی طرف الٹے جا رہے ہیں)
یہ دیکھیے ایک اور شہکار ۔
ب :— آگ ؟
م :— ہاں آگ کا سمندر
وہ روپ سامری کا سیلاب
جس نے نمرود کی خدائی کا روپ دھارا
یہی وہ شعلے ہیں جن کی چنگاریاں ابھی تک کہیں کہیں آنکھ کھولتی ہیں
کہیں کہیں آنکھ کھولتی ہیں تو ایک عاجز ذرۂ خاک ، ایک نادان شخص کا
دل پکار اٹھتا ہے ۔ میں ہی میں ہوں ! (قہقہہ لگا کر)
فاسٹس :— ابلیس کی یہ ایک چھوٹی سی لہر دنیائے شیطنت کا عجیب دلچسپ راز ہے
(وقفۂ موسیقی)
میفسٹوفلیس : اور یہ دیکھیے روم کا تماشا ۔ یہ روم کی سرزمین بھی دیکھنے کا منظر ہے !!!
— دیکھیے اہل روم دیوانہ وار ، بے اختیار ، اپنے عظیم و محبوب ، فاتح سروفار
سیزر کی تاجپوشی کے جشن میں جا رہے ہیں :
ہم نے ؛— عظیم سرکار کے غلاموں نے ، جشن کی اس فضا پر لہرا دیا وہ پرچم ۔
وہ خون میں دھویا ہؤا پھریرا ۔ کہ آن کی آن میں وہ میدان حشر، جو خون سے بھر گیا !
(ہنس کر) وہ بھی کیا تماشا تھا ،
رات بھر ہم نے ان کی وحشت کو یاد کر کر کے اس قدر قہقہے لگائے کہ ہنستے ہنستے بہت سے احباب ، جیسے بے حال ہو گئے تھے !!
فاسٹس :— عجیب ہے !!
میفسٹوفلیس : یہ بھی دیکھیے ۔
دیکھنے کو مٹی کا ایک پیالہ
فاسٹس :— یہ جام ؟
میفسٹوفلیس : ہاں زہر کا یہی جام تھا ۔
جو ہم کیسے کیسے دانشوروں کو دیتے تھے ۔
فاسٹس :— ہاں سنا ہے ۔
میفسٹوفلیس : جنھیں بہت اپنے علم پر ناز تھا ۔ انہی میں —
فاسٹس :— تو کیا یہ سقراط ہے ؟ —
میفسٹوفلیس ! دیکھو یہ زہر پیتا ہے اور چہرے پہ مسکراہٹ سی پھیلی ہے
اسے نہ چھینا گیا کسی سے ،
میفسٹوفلیس : حضور یہ دیکھیے ۔ وہ باتیں بہت پرانی ہیں ۔ چھوڑیے ۔ دیکھیے یہ کیا ہے ؟
فاسٹس :— مگر — میفسٹوفلیس ! سقراط کے خط و خال پر تبسم سا کھیلتا ہے
(جیسے کھو سا جاتا ہے)
میفسٹوفلیس : حضور — آقا ! ادھر تو آئیں ۔
یہ دیکھیے اک عجیب منظر ہے — آپ کیوں کھو گئے وہاں — آئیے ادھر آئیے

فاسٹس :— میفسٹوفلس، دیکھو ۔ یہ اُس کی آنکھیں عجیب سی روشنی سے کیسے چمک رہی ہیں
نہ جانے کن اجنبی فضاؤں میں دیکھتا ہے !!
یہ اس کے ہونٹوں پہ...اس کے ہونٹوں پہ نور کا نرم سا اُجالا —یہ مسکراہٹ -
(چیخ اُٹھتا ہے)
میفسٹوفلس ۔ وہ اجنبی فضائیں کہاں ہیں ؟
وہ راستے کدھر ہیں ؟
جہاں سے یہ نور کی کرن آکے اس کے ہونٹوں پہ کھِلی ہے

میفسٹوفلس : حضور ، آقا ۔ یہ آپ کو کیا ہوا — میرے ساتھ آئیے
تھامیے میرا ہاتھ — اس طرف آئیے !

فاسٹس :— میفسٹوفلیس ۔ سنتے ہو ۔
میں کہاں ہوں ؟؟
مجھے بتاؤ ۔ وہ اجنبی راستے کدھر ہیں ؟؟
یہ میں کدھر آ گیا ہوں — بولو !
مجھے کہاں لے کے آ گئے ہو ؟؟

میفسٹوفلس : حضور — آقا — وہ عہد نامہ ؟ — (کریہہ قہقہہ لگا کر)
وہ عہد نامہ نہ بھولیے ، وہ یاد رکھیے — (لہجے میں عجیب تمکنت پیدا کر کے)

فاسٹس :— مگر — میفسٹوفلس !
دیکھو ، میرے قدم ڈگمگا رہے ہیں ۔ میں کانپتا ہوں
مجھے ذرا تھام لو ، — میرا جسم خوف سے کیوں لرز رہا ہے —
یہاں سے باہر چلو —
کہیں اور لے چلو ۔

میفسٹوفلیس : خوف ، — خوف کیسا ؟
میں آپ کے ساتھ ہوں ،
یہی خوف دور کرنے تو ہم یہاں اس نگارخانے میں آئے تھے
سرخوشی کی ، عیش و طرب کی ہر شاہراہ میں ۔ خوف ہی تو بھاری چٹان ہے
اک یہ زنگ آلود قفل باقی ہے آپ کے دل پر ،
یہ توڑیے ۔ اس کو توڑ کر دیکھیے
خدا کے بنے ہوئے اس جہان سے آگے ،
یہ آس کی دنیا ، جہاں شکستوں سے چور دل ، آس کی عظمتوں کے کھنڈر ہیں
اپنے خدا کی عظمت کے راز داں ہیں ،
جہاں آہ و فغاں سے آگے — یہاں سے آگے ابھی دیکھیے
کیسی کیسی دنیائیں ہیں —
میرے ساتھ آئیے ... آئیے چلیں —

نیا منظر

[موسیقی سے جو حسین ترین فضا تیار ہو سکتی ہے — نرم ، سبک اور پرسوز نغموں کی فضا ، جن سے روح کو ٹھنڈک اور دل کو آسودگی ملتی ہے — اس فضا میں ، نگاہ گوش ، کو یوں محسوس ہو ، جیسے چاندنی کھلی ہے — ایک آبجو ہے اور اس کے کنارے ہیلن بیٹھی گیت گا رہی ہے ۔ فاسٹس مدہوش ہے اور پاس بیٹھا سن رہا ہے]

ہیلن :— (گاتی ہے)

یہاں گھاس پر ، آبجو کے کنارے
محبت کی یہ رات پھول اور ستارے
یہ نغموں کی ٹھنڈی مہک چاندنی میں
یہ فرصت کے شاداب ، سرسبز لمحے
یہ لمحے ہمیشہ ہمارے نہیں ہیں
یہ لمحے ہمیشہ کسی کے نہیں ہیں
ہر اک پھول کا دل دھڑکنے لگا ہے
سنو ، رات چلنے لگی ، کیا غضب ہے
مرے ساتھ سورج سے باتیں کرو تم
تمنا کا یہ روپ بھی دیکھ لو تم
یہ لمحے ہمیشہ ہمارے نہیں ہیں
یہ لمحے ہمیشہ کسی کے نہیں ہیں

[گیت ختم کر کے ہیلن ، ستار رکھ دیتی ہے ، اور پوچھتی ہے]

ہیلن : کوئی اور نغمہ سناؤں ؟

فاسٹس :- یہی گیت ہیلن — یہی گیت —
یہ حسن کے جوئباروں کے جھونکے نہ روکو
یہ ہاتھوں کی جنبش ، حسین انگلیوں کے اشارے نہ روکو
ستاروں سے رستی ہوئی نرم شبنم سے بھیگے ہوئے لب ، ہلاتی رہو
گیت گاتی رہو —
گیت گاتی رہو — میری ہیلن ! !

ہیلن :— یہاں چاندنی رات میں
ایسی جادو بھری رات میں
کس قدر کیف ہے
نغمۂ ماہتاب جواں برگ گل میں لہو بن گیا
اور ساری فضا ، جیسے دو شیرہ کلیوں کے مہکے ہوئے روپ میں ڈھل گئی ہے

فاسٹس :- یہی زندگی جاوداں ہے

ہیلن :— ادھر دیکھیے !
جیسے ہوا کی مچلی ہوئی آرزو کی طرح نغمہ خواں ہے
لجاتی ہوئی آبجوئے گریزاں
کہ سمٹی ہوئی پیچ کھاتی ہوئی ، مخملیں ساحلوں میں رواں ہے
یہاں گھاس کی پتیوں سے ، درختوں کی شاخوں سے ، پھولوں کے ہونٹوں سے ، لپٹے ہوئے ہیں
کئی دیوتاؤں کے بہکے ہوئے سانس !
مدہوش البیلیوں کی رگ آرزو کے فسانے
— یہ لیجیے ! — مرے جام میں کیف کا اک سمندر نہاں ہے

فاسٹس :— اسی جام میں سب زمان و مکاں ہے — پلاؤ ۔
یہی جام سب کچھ ہے — لاؤ ۔
مگر میری ہیلن ! یہ نغمے سناتی رہو ... گیت گاتی رہو !
سامری نے تمہاری یہ آنکھیں ... سہانے جزیروں کی شاداب جھیلوں سی آنکھیں ،
مجھے بخش دی ہیں تو یہ زندگی جاوداں ہے
یہیں سب زمان و مکاں ہے

فاسٹس :— سنو میری ہیلن ... تم اب تک کہاں تھیں ؟
مجھے یاد ہے ، میں نے پہلے بھی دیکھا ہے تم کو ، کسی خواب کی سرزمین میں
ہیلن :— میں دنیا کی تخلیق کے دن سے اب تک
یہاں پیار کی آبجو کے کنارے ،
یہی گنگنا رہی ہوں —
اور صبح سے شام تک دیکھتی ہوں
مہ و سال ، — صدیاں — زمانے ، گذرتے چلے جا رہے ہیں ۔
اُدھر — ان پہاڑوں کے پیچھے ، خزاں سے کئی بستیاں جل چکی ہیں
یہ رات ، اور یہ پھول ، اور یہ ستارے بھی جل جائیں گے
وقت ان سب کو کھا جائے گا ۔
صبح کی راکھ میں ، آج کی رات کا ایک ستارہ نہ ہوگا
فاسٹس :— مگر — میری ہیلن
یہ کیا کہہ رہی ہو ؟
میں اب تک نہ جانے کہاں
کیسی ویران راہوں میں تنہا بھٹکتا رہا ہوں ، — تمہیں کیا خبر
میں نے کیا دے کے پایا ہے تم کو
یہ صدیوں کی تخلیق — یہ رات — تم — اور تمہارے یہ نغمے
بس ان کے سوا اور اب کچھ نہیں چاہیے — کچھ نہیں چاہیے ۔
تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤگی ؟ —
میری ہیلن — بتاؤ
—(ھڑبڑا کر ، چونک کر—اور یہاں وہ تمام منظر اچانک بالکل بکھر جاتا ہے ،
تمام نغمے ایک ایک کر کے مر جاتے ہیں)
— مگر — دیکھتی ہو ، — وہ دیکھو
اُدھر — وہ اُفق آگ سے بھر گیا ہے
وہ شعلے ... وہ آگ — اور دھواں
سب ادھر آ رہا ہے —
یہ سب کیا ہوا ؟ —

[اُس فضا میں یک لخت ہلچل پیدا ہوجاتی ہے ۔ ایسی موسیقی جس میں خوابوں کے سب تانے بانے بکھر جاتے ہیں ۔ اس کرب کی فضا میں میفسٹوفلیس دور سے قہقہہ لگاتا ہوا آتا ہے !]

میفسٹوفلیس : (گھمبیر اور ٹھہری ہوئی آواز)
وہ عہد نامے کا وقت اب ختم ہو چکا ، فاسٹس ،
اُٹھو — وقت ہو چکا ۔
فاسٹس :— وقت ہو چکا — ؟؟
میفسٹوفلیس : آؤ اب جہنم کا منہ کھلا ہے
چلو — اُٹھو —
وقت ہو چکا —
فاسٹس :— کیسا خواب تھا ؟
کیسا خواب ہے —
وقت بھی حقیقت کا ایک سیلاب ہے !! (فیڈ آؤٹ)

ہماری مطبوعات

تنقید و تاریخ ادب

لکھنؤ کا دبستان شاعری	ڈاکٹر ابواللیث	۱۲/۸
غزل اور متغزلین	,,	۴/۸
جرأت اس کا عہد اور عشقیہ شاعری	,,	۲/-
مذہب و شاعری	ڈاکٹر اعجاز حسین	۵/۸
مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر اعجاز حسین	۷/-
دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	۱۰/-
تنقیدیں اور خاکے	خلیل قدوائی	۳/-
آغا حشر اور ان کے ڈرامے	وقار عظیم	۴/۸
ہمارے افسانے	,,	۲/۸
اندر سبھا	,,	۲/۸
فکر اقبال	غلام دستگیر	۴/-
ذکر حالی	صادق قریشی	۱/۴
مقدمہ شعر و شاعری	مولانا حالی	۱/۱۲
تاریخ قصائد اردو	جلال الدین جعفری	۳/-
تاریخ ممتاز	ڈاکٹر ناصر	۳/۸
مکاتیب حالی	شیخ اسماعیل پانی پتی	۲/۸

انتخاب و نظم

انتخاب مضامین	سید ابوالخیر کشفی	۱/۱۲
تہذیب الاخلاق		
انتخاب مقالات حالی	,,	۲/۸
,, مومن	وقار عظیم	۲/-
انتخاب اصغر	جمیل نقوی	۲/-
دیوان خواجہ میر درد	مرتبہ آسی مرحوم	۸/-
دیوان غالب مجلد	,,	۱/-
دیوان حالی	,,	۱/۱۰
ابجے	خلیل الرحمن	۱/۸
مسدس حالی	صدی ایڈیشن	۳/-
مثنوی سحر البیان مع فرہنگ میر حسن		۱/۱۲
,, گلزار نسیم	دیا شنکر نسیم	۱/۴
چشم غزال	فضل احمد کریم فضلی	۶/-

ڈرامے

رستم و سہراب	آغا حشر کاشمیری	۸/-
ترکی حور	,,	۱/۸
یہودی کی لڑکی	,,	۱/۸
سفید خون	,,	۱/۸
خوبصورت بلا	,,	۱/۸
پہلا پیار	,,	۱/۸
اسیر حرص	,,	۱/۸
صید ہوس	,,	۱/۸
خواب ہستی	,,	۱/۸
انجام	پروفیسر مجیب	۱/۴
مرزا جنگی	عظیم بیگ چغتائی	۹/-

تین نئی کتابیں

لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۔

’ رہائی ‘ لیوشاتانگ کی مشہور کتاب ’ آؤٹ آف ریڈچائنا ‘ کا اردو ترجمہ از بشیر حسین ضیائی ۔

’ فن تدریس ‘ گلبرٹ ہائٹ کی لافانی کتاب ’ دی آرٹ آف ٹیچنگ ‘ کا ترجمہ از مشرف انصاری ۔

اردو مرکز

گنپت روڈ لاہور

حسن اور فنکاری

مجنوں گورکھپوری

فنکاری ایک 'فکریاتی حرکت' (Idealogical Activity) ہے جو انسان کے اجتماعی جذبات اور خیالات کی نمائندگی کرتی ہے۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ اس اعتبار سے فنکاری اور انسان کے اجتماعی شعور کے دوسرے مظاہر کے درمیان کیا فرق ہے؟ فنکاری حقیقت کو ایک مخصوص تخیلی پیکر دے کر پھر سے پیدا کرتی ہے لیکن یہ پیدائش جدید میکانیکی یا اضطراری نہیں ہوتی جیسا کہ بعض نادان مادہ پرست یا چند بھولے بھالے سطحی واقعیت کے شیدائی سمجھے ہوئے ہیں۔ فنکاری ایک پیچیدہ جدلیاتی تخلیقی عمل کے ذریعہ واقعہ یا خارجی حقیقت کو نیا جنم دیتی ہے۔ وہ حال کو از سر نو اس طرح تشکیل دیتی ہے کہ اس میں ایک زیادہ خوش آئند اور مبارک مستقبل کی جھلک ہم کو مل جائے اور ہم زندگی کو سر تا سر عذاب سمجھ کر شکست خوردگی، پسپائی اور فراریت کی طرف نہ مائل ہوں بلکہ ہمارے اندر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہماری موجودہ زندگی میں جو خرابیاں اور الجھنیں ہیں وہ ہماری ہی یعنی ہماری ہیئت اجتماعی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور ہم ہیئت اجتماعی اور اس کے تمام اداروں کو بدل کر ان خرابیوں کو دور کر سکتے ہیں اور ایک ایسا مستقبل تعمیر کر سکتے ہیں جو ماضی اور حال دونوں سے زیادہ خوش گوار اور با فراغت اور دونوں سے زیادہ جمیل ہو۔

فنکار ایک فرد ہوتا ہے اور فنکاری یقیناً ایک واحد اور منفرد شخصیت کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس شخصیت کی تمام انفرادی خصوصیات فنکاری کی ترکیب میں داخل ہوتی ہیں۔ فنکار لاکھ اپنے زمانے اور ماحول کی مخلوق سہی جب ایک مرتبہ اس کا ایک کردار بن گیا اور اس نے ایک مستقل اکائی کی صورت اختیار کر لی تو اس کی تمام شخصی خصوصیات اس کے جملہ جسمانی اور ذہنی حرکات و سکنات میں بر روئے کار آئیں گی۔ ہاں اگر فنکار صالح کردار کا مالک ہے اور کھری شخصیت رکھتا ہے تو اس کے اختراعات اور زمانے کے میلانات اور مطالبات کے درمیان کوئی تصادم یا نفاق نہ ہوگا۔ اور اگر وہ کوئی مسخ شدہ کردار یا بگڑی ہوئی شخصیت ہے تو وہ جو کچھ پیدا کرے گا وہ حیات کلی یعنی ہیئت اجتماعی کے کام نہیں آسکتا بلکہ عام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے مضر ثابت ہو گا۔ لیکن یہ بھی مسلم ہے کہ شخصیتوں کو بگاڑنے کی ذمہ داری عام طور سے غلط معاشرتی نظام پر عائد ہوتی ہے۔ غلط معاشرتی نظام سے مراد وہ نظام ہے جو اپنے مقدر اور اپنی غایت کی تکمیل کر چکا ہو اور اپنی معیاد سے آگے اپنے کو قائم رکھنے کی زبردستی کوشش کر رہا ہو۔ اب اگر کوئی شخصیت ایسی پیدا ہو گئی جو اپنے دور کی تمام رجعتی اور تخریبی قوتوں پر قابو پا گئی اور ان سے بلند و بالا ہو کر زمانہ پر اپنا نقش جما سکی تو وہ اپنے کو بھی مضر اثرات سے بچا لیتی ہے اور ہیئت اجتماعی کے لیے بھی ترقی کی تحریک کا سبب بنتی ہے۔ ایسی ہی شخصیتیں اپنے اپنے دور کے لیے پیغمبر ہوئی ہیں، ایسی ہی شخصیتوں نے دنیا کی رہنمائی کی ہے اور ایسی شخصیتیں تواریخ میں ناقابل فراموش یادگاریں چھوڑ گئی ہیں جو آنے والے دور کے لیے فکر و عمل کے میدان میں شمع راہ بنی ہیں۔

لیکن انسان محض ایک مجرد اور بے تعلق فرد نہیں ہے۔ وہ جماعت کا ایک رکن بھی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ ہر فرد کے اندر جماعت موجود اور کارفرما ہوتی ہے۔ ہر انسان ایک خاص ہیئت اجتماعی اور ایک خاص دور تمدن کی مخلوق ہوتا ہے اور دونوں کے اثرات و میلانات اس کے جسم اور ذہن کی تشکیل اور اس کے کردار کی ترکیب میں داخل ہوتے ہیں۔ فرد جماعت میں ہے اور جماعت فرد میں۔ اقبال نے شاید اسی نکتہ کو سمجھ کر کہا تھا :

فرد تا اندر جماعت گم شود   قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

فرد جماعت میں فنا نہیں ہوتا بلکہ باقی رہتا ہے ورنہ وہ جماعت کی نئی تربیت و تحسین میں کوئی حصہ نہیں لے سکتا ۔ قطرہ قلزم ہونے کے بعد بھی اپنی قطرہ والی شخصیت کو برقرار رکھتا ہے۔ موج دریا سے باہر بے اصل و بے حقیقت ہو جاتی ہے لیکن دریا میں رہتے ہوئے بھی ہر موج اپنی فردیت کو قائم رکھتی ہے جس سے دریا کی عظمت اور اس کے شکوہ میں اضافہ ہوتا ہے ۔

یہ سب کچھ ہے مگر سو حقیقتوں کی ایک حقیقت یہ ہے کہ انسان جماعت پسند اور جماعت آفرین جانور ہے ۔ جب سے اس نے آدمیت کا رنگ و روپ پایا وہ اجتماعی رہا اور اپنے اجتماعی نظام کو روز بروز زیادہ وسیع ، زیادہ مستحکم اور زیادہ مہذب بناتا رہا ۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اس میں شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک اجتماعی میلان یا غایت نمایاں یا پوشیدہ ضرور ہوتی ہے ۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کی ہر حرکت ساقط الاعتبار ہے ۔ انسان اور دوسرے جانوروں میں یہی فرق ہے ۔ فنکاری میں بھی ہمیں یہ فرق ملے گا ۔ انسان کے درجہ سے نیچے بھی بعض جانور ہیں جو جبلی یعنی اضطراری طور پر فنکار ہیں لیکن ان کی فنکاری صرف ذاتی ضرورت اور مفاد پر مبنی ہے ۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اپنی فوری ضرورت سے مجبور ہو کر اور اپنی نسل کی بقا اور فلاح کے لیے کرتے ہیں ۔ بر خلاف اس کے انسان کی فنکاریاں اس کی ذاتی مسرت اور راحت کا بھی سبب ہوتی ہیں اور پوری جماعت بلکہ اکثر تمام بنی نوع انسان کی ترقی و تہذیب میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہیں ۔

مارکس اور اس کے ہم خیالوں کا یہ تصور بہت صحیح ہے کہ ایک خارجی دنیا کی عملی تشکیل و تخلیق ایک غیر نامیاتی بے جان عالم عناصر کو حسب مراد صورت دینا اور اس میں نئی زندگی پیدا کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان نوع حیوانی کا ایک ذی ارادہ ارتقائی رکن ہے ۔ وہ حیوانات میں ایک ایسی مخلوق ہے جس کی تخئیل یہ ہے کہ تمام بنی نوع انسان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جائے جیسا کہ خود اپنی ذات کے ساتھ ، اور اپنی ضرورتوں کی طرح اپنے تمام ہم جنسوں کی ضرورتوں کا رفیقانہ احساس رکھا جائے ۔ یہ شرف کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں ۔ اور اگر انسان کو اشرف المخلوقات کہا جا سکتا ہے تو اسی بنا پر ۔ دنیا میں اور بہت سے جانور ہیں مثلاً شہد کی مکھیاں ، مٹے ، دیمک اور بھڑ اور چڑیوں میں بیا وغیرہ جو کافی تخلیقی یا تعمیری قابلیت اپنے اندر رکھتے ہیں اور ضرورت کے وقت بیساختہ اس سے کام لیتے ہیں ۔ وہ چھتے ، دیموٹ اور گھونسلے ایسی فنکارانہ خوش اسلوبی کے ساتھ بناتے ہیں کہ انسان ان کی نقل بھی نہیں اتار سکتا ۔ لیکن یہ ادنیٰ درجہ کے جانور جو کچھ کرتے ہیں اپنی ذاتی یا زیادہ سے زیادہ اپنی اولاد کی فوری ضرورتوں کو رفع کرنے کے لیے کرتے ہیں ۔ ان کی کوششیں یک طرفہ ہوتی ہیں ۔ انسان کے مساعی اجتماعی قدر لیے ہوئے ہوتے ہیں ۔ حیوانات جو کچھ کرتے ہیں اپنی قدرتی جسمانی ضرورتوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کرتے ہیں اور انسان یعنی مہذب انسان اپنی جسمانی ضرورتوں سے آزاد ہو کر تخلیقی فن کی طرف متوجہ ہوتا ہے ۔ وہ اپنی بہترین تخلیق اس وقت پیش کر سکتا ہے جب کہ اس کی ادنیٰ حیوانی ضرورتیں آسودہ ہو چکی ہوں اور وہ ان کے تردد سے فراغت پا چکا ہو ۔ غیر انسانی مخلوقات اپنی اپنی ذاتوں میں کھوئی ہوئی ہیں ، وہ زیادہ سے زیادہ اپنے کو پھر سے پیدا کر سکتی ہیں اور انسان سائر کائنات کو پھر سے پیدا کر سکتا ہے ۔ دوسرے جانوروں کی تخلیقی کوششیں ان کی جسمانی خواہشوں اور ضرورتوں سے براہ راست متعلق ہوتی ہیں یعنی وہ اپنے فطری مطالبات کے غلام ہوتے ہیں ۔ بر خلاف اس کے انسان اپنی تخلیقات کا پورے احساس و فکر اور مکمل آزادی کے ساتھ سامنا کر سکتا ہے اور ان پر نگاہ بازگشت ڈال سکتا ہے جو خود اپنی جگہ ایک

نئی تخلیقی حرکت ہے ۔ جانور صرف اپنی نوع کی ضرورت کو اپنی تخلیقات کا پیمانہ بناتے ہیں ۔ انسان ہر نوع کی ضرورت کے مطابق اور ہر وقت ہر موقع پر موضوع کے اعتبار سے نئے پیمانے مہیا یا ایجاد کر سکتا ہے ۔ دوسرے حیوانات کی فنی تخلیق میں جو حسن ملتا ہے وہ اضطراری طور پر اس کی ترکیب میں داخل ہوتا ہے ، انسان کو اس حسن کا نہ صرف شعور بلکہ ادراک بھی ہوتا ہے اور وہ اپنے ارادے اور اپنی قوت سے اس حسن کو اور زیادہ حسین و جمیل بنا سکتا ہے ۔ انسان کی فنکاری نہ صرف ایک مفروضہ حسن کا اظہار ہوتی ہے بلکہ حسن کے اندرونی ناموس کے مطابق خوب سے خوب تر کی جستجو اور اسے پانے کا نام انسانی لغت میں فنکاری ہے ۔

حسن کے وجود اور اس کی اثر آفرینی سے آج تک کوئی انکار نہیں کر سکا ہے ۔ لیکن یہ حسن ہے کیا؟ اس سوال نے بڑے بڑے اہل فکر و بصیرت کو حیران رکھا ہے ۔ مشہور آفاق سائنس دان اور نظریۂ ارتقا کا مبلغ ڈارون ، مور کی دم کا راز نہ سمجھ سکا ۔ مور کی دم پر اس قرینہ کے ساتھ گلکاریاں کیوں ہوئی ہیں؟ اس سوال نے ڈارون کی عقل کو چکر میں ڈال رکھا تھا ۔ وہ زندگی کے ہر مظہر کو جہدللبقا ، قدرتی انتخاب اور بقائے اصلح کی روشنی میں سمجھنا چاہتا تھا ۔ لیکن محض حیاتیاتی مقصد کے ماتحت حسن یعنی قرینہ یا آہنگ کی تاویل نہیں کی جا سکتی ۔ مور کی دم میں اس توازن اور تناسب کے ساتھ خطوط و الوان کا التزام نہ ہوتا تو بھی حیاتیاتی غرض یعنی نسل کی افزائش اور اس کی بقا کا مقصد تو پورا ہوتا ہی رہتا ۔ قدرت نے اپنے تخلیقی نظام میں یہ جمالیاتی اسلوب کیوں ملحوظ رکھا ؟ اس کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے تاوقتیکہ ہم یہ نہ تسلیم کر لیں کہ قدرت کے اندر وہ آہنگ طبیعی طور پر موجود ہے جسے ہم حسن کہتے ہیں ۔ نہ صرف انسانی دنیا بلکہ حیوانی اور نباتاتی اور بہ ظاہر بے جان جماداتی دنیا بھی ایک جمالیاتی رخ رکھتی ہے ۔ جہاں کہیں بھی زندگی کی قوت ہے وہاں یہ حسن بھی موجود ہے اور زندگی کی بقا اور فروغ کا ضامن ہے ۔

متقدمین سے لے کر آج تک لوگ حسن کو بلا وجہ ایک غیر ارضی چیز سمجھتے رہے ہیں اور جو چیز کہ سر بسر انسانی دنیا کی پیداوار ہے اس کو خواہ مخواہ ایک دیولوک سے منسوب کرتے رہے ہیں ۔ اس ماورائیت نے حسن کو ایک سدیمی Nebulous شکل بنا کر رکھ دیا ہے ۔ افلاطون نے حقیقت ، خیر اور حسن کی سہ گانہ تقسیم کر کے ایک عرصہ تک دنیا کو مبہوت رکھا لیکن وہ خود بڑی الجھن میں تھا ۔ اگر ہم غور سے مطالعہ کریں تو اس کے بیان سے زیادہ اس کے بعض وقت کے سکوت سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے نظریۂ تصورات کی وجہ سے اپنے نظام فکر میں بہت ہی تناقضات محسوس کرتا ہے ۔ حسن کے بارے میں بھی اس کو اپنی عدم وضاحت کا احساس تھا ۔ اس نے عالم مثال یا عالم تصورات میں پناہ لے رکھی تھی : اس عالم اجسام سے باہر ایک عالم ہے جہاں ہر شے کا ایک ازلی تصور یا نمونہ موجود ہے ۔ عالم موجودات کی ہر شے اپنے تصور کی ایک ناقص نقل ہوتی ہے ۔ پھر ان تصورات سے بلند اور سب پر احاطہ کیے ہوئے ' تصورات کا تصور ' یا ' تصور اعلیٰ ' ہے ۔ حسن ، خیر اور حقیقت اس ' تصور اعلیٰ ' کے تین مختلف رخ ہیں جو عالم اجسام میں الگ الگ پائے جاتے ہیں ۔ افلاطون کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرشد سقراط کی طرح حسن کو حقیقت اور خیر کے ماتحت تصور کرتا تھا ۔ اس جگہ ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے ۔ ہم سقراط اور افلاطون اور ان کے متبعین کے نظریۂ تصورات سے آج ہرگز اتفاق نہیں کر سکتے ۔ لیکن ان لوگوں کے بعض متفرق اقوال ایسے ہیں جو حقیقت کے راستہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور جنھیں آج بھی ہم تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتے ، مثلاً حسن کے بارے میں سقراط کے جو اقوال ہیں ۔ ایک تو یہ ہے کہ حسن وہ چیز ہے جو لوگوں کو اچھی معلوم ہو ، دوسرا یہ ہے

که حسن اُس چیز کا نام ہے جو کسی غرض کو پورا کرے اور غرض سے مراد عملی مفاد ہے ۔ آج ہم حیرت کر سکتے ہیں کہ جس مفکر نے حیات اور کائنات کے سارے نظام کی بنیاد مادی اور عملی دنیا سے الگ تصورات پر رکھی ہو وہ حسن کا ایسا افادی نظریہ کیسے مرتب کر سکا ؟

بعد کے اشراقیوں اور صوفیوں نے اسی تصورات یا عالم مثال کے نظریہ کو اور زیادہ وسعت دی اور ہر ترقی یافتہ زبان کے بڑے بڑے شاعروں اور مفکروں نے اس سرابی بنیاد پر رنگ برنگ کی نازک، اور دل پذیر عمارتیں تیار کیں ۔ ان لوگوں نے ' لافانی حسن ' ' ازلی حسن ' ' لاہوتی حسن ' ' حسن مطلق ' ' حسن حقیقی ' وغیرہ جیسے بت تراشے جن کے آگے سر جھکانے والوں کی آج بھی کمی نہیں ۔ کیٹس نے حسن کو حقیقت اور حقیقت کو حسن بتایا اور اسی کے اظہار کو شاعری کہا ۔ بیدل بھی حسن حقیقت کے قائل ہیں یعنی حسن اور حقیقت کو ایک سمجھتے ہیں اور ہر وقت اور ہر جگہ اسے سامنے موجود مانتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس کی جستجو نہ کرنا ہی اس کو پانا ہے ۔ حسن کے اس پراسرار تصور نے فکر و احساس کی دنیا میں بڑی بڑی نزاکتیں پیدا کیں اور اس کی بدولت شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کے ایسے ناقابل فراموش نمونے وجود میں آئے جن کی تواریخی قدر ہمیشہ مسلم رہے گی ۔ اسی سلسلہ میں حسن صورت اور حسن معنی ، حسن خیال اور حسن عمل ، حسن مجاز اور حسن حقیقت سے متعلق فلسفہ ، تصوف اور شاعری نے بڑی بڑی موشگافیاں کیں جن کی آخری تان رومانیت کا وہ دبستان ہے جو مجاز اور حقیقت ، جسم اور روح ، صورت اور معنی کے درمیان کوئی دوئی نہیں محسوس کرتا اور جس کی بہترین مثال انیسویں صدی کے اواخر میں انگریزی مصوروں اور شاعروں کی وہ جماعت ہے جو ' پیش رفائیلی اخوت ' (Pre-Raphaelite Brotherhood) کے نام سے مشہور ہے ۔ ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ صورت معنی ہے معنی صورت ، حقیقت مجاز ہے مجاز حقیقت ۔ دوئی کا احساس ہماری فکر و نظر کا قصور ہے ۔ یہ نظریہ جدید متجسس ذہن کے لیے شاید ناقابل قبول نہ ہوتا اگر چھپے ہوئے طور پر اس کی اندرونی ترکیب میں ماورائیت یا تصوریت کی ایک مرکزی لہر کار فرما نہ ہوتی ۔ حسن کی مادی اصلیت اور اس کی افادی غایت کو ہمارے فنکاروں اور گیانیوں نے بالکل نظر انداز کر دیا اور حسن کو ایک غیر مادی اور ابدی دنیا سے منسوب کر کے ایک سیمیائی نمود بنا ڈالا اور ہم حسن کی جستجو میں صحرانورد یا مجذوب ہو کر رہ گئے ۔ اس ماورائی رومانیت سے ہماری فکر و بصیرت اور اسلوب اظہار میں جتنی وسعت اور نکھار پیدا ہوا ہے اس کا اعتراف کرتے ہوئے ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ حسن کی تلاش میں ہم آج تک بھٹکے اور بھٹکے ہوئے ہیں ۔ ہم 'حسن ازل' اور 'حسن مطلق' جیسے مجردات کی سحابی دنیا میں کھوئے ہوئے ہیں حالانکہ یہ سمجھنے کے لیے زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں کہ حسن کا کوئی ازلی نمونہ یا کوئی جامع اور مانع تصور ایک استحالہ یا منطقی مغالطہ ہے ۔ یہ احساس بیدل جیسے تصور پرست کو بھی تھا اگرچہ وہ اس کا اظہار بڑے فریب آفریں الفاظ میں کرتا ہے :

نزاکتہاست در آغوش مینا خانۂ حسرت
مژہ برہم مزن تا بشکنی رنگ تماشا را

استعارات کا پردہ ہٹانے کے بعد اشارتاً شعر کا سادہ مطلب یہ ہے کہ انسانی حسرت یعنی انسان کی ضرورت اور مطالبہ سے الگ حسن کی نزاکتوں کا کوئی وجود نہیں ہے اور پلک جھپکاتے ' رنگ تماشا ' فنا ہو سکتا ہے یعنی ' رنگ تماشا ' کا وجود و عدم صاحب تماشا کے ساتھ وابستہ ہے ۔

حسن یا عشق یا شاعری کے بارے میں ہمارے اسلاف نے اپنے زمانے اور ماحول اور اپنی

قوت فکر کے مطابق لطیف اور نازک خیالات کا ایک ذخیرہ ہمارے لیے چھوڑا ہے جسے بغیر چوں و چرا قبول کیے ہوئے بھی ہم اپنے دور کی تشکیل اور تحسین میں جذب کر سکتے ہیں - اگلے وقتوں کے افکار و نظریات سے ہمیں جس قدر بھی اختلاف ہو لیکن ان کو سامنے رکھے بغیر ہمارا کام نہیں چل سکتا - نئے افکار و نظریات کی تخلیق کے واسطے ہمیں اپنے آباء و اجداد کے تخلیقی اکتسابات سے استقراء اور استخراج کرنا ہے - یہ دوسری بات ہے کہ نئے دور کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق ہمارے نتائج اور ہمارے بزرگوں کے نتائج کے درمیان مشرق اور مغرب کا فرق ہو -

قبل اس کے کہ عصر حاضر کے میلانات کی روشنی میں حسن اور فنکاری کی اصل ماہیت تک پہنچنے کی کوشش کی جائے جی چاہتا ہے کہ ہمارے پیش رووں نے اپنی اپنی ندرت فکر و بصیرت کے مطابق جو کچھ سمجھا اور کہا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے ، اس لیے کہ اگلے زمانے کے خیالات میں ہمیں پوری حقیقت تو نہیں لیکن حقیقت کے کچھ پہلو مل جائیں گے اور ان سے ہم زندگی کی نئی سمتوں میں آگے بڑھنے کے لیے اشارے پائیں گے -

انگریزی کا مشہور شاعر شیلے ، جس کا مارکس تک قائل تھا ، کہتا ہے " عشق اور حسن اور مسرت کے لیے نہ تغیر ہے نہ موت ، یہ تو صرف ہم ہیں جو بدلتے رہتے ہیں . . . " ظاہر ہے کہ شیلے ایک تصور پرست تھا اور وہ حسن کو ایک ابدی حقیقت مانتا تھا اور انسان کو حادث اور فانی سمجھتا تھا - آج ہم اس منزل سے آگے بڑھ گئے ہیں اور کسی عالم کی ابدیت کے قائل نہیں ہیں - ہاں یوں سمجھیے کہ سارے وجود کو ابدی پاتے ہیں - آج ہم اس حقیقت تک پہنچ گئے ہیں کہ حدوث اور ترقی کے سوا کوئی حقیقت دائمی اور غیر فانی نہیں ہے - شیلے نے صرف حسن کو لافانی بتایا تھا ، آج حکیمانہ بصیرت ساری خلقت کو لافانی بتاتی ہے مگر اس مسلمہ کی بنا پر کہ ہیئتیں بدلتی رہی ہیں اور بدلتی رہیں گی - شیلے کی آواز اپنے زمانہ کی آواز تھی اور اپنے زمانہ کے اعتبار سے انقلابی آواز تھی جو ہمارے لیے اب ایک پرانی دھن ہو گئی ہے - لیکن اس نازک اور حسین آواز کے ارتعاشات ہمارے اندر نئی دھن کا ذوق پیدا کر رہے ہیں -

شاعروں کے پیر مغاں حافظ کے بعض ملفوظات یادگار ہیں جن میں حسن کی ماہیت کی طرف مبہم اشارے کیے گئے ہیں :

در ازل پرتو حسنش ز تجلی دم زد عشق پیدا شد و آتش به همه عالم زد

دوسری جگہ کہتے ہیں :

دلبر آن نیست که موئے و میانے دارد بندۂ طلعت آن باش که آنے دارد

ایک دوسرا شعر ہے :

جہاں شخص نه زلف ست و خط و عارض و خال
هزار نکته درین کار و بار دلداریست

اس ایک ' آن ' اور ان ' ہزار نکتوں ' کا احاطہ کون کر سکتا ہے - عام انسانی شعور سے یہ منزل بہت دور ہے - لیکن شاعر نے ہمارے لیے اتنا تو کیا ہی کہ حسن کو چند سطحی احساسات اور محض ظاہری خصوصیات کی قید سے باہر لا کر اور آزاد کر کے اس کو وہ پاکیزگی اور شرافت عطا کی جو تمدن انسانی کی رو سے اس کا پیدائشی حق تھا -

فغانی شیرازی کا بھی ایک شعر سننے کے لائق ہے :

خوبی همیں کرشمه و ناز و خرام نیست
بسیار شیوه‌هاست بتان را که نام نیست

غالب کا مشہور شعر ہے :

دھر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

آسی غازی پوری کے یہ اشعار بھی اپنی مخصوص کیفیت رکھتے ہیں :

آسی کے جلوے تھے لیکن وصال یار نہ تھا
میں اُس کے واسطے کس وقت بے قرار نہ تھا

لالۂ و گل میں آسی رشک چمن کی ہے بہار
باغ میں کون ہے اے باد صبا کیا کہیے

اصغر گونڈوی ایک ' نمود جلوۂ بے رنگ ' سے اس قدر گم کردۂ ہوش ہیں " کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی ۔" ہمارے دور کے مشہور اور ممتاز شاعر فراق گورکھپوری نے اپنی غزلوں اور رباعیوں میں حسن کی جسمانیت پر بڑا زور دیا ہے اور اس کے مادی روپ میں بڑی لطیف رنگینیاں دیکھی ہیں ، اور یہ جدید نسل کے لیے ان کی بہت بڑی دین ہے ، لیکن وہ بھی بسا اوقات ہمارے اندر یہ احساس پیدا کرتے ہیں کہ حسن کوئی غیبی یا داخلی ہمدر ہے ۔

اور عزیزلکھنوی نے تو حد ہی کر دی ۔ بعض مخصوص حالات یا ذہنی کیفیات کے زیر اثر کسی کی انگڑائی لاکھ ولولہ انگیز سہی لیکن عام طور سے انگڑائی یا جماہی کوئی حسین یا خوش آھنگ منظر نہیں پیش کرتی ۔ اس کے بارے میں یہ کہنا کہ " اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن " ایک ایسی بلاغت نظر ہے جس کو اوسط درجہ کا ذہن مجذوبیت کے سوا اور کچھ نہیں سمجھ سکتا ۔

یہ ساری باتیں تو ایک طرف ، ذرا داغ کا چونچلا بھی دیکھیے ۔ ساری عمر گوشت و پوست کے عشق میں سرشار رہے ۔ سڈول ، گداز اور اشتہا انگیز بدن کے علاوہ حسن کا کوئی مفہوم ان کے ذہن میں سما نہیں سکتا تھا لیکن خواہ مخواہ کا شوق ہؤا تو بغیر سوچے سمجھے کہہ بیٹھے :

وہی تو ہے شعلۂ تجلی جو دشت ایمن سے تنگ ہو کر
جب اُس نے اپنی نمود چاہی کھلا حسینوں پہ رنگ ہو کر

عصر جدید کے بعض مشہور شاعروں اور نقادوں مثلاً رابرٹ برجز (Robert Bridges) ، ڈبلو ۔ بی ۔ ییٹس (W.B.Yeats) ، ہربرٹ ریڈ (Herbert Read) ، آئی ۔ اے رچرڈز (I.A. Richards) وغیرہ نے بھی حسن یا اس حقیقت کے، جس کے اظہار کا نام شاعری بتایا گیا ہے، کچھ عجیب اثیری (Ethereal) نظریات پیش کیے ہیں ۔ ان میں سے بعض نے جس قیاس و استدلال سے کام لیا ہے اسے ہم بظاہر علمی یا حکیمانہ کہہ سکتے ہیں ۔ لیکن ان کے نتائج کچھ اس قدر موہوم ہیں کہ ہم اصل حقیقت کی طرف سے جوں کے توں نا بلد اور نا آشنا رہ جاتے ہیں ۔ رابرٹ بریجز نے اپنی طویل اور تھکا دینے والی نظم " عہد نامۂ حسن " Testament of Beauty میں حسن کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ ایک قسم کا روحانی تصوف ہے ۔ ڈبلو ۔ بی ۔ ییٹس (W.B. Yeats) کے مطالعے سے جو مجموعی اثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حسن کا تعلق ایک نہایت دور از خیال ماضی اور وہ بھی ' کلیا طیقی ' (Celtic) یعنی آئر لینڈ کے اساطیری ماضی سے ہے جو زندگی کی تمام خوبیوں اور سعادتوں کا سر چشمہ ہے ۔ اس نے ییٹس کی شاعری کو سرتا سر ایک متصوفانہ رمزیت (Mystical Symbolism) بنا کر رکھ دیا ہے جسے اوسط درجہ کا انسانی ذہن سمجھنے سے معذور ہے ۔

مفکرین میں افلاطون سے لے کر ہیگل اور ہیگل سے لے کر کروچے تک حسن اور فن کے متعلق جتنے نظریے قائم کیے گئے وہ سب کے سب ماورائی ہیں اور دنیائے عناصر سے پرے

ایک عالم مثال یا عالم خیال کے وجود کو تسلیم کرنے پر ہمیں مجبور کرتے ہیں ۔ ایک منفرد وجود کی صورت میں حس کے پس پشت ایک مجرد اور مطلق حقیقت کار فرما ہے تصور اعلیٰ کے مکمل اظہار کا نام حسن ہے ۔ یہ ہیگل کا دعویٰ ہے جو بے انتہا الجھا ہوا ہے ۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ ایک منفرد اور محسوس وجود کو حسین اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب کہ وہ اپنے مجرد اور مطلق تصور کے ساتھ پوری یگانگت رکھتا ہو ۔ لیکن یہ مطلق اور مجرد تصور ہے کیا اور وہ کون سے معقول اور مستند شواہد اور علامات ہیں جن کی بنا پر ہم اس تصور کو قائم بالذات اور واجب ماننے کے لیے مجبور ہیں ؟ ہیگل اور اس کے متبعین کے پاس اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں ہے ۔ ہیگل کے سارے فلسفہ کی بنیاد جدلیاتی حرکت پر ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ اصلی اور اساسی حقیقت تصور ہے نہ کہ وجود اور یہ تصور فطری طور پر متحرک ، تغیر پذیر اور مائل بہ ارتقا ہے ۔ " صورت ، تردید صورت اور تجدید صورت " — اس مثلثی عمل کا نام زندگی ہے ۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیں کہ اصل حقیقت وجود نہیں ہے بلکہ تصور ہے تو بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ تصور مطلق کہاں سے پیدا ہو گیا ، اور جدلیاتی حرکت نکایک ایک منزل پر آ کر رک کیوں گئی ؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہیگل بلا کسی معقول دلیل کے جدلیاتی حرکت کو ایک نقطہ پر لا کر ختم کرنے کے لیے بے چین تھا، اس لیے کہ اس کو پروشی یعنی جرمانی شہنشاہی کو مابعدالطبیعیاتی بنیاد پر قائم رکھنا تھا ۔ اس غرض کے لیے اس نے اپنے تمام نظام فکر کو قربان کر دیا ۔

ہیگل اور اس کے مدرسہ کے دوسرے مفکرین کے فلسفہ میں ہمیں نقائص ملتے ہیں لیکن ان کے پردہ میں ہمیں زندگی کی ماہیت کے بہت سے نئے پہلوؤں کی جھلکیاں بھی نظر آ جاتی ہیں ۔ ہیگل اور اس کے مقلدین کا یہ معمولی کارنامہ نہیں ہے کہ انھوں نے ہستی کو ایک جامد اور مردہ تصور سے ایک زندہ یعنی متحرک اور انقلاب پذیر حقیقت میں تبدیل کر دیا اور زندگی کو حالت کے بجائے حرکت مان کر ایک مسلسل تواریخ بتایا ۔ یہ ہیگل کی وہ دین ہے جس سے بعید ترین مستقبل میں بھی کوئی نسل انحراف نہ کر سکے گی ۔

حقیقت کا ایک اور رخ جو ہیگل کے متناقص فلسفہ کے اندر چھپا ہوا نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر حقیقت اولیٰ تصور ہی ہے تو مادی یا جسمانی روپ کے بغیر اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے ۔ ہیگل اسی ہستی کو حسین مانتا ہے جو اپنے تصور کا مکمل اظہار ہو یعنی وہ چیز حسین ہے جو اپنی نوع میں سب سے اعلیٰ ہو ۔ اس سے ہم اتنا نتیجہ تو نکال ہی سکتے ہیں کہ حسن کسی مجرد تصور میں نہیں ہوتا بلکہ ایک زندہ اور منفرد مظہر میں ہوتا ہے ۔ حسن تصور اور اس کی جسمانی شبیہ کے درمیان مکمل یگانگت کا نام ہے یعنی حسن نہ تو تنہا تصور میں ہے نہ تنہا جسم میں بلکہ دونوں کی انتہائی ہم آہنگی میں ہے ۔

دوسری بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ حسن سے جو احساس ہمارے اندر پیدا ہوتا ہے یا پیدا ہونا چاہیے وہ کمال مسرت و انبساط ہے ۔ اگر ایسا نہیں ہے تو انسان کے لیے حسن کا وجود اور عدم برابر ہے ۔ جس چیز سے زندگی کی نمو اور بالیدگی میں اضافہ نہ ہو وہ حسین نہیں ہو سکتی ۔ انسان کے لیے سب سے زیادہ اہم اور محبوب چیز زندگی ہے اور اسی نسبت سے انسان موت سے نفرت کرتا رہا ہے ۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حسن عین زندگی ہے ۔ وہ چیز حسین ہے جس میں زندگی کے فروغ کا امکان ہو یعنی جس میں ہم اپنی زندگی کی تخئیل کی جھلک پائیں ۔ وہ چیز حسین ہے جو ترقی پذیر زندگی کی علامت ہو ، جو ہمیں زندگی کی نت نئی توانائیوں کا احساس دلائے ۔

اب اگر یہ تعریف صحیح ہے کہ زندگی اور اس کے مظاہر حسن کے اصلی ترکیبی عناصر ہیں تو بیماری یا انحطاط کے اسباب و علامات قدرتی طور پر غیر حسن یا قبح یا بد صورتی قرار

پائیں گے۔تمام موجودات میں، چاہے وہ جمادات ہوں یا نباتات یا حیوانات، وہی صورتیں جمیل ہیں جو یا تو ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے سطح انسانی سے زیادہ قرابت رکھتی ہیں یا اس کی زندگی کی فلاح اور فروغ میں بیش از بیش ممد ثابت ہوئی ہیں ۔ خود ہیگل اور پیروان ہیگل کے اکثر ملفوظات ایسے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ نظام قدرت میں وہی عناصر و مظاہر حسین ہیں جو انسان کی یاد دلائیں یا جو شخصیت کا اظہار کریں ۔ ان مفکروں کو اصرار ہے کہ کائنات میں حسن کے معنی صرف یہ ہیں کہ جن چیزوں کو حسین کہا جاتا ہے وہ کسی نہ کسی اعتبار سے حیات انسانی کے اغراض و مقاصد کے ساتھ واسطہ رکھتی ہیں اور اس واسطہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں ۔

ان خیالات پر غور کیجیے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلاف کے نتائجِ فکر میں آج بھی ہمیں زندگی کے اسرار و حقائق کی بصیرت افروز جھلکیاں ملتی ہیں جنھیں ہم ٹھکرا دینے کے لیے مجبور ہیں ۔ مثلاً کانٹ کے مشہور شاگرد شلر (Schiller) کا یہ خیال کہ حسن محض ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ نظام قدرت میں موجود ہے ، حقیقت سے بہت قریب ہے اور آج بھی اس کے اس قول کی تردید مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے کہ فنون لطیفہ مادہ اور ذہنی صورتوں میں یا نفس انسانی اور خارجی مظاہر قدرت میں باہم ربط پیدا کرتے ہیں ۔ شلر بھی حسن کو زندگی ہی بتاتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے زمانہ کے عام میلان کے مطابق وہ جسم اور روح کے فرق کا قائل ہے اور حسن کو جسمانی نہیں بلکہ ایک غیر مادی کیفیت تصور کرتا ہے ۔ اس کا یہ خیال بھی بہت بڑی حد تک صحیح ہے کہ فنون لطیفہ اپنے حسین اسالیب کی بدولت ہمیں قدرت پر فتح پانے میں مدد دیتے ہیں اور مادہ کو لطیف بناتے ہیں ۔ اگر ہم اپنے اسلاف کے اکتسابات فکری کو تواریخ کی روشنی میں دیکھیں تو ہمیں نہ ان پر کوئی اعتراض کرنے کا حق ہوتا ہے نہ ان سے کوئی شکایت ہو سکتی ہے ۔ زاویہ اور سطح اور نقطۂ نظر کا فرق ہے ۔ جسم اور روح مادہ اور شعور کے درمیان تضاد اور تناقص قائم کر کے ہم نے خواہ مخواہ اپنے لیے الجھنیں پیدا کر لی ہیں ۔ مادہ اور شعور دراصل توام اور شریک ازلی ہیں ۔ شعور کی قدیم ترین صورت قوت اور اس کی اولین علامت حرکت ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اور تجربات کی طرح حسن کا تجربہ بھی دو سمتی ہے ۔ نہ یہ کہنا صحیح ہے کہ حسن کا وجود خارجی ہے اور نہ یہ دعویٰ ٹھیک ہے کہ حسن یکسر ایک داخلی کیفیت ہے ۔ رنج و الم ، انبساط و مسرت ، سردی اور گرمی کی طرح حسن کا وجود بھی مطلق نہیں اضافی ہے یعنی ایک حساس ہستی اور ایک محسوس وجود ، ایک خارجی مؤثر اور ایک اثر پذیر ذات ، ایک معروض اور ایک موضوع کے درمیان ایک ناگزیر اضافت یا تعلق کا نام حسن ہے جو خود اپنی جگہ بڑی اصلی اور ٹھوس حقیقت ہے ۔ نہ درد ، غصہ ، رنج ، مسرت بالکل داخلی کیفیتیں ہیں نہ گرمی سردی وغیرہ محض خارجی موجودات کے اعراض ہیں ۔ حسن اور گرمی و سردی میں یہ فرق ضرور ہے کہ مؤخرالذکر اثرات کم و بیش زمانۂ قبل تاریخ سے اب تک ایک معیار پر قائم ہیں اور حسن کا معیار ملک بہ ملک اور دور بہ دور متغیر ہوتا رہا ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے حدت و برودت کا احساس ہمارے بشر نما Anthropoid مورثوں میں اتنا ہی شدید اور نازک تھا جتنا کہ ہم میں ہے ؟ اور آج بھی اتنا تو ہے ہی کہ گرم ممالک کے رہنے والوں کو وہاں کی گرمی اس شدت کے ساتھ نہیں محسوس ہوتی جس شدت کے ساتھ سرد ممالک کے لوگ اسے محسوس کریں گے اگر ان کو گرم ممالک میں منتقل کر دیا جائے ۔ بہ ہر صورت ہر خارجی محسوس کے لیے کسی ذی حس ہستی کا ہونا ضروری ہے بالکل اسی طرح جس طرح ہر احساس یا تاثر کے لیے ذی حس ذات سے باہر اور الگ کسی خارجی محسوس یا مؤثر کا وجود لازم ہے ۔ کرسٹوفر کاڈول نے ایک طرف سردی ، گرمی ، انقباض ، انبساط ، خوف وغیرہ اور دوسری طرف حسن کے درمیان جو فرق ثابت کرنے کی کوشش

ہے وہ زیادہ اصلی اور قابل اعتبار نہیں ہے ۔ ذات ذی حس سے کسی نہ کسی مؤثر وجود تسلیم کیے بغیر احساس کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور احساس کے بغیر، جس کا تعلق ذات حس سے ہے ، خارجی اور مادی محسوسات و مؤثرات کا وجود اور عدم برابر ہے ۔

انگریزی کے مشہور نقاد آئی ، اے رچرڈز (I.A. Richards) کا یہ خیال ایک حد صحیح ہے کہ حسن ایک طرح کی حسی نسبت یا ہم احساسی (Coenesthesia) ہے ، ایک خارجی محرک یا مہیج سے ایک متناسب داخلی اثر پیدا ہونے کا نام حسن ہے ۔ ں یہ خیال خطرے سے خالی نہیں کیوں کہ اس سے داخلیت میں کھو کر رہ جانے کا اندیشہ ۔ کل زندگی کی طرح حسن کی ترکیب میں بھی ثنویت ہے ۔ حسن بھی ایک جدلیاتی حقیقت ہے ، کے دو اجزا ہیں جو بیک وقت باہم مقابل اور رفیق ہیں ۔ ایک خارجی وجود اور ایک ، ذی ادراک ۔ یہ دونوں اجزا یکساں اہم اور لازم ہیں ۔ دونوں کے تعاون عمل کے ر حسن کا تصور محض استحالہ ہے ۔

اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ حسن کا ایک مجرد اور مطلق تصور کی حیثیت سے کہیں کوئی ود نہیں تو ہم کبھی غلط اندیشی کا شکار نہیں ہو سکتے ۔ حسن کا تصور نہیں ہوتا بلکہ ین چیزوں کا وجود ہوتا ہے ۔ یہ سچ ہے کہ انسان کی فنی تخلیقات سے پہلے کائنات میں موصیت موجود تھی جس کو حسن کہتے ہیں ۔ نظام قدرت میں ایک ابتدائی قرینہ ، ایک س تناسب ، ایک خام آہنگ کا پتا چلتا ہے ۔ جہاں کہیں تخلیقی حرکت کا وجود ہوگا وہاں ی نہ کسی حد تک آہنگ یا تال سم یا قرینہ بھی ضرور پایا جائے گا ۔ لیکن اس کو قرینہ یا ن انسان نے سمجھا اس لیے کہ اس کو اپنی زندگی کی فلاح و بہبود اور تہذیب و تحسین میں رری اور مددگار پایا۔ اگر داخلیت کے خطرے سے ہم ہوشیار رہیں تو شاعری کے استعارات میں ل ، بے نظیر شاہ وارثی اور فراق کے یہ اشعار ہمارے اسی خیال کی ترجمانی کرتے ہیں :

" نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد   حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد "

(اقبال)

" نہ ہو اپنی آنکھ جو حسن بیں تو جہاں میں کوئی حسیں نہیں
جو وہ غزنوی کی نگاہ ہو ، وہی خم ہے زلف ایاز میں "

(بے نظیر شاہ وارثی)

" مائل دید کوئی اہل نظر ہوتا ہے
حسن اب تک تو نہ تھا حسن ، مگر ہوتا ہے"

(فراق گورکھپوری)

حسن ، خیر اور حقیقت کے درمیان ہزاروں برس سے جو فرق بتایا جا رہا ہے وہ کوئی لی اور اساسی فرق نہیں ہے ۔ وہ محض رخ اور زاویۂ نظر کا فرق ہے ۔ تینوں کی بنیاد ایک ، جو یقیناً افادی ہے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ ثقافتی ترقی اور تمدنی تواریخ کے ساتھ خود مفاد معیار بدلتا رہا اور کثیف سے لطیف اور لطیف سے لطیف تر ہوتا رہا ۔ یہ بھی انسانی زندگی بدلتی ہوئی ضرورت اور اس کی فلاح کے تقاضے سے ہؤا ہے ۔ اس کو ایک معمولی مثال کے یعے سے سمجھیے ۔ انسان بہت پرانے زمانے سے اوزار بنا رہا ہے ۔ قدیم ترین زمانوں کے اوزار ر آج کل کے نفیس سائنسی اوزار و آلات کے درمیان جو زمین آسمان کا فرق ہے وہ ہم کو صحیح دازہ کرنے سے قاصر رکھتے ہیں ۔ لیکن قدیم ترین تواریخ میں کسی دو دوروں کے اوزار کا مقابلہ یجیے جو ایک دوسرے کے فوراً بعد آئے ہوں ۔ مثلاً قدیم حجری اور جدید حجری دوروں کے

زیادہ سبک ، زیادہ چکنے اور زیادہ راحت بخش ہوں گے حالانکہ دونوں زمانوں میں پتھر ہی کے اوزار بنائے جاتے تھے - قدیم حجری دور کے انسان نے بہت محسوس کیا کہ اس کے بنائے ہوئے بے ڈول اور کھردرے اوزار نہ صرف اس کے ہاتھوں کے لیے تکلیف دہ اور ضرر رساں ہیں بلکہ ان سے اس کی کاریگریوں میں زحمت اور تاخیر بھی واقع ہوتی ہے - مسلسل عمل اور فکر اور تکرار عمل کے بعد اس کی سمجھ زیادہ واضح ہوتی گئی اور اس کے ہاتھ منجھتے گئے ، یہاں تک کہ جدید حجری دور آتے آتے وہ ایسے اوزار بنانے لگا جو اس سے پہلے کے دور کے اوزاروں سے کہیں زیادہ سبک ، نازک اور کارگر تھے اور جو اس کے ہاتھوں کے لیے زیادہ آرام بخش تھے جن سے وہ زیادہ سہولت کے ساتھ کم وقت میں اپنا کام کر سکتا تھا -

غرض کہ فنی اختراعات میں عہد بہ عہد جو لطافتیں پیدا ہوتی گئیں ان میں بھی ایک مقصدی میلان اور ایک افادی پہلو علانیہ یا مضمر موجود ملے گا - حسن کبھی مقصود بالذات نہیں رہا اور فن کسی زمانے میں آپ اپنی غایت نہیں قرار پایا - حسن اور فنکاری دونوں معاشرتی مطالبات سے وابستہ رہے ہیں - آج فنکاری لطافت ، نزاکت اور پیچیدگی کی ایسی منزل پر ہے کہ ہم اس کی مقصدی نہ تک مشکل سے پہنچ پاتے ہیں اور اس کی تاویل میں طرح طرح کے دوراز کار نظریات گڑھتے رہتے ہیں - لیکن ہمارے قدیم ترین اجداد کی زندگی میں افادی اور جمالیاتی دو الگ الگ قدریں نہیں تھیں -

فنکاری کا آغاز حیات انسانی کے ناگزیر مطالبات سے ہوا - الفاظ کی فنکاریوں سے بہت پہلے پہاڑوں کے اندر جائے پناہ بنانا ، اوزار و ظروف تیار کرنا ، جسمانی حرکات و سکنات سے مافی الضمیر کا اظہار کرنا اور کچھ عرصہ بعد چھینی سے پتھر پر نقش و نگار بنانا فنکاری کے سب سے زیادہ اہم اکتسابات تھے - یہ نقش و نگار یا تو واقعاتی زندگی کی نمائندگی کرتے تھے یا تعویذی یا طلسمی ہوتے تھے - ہمارے وحشی آبا و اجداد یا تو نظام کائنات کے ساتھ اپنے مقابلے اور پیکار کے کارناموں کو نقوش کی صورت میں چٹانوں پر اور اپنے ظروف پر ثبت کرتے تھے یا اپنے زمانے کے معصوم عقائد کے مطابق ، جو ان کے لیے زندگی کے سارے فلسفے اور سائنس کا حکم رکھتے تھے ، وہ ایسے نقوش بناتے تھے جو طلسمی تاثیر رکھتے تھے - ان کا ایمان یہ تھا کہ اس وسیلے سے وہ غیر انسانی عناصر اور مؤثرات پر قابو پا سکیں گے یا ان کو راضی کر کے اپنے اغراض و مقاصد کے لیے موافق اور مبارک بنا سکیں گے - یہ گویا انسان کی قدیم ترین کوششیں تھیں ، اپنے حال یعنی مقدر کو بدلنے اور سدھارنے کی -

اولین بنی نوع انسان کے لیے حسن کا تصور اقلیدسی یا ہندسی تھا یعنی ابعادی تناسب (Dimensional Proportion) حسن کا کوئی مفہوم نہ تھا - زمانے کے امتداد کے ساتھ انسانی ذہن زیادہ بالغ ، زیادہ رسا ، زیادہ دوراندیش ہوتا گیا اور اسی نسبت سے حسن کے مفہوم میں بھی روز بروز زیادہ بلاغت اور لطافت آتی گئی ، یہاں تک کہ آج ظاہری تناسب یا سطحی آہنگ کی جگہ باطنی تناسب یا اندرونی آہنگ نے لے لی ہے - نقاشی کے پارسی ، راجپوت اور مغل دبستانوں کا موازنہ جدید دبستان سے کیجیے - مؤخرالذکر دبستانوں کی نقاشیاں قدیم روایتی معیار سے بڑی بھونڈی اور بد قرینہ معلوم ہوں گی - لیکن آج کوئی یہ نہیں کہ سکتا کہ یہ نقاشیاں پرانے زمانوں کی نقاشیوں کے مقابلے میں زیادہ تربیت یافتہ اور بلیغ و لطیف نہیں ہیں - ان کے اندر خطوط و الوان کا جو آہنگ ہوتا ہے اس کا تعلق ہمارے حواس ظاہری سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ باطنی ادراک سے ہے - جیسا کہ ہم ایک بار کہہ چکے ہیں حسن کا تصور دور بہ دور کثیف سے لطیف ہوتا گیا - اگر کسی کو اصرار ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ حسن جسمانی سے غیر جسمانی ، مادی سے غیرمادی ہوتا گیا - مگر در اصل بہرحال مادی ، جسمانی اور افادی ہے -

جو بات سب سے زیادہ ناقابل تردید ہے وہ یہ ہے کہ حقیقت اور خیر کی طرح حسن کا

تصور بھی خطہ بہ خطہ اور عہد بہ عہد بدلتا رہا ہے ۔ ماحول کے مقتضا اور معاشرت کے مطالبے کے مطابق حسن کے مفہوم میں تغیرات واقع ہوتے رہے ہیں ۔ حسن ہو یا خیر یا حقیقت، سب کی بنیاد انسانی زندگی کی فلاح اور ترقی پر ہے ۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے ۔ تینوں قدریں تغیر پزیر اور مائل بہ ارتقاء ہیں ۔ حسن کسی قدر مطلق کا نام نہیں ہے ۔ فنکاری کوئی وحدانیت نہیں ہے ۔ تہذیب ہر ملک اور ہر زمانے کے لیے ایک نہیں ہو سکتی ۔ حسن کی ابدیت اور فنکاری کی ہمیشگی کے اگر کوئی معنی ہوسکتے ہیں تو صرف یہ کہ حسن کی ضرورت انسان کی زندگی میں ہمیشہ رہے گی اور فنکاری کے بغیر انسانی معاشرت بہیمیت سے بدتر ہو جائے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ حسن کا ایک ہی تصور ہمیشہ قائم رہے گا اور فنکاری کا ایک ہی معیار روز قیامت تک باقی رہے گا ۔ اس قسم کے مجرد اور بے معنی مسلمات کو حسن اور فنکاری سے کوئی واسطہ نہیں ہے ۔ فنکاری کے اقتضاءات انسانی زندگی کے مفاد کے لیے ہیں اور مفاد کا معیار برابر بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا ۔ قدیم ترین زمانوں کی فنکاری کے نمونے ہمارے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں ۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں فنکاری کے اولین نمونے اور حسن کے تصور کے قدیم ترین مظاہر ظروف اور اوزار ہیں ۔ ان کے بعد گھروں اور عبادت گاہوں کی عمارتیں ہیں جو ابتداء میں نہایت بھونڈی اور بھدی ہوتی تھیں لیکن جو رفتہ رفتہ اس قدر تربیت یافتہ ہوتی گئیں کہ آج ہم ان کی اصلی غایت کو بھول جاتے ہیں اور ان کی اسلوبی کیفیتوں کو مقصود بالذات قدر سمجھتے ہیں ۔

حسن ، خیر، حقیقت ، یہ تمام قدریں انسان کی پرمحن اور پر آزمائش زندگی کے نتائج ہیں ۔ اتنا سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں ہے بشرطیکہ ہم ایمانداری اور سچائی کے ساتھ سمجھنے کے لیے آمادہ ہوں ۔ قدرت کی طرف سے انسان پر جو مجبوریاں عائد تھیں اور ان کی وجہ سے وہ جن شدائد اور مصائب میں مبتلا تھا ان سے وہ برابر مقابلہ کرتا رہا اور بتدریج ان پر فتح پاتا رہا ۔ اسی مقابلے اور مجاہدے کا ایک ثمرہ فنکاری ہے ۔ محنت نے انسان کی زندگی میں یہ قدر پیدا کی جس کو حسن کہتے ہیں اور حسن کا تصور محنت کے اسلوب کو سنوارتا رہا ۔ ارتقاء بشری کی تواریخ میں محنت نے بہت بڑا حصہ لیا ہے ۔ محنت، جو زندگی کی توام بہن ہے، انسان کے جسمانی اعضا اور دماغی اور روحانی قویٰ کو روز بہ روز زیادہ توانا، زیادہ حسین ، زیادہ قابل اعتماد اور زیادہ کارگر بنانے میں بڑی مددگار رفیق رہی ہے ۔ مثال کے طور پر ہمارے جسمانی اعضاء میں ہاتھ کو لے لیجیے ۔ ہمارا عام خیال یہ ہے جو صحیح ہے کہ ہاتھ محنت کی تخلیق کرتا ہے لیکن اس حقیقت کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جو اتنا ہی اہم ہے ۔ محنت نے ہمارے ہاتھ کی بھی تخلیق و تربیت کی ہے ۔ نیم انسان یا انسان قدیم کے ہاتھ بہت بد ہیئت ، بھدے ، سخت اور سست تھے ۔ ہزاروں سال کی پیہم محنت ، نئے حالات اور مواقع کے مطابق نئے طریق عمل اختیار کرتے رہنے — سعی، غلطی ، ناکامی اور سعئی جدید کے تسلسل نے ہمارے ہاتھوں کو زیادہ خوبصورت ، زیادہ نرم اور زیادہ پھرتیلا بنایا ۔ کام کرتے کرتے ہاتھوں کے مفاصل اور رگوں اور پٹھوں میں بلکہ ان کی ہڈیوں میں بھی لچک ، چالاکی اور چستی آتی گئی ۔ نسلاً بعد نسل ہمارے ہاتھ بنتے اور سنورتے ہوئے آج اس قابل ہو گئے ہیں کہ وہ نقاشی ، مجسمہ سازی ، عمارت گری اور موسیقی میں نت نئی نزاکتیں اور نفاستیں پیدا کر رہے ہیں ۔

اب ہم حسن اور فنکاری کے متعلق آخر میں چند باتیں ذہن نشین کرا دینا چاہتے ہیں ۔ حسن اور فنکاری کے بنیادی تصور میں انسان کی مادی اور جسمانی زندگی کے اغراض و مقاصد اصل اور اہم اجزائے ترکیبی کا حکم رکھتے ہیں ۔ اور دونوں میں سے کسی ایک کی مادی ماہیت اور مقصدی غایت سے انکار کرنا ہٹ دھرمی ہوگی ۔ دوسری بات ، جس کو تسلیم کیے بغیر مفر نہیں ، یہ ہے کہ فنکاری کا نصب العین کم سے کم اول اول کسی فرد واحد کی زندگی کی فلاح نہیں بلکہ حیات اجتماعی کی توسیع و ترقی تھا ۔ لیکن اس جگہ بعض مغالطوں سے ہوشیار رہنا

ہے ۔ اول تو یہ کہ انسانی تہذیب کے کسی دور میں بھی کسی انسانی جماعت کے کل افراد نے مل کر کسی فن کو ایجاد نہیں کیا ۔ ہر گروہ یا قبیلہ یا خاندان میں دو چار ایسے افراد رہے ہوں گے جو عوام کے مقابلے میں ذہانت ، رسائیٔ فکر، ابداعی قوت اور عملی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے زیادہ خوش اندیش ، خوش تدبیر رہے ہوں گے اور انہیں کے ذہن میں پہلے پہل ایجاد و اختراع کا خیال آیا ہو گا ۔ اوزار یا ظروف کی ضرورت یقیناً پوری جماعت کی ضرورت تھی مگر ان کا تصور اور ان کی ساخت کا نقشہ افراد کے دماغوں کی تخلیق ہیں ۔ علت مادی اور علت غائی کے لحاظ سے فنکاری خارجی اور اجتماعی ہے لیکن علت صوری اور علت فعلی کے اعتبار سے داخلی اور انفرادی ہے ۔ لیکن یہاں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ فرد خود بھی خارجی اسباب و عوارض اور اجتماعی محرکات و میلانات کی پیداوار ہے ۔

فنکاری زندگی کی اور تخلیقات کی طرح اپنی غرض و غایت کی رو سے نہ تو انفرادی ہے نہ طبقاتی یا جماعتی بلکہ اجتماعی یعنی جمہوری ہے ۔ اس کا مقصد خلائق کی زندگی کا فروغ ہے ۔ لیکن ہماری بد نصیبی سے بہت جلد اور بہت سی زندگی بخش طاقتوں کی طرح فنکاری کی طاقت بھی مخصوص طبقے کا اجارہ بن کر رہ گئی ۔ اس اجارہ دار طبقے نے فنکاری کو عوام الناس پر اپنا رعب قائم رکھنے کا آلہ اور خود اپنے لیے عیش و تفریح کا ذریعہ بنائے رکھا ۔ بطریقی (Patriarchal) دور یا پروہت کال سے لے کر آج کل کے دور سرمایہ داری تک ایسا ہی رہا ہے ۔ ایک با فراغت اور با اقتدار اقلیت زندگی کی تمام برکتوں کو اپنائے رہی اور انھیں کے بل بوتے پر طرح طرح کے فریب پیدا کر کے اور عوام کو ان کے پیدائشی حقوق سے محروم رکھ کر ان پر حکومت کرتی رہی اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں زندگی کے اور مساعی کی طرح فنکاری نے بھی ترقی نہ کی ہو ۔ زمانۂ قبل تاریخ کے بھونڈے اوزار ، بھدے برتنوں اور بد ہیئت مسکنوں سے لے کر عصر حاضر کے نفیس ترین اختراعات تک لطافت اور نزاکت کے ارتقائی مدارج طے کرتی ہوئی فنکاری آج جس بلند مقام پر ہے اس کا اعتراف نہ کرنا تنگ نظری کے سوا کچھ نہ ہوگا ۔ لیکن اب دنیا کی آنکھوں سے بہت سے پردے ہٹ چکے ہیں ۔ اب التباسات کا زمانہ نہیں رہا ۔ اب ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ زندگی کی جو سعادتیں اب تک ایک چیدہ اور برگزیدہ کم تعداد گروہ کا اجارہ رہی ہیں ان کو جمہور کے لیے عام ہو جانا چاہیے ۔ فنکاری کے لیے ہمارا مطالبہ یہی ہے ۔ اب ہم کو ایسے نظام معاشرت کی ضرورت ہے جو جماعت کے ہر فرد کے لیے ایسے اسباب اور مواقع مہیا کرے کہ وہ اگر چاہے تو فنکار ہو سکے یا کم سے کم فنکاری کے اکتسابات سے حسب مراد بہرہ اندوز ہو سکے ۔ فنکاری انسان کی ثقافتی تخلیقات میں بے انتہا مبارک تخلیق ہے اور اس کی برکت کو تمام بنی نوع انسان کے لیے سہولت کے ساتھ قابل حصول ہونا چاہیے ۔ فنکار کی انفرادی ابداعی قوت کو تسلیم کرتے ہوئے ہمارا اصرار یہ ہے کہ اس ابداعی قوت کے نتائج جمہوری یا اجتماعی زندگی کی صحت اور ترقی میں مددگار ثابت ہوں ۔ اب تک فنکار کو پیغمبر یا فوق البشر کی قسم کی مخلوق سمجھا جاتا رہا جو فریب تھا ۔ فنکاری حیات انسانی کی نشو و نما اور اس کی توسیع و ترقی میں صحیح طور پر اسی وقت مفید اور مددگار ثابت ہو سکے گی جب فنکار اپنے کو عوام کی طرح انسان سمجھے گا اور عوام فنکار کو اپنوں میں شمار کر سکیں گے ۔ جب ہمارا معاشرتی نظام بدل جائے گا ، جب زندگی کے تمام حقوق عام ہو جائیں گے ، جب افلاس اور امارت کی بنا پر اختلاف مدارج مٹ جائے گا اس وقت ہر شخص بالفعل یا بالقوی فنکار ہو گا ۔ اس وقت فنکار بھی ہماری طرح ایک انسان ہو گا یا پھر ہم سب فوق الانسان یا اعلیٰ انسان ہوں گے ۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا اس وقت تک کسی فرد یا کسی انسانی مخصوص گروہ کا زندگی کے تمام حقوق پر قبضہ کر کے فوق الانسان ہونا عام بنی نوع انسان کے لیے بے انتہا مہلک اور تباہ کن ہے ۔

مختار صدیقی

کا تخیل اُس منزلِ شب کا مسافر ہے جس کی تاریکیوں میں ایلورا اجنتا کے سنگین مگر منقش رومانی خواب پرورش پاتے ہیں ، اس کا تصور اُس جلوہ گاہِ سحر کا حسلونی ہے جہاں «جمالِ ہم نشیں» عشوہ و ناز کے ہزاروں پیکر تراشتا ہے ۔

منزلِ شب

اردو شاعری کی عظیم روایتوں میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے ۔

مختار صدیقی کے تفکر و تحسس کی فن کارانہ تخلیق ۳/۸

☆ ☆ ☆

عدم

کا خاص سرمایۂ کلام اُس کا تغزل ہے ۔ اس تغزل کو حسن کی بے پناہ سرشاری اور عشق کی شوریدہ سری نے جنم دیا ہے ۔

خرابات

عدم کا لافانی شعری کارنامہ ۔ اس کی بارہ سالہ غزلوں کا نچوڑ ۔

دوسرا خوبصورت ایڈیشن -/۴

قتیل شفائی

پنجاب کا البیلا شاعر وقت کے ربط پر ایک سریلا راگ چھیڑ رہا ہے ۔ وہ راگ جس میں محبت کا درد ، محرومی کی کسک اور انقلاب کی پکار سبھی کچھ موجود ہے ۔ قتیل شفائی نئے دور کا محبوب ترین شاعر ہے ۔ وہ ذاتی غموں کو کائناتی پیمانوں میں ڈھالتا ہے ۔

گجر

قتیل شفائی کی غزلیں ، نظمیں ، گیت

دوسرا خوبصورت ایڈیشن -/۳

☆ ☆ ☆

ظہیر کاشمیری

اپنے وقت کا سب سے بڑا ستارہ شناس ہے ۔ اُس نے آنے والی نسلوں کے لیے فکر و فن کے لاثانی زائچے تیار کیے ہیں ۔ وہ انفرادی خوابوں سے گزر کر اجتماعی حقیقتوں کی ادبی نمائندگی کرتا ہے ۔

عظمتِ آدم

اردو کے صاحبِ طرز شاعر کا پہلا مجموعۂ کلام ۳/۸

☆ ☆ ☆ ☆

سعادت حسن منٹو کی موج در موج روح کو زندگی بھر کہیں قرار نہ ملا

لیکن اُس کے ہمزاد — نصیر انور نے بھی اُس کا ساتھ کہیں نہ چھوڑا

منٹو اب اس دنیا میں نہیں

لیکن نصیر انور جولانیٔ قلم سے اُسے اپنی کتاب

موجِ سراب

میں پھر سے رواں دواں کر رہا ہے ۔ (زیر طبع)

ضیا جالندھری

گزشتہ آدھی صدی میں ایوانِ شعر میں کئی آوازیں گونجیں، کئی شاعروں نے ادبیت کے چراغ جلائے، کئی فنکاروں نے اچھوتے سُر چھیڑے

سرِ شام

ضیا جالندھری کا نغمۂ فروزاں ہے جو اُن تمام آوازوں سے الگ بھی ہے اور ہم آہنگ بھی، اس کی انفرادیت لطافت اور احساس کی نزاکت کے خوبصورت دائروں میں موجزن ہے۔ سرِ شام کا شاعر اپنے شعروں میں سرِ شام کی موسیقی چھیڑتا ہے۔ ۲/۸

☆ ☆ ☆

اختر الایمان

نئے دبستانِ شاعری میں سب سے گھائل آواز اختر الایمان کی ہے۔ جو چٹیلا پن، جو تلخی، جو دھک اور جو تیز دھار اس کے افکار میں موجود ہے وہ بتا رہی ہے کہ آج نوجوان زندگیوں کے چہروں پر کابوسیت اور محبوسیت کیوں چھائی ہوئی ہے۔

تاریک سیارہ

اردو کے نوجوان فلسفی شاعر اختر الایمان کی نظموں کا دوسرا مجموعہ ۲/۸

ادا جعفری

اردو کی واحد شاعرہ۔ جس کی فنی تخلیقات مکمل اعتماد اور انتہائی فخر کے ساتھ اُس کے ہم عصر شاعروں کی بہترین نگارشات کے دوش بدوش پیش کی جا سکتی ہیں۔ ادا کی آواز میں مردانہ عزم اور نسائی لوچ اپنے پورے اوج پر ہے۔

ادا جعفری کے شعروں میں ہمیں جدائی کی کسک بھی ملتی ہے اور وصال کی سرشاری بھی

میں ساز ڈھونڈتی رہی

ادا جعفری کا پہلا مجموعۂ کلام ۲/۸

☆ ☆ ☆

دلِ دریا

نے کون دلاں دیاں جانے؟
پر جدوں کوئی اکھ اینہاں ڈوھنگیاں وِیہاں وچ جھات پا سارے دل آپ بھلیں بے جاندے ہیں۔

دلِ دریا

عبدالمجید بھٹی

دے گیتاں دا مجموعہ ۳/-

☆ ☆ ☆

تلخیاں

ساحر لدھیانوی

ساحر کی شاعری بدلتی ہوئی تاریخ کے ہمرکاب جا رہی ہے۔ وہ کسی ایک طبقے، ایک فرقے یا ایک قوم کا شاعر نہیں۔ وہ ساری انسانیت کا شاعر ہے۔ لازوال خلوص، لافانی محبت اور جد و جہد کا شاعر۔

جدید تر شعرا میں اردو دان طبقہ اُسے سب سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ جاندار، متحرک اور پائندہ ادب کا مثالی مجموعہ جو رنگین بھی ہے اور سنگین بھی۔ ۳/-

مطبوعاتِ نیا ادارہ

نثری ادب

(ناول)

باغ و بہار	میر امن	۵/-
امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	۵/-
لندن کی ایک رات	سجاد ظہیر	۱/۸
ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	۵/۸
دھوپ اور شگوفے	اے حمید	۴/۸
یونہی تو نہیں جینا	سعدی برلاس	۳/۸
دو ملک ایک کہانی	ابراہیم جلیس	۲/۸
چھٹا دریا	فکر تونسوی	۲/-
کپتان کا گڈا	ڈی ، ایچ ، لارنس	۲/۸

(ڈرامے)

منٹو کے ڈرامے	سعادت حسن منٹو	۴/-
آؤ	،،	۲/-
سیطان	عصمت جغتائی	۲/۸
دھانی بانکیں	،،	۱/-
چرواہے	اپندر ناتھ اشک	۲/-
میں اور تو	تاجور سامری	۱/-

(افسانے)

تین غنڈے	کرشن چندر	۲/۸
ان داتا	،،	۲/۸
طلسم خیال	،،	۲/۸
زندگی کے موڑ پر	،،	۲/۸
ٹوٹے ہوئے تارے	،،	۲/-
سڑک کے کنارے	سعادت حسن منٹو	۳/-
لذت سنگ	،،	۲/-
نمرود کی خدائی	،،	۲/-
رفیق تنہائی	علی عباس حسینی	۳/-
میلہ گھومنی	،،	۳/-
باسی پھول	،،	۲/۸

گرہن	راجندر سنگھ بیدی	۳/۴
دانہ و دام	،،	۲/۸
سناٹا	احمد ندیم قاسمی	۴/۸
طلوع و غروب	،،	۲/-
منظر و پس منظر	اختر اورینوی	۲/۱۲
کلیاں اور کانٹے	،،	۱/۱۲
ایک بات	عصمت چغتائی	۳/-
ہائے اللہ	ہاجرہ مسرور	۲/۸
منزل منزل	اے حمید	۴/-
آگ کی آغوش میں	انور	۲/۸
کونپل	اپندر ناتھ اشک	۱/۱۲
بھنور	شیر محمد اختر	۱/-
چاند کا گناہ	ترجمہ : راجہ مہدی علی خاں	۳/-
پتھر کا دل	،، سراج الدین نظامی	۲/-
زندہ چین	،، تمنائی	۲/۸
سرکش روحیں	خلیل جبران	۲/-
پردۂ سیمیں	ڈاکٹر نصیرالدین احمد	۳/-
درپن	شکملہ اختر	۲/-
روشنی کے مینار	جیلانی بانو	(زیر طبع)

(تاریخ و سوانح)

کارل مارکس	باری	۱/۴
مشین اور مزدور	،،	۱/۴
سوشلزم	،،	۱/۴
پاکستان اور اچھوت،	افضل حق چودھری	۱/۸
گاندھی ازم، نیشنلزم، سوشلزم-	ایم این رائے	۱/۸
قوم اور قومیت	طفیل احمد خان	۱/۸

(تنقید)

نئی تنقید	ممتاز حسین	(زیر طبع)
معیار	ممتاز شیریں	(زیر طبع)
کمپنی کی حکومت	باری (مرحوم)	(زیر طبع)

شعری ادب

(نظمیں ، غزلیں ، گیت)

سیف و سبو	جوش	۵/-
آیات و نغمات	,,	۵/-
جنون و حکمت	,,	۴/-
حرف و حکایت	,,	۴/-
نقش و نگار	,,	۳/۸
فکر و نشاط	,,	۲/۸
جلال و جمال	احمد ندیم قاسمی	۶/-
بادۂ مشرق	ساغر نظامی	۴/۸
خرابات	عبدالحمید عدم	۴/-
عظمت آدم	ظہیر کاشمیری	۳/۸
منزل شب	مختار صدیقی	۳/۸
تاریک سیارہ	اختر الایمان	۳/۸
دل دریا (پنجابی)	عبدالمجید بھٹی	۳/-
۴۸ کا شعری ادب	مرتبہ : ظہیر کاشمیری	-/-
۱۹۳۰ تا ۱۹۴۸ بہترین نظمیں (مکمل سٹ)		۹/۴
تلخیاں	ساحر لدھیانوی	۳/-
گجر	قتیل شفائی	۳/-
میں ساز ڈھونڈتی رہی	ادا بدایوانی	۲/۸
سرشام	ضیا جالندھری	۲/۸
خوناب	اختر انصاری	۲/-
زہر خند	یوسف ظفر	۲/-
وسعتیں	سلام مچھلی شہری	۱/۸
میرا جی کے گیت	میرا جی	-/۱۲/-
شہنائی	تاجور سامری	۱/-
آہنگ رزم	وقار انبالوی	۱/-
صبح انقلاب	انعام اللہ خاں ناصر	۱/-
رعنائیاں	شکیل بدایونی	(زیر طبع)
آب جو	اختر الایمان	(زیر طبع)
شب رفتہ	مجید امجد	(زیر طبع)
دیوان	ناصر کاظمی	(زیر طبع)
احمد پوری کے گیت	مقبول احمد پوری	(زیر طبع)

کرشن چندر

اردو کا محبوب ، مجتہد اور منفرد فن کار — روشنائی کی بجائے اپنے خون سے لکھنے کا عادی ہے ، کرشن کے فن کی عظمت اُس کے نظریات کی عالمگیر وسعت اور احساس کی بے پناہ شدت ہے ۔

ان داتا

یہ طلائی جھنکاروں کی رودادیں نہیں ، سہمے ہوئے ہونٹوں کی داستانیں ہیں ، ان داتا میں گندم اور دھان کے مرقعے نہیں بلکہ اُس کے پیچھے دبی ہوئی بھوکوں کے تجزیے ہیں ۔ ۲/۸

تین غنڈے

سماج کی نئی ذہنی تحریکوں ، نئے دُکھوں اور غموں کی نئی چیخوں اور کراہوں اور نئی تہذیبی کروٹوں کو اردو کے مسلّمہ فن کار کرشن چندر نے اپنے مخصوص لب و لہجہ میں بیان کیا ہے — وہ مخصوص لب و لہجہ جو آپ کی روح میں رچ چکا ہے ۔ ۲/۸

ٹوٹے ہوئے تارے

کرشن چندر کے ہردلعزیز اور مقبول ترین افسانوں کا مجموعہ جس میں کرشن چندر کا فن اپنی پوری بلندیوں پر ہے ۔ ۲/-

طلسم خیال

حیات انسانی کا گہرا مطالعہ ، موجودہ معاشرت پر طنز کے تیز تیز نشتر ، متین ، بیساختہ اور بے تکلف ظرافت ۔ ۲/۸

زندگی کے موڑ پر

طویل مختصر افسانوں کا مجموعہ ، اردو ادب میں اپنی طرز کی پہلی تصنیف ۔ ۲/-

مجید امجد

فلسفیانہ تفکر کو شاعری کے جمالیاتی سانچوں میں ڈھال کر پیش کرتا ہے۔

ہیئت کی ندرت کے معاملے میں خیال کی جدت پر زور دیتا ہے۔

جزئیات کی تصویر کشی میں فنکارانہ چابک دستی سے کام لیتا ہے۔

ابہام سے نفرت مگر رمز و کنایہ سے محبت کرتا ہے

شبِ رفتہ

مجید امجد کی نظمیں، غزلیں، گیت

☆ ☆ ☆

ناصر کاظمی

کا

دیوان

دیوانِ حشر گویا دیواں ہے ہمارا

(زیرِ طبع)

☆ ☆

آبِ جو

اخترالایمان کی شاعری انداز کے چٹیلے پن اور احساس کی گیرائی اور گہرائی کی شاعری نہیں بلکہ اُس کی نظمیں حیات اور اُس کے مسائل، انسانیت کی ہر الجھن اور سلجھاؤ کا ایک متوازن محاکمہ ہوتی ہیں۔

آبِ جو

انہی فکر و نظر، انداز و اسلوب کا آئینہ ہے۔

☆ ☆ ☆

«رعنائیاں» اور «صنم و حرم» کا خالق

شکیل بدایونی

شعر و نغمہ کا سرمایۂ انتخاب

شبستان

(غزلیں اور گیت)

کی صورت میں پیش کر رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

جیلانی بانو کے روشن افسانوں کا مجموعہ

روشنی کے مینار

☆ ☆

ممتاز حسین

ادب کے ترقی پسند اسکول کا ذہین نقاد ہے۔ اُسے ادب کی ہر صنف سے پوری واقفیت ہے۔ اس لیے اُس کی تنقیدی نظر میں وسعت بھی ہے اور گہرائی بھی۔۔۔

نئی تنقید

ممتاز حسین نے مشکل سے مشکل ادبی موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ جسے پڑھ کر قاری اردو ادب کی گراں مایہ ادبی روایتوں سے متعارف ہونے کے علاوہ موجودہ ادبی مسئلوں سے بھی پوری طرح روشناس ہو سکتا ہے۔ (زیرِ طبع)

« نظم لکھنے میں جیسا کمال میر کو ہے ، نثر لکھنے میں ویسا ہی میرامن کو ہے »
سر سید

« باغ و بہار زندہ کتابوں میں سے ہے » محمد حسین آزاد

« میرامن کی باغ و بہار ، فارسی قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہی نہیں ایک نئی تصنیف بھی ہے » گارساں دتاسی

« فورٹ ولیم کالج میں ، ڈاکٹر گلکرائسٹ کی زیر نگرانی جس قدر کتابیں لکھی گئیں ، باغ و بہار ان سب میں ممتاز ہے » سید عبداللطیف

« باغ و بہار ، اردو نثر کی ان چند کتابوں میں سے ہے جو ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں اور شوق سے پڑھی جائیں گی » ڈاکٹر مولوی عبدالحق

باغ و بہار

ھند و پاکستان کے مختلف مطابع میں کئی مرتبہ چھپی مگر فورٹ ولیم کالج کے اصلی ایڈیشن کے بعد کبھی اس کو اپنی شان کے شایاں لباس نہیں ملا -

اب ایک ایسا ایڈیشن تیار ہوا ہے

جسے نیا ادارہ نے پرانے نسخوں سے مقابلہ کر کے نئے آب و رنگ سے شائع کیا ہے -

تصویریں : حنیف رامے

اس ایڈیشن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جدید رموز و اوقاف کے برتنے سے میرامن کی لازوال نثر پہلے سے زیادہ آسان اور سادہ نظر آتی ہے -

« جو کوئی اس کو پڑھے گا گویا باغ کی سیر کرے گا ، بلکہ باغ کو آفت خزاں کی بھی ہے اور اس کو نہیں - یہ ہمیشہ سرسبز رہے گا » میرامن ۵/-

☆

ممتاز شیریں کے

ممتاز اور شیریں تنقیدی مضامین

معیار

کے نام سے شائع ہو رہے ہیں

☆

ڈی ، ایچ ، لارنس

انگریزی ادب میں لارنس کی حیثیت ایک ھرے بھرے وسیع و عریض کُرّے کی ھے — اور

کپتان کا گڈّا

اس کرۂ بہار کا ایک اجلا پھول ہے ، دروازہ ہے -

کتابی صورت میں ۸/۲